دار العلوم خیریہ نظامیہ سہسرام کا علمی فکری اور ادبی ترجمان

جہانِ مذہب و ادب کی وہ صدا جو ضمیر بیدار کرے

الرشید

سہسرام

مدیر اعلیٰ

محمد ملک الظفر سہسرامی

مدیر

محمد رحمت اللہ صدیقی



مارہرہ و بریلی

ایک روحانی تسلسل

عظمتِ اعلیٰ حضرت سے ضرورتِ اعلیٰ حضرتِ تک

نسبتوں کے چراغ: ایک روحانی وصیت نامے کا تجزیاتی مطالعہ

غزہ

ہزار دنوں کا اندھیرا

مذہبی صحافت

خونِ دل سے روشن چراغ

فقہی بصیرت سے عصری رہنمائی تک

مفتی اختر حسین قادری

کا علمی و فکری امتیاز

دار العلوم رحمت عالم

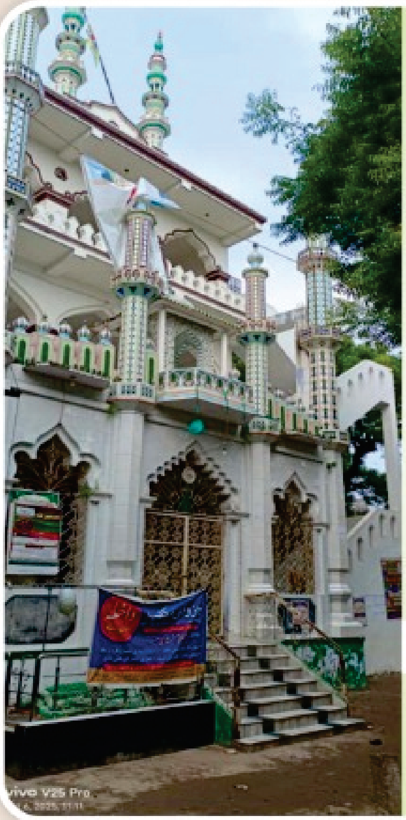


قائد اہلسنت خلیفہ حضور اشرف الفقہاء حضرت علامہ الحاج محمد امداد علی ضیائی رضوی قادری مدظلہ العالی ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ سنیت کی بقا، مسلک اعلیٰ حضرت کا تحفظ اور اسکی نشر واشاعت کے لئے ایک ادارے کا قیام بہت ضروری ہے اور آپ بار بار اپنے اس درد کا اظہار فرمایا کرتے تھے آپ کے دل کی یہ آواز بارگاہ رب کریم میں قبول ہوئی اور اس کام کے لئے قدرت نے ہمارے ہی شہر کی ایک باوقار شخصیت مخیر قوم وملت جناب الحاج شیخ انجم موسیٰ احمد صاحب کا انتخاب فرمایا اور اس بندہ خدا نے بڑی وسیع وعریض وہ بھی اپنی ذاتی زمین پر ذاتی خرچ سے دار العلوم رحمت عالم کی بنیاد رکھی اور تعمیری کام مکمل ہوا اللہ تعالیٰ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے صدقے انکی اس خدمت کو قبول فرمائے اور دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔

افتتاح دار العلوم رحمت عالم: 5 دسمبر 2018 کو دار العلوم کا افتتاح حضور اشرف الفقہاء حضرت علامہ الحاج مفتی مجیب اشرف رضوی قادری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں ہوا۔ پھر اسکے بعد الحاج شیخ انجم موسیٰ احمد صاحب نے اس ادرے کو حضور قائد اہلسنت حضرت علامہ الحاج محمد امداد علی ضیائی رضوی قادری صاحب قبلہ مدظلہ العالی اور آپ کے فرزند خلیفہ حضور تاج الشریعہ خطیب اہلسنت حضرت علامہ الحاج مفتی محمد اطہر حسن ضیائی صاحب قبلہ کے حوالے کر دیا کہ اب آپ حضرات اسے سنواریں اور آگے بڑھائیں۔ الحمدللہ ان حضرات کی سرپرستی میں یہ ادارہ ترقی پذیر ہے۔

سرپرست ومہتمم: خلیفہ حضور اشرف الفقہاء حضرت علامہ الحاج محمد امداد علی ضیائی رضوی قادری صاحب قبلہ مدظلہ العالی۔

ناظم اعلیٰ وصدر المدرسین: خلیفہ حضور تاج الشریعہ حضرت علامہ الحاج مفتی محمد اطہر حسن ضیائی صاحب قبلہ مدظلہ العالی



جزوقتی مکتب برائے نونہالانِ امت

(زیرِ انتظام: حضرت ذکی شہید کمیٹی، سہسرام)

تعلیم دین، خدمتِ عمل ---- یہی ہمارا عہد ہے

امت کا مستقبل اس کے نونہالوں کے ہاتھ میں ہے اور نونہالوں کا مستقبل صالح تعلیم و پاکیزہ تربیت سے وابستہ ہے۔ آج کے پُرآشوب دور میں جہاں فکری انتشار، اخلاقی انحطاط اور دینی غفلت کے بادل گہرے ہوتے جا رہے ہیں، وہاں ایک ایسے مکتب کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے جو بچوں کے دلوں میں نورِ قرآن روشن کرے، ان کے کردار میں سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کی خوشبو بسائے اور ان کی عملی زندگی نماز و اذکار سے آراستہ کرے۔

اسی مقدس مقصد کے تحت جزوقتی مکتب برائے نونہالانِ امت کا قیام عمل میں آیا ہے، جو حضرت ذکی شہید کمیٹی، سہسرام کے زیرِ انتظام جاری ہے۔ یہ مکتب محض درسگاہ نہیں بلکہ ایمان کی آبیاری اور کردار سازی کا مرکز ہے۔

★ نصابِ تعلیم ★ بنیادی دینی تعلیم ★ قرآن مجید ناظرہ وحفظ ★ اسلامی اخلاقیات کی تربیت ★ نماز واذکار کی عملی مشق ★ یہاں تعلیم محض معلومات نہیں بلکہ عمل کی بنیاد ہے اور تربیت محض نصیحت نہیں بلکہ عملی مشق کا نام ہے۔

اپیل: اہلِ ایمان سے دردمندانہ اپیل ہے کہ اس دینی وتربیتی مشن میں اپنا حصہ ضرور ادا کریں۔

اپیل کنندہ

(مولانا) محمد ملک الظفر سہسرامی • وقیع الدین عرف پپو ابنِ محترم الحاج نسیم الدین مرحوم

مقام: زردہ بھون، ذکی شہید، سہسرام

نوری ایجوکیشن وقف کمیٹی، احمد آباد کے زیرِ انتظام

جامعۃ الصالحات

JAMIATUS SALEHAT RATANPUR KHEDA

جامعۃ الصالحات رتن پور، گجرات کا ایک عظیم دینی وعصری تعلیم کا ادارہ ہے۔ جامعۃ الصالحات میں ۲۵۰ ر لڑکیاں تعلیم حاصل کررہی ہیں۔ ۲۰۰۳ء سے اب تک ۲۰۱ ر بچیوں نے قرآنِ کریم حفظ کیا ہے، جن میں ۵۰ رفضیلت، ۵۵ ر عالمہ، ۹۶ ر قاریہ اور ۲۸ ر مبلغہ شامل ہیں۔ گزشتہ سال ۶ ر فروری ۲۰۲۵ء کو ۸ ر لڑکیوں نے قرآنِ کریم حفظ مکمل کیا۔

جامعۃ الصالحات میں ۶ ر عالمہ، ۲ ر آفس اسٹاف، ۱ ر صفائی کارکن اور ۱ ر سیکیورٹی اسٹاف موجود ہیں۔

جامعۃ الصالحات کے ایک ماہ کے اخراجات تقریباً سات لاکھ چالیس ہزار روپے ہیں، چھیالیس لاکھ روپے ہیں۔

ایک لڑکی کے عالمہ بننے تک کا ایک ماہ کا خرچ تقریباً 2100 روپے ہے۔

اپنے مرحومین کے ایصال ثواب کے لیے آپ ایک طالبہ کا خرچ اپنے ذمہ لے سکتے ہیں۔

فروغ علومِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اہل خیر حضرات سے بھرپور تعاون کی گذارش ہے۔



بینک کی تفصیلات

Noori Education Waqf Committee

Account No.: **916010082434998**

Bank Name: AXIS BANK   IFSC Code: UTIB0000453

GPay کے ذریعے بھی عطیہ بھیجا جاسکتا ہے۔ آن لائن رقم جمع کرنے کے بعد بینک کی رسید کی تصویر بھیجنے کی گزارش ہے۔

جامعہ مدینۃ العلوم، رتن پور، ضلع کھیڑا، گجرات

JAMIA MADINATUL ULOOM RATANPUR KHEDA

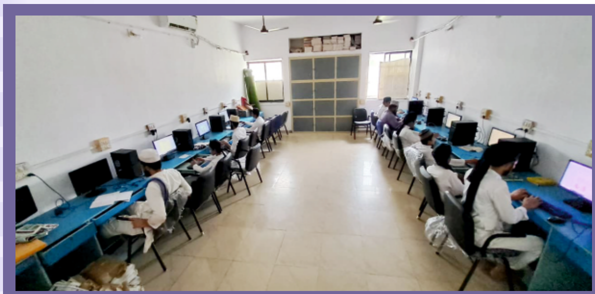
9879325786/9998025510/635331649/9574339263

جامعہ مدینۃ العلوم نوری ایجوکیشن اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ کے زیرِ انتظام چلتا ہے یہ ایک دینی وعصری تعلیمی ادارہ ہے، جہاں اس وقت تقریباً ۲۵۰/طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ گزشتہ سال ۱۰/فروری ۲۰۲۵ء کو جامعہ کی جانب سے منعقدہ دستار بندی کی تقریب میں ۱۰/عالم، ۱۴/قاری، ۱۰/حافظِ قرآن اور ۴۴/طلبہ کو دستار باندھی گئی۔ جامعہ کے قیام سے اب تک مجموعی طور پر ۴۹۱/طلبہ فارغ ہو چکے ہیں، جن میں ۳۲/فاضل، ۶۸/عالم، ۱۳۵/قاری، ۱۴۲/حافظِ قرآن، ۲۷/امام اور ایک مفتی شامل ہیں۔ جامعہ میں پانچویں جماعت سے بارہویں جماعت تک دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ اس کے علاوہ بارہویں جماعت کے طلبہ کو اسکول کی تعلیم کے ساتھ حفظِ قرآن بھی کرایا جا رہا ہے۔ جامعہ میں ۱۴/مدرسین، ۲/مفتی، ۱/کمپیوٹر ماسٹر، ۴/باورچی، ۱/گیٹ مین، ۲/صفائی کارکن اور ۲/دفتری ملازمین خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جامعہ مدینۃ العلوم کا ایک ماہ کا خرچ تقریباً ۹/لاکھ ۵۲/ہزار روپے ہے، جب کہ پورے سال کا خرچ تقریباً ۷۰/لاکھ ۴۰/ہزار روپے ہے۔

آپ جامعہ کی مدد کیسے کر سکتے ہیں؟

* ایک حافظِ قرآن یا ایک عالمِ دین کے ماہانہ اخراجات کے ذریعہ۔ * ایک طالب علم کا ماہانہ خرچ: ۲۱۰۰ روپے ہے۔

خلیفۂ حضور تاج الشریعہ حضرت علامہ مفتی حافظ وقاری محمد اشرف قادری رضوی بانی وسربراہ ادارہ ہٰذا، رتن پور، گجرات









بینک کی تفصیلات

Noori Education & Charitable Trust

Account No.: **913010045708080**

Bank Name: AXIS BANK IFSC Code: UTIB0000453

GPay کے ذریعے بھی عطیہ بھیجا جا سکتا ہے۔ آن لائن رقم جمع کرنے کے بعد بینک کی رسید کی تصویر بھیجنے کی گزارش ہے۔

دار العلوم خیریہ نظامیہ: ہماری امانت ہے





کچھ عمارتیں اینٹوں سے بنتی ہیں اور وقت کے ساتھ پرانی ہو جاتی ہیں، مگر کچھ عمارتیں دعاؤں سے اٹھتی ہیں اور نسلوں کے ایمان میں زندہ رہتی ہیں۔ دار العلوم خیریہ نظامیہ سہسرام بھی ایسی ہی ایک عمارت ہے۔ ★ یہ صرف دیواریں نہیں، ان دیواروں میں ہمارے اسلاف کی دعائیں سانس لیتی ہیں۔ یہ صرف حجرے نہیں، ان حجرات میں قرآن کی صدائیں، حدیث کی روشنی اور اہلِ محبت کے آنسو محفوظ ہیں۔ یہ محض ایک درس گاہ نہیں، یہ اس امانت کا امین ہے جو نسل در نسل ہمارے ہاتھوں تک پہنچی ہے۔ ★ کبھی غور کیجیے! کسی صبح اس ادارے کے صحن میں بلند ہونے والی تلاوتِ قرآن کی آواز سن کر۔ وہ صرف ایک حافظ قران کی آواز نہیں ہوتی، اس میں ان بزرگوں کی صدائیں شامل ہوتی ہیں جنھوں نے اپنے آرام کو دین کے لیے قربان کیا، جنھوں نے اپنے گھروں کے چراغ بجھا کر علم کے چراغ روشن کیے اور جنھوں نے اپنی زندگی آنے والی نسلوں کے ایمان کے نام کر دیا۔ ★ یہاں کتابیں صرف پڑھی نہیں جاتیں، یہاں دلوں کو سمت ملتی ہے۔ یہاں الفاظ صرف یاد نہیں کیے جاتے، یہاں عقیدہ سینوں میں اترتا ہے۔ یہاں طلبہ صرف عالم بننے کے لیے نہیں آتے، وہ دین کے خادم بننے کی تربیت پاتے ہیں۔ ★ یہ ادارہ آج بھی اپنی علمی شمع اہلِ خیر کے اخلاص سے روشن کیے ہوئے ہے۔ کسی حکومت کے خزانے سے نہیں، ان دلوں کی محبت سے جو دین کے لیے دھڑکتے ہیں، ان ہاتھوں کی قربانی سے جو اپنی ضرورتوں سے نکال کر علم کے چراغ میں تیل ڈالتے ہیں، ان دعاؤں سے جو خموشی سے آسمانوں کی طرف اٹھتی ہیں۔ ★ مگر چراغوں کی بھی ایک ضرورت ہوتی ہے۔ ★ چراغ روشنی بانٹتے رہیں تو انہیں تیل دینا پڑتا ہے اور علم کے یہ مراکز آباد رہیں تو انہیں اہلِ ایمان کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ ★ آج دار العلوم خیریہ نظامیہ ہم سے کچھ مانگ نہیں رہا، شاید وہ ہمیں ایک موقع دے رہا ہے--- اپنے حصے کی روشنی اس چراغ میں شامل کرنے کا موقع۔ ★ آپ کا دیا ہوا ایک روپیہ شاید آپ کی نظر میں معمولی ہو، مگر کسی طالب علم کی کتاب بن سکتا ہے۔ آپ کی ایک مدد کسی استاد کے گھر کا چراغ روشن کر سکتی ہے۔ آپ کا ایک عطیہ کسی ایسے علم کے سفر کا سبب بن سکتا ہے جس کا فیض آپ کی زندگی کے بعد بھی جاری رہے۔ ★ اس لیے آپ کی زکوۃ، آپ کے صدقات، آپ کے عطیات --- محض مالی تعاون نہیں۔ یہ دین کے ساتھ آپ کی نسبت ہے۔ یہ علم کے سفر میں آپ کا قدم ہے۔ یہ ان نسلوں کے ایمان میں آپ کا حصہ ہے جو شاید آپ کو کبھی جان بھی نہ سکیں، مگر آپ کے اخلاص کا فیض ان تک پہنچتا رہے گا۔ ★ آئیے! اس امانت کو تنہا نہ چھوڑیں، اس کے حجرات آباد رکھنے میں اپنا حصہ ادا کریں۔ اس کے طلبہ کو سہارا دیں۔ اس کے اساتذہ کے ہاتھ مضبوط کریں۔ اس چراغ میں اپنے اخلاص کا تھوڑا سا تیل ڈال دیں۔ ★ کیا خبر، یہی معمولی سا تعاون کل قیامت کے دن ہماری نجات کا سبب بن جائے! ★ یہ صرف تعاون نہیں، اپنے اسلاف سے وفا ہے، یہ صرف عطیہ نہیں، دین کے چراغ میں اپنے حصے کی روشنی ہے، یہ صرف خدمت نہیں، ایک امانت کی حفاظت ہے اور یہ امانت ہم سب کی ہے۔ ★ دار العلوم خیریہ نظامیہ--- ہماری نسبت، ہماری ذمہ داری، ہماری امانت۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

دارالعلوم خیریہ نظامیہ سہسرام کا علمی فکری اور ادبی ترجمان

مجلہ الکوثر

جہانِ مذہب و ادب کی وہ صدا جو ضمیر بیدار کرے

شمارہ: مارچ تا اگست ۲۰۲۶ء

رمضان ۱۴۴۷ھ تا صفر المظفر ۱۴۴۸ھ

فکرِ امروز

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مجددیت عموماً ان کے علمی کارناموں، فقہی بصیرت، عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دفاع اہل سنّت کی خدمات کے حوالے سے بیان کی جاتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی مجددانہ عظمت صرف علمی تصنیفات یا مناظرانہ فتوحات تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک ہمہ گیر روحانی و فکری انقلاب کا عنوان ہے۔ ان کی ذات میں تجدید محض مسائل کے حل یا عقائد کے تحفظ کا نام نہیں بلکہ ایمان کی حرارت تازہ کرنے، محبت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اسلام کو شعورِ امت کا مرکز بنانے اور شریعت و طریقت کے بکھرے رشتوں کو ایک وحدت میں پرو دینے کا نام ہے۔ انہوں نے اپنے قلم سے صرف شبہات کا ازالہ نہیں فرمایا بلکہ ایک عہد کے فکری انتشار کو سمیٹ کر حق کی ایک روشن شاہراہ متعین کی۔ ان کی مجددیت میں فقہ کی گہرائی بھی ہے، عرفان کی لطافت بھی، عشق کی سوزناکی بھی ہے اور ملت کی پاسبانی کا وقار بھی۔ حقیقت یہی ہے کہ ان کا ظہور ایک ایسے وقت میں ہوا جب امت کو محض ایک عالم نہیں، ایک مجدد، ایک نگہبان اور ایک روحانی چراغ درکار تھا۔

مولانا محمد ملک الظفر سہسرامی

مراسلت کا پتا: مجلہ الکوثر دارالعلوم خیریہ نظامیہ محلہ بارہ دری، سہسرام ضلع رہتاس، بہار (الہند) پن-821115

DARUL ULOOM KHAIRIA NEZAMIA

Barahdari, Sasaram, Bihar-821115, (INDIA), Contact: 7050055786
Email: alkausarsasaram@gmail.com Website: alkausarsasaram.blogspot.com

اس شمارے میں



اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی

بکارِ خویش حیرانم اغثنی یا رسول اللہ
پریشانم پریشانم اغثنی یا رسول اللہ

ندارم جز تو ملجائے ندارم جز تو ماوائے
توئی خود ساز و سامانم اغثنی یا رسول اللہ

شہا بیکس نوازی کن طبیبا چارہ سازی کن
مریضِ دردِ عصیانم اغثنی یا رسول اللہ

زرفتم راہِ بینایاں فتادم در چہِ عصیاں
بیا اے حبلِ رحمانم اغثنی یا رسول اللہ

گنہ بر سر بلا بارد دلم دردِ ہوا دارد
کہ داند جز تو درمانم اغثنی یا رسول اللہ

اگر رانی و گر خوانی غلامم انت سلطانی
دگر چیزے نمیدانم اغثنی یا رسول اللہ

رضایت سائلِ بے پر توئی سلطانِ لا تنہر
شہا بہرے ازیں خوانم اغثنی یا رسول اللہ

حضور تاج الشریعہ حضرت علامہ مفتی محمد اختر رضا قادری ازہری

کاش گنبد خضرا دیکھنے کو مل جاتا

داغِ فرقت طیبہ قلب مضمحل جاتا
کاش گنبد خضرا دیکھنے کو مل جاتا

میرا دم نکل جاتا ان کے آستانے پر
ان کے آستانے کی خاک میں میں مل جاتا

میرے دل سے دھل جاتا داغِ فرقت طیبہ
طیبہ میں فنا ہوکر طیبہ میں ہی مل جاتا

موت لے کے آجاتی زندگی مدینے میں
موت سے گلے مل کر زندگی میں مل جاتا

خلد زار طیبہ کا اس طرح سفر ہوتا
پیچھے پیچھے سر جاتا آگے آگے دل جاتا

دل پہ جب کرن پڑتی ان کے سبز گنبد کی
اس کی سبز رنگت سے باغ بن کے کھل جاتا

ان کے در پہ اختر کی حسرتیں ہوئیں پوری
سائل درِ اقدس کیسے منفعل جاتا

تقدیم

عظمت اعلیٰ حضرت سے ضرورت اعلیٰ حضرت تک

ایک مجلہ، ایک مکالمہ، ایک ذمہ داری

فکری و علمی مجلّات کی دنیا میں بعض رسائل محض مطبوعات نہیں ہوتے بلکہ اہلِ علم کے مابین ایک معتبر مکالمے کا عنوان بن جاتے ہیں۔ ان کے صفحات پر صرف مضامین نہیں چھپتے بلکہ افکار کی آبیاری، علمی روایات کی حفاظت اور فکری شعور کی تشکیل کا عمل جاری رہتا ہے۔

مجلہ ''الکوثر'' بھی اپنے آغاز سے یہی مقصد پیشِ نظر رکھے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کے محبوب رسول سرور کائنات محمد عربی ﷺ کے صدقہ و طفیل اس کے مختلف شماروں کو اہلِ علم، اربابِ قلم اور صاحبانِ نظر کے حلقوں میں جو پذیرائی حاصل ہوئی ہے، وہ ہمارے لیے حوصلے، اعتماد اور مزید ذمہ داری کا باعث ہے۔

خصوصاً گذشتہ خصوصی شمارہ، جو ''ٹیلی فونک استفاضۂ خبر'' جیسے اہم اور معاصر فقہی و فکری موضوع پر شائع کیا گیا تھا، علمی حلقوں میں غیر معمولی توجہ کا مرکز بنا۔ اہلِ تحقیق نے اس کی سنجیدگی، استدلال اور موضوع کی عصری اہمیت کو سراہا، جبکہ متعدد علماء، دانشوروں اور اصحابِ بصیرت نے اسے ایک ایسی علمی کاوش قرار دیا جو بدلتے ہوئے حالات میں دینی فکر کی رہنمائی کا مؤثر نمونہ پیش کرتی ہے۔ یہ پذیرائی دراصل اس بات کی علامت ہے کہ آج بھی سنجیدہ علمی مباحث اور تحقیقی کاوشوں کی ضرورت باقی ہے اور اہلِ علم ان کی قدرشناسی سے غافل نہیں۔

اسی علمی تسلسل اور فکری ذمہ داری کے احساس کے ساتھ ''الکوثر'' کا یہ تازہ شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، جس کا موضوع برصغیر کی علمی و دینی تاریخ کی ایک ایسی عظیم شخصیت ہے جس کے ذکر کے بغیر گذشتہ ڈیڑھ صدی کی مذہبی، فکری اور علمی تاریخ کا تصور مکمل نہیں ہوتا۔

اعلیٰ حضرت: ایک عہد، ایک فکر، ایک روایت

تاریخِ علم کے افق پر بعض نام ستاروں کی طرح نمودار نہیں ہوتے بلکہ آفتاب کی طرح طلوع ہوتے ہیں۔ ان کی روشنی کسی ایک سمت کی پابند نہیں ہوتی، وہ زمانوں کے اندھیروں کو منور کرتی اور نسلوں کے فکری سفر کی رہنمائی کرتی ہے۔ وہ محض اپنے عہد کے عالم نہیں ہوتے بلکہ عہد ساز ہوتے ہیں۔ ان کی فکر کتابوں کے صفحات تک محدود نہیں رہتی بلکہ ذہنوں کی تشکیل اور معاشروں کی تعمیر کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ان کے قلم کی جنبش علم کے نئے دریچے وا کرتی ہے اور ان کے افکار آنے والے زمانوں کے لیے چراغِ راہ بن جاتے ہیں۔

ایسی شخصیات وقت کی گرد سے دھندلا نہیں جاتیں بلکہ وقت گذرنے کے ساتھ ان کی عظمت مزید نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان کا علمی سرمایہ صرف معلومات کا ذخیرہ نہیں ہوتا بلکہ بصیرت، حکمت اور فکری بالیدگی کا ایسا سرچشمہ ہوتا ہے جس سے صدیوں تک اہلِ علم سیراب ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے دور کے سوالوں کا جواب ہی نہیں دیتے بلکہ آنے والے زمانوں کے شبہات اور فکری چیلنجوں کے لیے بھی بنیادیں فراہم کر جاتے

ہیں۔ان کی زندگی علم کی عظمت، تحقیق کی دیانت اور حق کے لیے استقامت کا ایسا روشن استعارہ بن جاتی ہے جسے تاریخ احترام کے ساتھ یاد کرتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قدرت بعض ہستیوں کو صرف ایک زمانے کے لیے نہیں بلکہ زمانوں کی رہنمائی کے لیے پیدا کرتی ہے۔ وہ خود ایک فرد ہوتے ہیں مگر اپنے اندر ایک عہد، ایک تحریک اور ایک مکمل علمی روایت سموئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا ذکر صرف تذکروں کا حصہ نہیں بنتا بلکہ تہذیبوں کی فکری تاریخ کا مستقل باب قرار پاتا ہے۔ان کی عظمت محض ان کے عہد تک محدود نہیں رہتی بلکہ آنے والے ادوار کے شعور میں سرایت کر جاتی ہے۔ وہ اپنے زمانے کے فرد نہیں ہوتے، زمانوں کے معمار ہوتے ہیں۔ ان کی فکر وقت کے دھارے کے ساتھ ماند نہیں پڑتی بلکہ ہر نئے دور میں ایک نئی معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ان کے افکار نسلوں کی رہنمائی کرتے ہیں، ان کے نظریات فکری قافلوں کی سمت متعین کرتے ہیں اور ان کے نقوش تاریخ کے صفحات پر مستقل عنوان بن جاتے ہیں۔ وہ حالات کے تابع نہیں ہوتے بلکہ حالات کا رخ متعین کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی بصیرت اپنے عہد کے مسائل تک محدود نہیں رہتی بلکہ مستقبل کے امکانات اور چیلنجوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہوتی ہے۔ اسی لیے زمانہ بدل جاتا ہے، تہذیبیں نئے سانچوں میں ڈھل جاتی ہیں مگر ان کی آواز اپنی تاثیر اور معنویت کے ساتھ باقی رہتی ہے۔ ایسی شخصیات محض علمی سرمایہ نہیں ہوتیں بلکہ تہذیبی ورثہ بن جاتی ہیں۔ ان کا وجود ایک چراغ کی مانند ہوتا ہے جس کی روشنی اپنے عہد سے آگے بڑھ کر آنے والی نسلوں کے راستے بھی منور کرتی رہتی ہے۔ وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ نہیں ہوتیں بلکہ تاریخ کے دھارے میں شامل ہو کر قوموں کی فکری، روحانی اور تہذیبی تشکیل کا حصہ بن جاتی ہیں۔ برصغیر کی علمی و روحانی تاریخ میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا نام اسی درخشاں سلسلے کی ایک تابندہ کڑی ہے۔ آپ کی ذاتِ گرامی علم و عرفان، فقاہت و بصیرت، عشقِ رسول ﷺ اور تجدیدِ دین کا ایسا حسین امتزاج تھی جس نے اپنے عہد ہی کو نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے فکری اور روحانی افق کو بھی منور کیا۔ آپ ان نابغۂ روزگار شخصیات میں سے تھے جن کی عظمت کا اعتراف صرف ان کے معاصرین ہی نہیں کرتے بلکہ زمانہ گذرنے کے ساتھ ان کے مقام و مرتبے کی رفعت مزید نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ آپ کی علمی خدمات محض چند تصنیفات یا فتاوے تک محدود نہیں رہیں بلکہ انہوں نے ایک ایسے فکری و روحانی دبستان کی بنیادوں کو استحکام بخشا جس کی جڑیں قرآن وسنت، محبتِ رسول ﷺ اور عقائدِ اہلِ سنّت کی مضبوط اساسات میں پیوست ہیں۔ آپ کی فکر نے امت کو اعتدال، محبت، وفاداری اور دینی حمیت کا وہ شعور عطا کیا جو ہر دور کے فتنوں کے مقابلے میں چراغِ راہ بن کر جلوہ گر ہوتا ہے۔ وہ صرف ایک عظیم فقیہ یا بلند پایہ محدث ہی نہیں تھے بلکہ ایک ایسے مردِ درویش تھے جن کے قلم میں تحقیق کی قوت، زبان میں حق گوئی کی جرأت اور دل میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی بے پایاں تپش جمع ہوگئی تھی۔

اعلیٰ حضرت: عظمت سے معنویت تک

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمہ کا ذکر کسی ایک شخصیت کا ذکر نہیں بلکہ ایک عہد، ایک فکر، ایک روایت اور ایک زندہ علمی و روحانی ورثے کا ذکر ہے، جو آج بھی لاکھوں دلوں کی رہنمائی اور عقیدت کا مرکز بنا ہوا ہے۔

چنانچہ جب ان کے علمی افق پر نظر ڈالی جاتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ذات ایک ایسے آفتابِ علم کی مانند ہے جس کی روشنی بیک وقت بے شمار علوم وفنون پر پڑتی ہے۔ ایک ایسا نام جس کے گرد فقہ، حدیث، تفسیر، کلام، تصوف، ادب، منطق، فلسفہ، ریاضیات اور فلکیات کے متعدد دائرے گردش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا جامع و ہمہ گیر وجود کہ جس کی علمی شخصیت کسی ایک فن، ایک مدرسے یا ایک جہت میں محدود نہیں ہوتی بلکہ علوم و معارف کے وسیع افق پر ایک آفتاب کی مانند جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اس کی فکر میں استدلال کی گہرائی بھی ہوتی ہے اور عشق کی حرارت بھی، تحقیق کی سنجیدگی بھی ہوتی ہے اور عرفان کی لطافت بھی۔ وہ صرف کتابوں کے مصنف نہیں ہوتے بلکہ ایک عہد کے فکری معمار ہوتے ہیں۔ ان کے قلم سے

نکلنے والے الفاظ درس گاہوں کی دیواروں تک محدود نہیں رہتے بلکہ نسلوں کے شعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔ان کی نگاہ ماضی کے علمی سرمائے پر بھی ہوتی ہے اور مستقبل کے فکری تقاضوں پر بھی۔ وہ روایت کے محافظ بھی ہوتے ہیں اور اجتہادی بصیرت کے امین بھی۔ایسی شخصیات تاریخ کے صفحات پر محض ایک نام نہیں ہوتیں بلکہ ایک مکمل علمی کائنات کی حیثیت رکھتی ہیں، جن کی زندگی علم کے تنوع ،فکر کی وسعت اور روحانیت کی رفعت کا ایسا حسین امتزاج بن جاتی ہے کہ آنے والے ادوار ان کے ذکر سے اپنی فکری راہوں کو منور کرتے رہتے ہیں۔

چنانچہ ان کی حیات کا مطالعہ درحقیقت ایک ایسے فکری و روحانی دبستان کا مطالعہ ہے جس میں علم و عرفان کی متعدد جہتیں یکجا ہو کر ایک منفرد شخصیت کی تشکیل کرتی ہیں۔ایک ایسی شخصیت جس نے روایت کی پاسبانی بھی کی اور اجتہادی بصیرت کی شمع بھی روشن رکھی۔ایک ایسا مفکر جس کے ہاں عشق اور عقل، استدلال اور جذب، روایت اور معاصرت، سب ایک متوازن اور حسین امتزاج کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ وہ ماضی کے امین بھی تھے اور مستقبل کے رہنما بھی۔ان کی فکر نے قدیم علمی سرمائے کو محض محفوظ نہیں رکھا بلکہ اسے عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے نئی معنویت عطا کی۔ان کے نزدیک روایت جمود کی علامت نہیں تھی بلکہ ایک زندہ اور متحرک آگہی تھی، جو ہر دور میں اپنے اندر تجدید اور ارتقا کی صلاحیت رکھتی ہے۔انہوں نے عقل کو عشق کے مقابل نہیں کھڑا کیا بلکہ دونوں کو ایک ہی حقیقت کے دو روشن پہلو قرار دیا۔ان کے استدلال میں تحقیق کی گہرائی تھی تو ان کے جذب میں محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرارت، ان کی تحریروں میں برہان کی قوت بھی تھی اور دل کی تاثیر بھی۔ وہ منبر پر خطیب تھے تو محراب میں عابد، درس گاہ میں معلم تھے تو قلم کی دنیا میں مفکر۔ عدالتِ علم میں محقق تھے تو محفلِ ذکر میں سراپا ادب واخلاص۔ فتویٰ نویسی میں دقتِ نظر کے پیکر تھے تو اصلاحِ معاشرہ میں حکمت و بصیرت کے علم بردار۔ وہ عوام کے لیے شفقت و محبت کا سایہ تھے اور خواص کے لیے علم و معرفت کا مرجع۔ان کی زبان سے حق گوئی جھلکتی تھی، ان کے قلم سے فکر کے چراغ روشن ہوتے تھے اور ان کی زندگی دینِ متین کی عملی تفسیر بن کر سامنے آتی تھی۔ یوں ان کی ذات مختلف اوصاف و کمالات سے پر تھی جس میں علم کا وقار، عبادت کی لطافت، کردار کی پاکیزگی اور خدمتِ خلق کی روشنی یکجا نظر آتی تھی۔ لاریب ان کی ذات علم و عرفان کے اس سنگم کی حیثیت رکھتی ہے جہاں فکر کو وقار ملتا ہے، محبت کو سمت ملتی ہے اور عقیدت کو شعور۔ اسی لیے ان کا نام محض ایک فرد کا نام نہیں بلکہ ایک عہدِ فکر، ایک دبستانِ بصیرت اور ایک روشن روایت کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے، جس کی روشنی آج بھی اہلِ علم و دانش کی راہوں کو منور کر رہی ہے۔ان کی فکری و روحانی عظمت کا راز بھی دراصل یہی ہے کہ وہ محض اپنے زمانے کے مسائل کا جواب نہیں تھے بلکہ آنے والے ادوار کی فکری ضرورتوں کے لیے بھی ایک روشن حوالہ بن گئے۔

اعلیٰ حضرت: روایت کے امین، مستقبل کے رہنما

یہ حقیقت ہے کہ ہر دور اپنے فکری بحران کے مطابق اپنے رجالِ علم کو دریافت کرتا ہے۔ جب مذہبی فکر انتہاؤں میں بٹنے لگے، جب اختلاف مکالمے کی بجائے مخاصمت میں بدلنے لگے، جب روایت جمود اور جدت بے سمتی کی شکار ہو جائے تو تاریخ اپنے حافظے سے ایسے ہی رجال کو سامنے لاتی ہے جن کی زندگی توازن کی عملی تفسیر اور جن کی فکر اعتدال کی روشن مثال ہوتی ہے۔ یہی وہ وصف ہے جو ایسے رجالِ علم کو اپنے عہد کے عام مفکرین سے ممتاز کرتا ہے اور انہیں محض نظری مباحث کے شرکا نہیں بلکہ فکری رہنمائی کے مراکز کی حیثیت عطا کرتا ہے۔ایسی شخصیات محض مسائل کا حل پیش نہیں کرتیں بلکہ فکر کے منتشر دھاروں کو ایک مرکز عطا کرتی ہیں۔ وہ جذبات کی تیز و تند آندھیوں میں بھی عقل و حکمت کا چراغ روشن رکھتی ہیں اور نظریاتی کشمکش کے شور میں بھی حق و انصاف کی آواز دبنے نہیں دیتیں۔ان کا امتیاز یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ ماضی کے اسیر ہوتے ہیں اور نہ حال کے فریب میں مبتلا، بلکہ زمانے کی رفتار سمجھتے ہوئے مستقبل کے امکانات بھی اپنی نگاہ میں رکھتے ہیں۔ وہ روایت کے چراغ بجھنے نہیں دیتے اور جدت کی روشنی سے بھی منہ نہیں موڑتے۔ان کی فکر زمانے کے ہنگاموں سے بلند اور ان کی بصیرت وقتی نعروں سے ماورا ہوتی ہے۔ وہ حالات کے دھارے میں بہہ جانے کی جگہ تاریخ کا رخ متعین کرتے ہیں اور واقعات کے تعاقب میں چلنے کی بجائے خود ایسے نقوش چھوڑ جاتے ہیں جن کی

پیروی آنے والی نسلیں کرتی ہیں۔ان کی زندگی محض ایک فرد کی زندگی نہیں ہوتی بلکہ ایک عہد کی تعبیر، ایک فکر کی نمائندگی اور ایک تہذیب کے شعور کا استعارہ بن جاتی ہے۔اسی لیے ان کے اثرات ان کے زمانے کے خاتمے کے ساتھ انتہا پذیر نہیں ہوتے بلکہ ان کی آواز صدیوں کے فاصلے طے کرکے آنے والے ادوار کے اذہان وقلوب میں گونجتی رہتی ہے۔وہ روایت کی روح محفوظ رکھتے ہوئے زمانے کے سوالات کا جواب دیتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ علم کا مقصد محض مناظرانہ غلبہ نہیں بلکہ انسانی شعور کی رہنمائی ہے اور دین کا مقصود صرف احکام کی تفہیم نہیں بلکہ دلوں کی اصلاح اور معاشرے کی تعمیر بھی ہے۔اسی لیے ان کی فکر میں گہرائی بھی ہوتی ہے اور وسعت بھی، استحکام بھی ہوتا ہے اور حرکت بھی، اصولوں کی پاسداری بھی ہوتی ہے اور حالات کی صحیح تفہیم بھی۔

تاریخ کے افق پر ایسے رجالِ علم چراغوں کی طرح نمودار ہوتے ہیں۔وہ اپنے عہد کے اندھیروں سے نبرد آزما ہوتے ہیں مگر ان کی روشنی اپنے زمانے تک محدود نہیں رہتی۔آنے والی نسلیں بھی ان کے افکار سے سمت پاتی ہیں، ان کے کردار سے حوصلہ پاتی ہیں اور ان کی بصیرت سے اپنے عہد کے مسائل سمجھنے کا سلیقہ سیکھتی ہیں۔یوں وہ اپنے زمانے کے فرد نہیں رہتے بلکہ زمانوں کے معمار اور فکری روایت کے امین بن جاتے ہیں۔زمانوں پر اثر انداز ہونے والی شخصیات کی اصل پہچان یہی ہوتی ہے کہ ان کا ورثہ افراد سے آگے بڑھ کر ایک فکری روایت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی علمی وفکری زندگی بھی اسی حقیقت کا روشن مظہر ہے۔اعلیٰ حضرت کا علمی کارنامہ صرف چند سو کتابوں یا ہزاروں فتاوے تک محدود نہیں۔ ان کا اصل کارنامہ ایک ایسی فکری روایت کی تشکیل ہے جس میں علم، حکمت اور توازن ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔انھوں نے محض علمی ذخیرہ نہیں چھوڑا بلکہ ایک ایسا منہج عطا کیا جس میں تحقیق کے ساتھ احتیاط، استدلال کے ساتھ اعتدال اور عقیدت کے ساتھ بصیرت ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ان کی فکر میں شریعت کی پاسداری بھی ہے اور روحانیت کی لطافت بھی، عقل کی رہنمائی بھی ہے اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حرارت بھی۔انھوں نے علم کو محض ذہنی مشق یا لفظی موشگافی کا عنوان نہیں بنایا بلکہ اسے ایمان، عمل اور اخلاق کے ساتھ جوڑ کر ایک زندہ حقیقت کے طور پر پیش کیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں صرف مسائل کا حل نہیں بتاتیں بلکہ فکر کو سمت، دل کو روشنی اور کردار کو استحکام بھی عطا کرتی ہیں۔ان کا قائم کردہ علمی وفکری دبستان وقت کے تغیرات سے ماورا ایک ایسی روایت بن گیا جس نے نسل در نسل اہلِ سنّت کے علمی شعور، دینی مزاج اور تہذیبی شناخت کی آبیاری کی۔اس اعتبار سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ صرف ایک عظیم مصنف، محدث اور فقیہ ہی نہیں بلکہ ایک عہد ساز مفکر، ایک فکری معمار اور ایک ہمہ جہت علمی روایت کے بانی بھی ہیں، جن کے اثرات اپنے زمانے سے نکل کر آنے والے زمانوں کے فکری افق پر بھی پوری آب وتاب کے ساتھ نمایاں ہیں اور اگر اس دبستان کی فکری روح کو چند الفاظ میں سمیٹا جائے تو اس کے پس منظر میں وہ اصولی بصیرت کارفرما نظر آتی ہے جس نے علم کو کردار، عشق کو ایمان اور اختلاف کو تہذیبِ مکالمہ سے ہم آہنگ کر دیا۔ان کے ہاں فقہ محض احکام کا مجموعہ نہیں بلکہ امت کی اجتماعی بصیرت ہے، عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم محض جذباتی وابستگی نہیں بلکہ ایمان کی روح ہے اور اختلاف محض رد وقبول کا نام نہیں بلکہ تہذیبِ مکالمہ کا ایک باوقار عنوان ہے۔وہ علم کو محض معلومات کا ذخیرہ نہیں سمجھتے بلکہ کردار سازی اور فکری رہنمائی کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک فتویٰ صرف ایک شرعی جواب نہیں بلکہ زمانے کے پیچیدہ سوالات کے درمیان شریعت کی حکیمانہ رہنمائی کا نام ہے۔ان کی فکر میں اعتدال کمزوری نہیں بلکہ قوتِ بصیرت کی علامت ہے اور محبت محض ایک جذبہ نہیں بلکہ دعوت واصلاح کا مؤثر ترین وسیلہ ہے۔وہ روایت کے امین بھی ہیں اور عصرِ نو کے نبض شناس بھی۔ ماضی کے علمی سرمائے سے وابستگی ان کے قدموں کو جمود کا شکار نہیں ہونے دیتی اور زمانے کی تبدیلیوں کا ادراک انھیں روایت سے بے نیاز نہیں بناتا۔اسی لیے ان کے ہاں اصالت اور معاصرت، تحقیق اور محبت، استدلال اور ادب ایک دوسرے کے مدمقابل نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون نظر آتے ہیں۔ان کی فکر کا امتیاز یہ ہے کہ وہ دین کو تنگ دائروں میں مقید نہیں کرتے بلکہ اسے ایک ایسی جامع حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو عقل کو روشنی، دل کو حرارت اور معاشرے کو توازن عطا کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی علمی میراث صرف کتابوں کے صفحات تک محدود نہیں رہتی بلکہ نسلوں کے فکری شعور، دینی ذوق اور تہذیبی احساس کی سمت بن جاتی ہے۔

ایک شخصیت متعدد علمی جہات:

زیرِ نظر خصوصی شمارہ اسی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف علمی، فکری، روحانی اور ادبی پہلوؤں کو نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی ایک معمولی سی کوشش ہے۔ اس کا مقصد محض ان کی حیات وخدمات کا تذکرہ کرنا نہیں بلکہ ان کے فکر وفن کی اُن جہات کو بھی اجاگر کرنا ہے جو وقت گذرنے کے ساتھ مزید روشن اور مؤثر ہوتی چلی گئی ہیں۔ ان کی شخصیت کا ہر پہلو اپنے اندر ایک مستقل موضوع، ایک مکمل دبستان اور ایک زندہ روایت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس شمارے کے مضامین میں کوشش کی گئی ہے کہ ان کے علمی کمالات، فکری بصیرت، روحانی گہرائی، ادبی ذوق اور ملی وسماجی خدمات کو محض تعریفی انداز میں نہیں، بلکہ تحقیقی، تجزیاتی اور تنقیدی شعور کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ قاری ان کی عظمتیں صرف روایات کے آئینے میں نہیں بلکہ دلیل، مطالعہ اور فہم کے تناظر میں بھی دیکھ سکے۔

یقیناً ایسی عظیم شخصیات کسی ایک عہد، ایک طبقے یا ایک خطۂ زمین کا سرمایہ نہیں ہوتیں بلکہ وہ اپنے افکار کی روشنی سے نسلوں کی رہنمائی کرتی ہیں، اپنے کردار کی خوشبو سے زمانوں کو معطر بناتی ہیں اور اپنے علمی ورثے سے تاریخ کے سفر کو سمت عطا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مطالعہ ماضی کی بازیافت نہیں بلکہ حال کی رہنمائی اور مستقبل کی تعمیر کا ایک مؤثر وسیلہ بھی ہے۔

اس شمارے میں شامل مضامین محض عقیدت کے اظہار نہیں بلکہ تحقیق، تجزیہ اور تفہیم کی سنجیدہ کاوشیں ہیں۔ ان تحریروں میں محبت واحترام کے جذبات کے ساتھ علمی دیانت، فکری توازن اور تحقیقی بصیرت بھی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ہر مضمون اپنے موضوع کو محض خراجِ عقیدت کے انداز میں نہیں دیکھتا بلکہ اس کے علمی، فکری، تاریخی اور تہذیبی پہلوؤں کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ یہ مضامین قاری کو صرف ماضی کی یادوں سے آشنا نہیں کرتے بلکہ اسے اس فکری ورثے کی معنویت اور عصری افادیت پر غور کرنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ ان میں شخصیتوں کا تذکرہ ہے تو ان کے اثرات کا جائزہ بھی، خدمات کا بیان ہے تو ان کی فکری جہات کا تجزیہ بھی اور کارناموں کا ذکر ہے تو ان کے پس منظر اور نتائج کی تفہیم بھی۔

یوں یہ شمارہ محض ایک یادگاری مجموعہ نہیں بلکہ علم وتحقیق، فکر ونظر اور شعور وآگہی کا ایسا سرمایہ ہے جو اہلِ علم کے لیے مطالعے، مکالمے اور استفادے کے نئے دریچے وا کرتا ہے۔

''فقہ سے فلکیات تک'' اعلیٰ حضرت کی علمی وسعتوں کا ایک اجمالی تعارف ہے۔ یہ مضمون ان کی ہمہ جہت علمی وفکری خدمات کا ایک اجمالی مگر بامعنیٰ تعارف پیش کرتا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اعلیٰ حضرت کی علمی شخصیت کا جو تعارف اب تک عام طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے، وہ ان کے علوم وفنون کے حقیقی تنوع اور وسعت کا مکمل احاطہ نہیں کرتا۔ بلاشبہ اعلیٰ حضرت ایک عظمت مآب مجدد، جلیل القدر فقیہ، بے نظیر محدث، نکتہ شناس مفسرِ قرآن، دور اندیش مناظر، مایہ ناز مدرس اور صاحبِ فتویٰ عالم تھے لیکن ان کی شخصیت ان چند علمی عناوین تک محدود نہیں تھی۔ وہ اپنے عہد کے ایک ہمہ جہت مفکر، بلند پایہ محقق، نکتہ رس ادیب، قادر الکلام شاعر، ماہرِ علمِ کلام، بصیرت افروز مصلح، عارفِ شریعت وطریقت اور عاشقِ صادقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ وہ قلم کے بھی امین تھے اور منبر کے بھی، تحقیق کے بھی امام تھے اور دعوت وارشاد کے بھی رہنما۔ ان کی فقاہت میں اجتہادی بصیرت تھی، ان کی تفسیر میں فہمِ قرآن کی گہرائی، ان کی حدیث دانی میں وسعتِ مطالعہ اور ان کی تحریروں میں علم وعشق کا ایسا حسین امتزاج تھا جو کم ہی شخصیات کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ صرف ایک عالمِ دین نہیں بلکہ ایک مکمل علمی ادارہ، ایک فکری تحریک، ایک تہذیبی شعور اور ایک روحانی مرکز کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی ذات میں علم کی عظمت، فکر کی گہرائی، کردار کی پاکیزگی، عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرارت اور اہلِ سنّت کے عقائد ونظریات کے تحفظ کا بے مثال جذبہ یکجا ہو گیا تھا۔ اسی لیے ان کا ذکر محض ایک فرد کا تذکرہ نہیں بلکہ برصغیر کی علمی، فکری اور روحانی تاریخ کے ایک درخشاں باب کا مطالعہ ہے۔ ان کی شخصیت اپنے عہد کی نمائندہ ہی نہیں بلکہ آنے والے زمانوں کے لیے بھی علم، عشق، بصیرت اور استقامت کا ایک روشن مینار ہے۔ ان کی علمی عظمت صرف انہی میدانوں تک محدود نہیں تھی۔ انہوں نے فلکیات، ریاضیات، ہیئت، توقیت، ہندسہ، لوگارثم اور دیگر

عقلی وسائنسی علوم میں بھی غیر معمولی مہارت کا ثبوت دیا۔ ان کی تصانیف اور تحقیقات اس امر کی شاہد ہیں کہ وہ اپنے عہد کے ان نابغۂ روزگار اہلِ علم میں شمار ہوتے تھے جنہوں نے دینی اور عقلی علوم کے درمیان ایک حسین امتزاج قائم کیا۔ اعلیٰ حضرت کی شخصیت علم و تحقیق کے ایسے بحرِ بیکراں کی حیثیت رکھتی ہے جس کی گہرائیوں کا مکمل ادراک ابھی باقی ہے۔ ان کے علمی آثار یہ بتاتے ہیں کہ وہ صرف اپنے زمانے کے فقیہ نہیں تھے بلکہ ایک ہمہ گیر مفکر، عبقری محقق اور متعدد علوم وفنون پر گہری نظر رکھنے والے دانش ور تھے، جن کی علمی بصیرت فقہ کے ایوانوں سے نکل کر افقِ تحقیق کی ان بلندیوں تک پہنچی جہاں بہت کم نگاہیں رسائی پاتی ہیں۔

''اختلاف سے اعتراف تک'' ان کے فکری اثرات کی وسعت کا بیان ہے۔ تاریخِ علم وفکر میں بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی عظمت صرف ان کے ماننے والوں کے اعتراف کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ ان کا علمی وقار اپنے مخالفین سے بھی خراجِ تحسین وصول کر لیتا ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ انہی نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے ہیں جن کی علمی وسعت، فقہی بصیرت، فکری گہرائی اور غیر معمولی ذہانت نے اپنے دور کے اہلِ علم کو حیرت زدہ کر دیا۔ اس مضمون میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ امام احمد رضا کی خداداد صلاحیتیں اور علمی کمالات اس درجے کے تھے کہ نظریاتی اور مسلکی اختلافات رکھنے والے بڑے بڑے علماء، مفکرین اور دانشور بھی ان کی علمی عظمت کی دہلیز پہ سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوئے۔ اختلافِ رائے اپنی جگہ برقرار رہا مگر علم کی دیانت نے انہیں اس حقیقت کے اعتراف پر آمادہ کیا کہ امام احمد رضا اپنے عہد کے ایک غیر معمولی عالم، نادر الفکر محقق اور بے مثال فقیہ تھے۔ یوں ان کی شخصیت اس حقیقت کی روشن دلیل بن گئی کہ حقیقی علم اپنی روشنی سے دلوں کو مسخر کر لیتا ہے اور عظمتِ علم کے سامنے اختلاف کی دیواریں بھی بالآخر اعتراف کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ یقیناً یہ مضمون اس باب کے لیے ایک فکری دروازہ کھولتی ہے اور قاری کو اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے آمادہ کرتی ہے کہ اعلیٰ حضرت کی عظمت محض عقیدت مندوں کے دعووں تک محدود نہیں بلکہ مخالف مکتبۂ فکر کے اہلِ علم کے اعترافات سے بھی ثابت ہے۔

''علم، حکمت اور توازن'' ان کی فکری میراث کے بنیادی عناصر کو اجاگر کرتا ہے۔ تاریخِ اسلام میں بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی عظمت صرف ان کے علمی ذخیرے سے نہیں ناپی جاتی بلکہ ان کے فکری توازن، حکیمانہ بصیرت اور عہد ساز اثرات سے پہچانی جاتی ہے۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ انہی نابغۂ روزگار شخصیات میں سے ہیں جنہوں نے علم کو حکمت کے ساتھ، عشق کو شعور کے ساتھ اور روایت کو بصیرت کے ساتھ جوڑ کر ایک ایسی فکری میراث چھوڑی جو آج بھی اہلِ سنّت کے علمی و دینی شعور کی رہنمائی کر رہی ہے۔ اعلیٰ حضرت کی فکر کا پہلا نمایاں وصف علم کی وسعت اور گہرائی ہے۔ فقہ، اصول، تفسیر، حدیث، عقائد، منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت اور دیگر متعدد علوم میں ان کی دسترس ان کے غیر معمولی علمی مقام کی شاہد ہے۔ ان کے نزدیک علم محض معلومات کا ذخیرہ نہیں بلکہ دین کی صحیح تفہیم اور امت کی رہنمائی کا ذریعہ تھا۔ دوسرا نمایاں پہلو حکمت اور بصیرت ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے فکری چیلنجز کا سامنا محض جذباتی ردِّعمل سے نہیں کیا بلکہ علمی استدلال، تحقیقی منہج اور حکیمانہ طرزِ استنباط کے ذریعے کیا۔ ان کی تحریروں میں جہاں عقیدے کی مضبوطی ہے وہیں استدلال کی متانت اور فکر کی پختگی بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ تیسرا اور نہایت اہم وصف توازن واعتدال ہے۔ امام احمد رضا عشقِ رسول ﷺ کے علم بردار تھے مگر ان کا عشق علم سے جدا نہ تھا۔ وہ شریعت کے پاسبان تھے مگر تصوف کے جمال سے بھی آشنا تھے۔ انہوں نے ظاہر و باطن، عقل و عشق، فقہ و روحانیت اور روایت و تحقیق کے درمیان ایک ایسا متوازن رشتہ قائم کیا جو ان کی فکر کو دائمی اہمیت عطا کرتا ہے۔ ان کی فکری میراث کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے اہلِ سنّت کے اعتقادی تشخص کو علمی بنیادوں پر مستحکم کیا۔ ان کے نزدیک دین کا تحفظ محض جذبات سے نہیں بلکہ مضبوط علمی استدلال، صحیح عقیدہ اور مستند روایات سے ممکن ہے۔ آج جب فکری انتشار، مذہبی انتہا پسندی اور علمی سطحیت کے مختلف مظاہر ہمارے سامنے ہیں تو اعلیٰ حضرت کی فکر ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ علم کے بغیر جذبہ بے سمت ہو جاتا ہے، حکمت کے بغیر دعوت بے اثر ہو جاتی ہے اور توازن کے بغیر فکر اپنی افادیت کھو دیتی ہے۔ اسی لیے ان کی فکری سرمائے کو صرف ایک تاریخی ورثہ نہیں بلکہ علم، حکمت اور اعتدال کے ایسے زندہ سرچشمہ کے طور پر دیکھا جانا چاہیے جو ہر دور میں اہلِ علم و دانش کے لیے رہنمائی کا سامان فراہم کرتے رہیں گے۔

’’تلمیحات کے استعمال میں امام احمد رضا کا تفرد‘‘ ان کی ادبی بصیرت کے ایک کم زیرِ بحث گوشے کو نمایاں کرتا ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ذکر عموماً ایک عظیم فقیہ، محدث، متکلم، مفتی اور عاشقِ رسول ﷺ کے طور پہ کیا جاتا ہے لیکن ان کی ادبی شخصیت کے بعض پہلو ایسے بھی ہیں جو ابھی مزید تحقیق و توجہ کے متقاضی ہیں۔ ان میں ایک اہم اور قابلِ مطالعہ پہلو ان کا فنِ تلمیح ہے، جو ان کے وسیع مطالعے، غیر معمولی حافظے، دینی و ادبی بصیرت اور فکری گہرائی کا آئینہ دار ہے۔ تلمیح ادب کا وہ لطیف اور مؤثر ہتھیار ہے جس کے ذریعے شاعر یا ادیب مختصر الفاظ میں وسیع تاریخی، قرآنی، حدیثی، مذہبی یا ادبی پس منظر ذہن میں زندہ کر دیتا ہے۔ امام احمد رضا کے یہاں تلمیح محض ایک شعری صنعت نہیں بلکہ معنیٰ آفرینی، فکری ترسیل اور روحانی تاثیر کا ایک مؤثر وسیلہ بن جاتی ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری خصوصاً ’’حدائقِ بخشش‘‘ کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ انہوں نے قرآنی واقعات، انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے حالات، سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف پہلوؤں، صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے تذکروں اور اسلامی تاریخ کے درخشاں ابواب نہایت فنی مہارت کے ساتھ اپنی شاعری میں سموئے ہیں۔ ان کی تلمیحات قاری کے سامنے محض ایک واقعہ نہیں لاتیں بلکہ ایک مکمل روحانی اور فکری منظر نامہ کھول دیتی ہیں۔ امام احمد رضا کی تلمیح نگاری کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ اس میں علمی وسعت اور فنی لطافت ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ وہ تلمیح کو محض اظہارِ فضل کا ذریعہ نہیں بناتے بلکہ اسے جذبۂ عشقِ رسول ﷺ کی ترجمانی، عقائدِ اہلِ سنّت کی توضیح اور معانی کی تہہ داری پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو امام احمد رضا اردو نعتیہ ادب میں تلمیح کے ان منفرد فنکاروں میں شمار ہوتے ہیں جن کے یہاں قرآنی و تاریخی اشارات صرف آرائشِ کلام نہیں بلکہ فکر و احساس کی تشکیل کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ان کی تلمیحات ان کے علم کی وسعت، حافظے کی قوت، ادبی ذوق اور فکری انفرادیت کا ایسا ثبوت ہیں جس پر ابھی مزید تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ یہ موضوع دراصل امام احمد رضا کی ادبی بصیرت کا ایک ایسا گوشہ سامنے لاتا ہے جو ان کی شاعرانہ عظمت اور فکری گہرائی سمجھنے میں نئی راہیں کھول سکتا ہے۔

بشارت سے تعبیر تک: ایک روحانی تسلسل:

تاریخِ اسلام کے بعض ابواب ایسے ہوتے ہیں جنہیں محض واقعات و حوادث کی روشنی میں نہیں بلکہ روحانی اشارات، ربانی بشارات اور اولیائے حق کی بصیرت کے آئینے میں پڑھنا پڑتا ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں زمانوں کے فاصلے سمٹ جاتے ہیں، صدیوں کے پردے اٹھ جاتے ہیں اور مستقبل حال کی طرح روشن دکھائی دینے لگتا ہے۔ برصغیر کی روحانی تاریخ میں گیارہویں صدی ہجری کے وہ عظیم صوفی بزرگ ایک منفرد مقام رکھتے ہیں جو شیراز کی علمی و روحانی فضا سے اٹھ کر حکمِ مصطفوی ﷺ کے تحت ہندستان تشریف لائے۔ ان کی حیاتِ مبارکہ محض دعوت و ارشاد کی ایک داستان نہیں بلکہ ولایت و معرفت کے اس تسلسل کی درخشاں کڑی ہے جس کے اثرات آنے والی صدیوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی نگاہِ ولایت نے نہ صرف اپنے عہد کی اصلاح و رہنمائی کی بلکہ مستقبل کے افق پر طلوع ہونے والے ایک ایسے آفتابِ علم و عرفان کی بھی خبر دی جس کی روشنی نے بعد کے زمانوں میں پورے عالمِ اسلام کو منور کیا۔ زیرِ نظر خصوصی شمارے کا مرکزی موضوع اسی روحانی بشارت اور تاریخی تعبیر سے وابستہ ہے۔ ان بزرگِ کامل نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ولادت سے تقریباً دو صدی قبل ایک عظیم مجدد دین کے ظہور کی بشارت دی اور اس کی بعض ایسی علامات و اوصاف بیان فرمائے جو بعد میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ذاتِ گرامی میں پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوئے۔ یوں ایک روحانی اشارہ، جو اپنے زمانے میں مستقبل کا مژدہ تھا، وقت گذرنے کے ساتھ تاریخ کی ایک روشن حقیقت بن گیا۔

اسی حقیقت کے مختلف پہلو اس شمارے کے متعدد مضامین میں جلوہ گر ہیں۔ ’’بشارتِ مجددیت: ایک روحانی وصیت نامے کا تجزیاتی مطالعہ‘‘، ’’کلاریا شریف سے بریلی شریف تک‘‘، ’’بشارت جو صدیوں بعد حقیقت بن گئی‘‘، ’’مجددیت: بشارت سے تعبیر تک‘‘ اور ’’چراغوں کے درمیان ایک روشنی اور بھی‘‘ دراصل ایک ہی حقیقت کے مختلف عنوانات ہیں۔ ان تحریروں میں اس روحانی پیش گوئی کے تاریخی، فکری اور ولایتی پہلوؤں کا

جائزہ لیا گیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اہلِ بصیرت کی نگاہ کس طرح آنے والے زمانوں کے حقائق کو پہلے ہی پہچان لیتی ہے۔

ان مضامین کے مطالعے سے یہ حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ذات صرف ایک عظیم عالم، فقیہ، محدث اور مصلح کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ان کا ظہور ایک ایسی بشارت کی تعبیر بھی ہے جو ان کی ولادت سے تقریباً دو سو برس پہلے زبانِ ولایت سے صادر ہو چکی تھی۔ گویا کلاریا شریف سے اٹھنے والی ایک صدا نے بریلی شریف میں اپنی تعبیر پائی، ایک چراغ نے دوسرے چراغ کے روشن ہونے کی خبر دی اور ایک روحانی امانت نسلوں کے فاصلے طے کر کے اپنے کامل ظہور تک پہنچ گئی۔

یہ محض ایک تاریخی اتفاق نہیں بلکہ روحانی تاریخ کا وہ تسلسل ہے جس میں اہل اللہ کی بصیرت آنے والے زمانوں کے افق پر ابھرنے والی شخصیات کو پہلے ہی دیکھ لیتی ہے۔ اسی لیے جب اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کی علمی عظمت، فقہی بصیرت، عشقِ رسول ﷺ سے سرشار فکر، تجدیدی خدمات اور امت کی فکری رہنمائی کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنے عہد کے عالم نہیں تھے بلکہ ایک ایسے مشن کے امین تھے جس کی آمد کی خبر صدیوں پہلے دی جا چکی تھی۔ یہی وہ روحانی تسلسل ہے جس کی آخری کڑی میں ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت جلوہ گر ہوئی جس نے اس بشارت کو محض ایک تاریخی واقعہ نہیں رہنے دیا بلکہ اپنے علم، عشق، تحقیق اور تجدیدی کردار سے اسے ایک زندہ حقیقت میں تبدیل کر دیا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی انہی ہمہ گیر شخصیات میں سے ہیں۔ ان کی ذات میں فقہ و افتاء کی بصیرت، عشقِ رسول ﷺ کا سوز و گداز، تحقیق کی دیانت، تصوف کی لطافت اور ملتِ اسلامیہ کے درد کی ایسی جامعیت جلوہ گر ہے جس کی مثالیں تاریخ میں کم ہی دکھائی دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان پہ جتنا لکھا گیا، ان کی عظمت کے اتنے ہی نئے پہلو سامنے آتے گئے اور ہر تحقیق یہ احساس دلاتی رہی کہ اس بحرِ بے کراں کی وسعتیں ابھی مزید غواصی کی متقاضی ہیں۔ زیرِ نظر شمارے کا رضویات سے متعلق حصہ بھی اسی احساسِ عقیدت کے ساتھ نہیں بلکہ اسی جذبۂ تحقیق کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے، تاکہ افکارِ رضا کے چند ایسے گوشے سامنے آسکیں جو ہمارے عہد کے فکری اور تہذیبی مباحث سے براہِ راست تعلق رکھتے ہیں۔

افکارِ رضا: آج کے فکری بحران میں ایک زندہ رہنمائی:

آج کا انسان صرف علمی انتشار ہی کا شکار نہیں بلکہ فکری ابہام، تہذیبی بے سمتی اور اعتقادی اضطراب بھی اس کے سامنے بڑے چیلنج بن کر کھڑے ہیں۔ ایسے ماحول میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی فکر ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ حق کا تعین جذبات سے نہیں بلکہ علم سے ہوتا ہے، محبت کا وقار اتباعِ سنّت سے قائم رہتا ہے اور اعتدال ہی وہ راستہ ہے جو امت کو افراط و تفریط دونوں سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ ''دورِ حاضر میں امام احمد رضا کا موقف ہی دینِ حق'' اسی حقیقت کو تاریخی، اعتقادی اور فکری تناظر میں واضح کرتا ہے۔ یہ مضمون اس امر کا جائزہ لیتا ہے کہ کیوں افکارِ رضا آج بھی اہلِ سنّت کے اعتقادی تشخص، علمی استقامت اور دینی اعتدال کی معتبر تعبیر سمجھے جاتے ہیں، اور کیوں زمانے کے بدلتے ہوئے سوالات کے باوجود ان کی فکر اپنی تازگی اور افادیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔

کسی عظیم شخصیت کو صرف اس کی ایک خدمت یا ایک وصف سے نہیں پہچانا جا سکتا۔ بعض ہستیاں خود ایک مکمل علمی کائنات ہوتی ہیں، جن کے ہر گوشے میں تحقیق کی نئی روشنی، فکر کی نئی جہت اور معرفت کی نئی خوشبو بکھری ہوتی ہے۔ امام احمد رضا کی شخصیت بھی اسی جامعیت کا عنوان ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں فقیہ بھی ہیں، محدث بھی، مفسر بھی، متکلم بھی، عاشقِ رسول ﷺ بھی، صاحبِ قلم بھی اور صاحبِ بصیرت مصلح بھی۔ ''امام احمد رضا کی خصوصیات'' اسی ہمہ گیر شخصیت کے ان امتیازات کو اجاگر کرتا ہے جنہوں نے انہیں اپنے عہد کا مرجعِ علم بنایا اور آنے والی نسلوں کے لیے مینارۂ ہدایت کی حیثیت عطا کی۔ اس مضمون کے مطالعے سے یہ حقیقت مزید واضح ہوتی ہے کہ امام احمد رضا کی عظمت صرف ان کے علمی کارناموں میں نہیں بلکہ ان علوم کے درمیان پیدا کی گئی حیرت انگیز ہم آہنگی میں بھی مضمر ہے۔

افکار رضا ایک زندہ تہذیبی شعور:

کسی مفکر کی عظمت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب اس کے افکار محض کتابوں کے اوراق میں نہیں بلکہ تاریخ کے دھارے میں دیکھے جائیں۔بعض اہلِ علم ایسے ہوتے ہیں جو اپنے عہد کے سوالات کا جواب دیتے ہیں لیکن بعض نابغۂ روزگار شخصیات وہ ہوتی ہیں جو آنے والی صدیوں کے لیے فکر کی بنیادیں استوار کر جاتی ہیں۔ان کی نگاہ صرف اپنے زمانے کے مسائل پہ نہیں ہوتی بلکہ وہ امت کے مستقبل، اس کی تہذیبی شناخت اور اس کی فکری بقا بھی اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں۔اسی لیے ان کی تصنیفات وقتی ضرورتوں کا جواب بن کر نہیں رہتیں بلکہ ایک زندہ منہج، ایک ہمہ گیر فکر اور ایک مسلسل تحریک کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی فکر کا مطالعہ جتنا گہرا ہوتا جاتا ہے، یہ حقیقت اسی قدر واضح ہوتی جاتی ہے کہ انہوں نے صرف فقہی مسائل کے حل پیش نہیں کیے بلکہ امتِ مسلمہ کی تعلیمی، اعتقادی، سماجی، معاشی، اخلاقی اور تہذیبی تعمیر کا ایک جامع تصور بھی عطا فرمایا۔اگر ان کے منتشر ارشادات، عملی خدمات اور اصلاحی ترجیحات کو ایک فکری وحدت میں دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی پوری جدوجہد دراصل دین کے انہی بنیادی اصولوں کی بازیافت کی ایک مسلسل کوشش تھی جن پر قرنِ اوّل کے اصحابِ رسول ﷺ کی زندگیاں استوار تھیں۔ان کے علم میں وہی صداقت، ان کے عمل میں وہی اخلاص، ان کے کردار میں وہی پاکیزگی، ان کی دعوت میں وہی بے غرضی اور ان کے ایمان میں وہی حرارت تھی جس نے پہلی نسل کو تاریخِ انسانیت کی سب سے عظیم جماعت بنا دیا تھا۔وہ دین کو محض کتابوں کے اوراق میں محفوظ دیکھنا نہیں چاہتے تھے؛ وہ چاہتے تھے کہ دین پھر سے زندگی کے اندر سانس لے، کردار میں ظاہر ہو، معاشرے کی سمت متعین کرے اور انسان کو اس کے رب اور اس کے محبوبِ حقیقی، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے وابستہ کر دے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی جدوجہد کا اصل مقصد کسی نئے راستے کا سراغ لگانا نہیں تھا، وہ تو اسی صراطِ مستقیم کی طرف واپسی کا عزم لے کر اٹھے تھے جس پر اصحابِ رسول ﷺ چلے تھے۔ان کے نزدیک اصلاح کا مطلب زمانے کے ساتھ دین کو بدلنا نہیں، بلکہ زمانے کو دین کے بنیادی اصولوں کی طرف واپس لانا تھا۔اسی لیے ان کی فکر میں علم بھی تھا، عمل بھی، شریعت بھی تھی، محبت بھی، فقہ بھی تھی، روحانیت بھی اور ہر چیز کے مرکز میں وہی ایمان، اخلاص، تقویٰ اور عشقِ رسول ﷺ تھا جس نے قرنِ اوّل کو قرنِ طلائی بنا دیا تھا۔

یہی وہ فکری اساس تھی جس نے ان کی جدوجہد کو محض اصلاحی آواز نہیں رہنے دیا بلکہ اسے ایک ہمہ گیر دعوتِ تعمیر میں بدل دیا، ایک ایسی دعوت جس میں دین کی حفاظت، ملت کی بیداری اور معاشرے کی اصلاح ایک ہی مقصد کے مختلف پہلو بن گئے۔

اسی فکری اساس کی عملی صورت ان کے دس نکاتی منشور میں سامنے آتی ہے، جسے اس شمارے میں ''امام احمد رضا: قوم وملت کے ایک دردمند مفکر'' کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ دس نکات محض اصلاحی تجاویز نہیں بلکہ ایک ایسی فکری عمارت کے دس مضبوط ستون ہیں جس کی بنیاد صحیح عقیدہ، علمِ دین، اخلاق، خدمتِ خلق اور عشقِ رسول ﷺ پہ استوار ہے۔صحیح دینی تعلیم اس عمارت کی بنیاد ہے، مدارس ومکاتب اس کے مراکز ہیں، مساجد اس کی روح ہیں، ملت کا اتحاد اس کی قوت ہے، اخلاق اس کا حسن ہے، معاشی خود کفالت اس کی عزت ہے، غرباء ویتامیٰ کی کفالت اس کا قلب ہے، دینی صحافت اس کی زبان ہے اور باطل افکار کا علمی رد اس کی فکری حفاظت ہے۔ان اصولوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ امام احمد رضا کی نظر صرف ایک فرد کی اصلاح پہ نہیں بلکہ ایک صالح، باوقار اور خودشناس امت کی تشکیل پر تھی۔

یہاں امام احمد رضا ایک مفتی سے بڑھ کر ایک معمارِ ملت، ایک فقیہ سے بڑھ کر ایک تہذیب ساز اور ایک مصلح سے بڑھ کر ایک دوراندیش مفکر

کے طور پہ سامنے آتے ہیں۔ ان کے نزدیک دین صرف عبادات کے چند ابواب کا نام نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں الٰہی ہدایت کی جلوہ گری کا نام ہے۔ اسی لیے ان کی فکر میں مسجد بھی ہے، مدرسہ بھی، خانقاہ بھی ہے، بازار بھی، قلم بھی ہے، صحافت بھی، فردکی اصلاح بھی ہے اور امت کی اجتماعی تعمیر بھی۔ یہی جامعیت ان کی فکر کو ہر دور میں زندہ اور ہر نسل کے لیے قابلِ رہنمائی بناتی ہے۔

اس شمارے میں شامل مضمون ''تجدیدِ دین اور عصرِ حاضر کا مذہبی بحران'' ایک ایسے موضوع کی طرف متوجہ کرتا ہے جس پر گفتگو آج پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ تجدیدِ دین کا مطلب دین میں کوئی نئی راہ پیدا کرنا نہیں، بلکہ زمانے کی گرد سے دین کی اصل روشنی کو نمایاں کرنا ہے۔ مجدد شریعت کا شارح ہوتا ہے، شارع نہیں؛ دین کا خادم ہوتا ہے، مخترع نہیں۔

حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''إِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ'' اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر اس امت کے لیے ایسے شخص یا جماعت کو مبعوث فرماتا ہے جو دین کی تجدید کرے۔ حدیثِ پاک کا یہ لفظ ''یبعث'' اپنے اندر ایک پوری حقیقت سمیٹے ہوئے ہے: مجدد بنتا نہیں، بھیجا جاتا ہے۔

مجدد کا فریضہ احیائے سنّت ہے۔ وہ بھولی ہوئی سنّتوں کو زندہ کرتا ہے، شریعت کی روشنی نمایاں کرتا ہے اور امت کو اسلاف کے پاکیزہ منہج کی طرف واپس لاتا ہے۔ وہ ممنوعات کو رواج نہیں دیتا، مکروہات کو شعار نہیں بناتا اور خلافِ سنّت امور کو تجدید کے نام پر تقدس کا ہالہ عطا نہیں کرتا۔ تجدید کا مطلب یہ نہیں کہ زمانے کے ہر نئے چلن کو دین کا حصہ بنا دیا جائے؛ بلکہ یہ ہے کہ دین کے اصل مزاج کو زمانے کے غبار سے محفوظ رکھا جائے۔ مگر ہمارے عہد کا المیہ یہ ہے کہ تجدیدِ دین سے زیادہ مجددیت کے دعوے زیرِ بحث ہیں۔ کہیں عقیدت کسی شخصیت کو مجددین کی صف میں کھڑا کرنا چاہتی ہے، کہیں علمی خدمات کو اس منصب کی دلیل سمجھا جاتا ہے اور کہیں شہرت، مقبولیت اور جدید ذرائعِ ابلاغ کی وسعت کو دینی عظمت کا معیار بنالیا جاتا ہے۔

حالاں کہ تاریخ کا معیار ہمیشہ مختلف رہا ہے۔ وہ القابات نہیں، خدمات دیکھتی ہے؛ نعروں سے نہیں، فتنوں کے مقابل استقامت سے متأثر ہوتی ہے۔ حقیقی مجدد اپنی ذات کے گرد تقدس کا حصار نہیں بناتا، بلکہ امت کو رسولِ اکرم ﷺ کے در سے وابستہ کرتا ہے اور احیائے سنّت کو اپنی جدوجہد کا مرکز بناتا ہے۔

یہ مضمون اسی بنیادی سوال کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ ہمیں مجددیت کے دعوے زیادہ درکار ہیں یا تجدیدِ دین کی حقیقی روح؟ کیونکہ وقت کا سب سے بڑا تقاضا شاید یہی ہے کہ ہم اپنی ذات کے چراغوں کی بجائے چراغِ مصطفیٰ ﷺ کی روشنی کو پہچانیں، اور یہ سمجھیں کہ حقیقی تجدید وہی ہے جو سنّت کو زندہ کرے، شریعت کو مضبوط کرے اور امت کو اس راستے پر واپس لائے جس پر خیر القرون کے مقدس قافلے گامزن تھے۔

مسلکِ اعلیٰ حضرت: ایک تہذیبی و روحانی منہج

جب کوئی فکر اپنے ماننے والوں کے کردار، تہذیب، معاشرت، ذوق، عبادت، اخلاق اور اجتماعی شعور کی تشکیل کرنے لگے تو وہ محض چند علمی آراء کا مجموعہ نہیں رہتی بلکہ ایک زندہ تہذیبی روایت بن جاتی ہے۔ فکر جب انسان کے عقیدے سے گذر کر اس کے کردار میں اترتی ہے، عبادت سے گذر کر اس کے اخلاق کو سنوارتی ہے اور علم سے گذر کر اس کے اجتماعی شعور کو تشکیل دیتی ہے تو وہ صرف ایک فکر نہیں رہتی، ایک مکمل طرزِ زندگی بن جاتی ہے۔

یہی حقیقت زیرِ نظر مضمون ''مسلکِ اعلیٰ حضرت کا تہذیبی و روحانی مطالعہ'' میں پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ اس مطالعے میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مسلکِ اعلیٰ حضرت محض ایک فقہی تعبیر، شخصی انتساب یا برصغیر میں وجود پانے والی کوئی نئی دینی جماعت نہیں بلکہ چودہ سو برس سے جاری مذہب اہلِ سنّت و جماعت کی اسی علمی، روحانی اور تہذیبی روایت کی نئی تعبیر، تجدید اور منظم ترجمانی ہے، جس کی بنیاد قرآنِ کریم، سنتِ نبوی ﷺ، اجماعِ امت اور ائمۂ سلف کے منہج پہ قائم ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کوئی نیا مسلک وضع نہیں کیا بلکہ اپنے عہد کے بدلتے ہوئے فکری، اعتقادی اور تہذیبی چیلنجز کے درمیان اہلِ سنّت کے قدیم منہج کی توضیح، دفاع اور احیا کا عظیم فریضہ انجام دیا۔ اس لیے مسلکِ اعلیٰ حضرت درحقیقت مسلکِ اہلِ

سنّت کی تجدیدی تعبیر اور اس کی علمی و روحانی شناخت کا دوسرا نام ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں یہی حقیقت تاریخی، تہذیبی اور روحانی تناظر میں واضح کی گئی ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی فکر نے برصغیر میں اہلِ سنّت کی علمی روایت کو کس طرح استحکام بخشا، عشقِ رسول ﷺ کو علمی وقار کے ساتھ ہم آہنگ کیا، تصوف کو شریعت کے تابع رکھا اور فقہ، فتویٰ، مدارس، خانقاہوں، دینی صحافت، نعتیہ ادب اور اصلاحِ معاشرہ کے ذریعے ایک ہمہ گیر تہذیبی شعور کو فروغ دیا۔ یہاں مسلکِ اعلیٰ حضرت کو محض عقائد و فقہ کی چند تعبیرات کے مجموعے کے طور پہ نہیں بلکہ علم و عرفان، عشق و ادب، شریعت و طریقت، اعتدال و استقامت اور تہذیبی شعور کے ایک جامع منہج کے طور پہ دیکھا گیا ہے، جس کی جڑیں قرآن و سنّت میں پیوست ہیں اور جس کی شاخیں زندگی کے مختلف شعبوں پہ سایہ فگن دکھائی دیتی ہیں۔

یہ مطالعہ اس بنیادی حقیقت کو بھی اجاگر کرتا ہے کہ مسلکِ اعلیٰ حضرت کی اصل شناخت کسی نئی دینی تشکیل میں نہیں بلکہ اہلِ سنّت کے قدیم علمی ورثے کے تحفظ، تجدید اور مؤثر اظہار میں ہے۔ اس مکتبِ فکر کا انتساب اگرچہ ایک عظیم شخصیت کی طرف ہے، لیکن اس کی بنیاد کسی فرد کی ذاتی رائے پہ نہیں بلکہ چودہ صدیوں پہ محیط اس علمی و روحانی تسلسل پہ قائم ہے جس کی نمائندگی ہر دور میں ائمۂ اہلِ سنّت نے کی ہے اور جسے اعلیٰ حضرت نے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق نہایت بصیرت، قوتِ استدلال اور عشقِ رسول ﷺ کے ساتھ از سرِ نو نمایاں کیا۔

ہر عظیم علمی و ادبی ورثہ صرف اس بات کا محتاج نہیں ہوتا کہ اسے پڑھا جائے، بلکہ اس کا اصل حق یہ ہے کہ اسے سمجھا جائے، اس پہ تحقیق کی جائے، اس کے فکری و فنی محاسن کو دریافت کیا جائے اور اسے ہر دور کی علمی زبان میں نئے سرے سے متعارف کرایا جائے۔ اسی اعتبار سے یہ مضمون مسلکِ اعلیٰ حضرت کی تہذیبی روح، روحانی مزاج، تاریخی تسلسل اور عصری معنویت کو سمجھنے کی ایک سنجیدہ علمی کاوش ہے، ایسی کاوش جو یہ احساس دلاتی ہے کہ زندہ افکار صرف کتابوں میں محفوظ نہیں رہتے، وہ اپنے ماننے والوں کے کردار، تہذیب، عبادت، اخلاق اور اجتماعی زندگی میں سانس لیتے ہیں۔

اسی فکری و تہذیبی ورثے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس سے وابستہ اصطلاحات اور نسبتوں کو بھی ان کے حقیقی تاریخی پس منظر، علمی مفہوم اور تہذیبی سیاق میں دیکھا جائے، کیونکہ کسی بھی زندہ فکری روایت کی درست تفہیم اس کے بنیادی تصورات اور معروف نسبتوں کی صحیح تعبیر کے بغیر ممکن نہیں۔ تاریخ کا انصاف یہ ہے کہ وہ الفاظ کو بھی ان کے زمانے، حالات اور مقاصد کے ساتھ پڑھتی ہے۔ جب یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو حقائق کی جگہ تاویلات اور شناخت کی جگہ اعتراضات جنم لینے لگتے ہیں۔ ''بریلوی'' کی نسبت بھی برصغیر کی مذہبی تاریخ کا ایسا ہی عنوان ہے جس کے گرد بہت کچھ کہا گیا، بہت کچھ سنا گیا مگر کم ہی مواقع ایسے آئے جب اس پر خالص علمی اور تحقیقی انداز میں گفتگو ہوئی ہو۔ زیرِ نظر شمارے میں ایک اہم استفتاء کے مدلل جواب کی روشنی میں اس نسبت کی شرعی حیثیت، تاریخی ارتقا، اکابر اہلِ سنّت کے طرزِ تعامل اور موجودہ دور میں اس کی معنویت کا نہایت متوازن اور مستند جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ مضمون محض ایک لفظ کے دفاع کی کوشش نہیں بلکہ اس علمی روایت کی وضاحت ہے جس نے برصغیر میں عقیدۂ اہلِ سنّت، توحید خالص، محبتِ رسول ﷺ، تعظیمِ صحابہ و اہلِ بیت، محبت اولیاء اور دینی اعتدال کی حفاظت میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ اور اس نسبت کی معنویت کا سب سے روشن مظہر یہ ہے کہ اس سے وابستہ علمی روایت نے صرف عقائد و افکار کی حفاظت ہی نہیں کی بلکہ علم، ادب، تحقیق اور عشقِ رسول ﷺ کے ایسے شاہکار کی تشکیل عمل میں آئی جو برصغیر کی تہذیبی تاریخ کا ناقابلِ فراموش سرمایہ ہیں۔

عظمت کا حق: ابلاغ، تحقیق اور ہماری ذمہ داری

جب کوئی قوم اپنے علمی اور ادبی سرمائے سے زندہ تعلق کھو دیتی ہے تو وہ اس کے نام سے تو وابستہ رہتی ہے مگر اس کے فکر و فن سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہی محرومی آہستہ آہستہ علمی جمود، ادبی سطحیت اور فکری افلاس کو جنم دیتی ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نعتیہ شاعری اردو ادب کا وہ درخشاں باب ہے جس میں عشق و عقیدت کی حرارت، قرآن و حدیث کی معرفت، زبان و بیان کی لطافت، فکر کی گہرائی اور فن کی رفعت ایک حیرت انگیز ہم آہنگی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ لیکن ایک

تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ ان کے کلام کی عظمت کا جس معیار پہ علمی، ادبی اور تنقیدی مطالعہ ہونا چاہیے تھا، وہ اب تک مکمل دیانت داری کے ساتھ سامنے نہیں آسکا۔ عقیدت نے اگرچہ ان کے کلام کو زبانوں پہ زندہ رکھا، مگر تحقیق اسے علمی دنیا میں وہ مقام نہ دلاسکی جس کا وہ بجا طور پر مستحق تھا۔

''کلامِ رضا کا ابلاغ اور ہماری ذمہ داریاں'' اسی احساسِ محرومی، اسی علمی بے توجہی اور اسی فکری کرب کا آئینہ دار مضمون ہے۔ یہ محض ایک تنقیدی مقالہ نہیں بلکہ اہلِ علم، اربابِ قلم، جامعات، مدارس اور رضوی اداروں کے ضمیر سے ایک سنجیدہ مکالمہ ہے۔ قلم کار نہایت دردمندی کے ساتھ یہ سوال اٹھاتا ہے کہ آخر وہ علمی روایت کیوں پروان نہ چڑھ سکی جو امام احمد رضا کی نعتیہ شاعری کے فنی، ادبی، لسانی، عروضی، فکری اور بلاغی محاسن کو عالمی تنقیدی معیار پر پیش کرتی؟ کیوں ''حدائقِ بخشش'' جیسی عظیم شعری کائنات اب بھی اپنے بہت سے علمی اسرار کے انکشاف کی منتظر ہے؟ اور کیوں ہمارے ہاں اس عظیم سرمایۂ ادب پر ہونے والا بیشتر کام اس گہرائی، وقار اور تحقیقی دیانت سے محروم دکھائی دیتا ہے جس کا خود کلامِ رضا تقاضا کرتا ہے؟

یہ مضمون درحقیقت تنقید برائے تنقید نہیں بلکہ تنبیہ برائے تعمیر ہے۔ اس میں ماضی کا نوحہ نہیں بلکہ مستقبل کی دعوت ہے، شکوہ نہیں بلکہ بیداری کی صدا ہے۔ یہ عقیدت مندانِ رضا کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ اگر ہم واقعی امام احمد رضا کے علمی اور ادبی وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ہمیں ان کے کلام کی عظمت کے شایانِ شان تحقیقی، تنقیدی اور ادبی روایت بھی قائم کرنا ہوگی، کیونکہ کسی عظیم شاعر سے محبت کا سب سے معتبر ثبوت اس کے فن کو سمجھنا، اس کے معارف کو عام کرنا اور اس کے معیارِ فکر و فن کو زندہ رکھنا ہے، صرف اس کا نام لینا نہیں۔

یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ ہر علمی روایت کی بقا صرف اس کی تصنیفات سے نہیں بلکہ اس کے امینوں سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر اہلِ علم اپنی ذمہ داری پہچان لیں، اربابِ قلم اپنی تحریر کو امانت سمجھیں، اہلِ درس اپنی مجالس کو تحقیق سے آراستہ کریں اور نئی نسل اپنے اکابر کے علمی سرمائے سے زندہ تعلق قائم کر لے تو کوئی فکری ورثہ کبھی زوال پذیر نہیں ہوتا۔ امام احمد رضا کی فکر بھی اسی وقت اپنی حقیقی معنویت کے ساتھ زندہ رہے گی جب وہ محض حوالوں میں نہیں بلکہ ہمارے مدارس، جامعات، مساجد، خانقاہوں، علمی اداروں، صحافت، تصنیف، تحقیق اور اجتماعی کردار میں جلوہ گر ہوگی۔

عظمت سے ضرورت تک:

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا کا پیغام صرف ایک دور کے لیے نہیں تھا۔ ان کی فکر میں وہ وسعت، توازن اور استحکام موجود ہے جو ہر نئے عہد کے سوالات سے مکالمہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ جتنا آگے بڑھتا ہے، افکارِ رضا کی ضرورت اتنی ہی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ فکری انتشار کے مقابلے میں علمی استدلال، مذہبی انتہا پسندی کے مقابلے میں اعتدال، تہذیبی بے سمتی کے مقابلے میں دینی شناخت اور جذباتیت کے مقابلے میں حکمت و بصیرت --- یہ سب وہ اقدار ہیں جن کی روشن تعبیر ہمیں امام احمد رضا کی فکر میں ملتی ہے۔

ایک علمی امانت، ایک روحانی نسبت

اسی احساس کے ساتھ ''الکوثر'' کا یہ خصوصی شمارہ اپنے قارئین کے سپرد کیا جا رہا ہے۔ ہماری یہ کاوش محض مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک علمی روایت سے تجدیدِ تعلق، ایک روحانی نسبت کی تجدید، ایک تہذیبی شعور کی بازیافت اور ایک عظیم فکری امانت کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کی ادنیٰ سی کوشش ہے۔ اگر اس کے مطالعے سے کسی دل میں علم کی عظمت جاگ اٹھے، کسی ذہن میں تحقیق کا چراغ روشن ہو جائے، کسی نوجوان کے اندر اپنے اکابر کے علمی ورثے کو سمجھنے کا شوق پیدا ہو جائے اور کسی قلم کو دین و ملت کی خدمت کا نیا حوصلہ مل جائے تو ہم سمجھیں گے کہ یہ کاوش اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی۔

کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ بعض شخصیات اپنے عہد کی نہیں ہوتیں، عہد ان کا ہو جاتا ہے، بعض افکار زمانوں کے ساتھ پرانے نہیں ہوتے بلکہ

ہر نئے زمانے کو نئی روشنی عطا کرتے ہیں اور بعض چراغ صرف اپنے گردوپیش کو منور نہیں کرتے بلکہ صدیوں کی تاریکیوں میں بھی مسافروں کو راستہ دکھاتے رہتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ انہی جاوداں چراغوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی فکر علم کی روشنی ہے، ان کا عشق دلوں کی حرارت ہے، ان کی تحقیق عقل کی بصیرت ہے اور ان کی وراثت امت کے لیے وہ امانت ہے جسے ہر نسل کو اگلی نسل تک اسی آب و تاب کے ساتھ منتقل کرنا ہے۔

ان کی ذات میں علم و عرفان، شریعت و طریقت، عشق و تحقیق اور فکر و عمل کی وہ جامعیت جلوہ گر نظر آتی ہے جو مجددانہ شخصیات کا خاصہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا فیضان محض ایک خطۂ زمین یا ایک دورِ زمانہ تک محدود نہیں رہا بلکہ برصغیر سے نکل کر عالمِ اسلام کے فکری اور روحانی افق پر پھیل گیا۔ ان کی تصنیفات، فتاوے، علمی تحقیقات اور عشقِ مصطفی ﷺ سے لبریز تعلیمات آج بھی اسی طرح زندہ ہیں جیسے اپنے عہد میں تھیں۔

یوں یہ خصوصی شمارہ صرف ایک عظیم شخصیت کی حیات و خدمات کا تذکرہ نہیں بلکہ ایک روحانی بشارت، ایک تاریخی حقیقت اور ایک مجددانہ وراثت کے باہمی ربط کا مطالعہ بھی ہے، ایسا مطالعہ جو ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ تاریخ کے بعض ابواب محض واقعات سے نہیں بنتے بلکہ تقدیرِ امت کے ان روشن نقوش سے تشکیل پاتے ہیں جنہیں اہلِ بصیرت اپنے نورِ فراست سے بہت پہلے دیکھ لیتے ہیں۔

یوں یہ خصوصی شمارہ چند تاریخی روایات یا تذکروں کا مجموعہ نہیں بلکہ اس حقیقت کا فکری و تاریخی مطالعہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت اور تجدید کے لیے ہر دور میں ایسے رجالِ حق پیدا فرماتا ہے جن کی آمد سے پہلے ہی اہلِ ولایت ان کی بشارت دے جاتے ہیں۔ جب وقت آتا ہے تو وہ بشارتیں تاریخ بن جاتی ہیں، اشارات تعبیر میں ڈھل جاتے ہیں اور روحانی امانتیں ایک پورے فکری، علمی اور مسلکی دبستان کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اسی نسبتِ روحانی، اسی تسلسلِ ولایت اور اسی بشارتِ مجددیت کی گہرائیوں کو سمجھنے کی ایک سنجیدہ اور بامعنیٰ کوشش اس خصوصی شمارے کی صورت میں قارئین کے سامنے پیش کی جارہی ہے۔ یہ شمارہ دراصل ماضی کی ایک بشارت، حال کی ایک حقیقت اور مستقبل کے لیے ایک فکری امانت کا مطالعہ ہے۔ چنانچہ اس بشارتِ مجددیت، اس روحانی تسلسل اور اس ہمہ گیر علمی ورثے کو نئے زاویۂ نگاہ سے سمجھنے کی آرزو ہی اس خصوصی شمارے کی اصل محرک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شخصیت جتنی وسیع ہے، اس کا احاطہ اتنا ہی دشوار۔ ان کے بارے میں ہر نئی تحریر ایک نئی دریافت کا احساس دلاتی ہے اور ہر مطالعہ یہ باور کراتا ہے کہ ابھی بہت کچھ ایسا ہے جو مزید تحقیق، مزید تدبر اور مزید تفہیم کا طالب ہے۔

وہ ایک ایسی علمی کائنات ہیں جس کے ہر گوشے میں فکر و دانش کی نئی شعاعیں بکھری ہوئی ہیں۔ ان کی ذات محض ایک فرد کی سوانح نہیں بلکہ علوم و معارف، عشق و عرفان اور فقہ و بصیرت کا ایک ہمہ گیر عہد ہے۔ جتنا ان کے افکار میں اترتے جائیں، اتنے ہی نئے دریچے وا ہوتے چلے جاتے ہیں اور جتنا ان کی خدمات کا مطالعہ کریں، اتنا ہی ان کی عظمت کا دائرہ وسیع تر محسوس ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت کا امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اپنے زمانے کی ضرورتوں کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ آنے والے زمانوں کے سوالات کے لیے بھی رہنمائی کا سامان فراہم کر گئے۔ ان کے قلم کی روشنی صرف اپنے عہد تک محدود نہیں رہی بلکہ نسلوں کا فکری سفر منور کرتی رہی ہے۔ اسی لیے ان پر لکھنا دراصل ایک بحرِ بے کراں کے کنارے کھڑے ہو کر اس کی وسعتوں کا اندازہ کرنے کے مترادف ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا پر ہونے والی ہر سنجیدہ کاوش کے اختتام پر بھی احساسِ تکمیل نہیں بلکہ احساسِ آغاز پیدا ہوتا ہے۔ قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے ایک عظیم علمی و روحانی دنیا کی صرف جھلک دیکھی ہے، جب کہ اس کے اندر ابھی بے شمار ایسے خزانے پوشیدہ ہیں جو اہلِ علم کی جستجو، محققین کی کاوش اور اہلِ محبت کی عقیدت کے منتظر ہیں اور یہی کسی عظیم شخصیت کی سب سے بڑی علامت ہوتی ہے کہ زمانہ اس پر لکھتے لکھتے تھک جائے مگر اس کی عظمت کے نئے پہلو کبھی ختم نہ ہوں بلکہ ہر عہد اسے نئے زاویے سے دریافت کرے اور ہر نسل اس کے فیوضِ علم و فکر سے اپنی تشنگی دور کرتی رہے۔ چنانچہ جب زمانے نئے سوالات اور فکری چیلنجوں سے دوچار ہوتے ہیں تو

ایسی ہی ہمہ گیر شخصیات کی فکر، رہنمائی کے لیے پھر سے مرکزِ توجہ بن جاتی ہے۔ آج جب فکری انتشار، تہذیبی بے سمتی اور مذہبی سطحیت کے مختلف مظاہر ہمارے سامنے ہیں تو افکارِ رضا کی طرف مراجعت محض ایک تاریخی شخصیت کو یاد کرنا نہیں بلکہ علم کے وقار، محبت کے آداب، اختلاف کی تہذیب اور اعتدال کی روایت از سرِ نو دریافت کرنا ہے۔ یہ مراجعت ماضی پرستی نہیں بلکہ ان اصولوں کی بازیافت ہے جو ہر دور میں زندہ اور مؤثر رہتے ہیں۔ افکارِ رضا ہمیں سکھاتے ہیں کہ علم اگر اخلاق سے جدا ہو جائے تو محض معلومات کا انبار رہ جاتا ہے اور محبت اگر حکمت سے خالی ہو تو جذباتیت کی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اختلاف اگر تہذیب کے دائرے سے نکل جائے تو معاشرتی انتشار کو جنم دیتا ہے، جبکہ اعتدال ہی وہ راستہ ہے جو فکر کو توازن، کردار کو استحکام اور معاشرے کو ہم آہنگی عطا کرتا ہے۔

افکارِ رضا دراصل عقل و عشق، تحقیق و روایت اور استقامت و وسعتِ نظر کا ایسا حسین امتزاج ہے جو انسان کو اپنی علمی بنیادوں سے وابستہ رکھتے ہوئے زمانے کے سوالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس فکر کا مطالعہ محض ایک عظیم دانشور کی خدمات کا اعتراف نہیں بلکہ ایک ایسے فکری و اخلاقی منہج کی دریافت ہے جو آج بھی دلوں کو روشنی، ذہنوں کو بصیرت اور معاشروں کو توازن فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یوں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی یاد صرف ایک شخصیت کی یاد نہیں بلکہ ایک تہذیبی شعور، ایک علمی روایت اور ایک اخلاقی ورثے کی یاد ہے، ایسا ورثہ جو جتنا کل کے لیے اہم تھا، اتنا ہی آج کے لیے ضروری اور آنے والے زمانوں کے لیے ناگزیر دکھائی دیتا ہے۔

''الکوثر'' کا یہ خصوصی شمارہ اسی احساس کا ایک اظہار ہے، اگر اس کے صفحات قاری کے دل میں علم کے لیے احترام، تحقیق کے لیے شوق اور اکابر امت کے فکری سرمائے سے وابستگی کا جذبہ پیدا کر سکیں تو یہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔

کیونکہ کسی علمی و فکری ورثے کی اصل معنویت اسی وقت آشکار ہوتی ہے جب اس کے پس منظر میں موجود عظیم شخصیات کے اثرات سمجھے جائیں اور ان کے تاریخی و تہذیبی کردار کا صحیح و درست ادراک کیا جائے کہ بعض شخصیات تاریخ کے اوراق میں نہیں رہتیں، تاریخ خود ان کے سائے میں سفر کرتی ہے اور بعض چراغ صرف اپنا عہد تابناک نہیں کرتے بلکہ آنے والی صدیوں کی راہوں میں بھی روشنی بکھیرتے رہتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ علیہ انہی چراغوں میں سے ایک ہیں، وہ ایک فرد نہیں، ایک عہد کا شعور ہیں، ایک نام نہیں، ایک علمی و فکری روایت کا استعارہ ہیں۔ ان کی شخصیت میں علم کی گہرائی، عشقِ رسول ﷺ کی حرارت، تحقیق کی دیانت اور کردار کی استقامت اس طرح یکجا ہو گئی تھی کہ ان کا ذکر محض ایک عالمِ دین کے طور پہ نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت فکری و تہذیبی مظہر کے طور پہ کیا جاتا ہے۔ ان کے قلم نے صرف مسائل حل نہیں کیے، فکر کے نئے زاویے عطا کیے، ان کے فتاوے نے صرف سوالات کے جوابات نہیں دیے بلکہ علمی منہج اور استدلال کی ایک مضبوط روایت قائم کی۔ ان کی شاعری محض جذبات کا اظہار نہیں بلکہ عشق و معرفت کی ایک روشن کائنات ہے اور ان کی علمی خدمات محض اپنے زمانے کی ضرورت نہیں بلکہ آنے والے ادوار کے لیے بھی رہنمائی کا سامان ہیں۔

وقت گذرنے کے ساتھ اکثر شخصیات تاریخ کے فاصلے میں دھندلا جاتی ہیں مگر کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں زمانہ جتنا دور لے جاتا ہے، ان کی عظمت اتنی ہی زیادہ نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی انہی نابغۂ روزگار شخصیات میں سے ہیں جن کے افکار ہر نئے مطالعے کے ساتھ نئی معنویت اور ہر نئی نسل کے سامنے نئی افادیت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان کا مطالعہ ماضی کی ایک یادگار کا مطالعہ نہیں بلکہ ایک زندہ فکری روایت سے مکالمہ ہے، ایسی روایت جو علم کو وقار، محبت کو شعور، عقیدت کو اعتدال اور اختلاف کو تہذیب عطا کرتی ہے۔ یہی وہ امتیاز ہے جو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کو اپنے عہد کے علماء میں ممتاز اور آنے والے زمانوں کے لیے مرجع و مقتدا بناتا ہے۔ یہی زندہ فکری روایت جب زمانے کے بدلتے ہوئے سوالات سے روبرو ہوتی ہے تو ہر عہد میں ایسے اہلِ علم سامنے آتے ہیں جو ماضی کے علمی سرمائے کو حال کی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری زید مجدہ کا مجموعۂ فتاویٰ ''فتاویٰ علیمیہ''، علمی و فقہی تسلسل کا ایک

قابلِ قدر مظہر ہے۔ فقہِ اسلامی کی تاریخ میں بعض مجموعہ ہائے فتاویٰ محض سوالات کے جوابات کا ذخیرہ نہیں ہوتے بلکہ اپنے عہد کے فکری، سماجی اور دینی مسائل کا آئینہ بن جاتے ہیں۔ حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری زید مجدہ کا مجموعۂ فتاویٰ ’’فتاویٰ علیمیہ‘‘ بھی انہی علمی کاوشوں میں شمار کیا جا سکتا ہے جو روایتِ فقہ کی پاسداری کے ساتھ عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل کی تفہیم اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ یہی وہ علمی تسلسل ہے جس نے ہر عہد میں فقہِ اسلامی کو محض ماضی کا ورثہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ہم آہنگ رہنے کی قوت عطا کی۔

یہی فکری وفقہی وراثت جب زمانے کے نئے سوالات سے روبرو ہوتی ہے تو اسے ایسے اہلِ علم کی ضرورت پیش آتی ہے جو روایت کی جڑوں سے وابستہ رہتے ہوئے عصری تقاضوں کو بھی سمجھ سکیں۔ حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری کا مجموعۂ فتاویٰ ’’فتاویٰ علیمیہ‘‘ اسی علمی تسلسل کی ایک قابلِ قدر کڑی ہے۔

یہ مجموعہ اپنے اندر فقہی تحقیق، نصوصِ شرعیہ سے استنباط، اکابر فقہاء کے منہج سے وابستگی اور عصری تقاضوں کے ادراک کا حسین امتزاج رکھتا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مفتی صاحب نے محض مسئلہ بیان کرنے پہ اکتفا نہیں کیا بلکہ جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں دلائل، فقہی اصول اور تطبیقات کے ذریعے مسئلے کی علمی بنیاد بھی واضح کی ہے۔

’’فتاویٰ علیمیہ‘‘ کا مطالعہ یہ احساس دلاتا ہے کہ حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری فقہ کو جامد احکام کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک زندہ اور متحرک علمی روایت سمجھتے ہیں جو ہر دور کے نئے سوالات کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے میں عبادات، معاملات، معاشرت، خاندانی مسائل اور جدید زندگی سے متعلق متعدد سوالات کا ایسا متوازن حل پیش کیا گیا ہے جو شرعی اصولوں سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ عملی زندگی کے تقاضوں سے بھی قریب تر ہے۔ اس مجموعۂ فتاویٰ کی ایک اہم خوبی اس کا سادہ، رواں اور عام فہم اسلوب ہے۔ علمی وقار برقرار رکھتے ہوئے ایسا اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے جس سے خواص کے ساتھ عوام بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ وصف ہر فقیہ کے یہاں نہیں ملتا جو علمی گہرائی کو سہل انداز میں منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

’’فتاویٰ علیمیہ‘‘ کو فقہی بصیرت، تحقیقی دیانت اور عصری رہنمائی کا ایک قابلِ قدر علمی سرمایہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف اہلِ افتاء، طلبۂ علوم دینیہ اور محققین کے لیے مفید ہے بلکہ ان تمام افراد کے لیے بھی رہنما کی حیثیت رکھتی ہے جو بدلتے ہوئے حالات میں شریعت اسلامی کی روشنی میں صحیح راہ متعین کرنا چاہتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مجموعہ روایت اور تجدید، اصول اور تطبیق اور فقہی بصیرت وعصری شعور کے درمیان ایک کامیاب علمی پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فتاوے کی کتابیں محض مسائل واحکام کے مجموعے نہیں ہوتیں بلکہ اپنے عہد کے فکری، سماجی اور دینی شعور کی آئینہ دار بھی ہوتی ہیں۔ ’’فتاویٰ علیمیہ‘‘ اس اعتبار سے ایک ایسی علمی دستاویز ہے جو فقہِ اسلامی کی زندہ روایت، اہلِ سنّت کے علمی منہج اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کے درمیان ایک مضبوط ربط قائم کرتی ہے۔ اس کے صفحات میں جہاں اکابرِ فقہاء کی علمی میراث کی جھلک دکھائی دیتی ہے وہیں ایک صاحبِ بصیرت مفتی کی دوررس نگاہ اور زمانے کے بدلتے ہوئے مسائل پر گہری نظر بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت مفتی اختر حسین قادری مدظلہ العالی کی علمی، فقہی اور دینی خدمات کو شرفِ قبول عطا فرمائے، ان کے علم وفکر کے فیوض مزید عام فرمائے اور اس عظیم علمی سرمائے کو امتِ مسلمہ کے لیے نفعِ عام کا ذریعہ بنائے۔ ہمیں یقین ہے کہ ’’فتاویٰ علیمیہ‘‘ آنے والے زمانوں میں بھی اہلِ علم، اصحابِ افتاء اور عام مسلمانوں کے لیے رہنمائی کا ایک معتبر سرچشمہ بنا رہے گا اور فقہِ اسلامی کے اس روشن تسلسل کو نئی نسلوں تک منتقل کرنے میں اپنا مؤثر کردار ادا کرتا رہے گا۔ یہی کسی علمی تصنیف کی حقیقی کامیابی اور دائمی زندگی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی علمی تصنیف کی اصل قدر اس کے صفحات کی تعداد میں نہیں بلکہ اس فکری وعلمی ورثے میں ہوتی ہے جو اس کے ذریعے نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے اور یہی ورثہ اپنے معماروں کو زمانے کی گردش سے ماورا کر کے دوام عطا کرتا ہے۔

علم کی تاریخ میں بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کا ذکر محض ماضی کی یاد نہیں بلکہ حال کی رہنمائی اور مستقبل کی تعمیر کا عنوان بن جاتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے صفحات تک محدود نہیں رہتیں بلکہ زمانوں کے شعور میں زندہ رہتی ہیں۔ ان کے افکار وقت کی گرد سے دھندلانے کی بجائے ہر نئے دور میں نئی معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں ان کی علمی وروحانی میراث نسلوں کی فکری تشکیل اور تہذیبی شعور کی آبیاری کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی انہی نابغۂ روزگار شخصیات میں سے ہیں جن کی ذات میں علم کی گہرائی، فکر کی وسعت، عشقِ رسول ﷺ کی حرارت، تحقیق کی دیانت اور کردار کی استقامت اس طرح یکجا ہوگئی کہ وہ ایک فرد سے بڑھ کر ایک عہد، ایک دبستان اور ایک زندہ روایت بن گئے۔ ان کی علمی خدمات، فکری بصیرت، روحانی اثرات اور تجدیدی کارنامے آج بھی اہلِ علم و دانش کے لیے سرچشمۂ ہدایت ہیں اور آنے والے زمانوں کے لیے بھی رہنمائی کا سامان فراہم کرتے رہیں گے۔

زیرِ نظر خصوصی شمارہ اسی عظیم علمی وروحانی ورثے کو نئے زاویۂ نظر سے سمجھنے اور سمجھانے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے۔ اگر اس کے صفحات قارئین کو امام احمد رضا کی شخصیت اور افکار کے کسی نئے پہلو سے روشناس کرا سکیں، اگر یہ مطالعہ تحقیق کے نئے دروازے کھول سکے، اگر اس کے ذریعے علم کے لیے احترام، اکابر کے لیے محبت اور فکری ورثے کے ساتھ وابستگی کا جذبہ بیدار ہو سکے تو ہم اپنی اس کاوش کو بارگاہِ الٰہی میں مقبول اور بامقصد سمجھیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی شخصیت ایک ایسے بحرِ بے کراں کی مانند ہے جس کی وسعتوں کا مکمل احاطہ ممکن نہیں۔ ان پر ہونے والی ہر تحقیق ایک نئی دریافت کا احساس دلاتی ہے اور ہر مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ابھی بہت کچھ ایسا باقی ہے جو اہلِ علم کی توجہ، محققین کی جستجو اور اہلِ محبت کی عقیدت کا منتظر ہے اور شاید کسی زندہ علمی وفکری ورثے کی سب سے بڑی معنویت بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ انسان کو صرف ماضی کی عظمتوں سے آشنا نہیں کرتا بلکہ حال کے سوالات کو سمجھنے، اپنے عہد کے بحرانوں کی معرفت اور مستقبل کی سمت متعین کرنے کی بصیرت بھی عطا کرتا ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی فکر کا مطالعہ اگر ہمیں علم، عشق، تحقیق، تہذیبی شعور اور اخلاقی ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے تو یہی احساس ہمیں اپنے گردوپیش کی دنیا سے بے نیاز نہیں رہنے دیتا۔ اس لیے اس خصوصی شمارے میں افکارِ رضا کے مطالعے کے ساتھ عصرِ حاضر کے ان اہم مسائل کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا ہے جو ہمارے اجتماعی شعور، دینی شناخت، انسانی ضمیر اور تہذیبی مستقبل سے براہِ راست تعلق رکھتے ہیں۔

زمانے کا بحران اور قلم کی ذمہ داریاں

افکارِ رضا کا مطالعہ محض ماضی کے ایک عظیم علمی عہد کی بازیافت نہیں بلکہ اپنے عہد کے فکری، اخلاقی اور تہذیبی بحرانوں کو سمجھنے اور ان کے مقابل ایک بااصول، بامقصد اور ذمہ دارانہ موقف اختیار کرنے کی دعوت بھی ہے۔ چونکہ زمانہ صرف واقعات سے نہیں بنتا، افکار سے بھی بنتا ہے اور قومیں صرف اپنی سرحدوں سے نہیں بلکہ اپنے اخلاقی شعور، اجتماعی ضمیر اور تہذیبی رویّوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ جب معاشرے میں قانون کی جگہ جذبات، مکالمے کی جگہ شور، انصاف کی جگہ طاقت اور حقیقت کی جگہ پروپیگنڈا لے لے تو بحران صرف سیاست کا نہیں رہتا، تہذیب کی روح بھی زخمی ہونے لگتی ہے۔ ایسے دور میں قلم کا فرض محض خبر دینا نہیں بلکہ شعور کو بیدار کرنا، سوال اٹھانا اور انسان کو اس کے گم ہوتے ہوئے اخلاقی مرکز کی طرف متوجہ کرنا بھی ہے۔

زیرِ نظر شمارے کے حالاتِ حاضرہ سے متعلق مضامین اسی احساسِ ذمہ داری کا اظہار ہیں۔ ان میں کہیں ہندستان کی مشترکہ تہذیبی روایت کے زخموں کی داستان ہے، کہیں فلسطین کے لہو میں ڈوبے ہوئے عالمی ضمیر کا نوحہ، کہیں حرم کی روحانی فضا میں در آنے والی جدید غفلتوں کا جائزہ ہے اور کہیں میڈیا کی اس دنیا کا محاسبہ ہے جہاں کبھی کبھی سچ بھی قیمت کے ترازو میں تولا جانے لگتا ہے۔

تہذیب کے زخم، انسانیت کا امتحان

ہندستان کی اصل قوت اس کی صدیوں پہ محیط مشترکہ تہذیبی روایت رہی ہے، جسے عرفِ عام میں گنگا جمنی تہذیب کہا جاتا ہے۔اس روایت کی بنیاد مذہبی تنوع کے باوجود باہمی احترام، سماجی ہم آہنگی اور انسانی وقار پہ قائم رہی ہے مگر جب مذہبی جذبات قانون سے بلند دکھائی دینے لگیں اور ہجوم عدالت کا کردار ادا کرنے لگےتو سب سے پہلے تہذیب ہی لہولہان ہوتی ہے۔

''گنگا جمنی تہذیب کے زخم'' اسی دردناک حقیقت کا سنجیدہ جائزہ ہے۔یہ مضمون کسی ایک واقعے کا بیان نہیں بلکہ اس اجتماعی زخم کی قرأت ہے جو قانون کی کمزوری، نفرت کی سیاست اور سماجی بے اعتمادی نے ہندستان کے جسم پہ ثبت کر دیا ہے۔انسانی تاریخ میں ظلم کی سب سے بھیانک صورت وہ ہوتی ہے جب وہ قانون، سفارت اور عالمی ضمیر کی خموشی کا لبادہ اوڑھ لے۔فلسطین آج اسی خموشی کا استعارہ ہے۔بے گناہ جانیں مٹتی رہتی ہیں، بستیاں اجڑتی رہتی ہیں اور انصاف کے دعوے کرنے والی دنیا مصلحت کے حصار سے باہر نہیں نکل پاتی۔

دینی شناخت اور تہذیبی حساسیت

اسی تہذیبی اور فکری تناظر میں ''تہذیبی ارتداد کا خموش سفر'' ایک نہایت اہم اور بیدار کن مضمون ہے، جو عالمی یومِ یوگا کے موقع پہ بعض صاحبانِ جبہ و دستار کے اس طرزِ عمل کا سنجیدہ تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے جنہوں نے اس تقریب میں شرکت کی، اس کے ماحول کا حصہ بنے اور پھر اپنی تصاویر کو سوشل میڈیا پہ فخر کے ساتھ عام کیا۔

یہاں مسئلہ محض کسی تقریب میں شرکت یا کسی تصویر کے نشر کیے جانے کا نہیں بلکہ اس تہذیبی حساسیت کا ہے جو ایک دینی شناخت رکھنے والے فرد سے وابستہ ہوتی ہے۔جب مذہبی شعائر، روحانی تصورات اور مخصوص تہذیبی پس منظر رکھنے والی سرگرمیوں کے ساتھ ایک عالمِ دین یا صاحبِ جبہ و دستار اپنی موجودگی کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے بھی ایک قابلِ قبول نمونہ بن جائے تو سوال صرف ایک فرد کے عمل کا نہیں رہتا بلکہ اس کے اثرات پوری دینی و تہذیبی فضا تک پھیل جاتے ہیں۔

''تہذیبی ارتداد کا خموش سفر'' اسی خطرے کی نشان دہی کرتا ہے کہ تہذیبی تبدیلیاں ہمیشہ نعروں اور اعلانات کے ساتھ نہیں آتیں، کبھی وہ تصویروں، نمائشی شرکتوں، رسمی اختلاط اور سوشل میڈیا کی چند لمحاتی نمائشوں کے ذریعے خموشی سے ذہنوں میں جگہ بناتی ہیں۔آج جو چیز محض ایک تصویر محسوس ہوتی ہے، کل وہ ایک معمول، دو دن بعد قابلِ قبول رویہ اور پھر ایک تہذیبی ترجیح بن سکتی ہے۔یہ مضمون کسی فرد کی تحقیر نہیں بلکہ دینی قیادت کے منصب سے وابستہ ذمہ داریوں کی یاد دہانی ہے۔صاحبانِ جبہ و دستار محض افراد نہیں ہوتے، وہ اپنے ساتھ ایک علمی روایت، ایک دینی شناخت اور ایک تہذیبی امانت لے کر چلتے ہیں۔ان کا ہر قدم، ہر شرکت اور ہر عوامی اظہار اپنے اثرات رکھتا ہے۔اس لیے ان کے لیے یہ سوال ہمیشہ زندہ رہنا چاہیے کہ وہ جس مقام پہ کھڑے ہیں، وہاں ان کی موجودگی صرف ان کی ذات کی نمائندگی کرتی ہے یا ایک پوری دینی روایت کی؟

زیرِ نظر مضمون اسی خموش سفر کے ابتدائی قدموں کو پہچاننے، تہذیبی حساسیت کو بیدار رکھنے اور دینی قیادت کو اس کی اجتماعی ذمہ داری کا احساس دلانے کی ایک سنجیدہ اور فکری کاوش ہے۔

مقدساتِ دین اور ایمان کی سرحدیں

عقیدۂ اہلِ سنّت میں ازواجِ مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ عنہن کا مقام محض تاریخ کا ایک روشن باب نہیں بلکہ ایمان، محبت اور ادب کا لازمی حصہ ہے۔خصوصاً ام المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وہ مقدس ہستی ہیں جن کی پاکیزگی کی گواہی خود قرآنِ کریم نے دی، جن کی زندگی علم، فقاہت، عبادت اور بصیرت کا روشن استعارہ ہے اور جن کی ذات امتِ مسلمہ کے لیے علم و ہدایت کا ایک عظیم سرچشمہ ہے۔

ایسے میں حالیہ دنوں ام المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے تعلق سے کی جانے والی دریدہ دہنی محض کسی فرد کی زبان کی

لغزش نہیں بلکہ دینی شعور، اسلامی تہذیب اور امت کے اجتماعی احساسات کے لیے ایک نہایت سنگین سوال ہے۔ ''ناموسِ ام المؤمنین: ایمان کی سرحد'' اسی افسوس ناک واقعے کے تناظر میں ایک سنجیدہ فکری و دینی محاسبہ ہے، جو یہ واضح کرتا ہے کہ اہلِ بیتِ اطہار اور ازواجِ مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ عنہن کی ناموس کا تحفظ اہلِ ایمان کے لیے کوئی ثانوی مسئلہ نہیں بلکہ عقیدت، محبت اور دینی غیرت کا بنیادی تقاضا ہے۔

یہ مضمون اس امر پہ بھی روشنی ڈالتا ہے کہ اختلافِ رائے، نظریاتی تفاوت اور علمی گفتگو کی اپنی حدود ہیں مگر مقدساتِ دین کی توہین اور امہات المؤمنین رضوان اللہ تعالیٰ عنہن کی شان میں گستاخی کسی بھی صورت میں آزادیِ اظہار یا اختلافِ فکر کے نام پہ قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔ امت کا اجتماعی ضمیر ایسے واقعات پہ خموش رہ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ناموسِ صحابہ واہلِ بیت اور ازواجِ مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی حفاظت بھی اسی ایمانی غیرت کا تسلسل ہے جس نے صدیوں سے امت کے عقیدے اور تہذیب کو محفوظ رکھا ہے۔

یہ تحریر محض مذمت نہیں بلکہ ایک یاددہانی ہے کہ جن مقدس ہستیوں کے ذریعے ہمیں دین، علم اور ہدایت کا نور پہنچا، ان کی عزت و ناموس پہ پہرہ دینا ہماری دینی ذمہ داری بھی ہے اور ایمانی شناخت بھی۔ ام المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ناموس دراصل اس ایمان کی سرحد ہے جس کے اندر محبت، ادب اور عقیدت کا پورا عالم آباد ہے۔

''قانون کے نام پر قتل: عالمی ضمیر کی شکست اور فلسطین کی چیخ'' اسی المیے کا فکری اور اخلاقی محاسبہ ہے، جو قاری کو صرف خبروں سے آگے لے جا کر انسانیت کے اس سوال سے روبرو کرتا ہے جس کا جواب پوری دنیا کو دینا ہے اور فلسطین کی یہ چیخ جب ایک دن، ایک ہفتے یا ایک واقعے کی حد سے نکل کر طویل محاصرے، مسلسل قتلِ عام اور ہزار دنوں پہ پھیلے ہوئے انسانی المیے میں تبدیل ہوجائے تو اس کی داستان صرف عالمی ضمیر کی شکست نہیں رہتی بلکہ غزہ کے ہزار دنوں کے اندھیرے کی ایک مستقل تاریخ بن جاتی ہے۔

''غزہ: ہزار دنوں کا اندھیرا'' تاریخ کے بعض دن صرف کیلنڈر کی تاریخ نہیں ہوتے، وہ انسانیت کے ضمیر پہ ثبت ہونے والے ایسے زخم بن جاتے ہیں جنہیں زمانے کی گردش بھی مٹا نہیں سکتی۔ غزہ کی سرزمین پر ظلم، محاصرہ، بمباری، بھوک اور بے بسی کے جو مسلسل مناظر ایک طویل عرصے سے رقم ہو رہے ہیں، وہ صرف ایک خطۂ ارض کی داستان نہیں بلکہ پوری انسانیت کے اخلاقی دیوالیہ پن کا نوحہ ہیں۔ یہ وہ اندھیرا ہے جس میں بستیاں راکھ ہوگئیں، اسپتال قبرستانوں کا منظر پیش کرنے لگے، مدارس اور مساجد ملبے کے ڈھیر بن گئے اور معصوم صفت بچوں کی چیخیں عالمی سیاست کے ایوانوں میں بھی سنائی نہ دیں۔

غزہ کا المیہ صرف اس لیے دردناک نہیں کہ وہاں ہزاروں بے گناہ انسان شہید ہوئے، بلکہ اس لیے بھی کہ دنیا نے اپنے تمام بلند بانگ دعووں، انسانی حقوق کے منشوروں اور بین الاقوامی انصاف کے نعروں کو خود اپنے ہاتھوں دفن کردیا۔ طاقت کا معیار انصاف نہیں بلکہ مفاد بن گیا اور مظلوم کا خون عالمی ضمیر کے لیے محض ایک خبر رہ گیا۔ اس اندھیرے میں اگر کوئی روشنی باقی ہے تو وہ اہلِ ایمان کے دلوں میں جلنے والا وہ چراغ ہے جو ظلم کے سامنے سرنگوں ہونے سے انکار کرتا ہے۔ غزہ نے ثابت کردیا ہے کہ ایمان، استقامت اور قربانی ایسی قوتیں ہیں جنہیں بارود اور بم ختم نہیں کرسکتے۔ شہداء کے لہو سے سینچی ہوئی یہ سرزمین آج بھی امت کو عزت، غیرت اور ثابت قدمی کا سبق دے رہی ہے۔

زیرِ نظر شمارے میں غزہ کے اسی المیے کو محض ایک سیاسی واقعہ نہیں بلکہ ایک دینی، اخلاقی اور انسانی مسئلہ سمجھتے ہوئے مختلف زاویوں سے پیش کیا گیا ہے، تاکہ قاری اس سانحے کو اعداد و شمار کی سرد دنیا میں نہیں بلکہ امت کے زخمی قلب کی دھڑکن کے طور پہ محسوس کرسکے۔

''الکوثر'' کا یہ شمارہ صرف غزہ کے غم کا ترجمان نہیں بلکہ اس یقین کا بھی اعلان ہے کہ ظلم خواہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو، اس کی مدت محدود ہوتی ہے، جبکہ حق کی روشنی ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ ہزار دنوں کا یہ اندھیرا بھی ایک دن صبحِ فتح پر منتج ہوگا، کیونکہ تاریخ کا فیصلہ ہمیشہ طاقت کے ہتھیار نہیں بلکہ حق، صبر اور قربانی کا لہو لکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اہلِ غزہ کی نصرت فرمائے، شہداء کے درجات بلند کرے، زخمیوں کو شفا عطا فرمائے اور امتِ مسلمہ کو ایسی بصیرت، وحدت اور جرأت عطا فرمائے جو اسے اپنے مظلوم بھائیوں کی حقیقی نصرت کے قابل بنادے۔ آمین۔

عبادت نمائش اور روحانی خلوت کا بحران:

غزہ کے مظلوموں کی نصرت کے لیے جس بصیرت، وحدت اور بیداری کی دعا کی گئی ہے، وہ صرف میدانِ سیاست اور عالمی ضمیر کی بیداری تک محدود نہیں، اس کا ایک اہم پہلو انسان کی اپنی ذات، اپنے شعور اور اپنی روحانی ترجیحات کی اصلاح بھی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عصرِ حاضر کی ٹیکنالوجی، اپنی تمام تر سہولتوں کے باوجود، انسان کے باطن اور اس کی عبادات کے آداب کے سامنے ایک نیا سوال بن کر کھڑی ہوتی ہے۔

دوسری طرف جدید ٹیکنالوجی نے جہاں زندگی میں بے شمار آسانیاں پیدا کی ہیں، وہیں اس نے انسان کی باطنی یکسوئی اور روحانی خلوت کو بھی ایک نئے امتحان سے دوچار کر دیا ہے۔ عبادت، خشوع اور حضوریِ قلب جیسے روحانی تصورات اس عہد میں صرف نفس کی غفلت سے نہیں بلکہ کیمرے کی آنکھ اور موبائل کی اسکرین سے بھی نبرد آزما ہیں۔ ''حرم کی خموشی اور موبائل کا شور'' اسی بدلتے ہوئے روحانی منظر نامے کا نہایت لطیف مگر بیدار کن مطالعہ ہے، جس میں مسلم معاشرے میں بڑھتی ہوئی خودنمائی اور عبادت کے مناظر کو نمائش میں تبدیل کر دینے کے رجحان پہ سنجیدہ تنقید کی گئی ہے۔

آج صورتِ حال یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ موبائل کے شور نے عبادت کی خموشی کو دفن کرنا شروع کر دیا ہے۔ طواف جاری ہے مگر نگاہیں کعبہ کی عظمت سے زیادہ کیمرے کے زاویے کی تلاش میں ہیں، احرام کی سادگی اور بندگی کے لباس کو بھی کبھی کبھی تصویری نمائش کا عنوان بنا دیا جاتا ہے، مساجد میں دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینے والے بعض افراد بھی عبادت، نصیحت اور اصلاح کے لمحات کو ویڈیو کلپس میں محفوظ کرنے اور دنیا تک پہنچانے کی ایسی بے قراری میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں جیسے اصل مقصد عبادت نہیں، اس کی تشہیر ہو۔ حیرت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب صاحبانِ جبہ ودستار بھی اس عمل میں اس انہماک کے ساتھ مشغول نظر آتے ہیں گویا کوئی بڑا دینی فریضہ انجام دیا جا رہا ہو۔

یہ مضمون کسی مفید ٹیکنالوجی کی مخالفت نہیں بلکہ اس سوال کا آئینہ ہے کہ جب عبادت بھی نمود ونمائش کی آرزو سے آلودہ ہونے لگے تو بندہ اپنے رب کے لیے عبادت کر رہا ہے یا دنیا کے لیے اپنی عبادت دکھا رہا ہے؟ حرم کی عظمت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ بعض مقامات پہ پہنچ کر انسان کو اپنے وجود سے بھی آگے نکلنا ہوتا ہے۔ وہاں تصویر سے زیادہ حضوری، ریکارڈنگ سے زیادہ خشوع اور دنیا کو دکھانے سے زیادہ اپنے رب کے سامنے جھکنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ بعض مقدس مقامات کی عظمت صرف وہاں پہنچ جانے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اپنے دل کو بھی وہاں حاضر کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

شور کے عہد میں سچ کی تلاش:

آج رائے عامہ بھی ایک صنعت بنتی جا رہی ہے۔ مباحث کبھی حقیقت کی تلاش کے لیے ہوتے تھے، اب بعض اوقات مفادات کی حفاظت کے لیے بھی ہونے لگے ہیں۔ جب دلیل سرمائے کی محتاج ہو جائے اور آوازیں خریدی جانے لگیں تو معاشرے میں صرف سچ ہی نہیں، معنیٰ بھی زخمی ہوتے ہیں۔ ''الفاظ کے شور میں معنیٰ کی شکست'' میڈیا، فکری آزادی اور اخلاقی ذمہ داری کے اسی پیچیدہ تعلق کا ایک گہرا تجزیہ پیش کرتا ہے، تاکہ قاری شور کے اس ہجوم میں بھی سچ کی آواز پہچان سکے۔ بعض نسبتیں تاریخ میں صرف دو مقامات، دو شخصیات یا دو اداروں کے درمیان قائم نہیں ہوتیں بلکہ وہ ایک پورے روحانی تسلسل کی علامت بن جاتی ہیں۔ مارہرہ شریف اور بریلی شریف کا تعلق بھی ایسی ہی ایک مبارک نسبت ہے، جس میں خانوادۂ برکات کا روحانی فیض، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی علمی وفکری عظمت اور عشقِ رسول ﷺ کی وہ تابانی یکجا نظر آتی ہے جس نے برصغیر کی دینی تاریخ کو ایک نئی معنویت عطا کی۔ اس نسبت کی سب سے روشن تاریخی شہادت حضور خاتم الاکابر حضرت سید شاہ آلِ رسول مارہروی قدس سرہٗ کا وہ وصیت نامہ ہے جس میں انہوں نے اپنی اور اپنے مشائخ کی تمام تصانیف کے بارے میں امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کو ایسا غیر معمولی اختیار عطا فرمایا کہ ان کے حذف واضافہ کو اپنی اور اپنے مشائخ کی طرف سے حذف واضافہ قرار دیا اور اس اعتماد کو ''بارگاہِ نبوی ﷺ سے عطا شدہ'' قرار دیا۔ یہ وصیت نامہ محض ایک خانقاہی ہدایت نہیں، مارہرہ شریف اور بریلی شریف کے درمیان

قائم اس علمی و روحانی رشتے کی تحریری شہادت ہے جس نے نسبت کو علم، علم کو بصیرت اور بصیرت کو عشقِ رسول ﷺ سے وابستہ کیا۔
''اصلاحِ معاشرہ اور حضور مفتی اعظم ہند'' کے عنوان سے شامل مضمون اسی وصیت نامے کی روشنی میں اس تاریخی اعتماد، فکری نیابت اور روحانی نسبت کا مطالعہ پیش کرتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی عظمت کا ایک روشن باب ان کی برکاتی نسبت بھی ہے۔ یہ وہ نسبت ہے جسے تاریخ نے محفوظ رکھا، اکابر نے اپنے قلم سے سند عطا فرمائی اور اہلِ بصیرت آج بھی جسے محض تعلق نہیں، ایک امانت سمجھتے ہیں، مارہرہ شریف اور بریلی شریف کا وہ رشتہ جس پر مدینے کی نظر ہے۔

لفظ جب عشق کی امانت بن جائے:

علم اگر عقل کو جلا دیتا ہے تو ادب دل کو زندگی بخشتا ہے۔ تحقیق حقائق تک رسائی کا وسیلہ بنتی ہے مگر ادب ان حقائق میں احساس، لطافت اور تاثیر کی روح پھونک دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امتوں کی فکری تاریخ صرف فقہ، تفسیر اور فلسفے سے نہیں بنتی بلکہ ان یادوں، شخصیتوں اور ادبی روایتوں سے بھی تشکیل پاتی ہے جو نسلوں کے ذوق، شعور اور احساس کی آبیاری کرتی رہتی ہیں۔ خصوصاً نعتیہ ادب تو اردو زبان کا وہ مقدس باب ہے جہاں عشق، عقیدہ اور ادب ایک دوسرے میں اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ الفاظ عبادت کا پیرایہ اختیار کر لیتے ہیں اور قلم، محبتِ مصطفیٰ ﷺ کی امانت بن جاتا ہے۔ زیرِ نظر شمارے کا ادبی حصہ بھی اسی احساس کا مظہر ہے۔ یہاں تحقیق بھی ہے، یادوں کی خوشبو بھی، اور ان شخصیات کا تذکرہ بھی جنہوں نے اپنے علم، قلم اور کردار سے ایک پورے عہد کی فکری و تہذیبی تشکیل میں حصہ لیا۔
نعتیہ شاعری کی پوری روایت عشقِ رسول ﷺ کے بے شمار رنگوں سے مزین ہے مگر ان میں استغاثہ کا رنگ اپنی معنوی گہرائی اور روحانی تاثیر کے اعتبار سے منفرد مقام رکھتا ہے۔ یہ محض عرضِ حاجت نہیں بلکہ بندے کے عجز، امید، محبت اور کامل اعتماد کا ایسا اظہار ہے جو بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں ادب و عقیدت کے ساتھ پیش ہوتا ہے۔ ''نعتیہ شاعری میں استغاثے کی روایت'' اسی لطیف ادبی و روحانی روایت کا تحقیقی مطالعہ ہے، جس میں اردو نعت کے اس اہم پہلو کی تاریخی، فنی اور فکری جہات کو نہایت دل نشیں انداز میں واضح کیا گیا ہے۔

یادوں کے چراغ اور تربیت کی خوشبو:

بعض شخصیتیں اپنی تصانیف سے زیادہ اپنے اخلاق، اپنی شفقت اور اپنی مجلسوں کے ذریعے دلوں میں گھر کر لیتی ہیں۔ وقت گذرتا ہے، محفلیں بکھر جاتی ہیں مگر ان کی یادوں کی خوشبو زمانے کی گرد سے کبھی مدھم نہیں ہوتی۔ ''جن کے سائے میں صبا چلتی تھی'' ایسی ہی دو عظیم علمی و روحانی شخصیتوں، خطیبِ مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور فخرِ بہار حضرت علامہ محمد میاں کامل سہسرامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی یادوں کا ایک ایسا مرقع ہے جس میں سوانح سے زیادہ تعلق کی حرارت، واقعات سے زیادہ محبت کی روشنی اور تاریخ سے زیادہ ایک معصوم صفت بچے کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ یہ صرف ایک یادداشت نہیں بلکہ ایک پورے علمی ماحول، ایک تہذیبی فضا اور اکابر کی تربیت یافتہ نسل کے احساسات کی داستان ہے۔

قلم: خبر سے آگے، ایک فکری امانت:

تاریخ میں کچھ چراغ ایسے ہوتے ہیں جو صرف اپنی روشنی سے نہیں بلکہ دوسروں کو روشن کرنے کی صلاحیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی تحریریں محض الفاظ نہیں ہوتیں بلکہ تحریک بن جاتی ہیں، ان کا قلم صرف خبر نہیں دیتا بلکہ شعور پیدا کرتا ہے اور ان کی صحافت محض پیشہ نہیں بلکہ دعوت و اصلاح کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ''مذہبی صحافت: خونِ دل سے روشن چراغ'' قائدِ اہلِ سنّت حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اسی درخشاں صحافتی زندگی کا مؤثر تذکرہ ہے۔ اس مضمون میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح انہوں نے قلم کو ملت کی امانت، صحافت کو دینی خدمت اور تحریر کو

فکری بیداری کا وسیلہ بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے اہلِ قلم اپنی زندگی میں مضامین نہیں لکھتے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے فکری چراغ روشن کر جاتے ہیں اور انہی روشن چراغوں کی لو سے علم و تحقیق کا سفر آگے بڑھتا ہے۔

افکار رضا کی معاصر معنویت:

تاریخِ اسلام میں بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کا ذکر صرف ان کے عہد تک محدود نہیں رہتا بلکہ ہر آنے والا زمانہ انہیں اپنے سوالات کے آئینے میں نئے سرے سے دریافت کرتا ہے۔ وہ وقت کی گرد میں اوجھل نہیں ہوتیں بلکہ زمانے کی گردش کے ساتھ ان کی معنویت مزید نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان کی فکر جامد روایت نہیں بنتی بلکہ ایک زندہ شعور کی صورت اختیار کر لیتی ہے، ایسا شعور جو بدلتے ہوئے حالات میں بھی اپنے اصولوں کی روشنی سے راہیں متعین کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت کی علمی تاریخ میں بعض نام افراد کے نہیں بلکہ دبستانوں، مناہج اور تہذیبی روایتوں کے عنوان بن جاتے ہیں اور جب تاریخِ اسلام کے ان تابندہ ناموں کی صف میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ذکر آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی ایک شخصیت کا تذکرہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک ایسے عہد کی بازیافت کر رہے ہیں جس میں علم عبادت تھا، تحقیق امانت تھی، عشقِ رسول ﷺ زندگی کا جوہر تھا، ادب عقیدت کا قرینہ تھا اور فکرِ دین ملت کی ذمہ داری سے جدا نہ تھی۔ اعلیٰ حضرت کی ذات نے علم کو عشق سے، عشق کو ادب سے، ادب کو عمل سے اور عمل کو خدمتِ دین سے اس طرح مربوط کیا کہ ان کی شخصیت ایک فرد کی حدود سے بلند ہو کر ایک مکمل علمی، روحانی اور تہذیبی روایت بن گئی۔ ان کے افکار کا مطالعہ ہمیں صرف یہ نہیں بتاتا کہ ایک عظیم عالم نے اپنے عہد کے سوالات کا جواب کیسے دیا، یہ بھی سکھاتا ہے کہ ہر عہد کے اہلِ ایمان کو اپنے زمانے کے فتنوں، فکری انتشار اور تہذیبی چیلنجوں کے سامنے اپنے ایمان، اپنے علم، اپنی نسبت اور اپنے اخلاق کے ساتھ کس طرح کھڑا ہونا چاہیے۔ یہی وہ زندہ معنویت ہے جس نے اعلیٰ حضرت کو ماضی کا ایک روشن باب نہیں بلکہ حال کی ایک بیدار آواز اور مستقبل کے لیے ایک روشن سمت بنا دیا ہے۔

''الکوثر'' کا یہ خصوصی شمارہ اسی زندہ نسبت کے حضور ایک ادنیٰ نذرانہ ہے۔ اس کے صفحات میں جہاں تحقیق کی روشنی ہے، وہاں عقیدت کی حرارت بھی، جہاں تاریخ کی شہادت ہے، وہاں فکر کی تازگی بھی، جہاں علمی گفتگو ہے، وہاں عشقِ رسول ﷺ کی وہ خوشبو بھی جو اعلیٰ حضرت کی پوری زندگی اور فکر کا بنیادی جوہر ہے۔ ہم نے اس شمارے کے ذریعے ایک عظیم شخصیت کو مکمل طور پہ سمیٹنے کا دعویٰ نہیں کیا، کیونکہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وہ بحرِ بے کراں ہیں جس کی ہر موج ایک نئی دنیا اپنے اندر رکھتی ہے، البتہ یہ ضرور چاہا ہے کہ اس بحر کی چند لہروں کو عصرِ حاضر کے قارئین تک پہنچا دیا جائے۔

اگر اس شمارے کا کوئی مضمون کسی دل میں علم کی طلب پیدا کر دے، کسی ذہن میں تحقیق کا چراغ روشن کر دے، کسی نوجوان کو اپنے علمی و روحانی ورثے سے وابستہ کر دے، کسی صاحبِ نسبت کے عشق کو تازگی عطا کر دے اور کسی بے سمت فکر کو اعلیٰ حضرت کے علمی و اخلاقی منہج کی طرف متوجہ کر دے تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری یہ کاوش اپنے مقصد سے ہم کنار ہو گئی۔

یہ شمارہ ختم نہیں ہوتا؛ یہاں سے ایک سفر شروع ہوتا ہے۔۔ اس شخصیت کی طرف جس نے اپنے عہد کو علم دیا، امت کو بصیرت دی، عشقِ رسول ﷺ کو زبان دی اور آنے والی نسلوں کو ایک ایسا فکری و روحانی چراغ عطا کیا جس کی روشنی آج بھی باقی ہے۔ ہم اسی چراغ کے سامنے ادب سے کھڑے ہیں، اسی نسبت سے اپنی شناخت پاتے ہیں اور اسی امید کے ساتھ یہ صفحات اہلِ علم و محبت کی خدمت میں پیش کرتے ہیں کہ:

چراغِ رضا جلتا رہے، نسبتوں کے قافلے چلتے رہیں، اور عشقِ رسول ﷺ کی یہ روشنی زمانوں کے سینوں میں اترتی رہے۔

آپ کا اپنا

محمد ملک الظفر سہسرامی

محمد ملک الظفر سہسرامی

گنگا جمنی تہذیب کے زخم

گاؤکشی، نفرتی سیاست اور زخم خوردہ انسانیت

بعض مسائل محض سیاسی یا مذہبی مباحث کے عنوان نہیں ہوتے بلکہ قوموں کے اخلاقی شعور اور انسانی رویّوں کا امتحان بن جاتے ہیں۔ گاؤکشی کا مسئلہ بھی برصغیر کی تاریخ میں ایک ایسا ہی حساس عنوان رہا ہے، جسے مختلف ادوار میں مذہبی جذبات، سماجی روایتوں اور سیاسی مفادات کے ساتھ جوڑ کر استعمال کیا گیا۔ وقت کے ساتھ یہ موضوع صرف ایک فقہی یا معاشرتی بحث نہ رہا بلکہ ایک ایسا تہذیبی اور نفسیاتی استعارہ بن گیا جس کے گرد اشتعال، خوف اور تقسیم کی فضا پیدا ہوتی رہی۔

یہ تحریر اس مسئلے کو جذباتی نعروں سے الگ ہو کر تاریخی شعور، انسانی احترام، آئینی توازن اور قومی ہم آہنگی کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ جب حساس موضوعات کو مکالمے اور حکمت کی بجائے نفرت، ہجوم اور سیاسی مفادات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو سب سے زیادہ نقصان عام انسان، سماجی اعتماد اور انسانی اقدار کو پہنچتا ہے۔ مضمون کا مرکزی سوال یہی ہے کہ کسی بھی مہذب معاشرے کی اصل پہچان طاقت اور نعروں سے نہیں بلکہ انسان کی حرمت، انصاف اور باہمی احترام سے ہوتی ہے۔

ہندستان ایک ایسا ملک ہے جہاں صدیوں سے مختلف تہذیبیں ساتھ ساتھ چلتی رہی ہیں۔

یہ وہ سرزمین ہے جہاں مندروں کی گھنٹیاں بھی بجتی رہی ہیں، مسجدوں سے اذانیں بھی بلند ہوتی رہی ہیں، گرجا گھروں میں دعاؤں کے نغمے بھی گونجتے رہے ہیں، گوردواروں سے کیرتن کی صدائیں بھی اٹھتی رہی ہیں اور بودھ، جین، سکھ، عیسائی اور صوفی روایتوں نے بھی اس دھرتی کو محبت، رواداری اور مشترکہ انسانیت کے چراغوں سے روشن رکھا ہے۔

یہ سرزمین صرف جغرافیے کا نام نہیں بلکہ رنگا رنگ روایتوں، مختلف عقیدوں، گوناگوں زبانوں اور متنوع ثقافتوں کے ایک عظیم انسانی قافلے کا نام ہے، جس نے نظریاتی اختلاف کے باوجود ساتھ جینے کا ہنر سیکھا ہے۔

یہاں گنگا کے کناروں پر عبادت کے دیے بھی روشن ہوتے رہے، صوفیوں کی خانقاہوں سے محبت و رواداری کے چراغ بھی جلتے رہے ہیں، گوردواروں سے محبت و خدمت کی خوشبو بھی پھیلتی رہی ہے، گرجا گھروں کی دعائیں بھی فضا میں امن کا احساس بکھیرتی رہی ہیں اور بودھ و جین روایتوں کی خموش حکمت بھی اس دھرتی کو صبر، برداشت اور انسان دوستی کا درس دیتی رہی ہے۔

یہ وہ دھرتی ہے جہاں تہذیب نے صرف عمارتیں نہیں بنائیں بلکہ دلوں کے درمیان راستے بھی قائم کیے۔

جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شرکت کی، تہواروں کی خوشیاں آپس میں تقسیم کیں اور صدیوں کے میل جول سے ایک مشترکہ سماجی فضا تشکیل دی۔

ہندستان کی اصل طاقت اس کی یک رنگی میں نہیں بلکہ اسی تنوع میں پوشیدہ ہے۔

یہ تنوع کبھی کمزوری نہیں رہا بلکہ اس تہذیب کی سب سے بڑی معنوی قوت ثابت ہوا ہے۔ کیونکہ وہ معاشرے زیادہ دیر قائم رہتے

ہیں جو اختلاف کو دشمنی نہیں بناتے بلکہ اسے باہمی احترام اور اجتماعی بقا کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ اسی لیے اس سرزمین کی روح ہمیشہ یہ پیغام دیتی رہی ہے کہ نفرت کے شور سے وقتی ہنگامے تو پیدا کیے جاسکتے ہیں مگر پائیدار معاشرے صرف محبت، انصاف، برداشت اور باہمی اعتماد کی بنیاد پر ہی تعمیر ہوتے ہیں۔

یہ وہ سرزمین ہے جہاں مختلف مذاہب، مختلف زبانیں اور مختلف تہذیبی روایتیں ایک ہی فضا میں سانس لیتی رہی ہیں۔

یہاں عقیدے الگ رہے مگر انسانی رشتوں کی حرارت مشترک رہی، عبادات کے طریقے مختلف رہے مگر محبت، احترام اور باہمی وابستگی کے جذبات ایک دوسرے سے جڑے رہے۔

صدیوں کے اس تہذیبی سفر نے ہندستان کو محض ایک سیاسی وحدت نہیں رہنے دیا بلکہ اسے ایک ایسی زندہ تہذیب میں تبدیل کر دیا جس کی روح کثرت میں وحدت کے احساس سے روشن ہوتی ہے۔

یہاں زبانیں بدلتی رہیں مگر جذبات کی مٹھاس باقی رہی، لباس مختلف رہے مگر تہذیب کی شائستگی مشترک رہی اور رسوم و روایات کے تنوع کے باوجود ایک ایسی اجتماعی فضا قائم رہی جس میں انسان کو اس کے مذہب سے پہلے اس کی انسانیت کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا۔

اسی لیے اس سرزمین کی گلیوں میں صرف بازار آباد نہیں ہوئے بلکہ صدیوں کی مشترکہ یادیں، باہمی تعلقات اور تہذیبی اعتماد بھی پروان چڑھتا رہا۔ برصغیر کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ یہاں تصادم سے زیادہ اشتراک نے تہذیب کو زندہ رکھا ہے۔

صوفیوں کی خانقاہیں ہوں یا سنتوں کے آشرم، ادیبوں کی محفلیں ہوں یا عوامی تہوار۔۔ ہر جگہ ایک ایسی فضا محسوس ہوتی رہی جس میں اختلاف کو نفرت نہیں بلکہ تنوع سمجھا جاتا تھا۔

یہی وہ شعور تھا جس نے اس سرزمین کو بار ہا ٹوٹنے سے بچایا اور اسے محض زمین کا ٹکڑا نہیں بلکہ تہذیبی ہم آہنگی کی ایک زندہ مثال بنا دیا۔ لیکن افسوس کہ بعض اوقات یہی تنوع سیاسی مفادات کی بھٹی میں ڈال دیا جاتا ہے اور پھر مذہبی جذبات کو انسانی ہمدردی پر فوقیت دے کر معاشرے کو نفرت کی ایسی آگ میں جھونک دیا جاتا ہے جس کی لپیٹ میں سب کچھ جل کر تباہ ہو جاتا ہے۔

پھر اختلاف صرف رائے کا فرق نہیں رہتا بلکہ شناختوں کی دیوار بن جاتا ہے۔

لفظوں میں تلخی بڑھنے لگتی ہے، دلوں میں بدگمانیاں جنم لینے لگتی ہیں اور وہ سماجی اعتماد۔۔ جو صدیوں کے میل جول سے تشکیل پاتا ہے۔۔ آہستہ آہستہ کمزور ہونے لگتا ہے۔ ایسے ماحول میں سب سے پہلے انسان کی انفرادی پہچان مٹنے لگتی ہے۔ لوگ اپنے کردار، اخلاق اور انسانیت سے زیادہ اپنے مذہبی یا سماجی خانوں میں تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔ پھر ایک فرد کا جرم پوری برادری کا بوجھ بن جاتا ہے اور ایک افواہ سیکڑوں رشتوں کو مشتبہ بنا دیتی ہے۔

یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب سیاست وقتی فائدہ تو حاصل کر لیتی ہے مگر معاشرہ اپنے باطن میں ایک گہرا زخم لے لیتا ہے۔

نفرت کی آگ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ صرف مخالف کو نہیں جلاتی بلکہ جلانے والے کا اخلاقی وجود بھی دھیرے دھیرے راکھ کر دیتی ہے۔

جب معاشرے مسلسل خوف، اشتعال اور انتقام کی فضا میں سانس لینے لگیں تو وہاں انصاف کمزور پڑنے لگتا ہے، مکالمہ خموش ہونے لگتا ہے اور برداشت ایک اجنبی صفت بننے لگتی ہے۔ پھر تہذیب کے چہرے سے وہ نرمی، وہ کشادگی اور وہ انسانی وقار چھننے لگتا ہے جو کسی بھی مہذب معاشرے کی اصل شناخت ہوتا ہے۔

اسی لیے تاریخ ہمیشہ یہ سبق دیتی ہے کہ مذہبی جذبات کا احترام اپنی جگہ ضروری ہے مگر جب ان جذبات کو نفرت، تقسیم اور سیاسی مفاد کا ایندھن بنا دیا جائے تو سب سے زیادہ نقصان خود انسانیت اٹھاتی ہے اور انسانیت کا زخم وہ زخم ہوتا ہے جس کی گونج نسلوں تک سنائی دیتی رہتی ہے۔ گاؤ کشی کا مسئلہ بھی ہندستان میں محض ایک مذہبی یا معاشرتی مسئلہ نہیں رہا بلکہ رفتہ رفتہ اسے ایک خطرناک سیاسی ہتھیار میں تبدیل کر دیا گیا۔ ایسا ہتھیار جس کے ذریعے جذبات کو بھڑکایا گیا، نفرت کو منظم کیا گیا اور انسانوں کے درمیان دیواریں کھڑی کی گئیں۔ پھر آہستہ آہستہ اختلافِ رائے کو دشمنی میں، تہذیبی فرق کو تصادم میں اور مذہبی

حساسیت کو سیاسی طاقت کے مظاہرے میں تبدیل کر دیا گیا۔ یوں وہ موضوعات، جنہیں دانش، تحمل اور باہمی احترام کے ساتھ سلجھایا جا سکتا تھا، اشتعال انگیز نعروں اور ہجوم کی نفسیات کے سپرد ہوتے چلے گئے۔

اس فضا میں سب سے زیادہ نقصان سچائی کو پہنچتا ہے۔ کیونکہ جب جذبات اپنی انتہا پر ہوں تو حقیقت کی آواز اکثر شور میں دب جاتی ہے۔ لوگ سننے سے زیادہ ردِعمل دینے لگتے ہیں، سمجھنے سے زیادہ فیصلہ صادر کرنے لگتے ہیں اور پھر معاشرہ مکالمے کی جگہ الزام تراشی کی راہ پر چل پڑتا ہے۔ نفرت کی سیاست کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ وہ وقتی فائدے کے لیے نسلوں کے درمیان فاصلے پیدا کر دیتی ہے۔ ایک ایسا خوف جنم لیتا ہے جس میں پڑوسی، پڑوسی سے بدگمان ہونے لگتا ہے، ایک ایسا ذہنی انتشار پیدا ہوتا ہے جس میں مشترکہ تہذیب کے صدیوں پرانے رشتے بھی مشکوک محسوس ہونے لگتے ہیں۔ حالاں کہ معاشرے صرف قانون سے نہیں بلکہ اعتماد، رواداری اور انسانی تعلقات کی نازک ڈور سے قائم رہتے ہیں۔

تاریخ کے صفحات بار بار یہ حقیقت دہراتے ہیں کہ نفرت وقتی ہجوم تو جمع کر سکتی ہے مگر پائیدار تہذیب تعمیر نہیں کر سکتی۔ تہذیبیں اس وقت محفوظ رہتی ہیں جب اختلاف کو دشمنی نہیں بننے دیا جاتا، جب مذہبی جذبات کے ساتھ انسانی وقار کا احترام بھی برقرار رکھا جاتا ہے اور جب سیاست انسانوں کو تقسیم کرنے کی بجائے انہیں ایک دوسرے کے قریب لانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستانی معاشرے میں گائے کو ہمیشہ ایک خاص تقدس حاصل رہا ہے۔ قدیم ہندو روایتوں میں اسے معاشی و مذہبی اعتبار سے اہم سمجھا گیا۔ دیہی معیشت میں بھی گائے ایک بنیادی کردار ادا کرتی رہی۔ کھیتی باڑی، دودھ، دیہی زندگی اور معاشرتی ڈھانچے میں اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ اسی لیے صدیوں تک مختلف طبقے اپنے اپنے انداز میں اس کا احترام کرتے رہے۔ لیکن تاریخ کا دوسرا رخ بھی موجود ہے۔ برصغیر میں مختلف ادوار میں گائے کے ذبیحے کا رواج بھی رہا ہے۔ مسلمانوں، دلت طبقات، بعض قبائلی برادریوں اور کئی معاشرتی گروہوں کی غذائی روایتوں میں بیف شامل رہا۔ برطانوی دور میں جب ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی نے مذہبی حساسیت کو سیاسی رخ دینا شروع کیا تو گاؤ رکشا کے نام پہ تحریکیں بھی شدت اختیار کرنے لگیں۔ نوآبادیاتی اقتدار اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر مختلف مذہبی طبقات کے درمیان باہمی اعتماد کمزور کر دیا جائے تو اقتدار کو طول دینا آسان ہو جاتا ہے۔

اسی لیے ایسے موضوعات، جو پہلے محدود سماجی یا مذہبی دائرے میں موجود تھے، رفتہ رفتہ عوامی جذبات، سیاسی صف بندی اور اجتماعی شناخت کے بڑے عنوان بنائے جانے لگے۔ اس دور میں مذہبی علامات صرف عقیدت کی علامات نہیں رہیں بلکہ سیاسی mobilization کا ذریعہ بھی بنتی چلی گئیں۔ گاؤ رکشا کے نام پر جلوس، اجتماعات اور تحریکیں اب محض مذہبی وابستگی کا اظہار نہیں تھیں بلکہ ان کے پس منظر میں ایک ایسی مکروہ سیاست بھی کارفرما ہونے لگی تھی جو عوامی جذبات کو منظم طاقت میں تبدیل کرنا چاہتی تھی۔

نتیجتاً معاشرے کے اندر وہ فاصلے بڑھنے لگے جنہیں صدیوں کے سماجی اشتراک نے بہت حد تک نرم کر رکھا تھا۔ برطانوی حکمرانوں کی پالیسی کا سب سے خطرناک پہلو یہی تھا کہ انہوں نے اختلافات کو ختم کرنے کی بجائے انہیں ابھارنے میں فائدہ محسوس کیا۔ ایک طبقے کے خوف کو دوسرے طبقے کے خلاف استعمال کیا گیا، مذہبی حساسیت کو اشتعال کی زبان دی گئی اور یوں مشترکہ تہذیب کی فضا میں آہستہ آہستہ بدگمانی کی دراڑیں پڑنے لگیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب بہت سے سماجی مسائل پہلی مرتبہ منظم سیاسی نعروں کی صورت اختیار کرنے لگے۔ تاریخ کا مطالعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ جب ریاستی مفادات مذہبی جذبات کے ساتھ الجھ جائیں تو مسائل صرف نظریاتی نہیں رہتے بلکہ عوامی نفسیات کا حصہ بن جاتے ہیں۔ پھر ہجوم آسانی سے متاثر ہوتا ہے، افواہیں تیزی سے پھیلتی ہیں اور جذباتی فضا میں اعتدال کی آوازیں کمزور پڑنے لگتی ہیں۔ اسی لیے برصغیر کی اس تاریخ کو صرف ماضی کا واقعہ سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس کے اثرات آج بھی ہمارے سماجی رویّوں، سیاسی بیانیوں اور باہمی تعلقات میں کہیں نہ کہیں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

برصغیر کی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ گاؤ رکھشا کی تحریک ابتدا میں محض مذہبی جذبات کے اظہار تک محدود دکھائی دیتی تھی لیکن رفتہ رفتہ

اس نے ایک وسیع سماجی، مذہبی اور سیاسی شکل اختیار کر لی۔خصوصاً انیسویں صدی کے آخری حصے میں جب برطانوی نوآبادیاتی اقتدار نے مختلف مذہبی طبقات کی جداگانہ شناختوں کو سیاسی اظہار سے مربوط کرنا شروع کیا تو گاؤ کشی کا مسئلہ بھی صرف مذہبی حساسیت کا عنوان نہ رہا بلکہ اجتماعی نفسیات، عوامی جذبات اور شناختی سیاست کا ایک نہایت نازک اور پُرتشدد مسئلہ بنتا چلا گیا۔تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ 1870ء اور 1880ء کی دہائیوں میں شمالی ہند، پنجاب، اودھ، بہار اور بنارس کے اطراف کئی مقامات پر گاؤ کشی کے الزامات اور مذہبی حساسیت کے سبب کشیدگی بڑھنے لگی تھی۔اگرچہ ابتدائی جھڑپوں کے آثار 1871ء میں پنجاب اور شمال مغربی صوبہ جات کے بعض علاقوں میں بھی ملتے ہیں مگر اس تحریک کی سب سے نمایاں اور منظم صورت 1880ء کے بعد سامنے آئی، جب Swami Dayanand Saraswati نے گاؤ رکشا کو ایک بڑے مذہبی و سماجی مسئلے کے طور پر پیش کیا۔ان کی کتاب ستیارتھ پرکاش اور بعد کے خطابات نے اس موضوع کو عوامی تحریک کی شکل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

1882ء کے بعد مختلف شہروں میں "گؤ رکشنی سبھائیں" (Cow Protection Societies) قائم ہونا شروع ہوئیں۔ بظاہر ان کا مقصد گائے کا تحفظ تھا، مگر رفتہ رفتہ یہ تنظیمیں مذہبی شناخت، عوامی mobilization اور سیاسی جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنتی چلی گئیں۔

پنجاب، بنارس، الٰہ آباد، بہار اور اودھ میں ان تحریکوں نے جلسوں، جلوسوں اور چندہ مہمات کے ذریعے وسیع سماجی اثرات پیدا کیے۔ برطانوی سرکاری رپورٹس میں بھی اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ گاؤ رکشا کے نعروں نے کئی علاقوں میں ہندو مسلم تعلقات کو شدید متاثر کیا۔

پنجاب، جہاں اس تحریک نے سب سے پہلے منظم صورت اختیار کی، جلد ہی اس کشمکش کا مرکز بن گیا۔

1881ء میں ملتان میں بیف کی فروخت کے مسئلے پر شدید فساد بھڑکا، جس نے پورے علاقے میں خوف اور اشتعال کی فضا پیدا کر دی۔لاہور، ہوشیار پور اور امرتسر کے اطراف بھی گاؤ رکھشا کی مہم نے ہندو مسلم تعلقات میں کشیدگی بڑھائی اور دیہی علاقوں تک تصادم کی لہریں پھیلتی چلی گئیں۔بعد ازاں صوبۂ متحدہ، یعنی موجودہ اتر پردیش، اس تحریک کا سب سے بڑا میدان بن گیا۔

1893ء کو اس حوالے سے ایک نہایت اہم اور پُرتشدد سال سمجھا جاتا ہے۔عیدالاضحی کے موقع پر گاؤ کشی کے مسئلے نے برصغیر کے مختلف حصوں میں شدید فسادات کی صورت اختیار کر لی۔اعظم گڑھ میں گاؤ رکھشا کے مسلح گروہوں اور مقامی مسلمانوں کے درمیان شدید تصادم ہوا، جس میں متعدد جانیں ضائع ہوئیں اور پورا علاقہ خوف و ہراس کی گرفت میں آ گیا۔مئو میں بھی یہی آگ پھیل گئی اور حالات اس قدر بگڑے کہ معمول کی سماجی زندگی معطل ہو کر رہ گئی۔بنارس، الٰہ آباد اور اتر پردیش کے دوسرے شہروں میں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔بعد کے برسوں میں ایودھیا بھی اس تناؤ سے محفوظ نہ رہ سکی، جہاں 1912ء میں گائے کی قربانی کے مسئلے پر دوبارہ فرقہ وارانہ کشیدگی بھڑک اٹھی۔بہار اور بنگال کے علاقوں میں بھی گؤ رکشنی سبھاؤں کا اثر گہرا ہوتا چلا گیا۔آرہ اور بہار کے دوسرے اضلاع میں اس تحریک کے زیر اثر متعدد پُرتشدد واقعات پیش آئے۔بنگال پریزیڈنسی، خصوصاً کلکتہ موجودہ کولکتہ اور اس کے مضافات میں، گائے کی قربانی کے تنازع نے فرقہ وارانہ تصادم کی شکل اختیار کی اور مذہبی حساسیت کو عوامی اشتعال میں بدلتے دیر نہ لگی۔

شمالی ہند کے یہ فسادات جلد ہی بمبئی پریزیڈنسی، یعنی موجودہ ممبئی اور گجرات، تک جا پہنچے۔

1893ء میں بمبئی میں گائے کے تحفظ کے مسئلے پر ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے، جن میں درجنوں افراد ہلاک ہوئے اور شہر کی فضا طویل عرصے تک خوف زدہ رہی۔گجرات کے جونا گڑھ اور اطراف کے علاقوں میں بھی اسی تحریک کے اثرات کے باعث کشیدگی اور تصادم کے واقعات ریکارڈ کیے گئے۔یہ تحریک صرف برصغیر تک محدود نہ رہی بلکہ برطانوی راج کے زیر اثر برما، یعنی موجودہ میانمار، کے شہر رنگون تک بھی جا پہنچی، جہاں ہجرت کر کے جانے والے ہندستانیوں کے ذریعے 1890ء کی دہائی میں اسی مسئلے پر فرقہ وارانہ

فسادات رونما ہوئے۔مورخین کے مطابق 1893ء کے فسادات صرف مذہبی اشتعال کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ ان کے پس منظر میں نوآبادیاتی سیاست، سماجی عدمِ تحفظ، معاشی مقابلہ آرائی اور مذہبی شناخت کی سیاست بھی کارفرما تھی۔برطانوی حکومت نے بظاہر امن قائم رکھنے کی کوشش کی، مگر متعدد مؤرخین کا خیال ہے کہ "Divide and Rule" کی پالیسی نے ان تنازعات کو دبانے کی بجائے بعض اوقات غیر محسوس انداز میں مزید گہرا کیا۔کیونکہ نوآبادیاتی اقتدار کے لیے ایک متحد ہندستانی سماج سے زیادہ مفید وہ فضا تھی جس میں مختلف مذہبی طبقات ایک دوسرے کے خلاف بدگمان رہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس دور کے برطانوی وائسرائے Lord Lansdowne نے اعتراف کیا تھا کہ گائے کے تحفظ کی یہ تحریک 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد برطانوی راج کے لیے سب سے بڑا چیلنج بنتی جارہی ہے۔تاریخ کے یہ اوراق صرف ماضی کی داستان نہیں بلکہ ایک گہرا تنبیہی پیغام بھی رکھتے ہیں۔وہ یہ بتاتے ہیں کہ جب مذہبی حساسیت کو سیاسی ہجوم، عوامی اشتعال اور شناختی کشمکش کے ساتھ ملا دیا جائے تو پھر معمولی اختلاف بھی خونریز تصادم میں تبدیل ہوسکتا ہے اور جب معاشرے جذبات کے طوفان میں بہنے لگیں تو سب سے پہلے انسانیت زخمی ہوتی ہے، اعتماد ٹوٹتا ہے اور تہذیب کے چہرے پر ایک ایسا زخم لگ جاتا ہے جس کی بازگشت نسلوں تک سنائی دیتی رہتی ہے۔

اسی لیے تاریخ کے یہ واقعات محض چند فسادات یا وقتی سیاسی کشمکش کی داستان نہیں بلکہ اجتماعی شعور کے لیے ایک گہرا انتباہ بھی ہیں۔وہ یہ سمجھاتے ہیں کہ جب مذہبی حساسیت کو ہجومی سیاست، شناختی کشمکش اور اقتدار کی حکمتِ عملی کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو پھر اختلاف صرف نظری نہیں رہتا بلکہ پورے سماج کی روح کو متاثر کرنے لگتا ہے۔تاریخ کا سنجیدہ مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ گاؤکشی کا مسئلہ صرف مذہبی عقیدت کا معاملہ نہیں رہا بلکہ اسے وقتاً فوقتاً سیاسی شناخت، عوامی جذبات اور سماجی تقسیم کے ایک مؤثر ذریعے کے طور پر بھی استعمال کیا گیا۔اور یہی وہ پہلو ہے جو اس موضوع کو محض ماضی کی بحث نہیں رہنے دیتا بلکہ آج بھی اسے برصغیر کی اجتماعی نفسیات اور تہذیبی سیاست کا ایک حساس باب بنائے رکھتا ہے۔آج کی تاریخ میں یہی مسئلہ دھیرے دھیرے انتخابی سیاست کے ایوانوں تک پہنچ گیا۔آزادی کے بعد توقع تھی کہ ہندستان ایک ایسا سیکولر اور جمہوری راستہ اختیار کرے گا جہاں مذہبی اختلافات کو آئینی حکمت کے ذریعے متوازن رکھا جائے گا۔مگر بدقسمتی سے وقت کے ساتھ ساتھ گائے ایک جانور سے زیادہ ایک سیاسی نعرہ بنتی چلی گئی۔ایسے نعرے میں تبدیل ہوگئی جس کے سہارے ووٹ مانگے گئے، اشتعال پیدا کیا گیا اور عوامی ذہنوں میں خوف اور نفرت کے بیج بوئے گئے۔

سب سے زیادہ تشویشناک پہلو یہ ہے کہ گاؤرکشا کے نام پر بعض علاقوں میں قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا رجحان پیدا ہوا۔ہجوم نے عدالت کی جگہ لینا شروع کردی۔شبہات کی بنیاد پر انسانوں کو مارا گیا، پیٹا گیا، ذلیل کیا گیا اور بعض بےقصور لوگ محض افواہوں کی بنیاد پر اپنی جانوں سے محروم ہوگئے۔یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ ایک طرف حیوان کے تحفظ کا شور بلند کیا جاتا ہے مگر دوسری طرف انسان کا خون سستا ہو جاتا ہے۔حالاں کہ ہر مذہب، ہر تہذیب اور ہر اخلاقی فلسفہ اس بات پر متفق ہے کہ انسانیت سب سے بڑی قدر ہے۔اگر ایک جانور کے احترام کے نام پر انسانوں کی تذلیل ہونے لگے، ان کی جانیں لی جانے لگیں اور معاشرہ خوف کی نفسیات میں مبتلا ہوجائے تو پھر سوال صرف قانون کا نہیں رہتا، انسانیت کا بن جاتا ہے۔یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہندستان دنیا کے بڑے بیف ایکسپورٹر ممالک میں شمار ہوتا رہا ہے۔یہاں گوشت کی صنعت ایک وسیع تجارتی نیٹ ورک کی صورت رکھتی ہے۔اور حیرت انگیز امر یہ ہے کہ اس کاروبار سے وابستہ بڑی بڑی کمپنیاں اکثر وہ لوگ چلاتے ہیں جو گاؤرکشا کے جذباتی نعروں سے عوام کو مشتعل بھی کرتے ہیں اور انتہائی خموشی کے ساتھ معاشی فائدے بھی حاصل کرتے رہتے ہیں۔یہ تضاد ہندستانی سیاست کے چہرے پر ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔اگر واقعی مسئلہ صرف مذہبی تقدس کا ہے تو پھر بڑے پیمانے پر ہونے والی تجارت پر وہی سختی کیوں نظر نہیں آتی جو غریبوں، کمزوروں اور عام شہریوں پر دکھائی دیتی ہے؟

کیوں قانون کی تیزی اکثر انہی گلیوں میں نظر آتی ہے جہاں

بے بس لوگ رہتے ہیں، مگر بڑے معاشی مفادات کے ایوانوں میں خموشی اختیار کر لی جاتی ہے؟

کیوں جذبات کا سارا بوجھ صرف کمزور کندھوں پر ڈال دیا جاتا ہے جبکہ طاقت، سرمایہ اور سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والے حلقے اکثر احتساب کی گرفت سے دور دکھائی دیتے ہیں؟

یہ سوال صرف قانون کے دوہرے معیار کا نہیں بلکہ سماجی انصاف کے اس بحران کا بھی ہے جہاں طاقتور کے لیے تاویلیں پیدا ہو جاتی ہیں اور کمزور کے لیے فوری فیصلے۔ حالاں کہ انصاف کی اصل روح یہی ہے کہ وہ طاقت، دولت، مذہب اور حیثیت سے بلند ہو کر سب کے لیے یکساں معیار قائم کرے۔ اگر قانون صرف کمزور انسان پر اپنی سختی ثابت کرے اور طاقتور مفادات کے سامنے خموش ہو جائے تو پھر معاشرے کے اندر اعتماد آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ پھر عوام کے ذہنوں میں یہ احساس جنم لیتا ہے کہ شاید مسئلہ واقعی تقدس کا نہیں بلکہ طاقت کے استعمال کا ہے، شاید جذبات کو اصول سے زیادہ سیاست کی ضرورت کے مطابق برتا جا رہا ہے اور شاید مذہبی احترام کے نام پر اصل میں سماجی تقسیم، خوف اور انتخابی فائدوں کی بساط بچھائی جا رہی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب قانون اپنی اخلاقی قوت کھونے لگتا ہے، کیونکہ قانون صرف سزا سے نہیں بلکہ غیر جانب داری سے معتبر بنتا ہے اور جب غیر جانب داری مشکوک ہو جائے تو معاشرہ خموشی کے باوجود اندر ہی اندر بے اعتمادی، اضطراب اور احساسِ محرومی کا شکار ہونے لگتا ہے۔ کسی بھی مہذب قوم کی اصل آزمائش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اصولوں کو صرف کمزوروں پر نافذ نہیں کرتی بلکہ طاقتور طبقات، بڑے تجارتی مفادات اور سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والوں کے سامنے بھی اسی دیانت اور جرأت کے ساتھ قائم رکھتی ہے۔ کیونکہ انصاف اگر سب کے لیے برابر نہ رہے تو پھر وہ انصاف نہیں رہتا، صرف اختیار کی ایک صورت بن کر رہ جاتا ہے۔ یہاں اصل مسئلہ صرف گاؤکشی نہیں بلکہ ''انتخابی نفسیات'' ہے۔ جب معاشرے کو معاشی بحران، بے روزگاری، مہنگائی اور تعلیمی پسماندگی جیسے مسائل درپیش ہوں تو بعض سیاسی رہنما عوام کی توجہ اصل مسائل سے ہٹانے کے لیے جذباتی موضوعات کو ہوا دیتے ہیں۔ کیونکہ عوامی جذبات کو مشتعل کرنا اکثر مسائل حل کرنے سے زیادہ آسان سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے موضوعات سامنے لائے جاتے ہیں جو فوری طور پر جذباتی ردِعمل پیدا کریں، ہجوم کو تقسیم کریں، اور معاشرے کو اصل سوالات سے دور لے جائیں۔ پھر گفتگو روزگار، تعلیم، صحت اور انصاف سے ہٹ کر شناخت، نفرت اور اشتعال کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ عوام کے ذہنوں میں یہ احساس پیدا کیا جاتا ہے کہ ان کی تمام محرومیوں کا سبب کوئی دوسرا طبقہ، کوئی دوسری برادری یا کوئی مخصوص مذہبی گروہ ہے۔ یوں اصل ناکامیاں پس منظر میں چلی جاتی ہیں اور جذباتی نعروں کا شور حقیقت کی آواز دبا دیتا ہے۔ تاریخ بار بار یہ حقیقت آشکار کرتی ہے کہ جب بھی معاشی بے چینی بڑھتی ہے تو نفرت کی سیاست کو فروغ دینے والے عناصر زیادہ سرگرم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ پریشاں حال معاشرے جذباتی نعروں سے جلد متأثر ہوتے ہیں۔ ایسے حالات میں عوام کو امید، ترقی اور اصلاح کے راستے دکھانے کی جگہ خوف، غصے اور تقسیم کے راستے پر ڈال دینا بعض سیاسی قوتوں کے لیے زیادہ سودمند محسوس ہوتا ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ اس طرزِ سیاست میں نہ غربت کم ہوتی ہے، نہ بے روزگاری ختم ہوتی ہے، نہ تعلیمی زوال رک پاتا ہے اور نہ ہی عام انسان کی زندگی میں حقیقی سکون آتا ہے۔ البتہ معاشرے کے اندر بے اعتمادی بڑھ جاتی ہے، مشترکہ سماجی رشتے کمزور پڑ جاتے ہیں اور وہ قومی توانائی جو تعمیر و ترقی پر صرف ہونی چاہیے تھی، باہمی کشمکش میں ضائع ہونے لگتی ہے۔

دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ قومیں وقتی جذبات کے شور میں اپنے اصل مسائل فراموش نہ کریں۔ کیونکہ مضبوط معاشرے نفرت کے نعروں سے نہیں بلکہ تعلیم، انصاف، معاشی استحکام، سماجی ہم آہنگی اور انسانی وقار کے احترام سے تعمیر ہوتے ہیں۔ یہی وہ بنیادیں ہوتی ہیں جو قوموں کو صرف طاقتور نہیں بلکہ پائیدار بھی بناتی ہیں اور یہی وہ اقدار ہیں جو اختلافات کے باوجود معاشروں کو ٹوٹنے نہیں دیتیں بلکہ ایک مشترکہ قومی شعور میں باندھے رکھتی ہیں۔ لیکن جب سماجی شعور کمزور پڑنے لگے اور سیاست جذباتی موضوعات کے اردگرد اپنی طاقت تعمیر

کرنے لگے تو پھر بعض معاملات اپنی فطری حیثیت سے نکل کر علامتی کشمکش کا عنوان بن جاتے ہیں چنانچہ گائے ایک جانور کم اور ایک سیاسی علامت زیادہ بن جاتی ہے۔اس پورے مسئلے کا ایک آئینی اور مستقل حل ضرور سوچا جا سکتا ہے۔اگر واقعی ملک کی اکثریت گائے کو مذہبی وتہذیبی احترام کی علامت سمجھتی ہے تو پھر حکومت واضح،غیر مبہم اور یکساں قانون سازی کرے۔کیونکہ کسی بھی حساس مسئلے کا مستقل حل محض جذباتی نعروں، وقتی ردِعمل یا انتخابی مصلحتوں میں نہیں بلکہ ایسی متوازن اور ہمہ گیر پالیسی میں پوشیدہ ہوتا ہے جو قانون، سماجی ذمہ داری اور قومی نظم ـــــ تینوں کو یکجا کر سکے۔

اگر مقصد حقیقی گاؤکشی کے مسئلے کو سیاسی نعروں، ہجومی اشتعال اور وقتی انتخابی مفادات سے نکال کر ایک سنجیدہ قانونی اور سماجی دائرے میں لانا ہے تو پھر اس کے لیے محض جذباتی تقاریر یا وقتی شور کافی نہیں ہوگا بلکہ ایک واضح، ہمہ گیر اور غیر جانب دار پالیسی اختیار کرنا ہوگی۔

اگر حکومت اس معاملے میں قطعی سنجیدہ ہے تو گائے کو قومی جانور قرار دے کر پورے ملک میں ایک ایسا مضبوط، متوازن اور یکساں قانون نافذ کرے جو اس مسئلے کو مستقل سیاسی ہتھیار بننے سے روک دے۔اسی کے ساتھ ملک بھر میں قائم تمام بوچڑ خانوں اور بیف سے وابستہ تجارتی کمپنیوں کے لائسنس منسوخ کیے جائیں، بیف کی تجارت سے وابستہ کاروبار کو قانونی طور پر بند کیا جائے اور ایسے فائیو اسٹار ہوٹلوں کے خلاف بھی قانونی کارروائی کی جائے جن کے مینیو میں بیف شامل ہے۔اسی طرح چمڑے کی ان تمام ٹینریوں کے لائسنس بھی ختم کیے جائیں جو اس صنعت سے وابستہ ہیں، تاکہ پالیسی محض علامتی نہ رہے بلکہ عملی سطح پر بھی یکساں طور پر نافذ ہوتی دکھائی دے۔کیونکہ اگر کسی مخصوص طبقے کی مذہبی آستھا اور جذبات کو قانونی تحفظ دینا واقعی ملک کی ترجیحات میں ہے تو پھر انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ قانون کا اطلاق ہر سطح پر یکساں ہو، نہ کہ صرف کمزور طبقات یا محدود سماجی حلقوں تک۔ہم اربابِ حکومت سے یہی گذارش کرتے ہیں کہ اگر وہ واقعی ملک میں گاؤکشی کے مسئلے کے مستقل حل میں سنجیدہ ہیں تو اس سلسلے میں واضح، دوٹوک اور ہمہ گیر اقدامات کریں، تاکہ یہ مسئلہ محض سیاسی نعروں کا عنوان نہ رہے بلکہ ایک باقاعدہ قانونی دائرے میں آسکے اور ملک میں مذہبی حساسیت، سماجی توازن اور باہمی اعتماد کے تحفظ کی کوئی سنجیدہ صورت پیدا ہو سکے۔ایسے قوانین اگر غیر جانبدارانہ انداز میں نافذ ہوں تو شاید ہجومی تشدد، نفرتی سیاست اور اشتعال انگیزی کے دروازے بند ہو سکیں۔لیکن سوال پھر وہی کھڑا ہوتا ہے کہ کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟

جب ملک کی معیشت کا ایک حصہ اسی تجارت سے وابستہ ہو، جب بڑے بڑے تجارتی مفادات اس صنعت سے جڑے ہوں اور جب سیاست کو جذباتی نعروں کی ضرورت باقی ہو، تو پھر مسئلہ محض عقیدت کا نہیں رہتا بلکہ مفادات کا بن جاتا ہے۔پھر جذبات اور تجارت، عقیدت اور سیاست، عوامی نعروں اور معاشی فائدوں کے درمیان ایک ایسا پیچیدہ تضاد جنم لیتا ہے جس میں حقیقت اکثر دھندلا جاتی ہے۔

ایسے ماحول میں عوام کے سامنے ایک چہرہ پیش کیا جاتا ہے اور اقتدار وتجارت کے ایوانوں میں دوسرا چہرہ زندہ رہتا ہے۔سڑکوں پر مذہبی جوش کی زبان بولی جاتی ہے مگر معاشی مفادات کی میزوں پر خموش سمجھوتے جاری رہتے ہیں۔نتیجتاً قانون کی سختی اکثر کمزور انسان تک محدود رہ جاتی ہے جبکہ طاقت، سرمایہ اور اثر ورسوخ رکھنے والے حلقے اسی نظام کے اندر اپنے لیے آسان راستے نکال لیتے ہیں۔یہی وہ تضاد ہے جو معاشرے کے اندر بے اعتمادی کو جنم دیتا ہے لوگ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ بعض اوقات اصولوں سے زیادہ مفادات طاقتور ہوتے ہیں، نعروں سے زیادہ تجارت مؤثر ہوتی ہے اور انصاف کا ترازو ہر ہاتھ میں یکساں وزن نہیں رکھتا۔پھر عوامی جذبات ایک مستقل سیاسی سرمایہ بن جاتے ہیں، جنہیں وقتاً فوقتاً ابھار کر اصل مسائل سے توجہ ہٹا دی جاتی ہے۔حالاں کہ کسی بھی مہذب معاشرے میں مذہبی احترام کا مفہوم یہ نہیں ہونا چاہیے کہ انسان خوف میں جینے لگے یا قانون طبقاتی فرق کا شکار ہو جائے۔حقیقی انصاف وہی ہے جو طاقتور اور کمزور دونوں کو ایک ہی معیار پر پرکھے اور حقیقی تہذیب وہی ہے جو عقیدت کے ساتھ دیانت، قانون کے ساتھ مساوات اور جذبات کے ساتھ

انسانیت کو بھی زندہ رکھے۔اس لیے آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندستان اپنے اجتماعی ضمیر سے ایک بنیادی سوال کرے۔

کیا ایک مہذب معاشرہ وہ ہوتا ہے جہاں جانور کے نام پر انسان مارے جائیں؟ کیا مذہبی احترام کا مطلب نفرت کا بازار گرم کرنا ہے؟ کیا قانون کی جگہ ہجوم لے سکتا ہے؟ اور کیا سیاست کا مقصد انسانوں کو جوڑنا ہے یا بانٹنا؟

یاد رکھیے! تہذیبیں نفرت سے نہیں، انصاف سے بنتی ہیں۔قومیں اشتعال سے نہیں، انسانیت سے بنتی ہیں۔اور وہ معاشرہ کبھی حقیقی امن حاصل نہیں کرسکتا جہاں حیوان کے نام پر انسانیت زخمی ہوتی رہے۔ہندستان کی اصل طاقت اس کی گنگا جمنی تہذیب ہے۔اگر یہ تہذیب کمزور ہوگئی تو نہ سیاست بچے گی، نہ نعرے، نہ بازار اور نہ اقتدار، کیونکہ قوموں کی حقیقی بنیاد صرف معیشت، طاقت یا اکثریت نہیں ہوتی بلکہ وہ اخلاقی اور تہذیبی رشتہ ہوتا ہے جو مختلف انسانوں کو ایک مشترکہ وطن کے احساس میں جوڑے رکھتا ہے۔یہی گنگا جمنی تہذیب صدیوں سے اس سرزمین کی روح رہی ہے۔اسی نے مختلف مذاہب، مختلف زبانوں، الگ الگ ثقافتوں اور متنوع روایتوں کو ایک ہی سماجی فضا میں جینے کا سلیقہ دیا۔یہی وہ تہذیبی شعور ہے جس نے اختلاف کو تصادم بننے سے روکا اور نفرت کے موسموں میں بھی محبت، برداشت اور باہمی احترام کے چراغ روشن رکھے۔اگر یہی تہذیبی ہم آہنگی ٹوٹنے لگے تو پھر فقط سماجی رشتے کمزور نہیں ہوتے بلکہ پورا قومی وجود اندر سے خالی ہونے لگتا ہے۔معاشرے خوف میں تقسیم ہوجاتے ہیں، اعتماد کی جگہ بدگمانی لے لیتی ہے اور سیاست وقتی فائدے تو سمیٹ لیتی ہے مگر قوم اپنے باطن میں ایک گہرا زخم لے کر رہ جاتی ہے۔کیونکہ بازار صرف سرمایے سے نہیں چلتے، وہ سماجی اعتماد سے زندہ رہتے ہیں۔جمہوریت صرف ووٹ سے قائم نہیں رہتی، وہ باہمی احترام اور آئینی انصاف سے مضبوط ہوتی ہے اور ریاستیں صرف طاقت سے محفوظ نہیں ہوتیں بلکہ اس احساس سے محفوظ رہتی ہیں کہ اس ملک میں ہر انسان برابر وقار اور تحفظ رکھتا ہے۔اسی لیے ہندستان کا مستقبل نفرت کے شور میں نہیں بلکہ اسی تہذیبی بصیرت میں محفوظ ہے جو انسان کو اس کی شناخت سے پہلے "انسان" سمجھتی ہے، اختلاف کے باوجود مکالمہ زندہ رکھتی ہے اور مذہبی تنوع کو خطرہ نہیں بلکہ مشترکہ حسن تصور کرتی ہے، کیونکہ تہذیبیں ہتھیاروں سے نہیں، انسان دوست رویّوں سے زندہ رہتی ہیں اور جب تاریخ کے شور، سیاست کے نعروں اور طاقت کے تمام مظاہروں کی گرد بیٹھ جاتی ہے تو آخر میں باقی صرف وہی اقدار رہ جاتی ہیں جو انسان کے دل کو انسان سے جوڑتی ہیں اور پھر بچے گی صرف وہی روشنی جو انسان کو انسان سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے۔وقت کے صفحات پر بعض مسئلے ایسے ثبت ہوجاتے ہیں جو صرف قانون، سیاست یا مذہبی اختلاف کا عنوان نہیں رہتے بلکہ پوری قوم کے اخلاقی شعور کا آئینہ بن جاتے ہیں۔

گاؤکشی کا مسئلہ بھی آج اسی مقام پر کھڑا ہے، جہاں سوال صرف ایک جانور کے ذبیحے کا نہیں بلکہ اس ذہنیت کا ہے جو اختلاف کو دشمنی، جذبات کو اشتعال اور سیاست کو نفرت کے کاروبار میں بدل دیتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر قوم کو اپنی مذہبی اور تہذیبی حساسیت کے تحفظ کا حق حاصل ہے۔مگر اس سے بھی بڑا سچ یہ ہے کہ انسان کی جان، اس کی عزت اور اس کا بنیادی وقار ہر تہذیبی اور مذہبی بحث سے بلند تر حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کسی معاشرے میں حیوان کے نام پر انسان خوف میں جینے لگے، اگر قانون کی جگہ ہجوم فیصلہ کرنے لگے اور اگر سیاست انسانوں کو قریب لانے کی بجائے ایک دوسرے سے نفرت سکھانے لگے تو پھر یہ صرف سیاسی بحران نہیں بلکہ اخلاقی زوال کی علامت بن جاتا ہے، کیونکہ کسی بھی مہذب سماج کی اصل پہچان اس کے نعروں، عمارتوں یا طاقت کے مظاہروں سے نہیں بلکہ اس انصاف سے ہوتی ہے جو کمزور انسان کو بھی تحفظ کا احساس دے اور اس فضا سے ہوتی ہے جس میں اختلاف کے باوجود خوف نہیں بلکہ اعتماد زندہ رہے۔جب ہجوم جذبات کے زور پر فیصلے کرنے لگے تو انصاف کی روح مجروح ہونے لگتی ہے۔پھر ثبوت کی جگہ افواہیں، قانون کی جگہ اشتعال اور انسانی وقار کی جگہ اجتماعی غصہ حاوی ہونے لگتا ہے۔ایسے ماحول میں صرف چند افراد ہی متأثر نہیں ہوتے بلکہ پورا معاشرہ آہستہ آہستہ ایک دائمی بے چینی، عدمِ تحفظ اور نفسیاتی انتشار کا شکار ہوجاتا ہے۔تاریخ یہ بتاتی ہے کہ تہذیبوں کا

زوال ہمیشہ بیرونی حملوں سے نہیں ہوتا، کئی بار معاشرے اندر سے اس وقت ٹوٹنے لگتے ہیں جب ان کے اخلاقی اصول کمزور پڑ جائیں، جب انصاف سب کے لیے یکساں نہ رہے اور جب انسان کی جان، عزت اور آزادی جذباتی نعروں سے کم تر سمجھی جانے لگے۔ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جہاں خوف خموشی پیدا کرتا ہے، خموشی بے حسی کو جنم دیتی ہے اور بے حسی آہستہ آہستہ ظلم کو معمول بنا دیتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ معاشرہ قانون کی بالادستی، انسانی وقار اور اجتماعی ذمہ داری کے اصولوں کو ہر حال میں مقدم رکھے۔ کیونکہ نفرت وقتی ہجوم تو پیدا کر سکتی ہے مگر پُرامن اور پائیدار قومیں صرف انصاف، برداشت، رواداری اور اخلاقی بصیرت کی بنیاد پر ہی تعمیر ہوتی ہیں۔ ہندستان کی اصل روح اس کی کثرت میں وحدت، اس کی گنگا جمنی تہذیب اور اس کی صدیوں پرانی رواداری میں پوشیدہ ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں مختلف عقیدے، مختلف زبانیں، مختلف رسم و رواج اور الگ الگ تہذیبی روایتیں صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتی آئی ہیں اور اسی اشتراک نے اس معاشرے کو ایک منفرد تہذیبی شناخت عطا کی ہے۔ یہاں صرف مذاہب ساتھ ساتھ نہیں رہے بلکہ دل بھی ایک دوسرے سے جڑے رہے ہیں۔

کبھی مندروں کی گھنٹیوں اور مسجدوں کی اذانوں نے ایک ہی فضا میں گونج پیدا کی، کبھی گرجا گھروں کی دعاؤں، گوردواروں کے کیرتنوں، بودھ وہاروں کی خموش ساعتوں اور جین مندروں کی پرامن تعلیمات نے اس سرزمین کے روحانی منظرنامے کو وسعت بخشی۔ کبھی صوفیوں کی خانقاہوں، سنتوں کے آشرموں، سکھ گروؤں کی تعلیمات اور مختلف مذہبی روایتوں نے انسان دوستی، محبت، خدمت، رحم اور رواداری کا ایسا پیغام دیا جس نے صدیوں تک اس دھرتی کے سماجی وجود کو ایک مشترکہ تہذیبی رشتے میں باندھے رکھا۔ یہی وہ تہذیبی آمیزش تھی جس نے اس سرزمین کو محض ایک سیاسی خطہ نہیں بلکہ ایک زندہ تمدنی روایت بنا دیا۔ گنگا جمنی تہذیب دراصل اسی اجتماعی شعور کا نام ہے جس میں اختلاف کو دشمنی نہیں سمجھا جاتا بلکہ تنوع کے حسن کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ یہ تہذیب ہمیں سکھاتی ہے کہ ایک دوسرے کے عقائد کا احترام کرتے ہوئے بھی ساتھ جیا جا سکتا ہے اور یہی وہ فکر ہے جس نے ہندستان کو صدیوں تک سماجی ہم آہنگی کی ایک مثال بنائے رکھا۔ اسی لیے ہمارے ملک کی حقیقی طاقت اس کی یکسانیت میں نہیں بلکہ اس کی رنگارنگی میں ہے۔ اسی تناظر میں ابراہیم ذوق نے کہا ہے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

یہاں تہذیب کا حسن اسی وقت برقرار رہ سکتا ہے جب محبت نفرت پر، مکالمہ تصادم پر اور انسانیت سیاسی مفادات پر غالب رہے۔

کیونکہ قومیں صرف سرحدوں سے نہیں بلکہ مشترکہ اخلاقی شعور، باہمی احترام اور اجتماعی رواداری سے زندہ رہتی ہیں۔ ہندستان کی اصل روح اس کی تہذیبی وسعت، اس کے باہمی اشتراک اور اس روایتی رواداری میں پوشیدہ ہے جس نے صدیوں سے مختلف طبقات کو ایک ہی سماجی فضا میں جوڑے رکھا ہے۔ یہ ملک صرف زمین کے ایک ٹکڑے کا نام نہیں بلکہ بے شمار زبانوں، عقیدوں، ثقافتوں اور انسانی جذبوں کے ایک ایسے قافلے کا نام ہے جس کی اصل طاقت اس کے تنوع میں ہے۔ یہ ملک نفرت کے نعروں سے نہیں بلکہ باہمی احترام، آئینی انصاف اور انسانی اخوت سے مضبوط ہوگا۔ کیونکہ قوموں کی پائیداری غصے کے ہجوم سے نہیں بلکہ اعتماد کے رشتوں سے قائم ہوتی ہے۔ وہ معاشرے زیادہ دیر زندہ رہتے ہیں جہاں قانون سب کے لیے برابر ہو، جہاں اختلاف کو دشمنی نہ بنایا جائے اور جہاں انسان کو اس کے مذہب، زبان یا شناخت سے پہلے ایک انسان سمجھا جائے۔ ہندستان کی تاریخ بار بار یہ سبق دیتی ہے کہ اس سرزمین نے ہمیشہ محبت، برداشت اور مشترکہ تہذیب کے ذریعے اپنی بقا کا راستہ تلاش کیا ہے۔

جب بھی نفرت نے اس کے سماجی تانے بانے کو توڑنے کی کوشش کی، اسی دھرتی کی گہرائیوں سے رواداری، حکمت اور انسان دوستی کی صدائیں بلند ہوئیں۔ کیونکہ اس ملک کی روح تصادم میں نہیں بلکہ اس شعور میں زندہ ہے جو اختلاف کے باوجود ساتھ جینے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ اسی لیے مستقبل کا محفوظ اور مضبوط ہندستان وہی ہوگا

جہاں سیاست تقسیم نہیں بلکہ اتحاد کا ذریعہ بنے، جہاں مذہبی جذبات کے ساتھ انسانی وقار کا احترام بھی برقرار رہے اور جہاں ہر شہری یہ محسوس کرے کہ یہ ملک صرف اکثریت یا اقلیت کا نہیں بلکہ سب کا مشترکہ وطن ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ جذباتی نعروں کی جگہ سنجیدہ قانون سازی، متوازن سماجی شعور اور انصاف پر مبنی قومی رویہ اختیار کیا جائے تاکہ نہ کسی کے مذہبی جذبات مجروح ہوں اور نہ کسی بے گناہ انسان کا خون سڑکوں پر بہے۔

کیونکہ کسی بھی مہذب معاشرے کی بنیاد یہی ہوتی ہے کہ وہاں قانون ہجوم سے زیادہ طاقتور ہو، انصاف جذبات سے بالاتر ہو اور انسانی جان کو ہر حال میں احترام حاصل ہو۔اس نوعیت کے حساس مسائل کو اشتعال، خوف اور سیاسی فائدے کی بجائے آئینی حکمت، سماجی ذمہ داری اور باہمی اعتماد کے ساتھ حل کرنے کی ضرورت ہے۔ جب قانون واضح، منصفانہ اور سب کے لیے یکساں ہو تو معاشرے میں بے یقینی کم ہوتی ہے، افواہوں کی طاقت ٹوٹتی ہے اور لوگ اپنے مسائل کا حل تشدد کی جگہ قانونی اداروں میں تلاش کرنے لگتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ایک متوازن سماجی شعور بھی ناگزیر ہے۔ایسا شعور جو لوگوں کو یہ سکھائے کہ مذہبی وابستگی اور انسانی ہمدردی ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک مہذب معاشرے میں دونوں کا ساتھ ساتھ زندہ رہنا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر عقیدت انسانیت سے جدا ہو جائے تو وہ آسانی سے شدت اور نفرت کا شکار ہو سکتی ہے، جبکہ حقیقی تہذیب وہی ہے جو اپنے عقائد کے احترام کے ساتھ دوسروں کے جان و مال اور عزت و وقار کا تحفظ بھی یقینی بنائے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ نفرت کی آگ جب بھڑکتی ہے تو وہ صرف ایک طبقے کو نہیں جلاتی بلکہ پورے معاشرے کے امن، معیشت، تعلیم اور اخلاقی توازن کو متاثر کرتی ہے۔

لگے گی آگ تو آئیں گے گھر کئی زد میں
یہاں پہ صرف ہمارا مکان تھوڑی ہے

اس لیے قومی دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے مسائل وقتی سیاسی فائدوں سے اوپر اٹھ کر دیکھے جائیں، تاکہ آنے والی نسلوں کو خوف، تقسیم اور بے اعتمادی کی بجائے ایک پُرامن، منصف اور باوقار معاشرہ مل سکے۔قوموں کی اصل عظمت اس میں نہیں ہوتی کہ وہ کتنے بلند نعرے لگا سکتی ہیں بلکہ اس میں ہوتی ہے کہ وہ اختلاف کے باوجود انصاف، رواداری اور انسانیت کو کس حد تک زندہ رکھ سکتی ہیں۔تاریخ ہمیشہ یہی سوال پوچھتی ہے کہ قوموں نے اپنے کمزور انسانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ انہوں نے اختلاف کو مکالمہ بنایا یا نفرت؟ اور انہوں نے مذہب کو رحمت بنایا یا سیاست کا ہتھیار؟ تاریخ صرف فاتحین کے نام محفوظ نہیں رکھتی بلکہ معاشروں کے اخلاقی رویّے بھی یاد رکھتی ہے۔

وہ یہ بھی دیکھتی ہے کہ طاقت کے لمحوں میں انصاف زندہ رہا یا نہیں، اکثریت نے کمزور طبقات کے حقوق تسلیم کیے یا نہیں اور جذبات کے طوفان میں انسانیت کی شمع بجھنے دی گئی یا اسے بچانے کی کوشش کی گئی۔قوموں کی اصل آزمائش امن اور خوش حالی کے دنوں میں نہیں بلکہ کشیدگی، خوف اور اختلاف کے زمانوں میں ہوتی ہے۔ وہیں معلوم ہوتا ہے کہ کون سا معاشرہ قانون کو ہجوم پر ترجیح دیتا ہے، کون سا سماج انصاف کو تعصب سے بلند رکھتا ہے اور انسانی وقار کو سیاسی مفادات پر قربان نہیں ہونے دیتا۔مذہب جب اپنے حقیقی جوہر میں زندہ ہو تو وہ دلوں میں رحم، اخلاق، انصاف اور انسان دوستی پیدا کرتا ہے۔وہ انسان کو توڑتا نہیں بلکہ جوڑتا ہے، نفرت نہیں بلکہ ہمدردی سکھاتا ہے اور طاقت کے غرور کی بجائے جواب دہی اور عدل وانصاف کا احساس پیدا کرتا ہے۔مگر جب مذہب کو سیاست کے شور، اقتدار کی خواہش یا ہجوم کے اشتعال کے ساتھ ملا دیا جائے تو پھر اس کی روح پس منظر میں چلی جاتی ہے اور اس کا نام صرف جذباتی mobilization کا ذریعہ بن کر رہ جاتا ہے۔اسی لیے آنے والے زمانے شاید ہمارے نعروں کو یاد نہ رکھیں، مگر وہ یہ ضرور یاد رکھیں گے کہ ہم نے اپنے عہد میں انصاف کا ساتھ دیا یا خاموشی اختیار کی، ہم نے نفرت کی آگ کو ہوا دی یا اسے بجھانے کی کوشش کی، اور ہم نے انسان کو اس کی شناخت سے پہلے ایک انسان سمجھا یا نہیں۔شاید ایک مہذب سماج کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ وہاں انسان، ہر اختلاف سے پہلے "انسان" سمجھا جاتا ہے۔اس کی جان، اس کی عزت، اس کے خوف، اس کے دکھ اور اس کے بنیادی حقوق کو کسی مذہبی، سیاسی یا سماجی اختلاف سے کم تر نہیں سمجھا جاتا۔کیونکہ تہذیب کی اصل روح اسی

احساس میں پوشیدہ ہوتی ہے کہ انسانیت ہر تعصب، ہر نفرت اور ہر تقسیم سے بلند ایک مشترکہ قدر ہے۔

ایک حقیقی مہذب معاشرہ وہ ہوتا ہے جہاں اختلاف دشمنی میں تبدیل نہیں ہوتا، جہاں قانون ہجوم کے شور سے مرعوب نہیں ہوتا اور جہاں انصاف صرف طاقتور کے لیے نہیں بلکہ کمزور انسان کے لیے بھی یکساں دروازہ کھولتا ہے۔ وہاں لوگوں کو ایک دوسرے سے خوف زدہ نہیں کیا جاتا بلکہ ایک دوسرے کو سمجھنے، سننے اور ساتھ جینے کا شعور دیا جاتا ہے۔ ایسے معاشروں میں مذہب اخلاق کو مضبوط کرتا ہے، سیاست خدمت کا ذریعہ بنتی ہے اور تہذیب انسانوں کے درمیان دیواریں نہیں بلکہ پل تعمیر کرتی ہے۔ وہاں زبانیں مختلف ہو سکتی ہیں، عقیدے الگ ہو سکتے ہیں، رسم و رواج جدا ہو سکتے ہیں، مگر انسانی احترام کا اصول سب کے لیے مشترک رہتا ہے۔ شاید اسی لیے تاریخ میں وہی قومیں دیر پا عزت حاصل کر پاتی ہیں جو طاقت کے باوجود انصاف اور رواداری کے اصول زندہ رکھتی ہیں، اختلاف کے باوجود انصاف قائم رکھتی ہیں اور جذبات کے طوفان میں بھی انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔ کیونکہ تہذیبوں کی اصل عظمت ان کے نعروں میں نہیں بلکہ ان کے انسان دوست رویّوں میں محفوظ رہتی ہے۔

اور شاید یہی وہ مقام ہے جہاں ایک قوم کا حقیقی امتحان شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ ریاستیں صرف آئین سے نہیں بلکہ اس اخلاقی احساس سے مضبوط ہوتی ہیں جو اپنے ہر شہری کو یہ یقین دلائے کہ اس کی جان، اس کی عزت، اس کے حقوق اور اس کا خوف سب برابر اہمیت رکھتے ہیں۔ جمہوریت صرف ووٹ ڈالنے کا نام نہیں بلکہ اس اعتماد کا نام ہے جس میں اکثریت اپنی طاقت انصاف کے تابع رکھتی ہے اور ریاست اپنے ہر شہری کے لیے یکساں تحفظ کی ضمانت بنتی ہے۔ اسی لیے آج سب سے بڑا سوال صرف گاؤکشی کا نہیں بلکہ اس قومی سمت کا ہے جس کی طرف ملک کو لے جایا جا رہا ہے۔ کیا ہندستان اپنی صدیوں پرانی گنگا جمنی تہذیب، آئینی مساوات اور جمہوری رواداری کے راستے پر قائم رہے گا یا پھر جذباتی سیاست، ہجومی نفسیات اور نفرت کے شور میں اپنی اصل روح کھو دے گا؟ کیونکہ قومیں اس وقت کمزور نہیں ہوتیں جب ان کے پاس وسائل کم ہوں بلکہ اس وقت کمزور ہونے لگتی ہیں جب ان کے اجتماعی ضمیر میں انصاف کی روشنی مدھم پڑنے لگے۔

حکمراں جماعت کی یہ آئینی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک کے ہر شہری کو عملی طور پہ یہ احساس دلائے کہ قانون صرف کمزور کے لیے نہیں بلکہ سب کے لیے برابر ہے۔ ریاست کا فرض ہجوم کے جذبات کی ترجمانی نہیں بلکہ آئین کی بالادستی کا تحفظ ہے۔ اگر سڑکوں پر خوف قانون سے زیادہ طاقتور محسوس ہونے لگے، اگر افواہیں عدالتوں سے زیادہ مؤثر ہو جائیں اور مذہبی جذبات کے نام پر انسانی جانیں غیر محفوظ ہونے لگیں تو پھر سوال صرف سیاسی ناکامی کا نہیں بلکہ جمہوری روح کے مجروح ہونے کا بن جاتا ہے۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اقتدار نفرت کے عارضی فائدوں سے اوپر اٹھ کر قومی یکجہتی، سماجی اعتماد اور آئینی انصاف کو اپنی ترجیح بنائے۔ کیونکہ ایک مضبوط ہندستان وہ نہیں ہوگا جہاں صرف اکثریت مطمئن ہو بلکہ وہ ہوگا جہاں اقلیت بھی خود کو محفوظ سمجھے، جہاں اختلاف رکھنے والا بھی خوف کے بغیر زندہ رہ سکے اور جہاں قانون ہر حال میں ہجوم سے زیادہ طاقتور نظر آئے۔ حکومتوں کی اصل عظمت ترقیاتی نعروں سے نہیں بلکہ اس جرأت سے ناپی جاتی ہے جس کے ذریعے وہ معاشرے میں انصاف قائم کرتی ہیں، نفرت کے تاجروں کو روکتی ہیں اور کمزور انسان کے حق میں کھڑی ہوتی ہیں۔ کیونکہ اقتدار وقتی ہوتا ہے مگر قوموں کا اخلاقی حافظہ بہت طویل ہوتا ہے۔ تاریخ یہ ضرور یاد رکھتی ہے کہ کس عہد میں سیاست نے لوگوں کو جوڑا اور کس دور میں انہیں تقسیم کیا گیا۔ آج اگر ہندستان کو واقعی ایک مضبوط، پائیدار اور باوقار جمہوری ملک بنانا ہے تو پھر ضروری ہے کہ مذہبی حساسیت کے ساتھ انسانی حقوق، آئینی آزادی اور قانون کی غیر جانب داری کو بھی یکساں احترام دیا جائے۔ کیونکہ کسی بھی قوم کی سلامتی نفرت کے نعروں سے نہیں بلکہ انصاف کے اعتماد سے محفوظ ہوتی ہے اور شاید آنے والی نسلیں ہمارے عہد کے بارے میں یہی فیصلہ کریں گی کہ ہم نے اختلاف کے زمانے میں مکالمہ بچایا یا نہیں، ہم نے سیاست کو خدمت بنایا یا اشتعال، ہم نے قانون کو ہجوم سے بلند رکھا یا نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم نے انسان کو اس کے مذہب، شناخت اور اختلاف سے پہلے ''انسان'' سمجھا یا نہیں۔

□□□□

محمد ملک الظفر سہسرامی

قانون کے نام پہ قتل: عالمی ضمیر کی شکست اور فلسطین کی چیخ

دنیا جب اپنے آپ کو تہذیب، قانون اور انسانی وقار کے بلند نعروں سے آراستہ کرتی ہے تو یہ امید جاگتی ہے کہ ظلم کی تاریکیاں اب زیادہ دیر قائم نہیں رہیں گی اور انصاف کا سورج ہر افق پہ یکساں روشنی بکھیرے گا۔ انسان یہ گمان کرنے لگتا ہے کہ تاریخ کی سنگین غلطیوں سے سبق حاصل کر لیا گیا ہے اور اب طاقت کے ایوانوں میں فیصلے نہیں بلکہ اصول بولیں گے۔ مگر حقیقت کا منظر نامہ اکثر اس امید کے برعکس دکھائی دیتا ہے، جہاں قانون کی زبان میں جبر لکھا جاتا ہے اور انسانی حقوق کے منشور سیاسی مصلحتوں کی گرد میں دب کر رہ جاتے ہیں۔

ایسے مواقع پہ انسانی ضمیر ایک کربناک سوال اٹھاتا ہے کہ کیا تہذیب کی ترقی محض ظاہری ہے؟ کیا انصاف کا پیمانہ اب بھی طاقت کے ترازو میں تولا جاتا ہے؟ جب مظلوم کی فریاد عالمی اداروں کی دیواروں سے ٹکرا کر واپس لوٹ آئے، جب حقوق زندگی جیسے بنیادی اصول بھی بحث کا موضوع بن جائیں اور جب قانون سازی کمزوروں کے خلاف ہتھیار بننے لگے، تو یہ احساس مزید گہرا ہو جاتا ہے کہ انسانیت ابھی اپنے امتحان کے مرحلے سے گذر رہی ہے۔

یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب قلم خموش نہیں رہ سکتا۔ تاریخ کی عدالت میں الفاظ گواہی دیتے ہیں اور ضمیر کی عدالت میں صداقت اپنا راستہ خود بناتی ہے۔ اس پس منظر میں یہ سطور صرف ایک آغاز نہیں بلکہ اس درد کی ترجمانی ہیں جو انصاف کے منتظر دلوں میں موجزن ہے -- ایک ایسی صدا جو یاد دلاتی ہے کہ اگر انسانی وقار کا دفاع نہ کیا گیا تو تہذیب کے تمام دعوے محض کھوکھلے نعروں میں تبدیل ہو جائیں گے۔

تاریخ کے بعض موڑ ایسے بھی آتے ہیں جب یہی نعرے محض الفاظ کی صورت میں باقی رہ جاتے ہیں اور حقیقت کے افق پہ جبر کی دھند گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ فلسطین کی مظلوم سرزمین آج اسی تضاد کا سب سے واضح منظر پیش کر رہی ہے، جہاں طاقت کے ایوانوں میں قانون کی تشکیل ہو رہی ہے اور اس کے سائے میں انسانیت کی سانس گھٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں حق کی میزان قوت کی دہلیز پہ رکھ دی گئی ہے اور عدل کے نام پہ وہ فیصلے صادر ہو رہے ہیں جو دلوں میں خوف اور فضاؤں میں بے بسی بڑھا رہے ہیں۔

یہ وہ منظر ہے جہاں الفاظ تو قانون کے ہیں مگر روح انتقام کی ہے، جہاں ضابطے تحریر کیے جا رہے ہیں مگر ان کے اثرات انسانی وقار مجروح کر رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی دھول سے اٹھنے والے پرانے زخم پھر تازہ ہو رہے ہیں اور تہذیب کے دعوؤں کے باوجود ظلم کے طریقے نئے عنوانات کے ساتھ سامنے آ رہے ہیں۔ انسانی حقوق کے علمبردار اداروں کی خموشی یہ منظر مزید گہرا کر دیتی ہے، گویا مظلوم کی فریاد ایک ایسے خلا میں گونج رہی ہے جہاں سننے والے تو بہت ہیں مگر بولنے کی جرأت کم ہے۔ اسی کشمکش میں انسانیت کا چہرہ سوالیہ نشان بن جاتا ہے اور ضمیر یہ پوچھنے لگتا ہے کہ اگر قانون ہی کمزوروں کے خلاف دیوار بن جائے تو انصاف کہاں پناہ لے گا؟ یہی وہ فضا ہے جس میں فلسطین کی سرزمین محض ایک جغرافیہ نہیں رہتی بلکہ عالمی اخلاقی بحران کی علامت بن جاتی ہے -- ایک ایسا استعارہ جس میں طاقت اور اصول کی کشمکش نمایاں ہے اور جس کی ہر دھڑکن دنیا کے

ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔

یہ الفاظ اس پس منظر کو اجاگر کرتے ہیں جس میں قانون سازی کے نام پہ انسانی حقوق محدود کیے جا رہے ہیں، انصاف سیاسی مفادات کے تابع کیے جا رہے ہیں اور عالمی اداروں کی خموشی ایک نیا اخلاقی بحران جنم دے رہی ہے۔ جب زندگی کے بنیادی حق پہ ہی سوال اٹھنے لگے، جب عدل کا ترازو قوت کے ہاتھوں میں دے دیا جائے اور جب مظلوم کی فریاد عالمی ایوانوں میں محض رسمی جملوں تک محدود ہو جائے، تو قلم کا فرض بنتا ہے کہ وہ ان حقائق کو بے نقاب کرے۔

زیرِ نظر تحریر اسی احساسِ ذمہ داری کا اظہار ہے--ایک ایسا اظہار جو نہ صرف ظلم کے تسلسل کو تاریخ کے آئینے میں دکھاتا ہے بلکہ انسانی حقوق کے نام پہ قائم عالمی نظام کی بے بسی کو بھی سوالیہ نشان بناتا ہے۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں یہ گفتگو اپنی معنویت حاصل کرتی ہے اور قاری کو سوچنے پہ مجبور کرتی ہے کہ آخر انسانیت کا پیمانہ کب یکساں ہوگا۔ دنیا کی تاریخ میں ظلم کی کئی صورتیں سامنے آئیں مگر جب ظلم کو قانون کا جامہ پہنا دیا جائے تو وہ محض جبر نہیں رہتا بلکہ انسانیت کے وجود پہ ایک کھلا اعلانِ جنگ بن جاتا ہے۔ کیونکہ اس مرحلے پہ طاقت صرف تلوار کی نوک تک محدود نہیں رہتی بلکہ عدالت کے کمرے، پارلیمان کے ایوان اور قانون کی سطروں میں بھی اپنی گرفت مضبوط کر لیتی ہے۔ یوں انصاف کا چراغ اسی ہاتھ سے بجھایا جاتا ہے جو اسے روشن رکھنے کا دعویدار ہوتا ہے اور حق کے نام پہ ایسے فیصلے صادر ہوتے ہیں جو ضمیر کو لرزا دیتے ہیں۔

جب قانون خود کمزوروں کے خلاف ہتھیار بن جائے تو ظلم کی شدت دوچند ہو جاتی ہے۔ فرد کے پاس اپیل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، فریاد کی آواز دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ آتی ہے اور انصاف کا تصور ایک خواب بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جہاں ظلم کی صورت محض وقتی نہیں رہتی بلکہ ایک مستقل نظام میں ڈھل جاتی ہے، جس کے اثرات نسلوں تک پھیلتے ہیں۔ ایسے میں تاریخ کے اوراق پہ یہ سیاہی محض ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک عہد کی اخلاقی شکست کے طور پہ درج ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب قانون کے نام پہ جبر مسلط کیا جاتا ہے تو انسانیت کے بنیادی اصول خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ انصاف کی غیر جانب داری ختم ہو جاتی ہے، انسانی وقار پامال ہوتا ہے اور عالمی ضمیر پہ ایک ایسا بوجھ پڑتا ہے جو طویل عرصے تک محسوس کیا جاتا ہے۔ اسی پس منظر میں یہ الفاظ ایک تنبیہ ہیں کہ اگر قانون طاقت کا تابعدار ہو جائے تو تہذیب کی عمارت کھوکھلی ہو جاتی ہے اور انسانیت کے مستقبل پہ سوالیہ نشان ثبت ہو جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں عدالتیں محض رسمی ادارے بن کر رہ جاتی ہیں، فیصلے انصاف کی بجائے قوت کے ترازو میں تولے جاتے ہیں اور مظلوم کی امید آہستہ آہستہ دم توڑنے لگتی ہے۔ جب قانون کمزور کے لیے ڈھال بننے کی جگہ اس کے خلاف دیوار کھڑی کر دے تو معاشرے کے اخلاقی ستون ہلنے لگتے ہیں۔ پھر نہ صرف ایک قوم بلکہ پوری انسانیت اس کے اثرات سے متأثر ہوتی ہے، کیونکہ ظلم کی یہ روایت سرحدوں کی محتاج نہیں رہتی بلکہ ایک خطرناک مثال بن کر دوسرے خطوں تک پھیلنے لگتی ہے۔

یہ صورت حال تہذیب کے دعووں کو بھی مشکوک بنا دیتی ہے۔ ترقی کے نعروں کے باوجود اگر انصاف کا چراغ مدھم ہو جائے تو معاشرتی ارتقا محض ظاہری رہ جاتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ نظام زیادہ دیر قائم نہیں رہتے جو قانون کو عدل کی بجائے طاقت کی ترجمانی بنا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تنبیہ صرف ایک خطے تک محدود نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے پیغام ہے کہ انسانیت کی بقا اسی میں ہے کہ قانون کو انصاف کا محافظ بنایا جائے، نہ کہ جبر کا ہتھیار۔

اسرائیلی پارلیمنٹ کی جانب سے فلسطینیوں کے لیے سزائے موت سے متعلق نیا قانون اسی نوعیت کا اقدام ہے، جس نے نہ صرف مقبوضہ سرزمین کے مظلوموں کے زخموں کو تازہ کیا ہے بلکہ انسانی حقوق کے عالمی دعووں کی قلعی بھی کھول دی ہے۔ یہ قانون دراصل طاقت کے غرور میں ڈوبی ہوئی اس ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے جو انصاف کو نہیں بلکہ انتقام کو قانون بنانا چاہتی ہے۔ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ فلسطین کی سرزمین گذشتہ کئی دہائیوں سے ریاستی جبر، اجتماعی سزا اور امتیازی پالیسیوں کی تجربہ گاہ بنی ہوئی ہے۔ بستیوں کی تعمیر سے لے کر محاصروں

تک، جبری گرفتاریوں سے لے کر ماورائے عدالت قتل تک، ہر حربہ آزمایا جا چکا ہے۔ اب سزائے موت کے اس قانون نے ظلم کے اس تسلسل کو ایک نئی قانونی حیثیت دے دی ہے۔ یہ فیصلہ نہ صرف بین الاقوامی انسانی قوانین سے متصادم ہے بلکہ انصاف کے بنیادی اصولوں کی بھی نفی کرتا ہے، کیونکہ کسی مقبوضہ علاقے میں قابض قوت کی جانب سے اس نوعیت کی سزا کا نفاذ بذاتِ خود قانونی جواز سے محروم ہے۔ اس قانون کی سب سے خطرناک جہت یہ ہے کہ یہ مقبوضہ علاقوں میں عدالتی نظام کو بھی طاقت کے تابع کر دیتا ہے۔ جب قابض قوت خود ہی مدعی، منصف اور جلاد بن جائے تو انصاف کا تصور محض ایک فریب رہ جاتا ہے۔ فلسطینی قیادت اور انسانی حقوق کی تنظیموں کی جانب سے اسے ماورائے عدالت قتل کو قانونی شکل دینے کی کوشش قرار دینا دراصل اسی حقیقت کا اظہار ہے۔ اس اقدام سے نہ صرف سیاسی قیدیوں اور کارکنوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی بلکہ مقبوضہ سرزمین میں خوف اور عدمِ تحفظ کا ایک نیا باب بھی کھل جائے گا۔

اسرائیلی سفاکیت کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ وہاں قانون سازی اکثر طاقت کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے کی جاتی رہی ہے۔ 1948ء سے لے کر آج تک فلسطینیوں کو ان کی زمین سے بے دخل کرنے، ان کی شناخت مٹانے اور ان کی مزاحمت کچلنے کے لیے مختلف اقدامات کیے گئے۔ کبھی بستیوں کے قیام کے ذریعے، کبھی محاصروں کے ذریعے اور کبھی امتیازی قوانین کے ذریعے۔ سزائے موت کا یہ قانون اسی سلسلے کی ایک تازہ کڑی ہے، جو اس بات کی غماز ہے کہ مسئلہ محض سکیورٹی نہیں بلکہ ایک قوم کی اجتماعی سزا ہے۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک پہلو عالمی سطح پہ انسانی حقوق کے نام پہ قائم اداروں کی بے بسی ہے۔ اقوامِ متحدہ، یورپی ادارے اور بین الاقوامی تنظیمیں بیانات تو جاری کرتی ہیں، تشویش کا اظہار بھی کرتی ہیں مگر ان کے پاس عملی اقدام کی قوت دکھائی نہیں دیتی۔ یہی وہ تضاد ہے جو عالمی نظام کی ساکھ مجروح کر رہا ہے۔ جب دنیا کے کسی اور خطے میں سزائے موت یا انسانی حقوق کی خلاف ورزی پہ فوری پابندیاں عائد کی جاتی ہیں، تو فلسطین کے معاملے میں یہ اصول کیوں خاموش ہو جاتے ہیں؟

یہ سوال عالمی انصاف کے تصور کو چیلنج کرتا ہے۔ یہ حقیقت بھی تلخ ہے کہ عالمی طاقتوں کی سیاسی مصلحتیں انسانی حقوق کے نعروں پہ غالب آ جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ظلم پہ محض مذمتی بیانات جاری ہوتے ہیں، جبکہ زمینی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔ اس خاموشی نے نہ صرف ظالم کے حوصلے بلند کیے ہیں بلکہ مظلوم کے لیے انصاف کی امید بھی کمزور کی ہے۔ فلسطینی عوام آج بھی اپنے بنیادی حقوق زندگی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں مگر عالمی ضمیر کی سرد مہری ان کا دکھ مزید گہرا کر رہی ہے۔ یہ قانون دراصل ایک انتباہ ہے کہ اگر انسانی حقوق کے عالمی ادارے اسی طرح بے اثر رہے تو انصاف کا عالمی نظام محض ایک علامتی ڈھانچہ بن کر رہ جائے گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب قانونی ادارے خاموش ہو جائیں تو ظلم کو دوام ملتا ہے اور جب انصاف کی آواز دب جائے تو انسانیت کی بنیادیں لرزنے لگتی ہیں۔ اس خموشی کے سائے میں جبر کو حوصلہ ملتا ہے، قانون کی معنویت کمزور پڑتی ہے اور مظلوم کی امیدیں ماند ہونے لگتی ہیں۔ پھر وہی ادارے جو انسانیت کے محافظ سمجھے جاتے تھے، محض علامتی وجود بن کر رہ جاتے ہیں اور ان کے بیانات زمینی حقیقت بدلنے سے قاصر دکھائی دیتے ہیں، ایسے میں ظلم ایک واقعہ نہیں رہتا بلکہ ایک مسلسل روایت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ طاقتور اپنے اقدامات کو جائز سمجھنے لگتے ہیں اور کمزوروں کے لیے انصاف کا دروازہ بتدریج بند ہوتا چلا جاتا ہے۔ عالمی ضمیر پہ ایک ایسی خموشی طاری ہو جاتی ہے جس میں صدائیں تو بہت ہوتی ہیں مگر اثر کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسانیت کے اجتماعی شعور کو شدید دھچکا پہنچتا ہے اور تہذیب کے بلند دعوے سوالیہ نشان بن جاتے ہیں۔

اگر انصاف کی آواز دبا دی جائے تو تاریخ کے اوراق پہ یہ خلا نمایاں ہو جاتا ہے۔ آنے والی نسلیں پوچھتی ہیں کہ جب ظلم اپنے عروج پہ تھا تو انصاف کے علمبردار کہاں تھے؟ جب بے گناہوں کے لہو سے زمین سرخ ہو رہی تھی تو عالمی ضمیر کیوں خموش تھا؟ جب قانون کی کتابیں کھلی تھیں تو عدل کے اوراق کیوں بند تھے؟ یہ سوالات صرف تاریخ کے صفحات پہ نہیں اُبھرتے بلکہ انسانیت کے ماتھے پہ لکھی ہوئی وہ تحریریں بن جاتے ہیں جنہیں وقت بھی مٹا نہیں سکتا۔

وہ یہ بھی جاننا چاہیں گی کہ کیا طاقت کی چکاچوند نے آنکھوں کو اندھا کر دیا تھا یا مفادات کی زنجیروں نے زبانوں سے قوت گویائی چھین لی تھی؟ کیا اصولوں کے ایوان واقعی اتنے کمزور تھے کہ ایک مظلوم قوم کی آہ سے بھی لرز نہ سکے؟ جب بچے ملبے کے درمیان اپنے مستقبل کے ٹکڑے تلاش کر رہے تھے اور مائیں صبر کی چادر میں درد چھپا رہی تھیں، تو کیا دنیا کے درباروں میں خموشی ہی سب سے بڑا فیصلہ بن گئی تھی؟ تاریخ کا یہی المیہ ہے کہ وہ صرف واقعات نہیں لکھتی، کردار بھی محفوظ کرتی ہے۔ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ کس نے سچ کہا اور کس نے خموشی کو حکمت کا نام دیا۔ اسی لیے آنے والا زمانہ صرف ظلم نہیں دیکھے گا بلکہ اس خموشی کو بھی یاد رکھے گا جو ظلم کے برابر کھڑی نظر آئی۔ اور یہی خموشی، شاید، انسانی ضمیر کے لیے سب سے سخت احتساب بن جائے گی، ایک ایسا احتساب جس میں سوال کم اور شرمندگی زیادہ ہوگی اور یہی سوال اداروں کی ساکھ کمزور کرتا ہے اور عالمی نظام کی بنیادیں ہلا دیتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ خموشی توڑی جائے، کیونکہ جب آواز اٹھتی ہے تو امید باقی رہتی ہے اور جب امید زندہ رہے تو انسانیت کی بنیادیں بھی مضبوط رہتی ہیں۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیا بیانات سے آگے بڑھے اور اصولی موقف اختیار کرے۔ انسانی حقوق کا تحفظ اسی وقت ممکن ہے جب قانون کو طاقت کا ہتھیار بنانے والوں کے سامنے موئثر مزاحمت کی جائے۔ ورنہ یہ قانون صرف فلسطین تک محدود نہیں رہے گا بلکہ عالمی انصاف کا تصور بھی کمزور کر دے گا۔ فلسطین کی سرزمین آج پھر انصاف کی منتظر ہے۔ اس کی خاک میں صدیوں کی تاریخ سسک رہی ہے، اس کے آسمان پہ دعاؤں کی صدائیں معلق ہیں اور اس کے گلی کوچوں میں مظلومیت کی داستانیں رقم ہو رہی ہیں۔ فلسطین کے بچے اپنے کھلونوں کی جگہ ملبے کے درمیان خواب تلاش کر رہے ہیں، ان کے ننھے ہاتھوں میں رنگین گیندوں کی بجائے ٹوٹے ہوئے پتھروں کے ٹکڑے ہیں اور ان کی ہنسی بارود کی گونج میں دب کر رہ گئی ہے۔ کھیل کے میدانوں کی جگہ ویران گلیاں ہیں جہاں دوڑتے قدم بھی خوف کی چاپ سن کر ٹھٹھک جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کہانیوں کی چمک نہیں بلکہ دھوئیں سے بھرا ہوا آسمان جھلملاتا ہے، وہ اسکول کی گھنٹی کی آواز کی جگہ سائرن کی چیخ سن کر چونک اٹھتے ہیں، بستوں کی جگہ کندھوں پہ بے یقینی کا بوجھ ہے اور کاپیوں کی جگہ یادوں کے اوراق ہیں جن پہ ادھورے خواب درج ہیں۔ وہ مٹی میں گھروندے نہیں بناتے بلکہ ملبے کے ڈھیروں کو دیکھ کر اپنے ٹوٹے ہوئے گھروں کی تصویریں ذہن میں محفوظ کرتے ہیں۔ ان کی معصومیت بھری گفتگو میں کھلونوں کا ذکر کم اور سلامتی کی دعا زیادہ سنائی دیتی ہے، ان کے چہروں پہ بچپن کی شوخی نہیں بلکہ وقت سے پہلے آئی سنجیدگی کا عکس ہے، جیسے حالات نے ان سے عمر کا حق چھین کر انہیں خموشی کا ہنر سکھا دیا ہو۔ یہ وہ بچپن ہے جو کھیل کے میدانوں میں نہیں بلکہ آزمائش کی دہلیز پر پروان چڑھ رہا ہے، ایک ایسا بچپن جو دنیا سے صرف مسکراہٹ نہیں بلکہ امن وسکون کی بھیک مانگ رہا ہے۔

مائیں صبر کے دامن میں آنسو چھپا کر امید کی شمع جلائے بیٹھی ہیں اور بوڑھی آنکھیں آزادی کی صبح کا انتظار کرتے کرتے تھک سی گئی ہیں، ان کے لبوں پہ دعا ہے مگر دل میں ایک طویل آزمائش کی داستان رقم ہے۔ وہ اپنے بچوں کے سروں پہ ہاتھ رکھ کر انہیں حوصلہ دیتی ہیں، گویا ہر لرزتی ہوئی سانس کے ساتھ یقین کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ان کی خموشی میں بھی ایک صدا ہے، جو آسمان سے مخاطب ہو کر انصاف کی التجا کرتی ہے۔ بوڑھی آنکھیں جس نے کئی موسموں کی گردش دیکھی، اب افق کو ٹکٹکی باندھے اس روشنی کی منتظر ہیں جو شاید برسوں سے وعدہ بن کر رہ گئی ہے۔ ان کی جھریوں میں وقت کی تھکن ہی نہیں بلکہ جدوجہد کی پوری تاریخ سمٹ آئی ہے۔ وہ ہر طلوعِ سحر کو اس امید سے دیکھتی ہیں کہ شاید آج کی صبح غلامی کی دھند کو چیر دے، مگر شام ہوتے ہوتے ان کی پلکوں پہ انتظار کی نمی مزید گہری ہو جاتی ہے، پھر بھی حیرت یہ ہے کہ امید کا چراغ بجھتا نہیں۔ مائیں اپنے آنچل میں یقین کی دنیا سمیٹے بیٹھی ہیں اور بوڑھی آنکھیں تھکن کے باوجود افق سے نظریں نہیں ہٹاتیں۔ گویا صبر اور امید نے مل کر ایک ایسا عہد باندھ لیا ہے جو حالات کی سختی سے ٹوٹتا نہیں بلکہ ہر آزمائش کے ساتھ اور مضبوط ہوتا جاتا ہے-- ایک خموش مگر پُراثر اعلان کہ اندھیری رات کتنی ہی

طویل کیوں نہ ہو، صبح کا وعدہ بہرحال باقی رہتا ہے۔ فلسطین یہ وہ سرزمین ہے جس نے ہمیشہ امن، اخوت اور انسانیت کا پیغام دیا مگر آج اسی دھرتی پہ ظلم کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ مسجدوں کی اذانیں اب بھی فضا میں بلند ہوتی ہیں لیکن ان کے ساتھ ہی بے بسی کی صدائیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ ہر گرتی ہوئی دیوار گویا انسانیت کا ضمیر جھنجھوڑ رہی ہے اور ہر ٹوٹتا ہوا گھر عالمی انصاف کے ایوانوں سے سوال کر رہا ہے۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ ظلم کی رات کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، انصاف کا سورج ضرور طلوع ہوتا ہے۔ فلسطین کی سرزمین بھی اسی امید کے ساتھ زندہ ہے کہ عدل و مساوات کا چراغ پھر روشن ہوگا، امن کی ہوائیں دوبارہ چلیں گی اور زخم خوردہ دلوں کو سکون نصیب ہوگا۔ یہ انتظار صرف ایک قوم کا نہیں بلکہ پوری انسانیت کے ضمیر کا امتحان ہے اور جب یہ امتحان سرخروئی میں بدلے گا تو مظلوم کی آہ، صبر کی قوت اور دعا کی تاثیر مل کر تاریخ کا رخ بدل دیں گی۔

قانون کے ایوانوں میں جب فیصلے کاغذ پہ ثبت ہوتے ہیں تو انہیں انصاف کی علامت سمجھا جاتا ہے، مگر ہر تحریر شدہ قانون لازماً عدل کی ضمانت نہیں ہوتا۔ بعض اوقات الفاظ کی ترتیب میں وہ قوت چھپی ہوتی ہے جو کمزوروں کے لیے دیوار اور طاقتوروں کے لیے راستہ بن جاتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب قانون کی ظاہری صورت اور اس کی اخلاقی روح کے درمیان فاصلے واضح ہونے لگتے ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ قانون منظور ہو گیا بلکہ سوال یہ ہے کہ کیا دنیا کا ضمیر بھی اس کے ساتھ ہی خموش ہو گیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ صرف فلسطین کی شکست نہیں بلکہ پوری انسانیت کی اخلاقی شکست ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب تاریخ اپنے اوراق پلٹ کر دیکھتی ہے کہ طاقت کے ایوانوں میں بیٹھنے والوں نے انصاف کے چراغ بجھنے کیوں دیے، جب اصولوں کی بات کرنے والی دنیا نے مصلحت کی چادر اوڑھ لی اور انسانی حقوق کے دعوے کاغذی تحریروں تک محدود ہو کر رہ گئے۔ ضمیر کی عدالت میں یہ سوال ہمیشہ گونجتا رہے گا کہ کیا طاقت کا فیصلہ ہی حق کا پیمانہ بن گیا ہے؟ اگر مظلوم کی فریاد سننے والے کان بند ہو جائیں اور ظلم کو روکنے والے ہاتھ لرزنے لگیں تو انسانیت کی بنیادیں ہلنے لگتی ہیں۔ فلسطین کا دکھ دراصل ایک خطے کا درد و کرب نہیں، یہ اس عالمی نظام کی آزمائش ہے جو انصاف، مساوات اور امن کے نام پہ قائم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

جب ایک بچے کی چیخ، ایک ماں کی دعا اور ایک بوڑھے کی امید عالمی سیاست کے شور میں دب جائے تو یہ خموشی محض خموشی نہیں رہتی بلکہ اجتماعی بے حسی کا اعلان بن جاتی ہے۔ ایسے میں الفاظ اپنی تاثیر کھونے لگتے ہیں اور اصول معنویت سے خالی محسوس ہوتے ہیں۔ ایوانوں میں قراردادیں پاس ہوتی ہیں مگر زمین پہ آنسو بہتے رہتے ہیں، ہجوم میں امن کے نعرے بلند ہوتے ہیں مگر فضاؤں میں بارود کی بو باقی رہتی ہے۔ انہی حالات میں ضمیر کی عدالت یہ سوال اٹھاتی ہے کہ کیا انسان نے ترقی کے نام پہ اپنے احساسات و جذبات قربان کر دیے ہیں؟ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب گفتگو کی چمک مدھم پڑنے لگتی ہے اور اصول محض کتابوں کی سطور تک محدود ہو جاتے ہیں۔ طاقت کے ایوانوں میں بحثیں جاری رہتی ہیں مگر زمین پہ بکھری ہوئی سسکیاں کسی فیصلے کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ یہ وہ کیفیت ہے جہاں آنسو دلیل سے زیادہ سچ بولتے ہیں اور خموشی احتجاج سے زیادہ گہرا پیغام دیتی ہے۔ ایک بچہ جو امن کا خواب دیکھنا چاہتا تھا، خوف کی تعبیر سے آشنا ہو جاتا ہے، ایک ماں جو دعا میں تحفظ مانگتی ہے، بے یقینی کے سائے میں جینے پہ مجبور ہو جاتی ہے اور ایک بوڑھا جس کی ناتواں آنکھیں آزادی کی صبح کی منتظر تھیں، وقت کی گرد میں امید کی لو بچانے کی جدوجہد کرتا رہتا ہے۔

جب یہ تینوں صدائیں ایک ساتھ دب جائیں تو دنیا کی ترقی کا شور کھوکھلا محسوس ہونے لگتا ہے۔ یہ منظر یاد دلاتا ہے کہ سیاست کے بلند نعروں سے زیادہ اہم وہ انسانی آوازیں ہیں جو انصاف کی بنیاد بنتی ہیں۔ اگر یہ آوازیں سنائی دینا بند ہو جائیں تو تہذیب کا سارا فخر محض ایک گونج بن کر رہ جاتا ہے۔۔۔ اور یہی گونج تاریخ کے سینے میں ایک خموش مگر باوزن سوال کی صورت میں ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

خموشی کبھی کبھی ظلم کی سب سے مضبوط پشت پناہ بن جاتی ہے۔ جب بولنے والے لب سی لیے جائیں اور سننے والے کان بند کر لیے

جائیں تو مظلوم کی آواز خلا میں معلق رہ جاتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب تاریخ گواہی دیتی ہے کہ ظلم صرف ظالم کے ہاتھوں نہیں بڑھتا بلکہ خموش تماشائیوں کی بے عملی بھی اسے قوت دیتی ہے، لیکن اندھیروں کی یہی شدت روشنی کی ضرورت اور نمایاں کردیتی ہے۔ شاید کسی کونے میں اب بھی کوئی دل تڑپ رہا ہو، کوئی قلم جاگ رہا ہو، کوئی دعا اٹھ رہی ہو۔ یہی چھوٹی چھوٹی روشنیاں مل کر امید کا چراغ بناتی ہیں، کیونکہ جب تک ایک دل بھی انسانیت کے درد سے دھڑکتا ہے، اجتماعی بے حسی مکمل نہیں ہوسکتی۔ اور یہی امید تاریخ کو یہ پیغام دیتی ہے کہ ظلم کی گونج جتنی بلند ہو، انسانیت کی خموش دعا اس سے زیادہ طاقت رکھتی ہے۔

ان تمام تاریکیوں کے باوجود تاریخ صرف مایوسی کی داستان نہیں سناتی۔ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ ظلم چاہے کتنا ہی مضبوط دکھائی دے، انسانیت کے اندر ایک روشنی ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ حالات کی سختی وقتی طور پہ سچائی کو ضرور دبا دیتی ہے مگر اسے مٹا نہیں سکتی۔ یہی حقیقت دلوں میں امید کی ایک خموش کرن پیدا کرتی ہے۔

تاریخ کا ایک اور پہلو بھی ہے-- ضمیر کبھی مکمل طور پہ مرتا نہیں۔ وہ خموش ہوسکتا ہے، دبایا جاسکتا ہے مگر کسی نہ کسی لمحے پھر بیدار ہوتا ہے۔ شاید یہی امید فلسطین کے دلوں میں زندہ ہے کہ دنیا کا سویا ہوا ضمیر ایک دن جاگے گا، انصاف کا ترازو پھر سیدھا ہوگا اور ظلم کے اندھیرے کو انسانیت کی روشنی شکست دے گی۔ کیونکہ اگر امید باقی ہے تو انسانیت ابھی زندہ ہے اور جب انسانیت زندہ ہو تو انصاف کی صبح دور نہیں ہوتی۔

یہی وہ لمحہ ہے جہاں تاریخ اپنے قلم سے شہادت تحریر کررہی ہے کہ ظلم کے مقابلے میں خموشی بھی جرم ہے اور انسانی حقوق کے نام پہ قائم اداروں کی بے بسی خود ایک سوالیہ نشان بن چکی ہے۔

یوں فلسطین کی سرزمین صرف ایک جغرافیائی خطہ نہیں رہی بلکہ انسانیت کے ضمیر کی ایک زندہ علامت بن چکی ہے۔ اس کی گلیوں میں بکھرا ہوا ملبہ دراصل انسانی اقدار کے ٹوٹنے کی کہانی سناتا ہے اور اس کے آسمان پہ بلند ہوتی دعائیں امید کی نئی تعبیر رقم کرتی ہیں۔ وقت گذر جائے گا، حالات بدل جائیں گے، طاقت کے توازن بھی تبدیل ہو جائیں گے مگر مظلوم کی آہ اور صبر کی روشنی تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ زندہ رہے گی اور یہی امید انسانیت کو یہ پیغام دیتی ہے کہ اندھیروں کی شدت چاہے کتنی ہی بڑھ جائے، روشنی کی کرن اپنا راستہ ضرور بنا لیتی ہے۔ جب دلوں میں احساس باقی ہو، قلموں میں صداقت کی روشنائی ہو اور دعاؤں میں یقین کی حرارت ہو تو ظلم کی دیواریں زیادہ دیر قائم نہیں رہتیں۔ فلسطین کا دکھ ایک پکار ہے-- انصاف کے لیے، بیداری کے لیے اور انسانیت کے احیاء کے لیے، یہ محض ایک سرزمین کی آہ نہیں بلکہ مظلوم دلوں کی مشترکہ صدا ہے جو سرحدوں سے بلند ہو کر ضمیر کو جھنجھوڑتی ہے۔ اس پکار میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور امید کی حرارت بھی، گویا درد نے خود کو دعا کی صورت میں ڈھال لیا ہو۔

یہ صدا یاد دلاتی ہے کہ خموش رہنا بھی ایک انتخاب ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ خموشی تاریخ کے کٹہرے میں سوال بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ فلسطین کا دکھ انسانیت کو آئینہ دکھاتا ہے کہ اصول صرف تقریروں کے لیے نہیں بلکہ عمل کے لیے ہوتے ہیں۔ اگر دلوں میں احساس زندہ ہو تو فاصلے معنی نہیں رکھتے اور اگر ضمیر بیدار ہو جائے تو کمزوروں کی فریاد بھی طاقت بن جاتی ہے، اسی لیے یہ دکھ محض ماتم نہیں بلکہ بیداری کا پیغام ہے۔ یہ انسان کو یاد دلاتا ہے کہ ظلم کے مقابلے میں سب سے پہلی ذمہ داری احساس زندہ رکھنا ہے۔ جب دلوں میں یہ احساس باقی رہے تو امید کا چراغ بجھتا نہیں اور یہی چراغ ایک دن راستہ دکھاتا ہے-- ایسا راستہ جہاں انصاف صرف لفظ نہیں بلکہ حقیقت بن کر ابھرتا ہے اور انسانیت اپنی اصل روشنی کے ساتھ دوبارہ زندہ ہوتی ہے۔

اور شاید یہی وہ پیغام ہے جو آنے والی نسلوں کو یاد رہے گا کہ تاریخ نے ظالموں کی طاقت نہیں، مظلوموں کے صبر کو دوام بخشا ہے۔ جب بھی انسانیت نے اپنے ضمیر کی آواز سنی، انصاف نے نئی صبح کا در کھولا۔ اس لیے امید کا چراغ بجھنے نہ دیں، کیونکہ یہی چراغ کل کی روشن صبح کا پیش خیمہ ہے......اور یہی یقین انسانیت کی اصل بقا ہے۔

□□□□

محمد ملک الظفر سہسرامی

غزہ ہزار دنوں کا اندھیرا اور انسانی ضمیر کی شکست

ایک ایسے عہد کی داستان جس میں روشنیوں سے بھری دنیا ایک مظلوم شہر کا اندھیرا نہ مٹا سکی

تہذیبیں صرف بلند و بالا عمارتوں، وسیع شاہراہوں، چمکتے شہروں اور جدید ایجادات سے زندہ نہیں رہتیں۔ ان کی اصل زندگی اس وقت تک برقرار رہتی ہے جب تک انسان کے دل میں رحم زندہ ہو، انصاف کی شمع روشن ہو، مظلوم کی آہ سننے والا ضمیر بیدار ہو اور طاقت، انسانیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے رکھے۔ جس دن یہ چراغ بجھنے لگیں، اسی دن تہذیبوں کا زوال شروع ہو جاتا ہے، خواہ ان کے شہر لاکھوں قمقموں سے کیوں نہ جگمگا رہے ہوں۔

غزہ کا المیہ درحقیقت ایک محصور شہر کا المیہ نہیں، یہ ہمارے عہد کی تہذیبی شکست کا سب سے المناک باب ہے۔ یہ المیہ صرف احساس یا تاثر نہیں بلکہ ایک تلخ حقیقت بھی ہے۔ اقوامِ متحدہ کے اداروں کی تازہ رپورٹوں کے مطابق غزہ کی آبادی کا بہت بڑا حصہ بے گھر ہو چکا ہے، لاکھوں افراد شدید غذائی، طبی اور آبی بحران کا سامنا کر رہے ہیں، جبکہ بجلی، صاف پانی، صحت اور نکاسیٔ آب کا بنیادی ڈھانچہ بہت حد تک مفلوج ہو چکا ہے۔ اقوامِ متحدہ اور دیگر بین الاقوامی ادارے مسلسل خبردار کر رہے ہیں کہ غزہ کا انسانی بحران جدید تاریخ کے شدید ترین انسانی المیوں میں شمار ہونے لگا ہے۔ یہاں صرف عمارتیں ملبے میں تبدیل نہیں ہوئیں، یہاں انسانی اقدار کے مینار بھی لرز گئے ہیں۔ یہاں صرف بجلی کے تار نہیں کٹے بلکہ انسانیت کے رشتے بھی منقطع ہوئے ہیں۔ یہاں صرف پاور اسٹیشن خموش نہیں ہوئے بلکہ عالمی انصاف کی آواز بھی مدھم پڑ گئی ہے۔ اور یہاں صرف راتیں تاریک نہیں ہوئیں بلکہ وہ ضمیر بھی تاریکی میں ڈوب گئے جو کبھی مظلوم کی ایک آہ پہ بے چین ہو جاتے تھے۔

شاید آنے والے زمانوں کے مورخ جب اکیسویں صدی کے اوراق پلٹیں گے تو وہ حیرت سے لکھیں گے کہ یہ وہی صدی تھی جس نے عقل کو حیرت انگیز بلندیوں تک پہنچایا، سائنس کو حیرتوں کا ہم سفر بنایا، زمین اور آسمان کے فاصلے سمیٹ دیے مگر اسی صدی میں ایک ایسا شہر بھی تھا جو ہزار دنوں تک اندھیروں میں ڈوبا رہا اور دنیا کی بے شمار روشنیاں اس کے اندھیرے کو شکست نہ دے سکیں۔

یہ مضمون صرف غزہ کی بجلی کے تعطل کی داستان نہیں بلکہ اس عہد کے زخمی ضمیر، خموش انسانیت اور شکست خوردہ تہذیب کا نوحہ ہے، ایک ایسا نوحہ جو صرف آنکھیں نم نہیں کرتا بلکہ دلوں سے یہ سوال بھی کرتا ہے کہ اگر روشنیوں سے بھرپور دنیا ایک مظلوم شہر کا اندھیرا دور نہ کر سکی، تو آخر اندھیرا غزہ میں تھا یا انسانیت کے باطن میں؟ اس سوال کا جواب کسی فلسفی کی کتاب میں نہیں، غزہ کی راتوں میں ملتا ہے۔ وہاں اندھیرا صرف دیکھا نہیں جاتا، گزرتی ہوئی زندگی کے لمحوں میں خموشی کے ساتھ سمیٹا جاتا ہے، وہاں تاریکی صرف آنکھوں پہ نہیں اترتی، دلوں اور تقدیروں پہ بھی سایہ کر لیتی ہے۔ اگر کوئی اس عہد کی تہذیبی شکست اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہے تو اسے غزہ کی ایک رات میں داخل ہونا ہوگا، جہاں خموشی بھی سسکتی ہے اور تاریکی بھی گواہی دیتی ہے۔

رات جب زمین پر اترتی ہے تو دنیا کے بیشتر شہروں میں چراغ روشن ہوتے ہیں۔ کھڑکیوں سے زرد روشنی باہر جھانکتی ہے، بازار جگمگاتے ہیں، گھروں میں بچوں کی ہنسی گونجتی ہے، اسپتالوں میں مشینیں زندگی کی دھڑکن سنبھالتی ہیں اور مسجدوں کے میناروں سے اذان کی آواز روشنی کے سائے میں بلند ہوتی ہے۔ انسان نے صدیوں

کی جدوجہد کے بعد اندھیرے پہ فتح حاصل کی تھی۔ بجلی محض ایک ایجاد نہیں رہی، وہ تہذیب کی سانس بن گئی، زندگی کی روانی بن گئی، انسانی تمدن کی نبض بن گئی۔ مگر دنیا کے نقشے پہ ایک ایسی سرزمین بھی ہے جہاں رات اب رات نہیں، ایک طویل ماتم ہے، جہاں دن بھی روشنی نہیں لاتا، صرف آگ برساتا ہے، جہاں اندھیرا سورج ڈوبنے سے نہیں بلکہ انسانیت کے ضمیر کے بجھ جانے سے پیدا ہوا ہے۔

اس سرزمین کا نام غزہ ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس نے ہزار دنوں سے بجلی کا چہرہ نہیں دیکھا۔ اقوامِ متحدہ اور انسانی امدادی اداروں کی متعدد رپورٹیں اس امر کی تصدیق کرتی ہیں کہ طویل عرصے سے بجلی، ایندھن اور توانائی کے نظام کی تباہی نے اسپتالوں، پانی کی فراہمی اور نکاسیٔ آب کے پورے نظام کو مفلوج کر دیا ہے۔

ہزار دن... یہ صرف ایک عدد نہیں، ایک عہد ہے۔

ایک ایسا عہد جس میں ہزاروں بچے اندھیرے میں پیدا ہوئے، ہزاروں نے اندھیرے میں اپنے والدین کو دفن کیا، ہزاروں مائیں اندھیرے میں اپنے نومولود کو سینے سے لگائے بیٹھی رہیں اور ہزاروں بوڑھی آنکھیں اس امید میں پتھرا گئیں کہ شاید آج رات کہیں کوئی چراغ جل اٹھے۔ ایک ایسا عہد جس میں ہزاروں نوجوان اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے خوابوں کو ملبے تلے بکھرتا دیکھتے رہے۔ جن ہاتھوں میں کتابیں ہونی چاہئیں تھیں، وہ اپنے ہی گھروں کی اینٹیں ہٹاتے رہے۔ جن آنکھوں میں مستقبل کے سنہرے خواب آباد تھے، ان میں دھوئیں، راکھ اور شکستہ تمناؤں کی پرچھائیاں اترتی چلی گئیں۔ کتنے ہی باپ اپنے بچوں کو ایک محفوظ رات دینے کی حسرت لیے دنیا سے رخصت ہو گئے اور کتنے ہی بچے اس عمر میں بڑے ہو گئے جب کہ انہیں ابھی بچہ ہی رہنا تھا۔

یہ ایک ایسا عہد ہے جس میں ہزاروں طالب علموں نے چراغ کی روشنی میں نہیں بلکہ آہ و بکا کے سائے میں اپنی کتابیں بند کر دیں، ہزاروں مریض زندگی کی آس لیے مشینوں کی خموشی کو تکتے رہے، ہزاروں مائیں اپنے بچوں کی بھوک، پیاس اور بے بسی کو سینے میں دفن کر کے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتی رہیں اور ہزاروں باپ ہر غروبِ آفتاب کے ساتھ یہ سوچ کر لرز اٹھتے رہے کہ نہ جانے آنے والی رات ان کے خاندان پہ کیا قیامت لے کر اترے گی۔

یہ صرف ہزار دنوں کا اندھیرا نہیں، ہزاروں ادھورے خوابوں کا ماتم ہے، ہزاروں مسکراہٹوں کا نوحہ ہے، ہزاروں بچھڑتی ہوئی سانسوں کی خموش داستان ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں صرف شہر ویران نہیں ہوئے، امیدیں ویران ہوئیں، صرف عمارتیں نہیں گریں، نسلوں کے خواب زمیں بوس ہوئے، صرف بجلی نہیں بجھی، زندگی کی بے شمار روشن تمنائیں بھی تاریکی کے حوالے کر دی گئیں۔

یہ اندھیرا صرف تاریکی نہیں، ایک مکمل تہذیبی شکست کا استعارہ ہے۔

ایسے مواقع پہ قرآنِ مجید انسان کو یہ یاد دلاتا ہے کہ ظلم خواہ کتنا ہی طاقت ور دکھائی دے، اس کی عمر ہمیشہ محدود ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (سورۂ ابراہیم:42)

ترجمہ: اور ہرگز اللہ کو بے خبر نہ جاننا ظالموں کے کام سے انہیں ڈھیل نہیں دے رہا ہے مگر ایسے دن کے لیے جس میں آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔

یہ صرف بجلی کے بلب بجھ جانے کا المیہ نہیں بلکہ ان اقدار کے بجھ جانے کا نوحہ ہے جن پہ انسانی تہذیب نے اپنی عظمت کی عمارت کھڑی کی تھی۔ یہ اس احساس کی شکست ہے کہ انسان، انسانی درد کو اپنا درد سمجھتا ہے۔ یہ اس انصاف کی شکست ہے جس کے نام پہ عالمی ادارے قائم ہوئے، یہ اس رحم کی شکست ہے جسے ہر مذہب نے انسانیت کی معراج قرار دیا اور یہ اس ضمیر کی شکست ہے جسے زندہ معاشروں کی سب سے بڑی دولت کہا جاتا ہے۔

یہ اندھیرا صرف غزہ کی گلیوں میں نہیں اترا، یہ عالمی سیاست کے ایوانوں پہ بھی سایہ فگن ہوا، یہ بین الاقوامی قانون کی کتابوں کے صفحات پہ بھی پھیل گیا، یہ انسانی حقوق کے بلند بانگ نعروں کی معنویت پہ بھی چھا گیا اور یہ ان دلوں تک بھی جا پہنچا جو ظلم و ستم کے طوفان اٹھتے دیکھتے رہے مگر ان کی دھڑکنوں میں احتجاج کی کوئی لہر پیدا

نہ ہو سکی۔

یہ وہ اندھیرا ہے جس میں صرف چراغ نہیں بجھے بلکہ اعتماد بجھ گیا، امید بجھ گئی، انصاف کی لو مدھم پڑ گئی اور انسانیت کا چہرہ گرد و غبار سے ڈھک گیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تہذیب نے اپنی تمام تر ترقیات کے باوجود اپنے ہی ضمیر کی شمع پہ اپنے ہاتھوں سے پھونک ماردی ہو۔

اور شاید تاریخ اس اندھیرے کو صرف بجلی کی عدم موجودگی کے عنوان سے یاد نہ کرے بلکہ اسے اس عہد کے نام سے یاد کرے جب روشنیوں سے بھری دنیا نے ایک شہر کو اندھیروں کے سپرد کر دیا اور سب سے زیادہ تاریکی آسمان پہ نہیں بلکہ انسان کے باطن میں اتر آئی تھی۔

جب بجلی جاتی ہے تو دنیا کے ترقی یافتہ شہروں میں لوگ چند لمحوں کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں۔ موبائل کی بیٹری ختم ہونے لگتی ہے، پنکھے رک جاتے ہیں، انٹرنیٹ بند ہو جاتا ہے اور لوگ فوراً شکایت درج کرا دیتے ہیں۔ لیکن غزہ میں شکایت کس سے کی جائے؟ وہاں تو شکایت سننے والے کان بھی ملبے تلے دفن ہو چکے ہیں۔

غزہ کی گلیاں آج بھی موجود ہیں مگر ان میں روشنی نہیں چلتی، صرف یادیں چلتی ہیں۔ وہ بازار جہاں کبھی شام کے بعد زندگی مسکراتی تھی، آج سورج ڈھلتے ہی قبرستان کی خموشی اوڑھ لیتے ہیں۔ وہ مکان جہاں کبھی بچوں کے قہقہے گونجتے تھے، اب دیواریں بھی نہیں رہیں کہ گونج واپس لوٹ سکے۔ خیموں کی ایک بے کنار بستی ہے اور ان خیموں میں آباد انسان ایسے محسوس ہوتے ہیں جیسے کسی نے انہیں زمانے کے کنارے لاکر بھلا دیا ہو۔

دن کی دھوپ ان خیموں کو بھٹی بنا دیتی ہے۔ رات کا اندھیرا انہیں قبر کا احساس دیتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان زندگی کہیں سسک رہی ہوتی ہے۔ دوپہر کی تیز دھوپ میں جب ریت آگ بن جاتی ہے تو خیموں کے اندر بیٹھے بچے اپنے ننھے ہاتھوں سے ماتھے پر اُمڈ آنے والے پسینے کے قطرے پونچھتے رہتے ہیں۔ سورج کی بے رحم کرنیں خیموں کے باریک کپڑے کو چیرتی ہوئی اندر اترتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آسمان نے آگ کے ہزاروں تیر زمین پر برسا دیے ہوں۔ گرم ہوا کا ہر جھونکا ٹھنڈک کا پیامبر نہیں بلکہ دہکتے ہوئے تنور کی ایک نئی لہر بن کر آتا ہے، جو ننھے جسموں کی باقی ماندہ طاقت بھی نچوڑ لیتا ہے۔

ان بچوں کی آنکھوں میں کھیلنے کی شرارتیں نہیں، گرمی سے بوجھل ہوتی ہوئی پلکوں کی تھکن بسی ہوئی ہے۔ ان کے لبوں پہ ہنسی کی بجائے پیاس کی ایک خموش فریاد ہے اور ان کے چہروں پہ معصومیت کے ساتھ ایسی بے بسی رقم ہے جسے دیکھ کر پتھر بھی پگھل جائیں۔ کوئی بچہ اپنی ماں کے آنچل سے ہوا لینے کی ناکام کوشش کرتا ہے، کوئی خالی بوتل کو بار بار ہونٹوں سے لگا کر یہ بھول جانا چاہتا ہے کہ اس میں پانی نہیں اور کوئی اپنے باپ کے سینے سے لپٹ کر صرف اتنا چاہتا ہے کہ شاید اس کے بازوؤں کا سایہ سورج کی تپش سے کچھ دیر کی پناہ دے دے۔

خیموں کے اندر سانس لینا بھی ایک آزمائش بن جاتا ہے۔ پسینہ صرف جسم سے نہیں بہتا، جیسے صبر بھی قطرہ قطرہ پگھل رہا ہو۔ ہر گذرتا لمحہ آگ کے ایک نئے دائرے میں داخل ہونے کا احساس دلاتا ہے اور ہر گذرتی دوپہر اپنے پیچھے کئی معصوم چہروں کی تازگی، کئی بوڑھی آنکھوں کی چمک اور کئی ماؤں کے حوصلے کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔

پھر جب شام ڈھلتی ہے تو گرمی کچھ کم ضرور ہو جاتی ہے مگر اندھیرا اپنے ساتھ ایک اور امتحان لے آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ غزہ کے خیموں میں رہنے والوں کی قسمت میں نہ دن کا سکون لکھا گیا ہے اور نہ رات کا اطمینان، دن آگ کی قید ہے اور رات اندھیرے کی اسیری۔

اسی خیمے کے کسی تاریک گوشے میں ایک ننھا بچہ اپنی خشک ہوتی ہوئی زبان سے معصومانہ لہجے میں اپنی ماں سے کہتا ہے:

''امّی... پانی...!'' یہ صرف پانی کے لیے ایک صدا نہیں تھی بلکہ ایک پوری کائنات کی بے بسی اس ایک صدا میں سمٹ آتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے معصوم صفت بچے کے خشک ہونٹوں سے نکلنے والی ننھی سی آواز زمین سے اٹھ کر آسمان کے دروازوں تک دستک دے رہی ہو۔ اس ایک لفظ میں پیاس بھی ہے، معصومیت بھی، امید بھی ہے، بے بسی بھی اور ایک ایسی خموش فریاد بھی جسے سن کر پتھر پگھل جائیں۔

یہ صرف ایک بچے کی آواز نہیں رہتی بلکہ ہزاروں خیموں میں بسنے والے لاکھوں بچوں کی اجتماعی پکار بن جاتی ہے وہ بچے جنہوں نے

ابھی زندگی کا مفہوم بھی نہیں جانا مگر محرومی کا ذائقہ چکھ لیا، جنہیں ابھی تو کھلونوں سے کھیلنا تھا، رنگ برنگی تتلیوں کے پیچھے دوڑنا تھا، بارش کے پانی میں کشتیاں بہانی تھیں، ماؤں کی گود میں بے فکر ہو کر سو جانا تھا اور باپ کی انگلی تھام کر زندگی کی پہلی راہوں سے آشنا ہونا تھا مگر قسمت نے انہیں ملبے، دھوئیں، اور تپتی ہوئی ریت سے آشنا کر دیا۔

جن آنکھوں میں رنگین غباروں کی چمک ہونی چاہیے تھی، وہاں دھوئیں کے سیاہ بادل اتر آئے، جن ہاتھوں میں کھلونے ہونے چاہیے تھے، وہ اپنے ہی بکھرے ہوئے گھر کی اینٹیں ٹٹولنے لگے، جن ہونٹوں پہ نظموں، لوریوں اور معصوم شرارتوں کی ہنسی سجنی چاہیے تھی وہاں پیاس، خوف اور بھوک کی خموشیاں بسیرا کر گئیں۔

یہ وہ بچے ہیں جنہوں نے اسکول کی گھنٹی سے پہلے بمباری کی آواز پہچان لی، جنہوں نے کہانیوں کی پریوں سے پہلے ایمبولنس کے سائرن سن لیے، جنہوں نے عید کے نئے لباس سے پہلے کفن کا سفید رنگ دیکھ لیا اور جنہوں نے زندگی کے پہلے سبق سے پہلے جدائی، ہجرت اور محرومی کے معانی سیکھ لیے۔

ان کے بچپن کا سب سے زیادہ خوبصورت کھلونا شاید اب ایک محفوظ کتاب، ایک روشن چراغ، ٹھنڈے پانی کا ایک گھونٹ یا اپنے ماں باپ کی محفوظ آغوش بن چکا ہے۔ ان کی خواہشیں بھی اب بچوں جیسی نہیں رہیں، وہ کھلونے نہیں مانگتے، وہ صرف ایک ایسی رات مانگتے ہیں جس میں بموں کی گرج نہ ہو، ایک ایسی صبح مانگتے ہیں جس میں دھواں نہ ہو اور ایک ایسا گھر مانگتے ہیں جس کی چھت آسمان کے رحم و کرم پہ نہ ہو۔ اور شاید تاریخ جب غزہ کے بچوں کا تذکرہ کرے گی تو یہ ضرور لکھے گی کہ وہ ایسی نسل تھی جس کے بچپن سے صرف کھلونے نہیں چھینے گئے تھے بلکہ پورا بچپن ہی چھین لیا گیا تھا۔ ان کی پہلی خواہش کھیل نہیں، ایک گھونٹ پانی تھی، پہلا خواب عید کا لباس نہیں، ایک محفوظ رات تھی اور پہلی دعا کسی نئی چیز کے لیے نہیں بلکہ صرف زندہ رہنے کے لیے تھی۔

ایسے لمحات میں انسان کو قرآن کا وہ آفاقی اصول یاد آتا ہے جس میں ایک بے گناہ جان کی حرمت پوری انسانیت کی حرمت قرار دی گئی ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا (سورۃ المائدۃ:32)

ترجمہ: جس نے کوئی جان قتل کی بغیر جان کے بدلے یا زمین میں فساد کے تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کیا۔

غزہ کے معصوم بچوں کا دکھ اسی آفاقی انسانی اصول کی یاد دہانی ہے کہ ہر بے قصور جان پوری انسانیت کی امانت ہے۔ اس کے الفاظ میں صرف پانی کی طلب نہیں ہوتی اس میں زندگی کی التجا ہوتی ہے، اس میں محفوظ بچپن کی ایک آرزو ہوتی ہے، پرسکون رات کا خواب ہوتا ہے، ایک ایسے کل کی امید ہوتی ہے جہاں پیاس کے جواب میں خموشی نہیں بلکہ ممتا کے ہاتھوں میں پانی کا پیالہ ہو۔

پھر ماں اپنے بچے کو سینے سے لگا لیتی ہے اس کے ہونٹ خموش رہتے ہیں مگر اس کا دل چیخ رہا ہوتا ہے، وہ جانتی ہے کہ بعض اوقات ماں کی سب سے بڑی بے بسی یہ نہیں ہوتی کہ اس کے بچے کے پاس اپنے بچے کی پیاس بجھانے کے لیے ایک گھونٹ پانی بھی نہ ہو۔ اس لمحے ماں کی آنکھ سے گرنے والا ہر آنسو پانی کا بدل تو نہیں بن سکتا مگر اس عہد کی سب سے دردناک شہادت ضرور بن جاتا ہے کہ دنیا میں کہیں ایک ماں اپنے بچے کو تسلی تو دے سکتی ہے پانی نہیں دے سکتی۔

مگر اس کرب کی انتہا اس وقت سامنے آتی ہے جب بچے کے خشک ہونٹوں سے ایک ہی سوال بار بار ابھرتا ہے، ایسا سوال جس کا جواب ماں کے پاس آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ صدا صرف فضا میں نہیں گونجتی تھی بلکہ ایک ماں کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر اس کی بے بسی کو اور بھی نمایاں کر دیتی تھی۔

یہ دو لفظ صرف پیاس کی فریاد نہ تھے بلکہ ایک ایسی آزمائش تھے جس کے سامنے ماں کی ساری تسلیاں بے بس ہو چکی تھیں۔

ماں چند لمحوں کے لیے اپنے بچے کی آنکھوں میں دیکھتی ہے۔ اس کے پاس نہ پانی ہے، نہ کوئی امید افزا جواب۔ وہ اسے سینے سے لگا لیتی ہے، اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہے، جھوٹی تسلی کی لوریاں سنانے لگتی ہے، کبھی کہتی ہے: ''بس بیٹا! ابھی پانی آ جائے گا...'' کبھی

آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی ناکام کوشش کرتی ہے مگر اس کی پلکوں پہ ٹھہرے آنسو اس کی بے بسی کا راز فاش کر دیتے ہیں۔ وہ بار بار اپنے آنچل سے آنکھیں پونچھتی ہے، جیسے اپنے بچے سے اپنا دکھ چھپانا چاہتی ہو، حالانکہ آنچل آنسو تو چھپا لیتا ہے مگر ماں کا ٹوٹتا ہوا دل نہیں چھپا سکتا۔

ذرا آگے ایک ضعیف العمر خاتون خیمے کے دروازے پہ بیٹھی ہے۔ اس کے چہرے پہ وقت کی بے شمار لکیریں ہیں، مگر آج ان لکیروں سے زیادہ گہری پیاس کی دراریں ہیں۔ وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بچوں کو اپنے قریب بلاتی ہے، ان کے سروں پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتی ہے اور پھر آسمان کی طرف نظریں اٹھا دیتی ہے۔ شاید وہ بارش نہیں مانگ رہی، شاید وہ صرف اتنی دعا کر رہی ہے کہ اس کے جیتے جی اس کے پوتے پوتیاں ایک ایسی رات بھی دیکھ لیں جس میں گرمی سے بلکتے ہوئے بچے سکون کی نیند سو سکیں، ایک ایسا دن بھی طلوع ہو جس میں پانی مانگنے والے معصوم ہونٹ مایوس واپس نہ لوٹیں اور ایک ایسا چراغ بھی روشن ہو جو صرف خیمے نہیں بلکہ ان کی زندگیاں بھی روشن کر دے۔

بوڑھی خاتون کی دعا ابھی لبوں ہی پہ ہوتی ہے کہ قریب ہی سے ایک ننھا سا بچہ اپنی ماں کی طرف ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے پکارتا ہے: ''امّی... پانی!''

یہ دو لفظ نہیں، ایک عہد کی شکست خوردہ صدائیں ہیں۔ ان میں صرف ایک بچے کی پیاس نہیں بولتی بلکہ ایک ایسی سرزمین کی تھکن بولتی ہے جس کے نصیب سے سکون کے موسم چھین لیے گئے ہیں۔ یہ آواز کسی ایک خیمے کی نہیں، ان بے شمار خاندانوں کی مشترکہ آہ ہے جن کے نصیب میں شاید انتظار تو لکھا گیا مگر آسودگی نہیں۔

بچہ ابھی زندگی کے پہلے سوال سیکھ رہا تھا مگر زمانے نے اس کے نصاب میں محرومی کا پہلا سبق لکھ دیا۔ اس نے ابھی لفظوں کی دنیا میں قدم ہی رکھے تھے کہ اس کی زبان پر ''امّی'' کے بعد سب سے اہم لفظ ''پانی'' بن گیا۔ شاید یہی اس عہد کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ بچوں کی لغت سے ''کھلونا''، ''عید''، ''سیر''، ''اسکول'' اور ''دوست'' جیسے لفظ دھیرے دھیرے مٹتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ ''پیاس''، ''پناہ''، ''خیمہ'' اور ''انتظار'' نے لے لی ہے۔ جو عمر قہقہوں کی امانت ہوتی ہے، وہ سسکیوں کے حوالے کر دی گئی۔ جو موسم تتلیوں کے تعاقب میں گزرنے چاہیے تھے، وہ دھوئیں کے بادل گنتے گزر گئے۔

ایک زمانہ تھا جب مائیں بچوں کو سونے سے پہلے خواب سنایا کرتی تھیں مگر غزہ کی بہت سی مائیں اب انہیں صرف یہ تسلی دیتی ہیں کہ شاید اگلا دن آج سے کم سخت ہو۔ وہ جانتی ہیں کہ ان کے پاس دینے کے لیے نہ ٹھنڈا پانی ہے، نہ روشن کمرہ، نہ محفوظ چھت، اس لیے وہ اپنی ممتا کو الفاظ کا سہارا دیتی ہیں، حالانکہ ان کے دل کی ہر دھڑکن اپنی بے بسی کا نوحہ پڑھ رہی ہوتی ہے۔

اور جب تاریخ غزہ کے ان بچوں کا ذکر کرے گی تو شاید ان کی محرومیوں کی فہرست ہی نہیں لکھے گی بلکہ یہ بھی درج کرے گی کہ انسان نے ترقی کی بلندیاں تو چھو لیں مگر اپنی سب سے بڑی ذمہ داری یعنی بے قصور جانوں کی حفاظت میں ناکام رہا۔ وہ لکھے گی کہ اکیسویں صدی میں ایسے بھی بچے تھے جنہوں نے جنگ کو کھیل سے پہلے، ہجرت کو سفر سے پہلے، خوف کو خواب سے پہلے اور انتظار کو آسودگی سے پہلے پہچان لیا۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ صرف یہ نہ تھا کہ ان کے پاس کھلونے نہیں تھے بلکہ یہ تھا کہ انہیں بچپن جینے کا موقع ہی نہ ملا۔ ان کے معصوم چہروں پہ لکھی ہوئی قبل از وقت سنجیدگی اس عہد کی ایسی گواہی بن گئی جسے آنے والی نسلیں صرف ایک سانحہ نہیں بلکہ پوری انسانیت کے اجتماعی ضمیر کی ناکامی کے طور پہ پڑھیں گی۔

وہ نسل جس کی پہلی خواہش کھلونا نہیں، ایک گھونٹ پانی تھی، جس کا پہلا خواب عید کا لباس نہیں، ایک محفوظ رات تھی، جس کی پہلی یاد کسی کھلونے کی نہیں بلکہ ایک ایسے زمانے کی تھی جہاں ایک گھونٹ پانی بھی ایک خواب کی طرح دور دکھائی دیتا تھا۔ جس کی پہلی ضد کسی نئے کھلونے کے لیے نہیں، اپنے بچھڑے ہوئے باپ، ماں یا بہن بھائی کو دوبارہ دیکھ لینے کی تھی اور جس کی پہلی دعا کسی نئی چیز کے لیے نہیں، صرف زندہ رہنے کے لیے تھی۔

شاید اسی لیے غزہ کے بچوں کی آنکھوں میں عمر سے پہلے اتر آنے والی سنجیدگی، اس عہد کی سب سے بڑی فردِ جرم ہے۔ ان کے

معصوم چہروں پہ لکھی ہوئی خموشیاں، دنیا کی ہر عدالت، ہر ایوان اور ہر زندہ ضمیر سے ایک ہی سوال کرتی ہیں: آخر بچوں سے ان کا بچپن چھین لینے کے بعد بھی انسان اپنی تہذیب پہ فخر کیسے کر سکتا ہے؟

اور شاید آنے والے زمانوں کا مورخ یہ بھی لکھے کہ اکیسویں صدی کی سب سے المناک تصویر کوئی تباہ شدہ عمارت نہیں تھی بلکہ ایک ننھے بچے کا اپنی ماں سے صرف ایک لفظ کہنا تھا:

''امّی... پانی...!'' اور اس کے جواب میں ماں کی خموش آنکھوں سے بہہ جانے والے آنسو، جو اس عہد کی پوری تہذیب پہ ایک ایسا سوالیہ نشان بن گئے جس کا جواب تاریخ آج تک تلاش کر رہی ہے۔

ان خیموں میں رہنے والوں کی سب سے بڑی محرومی شاید بجلی نہیں بلکہ وہ بے بسی ہے جو ایک باپ کو اپنے بچوں کے سامنے خموش کر دیتی ہے، ایک ماں کو جھوٹی امیدیں دینے پہ مجبور کر دیتی ہے اور ایک بوڑھی عورت کو اپنی آخری دعاؤں میں اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے روشنی مانگنے پہ آمادہ کر دیتی ہے۔

ان کی مائیں بے بسی سے انہیں دیکھتی ہیں۔ نہ پنکھا ہے، نہ ٹھنڈا پانی، نہ ہوا کا کوئی جھونکا۔ صرف گرم سانسیں ہیں، جو ایک دوسرے سے ٹکرا کر مزید تپش پیدا کرتی ہیں۔

کبھی کبھی کوئی باپ خیمے کے باہر کھڑا ہو کر آسمان کو دیکھتا ہے۔ وہ بارش نہیں مانگتا۔ وہ بجلی نہیں مانگتا۔ وہ صرف اتنی دعا کرتا ہے کہ اس کے بچے آج کی رات زندہ رہ جائیں۔ یہ دعا سن کر بھی شاید آسمان خموش رہتا ہے۔

دنیا نے بجلی کو ترقی کا نام دیا تھا مگر غزہ نے بجلی کو زندگی کا دوسرا نام بنا دیا ہے۔ وہاں ایک بلب جل جانا خوش حالی نہیں بلکہ بقا کی علامت ہے۔ ایک موبائل کا چارج ہو جانا صرف رابطہ نہیں بلکہ اس امید کا ثبوت ہے کہ شاید کسی زندہ عزیز کی خبر ابھی باقی ہے۔ ایک پنکھے کا چند لمحوں کے لیے گھوم جانا آسائش نہیں بلکہ موت کے مقابلے میں چند سانسوں کی مہلت ہے۔

غزہ میں اندھیرا صرف گھروں میں نہیں اترا۔ وہ دلوں میں اترا ہے۔ وہ خوابوں میں اترا ہے۔ وہ آنے والے کل پر اترا ہے اور سب سے بڑھ کر، وہ عالمی ضمیر پر اترا ہے۔ یہ وہ اندھیرا ہے جسے کوئی سورج شکست نہیں دے سکتا، جب تک انسان اپنے ضمیر کی روشنی واپس نہ حاصل کر لے۔ جب زندگی مشینوں کے سہارے نہیں، دعا کے سہارے چلتی ہے۔ غزہ میں صرف چراغ نہیں بجھے، زندگی کے بہت سے معنی بھی بجھ گئے ہیں۔

وہ اسپتال جن کے دروازے کبھی امید کی علامت سمجھے جاتے تھے، آج خود امید کے محتاج ہیں۔ سفید لباس میں ملبوس ڈاکٹر جب آپریشن تھیٹر میں داخل ہوتا ہے تو اس کے ہاتھ میں جراحی کے آلات سے زیادہ ایک انجانا خوف ہوتا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ اگلے چند لمحوں میں جنریٹر خموش ہو جائے گا یا نہیں۔ اگر ایندھن ختم ہو گیا تو شاید آپریشن مکمل ہونے سے پہلے ہی روشنی بجھ جائے، مشینیں خموش ہو جائیں، سانسوں کی نگرانی کرنے والے آلات ساکت ہو جائیں اور ایک زندگی خموشی سے موت کے حوالے کر دی جائے۔

یہ کیسا عہد ہے کہ طب کی تمام مہارت ایک قطرۂ ایندھن کی محتاج ہو کر رہ گئی ہے؟ ایک طرف جدید دنیا مصنوعی ذہانت، خلائی تحقیقات اور نئی نئی ایجادات پہ جشن منا رہی ہے، دوسری طرف غزہ میں ایک نرس ہاتھ سے مریض کو ہوا دے رہی ہے تا کہ اس کی سانسیں کچھ دیر اور قائم رہ سکیں۔ ترقی اور محرومی کا یہ فاصلہ شاید انسانی تاریخ میں کبھی اتنا گہرا نہیں تھا۔

پانی... جسے قرآن نے زندگی کی اصل قرار دیا، غزہ میں وہ بھی بجلی کا اسیر بن چکا ہے۔ کنویں خموش ہیں، پمپ خموش ہیں، فلٹریشن پلانٹ خموش ہیں۔ پانی زمین کے سینے میں موجود ہے مگر اسے نکالنے والی قوت موجود نہیں۔ پیاس صرف ہونٹوں پہ نہیں، پورے وجود پہ اتر آئی ہے۔ بچے جب پانی مانگتے ہیں تو مائیں صرف خالی برتنوں کی طرف دیکھتی ہیں، جیسے امید بھی اب برتنوں کی تہہ میں سوکھ چکی ہو۔

پھر وہی پانی جب نکاسی کا راستہ نہیں پاتا تو گلیوں میں تعفن بن کر بہنے لگتا ہے۔ یوں زندگی کا ایک بڑا امادی سہارا پانی بیماریوں کا پیغام بر بن جاتا ہے۔ وبائیں، بخار، آلودگی اور بدبو گویا اس محصور سرزمین کے

نئے مکین بن گئے ہیں۔

شام اترتی ہے تو غزہ کا منظر کسی قدیم داستان کا نہیں بلکہ قیامت سے پہلے کے کسی باب کا منظر محسوس ہوتا ہے۔

افق پر سورج کی آخری کرن ڈوبتی ہے اور اس کے ساتھ ہی پورا شہر سیاہی کے سپرد ہو جاتا ہے۔

نہ گلیوں میں چراغ، نہ گھروں میں روشنی، نہ بازاروں کی رونق۔ صرف کہیں دور کسی جنریٹر کی تھکی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے، جو یوں محسوس ہوتی ہے جیسے کسی زخمی انسان کی آخری سانس ہو۔

اسی تاریکی میں ایک ماں اپنے بچے کو سینے سے لگائے بیٹھی ہے۔ بچہ پوچھتا ہے: ''امّی! روشنی کب آئے گی؟'' ماں جواب نہیں دیتی۔ وہ جانتی ہے کہ بعض سوالوں کا جواب الفاظ میں نہیں، صرف آنسوؤں میں ہوتا ہے۔

کسی خیمے کے باہر ایک بوڑھا آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ شاید اسے یاد آ رہا ہے کہ ایک زمانہ تھا جب اس کے گھر میں بھی چراغ جلتے تھے، افطار کے وقت دسترخوان آباد ہوتا تھا، بچے شور مچاتے تھے اور رات کو قرآن کی تلاوت کی آواز آتی تھی۔ آج نہ وہ گھر باقی ہے، نہ وہ دسترخوان، نہ وہ آسودگی۔ مگر ایمان ابھی باقی ہے۔ اسی ایمان کے سہارے غزہ زندہ ہے۔ یہی ایمان ہے جو ملبے پر کھڑے باپ کو دوبارہ خیمہ نصب کرنے کی طاقت دیتا ہے۔ یہی ایمان ہے جو شہید کے جنازے کے بعد بھی زندہ لوگوں کو صبر کا سبق دیتا ہے۔ یہی ایمان ہے جو اندھیری رات میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سورج کا انتظار کرنا سکھاتا ہے۔

لیکن ایک سوال مسلسل فضاؤں میں معلق ہے۔ کیا صرف اہلِ غزہ ہی آزمائش میں ہیں؟ یا یہ امتحان پوری انسانیت کا بھی ہے؟ کیا اندھیرا صرف غزہ پر اترا ہے، یا ان دلوں پر بھی چھا گیا ہے جو سب کچھ دیکھ کر بھی خموش ہیں؟ تاریخ گواہ ہے کہ ظلم صرف ظالم کے ہاتھوں سے نہیں پھیلتا بلکہ بسا اوقات خموش تماشائیوں کی خموشی بھی اسے طاقت عطا کرتی ہے۔

غزہ آج دنیا سے صرف بجلی نہیں مانگ رہا۔ وہ انسانیت کی روشنی مانگ رہا ہے۔ وہ انصاف کا ایک چراغ مانگ رہا ہے۔ وہ ضمیر کی ایک کرن مانگ رہا ہے۔ اور شاید آنے والی نسلیں ہم سب سے یہی سوال کریں گی کہ جب ایک شہر ہزار دن تک اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، اس وقت تمہارے ہاتھوں میں جو چراغ تھے، وہ کس کے لیے روشن تھے؟

جب چراغ بجھتے ہیں تو تاریخ گواہی لکھتی ہے:

تاریخ صرف جنگوں کی تاریخ نہیں ہوتی، وہ انسانوں کے ضمیر کی تاریخ بھی ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی لکھتی ہے کہ کس نے ظلم کیا مگر اس سے پہلے یہ بھی محفوظ کرتی ہے کہ ظلم کے وقت کون خموش رہا، کس نے آنکھیں پھیر لیں، کس نے الفاظ کو مصلحت کی زنجیروں میں قید کر دیا اور کس نے اندھیرے میں بھی حق کی شمع تھامے رکھی۔ غزہ کا المیہ صرف ایک خطے کی داستان نہیں، یہ ہمارے عہد کا اخلاقی امتحان ہے۔

یہاں صرف عمارتیں نہیں گریں، بین الاقوامی انصاف کے بہت سے دعوے بھی ملبے میں تبدیل ہو گئے۔ صرف دیواریں ہی زمیں بوس نہیں ہوئیں بلکہ وہ اصول بھی لرز گئے جنہیں عالمی امن کی بنیاد قرار دیا جاتا تھا۔ انسانی حقوق کے وہ منشور، جنہیں دنیا نے اپنی تہذیبی کامیابی کی علامت سمجھا تھا، اس آزمائش کی گھڑی میں بے بسی کی دستاویز معلوم ہونے لگے۔ امن، مساوات، انصاف اور انسانی وقار کے بلند آہنگ نعرے غزہ کے ملبے پہ آ کر یوں خموش ہوئے کہ گویا ان کی بازگشت بھی گرد و غبار میں کہیں گم ہو گئی ہو۔

یہ صرف ایک شہر کی آزمائش نہیں تھی، یہ عالمی ضمیر کا امتحان بھی تھا۔ طاقتور ملکوں کے ایوان، بین الاقوامی تنظیموں کے دفاتر، سفارتی کانفرنسوں کے طویل بیانات اور ہمدردی سے لبریز قراردادیں -- سب ایک ایسے سوال کے سامنے کھڑے دکھائی دیے جس کا جواب الفاظ سے نہیں، عمل سے دیا جانا تھا۔ مگر جب تاریخ نے اس دور کے ورق الٹے تو اسے بہت سے بیانات ملے، بہت سی تشویشیں ملیں، بہت سے اجلاس ملے، مگر مظلوم انسان کے ہاتھ میں زندگی کی وہ روشنی بہت کم دکھائی دی جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔

شاید مورخ یہ بھی لکھے کہ اکیسویں صدی میں عالمی ادارے موجود تھے، بین الاقوامی قوانین بھی موجود تھے، انسانی حقوق کے بے شمار منشور بھی موجود تھے مگر جب ایک محصور قوم اندھیروں، بھوک، پیاس اور مسلسل خوف کے حصار میں تھی تو ان اداروں کی قوت، ان قوانین کی حرمت اور ان نعروں کی تاثیر، سب اپنے ہی امتحان میں کھڑی نظر آئیں اور تاریخ کا قلم شاید یہ جملہ لکھتے ہوئے کچھ دیر کے لیے ٹھہر جائے کہ تہذیبوں کی اصل شکست اس وقت نہیں ہوتی جب شہر ملبے میں بدل جائیں بلکہ اس وقت ہوتی ہے جب انصاف کے محافظ صرف تماشائی بن جائیں اور انسانیت کے علمبردار مظلوم کی چیخ سن کر بھی اپنے ضمیر کی خموشی کو ترجیح دے دیں۔

شاید تہذیبوں کا اصل چہرہ جنگوں کے بعد نہیں، جنگوں کے دوران سامنے آتا ہے۔ اسی وقت معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے صرف شہروں کو روشن کیا ہے یا اپنے ضمیر کو بھی، اس نے صرف ایوان تعمیر کیے ہیں یا انصاف کی بنیادیں بھی مضبوط کی ہیں۔ غزہ نے دنیا کے سامنے یہی سوال رکھ دیا اور اس سوال کا جواب صرف الفاظ میں نہیں بلکہ دنیا کے رویّوں میں لکھا گیا۔ یہاں صرف بجلی کا نظام نہیں ٹوٹا، انسانی اقدار کا ایک بڑا امتحان بھی سامنے آ کھڑا ہوا۔ عجیب منظر ہے کہ ایک طرف دنیا کے بڑے بڑے شہر رات کو روشنیوں کے جشن مناتے ہیں، آسمان رنگ و نور سے بھر جاتے ہیں، بلند و بالا عمارتیں چراغاں میں نہا جاتی ہیں، سڑکیں جگمگا اٹھتی ہیں، بازار رات گئے تک آباد رہتے ہیں اور زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ مسکراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے مگر دوسری طرف غزہ میں ایک ماں اپنے بچے کا چہرہ دیکھنے کے لیے بھی روشنی کی محتاج ہے۔

وہ بار بار اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے بچے کے پیشانی پہ ہاتھ رکھتی ہے اور اسے ٹٹولتی ہے، اس کے رخساروں پہ ہاتھ پھیر کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتی ہے کہ بخار تو نہیں بڑھ گیا، وہ اس کی سانسوں کی آہٹ محسوس کرتی ہے مگر اس کی آنکھیں اپنے ہی لختِ جگر کا چہرہ صاف طور پہ دیکھنے سے محروم رہتی ہیں۔ کبھی وہ خیمے کے پردے ہٹا کر آسمان سے اترتی مدھم چاندنی کو اندر آنے دیتی ہے، کبھی کسی دور جلتے ہوئے چراغ کی دھندلی سی روشنی میں اپنے بچے کی آنکھوں میں زندگی کی رمق تلاش کرتی ہے اور کبھی اسے اپنے سینے سے اس زور سے لگا لیتی ہے جیسے ممتا کی حرارت ہی اس کے لیے روشنی کا آخری چراغ ہو۔ اسے خوف صرف اندھیرے کا نہیں ہوتا، اسے اس لمحے کا ڈر بھی ستاتا ہے کہ کہیں اس کا بچہ خموشی سے تپتا رہے، اس کی سانسیں مدھم پڑتی رہیں اور وہ صرف اس لیے اس کی کیفیت نہ جان سکے کہ ایک بلب جلانے کی بھی طاقت باقی نہیں رہی۔ اس وقت ماں کی بے بس نگاہیں آسمان کی طرف اٹھتی ہیں مگر دعا کے لیے نہیں، جیسے وہ تاروں سے پوچھ رہی ہوں کہ تم اتنے روشن ہو کر بھی میرے بچے کے نصیب میں ایک کرن کی روشنی کیوں نہیں اتار سکتے؟ اور شاید یہی اس عہد کا سب سے المناک منظر ہے کہ ایک ماں کو اپنے بچے کے چہرے کی زیارت کے لیے بھی بجلی نہیں، امید کی روشنی کا انتظار کرنا پڑ رہا ہے۔

یہ صرف ایک ماں کی بے بسی کا منظر نہیں بلکہ ایک ایسے عہد کی تصویر ہے جس میں روشنی کی تقسیم بھی انسانوں کی قسمتوں کی طرح عدم مساوات کی شکار ہو گئی ہے۔ ایک طرف چراغوں کی فراوانی ہے، دوسری طرف ایک کرن کی تمنا، ایک طرف راتیں جشنِ نور سے آشنا ہیں، دوسری طرف اندھیرا نسلوں کی تقدیر بن چکا ہے۔ تبھی تو ایک ہی زمین پہ بسنے والے انسانوں کی زندگیاں دو بالکل مختلف تصویروں میں بٹ گئی ہیں۔

یہ دو تصویریں ایک ہی زمانے کی ہیں مگر ان کے درمیان صرف فاصلے کا نہیں، احساس کا فرق ہے۔

قرآنِ مجید ہمیں بار بار یہ یاد دلاتا ہے کہ ظلم کبھی دائمی نہیں ہوتا۔ باطل چاہے کتنی ہی قوت جمع کر لے، اس کی بنیاد کمزور ہوتی ہے اور حق اگرچہ بظاہر بے سروسامان دکھائی دے، اس کی پشت پہ ربِّ کائنات کی نصرت ہوتی ہے۔ یہی یقین اہلِ غزہ کے چہروں پہ آج بھی جھلکتا ہے۔ ملبے پہ کھڑے بچے، خیموں میں بیٹھی مائیں، زخمی جسموں کے ساتھ خدمت انجام دینے والے ڈاکٹر، اور اذان کی صدا بلند کرنے والے مؤذن اس حقیقت کے زندہ استعارے ہیں کہ ایمان کا چراغ، بجلی کے چراغ سے کہیں زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔

مگر ایمان کا یہ چراغ ہمیں بے عملی کا جواز نہیں دیتا۔ یہ ہم سے سوال کرتا ہے کہ کیا ہم نے اپنے حصے کی ذمہ داری ادا کی؟ کیا ہم نے اپنے قلم کو سچ کا ترجمان بنایا؟ کیا ہماری دعائیں محض الفاظ رہیں یا دل کی تڑپ بن سکیں؟ کیا ہم نے اپنی نئی نسل کو بتایا کہ غزہ صرف ایک جغرافیہ نہیں بلکہ ظلم کے مقابل صبر، عزیمت اور استقامت کا استعارہ ہے؟ یہ سوال صرف حکومتوں سے نہیں، اہلِ علم سے بھی ہے، صرف عالمی اداروں سے نہیں، اہلِ قلم سے بھی ہے، صرف طاقت ور ملکوں سے نہیں، ہر اس انسان سے بھی ہے جس کے دل میں رحم، انصاف اور انسانیت کی کوئی ہلکی سی بھی رمق باقی ہے۔

قرآنِ مجید صرف ظلم کی مذمت ہی نہیں کرتا بلکہ اہلِ ایمان کو عدل اور جادۂ حق وصداقت پہ ثابت قدم رہنے کی تلقین بھی کرتا ہے:

﴿كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ﴾ (سورۃ النساء: 135) ترجمہ: انصاف پر خوب قائم ہوجاؤ اللہ کے لیے گواہی دیتے۔

اسی لیے ظلم کے خلاف آواز اٹھانا محض ایک سیاسی یا انسانی تقاضا نہیں بلکہ ایک اخلاقی اور دینی ذمہ داری بھی ہے۔

اہلِ قلم کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ غزہ کو خبروں کی سرخی بنا کر فراموش نہ ہونے دیں بلکہ اسے تاریخ کے شعور کا حصہ بنائیں۔ اہلِ دعا کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے سجدوں میں ان مظلوموں کو یاد رکھیں۔ اہلِ ثروت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق انسانی امداد کے دروازے کھلے رکھیں۔ اور اہلِ اقتدار کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ انصاف کو سیاسی مفادات کی نذر نہ ہونے دیں۔

غزہ آج بھی زندہ ہے۔ اس کے مینار زخمی ہیں مگر اذان خموش نہیں ہوئی۔ اس کی گلیاں ملبے سے اٹی ہیں مگر امید کا راستہ بند نہیں ہوا۔ اس کے خیمے تاریکی میں ڈوبے ہیں مگر ایمان کی روشنی ابھی باقی ہے۔ شاید یہی غزہ کی سب سے زیادہ درخشاں علامت ہے کہ ہزار دنوں کے اندھیرے نے بھی اس کے دلوں سے ایمان، امید اور استقامت کی لو بجھنے نہیں دی۔ اور شاید یہی وہ پیغام ہے جو آنے والی نسلیں یاد رکھیں گی کہ تہذیبیں صرف بجلی سے روشن نہیں ہوتیں بلکہ سچ، عدل، رحم اور ایمان کی روشنی سے زندہ رہتی ہیں۔

آیئے! ہم دعا کریں کہ وہ دن جلد آئے جب غزہ کی راتیں پھر چراغوں سے منور ہوں، اسپتالوں میں زندگی کی مشینیں بے خوف چلیں، کنوؤں سے پانی پھر خوش حالی کی نوید بن کر نکلے، بچوں کی آنکھوں میں خوف کی جگہ خواب لوٹ آئیں اور ماؤں کے لبوں پہ صبر کے ساتھ مسکراہٹ بھی واپس آجائے۔

اس دن صرف غزہ میں بجلی بحال نہیں ہوگی بلکہ انسانیت کے بجھے ہوئے ضمیر میں بھی ایک نئی روشنی پیدا ہوگی۔ کیونکہ غزہ کا اندھیرا صرف غزہ کا اندھیرا نہیں، یہ پوری دنیا کے اخلاقی شعور کا امتحان ہے۔ یہ اس بات کا امتحان ہے کہ انسان نے واقعی انسان ہونا سیکھا ہے یا صرف ترقی کرنا۔ یہ اس عالمی ضمیر کا محاسبہ ہے جو ظلم کو دیکھتا بھی ہے، سمجھتا بھی ہے مگر اکثر مصلحتوں کی چادر اوڑھ کر خموش ہوجاتا ہے۔ یہ اس تہذیب سے پوچھے جانے والا سوال ہے جو اپنے آپ کو مہذب، منصف اور انسانی اقدار کا علمبردار کہتی ہے مگر جب ایک معصوم صفت بچے کی پیاس، ایک ماں کے آنسو اور ایک بوڑھے کی آہ اس کے دروازے تک پہنچتی ہے تو اس کے بہت سے چراغ مدھم پڑ جاتے ہیں۔

غزہ آج دنیا سے صرف بجلی نہیں مانگ رہا، وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا انسانی حقوق صرف طاقت وروں کے لیے ہیں؟ کیا انصاف کی آنکھیں صرف کمزوروں کے لیے کھلتی ہیں؟ کیا رحم کی زبان صرف کانفرنسوں، قراردادوں اور تقریروں تک محدود ہے؟ اور کیا انسانیت کا ضمیر اتنا تھک چکا ہے کہ اسے اب بچوں کی سسکیاں بھی بیدار نہیں کر سکتیں؟

اگر ان سوالوں کا جواب خموشی ہے، تو پھر اندھیرا غزہ میں کم اور انسانیت کے باطن میں زیادہ ہے۔ اگر دنیا کی بے شمار روشنیاں ایک مظلوم ماں کے خیمے تک امید کی ایک کرن بھی نہ پہنچا سکیں، تو یہ صرف غزہ کی محرومی نہیں، پوری تہذیب کی ناکامی ہے، اور شاید تاریخ سب سے سخت جملہ یہی لکھے کہ اکیسویں صدی کا سب سے بڑا المیہ یہ نہیں تھا کہ غزہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا بلکہ یہ تھا کہ روشنیوں سے بھری دنیا اپنے ہی ضمیر کے اندھیرے کو پہچان نہ سکی۔

مگر تاریخ کا قلم صرف تہذیبوں کی لغزشیں ہی محفوظ نہیں کرتا، وہ

انسانوں کے کردار بھی ثبت کرتا ہے۔ وہ صرف یہ نہیں گنتا کہ ظلم کس نے کیا بلکہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ ظلم کے موسم میں کون خاموش رہا، کس نے مصلحت کو ترجیح دیا، کس نے مظلوم کی آواز سنی اور کس نے اندھیروں کے درمیان بھی روشنی پہ یقین برقرار رکھا۔ تاریخ کے اوراق میں صرف مجرموں کے نام نہیں لکھے جاتے، وہاں اہلِ ضمیر کے نقوش بھی محفوظ رہتے ہیں اور جب کبھی یہ امتحان ختم ہوگا، تاریخ یہ ضرور لکھے گی کہ چراغ کس نے بجھائے تھے مگر اس سے بھی زیادہ یہ لکھے گی کہ اندھیروں کے اس طویل موسم میں روشنی کی بات کس نے کی تھی۔

شاید آنے والے زمانے میں جب مورخ اس عہد کی تاریخ لکھیں گے تو وہ یہ ضرور لکھیں گے کہ اکیسویں صدی نے انسان کو چاند تک پہنچا دیا تھا، مصنوعی ذہانت کو حیرت انگیز بلندیوں تک لے گئی تھی، سمندروں کی تہیں اور خلاؤں کی وسعتیں فتح کر لی تھیں مگر اسی صدی میں ایک چھوٹی سی سرزمین ایسی بھی تھی جہاں ایک بچہ صرف اس لیے اندھیرے میں سوتا تھا کہ دنیا کی روشنیاں اس تک پہنچنے سے روک دی گئی تھیں۔

وہ یہ بھی لکھیں گے کہ غزہ میں صرف بجلی منقطع نہیں ہوئی تھی بلکہ انسانیت کے بہت سے چراغ بھی بجھ گئے تھے۔ تاریں ٹوٹنے سے پہلے رشتے ٹوٹے، پاور اسٹیشن تباہ ہونے سے پہلے انصاف کا ایوان منہدم ہوا اور خیموں پر رات اترنے سے پہلے عالمی ضمیر پر اندھیرا چھا گیا تھا۔

سوچیے! اگر ایک ماں اپنے بیمار بچے کے چہرے پر ہاتھ رکھ کر اس کی پیشانی کا درجۂ حرارت تو محسوس کر سکتی ہو مگر بجلی نہ ہونے کی وجہ سے اس کی جان بچانے والی مشین نہ چلا سکے، اگر ایک باپ اپنے بچوں کو صرف اس لیے گرمی، پیاس اور اندھیرے کے سپرد کر دے کہ اس کے پاس ایک بلب جلانے کی طاقت بھی باقی نہ ہو، اگر ایک طالب علم کتاب تو کھولے مگر روشنی نہ ہونے کے باعث ایک حرف بھی نہ پڑھ سکے تو پھر سوال صرف غزہ کا نہیں رہ جاتا، سوال پوری انسانیت کا بن جاتا ہے۔

یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے رہنی چاہیے کہ ہزاروں جانوں کے ضیاع، بڑے پیمانے پہ نقل مکانی اور بنیادی شہری ڈھانچے کی تباہی کے بعد بھی غزہ میں صحت، پانی اور صفائی کے نظام کو شدید بحران کا سامنا ہے۔ بین الاقوامی امدادی اداروں کی تازہ رپورٹیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ بیماریوں کے پھیلاؤ، آلودہ پانی اور ایندھن کی قلت نے انسانی زندگی کو مزید خطرے میں ڈال دیا ہے۔ یہ اعداد و شمار صرف رپورٹوں کے صفحات نہیں بلکہ ان بے شمار خاندانوں کی خموش فریاد ہیں جو آج بھی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

آج غزہ ہم سے صرف ہمدردی نہیں مانگ رہا، وہ ہمارے ضمیر کا جواب مانگ رہا ہے۔ وہ پوچھ رہا ہے کہ جب میرے بچوں کے خواب اندھیروں میں دفن ہو رہے تھے، تمہاری روشنی کس کام آ رہی تھی؟ جب میرے اسپتال خموش ہو رہے تھے، تمہاری ترقی کس کے لیے تھی؟ جب میرے خیموں میں رات مسلسل ہزار دن تک اترتی رہی، تمہارے دلوں میں صبح کیوں نہ ہوئی؟

یاد رکھیے! ظلم کا سب سے خطرناک ہتھیار اس کی طاقت نہیں بلکہ اہلِ حق کی خموشی ہوتی ہے۔ چراغ ہمیشہ تیل ختم ہونے سے نہیں بجھتے، بعض اوقات وہ اس لیے بھی بجھ جاتے ہیں کہ انہیں بچانے والے ہاتھ پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

اس لیے اگر ہم واقعی چاہتے ہیں کہ آنے والی نسلیں ہمیں شرمندگی سے نہیں، عزت سے یاد کریں، تو ہمیں اپنے حصے کا چراغ ضرور جلانا ہوگا، اپنے قلم سے، اپنی دعا سے، اپنی آواز سے، اپنی فکر سے، اپنی استطاعت سے۔ اس لیے کہ شاید اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہم سے یہ نہ پوچھے کہ تم غزہ کے ملبے سے کتنے پتھر ہٹا سکے مگر یہ سوال ضرور ہو سکتا ہے کہ جب ظلم اپنے عروج پہ تھا، اس وقت تمہارا دل کس کے ساتھ دھڑکتا تھا، تمہارا قلم کس کے لیے چلتا تھا اور تمہاری زبان حق کے لیے کب کھلی تھی؟

غزہ آج بھی اندھیرے میں ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ خوفناک اندھیرا وہ ہے جو اگر ہمارے ضمیر پر چھا جائے تو پھر کوئی سورج، کوئی بجلی اور کوئی چراغ اسے روشن نہیں کر سکتا۔

□□□□

مفتی خورشید احمد رضوی
پرنسپل دارالعلوم تدریس الاسلام بسڈیلہ

تہذیبی ارتداد کا خموش سفر

تہذیبی علامتوں، دینی حساسیت اور ملی شناخت کے تحفظ پہ ایک فکری مطالعہ

تاریخ کا ایک ایسا باب بھی ہے جسے فاتحین سے زیادہ اہلِ بصیرت نے رقم کیا ہے۔ اس باب کا عنوان یہ ہے کہ قومیں ہمیشہ میدانِ جنگ میں شکست نہیں کھاتیں، بعض اوقات وہ اپنے شعور کی سرحدوں پہ شکست کھا جاتی ہیں۔ ان کے قلعے اس وقت تک محفوظ رہتے ہیں جب تک ان کی تہذیبی شناخت محفوظ رہتی ہے اور جب شناخت کی دیواروں میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں تو مضبوط سے مضبوط قلعے بھی زیادہ دیر قائم نہیں رہتے۔

تہذیبوں کا انہدام ہمیشہ توپ و تفنگ کی گھن گرج سے شروع نہیں ہوتا بلکہ اس کا آغاز اس لمحے سے ہوتا ہے جب ایک قوم اپنے ماضی سے شرمندہ، اپنی اقدار سے بے نیاز اور اپنی روایت سے بے تعلق ہونے لگتی ہے۔ اس کے بعد شکست دشمن کے حملے سے نہیں بلکہ اپنے ہی احساسِ کمتری سے جنم لیتی ہے۔

اسی لیے تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ جس قوم نے اپنے عقیدے، اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنے علمی ورثے اور اپنی اجتماعی شناخت کی حفاظت کی، وہ سخت ترین آزمائشوں کے باوجود زندہ رہی اور جس نے ان بنیادوں کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیا، اس کے لیے سیاسی اقتدار، معاشی خوش حالی اور عسکری قوت بھی دائمی بقا کی ضمانت نہ بن سکیں۔

چراغوں کی حفاظت صرف ان کے شعلوں کو روشن رکھنے سے نہیں ہوتی بلکہ ان بنیادوں کو محفوظ رکھنے سے بھی ہوتی ہے جن پہ وہ چراغ قائم ہیں۔ کیونکہ جب شناخت کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں تو روشنی بجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی اور جب روشنی بجھ جائے تو اندھیرا صرف ایک نسل پر نہیں، آنے والی نسلوں کی تقدیر پر بھی سایہ فگن ہو جاتا ہے۔ یہی وہ خموش عمل ہے جسے تاریخ کے اربابِ نظر تہذیبوں کے زوال کا پہلا زینہ قرار دیتے ہیں۔

تہذیبوں کا زوال اچانک رونما نہیں ہوتا بلکہ خموشی سے شعور کی تہوں میں جنم لیتا ہے۔ اس کی پہلی آہٹ وہاں سنائی دیتی ہے جہاں اقدار کو بوجھ اور شناخت کو قابلِ ترمیم سمجھا جانے لگتا ہے۔ چنانچہ پہلے قوموں سے ان کے امتیازات کی معنویت چھینی جاتی ہے، پھر شعائر کو محض رسمی علامات قرار دیا جاتا ہے، پھر ان کے محافظوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے اپنی شناخت کے بعض حصوں سے دست بردار ہونا ناگزیر ہے۔ اس کے بعد روایت کو جمود، وفاداری کو تنگ نظری، غیرتِ ایمانی کو انتہا پسندی اور تہذیبی استقامت کو زمانہ شناسی سے محرومی کا عنوان دے دیا جاتا ہے۔ یوں الفاظ کے معانی بدلتے ہیں، اقدار کے پیمانے تبدیل ہوتے ہیں اور قومیں اس تبدیلی کو ترقی کا نام دے کر خود ہی اپنے فکری حصار منہدم کرنے لگتی ہیں۔

پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب شناخت پر حملہ باہر سے نہیں بلکہ اندر سے ہونے لگتا ہے۔ زبان وہی رہتی ہے مگر لہجہ بدل جاتا ہے، چہرے وہی رہتے ہیں مگر کردار تبدیل ہو جاتے ہیں، عمارتیں باقی رہتی ہیں مگر ان کی روح رخصت ہو جاتی ہے۔ اس مرحلے پر تہذیب اپنے دشمنوں سے کم اور اپنے بے حس محافظوں سے زیادہ زخم کھاتی ہے۔

تاریخ کا المیہ یہی ہے کہ جب کسی قوم کو اپنی شناخت کے بتدریج زوال کا احساس ہوتا ہے تو بہت کچھ اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ اس لیے اہلِ بصیرت ہمیشہ سرحدوں سے پہلے شعور کی حفاظت کرتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جس قوم کا شعور سلامت

رہے، اس کی تہذیب بھی زندہ رہتی ہے اور جس کا شعور مغلوب ہو جائے، اس کی آزادی بھی دیر پا نہیں رہتی۔

رفتہ رفتہ وہ قوم خود اپنی تہذیبی دستبرداری کو اعتدال، روشن خیالی یا قومی ہم آہنگی کا نام دینے لگتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جسے اہلِ نظر تہذیبی ارتداد کی پہلی آہٹ قرار دیتے ہیں۔

یہاں ''ارتداد'' سے مراد کسی فرد کے عقیدے پہ حکم لگانا نہیں بلکہ ایک تہذیبی کیفیت کی نشاندہی کرنا ہے۔ عقیدہ دل میں ہوتا ہے مگر تہذیب اس عقیدے کی خارجی تعبیر ہے۔ جب خارجی علامتیں، امتیازی شعائر اور دینی حساسیت کمزور ہونے لگے تو اہلِ بصیرت کو مستقبل کے خطرات دکھائی دینے لگتے ہیں، اگرچہ عام نگاہیں اسے معمولی تبدیلی سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔

آج ہمارا قومی منظر نامہ اسی تناظر میں غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ایک طرف ملک کے مختلف حصوں میں مساجد، مدارس، مکاتب اور مزارات پہ مختلف عنوانات کے تحت دباؤ بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ کہیں انہدام کی کارروائیاں ہیں، کہیں قانونی پیچیدگیاں، کہیں مذہبی شناخت رکھنے والی املاک پہ سوالات۔ یہ صورتِ حال بجا طور پہ ہر صاحبِ ایمان کے لیے باعثِ تشویش ہے، کیونکہ مسجد اور مدرسہ صرف اینٹ اور پتھر کی عمارت نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک تہذیب کی علامت، ایک تاریخ کی یادگار اور ایک عقیدے کے زندہ مراکز ہوتے ہیں۔ ان کی دیواروں میں صرف گارے اور پتھر نہیں چنے ہوتے بلکہ نسلوں کے ایمان، بزرگوں کی دعائیں، علماء کی قربانیاں اور امت کی فکری روایت بھی پیوست ہوتی ہے۔ یہی وہ مراکز ہیں جہاں عقیدہ شعور میں ڈھلتا ہے، عبادت کردار کی صورت اختیار کرتی ہے اور تہذیب اپنی آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتی ہے۔

اسی لیے جب کسی قوم کے مسجد و مدرسہ کو محض ایک عمارت، ایک رسمی ادارہ یا ایک انتظامی ڈھانچہ سمجھا جانے لگے تو درحقیقت اس کی تہذیبی روح کمزور کرنے کا عمل شروع ہو چکا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ مراکز صرف نماز اور درس کے لیے نہیں بلکہ اجتماعی حافظے، دینی تشخص، اخلاقی تربیت اور تہذیبی تسلسل کی حفاظت کے لیے بھی قائم ہوتے ہیں۔ جب ان کی معنویت مجروح ہوتی ہے تو دراصل ایک پوری تہذیب کی بنیادیں لرزنے لگتی ہیں۔

تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ جن قوموں نے اپنے دینی مراکز کی حرمت، آزادی اور تہذیبی حیثیت محفوظ رکھی، وہ سیاسی نشیب و فراز کے باوجود اپنی شناخت برقرار رکھنے میں کامیاب رہیں اور جنہوں نے ان مراکز کو اپنی اجتماعی زندگی کے حاشیے پہ ڈھکیل دیا، وہ رفتہ رفتہ اپنے فکری ورثے، تہذیبی امتیاز اور دینی تشخص سے بھی محروم ہوتی چلی گئیں۔

چنانچہ جب تہذیبی شناخت کو چیلنج درپیش ہو تو عمارتوں سے زیادہ ان کے وارثوں کا کردار فیصلہ کن بن جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں ملت کی نگاہیں فطری طور پہ اپنے علماء، مدارس اور اصحابِ منبر و محراب کی طرف اٹھتی ہیں۔ تاریخ کا یہی دستور ہے کہ جب حالات سخت ہوتے ہیں تو قومیں اپنے علمائے کرام کی طرف رجوع کرتی ہیں۔ اس لیے کہ علماء صرف احکامِ شریعت کے شارح نہیں بلکہ تہذیبی شعور کے محافظ بھی ہوتے ہیں۔ وہ محض مسائل کے جواب دینے والے نہیں بلکہ امت کی فکری سمت متعین کرنے والے، دینی شناخت کی حفاظت کرنے والے اور نسلوں کو اپنے ماضی سے جوڑ کر مستقبل کی راہیں روشن کرنے والے رہنما ہوتے ہیں۔ ان کی زبان سے صرف فتاوے صادر نہیں ہوتے بلکہ ان کی نصیحتوں سے قوموں کے ضمیر بیدار ہوتے ہیں، اقدار کو استحکام ملتا ہے اور تہذیبی شعور کو دوام حاصل ہوتا ہے۔

اسی لیے جب تہذیبی شناخت کسی نئے چیلنج سے دوچار ہوتی ہے تو سب سے پہلے انہی کی بصیرت، حکمت اور جرأت آزمائش کی کسوٹی پہ آتی ہے۔ اگر وہ وقت کی نزاکت سمجھتے ہوئے حق کی آواز بلند کریں تو قوم اپنی سمت کھونے سے محفوظ رہتی ہے، اور اگر ان کی آواز مصلحتوں کے غبار میں دب جائے تو فکری انتشار رفتہ رفتہ تہذیبی انہدام کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں علماء کا کردار صرف دینی قیادت کا نہیں بلکہ تہذیبی بقا اور ملی شناخت کے تحفظ کا کردار بھی رہا ہے۔

ان کا ہر قول رہنمائی سمجھا جاتا ہے اور ان کا ہر عمل خموش درس کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن انہی حالات میں جب عالمی یومِ یوگ کے موقع پہ بعض دینی اداروں، مدارس اور اصحابِ جبہ و دستار کی جانب سے یوگ

کی اجتماعی مشقوں کا اہتمام ہوتا ہے اور ان کی تصاویر بہت اہتمام سے ذرائع ابلاغ اور سوشل میڈیا پہ نشر کی جاتی ہیں، تو ایک حساس دل کے اندر سوالوں کی ایک پوری دنیا آباد ہو جاتی ہے۔

یہ سوال یوگ کے طبی فوائد یا جسمانی ورزش ہونے یا نہ ہونے کا نہیں۔ جسمانی صحت اسلام میں بھی مطلوب ہے اور مفید ورزش ہمیشہ قابلِ قدر رہی ہے۔ اصل سوال علامتوں کا ہے۔ ہر تہذیب کی کچھ علامتیں ہوتی ہیں، ہر مذہب کے کچھ امتیازات ہوتے ہیں اور ہر دینی طبقے سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ان علامتوں کے باب میں غیر معمولی حساسیت کا مظاہرہ کرے گا۔

کسی عمل کی انفرادی حیثیت اور اس کی اجتماعی علامتی حیثیت میں فرق ہوتا ہے۔ جو چیز ایک عام فرد کے لیے محض ورزش سمجھی جا سکتی ہے، وہی چیز جب اصحابِ منبر و محراب کے اجتماعی عمل کی صورت اختیار کر لے تو اس کے معانی بدل جاتے ہیں۔ اس وقت وہ صرف ایک جسمانی سرگرمی نہیں رہتی بلکہ ایک تہذیبی پیغام بھی بن جاتی ہے۔

یہی وہ نکتہ ہے جس پہ سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ کیا ہم اس فرق کو پوری طرح سمجھ رہے ہیں؟ کیا ہم یہ محسوس کر رہے ہیں کہ قومیں اپنی سرحدیں صرف جغرافیے میں نہیں بلکہ اپنی علامتوں، اپنے شعائر اور اپنی تہذیبی حساسیت میں بھی محفوظ رکھتی ہیں؟ اور کیا ہم اس حقیقت سے غافل تو نہیں ہو رہے کہ تہذیبیں جب کمزور ہوتی ہیں تو سب سے پہلے ان کے محافظوں کی حساسیت کمزور ہوتی ہے؟ یہ سوالات کسی فرد یا ادارے کی نیت پہ حکم لگانے کے لیے نہیں بلکہ اپنے اجتماعی مستقبل پہ غور کرنے کے لیے ہیں۔ اس لیے کہ خیر خواہی کا تقاضا خموش رہنا نہیں بلکہ ادب، حکمت اور دیانت کے ساتھ ان سوالات کو اہلِ علم کے سامنے رکھنا ہے۔ شاید اسی لیے تاریخ ہمیں بار بار متنبہ کرتی ہے کہ چراغ اس وقت نہیں بجھتے جب ہوا تیز چلتی ہے، بلکہ اس وقت بجھتے ہیں جب ان کی حفاظت کرنے والے اپنی ذمہ داری کو معمولی سمجھنے لگتے ہیں۔

جب پاسبان مصلحت کے اسیر ہوں:

یہ حقیقت ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ کسی قوم کی تہذیبی زندگی میں بعض اوقات ایسے موڑ آتے ہیں جہاں اصل آزمائش دشمن کی قوت نہیں بلکہ اپنے محافظوں کی بصیرت ہوتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب اہلِ علم نے اپنی ذمہ داری محض تدریس تک محدود سمجھ لی اور تہذیبی شعور کی نگہبانی سے غفلت برتی، تو آنے والی نسلوں نے صرف کتابیں نہیں، اپنی شناخت بھی کھو دی۔ کیونکہ کتابیں اگرچہ علم منتقل کرتی ہیں مگر شناخت صرف اس وقت منتقل ہوتی ہے جب علم کے ساتھ احساسِ ذمہ داری، غیرتِ ایمانی اور تہذیبی بصیرت بھی نسل در نسل منتقل ہو۔ جب یہ رشتہ کمزور پڑ جائے تو نصاب باقی رہتے ہیں مگر مقصد اوجھل ہو جاتا ہے، مدارس قائم رہتے ہیں مگر ان کی روح ماند پڑنے لگتی ہے اور تعلیم جاری رہتی ہے مگر تہذیب کی حفاظت کا جذبہ بتدریج مفقود ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اہلِ علم کی ذمہ داری صرف یہ نہیں کہ وہ علوم کی روایت زندہ رکھیں بلکہ یہ بھی ہے کہ ان علوم کے پس منظر میں کارفرما دینی شعور، تہذیبی امتیاز اور ملی غیرت بھی محفوظ رکھیں۔ کیونکہ اگر علم اپنی تہذیبی روح سے جدا ہو جائے تو وہ محض معلومات کا ذخیرہ بن کر رہ جاتا ہے، جبکہ وہی علم جب ایمان، بصیرت اور کردار سے ہم آہنگ ہوتا ہے تو قوموں کی تقدیر سنوارتا ہے، ان کی شناخت کو استحکام بخشتا ہے اور انہیں تاریخ کے طوفانوں میں بھی ثابت قدم رکھتا ہے۔

تاریخ کے اوراق اس حقیقت پہ گواہ ہیں کہ تہذیبوں کی حفاظت صرف شمشیر سے نہیں بلکہ صاحبِ بصیرت معلم، باکردار عالم اور بے باک داعی کے قلم، فکر اور کردار سے بھی ہوتی ہے۔ جب یہ تینوں اپنی اصل ذمہ داری ادا کرتے ہیں تو قومیں صرف زندہ نہیں رہتیں بلکہ اپنے تشخص کے ساتھ زندہ رہتی ہیں۔ اسی لیے یہ مضمون کسی فرد، کسی ادارے یا کسی مخصوص جماعت کے خلاف نہیں بلکہ ایک اجتماعی احساسِ ذمہ داری کی دعوت ہے۔ یہاں کسی کی نیت پہ حکم لگانا مقصود نہیں، اس لیے کہ نیتوں کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ البتہ اعمال کے اجتماعی اثرات، ان کے تہذیبی نتائج اور ان سے پیدا ہونے والے فکری رجحانات پہ گفتگو کرنا اہلِ علم کا فرض ہے۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ عوام اپنے علماء سے صرف فتوے نہیں لیتے بلکہ اپنے رویّے بھی سیکھتے ہیں۔ اصحابِ جبہ و دستار کا ہر

عمل، اہلِ مدارس کا ہر اجتماعی فیصلہ اور منبر و محراب سے وابستہ شخصیات کا ہر طرزِ عمل، عام مسلمانوں کے لیے ایک خموش پیغام ہوتا ہے۔ خواص کی معمولی سی غفلت، عوام کی مستقل عادت بن جاتی ہے۔

آج اگر ایک عام مسلمان سوشل میڈیا پہ اپنے کسی دینی مدرسے کے شیخ الحدیث، ناظم، مہتمم یا امام کو یوگ کے مختلف آسنوں میں دیکھتا ہے، تو وہ فقہی موشگافیوں سے پہلے اس منظر کا ظاہری مفہوم قبول کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس عالم کی نیت کیا تھی وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ جس عمل کو کل تک اپنے مذہب سے باہر سمجھا جاتا تھا، آج وہی عمل دینی قیادت کی سرپرستی میں انجام پا رہا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تہذیبی ابہام جنم لیتا ہے۔

یہاں ایک سوال پوری سنجیدگی سے پوچھا جانا چاہیے۔

آخر وہ کیا تبدیلی آئی ہے کہ جو مدارس کبھی حکومتی تقریبات سے بے نیاز رہ کر صرف قرآن و سنّت کی خدمت کو اپنا شرف سمجھتے تھے، آج وہ ہر سرکاری مہم میں اپنی شرکت ضروری محسوس کرنے لگے ہیں؟ آخر وہ کون سی فکری ترجیحات بدل گئی ہیں جنہوں نے دینی اداروں کی توجہات کو ان کے اصل منصب سے ہٹا کر ایسے میدانوں کی طرف مائل کر دیا ہے جو کبھی ان کی بنیادی شناخت کا حصہ نہیں تھے؟

یہ سوال کسی تعاون یا خیر خواہی کے اصول پہ اعتراض نہیں بلکہ ترجیحات کے تعین سے متعلق ہے۔ کیونکہ ہر ادارہ اپنی شناخت اسی وقت برقرار رکھتا ہے جب وہ اپنے اصل دائرۂ کار، اپنے بنیادی مقصد اور اپنی تہذیبی ذمہ داری کو ہر تقاضے پہ مقدم رکھے۔ جب ترجیحات بدلنے لگتی ہیں تو ابتدا میں تبدیلی معمولی محسوس ہوتی ہے مگر وقت گذرنے کے ساتھ یہی معمولی تبدیلیاں اداروں کے مزاج، کردار اور اجتماعی شناخت پہ گہرے اثرات مرتب کرنے لگتی ہیں۔

یہ بھی سوچنے کی ضرورت ہے کہ کیا دینی اداروں کی اصل قوت ان کی سرکاری تقریبات میں نمایاں موجودگی ہے، یا پھر ان کی علمی خودمختاری، اخلاقی وقار اور دینی غیر جانب داری؟

تاریخ کا سبق یہی ہے کہ علماء اور مدارس کی حقیقی عظمت اقتدار سے قربت میں نہیں بلکہ حق گوئی، فکری استقلال اور دینی امانت کے تحفظ میں مضمر رہی ہے۔ جب تک یہ اوصاف محفوظ رہتے ہیں، ان کا وقار بھی محفوظ رہتا ہے اور جب یہی اوصاف مصلحتوں کی نذر ہونے لگیں تو عمارتیں باقی رہتی ہیں مگر ان کی معنوی ہیبت اور تہذیبی اثر پذیری بتدریج کم ہونے لگتی ہے۔

یہ سوال اس لیے بھی اہم ہے کہ یوگ کوئی لازمی حکومتی فریضہ نہیں۔ اس میں عدمِ شرکت پہ نہ کوئی قانونی سزا ہے اور نہ کوئی آئینی مواخذہ۔ پھر وہ کون سی ضرورت ہے جو بعض دینی اداروں کو اس باب میں غیر معمولی سرگرمی پر آمادہ کرتی ہے؟ ممکن ہے اس کے مختلف اسباب ہوں۔ ممکن ہے بعض حضرات اسے صرف ایک جسمانی ورزش سمجھتے ہوں۔ ممکن ہے بعض کے نزدیک یہ قومی ہم آہنگی کے اظہار کا ذریعہ ہو۔ ممکن ہے بعض ادارے اپنے بارے میں پیدا ہونے والے شبہات دور کرنا چاہتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض جگہوں پہ حالات کا دباؤ، انتظامی مصلحتیں یا مستقبل کے خدشات فیصلہ سازی پہ اثر انداز ہوتے ہوں۔ ان احتمالات میں سے کس کا اطلاق کہاں ہوتا ہے، اس کا فیصلہ بغیر دلیل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایک حقیقت بہرحال اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ جو عمل ملت کے ذہن میں اشتباہ پیدا کرے، اس کے بارے میں اہلِ علم کو دوسروں سے زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے اکابر اہلِ سنّت کی دور اندیشی پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

آج سے کئی دہائیاں پہلے جب مدارس کے ایڈ اور الحاق کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تو ہمارے بعض اکابر نے غیر معمولی احتیاط بلکہ سخت مزاجی کا اظہار فرمایا۔ اس وقت بعض لوگوں نے اسے تنگ نظری کہا، بعض نے زمانے سے بے خبری قرار دیا اور بعض نے اسے غیر ضروری تشدد پہ محمول کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بزرگ صرف اپنا عہد نہیں دیکھ رہے تھے، ان کی نگاہ آنے والی نسلوں پر تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اداروں کی آزادی صرف عمارتوں سے نہیں بلکہ ان کی فکری خودمختاری سے قائم رہتی ہے۔ جس دن یہ خودمختاری کمزور پڑ گئی، اسی دن تہذیبی استقلال بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ آج جب ہم بدلتے ہوئے حالات دیکھتے ہیں تو بے اختیار یہ شعر یاد آتا ہے:

دور اندیش بڑا تنگ نظر ہوتا ہے
قبلِ آغاز ہی انجام کا ڈر ہوتا ہے

واقعہ یہی ہے کہ دور اندیش لوگ ہمیشہ حال کی آسائشوں پہ نہیں، مستقبل کے نتائج پہ نظر رکھتے ہیں۔ وہ ان راستوں کو بھی بند کر دیتے ہیں جن سے خطرہ ابھی داخل نہیں ہوا ہوتا مگر داخل ہوسکتا ہے۔ ان کی احتیاط لوگوں کو وقتی طور پہ سختی معلوم ہوتی ہے لیکن تاریخ بعد میں ان کی حکمت پہ شہادت پیش کرتی ہے۔ شاید یہی مفاسد تھے جنہیں سامنے رکھ کر ہمارے اکابر نے بعض معاملات میں کسی مصلحت کو قبول کرنے کی بجائے تنہائی قبول کر لی مگر دینی اور تہذیبی خودمختاری پہ سمجھوتہ نہیں کیا۔ آج ان مردانِ حق کی فراست جس قدر یاد کی جائے کم ہے، جنہوں نے وقتی مصلحتوں کی جگہ آنے والی نسلوں کے ایمان اور تہذیبی تشخص کی حفاظت کو ترجیح دیا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ان کی بصیرت اور بھی روشن ہو کر سامنے آتی ہے۔ آج اگر ہم ان کی بصیرت کو محض ماضی کا قصہ سمجھ کر نظر انداز کریں گے تو ممکن ہے کل ہماری آئندہ نسلیں انہی سوالات کے جواب ڈھونڈ رہی ہوں جو آج ہمارے سامنے کھڑے ہیں۔ اس لیے اصل مسئلہ یوگ نہیں، بلکہ تہذیبی حافظے کا ہے۔ اصل مسئلہ ورزش نہیں بلکہ علامتوں کی حرمت کا ہے۔ اصل مسئلہ ایک تقریب میں شرکت نہیں بلکہ اس ذہنی تبدیلی کا ہے جو رفتہ رفتہ دینی امتیازات کو غیر ضروری اور تہذیبی حساسیت کو فرسودہ سمجھنے لگتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جہاں اہلِ علم کو سب سے زیادہ بیدار رہنے کی ضرورت ہے، کیونکہ اگر پاسبان ہی مصلحت کے اسیر ہو جائیں تو قافلے کی منزل ہمیشہ خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

تہذیبی ارتداد کی پہلی آہٹ

یہاں پہنچ کر گفتگو کا رخ کسی فرد، کسی ادارے یا کسی ایک تقریب سے بلند ہو کر ایک بڑے تہذیبی سوال کی طرف مڑ جاتا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ یوگ میں شرکت درست ہے یا نہیں اس پہ اہلِ افتاء اپنی علمی آراء رکھتے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا ہماری دینی قیادت اپنے تہذیبی کردار کے بارے میں اسی قدر حساس ہے جس قدر ہمارے اسلاف تھے؟

تہذیبیں صرف عقائد سے نہیں بلکہ شعائر، علامتوں، امتیازات اور اجتماعی حافظے سے زندہ رہتی ہیں۔ جب کوئی قوم اپنے شعائر کی عظمت کو معمولی سمجھنے لگتی ہے، اپنے امتیازات کو بوجھ محسوس کرنے لگتی ہے اور اپنی تہذیبی سرحدوں کو غیر ضروری خیال کرنے لگتی ہے، تو اس کا زوال خموشی سے شروع ہو جاتا ہے۔ یہ زوال ہمیشہ عقیدے کے انکار سے شروع نہیں ہوتا اکثر اس کی ابتدا احساس کے زوال سے ہوتی ہے۔ عقیدے پر پہلا حملہ ہمیشہ عقیدے پر نہیں ہوتا پہلے اس کی علامتیں غیر اہم بنائی جاتی ہیں، پھر اس کے شعائر رسم بنا دیے جاتے ہیں، پھر اس کے امتیازات کو زمانے سے عدمِ موافقت کا عنوان دیا جاتا ہے، اور آخر کار نئی نسل کو یہ احساس بھی باقی نہیں رہتا کہ اس نے اپنا کیا کھویا اور کیا پایا۔ یہی تہذیبی ارتداد کا وہ خموش سفر ہے جس کی چاپ اہلِ بصیرت بہت پہلے سن لیتے ہیں، جبکہ عام نگاہیں اسے زمانے کے ساتھ چلنے کا نام دیتی رہتی ہیں۔

اسلام نے ہمیں حسنِ سلوک، عدل، رواداری اور بقائے باہمی کی تعلیم دی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی سکھایا ہے کہ تشبہ اور مداہنت کے درمیان جو فرق ہے آسے ہمیشہ پیشِ نظر رکھا جائے۔ دوسروں کے ساتھ خیر خواہی اور حسنِ تعلق ایک اسلامی وصف ہے لیکن اپنی دینی شناخت کا چراغ مدہم کر دینا نہ حکمت ہے اور نہ رواداری۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے اکابر نے ہمیشہ ایک اصول سکھایا: ملت کا اعتماد، دینی قیادت کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ جب عوام اپنے علماء کو دیکھتے ہیں تو وہ صرف ایک شخص کو نہیں دیکھتے بلکہ اپنے دین کی عملی تصویر دیکھتے ہیں۔ اس لیے علماء کا ہر قدم انفرادی نہیں، اجتماعی حیثیت رکھتا ہے۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے مدارس، خانقاہیں، دینی تنظیمیں اور اصحابِ منبر و محراب ایک لمحے کے لیے رک کر خود سے یہ سوال کریں کہ: کیا ہم آنے والی نسل کو اپنی تہذیبی شناخت کے بارے میں زیادہ حساس بنا رہے ہیں یا کم حساس؟ کیا ہمارے اعمال ان کے دلوں میں شعائرِ اسلام کی عظمت بڑھا رہے ہیں یا غیر محسوس طور پہ اس

عظمت کو معمول کا درجہ دے رہے ہیں؟ کیا ہم قومی وفاداری کا اظہار اس انداز میں کر رہے ہیں جس سے دین کا وقار بھی محفوظ رہے، یا کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم غیر ضروری طور پہ ان میدانوں میں اپنی موجودگی ثابت کرنے لگے ہیں جہاں شریعت نے ہمیں اس کا مکلف ہی نہیں بنایا؟

یہ سوالات تلخ ضرور ہیں لیکن خیر خواہی اکثر تلخ ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے بھی اہلِ ایمان کو بار بار اپنے محاسبے کی دعوت دی ہے۔ زندہ قومیں وہی ہوتی ہیں جو دوسروں سے پہلے اپنا احتساب کرتی ہیں۔

یہ وہ مفاسد ہیں جنہیں دیکھ کر ہمارے اکابرِ اہلِ سنّت نے بعض معاملات میں غیر معمولی احتیاط اختیار کی تھی۔ مدارس کے ایڈ اور الحاق کے باب میں ان کی سختی محض انتظامی مسئلہ نہیں تھی بلکہ تہذیبی خودمختاری کے تحفظ کی ایک حکیمانہ تدبیر تھی۔ اس وقت بعض لوگوں نے ان کی اس احتیاط کو شدت پسندی سمجھا مگر وقت گذرنے کے ساتھ معلوم ہوا کہ وہ آنے والے حالات کی آہٹ سن رہے تھے۔ سچ ہے:

دور اندیش بڑا تنگ نظر ہوتا ہے
قبلِ آغاز ہی انجام کا ڈر ہوتا ہے

اہلِ بصیرت کی نگاہ حال پہ نہیں، مستقبل پہ ہوتی ہوتی ہے۔ ان کی یہی احتیاط آنے والی نسلوں کے ایمان، تشخص اور تہذیبی وقار کی محافظ بن جاتی ہے۔ آج جبکہ ملت مختلف داخلی و خارجی چیلنجز سے گذر رہی ہے، اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ نہیں کہ ہم ایک دوسرے پہ فتوے صادر کریں یا ایک دوسرے کی نیتوں پہ حملے کریں بلکہ یہ ہے کہ ہم اپنا تہذیبی شعور بیدار کریں۔ اختلاف ہوسکتا ہے لیکن حساسیت ختم نہیں ہونی چاہیے۔ رائے مختلف ہوسکتی ہے لیکن دینی امتیاز کی حفاظت سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک مقام پر امت کی کمزوریوں کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ حقیقت واضح کی کہ جب قومیں اپنے باطنی اصولوں سے غافل ہوتی ہیں تو ان کے ظاہری نظام بھی بکھرنے لگتے ہیں۔ یہی اصول آج بھی اتنا ہی سچا ہے۔ شناخت کی حفاظت صرف سرحدوں سے نہیں ہوتی شناخت کی حفاظت شعور سے ہوتی ہے اور شعور کی حفاظت علماء کرتے ہیں۔

اسی لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر مدارس اور علماء اپنی تاریخی ذمہ داری مکمل بصیرت کے ساتھ ادا کرتے رہے تو ملت کا مستقبل محفوظ رہے گا لیکن اللہ نہ کرے اگر انہی مراکز میں تہذیبی حساسیت کمزور پڑ گئی تو اس کے اثرات صرف ایک نسل تک محدود نہیں رہیں گے۔

اسی حقیقت کو ہمارے اسلاف نے نہایت بلیغ انداز میں یوں بیان کیا ہے: ''چوں کفر از کعبہ برخیزد، کجا ماند مسلمانی''

یہ کسی پہ حکم نہیں بلکہ ایک دائمی تنبیہ ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب حفاظت کے مراکز ہی اپنی ذمہ داری سے غافل ہو جائیں تو پھر عام لوگوں سے کیا توقع کی جاسکتی ہے؟

آخر میں ہم اپنے تمام علماء، ائمہ، ذمہ دارانِ مدارس اور دینی اداروں سے نہایت ادب، اخلاص اور خیر خواہی کے ساتھ صرف اتنی گذارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے ہر اجتماعی عمل کو صرف قانونی یا انتظامی زاویے سے نہ دیکھیں بلکہ اس کے تہذیبی، دینی اور نفسیاتی اثرات بھی سامنے رکھیں۔ اس امت نے اپنے مدارس کو صرف اس لیے قائم نہیں کیا کہ وہاں نصاب پڑھایا جائے بلکہ اس لیے بھی کہ وہاں سے دینی غیرت، تہذیبی وقار اور ایمانی حمیت کی ایسی روشنی پھوٹے جو آنے والی نسلوں کے لیے مینارِ نور بن جائے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے علماء کو حکمت، ہمارے مدارس کو استقلال، ہماری نسلوں کو دینی بصیرت، اور پوری ملت کو اپنی اسلامی شناخت پہ ثابت قدمی عطا فرمائے۔ چراغوں کی حفاظت صرف ہوا سے نہیں کی جاتی بلکہ اس بات سے بھی کی جاتی ہے کہ ان کی لو کو غیر ضروری تجربوں کی نذر نہ ہونے دیا جائے۔ کیونکہ جب چراغ بجھتے ہیں تو اندھیرا صرف ایک گھر میں نہیں، پوری بستی میں اتر آتا ہے۔

ہماری یہ معروضات کسی شخصیت کے خلاف نہیں، کسی ادارے کی نیت پہ شبہ نہیں اور نہ ہی کسی کی حب الوطنی کو میزان پہ تولنے کی کوشش ہیں۔ یہ صرف ایک ایسے دردمند دل کی صدا ہے جو اپنی ملت کی تہذیبی شناخت کو وقت کی تیز آندھیوں میں لرزتے ہوئے دیکھ کر بے چین ہے۔ یہ کسی شخصیت، ادارے یا جماعت کے خلاف صدائے احتجاج نہیں بلکہ اس چراغ کی حفاظت کی ایک مخلصانہ فریاد ہے جس کی روشنی

میں ہماری نسلوں نے صدیوں تک اپنے ایمان، اپنی تہذیب اور اپنی شناخت کا سفر طے کیا ہے۔ دل اس لیے مضطرب ہے کہ اگر آج ہم نے اپنی تہذیبی بنیادوں میں پڑنے والی باریک دراروں کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیا تو کل یہی دراریں ہماری اجتماعی عمارت کو کمزور کر دیں گی۔ تاریخ کے سانحات ہمیشہ ایک ہی لمحے میں جنم نہیں لیتے وہ برسوں کی غفلت، خموشی اور مصلحت کے بطن سے جنم لیتے ہیں۔ اس وقت جب قومیں خطرات محسوس کرتی ہیں، اکثر بہت کچھ ان کے ہاتھوں سے نکل چکا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ تحریر الزام کا نوحہ نہیں، احساس کا پیغام ہے، مخالفت کی آواز نہیں، خیر خواہی کی پکار ہے۔ تاریخ کا فیصلہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ قومیں اس وقت تک زندہ رہتی ہیں جب تک ان کے شعائر زندہ رہتے ہیں اور شعائر اس وقت تک زندہ رہتے ہیں جب تک ان کے محافظ بیدار رہتے ہیں۔ جب محافظوں کی نگاہوں سے امتیازِ حق و باطل کی حساسیت اوجھل ہونے لگے تو پھر زوال کی آہٹ سننے کے لیے کسی مورخ کی ضرورت نہیں رہتی۔ آج بھی وقت ہاتھ سے نہیں نکلا۔ ہمارے مدارس زندہ ہیں، ہمارے منبر آباد ہیں، ہماری خانقاہیں ذکرِ الٰہی سے معمور ہیں اور ہمارے علماء ملت کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم ہر اس راستے پر ایک لمحہ ٹھہر کر ضرور سوچیں جو بظاہر آسان، لیکن انجام کے اعتبار سے مبہم ہو۔

ہمارے اکابر نے ہمیں یہی سبق دیا تھا کہ دین کی حفاظت صرف عقائد کی حفاظت سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی تہذیب، اس کے شعائر اور اس کے امتیازات کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ جو قوم اپنے امتیازات کی حفاظت نہیں کرتی، تاریخ رفتہ رفتہ اس کی شناخت بھی اس سے چھین لیتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عقیدے پہ پہلا حملہ ہمیشہ عقیدے پہ نہیں ہوتا، پہلے اس کی علامتوں کو غیر اہم بنایا جاتا ہے، پھر اس کے شعائر کو محض رسم بنا دیا جاتا ہے، پھر اس کے امتیازات کو زمانے سے عدم موافقت کا عنوان دیا جاتا ہے اور آخر کار نئی نسل کو یہ احساس بھی باقی نہیں رہتا کہ اس نے اپنا کیا کھویا۔ یہی وہ خموش سفر ہے جس کی آہٹ اہلِ بصیرت بہت پہلے سن لیتے ہیں، جبکہ عام نگاہیں اسے زمانے کے ساتھ چلنے کا نام دیتی رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں ایمان کی حرارت، ہماری نگاہوں میں بصیرت کی روشنی، ہمارے علماء میں حق گوئی کی جرأت، ہمارے مدارس میں اسلاف کی امانت اور ہماری نسلوں میں اسلامی تشخص کی ایسی غیرت عطا فرمائے کہ زمانے کی کوئی آندھی ہمارے چراغوں کی لو کو مدھم نہ کر سکے۔ چراغوں کو ہوا سے نہیں، غفلت سے خطرہ ہوتا ہے اور جس قوم کے چراغِ شعور بجھ جائیں، اس کی تاریخ پھر وہ خود نہیں لکھتی بلکہ دوسرے اس کا نوحہ لکھتے ہیں۔ کیونکہ تاریخ کی باگ ڈور ہمیشہ ان ہاتھوں میں آجاتی ہے جو اپنے شعور، اپنی شناخت اور اپنے مقصد کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ جو قومیں اپنے فکری سرمائے کی نگہبانی سے غافل ہو جاتی ہیں، وہ رفتہ رفتہ اپنے تاریخی بیانیے، تہذیبی امتیاز اور اجتماعی حافظے پر بھی اپنا اختیار کھو بیٹھتی ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب ان کی نئی نسل اپنے اسلاف کی عظمت دوسروں کی کتابوں سے جانتی ہے، اپنی تہذیبیں دوسروں کی تعبیر سے سمجھتی ہے اور اپنی شناخت کو دوسروں کے پیمانوں پر پرکھنے لگتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب شکست صرف جغرافیے کی نہیں بلکہ فکر، تہذیب اور خود آگہی کی بھی ہو چکی ہوتی ہے۔

اس لیے زندہ قومیں اپنے قلعوں سے پہلے اپنے شعور کی حفاظت کرتی ہیں، اپنے وسائل سے پہلے اپنی اقدار کی پاسبانی کرتی ہیں اور اپنی سرحدوں سے پہلے اپنی تہذیبی شناخت کی نگہبانی کرتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ چراغ جب تک روشن رہتے ہیں، راستے بھی باقی رہتے ہیں لیکن جب چراغِ شعور بجھ جائیں تو پھر منزلیں نہیں ملتیں، صرف بھٹکتے ہوئے قافلے تاریخ کے اوراق میں اپنی گمشدگی کی داستان چھوڑ جاتے ہیں۔

حرفِ آخر: یہ تحریر اختلاف کی آواز سے زیادہ احساسِ ذمہ داری کی ایک مؤدبانہ دستک ہے۔ اس میں احتجاج سے زیادہ احتساب، جذبات سے زیادہ بصیرت اور رد سے زیادہ تہذیبی بیداری کی دعوت مضمر ہے۔ اگر اسے الزام نامہ نہیں بلکہ اجتماعی خود احتسابی کا آئینہ سمجھ کر پڑھا جائے، تو امید ہے کہ یہ اپنے اصل مقصد، یعنی تہذیبی شعور کی تجدید اور دینی حساسیت کی بیداری میں مؤثر کردار ادا کرے گی۔

□□□□

مفتی اطہر حسن ضیائی
صدر المدرسین دارُ العلوم رحمت عالم شری رامپور، احمد نگر

ناموسِ اُمّ المؤمنین: ایمان کی سرحد اور امت کے ضمیر کی آواز

جان صدیق آرامِ جانِ نبی
اُس حریمِ برأت پہ لاکھوں سلام
(رضا بریلوی)

بعض فیصلے زمین پہ نہیں، آسمان پہ ہوتے ہیں۔ بعض عظمتیں انسانوں کے قلم نہیں لکھتے بلکہ انہیں وحیِ الٰہی ثبت کرتی ہے۔ بعض کردار تاریخ کی عدالت سے نہیں، ربِ کائنات کی بارگاہ سے سندِ صداقت پاتے ہیں۔ پھر زمانے کے تمام قلم، تمام زبانیں اور تمام شور اس نورانی فیصلے کے سامنے بے معنیٰ ہو جاتے ہیں۔

امّ المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عظمت بھی انہی آسمانی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت ہے۔ جب منافقین نے تہمتِ افک کا فتنہ برپا کیا، مدینہ منورہ کی فضائیں غبار آلود ہوگئیں، دل بے چین تھے، زبانیں مختلف چہ میگوئیوں میں مصروف تھیں لیکن اس نازک لمحے میں نہ کسی بادشاہ کا فرمان اترا، نہ کسی عدالت کا فیصلہ صادر ہوا بلکہ سات آسمانوں کے اوپر سے ربِّ ذوالجلال نے سورۂ نور کی پاکیزہ آیات نازل فرما کر قیامت تک کے لیے اعلان کر دیا کہ جس ہستی کی عفت و عصمت پہ انگلی اٹھائی گئی تھی، وہ اللہ کی بارگاہ میں پاک، مطہرہ، مقدسہ اور بلند مرتبہ ہے۔ یوں یہ صرف ایک خاتون کی برأت نہ تھی بلکہ یہ اعلان تھا کہ ازواجِ مطہرات کی حرمت، حرمتِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حصہ ہے اور ان کا ادب ایمان کے آداب میں شامل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اہلِ سنّت و جماعت کی پوری تاریخ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ادبِ ازواجِ مطہرات سے عبارت ہے۔ امامِ اہلِ سنّت، مجددِ دین و ملت، عاشقِ رسول امام احمد رضا قادری رحمۃ اللہ علیہ نے جس محبت کے ساتھ صحابۂ کرام، اہلِ بیتِ اطہار اور ازواجِ مطہرات کا تذکرہ فرمایا، وہ دراصل اسی قرآنی تعلیمات کی ترجمانی ہے کہ جس گھرانے کو اللہ نے نبوت کا مرکز بنایا، اس کے ہر فرد کا احترام امت کی دینی شناخت کا حصہ ہے۔

آج جب تہذیب کے نام پہ بے ادبی، آزادیِ اظہار کے نام پہ گستاخی اور فکری آزادی کے نام پہ مذہبی مقدسات کی توہین کو رواج دینے کی کوشش کی جارہی ہے، تو ہر صاحبِ ایمان کے دل میں یہ سوال پیدا ہونا فطری ہے کہ کیا آزادی کا مطلب یہ ہے کہ کروڑوں انسانوں کے مقدس ترین عقائد مجروح کیے جائیں؟ کیا جمہوریت کا مفہوم یہ ہے کہ مذہبی شخصیات کو نفرت اور تمسخر کا نشانہ بنایا جائے؟ اور کیا قانون کی خموشی شرپسند عناصر کے حوصلے مزید بلند نہیں کرے گی؟ اگر اظہارِ رائے کی آزادی کو دوسروں کے ایمان، عقیدت اور مذہبی جذبات کچلنے کا پروانہ بنا دیا جائے تو پھر معاشرے میں امن، باہمی احترام اور سماجی ہم آہنگی کی بنیاد کیسے باقی رہ سکتی ہے؟ وہ آزادی جو انسانوں کے درمیان نفرت کی دیواریں کھڑی کرے، معاشرتی انتشار کو ہوا دے اور مذہبی منافرت کو فروغ دے، درحقیقت آزادی نہیں بلکہ بے لگام انتشار کا دوسرا نام ہے۔

ہر مہذب، جمہوری اور آئینی معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ وہ آزادیِ اظہار اور مذہبی احترام کے درمیان متوازن حد قائم رکھے، تاکہ کسی فرد یا گروہ کو یہ اجازت نہ ملے کہ وہ کروڑوں انسانوں کے

مقدسات کی توہین کرکے معاشرے کے امن و امان کو داؤں پہ لگا دے۔ قانون کی خموشی نہ صرف انصاف پہ سوالیہ نشان ہے بلکہ یہ ان عناصر کے لیے ایک خطرناک پیغام بھی ہے کہ وہ نفرت اور اشتعال انگیزی کے اپنے مذموم عزائم کو مزید بے خوف ہوکر آگے بڑھائیں۔

حالیہ دنوں نازیہ خان الٰہی کی جانب سے امّ المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں سامنے آنے والے توہین آمیز بیانات نے ہر دردمند مسلمان کا قلب زخمی کر دیا ہے۔ یہ معاملہ کسی فرد، جماعت یا مسلک کا نہیں بلکہ اس مقدس نسبت کا ہے جسے خود قرآن نے ''أُمَّهَاتُ الْمُؤْمِنِين'' کا ابدی شرف عطا فرمایا ہے۔

ہمیں یہ حقیقت بھی ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اہلِ اسلام کا احتجاج کبھی قانون شکنی کا عنوان نہیں بنتا۔ ہمارا مزاج دلیل، ہمارا ہتھیار آئین، اور ہماری قوت قانون کی بالادستی ہے۔ ہم امن کے داعی ہیں مگر امن کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ایمان کی سرحدوں پہ حملہ ہو اور اہلِ ایمان خموش تماشائی بنے رہیں۔ ناموسِ رسالت ﷺ، ناموسِ اہلِ بیت اور ناموسِ ازواجِ مطہرات وہ مقدس اقدار ہیں جن پہ امت کبھی سمجھوتہ نہیں کرسکتی۔

ناموسِ رسالت ﷺ، ناموسِ اہلِ بیتِ اطہار اور ناموسِ ازواجِ مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ عنہن اجمعین وہ مقدس اقدار ہیں جن پہ امتِ مسلمہ کبھی سمجھوتہ نہیں کرسکتی۔ یہ صرف مذہبی وابستگی کا مسئلہ نہیں بلکہ مسلمانوں کے ایمان، محبت، عقیدت اور روحانی شناخت کا بنیادی تقاضا ہے۔ ان مقدس ہستیوں کی عزت وحرمت ہر مسلمان کے دل کی دھڑکن اور اس کے ایمان کا لازمی جزو ہے۔

ان مقدسات کی توہین یا ان کے بارے میں نفرت، تمسخر اور اشتعال انگیز زبان کا استعمال نہ صرف مذہبی جذبات کو شدید مجروح کرتا ہے بلکہ معاشرتی ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور باہمی احترام کی فضا کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ ایک مہذب اور آئینی معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام مذاہب اور ان کے مقدسات کے احترام کو یقینی بنائے، کیونکہ حقیقی آزادی وہی ہے جو دوسروں کے عقائد، مذہبی احساسات اور انسانی وقار کا احترام کرتے ہوئے استعمال کی جائے، نہ کہ انہیں مجروح کرنے کا ذریعہ بنے۔

امتِ مسلمہ واضح طور پہ یہ سمجھتی ہے کہ ناموسِ رسالت ﷺ، ناموسِ اہلِ بیتِ کرام اور ناموسِ ازواجِ مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ عنہن کا تحفظ صرف ایک مذہبی مطالبہ نہیں بلکہ امن، باہمی احترام اور مہذب معاشرے کی بقا کی بنیادی ضمانت ہے۔ ان مقدس اقدار کے بارے میں ہر قسم کی گستاخی، نفرت انگیزی اور اشتعال انگیزی کے خلاف مؤثر قانونی کارروائی ہی انصاف، آئین کی بالادستی اور سماجی استحکام کا تقاضا ہے۔

سورۂ نور کا فیصلہ اور امّ المؤمنین کا علمی وایمانی مقام:

اسلامی تاریخ میں بہت سے واقعات ایسے ہیں جنہوں نے امت کی فکری سمت متعین کی، لیکن واقعۂ افک ان چند عظیم ترین واقعات میں سے ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ایک پاکیزہ ہستی کی برأت فرمائی بلکہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو یہ بھی سکھا دیا کہ کسی مؤمن کی عزت پہ حملہ، خصوصاً اہلِ بیتِ نبوت اور ازواجِ مطہرات کے بارے میں زبان درازی، کس قدر سنگین جرم ہے۔

جب منافقین نے حضرت امّ المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے خلاف بہتان کا طوفان کھڑا کیا تو مدینۂ منورہ کی فضا اضطراب سے بھر گئی۔ یہ محض ایک گھریلو معاملہ نہ تھا بلکہ پورے معاشرے کی اخلاقی آزمائش تھی۔ ایسے نازک موقع پہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور کی آیات نازل فرما کر ہمیشہ کے لیے یہ اصول قائم کر دیا کہ پاک دامن اہلِ ایمان پہ تہمت لگانا عظیم گناہ ہے اور جن لوگوں نے اس بہتان کو معمولی بات سمجھا، ان کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ تم اسے معمولی سمجھتے تھے، حالانکہ اللہ کے نزدیک وہ بہت بڑا معاملہ تھا۔

یہ صرف ایک تاریخی فیصلہ نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ایک شرعی معیار ہے۔ جب قرآنِ کریم کسی شخصیت کی طہارت وعظمت کی گواہی دے دے تو اس کے بعد اس شخصیت کے بارے میں ہر زبان کو ادب کا پابند ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ سنّت و جماعت نے

ہمیشہ حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی محبت کو ایمان کا حصہ اور ان کے ادب کو محبت رسول ﷺ کی لازمی علامت قرار دیا ہے۔

امّ المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عظمت صرف اس لیے نہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی زوجۂ مطہرہ تھیں بلکہ اس لیے بھی کہ وہ علمِ نبوت کی امین تھیں۔ دو ہزار سے زائد احادیث آپ کے ذریعے امت تک پہنچیں۔ فقہ، تفسیر، حدیث، میراث، عبادات، اخلاق، عائلی زندگی اور خواتین سے متعلق بے شمار شرعی مسائل میں آپ کی آراء آج بھی اسلامی فقہ کا بنیادی سرمایہ ہیں۔ اکابر صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین مشکل مسائل میں آپ کی طرف رجوع کرتے تھے، کیونکہ آپ نے بارگاہِ نبوت میں وہ تربیت پائی تھی جو کسی درسگاہ میں ممکن نہ تھی۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے کہ اگر تمام امہات المؤمنین اور تمام خواتینِ امت کا علم ایک طرف رکھا جائے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا علم دوسری طرف، تو آپ کا علم سب پہ غالب نظر آئے۔ یہ صرف ایک فرد کی تعریف نہیں بلکہ اسلامی علمی روایت کا اعتراف ہے۔

افسوس کہ آج بعض لوگ انہی مقدس ہستیوں کو اپنی اشتعال انگیز گفتگو کا نشانہ بنا کر شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ نازیہ خان الٰہی کی جانب سے حضرت امّ المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں سامنے آنے والے توہین آمیز بیانات اسی افسوس ناک رجحان کی ایک مثال ہیں۔ یہ طرزِ گفتگو نہ علمی اختلاف ہے، نہ تاریخی تحقیق اور نہ ہی آزادیِ اظہار بلکہ ایسی باتیں کروڑوں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرتی ہیں، معاشرتی ہم آہنگی کو نقصان پہنچاتی ہیں اور باہمی احترام کی فضا مکدر کرتی ہیں۔

یہ بھی قابلِ غور ہے کہ جب کسی مذہب کی مقدس شخصیات کو مسلسل اشتعال انگیز انداز میں نشانہ بنایا جاتا ہے تو اس کے نتائج صرف مذہبی حلقوں تک محدود نہیں رہتے بلکہ قومی یکجہتی، سماجی اعتماد اور امنِ عامہ بھی متاثر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مہذب اور آئینی ریاست مذہبی منافرت اور مقدسات کی توہین کو محض ایک شخصی اظہار نہیں بلکہ ایک عوامی ذمہ داری اور قانونی مسئلہ تصور کرتی ہے۔

لہٰذا اس معاملے میں مسلمانوں کا احتجاج کسی فرد سے ذاتی مخاصمت نہیں بلکہ اپنے دینی شعائر، اپنے ایمانی تشخص اور اپنے آئینی حقوق کے تحفظ کی پرامن اور قانونی آواز ہے۔ جو قوم اپنے مقدسات کے احترام کا شعور کھو دیتی ہے، وہ آہستہ آہستہ اپنی تہذیبی شناخت بھی کھو بیٹھتی ہے۔ اور جو قوم اپنے مقدسات کا ادب کرتی ہے، تاریخ عزت و وقار کے ساتھ اسی کا نام محفوظ رکھتی ہے۔

قانون کی عمل داری، دینی غیرت اور ملت کی اجتماعی ذمہ داری:

ہندستان ایک جمہوری اور کثیر مذہبی ملک ہے، جہاں آئین ہر شہری کو مذہبی آزادی عطا کرتا ہے اور ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے عقائد اور مقدسات کے احترام کے ساتھ زندگی گذارنے کا حق دیتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آزادیِ اظہار کا حق مطلق نہیں ہوتا اس کے ساتھ یہ ذمہ داری بھی وابستہ ہے کہ کسی دوسرے مذہب، اس کی مقدس شخصیات یا اس کے ماننے والوں کے مذہبی جذبات مجروح نہ کیے جائیں۔ یہی توازن ایک مہذب، پرامن اور آئینی معاشرے کی بنیاد ہے۔

اسی لیے جب کسی فرد کی گفتگو سے کسی مذہبی برادری کے جذبات مجروح ہوں، معاشرے میں نفرت اور کشیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، یا عوامی امن متاثر ہونے کا خطرہ ہو، تو ریاستی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ قانون کے مطابق معاملات کی جانچ کریں اور اگر جرم ثابت ہو تو بلا امتیاز کارروائی کریں۔ قانون کی بروقت اور منصفانہ عمل داری نہ صرف متاثرہ طبقے کا اعتماد بحال کرتی ہے بلکہ مستقبل میں ایسے واقعات کی روک تھام کا بھی ذریعہ بنتی ہے۔

نازیہ خان الٰہی کی جانب سے امّ المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں سامنے آنے والے توہین آمیز بیانات کے تناظر میں ہم متعلقہ حکام سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس معاملے کی فوری، غیر جانبدارانہ اور قانونی تحقیقات کرائی جائیں، قابلِ اعتراض مواد کا جائزہ لیا جائے اور اگر متعلقہ قوانین کی خلاف ورزی

ثابت ہو تو قانون کے مطابق مناسب کارروائی کی جائے۔ اسی طرح ایسے مواد کی تشہیر اور اشاعت روکنے کے لیے متعلقہ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز سے بھی ضروری اقدام کیا جائے، تاکہ معاشرتی ہم آہنگی اور مذہبی احترام کو نقصان نہ پہنچے۔

ساتھ ہی ہم امتِ مسلمہ سے بھی یہ گذارش کرتے ہیں کہ اپنے احتجاج کو ہمیشہ آئین، قانون، حکمت اور اخلاق کے دائرے میں رکھیں۔ اشتعال انگیزی کا جواب اشتعال سے نہیں بلکہ علم، کردار، صبر اور قانونی جدوجہد سے دیا جائے۔ حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سیرتِ طیبہ خود ہمیں یہی سبق دیتی ہے کہ حق کی سربلندی علم، استقامت اور اخلاقِ عالیہ سے ہوتی ہے۔

اس واقعے کا ایک اہم سبق یہ بھی ہے کہ ہمیں اپنی نئی نسل کو ازواجِ مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ عنہن کی سیرت، ان کی علمی خدمات، ان کے مقام اور ان کے ادب سے روشناس کرانا ہوگا۔ جب تک گھروں، مدارس، جامعات اور دینی و سماجی اداروں میں ان عظیم شخصیات کا صحیح تعارف عام نہیں ہوگا، تب تک فتنہ انگیز عناصر جھوٹ، تحریف اور اشتعال کے ذریعے ذہنوں کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ مقدسات کا تحفظ صرف قانونی کارروائی سے نہیں بلکہ صحیح علم کی اشاعت سے بھی ہوتا ہے۔

تہذیبوں کی اصل شناخت ان کی عمارتیں نہیں، ان کے مقدسات ہوتے ہیں۔ قومیں اپنے اسلاف کے احترام، اپنے عقائد کی حرمت اور اپنے اخلاقی اصولوں کی پاسداری سے زندہ رہتی ہیں۔ امتِ محمدیہ کی سب سے بڑی دولت محبتِ رسول ﷺ ہے اور اسی محبت کا لازمی تقاضا آپ ﷺ کے اہلِ بیت، صحابۂ کرام اور ازواجِ مطہرات کا کامل ادب و احترام ہے۔

ہم پورے یقین کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ ہم اپنے وطن کے وفادار شہری ہیں، آئین ہند پہ مکمل اعتماد رکھتے ہیں اور ہر مسئلے کا حل قانون کے دائرے میں تلاش کرنے کے قائل ہیں۔ لیکن ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مذہبی مقدسات کی حرمت کا تحفظ ایک مشترکہ قومی ذمہ داری ہے، کیونکہ کسی بھی مذہب کے مقدسات کی توہین صرف ایک مذہبی مسئلہ نہیں بلکہ سماجی ہم آہنگی اور قومی اتحاد کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔

آج ہماری آواز انتقام کی نہیں، انصاف کی ہے، تصادم کی نہیں، قانون کی ہے، نفرت کی نہیں، احترام کی ہے۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو محبتِ رسول ﷺ، تکریم اہل بیت، ادبِ ازواجِ مطہرات اور احترامِ صحابۂ کرام سے ہمیشہ آباد رکھے، ہمارے وطن کو امن، انصاف اور باہمی احترام کا گہوارہ بنائے اور ہمیں ہر ایسے قول و عمل سے محفوظ رکھے جو دلوں میں نفرت اور معاشرے میں فساد کا سبب بنے۔

ناموسِ امّ المؤمنین کا تحفظ صرف مسلمانوں کی ذمہ داری نہیں بلکہ ہر اس معاشرے کی اخلاقی ذمہ داری ہے جو احترام، انصاف اور پرامن بقائے باہمی پہ یقین رکھتا ہے۔ یہی آئین کا تقاضا ہے، یہی تہذیب کا حسن ہے، اور یہی انسانیت کی معراج ہے۔

□□□□

رسائل و جرائد صرف کاغذ پہ چھپے ہوئے الفاظ نہیں ہوتے، یہ عقائد کی حفاظت، نظریات کی پاسبانی اور تہذیبی شعور کی بقا کے خموش مگر مؤثر قلعے ہوتے ہیں۔ اس لیے رسائل کا مطالعہ کیجیے، انہیں اپنے گھروں تک پہنچائیے اور اپنے بچوں کے ہاتھوں میں دیجیے، کیونکہ جو قوم اپنے قلم اور مطبوعات کی حفاظت نہیں کرتی، رفتہ رفتہ اپنے افکار، عقائد اور تہذیبی شناخت کی حفاظت سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر فرزانہ پروین

الفاظ کے شور میں معنیٰ کی شکست

ہر عہد کا اپنا ایک فکری مزاج ہوتا ہے۔ کچھ زمانے سوال پیدا کرتے ہیں، کچھ جواب اور کچھ ایسے بھی آتے ہیں جن میں نہ سوال باقی رہتے ہیں اور نہ جواب، صرف ترتیب باقی رہ جاتی ہے۔ ہمارا عہد اسی ترتیب کا اسیر ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کے نام پہ جو کچھ ہمارے سامنے ہے، وہ مکالمہ نہیں بلکہ منصوبہ بند اظہار ہے جہاں بولنے سے پہلے سوچ نہیں ہوتی بلکہ سوچنے سے پہلے طے کرلیا جاتا ہے کہ کیا بولنا ہے۔ ایسے میں فکر کی آزادی محض ایک نعرہ رہ جاتی ہے اور مکالمہ اپنی اصل روح کھو بیٹھتا ہے۔ زبان حرکت میں ہوتی ہے مگر ذہن مفلوج رہتا ہے، الفاظ ادا ہوتے ہیں مگر معنیٰ جنم نہیں لیتے۔ یہاں گفتگو دریافت کا سفر نہیں رہتی، محض طے شدہ موقف کی نمائش بن جاتی ہے اور اختلافِ رائے بھی اسی حد تک قابلِ قبول ہوتا ہے جہاں وہ اسکرپٹ کی دیواروں سے نہ ٹکرائے۔ یوں سوچ کو بولنے کی اجازت نہیں ملتی بلکہ بولنے کو سوچ کا نام دے دیا جاتا ہے۔۔اور یہی وہ مقام ہے جہاں اظہار کی آزادی خاموشی کی ایک نئی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

آج کا الیکٹرانک میڈیا محض خبر رسانی کا وسیلہ نہیں رہا بلکہ ایک باقاعدہ اسٹیج شو بن چکا ہے، جہاں سوالات بھی پہلے طے ہوتے ہیں، جوابات بھی، اعتراضات اسکرپٹ کا حصہ ہوتے ہیں اور اعترافات ایڈیٹنگ ٹیبل پہ ترتیب پاتے ہیں۔ یہاں نتائج پہ بحث نہیں ہوتی، نتائج پہلے لکھ لیے جاتے ہیں، بحث صرف اس کا جواز تراشتی ہے۔ نذرانے کی رقم، تالیوں کا شور، داد و تحسین کے نعرے، سب کچھ پہلے سے مقرر ہوتا ہے۔ بس چہرے بدلتے ہیں، کردار وہی رہتے ہیں۔ یہاں بحث سچ کی تلاش نہیں، بلکہ ایک پہلے سے طے شدہ نتیجے کی نمائشی تکمیل ہے۔ سوال اس لیے نہیں اٹھایا جاتا کہ حقیقت واضح ہو بلکہ اس لیے کہ جواب کو کسی خاص سانچے میں فِٹ کیا جا سکے۔ اعتراضات عقل کی بے چینی نہیں بلکہ پروگرام کی ضرورت ہوتے ہیں اور اعتراف ضمیر کی آواز نہیں بلکہ کلائمکس۔ اس ترتیب یافتہ منظر نامے میں صداقت کوئی منزل نہیں رہتی، صرف ایک مرحلہ بن جاتا ہے جسے طے شدہ وقت پہ عبور کر لینا کافی سمجھا جاتا ہے۔ یہاں سوال کا کام پردہ ہٹانا نہیں، رفتار قائم رکھنا ہوتا ہے اعتراض کا مقصد غور و فکر نہیں، حرارت پیدا کرنا اور اعتراف کی حیثیت توبہ کی نہیں، تفریح کی ہوتی ہے۔

یوں مکالمہ ضمیر کی تطہیر کی بجائے ناظر کی تسکین کا ذریعہ بن جاتا ہے اور بحث حقیقت تک پہنچنے کے لیے نہیں بلکہ اس لمحے تک کھینچی جاتی ہے جہاں اشتہار کا وقفہ اسے روک دے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سوال اپنی معنویت، اعتراض اپنی سچائی اور اعتراف اپنی اخلاقی قدر کھو بیٹھتا ہے۔۔اور گفتگو محض ایک منظم شور میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں علم اپنی فطری حیثیت کھو بیٹھتا ہے۔ وہ کشف نہیں رہتا، کنٹینٹ بن جاتا ہے، وہ رہنمائی نہیں کرتا، صرف ریٹنگ بڑھاتا ہے۔ فلسفے کی زبان میں کہا جائے تو یہاں معنیٰ کی جگہ منظر لے لیتا ہے اور سچ کی جگہ تاثر۔ یہی وہ لمحہ ہے جہاں تہذیب کا زوال شور مچائے بغیر شروع ہو جاتا ہے۔

باقی صفحہ 106 پر ملاحظہ فرمائیں۔۔۔۔

اخلاقیات

حافظ رضی الدین

اندھیری رات کے مسافر

تاریخِ انسانی میں بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جو محض ماضی کی ایک یاد نہیں رہتے بلکہ کردار، قیادت اور انسانیت کے دائمی معیار بن جاتے ہیں۔ ان کی عظمت اس لیے نہیں ہوتی کہ ان میں کوئی غیر معمولی جنگ یا حیرت انگیز فتح مذکور ہوتی ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ انسان کے باطن میں پوشیدہ رحمت، احساسِ ذمہ داری اور خوفِ خدا کو اپنے کامل ترین روپ میں آشکار کر دیتے ہیں۔

اسلام کی تاریخ ایسے ہی روشن اور تابندہ واقعات سے مزین ہے۔ یہاں حکمرانی کا تصور اقتدار، جاہ و جلال اور برتری کے گرد نہیں گھومتا بلکہ خدمت، امانت اور جواب دہی کے اصولوں پر استوار نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تاریخ کے اوراق میں ہمیں ایسے مناظر بھی ملتے ہیں جہاں ایک حکمران اپنی رعایا کے حال جاننے کے لیے راتوں کو جاگتا ہے، محروموں کی تلاش میں گلیوں اور ویرانوں کی خاک چھانتا ہے اور اپنے منصب کو اعزاز نہیں بلکہ ایک بھاری امانت سمجھتا ہے۔

زیرِ نظر واقعہ بھی اسی احساسِ ذمہ داری، رحم دلی اور خدمتِ خلق کی ایک درخشاں مثال ہے۔ یہ ایک ایسی رات کی داستان ہے جس میں خاموش فضا، مدھم آگ، بھوک سے بلکتے ہوئے چند بچے اور ایک دردمند دل آمنے سامنے آتے ہیں۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقت میں یہ اسلامی تصورِ حکومت، عدلِ اجتماعی اور انسانی ہمدردی کی ایک ایسی زندہ تفسیر ہے جس کی روشنی صدیوں بعد بھی دلوں کو منور کرتی ہے۔

آیئے! مدینۂ منورہ کی اس خاموش اور سرد رات میں داخل ہوتے ہیں اور ایک ایسے مسافر کے ساتھ چلتے ہیں جس کے قدم تاریکی میں سفر کر رہے ہیں، مگر جس کا دل اپنی رعایا کے دکھوں کو روشنی عطا کرنے کے لیے دھڑک رہا ہے۔

مدینہ منورہ کی وہ ایک سرد رات تھی۔ آسمان پر ستارے خاموشی سے ٹمٹما رہے تھے اور زمین پر سناٹے کی ایک دبیز چادر بچھی ہوئی تھی۔ بیشتر گھروں کے چراغ گل ہو چکے تھے۔ لوگ اپنے اہل و عیال کے درمیان آرام کر رہے تھے۔ دن بھر کی مشقت کے بعد تھکے ہوئے جسم نیند کی آغوش میں جا چکے تھے اور گلیاں اپنے مکینوں کی خموش سانسوں کے ساتھ سکون کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ ہوا کے نرم جھونکے مدینہ منورہ کی خاموش فضا میں سرگوشیاں کرتے پھر رہے تھے۔ کھجوروں کے درخت آہستہ آہستہ جھوم رہے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے پوری بستی ایک گہری خاموشی میں ڈوبی ہوئی اپنے رب کی قدرت کا مشاہدہ کر رہی ہو۔ رات اپنے شباب پر تھی، تاریکی اپنی پوری وسعت کے ساتھ زمین پر سایہ فگن تھی، اور دور دور تک سکون اور خاموشی کا راج تھا۔ مگر اسی خاموشی کے عالم میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی، جس کے قدم آرام کی طرف نہیں بلکہ ذمہ داری کی طرف اٹھ رہے تھے۔ جب شہر سو جاتا تھا تو وہ جاگتا تھا، جب لوگ اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیتے تھے تو وہ بستی کے دروازوں پر دستک دیتا تھا اور جب ہر طرف سکون چھا جاتا تھا تو اس کا دل اپنی رعایا کی فکر میں بے چین رہتا تھا۔

اس کے قدموں میں عجب بے قراری تھی، جیسے وہ کسی گمشدہ امانت کی تلاش میں ہو۔ کبھی کسی گلی کی طرف دیکھتا، کبھی کسی راستے پر نظر ڈالتا اور کبھی دور افق تک پھیلے اندھیروں کا جائزہ لیتا۔ اس کے چہرے

پر فکر تھی، مگر وہ فکر اپنی ذات کے لیے نہیں، دوسروں کے لیے تھی۔

وہ اپنے ایک خادم کے ساتھ خاموشی سے مدینہ منورہ کی گلیوں اور نواحی علاقوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے قدموں میں عجلت نہ تھی مگر بے پروائی بھی نہ تھی۔ وہ کبھی کسی گلی کی طرف نگاہ اٹھاتا، کبھی کسی مکان کی طرف متوجہ ہوتا اور کبھی دور تک پھیلے ہوئے اندھیروں میں کچھ تلاش کرتا محسوس ہوتا تھا۔ گویا وہ کسی کھوئی ہوئی شے کی جستجو میں تھا، یا شاید کسی ایسی آہ کی تلاش میں جو ابھی تک اس کے کانوں تک نہ پہنچ سکی ہو۔ اس کے دل میں ایک عجیب احساسِ ذمہ داری موجزن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رات کی تاریکی بہت سے دکھوں کو اپنی آغوش میں چھپا لیتی ہے، بہت سی فریادیں خاموش رہ جاتی ہیں، بہت سے آنسو اندھیروں میں بہہ جاتے ہیں اور بہت سی بھوکیں ایسی ہوتی ہیں جن کی خبر صبح ہونے تک کسی کو نہیں ہو پاتی۔ وہ جانتا تھا کہ دن کی روشنی میں انسان اپنے زخموں پر صبر کی چادر ڈال لیتا ہے مگر رات کے سناٹے میں دل کے بوجھ زیادہ محسوس ہونے لگتے ہیں۔ کتنی ہی بیوائیں ایسی ہوتی ہیں جو دن بھر بچوں کے سامنے حوصلے کی تصویر بنی رہتی ہیں مگر رات کے اندھیرے میں خموشیوں کی چادر میں لپٹی ہوئی اپنی بے بسی پر آنسو بہاتی ہیں۔ کتنے ہی یتیم ایسے ہوتے ہیں جو دن بھر کھیل کود میں اپنی محرومی بھلا دیتے ہیں مگر رات کو بھوک اور تنہائی ان کی آنکھوں سے نیند چھین لیتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ بعض چولہے ایسے بھی ہوتے ہیں جن میں آگ تو جلتی ہے مگر ہانڈی خالی رہتی ہے، بعض گھروں میں چراغ تو روشن ہوتے ہیں مگر امید کے دیے بجھنے لگتے ہیں اور بعض دل ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی حاجت کسی انسان کے سامنے نہیں بلکہ خاموشی سے اپنے رب کے حضور پیش کرتے رہتے ہیں۔

اسی لیے اس کی نگاہیں صرف راستوں کو نہیں ٹٹولتیں تھیں بلکہ دلوں کے احوال بھی تلاش کرتی تھیں۔ وہ صرف گلیوں کا نگہبان نہیں تھا بلکہ آہوں کا امین اور محروموں کے دکھ کا شریک بھی تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں اس کی بستی میں کوئی بھوکا سو نہ جائے، کہیں کسی مجبور کی فریاد اس تک پہنچنے سے پہلے آسمان تک نہ پہنچ جائے اور کہیں کوئی ایسا آنسو نہ بہہ جائے جس کے بارے میں کل اسے اپنے رب کے حضور جواب دینا پڑے۔ اسی احساسِ ذمہ داری کے ساتھ وہ تاریکی کے اس سمندر میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک دور ویرانے میں ایک مدھم سی روشنی اس کی نگاہوں سے ٹکرائی...

اسی دوران دور کہیں ایک آگ کی روشنی دکھائی دی۔ ویرانے کے سینے میں جلتی ہوئی وہ آگ گویا کسی خموش فریاد کا اشارہ تھی۔ تاریکی کے بے کراں سمندر میں وہ ننھی سی روشنی ایسی محسوس ہو رہی تھی جیسے کسی بے بس دل کی امید ابھی مکمل طور پر بجھی نہ ہو۔ آس پاس ہر طرف اندھیرا تھا، خاموشی تھی، سکون تھا مگر اس ایک شعلے میں نہ جانے کتنی کہانیاں پوشیدہ تھیں، کتنے دکھ سمٹے ہوئے تھے اور کتنی ناگفتہ حاجتیں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ اس نے چند لمحوں کے لیے اپنے قدم روک لیے۔ نگاہیں اسی سمت جم گئیں۔ شاید یہ کسی مسافر کا پڑاؤ ہو، شاید کسی قافلے نے رات گذارنے کے لیے وہاں ڈیرہ ڈالا ہو، یا شاید اس آگ کے پیچھے کوئی ایسی داستانِ الم چھپی ہو جس کی خبر ابھی تک کسی کو نہ ہو سکی ہو۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ وہ شعلہ کبھی بلند ہوتا، کبھی مدھم پڑ جاتا، جیسے کوئی بے زبان انسان دور بیٹھا مدد کے لیے ہاتھ ہلا رہا ہو۔ رات کی تاریکی میں وہ آگ محض آگ نہ تھی بلکہ ایک سوال تھی، ایک پکار تھی، ایک دعوتِ جستجو تھی جو حساس دلوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک انجانی سی تشویش پیدا ہوئی۔ بعض اوقات تجربہ کار نگاہیں روشنیوں کے پیچھے چھپے اندھیروں کو بھی پہچان لیتی ہیں۔ اسے محسوس ہوا کہ اس ویرانے میں جلنے والی یہ آگ محض سردی دور کرنے کے لیے نہیں، اس کے پس منظر میں کوئی اور کہانی بھی ہے۔

چنانچہ اس نے اپنے خادم کی طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں کہا:

''آؤ، اس روشنی کے قریب چلتے ہیں۔ معلوم نہیں اس آگ کے پاس کون ہماری راہ دیکھ رہا ہو چلو دیکھتے ہیں وہاں کون ہے۔ شاید کسی کو ہماری ضرورت ہو۔''

پھر دونوں خاموشی سے اس سمت بڑھنے لگے، بے خبر کہ چند ہی لمحوں بعد ان کے سامنے ایسا منظر آنے والا ہے جو انسانیت، رحم دلی اور احساسِ ذمہ داری کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جائے گا۔ جوں جوں وہ قریب پہنچتے گئے، ایک دردناک منظر ان کے سامنے کھلتا

گیا۔ ویرانے کے اس گوشے میں ایک عورت چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔ آگ جل رہی تھی، ایک دیگچی چولہے پر رکھی ہوئی تھی اور اس کے گرد چند ننھے بچے بھوک سے بے حال ہو کر رو رہے تھے۔ وہ کوئی معمولی رونا نہ تھا، بھوک کی وہ صدا تھی جو راست دل پر اثر کرتی ہے۔ ان معصوم صفات چہروں پر کم سنی کی شادابی کی بجائے محرومی کے آثار نمایاں تھے۔ ان کی آنکھیں اشک بار تھیں، ہونٹ خشک تھے اور کمزور ہاتھ بار بار دیگچی کی طرف اٹھ جاتے تھے، گویا وہ اس انتظار میں تھے کہ اب کھانا تیار ہوگا، اب ان کی بھوک ختم ہوگی، اب انہیں سکون ملے گا۔

مگر انتظار طویل ہوتا جا رہا تھا۔ بچے کبھی ماں کے دامن سے لپٹ جاتے، کبھی روتے روتے زمین پر لوٹنے لگتے اور کبھی حسرت بھری نگاہوں سے چولہے پر رکھی ہانڈی کو دیکھنے لگتے۔ ان کی سسکیاں سرد رات کی خاموش فضا میں اس طرح گونج رہی تھیں کہ گویا ہر آہ آسمان کے دروازوں پر دستک دے رہی ہو۔

ادھر ماں بیٹھی تھی۔ بے بسی کی ایک مجسم تصویر۔ اس کے چہرے پر غربت کی تھکن تھی، آنکھوں میں بے خوابی کے سائے تھے اور دل میں اولاد کی بھوک کا وہ کرب تھا جسے الفاظ پوری طرح بیان نہیں کر سکتے۔ وہ بار بار بچوں کو تسلی دیتی، کبھی انہیں بہلاتی، کبھی صبر کا دلاسہ دیتی اور کبھی چولہے کی طرف اشارہ کر کے امید دلاتی کہ بس تھوڑی دیر اور لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کے پاس کھلانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ چولہے میں جلتی ہوئی آگ صرف لکڑیوں کو نہیں جلا رہی تھی بلکہ ایک مجبور ماں کے دل کو بھی جلا رہی تھی۔ ہانڈی میں کوئی کھانا نہ تھا مگر امید کا ایک دھوکا ضرور تھا جس کے سہارے وہ اپنے بھوک سے بلکتے بچوں کو سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

یہ منظر اتنا دردناک تھا کہ رات کا سناٹا بھی گویا سوگوار دکھائی دیتا تھا۔ ہوا کے جھونکے جب اس آگ کے شعلوں کو ہلاتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے خود فضا بھی اس غربت اور بے کسی پر نوحہ کناں ہو۔

وہ شخص چند لمحے خاموش کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا۔

اس کی نگاہیں بچوں کے آنسوؤں پر تھیں مگر ان آنسوؤں کا بوجھ اس کے دل پر اتر رہا تھا۔ اس نے بھوک دیکھی تھی، فقر دیکھا تھا، محتاجی دیکھی تھی لیکن ایک ماں کو اپنے بچوں کی بھوک کے سامنے اس قدر بے بس دیکھنا ایسا منظر تھا جو پتھر دل انسان کو بھی پگھلا سکتا تھا۔

بچوں کی سسکیاں رات کی خاموشی کو چیر رہی تھیں۔

وہ شخص قریب گیا اور سلام کیا۔ عورت نے جواب دیا۔

اس نے پوچھا: ''بچوں کو کیا ہوا ہے؟''

عورت نے مختصر جواب دیا: ''بھوک لگی ہے۔''

اس نے دیگچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: ''اور اس میں کیا پک رہا ہے؟'' عورت کی آنکھوں میں بے بسی تیر گئی۔

کہنے لگی: ''کچھ نہیں۔ اس میں صرف پانی ہے۔ میں نے اسے اس لیے چڑھایا ہے کہ بچے سمجھیں کھانا پک رہا ہے اور انتظار کرتے کرتے سو جائیں۔'' پھر دل کا سارا درد زبان پر آ گیا۔

کہنے لگی: ''اللہ ہمارے اور حاکمِ وقت کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ وہ ہمارے حال سے بے خبر ہے۔''

یہ الفاظ محض شکایت نہ تھے، ایک مجبور دل کی ٹوٹی ہوئی صدا تھے۔ ان میں بھوک سے بلکتے بچوں کی سسکیاں بھی شامل تھیں، ایک بے بس ماں کی آہیں بھی اور ان طویل راتوں کا درد بھی جنہیں اس نے فاقوں اور محرومیوں کے ساتھ گذارا تھا۔

یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرّ ا گئی۔ اس نے اپنے بچوں کی طرف دیکھا جو بھوک کی شدت سے تڑپ رہے تھے، پھر آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی، گویا زمین والوں سے مایوس ہو کر اپنی فریاد زمین و آسمان کے مالک کے حضور پیش کر رہی ہو۔

اس کے لہجے میں بغاوت نہ تھی، درد تھا، گستاخی نہ تھی، بے بسی تھی اور الزام سے زیادہ ایک زخمی دل کی پکار تھی۔

وہ کہہ رہی تھی کہ اگر رعایا بھوک سے تڑپ رہی ہو، اگر معصوم صفت بچے رات بھر رو رہے ہوں، اگر ایک ماں کے پاس اپنے جگر گوشوں کو کھلانے کے لیے ایک لقمہ بھی نہ ہو، تو پھر اس درد کی خبر آخر کس تک پہنچنی چاہیے؟

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

شاید یہ آنسو صرف اپنی غربت پر نہ تھے بلکہ اس احساس پر بھی تھے کہ اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں۔ چنانچہ اس نے اپنا مقدمہ کسی انسان کے سامنے نہیں بلکہ اُس ذات کے سپرد کر دیا جو مظلوم کی آہ کو رد نہیں کرتی اور جس کے دربار میں نہ کوئی پردہ ہے اور نہ کوئی دربان۔

فضا چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی۔ چولہے میں جلتی ہوئی لکڑیاں چیخ رہی تھیں، بچے سسک رہے تھے اور ایک بے سہارا ماں کے دل کا درد الفاظ بن کر رات کے سناٹے میں بکھر چکا تھا۔

مگر اسے کیا معلوم تھا کہ جس حاکمِ وقت کے خلاف وہ اپنا مقدمہ بارگاہِ الٰہی میں پیش کر رہی ہے، وہی حاکم چند قدم کے فاصلے پر کھڑا اس کی ایک ایک بات سن رہا ہے اور اس کے دل پر یہ الفاظ اس طرح اتر رہے ہیں جیسے تیر نشانے پر اترتے ہیں۔

یہ جملہ سن کر اس کا سر جھک گیا۔ اس نے نہ اپنی صفائی پیش کی، نہ عورت کی شکایت کا جواب دیا۔

صرف اتنا کہا: ''یہیں ٹھہرو، میں ابھی واپس آتا ہوں۔''

پھر وہ تیزی سے واپس لوٹا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بھاری بوری اپنی پشت پر اٹھائے واپس آ رہا تھا۔ اس کے خادم نے کئی مرتبہ عرض کیا: ''مجھے دے دیجیے، میں اٹھا لیتا ہوں۔''

بوری خاصی بھاری تھی۔ اس میں آٹا بھی تھا، گھی بھی اور دوسری ضروری اشیاء بھی۔ رات کی خاموشی میں ایک حکمران کا اسے اپنی پشت پر لادے ہوئے چلنا خادم کے لیے ناقابلِ برداشت محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ادب و محبت سے آگے بڑھتا اور عرض کرتا: ''حضور! یہ خدمت مجھ پر چھوڑ دیجیے، میں اس کا زیادہ حق دار ہوں۔''

مگر وہ ہر بار انکار کر دیتا۔ خادم پھر اصرار کرتا، اس کے دل میں عقیدت بھی تھی اور اپنے آقا کی راحت کا خیال بھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ بوجھ ان کے کندھوں پر رہے، اس لیے بار بار عرض گذار ہوتا رہا لیکن ہر مرتبہ جواب میں وہی خاموش عزم، وہی استقامت اور وہی جواب ملتا۔ آخر جب اس نے دوبارہ بوری اٹھانے کی درخواست کی تو اس شخص نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔

یہ ایک معمولی نگاہ نہ تھی، اس نگاہ کے پس منظر میں احساسِ ذمہ داری کی پوری دنیا آباد تھی۔ پھر اس نے وہ تاریخی جملہ کہا جس نے صدیوں کے فاصلے مٹا دیے اور حکمرانی کے مفہوم کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا: ''کیا قیامت کے دن بھی تم میرا بوجھ اٹھاؤ گے؟''

یہ سن کر خادم پر جیسے سکوت طاری ہوگیا۔ اسے محسوس ہوا کہ یہ صرف آٹے کی بوری کا بوجھ نہیں بلکہ ایک بھوکی ماں کی فریاد کا بوجھ ہے، یہ چند ضرورت مند بچوں کی بھوک کا بوجھ ہے، یہ منصبِ خلافت کی امانت کا بوجھ ہے اور یہ وہ ذمہ داری ہے جس کا حساب کسی انسان کے سامنے نہیں بلکہ ربِّ کائنات کے حضور دینا ہے۔ اس جملے نے رات کی خاموشی میں ایک عجیب ہیبت پیدا کر دی۔ گویا بولنے والا اپنی نگاہوں کے سامنے قیامت کا وہ میدان دیکھ رہا تھا جہاں نہ لشکر کام آئیں گے، نہ محافظ، نہ عہدے اور نہ اختیارات، جہاں ہر شخص اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ کھڑا ہوگا اور ہر امانت کا حساب دینا ہوگا۔ اس کے دل میں یہ احساس موجزن تھا کہ اگر آج ایک بھوکا بچہ سو گیا، اگر آج ایک بے سہارا عورت کی آہ آسمان تک پہنچ گئی، تو کل اس کا جواب بھی اسی کو دینا ہوگا۔ اس جواب دہی میں نہ کوئی وزیر شریک ہوگا، نہ کوئی خادم، نہ کوئی سپہ سالار اور نہ کوئی مشیر۔ چنانچہ اس نے بوری کو اور مضبوطی سے اپنی پشت پر سنبھالا اور آگے بڑھ گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ آٹے کی بوری نہیں اٹھائے ہوئے بلکہ اپنی رعایا کے حقوق کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہو اور اس کے قدم زمین پر نہیں بلکہ احساسِ ذمہ داری کی ایک ایسی شاہراہ پر چل رہے ہوں جس کی منزل رضائے الٰہی تھی۔ جب وہ اس مقام پہ واپس پہنچا تو فوراً کھانا تیار کرنے میں لگ گیا۔ سامان نکالا، ہانڈی میں ڈالا، آگ جلائی، چولہے میں پھونکیں ماریں اور کھانا پکانے لگا۔ دھواں بار بار اس کے چہرے اور داڑھی سے گذرتا رہا مگر وہ اپنے کام میں مشغول رہا۔ کبھی وہ ہانڈی کو ہلاتا، کبھی چولہے میں پھونک مارتا، کبھی آگ کو سنبھالتا اور کبھی کھانے کی حالت دیکھتا۔ چنگاریوں کی سرخی اس کے چہرے پر پڑتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے احساسِ ذمہ داری کی آگ اس کے دل میں اس سے کہیں زیادہ روشن ہو۔

دھواں آنکھوں میں جاتا، چہرے سے لپٹتا اور داڑھی کے

درمیان سے گذرتا ہوا فضا میں تحلیل ہو جاتا مگر اس کے ہاتھ نہ رکتے تھے اور نہ اس کی توجہ بٹتی تھی۔ اس وقت اس کے دل و دماغ پر صرف ایک ہی فکر غالب تھی کہ کسی طرح ان معصوم صفت بچوں کی بھوک مٹ جائے اور ان کے چہروں پر سکون لوٹ آئے۔ گویا اس کے سامنے نہ اقتدار تھا، نہ منصب، نہ عظمت اور نہ دنیا کی کوئی شان، اس کے سامنے صرف بھوک سے بلکتے ہوئے چند بچے تھے۔ اس لمحے نہ اسے اپنی حکومت کی وسعت یاد تھی، نہ فتوحات کی داستانیں، نہ رعایا کی کثرت اور نہ اپنی ہیبت وجلال کا احساس۔ اس کے سامنے اگر کچھ تھا تو ایک ماں کی بے بسی تھی، چند معصوم صفت ننھے ننھے بچوں کی آنکھوں کے آنسو تھے اور بھوک سے لرزتے ہوئے ننھے وجود تھے۔ وقت کا سب سے طاقتور حکمران اس وقت اپنے اقتدار کے تخت پر نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت کے مقام پر بیٹھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حکمرانی کا اصل حسن تخت و تاج میں نہیں بلکہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے میں ہے۔ سلطنتوں کی عظمت محلات کی بلندی سے نہیں ناپی جاتی بلکہ اس بات سے ناپی جاتی ہے کہ ان کے سائے میں رہنے والے کمزور اور محروم لوگ کس قدر محفوظ اور آسودہ ہیں۔ اس کے ہاتھ ہانڈی چلا رہے تھے لیکن اس کا دل بار بار ان بچوں کی طرف متوجہ ہو رہا تھا۔ ہر سسکی اسے بے چین کر رہی تھی اور ہر آنسو اس کے احساسِ جواب دہی کو مزید گہرا کر رہا تھا۔ وہ منظر اپنی جگہ ایک عجیب تفسیر پیش کر رہا تھا۔ ایک طرف فاقوں سے نڈھال بچے تھے اور دوسری طرف ایک ایسا انسان جو اپنی حیثیت، اپنے مرتبے اور اپنی شان بھلا کر ان کے لیے خادم بنا ہوا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انسانیت خود چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی ہے اور رحمت، شفقت اور احساسِ ذمہ داری اس کے ہاتھوں میں مجسم ہو گئے ہیں۔ اگر اس وقت کوئی اجنبی وہاں آ جاتا تو شاید وہ کبھی یہ گمان نہ کر سکتا کہ چولہے کے سامنے بیٹھا یہ شخص ایک عظیم سلطنت کا فرمانروا ہے۔ وہ تو اسے ایک درد مند باپ، ایک مشفق سرپرست یا کسی مجبور خاندان کا ہمدرد خیرخواہ ہی سمجھتا، کیونکہ اس لمحے اس کی اصل پہچان حکومت نہیں بلکہ خدمت تھی، اقتدار نہیں بلکہ ایثار تھا اور عظمت نہیں بلکہ عاجزی تھی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں قیادت اپنے بلند ترین معنیٰ اختیار کر لیتی ہے، جب حاکم رعایا سے اوپر کھڑا ہونے کی بجائے ان کے دکھوں میں شریک ہو جاتا ہے، اور جب اختیار خدمت کا روپ دھار لیتا ہے تو تاریخ ایسے ہی مناظر اپنے سینے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتی ہے۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو اس نے جلدی نہ کی۔ پہلے اسے ٹھنڈا کیا۔ پھر اپنے ہاتھوں سے بچوں کو کھلانے لگا۔

آہستہ آہستہ رونا بند ہو گیا۔ بچوں کے چہروں پر زندگی لوٹ آئی۔ بھوک کی جگہ اطمینان نے لے لی۔ عورت کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آ گئے۔ اس نے دعا دیتے ہوئے کہا: ''اللہ تمہیں جزائے خیر دے! تم تو حاکم وقت سے زیادہ اس منصب کے حق دار معلوم ہوتے ہو۔''

وہ شخص خاموشی سے مسکرا دیا۔ لیکن ابھی اس کا کام مکمل نہیں ہوا تھا۔ وہ کچھ فاصلے پر جا کر بیٹھ گیا اور بچوں کو ہنسانے کے لیے عجیب آوازیں نکالنے لگا۔ بچے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اب ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے، ہنسی تھی۔ ان کے چہروں پر محرومی نہیں، خوشی تھی۔ وہ کھیلنے لگے، ہنسنے لگے اور پھر خوشی خوشی سو گئے۔ اس وقت اس کے خادم نے حیرت سے پوچھا: ''آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟''

تب اس شخص نے وہ جملہ کہا جو تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا: ''میں نے انہیں بھوک سے روتا دیکھا تھا۔ میں اس وقت تک واپس نہیں جانا چاہتا تھا جب تک انہیں ہنستا نہ دیکھ لیتا۔''

یہ کہہ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان اتر آیا۔ اب اس راز سے پردہ اٹھانے کا وقت آ چکا تھا۔ وہ کوئی عام آدمی نہ تھا۔ وہ کوئی درویش، مسافر یا نیک دل اجنبی نہیں تھا۔ وہ اس وقت کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کا فرمانروا تھا۔ وہ لاکھوں انسانوں کا حکمران تھا۔

وہ امیر المؤمنین، خلیفۂ ثانی، مرادِ رسول ﷺ، عدل و انصاف کا آفتاب، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔

یہی وہ عمر بن خطاب تھے جن کے نام سے قیصر و کسریٰ کے ایوان لرزتے تھے، مگر ایک بھوکے بچے کے آنسو انہیں بے چین کر دیتے تھے۔

جن کی ہیبت سے بڑی بڑی سلطنتوں کے تاج لرز جاتے تھے، مگر ایک بے سہارا ماں کی آہ ان کے دل کو مضطرب کر دیتی تھی۔ میدانِ سیاست میں جن کا عزم پہاڑوں کی مانند مضبوط تھا، عدل کے معاملے میں جن کی آواز تلوار کی دھار سے زیادہ فیصلہ کن تھی، وہی شخص معصوم صفت بچوں کی سسکیاں سن کر رات کی نیند اپنے او پر حرام کر لیتا تھا۔

وہ جانتے تھے کہ فتوحات سے سلطنتیں تو وسیع ہو جاتی ہیں مگر حکمرانوں کی اصل عظمت رعایا کے دلوں میں جگہ بنانے سے قائم ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کی نگاہیں صرف سرحدوں کی حفاظت پر نہیں بلکہ بھوکے پیٹوں، اشک بار آنکھوں اور شکستہ دلوں پر بھی لگی رہتی تھیں۔

ان کے لیے ایک بچے کی بھوک محض ایک گھریلو مسئلہ نہ تھی بلکہ خلافت کی امانت سے وابستہ ایک سوال تھی۔ ایک ماں کا آنسو صرف ایک عورت کا آنسو نہ تھا بلکہ پوری حکومت کے ضمیر کو جھنجھوڑ دینے والی صدا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اقتدار کا حقیقی امتحان فتوحات کے میدان میں نہیں بلکہ محروموں کی دہلیز پر ہوتا ہے۔

اسی لیے جب انہوں نے ان بچوں کو بھوک سے روتے دیکھا تو ان کے دل نے انہیں چین سے بیٹھنے نہ دیا اور جب انہیں ہنستا ہوا دیکھا تو گویا ان کی اپنی روح کو سکون نصیب ہوا۔

یہی وہ عمر تھے جن کے عدل کی مثالیں دنیا دیتی ہے، مگر ان کی شفقت اور احساسِ ذمہ داری کا یہ عالم تھا کہ رعایا کا ایک ادنیٰ فرد بھی ان کی نگاہ سے اوجھل ہو جاتا تو وہ خود کو جواب دہ سمجھتے تھے۔ انہیں اپنی سلطنت کی وسعت پر فخر نہ تھا بلکہ اس بات کا خوف تھا کہ کہیں ان کی حدودِ حکومت میں کوئی بھوکا، مجبور یا بے سہارا انسان ان کی توجہ سے محروم نہ رہ جائے۔

اسی لیے تاریخ جب عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تذکرہ کرتی ہے تو صرف ایک فاتح، مدبر اور عادل حکمران کا نہیں بلکہ ایسے دلِ درد مند انسان کا تذکرہ کرتی ہے جس کے نزدیک رعایا کی راحت ہی حکومت کی اصل کامیابی تھی اور جس کے لیے ایک بھوکے بچے کی مسکراہٹ دنیا کی بڑی سے بڑی فتح سے زیادہ قیمتی تھی۔

یہی وہ عمر تھے جن کے فیصلے تاریخِ عدل کا سرمایہ ہیں، مگر جو ایک غریب عورت کے لیے اپنے کندھوں پر آٹے کی بوری اٹھانے میں اپنی عزت و وقار کی کوئی کمی محسوس نہیں کرتے تھے۔

دنیا کی تاریخ میں حکمران بہت گذرے، تاجدار بھی بہت آئے، فاتحین کی کمی نہیں رہی مگر رعایا کے غم کو اپنا غم اور بھوکے بچوں کے آنسوؤں کو اپنی جواب دہی سمجھنے والا ایسا حساس اور بیدار ضمیر حکمران شاید ہی کسی اور قوم یا تہذیب کو نصیب ہوا ہو۔

تاریخ کے اوراق عظیم الشان محلات، بلند و بالا ایوانوں، وسیع سلطنتوں اور بے شمار فتوحات کے تذکروں سے بھرے پڑے ہیں۔ ایسے فرمانروا بھی گذرے ہیں جن کے دربار سونے اور چاندی سے جگمگاتے تھے، جن کے اشارے پر لاکھوں سپاہی حرکت میں آجاتے تھے اور جن کی ہیبت سے دور دور کے ممالک کانپ اٹھتے تھے۔ مگر تاریخ کے ان طویل سلسلوں میں ایسے مناظر بہت کم دکھائی دیتے ہیں جہاں ایک حکمران اپنی رعایا کے دکھ کو اپنے دل کا دکھ سمجھ کر رات کی تاریکی میں ان کے دروازے تک پہنچ جائے۔

بہت سے تاجداروں نے رعایا پر حکومت کی مگر عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رعایا کے دلوں پر حکومت کی۔ بہتوں نے اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے لشکر تیار کیے مگر انہوں نے اپنی رعایا کی عزت، آسودگی اور حقوق کی حفاظت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ بہتوں نے اپنی عظمت کا اظہار اپنے محلات سے کیا مگر انہوں نے اپنی عظمت کا ثبوت ایک غریب عورت کے چولہے کے پاس بیٹھ کر دیا۔

یہی وجہ ہے کہ یہ واقعہ محض ایک تاریخی حکایت نہیں، بلکہ اسلامی تصورِ حکومت کا ایک زندہ اور روشن منشور ہے۔

یہاں ایک فرمانروا اپنی رعایا سے خدمت نہیں لے رہا بلکہ ان کی خدمت کر رہا ہے۔ یہاں اقتدار حکم دینے کے لیے نہیں بلکہ دکھ بانٹنے کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ یہاں خلافت تخت و تاج کا نام نہیں بلکہ امانت، جواب دہی اور ایثار کا دوسرا عنوان بن کر سامنے آتی ہے۔

اگر دنیا کی حکومتیں اپنے جاہ و جلال سے پہچانی جاتی ہیں تو عمر

فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت اپنے عدل، رحم، شفقت اور احساسِ ذمہ داری سے پہچانی جاتی ہے۔ اگر بہت سے حکمران اپنی فتوحات کی وجہ سے زندہ رہتے ہیں تو فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے کردار کی وجہ سے دلوں میں زندہ ہیں۔ اسی لیے صدیوں گذر جانے کے باوجود جب بھی حکمرانی کے اعلیٰ ترین اصولوں کا ذکر آتا ہے، جب بھی عدل و انصاف کی بات ہوتی ہے، جب بھی رعایا نوازی اور خدمتِ خلق کی مثال تلاش کی جاتی ہے، تو تاریخ احترام کے ساتھ اسی رات کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے، وہی رات جس میں ایک عظیم سلطنت کا فرمانروا اپنی پشت پر آٹے کی بوری اٹھائے ایک بھوکے خاندان کی طرف جا رہا تھا۔ یہ منظر صرف حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عظمت کا آئینہ نہیں بلکہ اسلام کی حقانیت، اس کی اخلاقی برتری اور اس کے نظامِ حکومت کی روح کا بھی روشن ترین مظہر ہے۔ اس واقعے نے ثابت کر دیا کہ اسلام میں حکمران رعایا کا مالک نہیں بلکہ خادم ہوتا ہے اور اقتدار ایک اعزاز نہیں بلکہ ایسی امانت ہے جس کے بارے میں ایک دن ربِّ کائنات کے حضور جواب دینا ہوگا۔

شاید اسی لیے آج بھی جب انسانیت مثالی قیادت کا کوئی نمونہ تلاش کرتی ہے تو تاریخ کے افق پر ایک ہی شخصیت پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں نظر آتی ہے وہ شخصیت جس کے ہاتھ میں حکومت تھی مگر دل میں خوفِ خدا، جس کے قدموں میں سلطنت تھی مگر نگاہوں میں آخرت، اور جس کے سامنے دنیا کی عظمتیں ہیچ تھیں مگر ایک بھوکے بچے کے آنسو بے حد قیمتی۔

یوں مدینہ منورہ کی وہ سرد رات اپنے دامن میں ایک ایسا منظر سمیٹ کر تاریخ کے سپرد کر گئی جس کی روشنی صدیوں بعد بھی مدھم نہیں ہوئی۔ رات گذر گئی، آگ بجھ گئی، ہانڈی خالی ہوگئی، بچے سو گئے اور ویرانے پر پھر خاموشی چھا گئی مگر اس رات کا ایک ایک لمحہ تاریخ کے حافظے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگیا۔ اس لیے کہ اس رات ایک بھوکے بچے کی مسکراہٹ نے حکمرانی کے معنیٰ و مفہوم بدل کر رکھ دیے تھے، ایک غریب ماں کی آہ نے خلافت کی ذمہ داری کا مفہوم واضح کر دیا تھا اور ایک مردِ خدا نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اقتدار کی حقیقی عظمت تخت و تاج میں نہیں بلکہ خدمت، رحم اور جواب دہی میں ہے۔ یہ محض ایک تاریخی واقعہ نہیں، اسلامی تہذیب کے ضمیر کی ایک زندہ تصویر ہے۔ یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ اسلام نے حکمران کو رعایا کا مالک نہیں بلکہ نگہبان بنایا ہے ایسا نگہبان جس کی راتوں کا سکون بھی اپنی رعایا کے سکون سے وابستہ ہو اور جس کی خوشی بھی ان کے چہروں کی خوشی میں پوشیدہ ہو۔ آج جب تاریخ کے اوراق پلٹے جاتے ہیں تو بے شمار تاجداروں کے نام دھندلا چکے ہیں، بے شمار سلطنتوں کے آثار مٹ چکے ہیں اور بے شمار فتوحات صرف کتابوں کی سطروں میں باقی رہ گئی ہیں مگر مدینہ منورہ کی اس خموش رات میں ایک غریب عورت کے چولہے کے پاس بیٹھنے والا وہ دردمند حکمران آج بھی دلوں میں زندہ ہے۔ اس لیے کہ سلطنتیں طاقت سے قائم ہوتی ہیں لیکن عظمت کردار سے جنم لیتی ہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کردار تاریخِ انسانیت کے افق پر ایک ایسے روشن چراغ کی مانند ہے جس کی روشنی رہتی دنیا تک عدل، خدمت، ایثار اور خوفِ خدا کا راستہ دکھاتی رہے گی۔ اور شاید اسی لیے جب بھی دنیا مثالی قیادت، بے لوث خدمت اور حقیقی انسانی ہمدردی کی کوئی مثال تلاش کرتی ہے تو مدینہ منورہ کی اسی رات سے ایک آواز ابھرتی ہے، ایک اندھیری رات کا وہ مسافر آج بھی انسانیت کو یہ سبق دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ رعایا کے آنسو پونچھنا ہی حکمرانی کا سب سے بڑا اعزاز ہے اور بھوکے بچوں کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دینا ہی اقتدار کی سب سے بڑی کامیابی۔

حقیقت یہ ہے کہ مدینہ منورہ کی اس ایک رات نے قیادت، خدمت اور جواب دہی کے وہ اصول واضح کر دیے جو ہزاروں خطبوں اور سیکڑوں کتابوں سے بھی پوری طرح واضح نہیں ہو سکتے۔

اسلام نے اقتدار کو خدمت کا نام دیا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی زندگی سے اس کی ایسی تفسیر پیش کی کہ صدیوں بعد بھی انسانیت اس کے سامنے جبینِ عقیدت جھکاتی ہے۔

□□□□

مولانا محمد رحمت اللہ صدیقی

حضور مفتیٔ اعظم ہند اور اصلاحِ معاشرہ

حضور مفتیٔ اعظم ہند شاہ محمد مصطفیٰ رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی ذات ایک ایسی کتاب ہے جسے بار بار پڑھنے کے بعد بھی ایک قاری تشنگی محسوس کرتا ہے۔ وہ تاحیات خواص میں قبلۂ عقیدت بنے رہے۔ ان کی ہر ادا ادائے مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کے نور میں ڈھلی ہوئی تھی۔ شریعت کی کامل وفاداری کی چادر میں تاحیات ان کا وجود ڈھکا رہا، بلکہ وصال کے بعد بھی جب انہیں غسل دیا جا رہا تھا تو اس وقت بھی وہ اصولِ شریعت کے التزام و اہتمام سے غافل نہ ہوئے۔ چادر سترِ عورت سے ہٹنا چاہتی تھی کہ دفعتاً آپ نے چادر کو اپنی انگشتِ مبارک سے پکڑ لیا۔ جو لوگ غسل دینے میں شریک تھے ان میں سے اکثر نے یہ سب منظر اپنے سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ وہ جس طرح اپنی حیاتِ ظاہری میں خلقِ خدا کے قلوب میں مقیم تھے اسی طرح بعدِ وصال بھی وہ قلوب کی زینت بنے ہوئے ہیں، اور ان شاء اللہ تا قیامت یونہی وہ قلوبِ انسانی میں روشنی کا مینار بنے رہیں گے۔

حضور مفتیٔ اعظم ہند شاہ محمد مصطفیٰ رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی ذات منزل بھی تھی اور نشانِ منزل بھی تھی۔ لوگ عموماً کسی سے اس کی ظاہری حیات ہی میں بیعت و ارادت کا رشتہ بناتے ہیں لیکن آپ کی ذات کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ آج بھی لوگ آپ سے بیعت و ارادت کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ایسے بہت سارے چہرے ہماری نگاہوں میں محفوظ ہیں۔ جب آپ کے وصال کے لمحات قریب تھے اور آپ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ سفر کا سلسلہ جاری رکھ سکیں۔ اس وقت ملک ہی نہیں بلکہ بیرونِ ملک بھی بہت سارے افراد ایسے تھے جو اپنے دلوں میں آپ کے غلاموں کی صف میں شامل ہونے کی حسرت لیے بیٹھے تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے آپ نے اپنا ایک جذباتی پیغام جاری فرمایا تھا کہ جو لوگ ہم سے مرید ہونے کی خواہش رکھتے ہیں، ہم نے انہیں اپنے مریدوں میں شامل کر لیا ہے۔ آج آپ کے مریدوں میں خود کو شامل کرنے والے افراد آپ کے اسی فرمان کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے والے افراد یہ کہتے ہیں کہ باشرع پیر کی تلاش کرتے کرتے آنکھیں تھک گئی ہیں لیکن کوئی حضور مفتیٔ اعظم ہند جیسا باشرع ہمیں نظر نہیں آیا، اس لیے ہم نے انہی کو اپنا مرشد مان لیا ہے۔ یہ حضور مفتیٔ اعظم ہند شاہ محمد مصطفیٰ رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی مقبولیت اور ان کی خدا دوستی کی روشن دلیل ہے۔ اس حوالے سے شریعت کا حکم بہر حال محفوظ ہے۔

حضور مفتیٔ اعظم ہند شاہ محمد مصطفیٰ رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی علمیت، قابلیت، شہرت اور مقبولیت کے وثیقے ان کی ولادت کے وقت ہی ان کے پیر روشن ضمیر نور العارفین حضور سیّد شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہٗ نے تیار کر دیے تھے، اور ان خصوصیات کا اعلان و اظہار بھی انہوں نے اپنی زبانِ حق نشان سے کر دیا تھا۔ نور العارفین زاہد خشک نہیں تھے۔ ان کی عظمت و رفعت کو عرش کی بلندی بھی رشک بھری نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ ان کا اسمِ گرامی خاندانِ برکات کے آخری قطب میں آتا ہے۔ اعلیٰ حضرت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے اساتذہ کی صف میں بھی آپ شامل ہیں۔ یہ دونوں شخصیات ایک دوسرے کو کتنا چاہتی تھیں، اسے لفظوں میں بیان کرنا ذرا مشکل ہے۔ ان دونوں شخصیات کی آپسی محبت اور ایک دوسرے پہ کامل اعتماد تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ حضور مفتیٔ اعظم ہند کی

کتابِ حیات کے ہر ورق پہ حضور نور العارفین کی دعاؤں کو محسوس پیکر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حضور مفتیٔ اعظم ہند کی جس روز ولادت ہوئی اسی روز آپ کو مرید بھی کر لیا تھا۔ اور آپ کی کچھ امانتیں اعلیٰ حضرت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے سپرد کر دی گئی تھیں۔ حضور نور العارفین نے اعلیٰ حضرت سے مزید فرمایا کہ اس بچے کو مجھے دیکھنے کی خواہش ہے۔ جب بریلی میری حاضری ہوگی تو اس کی بقیہ امانتیں اس کے حوالے کر دوں گا۔ حضور نور العارفین کے فرمان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ امانتیں بہت پہلے سے حضور مفتیٔ اعظم ہند کے نام محفوظ تھیں۔ یہ بھی ایک سربستہ راز ہے کہ آخر وہ امانتیں کیا تھیں جو اعلیٰ حضرت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کو نہیں دی جا سکتی تھیں؟ جو امانتیں اعلیٰ حضرت کے سپرد ہوئیں، یہ بھی سپرد کر دی جاتیں۔ خاص حضور مفتیٔ اعظم ہند کی دید و شنید کے لیے حضور نور العارفین نے بریلی شریف کا سفر فرمایا۔ حضور مفتیٔ اعظم ہند کے حوالے سے حضرت نور العارفین کے اضطراب کو سمجھنے کی اب تک کوشش نہیں ہوئی ہے۔ اپنی تمام خانقاہی روایات کو ایک نومولود کے لیے نظر انداز کر دینا یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ عمل ایک روایتی شیخ کا نہیں ہے بلکہ اس پیر روشن ضمیر اور شیخ کامل کا ہے، جس کے حضور بڑی بڑی گردنیں ہر وقت خم رہا کرتی تھیں۔ جس کے ناز و نیاز اٹھانے کے لیے شاہانِ زمانہ قطار در قطار کھڑے رہا کرتے تھے۔ حضور نور العارفین کی عظمت شان و رفعت مکان کے اعتراف میں اعلیٰ حضرت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ رقمطراز ہیں۔

برتر قیاس سے مقام ابو الحسین
سدرہ سے پوچھو رفعت بام ابو الحسین
خطِ سیہ میں نورِ الٰہی کی تابشیں
کیا صبح نور بار ہے شام ابو الحسین
ساقی سنادے شیشۂ بغداد کی مہک
مہکی ہے بوئے گل سے مدام ابو الحسین
کرسی نشیں ہے نقش مراد ان کے فیض سے
مولائے نقش بند ہے نام ابو الحسین
میلہ لگا ہے شانِ مسیحا کی دید ہے
مُردے جلا رہا ہے خرام ابو الحسین
سرگشتہ مہر و مہ ہیں پر اب تک کھلا نہیں
کس چرخ پر ہے ماہِ تمام ابو الحسین
ذرہ کو مہر، قطرہ کو دریا کرے ابھی
گر جوش زن ہو بخششِ عام ابو الحسین
انعام لیں بہارِ جناں تہنیت لکھیں
پھولے پھلے تو نخلِ مرام ابو الحسین
یاں طالع رضا تری اللہ رے یاوری
اے بندۂ جدود کرامِ ابو الحسین
اللہ ہم بھی دیکھ لیں شہزادہ کی بہار
سونگھے گل مراد مشام ابو الحسین
قدرت خدا کی ہے کہ طلاطم کنا اٹھیں
بحرِ فنائے موج دوامِ ابو الحسین

ماہ سیما ہے احمد نوری
مہر جلوہ ہے احمد نوری
نہ کھلا کیا ہے احمد نوری
رازِ بستہ ہے احمد نوری
رشد و ارشاد کا ترے سر پر
آج طرہ ہے احمد نوری
میرا مرشد ہے مصحفِ ناطق
نوری آیہ ہے احمد نوری
شکل دیکھو تو نور کی تصویر
نوری پتلا ہے احمد نوری
طالبانِ حریمِ حق کے لیے
راست قبلہ ہے احمد نوری
بھولی صورت ہے نور کی مورت
پیارا پیارا ہے احمد نوری
نخلِ بغداد کی مہک میں بسا
بھینا بھینا ہے احمد نوری

اس کے ارشاد میں دلیل یقیں
شک مٹاتا ہے احمد نوری
اس کے لب ہیں کلیدِ کشفِ قلوب
فتح دولہا ہے احمد نوری
وہ حسینی رچی ہوئی رنگت
گل سے زیبا ہے احمد نوری
عبدِ واحد کے بحرِ وحدت میں
دُرِّ یکتا ہے احمد نوری
اتنا کہہ دے رضؔا ہمارا ہے
پار بیڑا ہے احمد نوری

حضور مفتیٔ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد مصطفیٰ رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی عمر شریف جب چھ ماہ کی ہوئی تو حضرت نور العارفین بریلی شریف رونق افروز ہوئے۔ حضور مفتیٔ اعظم ہندان کی آغوش میں رکھے گئے۔ ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ حضور مفتیٔ اعظم ہند حضرت نور العارفین کی گود میں اس طرح ہمک رہے تھے جیسے اس گود کی لطافت سے آپ خوب آشنا ہیں۔ حضرت نور العارفین کی گود صرف ایک گود نہیں تھی، اسرارِ الٰہی کے درجنوں سمندر اس میں پنہاں تھے۔ جو بچہ اس گود کے حصار میں آتا تھا وہ کائنات گیر ہو جاتا تھا۔ ان کی گود حضرت عثمان ہارونی قدس سرہٗ کی دو انگلیوں کے درمیان تحت الثریٰ سے لامکاں تک پھیلی ہوئی نور کی لہریں تھی۔ حضرت نور العارفین چاہتے تو سارے حجابات اٹھ جاتے لیکن حضور مفتیٔ اعظم ہند کی عمر اس منزل میں نہیں تھی مگر چہرے کا فراز بہت کچھ گواہی دے رہا تھا۔ حاضرین حضرت نور العارفین کے ہر بدلتے ہوئے انداز پہ گہری نظر جمائے ہوئے تھے، چونکہ جو ہو رہا تھا خانقاہِ برکاتیہ کی روایات کے خلاف ہو رہا تھا۔ داخلِ سلسلہ کرنے کے بعد مارہرہ شریف طلب نہ کر کے خود پیر کا مرید کے گھر پہنچ جانا یہ آسمان کا زمین پہ اتر آنا ہے۔ تاریخ میں ایسا بہت کم ہوا ہے۔ ہمارے علم کے مطابق خانقاہ برکاتیہ مارہرہ شریف میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی۔ خانقاہِ برکاتیہ کا اصولِ طریقت ہمیشہ دوسری خانقاہوں سے مختلف رہا ہے۔ یہاں بیعت و ارادت کو پیشے کی شکل میں کبھی دیکھا نہیں گیا، یہاں خلافت دینے کا اصول بھی بہت سخت ہے، یہاں دل و نگاہ کا تقدس دیکھا جاتا ہے، شریعت پر استقامت دیکھی جاتی ہے اور باطن کی طہارت پہ ہر وقت نگاہ رہتی ہے۔ بدلتے حالات میں بھی خانقاہِ برکاتیہ اپنی قدیم روایات کو زمانے کے گرد و غبار سے بچائے ہوئے ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ اور حضور مفتیٔ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد مصطفیٰ رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے لیے جداگانہ اصول تراشے گئے۔ سوالات بھی اٹھے اور سوالات کے جوابات بھی دیے گئے۔ بابِ طریقت میں دل کا تقدس دیکھا جاتا ہے، جہاں تقدس نہیں ہوتا وہاں ریاضت سے کام لیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ریاضت کا سلسلہ برسوں پہ پھیل جاتا ہے۔ اعلیٰ حضرت جس وقت مارہرہ شریف حاضر ہوئے تھے اس وقت آپ عمر کی اکیسویں بہار میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ عمر شباب کی ہوتی ہے، اس عمر میں آپ کے دل پر غبارِ وقت کا کوئی اثر نہیں تھا۔ ان کے مرشد گرامی حضور سیّد شاہ آلِ رسول احمدی میاں قادری برکاتی قدس سرہٗ نے فرمایا تھا کہ یہ صاف و شفاف دل لے کر آئے تھے، اس لیے انہیں ریاضت کی بھٹی سے گذرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی، لیکن حضور مفتیٔ اعظم ہند کو جس وقت داخلِ سلسلہ کیا گیا اس وقت ان کی عمر چوبیس گھنٹے کی بھی نہیں تھی، وہ شکمِ مادر سے صاف و شفاف دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اگر ان کو ریاضت کی ضرورت ہوتی تو انہیں اس عمر میں داخلِ سلسلہ نہیں کیا جاتا۔ حضور مفتیٔ اعظم ہند کے لیے اس وقت حضور نور العارفین کی زبان سے جو الفاظ ادا ہوئے تھے تاریخ انہیں آج بھی اپنے سینے میں سنبھال کر رکھے ہوئے ہے۔ حضرت نور العارفین نے فرمایا یہ بچہ پیدائشی ولی ہے، خلقِ کثیر اس سے ہدایت کی روشنی پائے گی، یہ بچہ انتہائی مبارک ہے، ہم اس نومولود کا نام آل الرحمٰن ابو البرکات محی الدین جیلانی رکھتے ہیں، ہمارے خیال سے یہ نام نہیں ہے بلکہ مدارج، مراتب اور مناصب کی تفصیلات ہیں۔ نام کا ہر لفظ اپنے اندر فضائل و کمالات کی کائنات رکھتا ہے۔ یہ نام کوئی اور رکھتا تو خوش گمانی پہ محمول کیا جاتا، لیکن یہ نام وہ ذات رکھ رہی ہے جو زمین پہ بیٹھ کر عرش کی قندیلوں کا مشاہدہ کرتی ہے۔ ماضی کیا ہے، حال کیا ہے اور مستقبل کیا ہے؟ ہر زمانے کو وہ آئینے کی طرح دیکھتی ہے۔ حضور مفتیٔ اعظم ہند پہ نور العارفین کی نوازشات، عنایات اور مکاشفات جہاں اپنا قابلِ رشک

ظاہر رکھتے ہیں، وہیں باطن کی دنیا اور بھی حیران کن ہے۔ جب ایک پڑھا لکھا قاری نام کے ہر ایک لفظ پہ سنجیدگی سے غور کرتا ہے تو اس کے پیشِ نگاہ عجائبات کی ایک الگ کائنات ہوتی ہے۔ نام میں جدت بھی ہے، حیرت بھی ہے اور تجسس بھی۔

نور العارفین حضرت سیّد شاہ ابو الحسین احمد نوری قادری برکاتی قدس سرہٗ روشن ضمیر ہی نہیں تھے بلکہ جس پہ نگاہ ڈال دیتے تھے وہ بھی روشن ضمیر ہو جاتا تھا۔ جب ان کی نگاہ کا یہ عالم تھا تو ان کی گود کا کیا عالم ہوگا۔ ان کے سر پہ قطبیت کا تاج تھا، وہ گردشِ زمانہ کو اپنی ہتھیلیوں میں دیکھتے تھے، پیشانیوں میں چھپی ہوئی لکیروں کو بھی وہ پڑھ لیتے تھے۔ نوازنا ان کی عادت تھی، ان کا سینہ علم وخبر کا مدینہ تھا۔ برسوں کی ریاضت کے بعد جو نعمتیں ملتی ہیں ان کی لمحوں کی حضوری میں اس سے سوا مل جاتا تھا۔ ان کی ذات ہر طرح کے رستے زخموں کے لیے مرہم تھی، جسم وروح دونوں کے وہ معالج تھے۔ ان کا بابِ کرم ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ان کے در سے کوئی سائل کبھی محروم واپس نہیں لوٹا۔ کسی کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر ان کا اضطراب بڑھ جاتا تھا۔ دلوں میں پلتے ہوئے شوق کو ان کی آنکھیں دیکھ لیتی تھیں، فقیری ان سے شعور لیتی تھی اور شاہی ان سے سلیقہ سیکھتی تھی۔ طالبانِ حریمِ شوق کے لیے ان کی ذات قبلہ بھی تھی اور قبلہ نما بھی۔ ان کے ارشادات وفرمودات سے صدق وصداقت کی شعاعیں پھوٹتی تھیں۔ ان کی ذات کلید کشفِ قلوب تھی۔ جب ان کا کرم جوش پہ آتا تو ذرے کو آفتاب اور قطرے کو دریا میں تبدیل کر دیتے تھے۔ ان کے میکدے میں صبح تا شام بغداد کے جام چھلکتے تھے، ان کے حضور ہر وقت قادری میکشوں کی قطار در قطار بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ان کے مقام و مرتبت کو سمجھنے کے لیے اہلِ حال وقال ہر وقت پریشان رہا کرتے تھے۔ پاکیزگیٔ نفس ان کی بلائیں لیتی تھی۔ وہ دنیا میں تھے لیکن ان میں دنیا نہیں تھی۔ نوری ان کے نام کا حصہ ہے، لیکن ان کا پورا وجود نوری تھا، اور خلوصِ دل سے جو ان سے وابستہ ہو جاتا وہ بھی نوری بن جاتا۔ ان کی ذات میں فطرت گنگناتی تھی۔ انہوں نے زمانے کے کسی دباؤ کو کبھی قبول نہیں کیا، بلکہ زمانے کا ہر باطل تصور ان کی دہلیز پہ آ کر دم توڑ دیتا تھا۔ انہیں مدینے اور بغداد سے ہدایات ملا کرتی تھیں اور انہیں ہدایات وارشادات کی روشنی میں ان کی سانسوں کا سفر طے ہوتا تھا۔ وہ فنافی اللہ، فنافی الرسول اور فنافی الغوث کی منزل پہ فائز تھے۔ قطرے کو دریا اور ذرے کو آفتاب بنا دینا ان کے لیے کوئی مشکل عمل نہیں تھا، بلکہ ان کی سرکار میں ایسے تماشے روز ہوا کرتے تھے۔ ان کی سرکار انسانی تعمیر وتہذیب کی موثر تجربہ گاہ تھی، انسانی تعمیر ہی سے عہد جنت نشان ہوتا ہے۔ آج درس گاہوں پہ غفلت طاری ہے اور خانقاہوں سے روایات کے احترام کا شعور رخصت ہو چکا ہے، یہی وجہ ہے کہ تاریکی دن بدن گہری ہوتی جا رہی ہے۔ انہوں نے درس گاہوں اور خانقاہوں کو اصولوں سے مربوط رکھا اور روایات کے چراغوں کو بجھنے نہیں دیا۔ انہیں کتابوں سے سکھانے اور نگاہوں سے پلانے کا ملکہ حاصل تھا۔ عشق وعرفان کی کوئی ایسی منزل نہیں تھی جو ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو۔ ان کے دربار میں مجذوب آتے اور سالک کا لبادہ اوڑھ کر واپس جاتے۔ ایک مجذوب کو راہِ سلوک پر لانے کے لیے اسی سال کا وقفہ درکار ہوتا ہے۔ شریعت وطریقت کے باب میں ان کی خدمات کے تسلسل کو لفظوں میں سمیٹنا بہت مشکل ہے۔ خانقاہِ برکاتیہ کی آغوش میں آپ جیسی درجنوں شخصیات محوِ خواب ہیں۔ یہ ایک ایسی صداقت ہے جس کا انکار کوئی بھی تاریخ کا طالب علم نہیں کر سکتا ہے۔

نور العارفین حضور سیّد شاہ ابو الحسین احمد نوری قادری برکاتی قدس سرہٗ بریلی شریف میں جلوہ افروز ہیں اور پورا شہر ان کے جلووں کی چاندنی میں نہا رہا ہے۔ کاشانۂ رضا پہ نور کی بارش ہو رہی ہے، پورا گھر جنت نشان بنا ہوا ہے۔ گھر آنگن پہلے ہی سے ایک مجددِ وقت کے قدموں کی برکتوں میں نہائے ہوئے تھے، آج ان کا سرور دو آتشہ ہو گیا ہے۔ حاضرین امیدوں کی تھالی لیے ہوئے صف بہ صف بیٹھے ہوئے ہیں۔ عارفِ عصر، قطب وقت اور حاملِ شریعت وطریقت کا دریائے کرم پورے اہتمام و وقار کے ساتھ لہریں مار رہا ہے۔ حضور مفتیٔ اعظم ہند نور العارفین کی گود میں ہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آسمان کی بلندی زمین کی آغوش میں سمٹ آئی ہے، نور العارفین اپنی انگشتِ شہادت حضور مفتیٔ اعظم ہند کے دہنِ مبارک میں ڈال دیتے ہیں، روحانی امانتیں ایک سینے سے دوسرے سینے میں منتقل ہو رہی

ہیں۔ ایسے مناظر زمین کی آنکھیں بہت کم دیکھتی ہیں۔ ایسے ہی مواقع پہ یہ صدا فضاؤں میں گونجتی ہے کہ خم ہوگئی پیشانئ فلک اس طعن زمیں سے۔ سن ہم پہ مدینے کی امانتیں ہیں یہ رتبہ ہے ہمارا۔ نور العارفین اور حضور مفتیٔ اعظم ہند دونوں شخصیات کی حیثیت ملّی امانت کی تھی۔ دونوں شخصیات نے اپنے اپنے وقت میں اپنی خدمات وتصرفات سے اپنے عہد کو خوب متأثر کیا۔ حضور نور العارفین نے اپنے عشق وعرفان کی گود میں رکھ کر حضور مفتیٔ اعظم ہند کو ہر جہت سے کندن بنا دیا تھا۔ زمانے کی کوئی تپش حضور مفتیٔ اعظم ہند کے حوصلوں پہ منفی اثر نہیں ڈال پاتی تھی۔ چونکہ ایک نوری سلسلہ مدینے سے مارہرہ تک آتا ہے، اسی نوری سلسلے کی کرن بریلی شریف تک آتی ہے۔ حضور مفتیٔ اعظم ہند تا حیات اسی نوری سلسلے کی آغوش میں رہے۔ نور العارفین نے حضور مفتیٔ اعظم ہند کو اپنی آغوشِ رحمت وکرامت میں لے کر سلوک کی تمام منزلوں کا عارف وعامل بنا دیا تھا۔ مارہرہ شریف ریاضتوں کا شہر ہے۔ حضور مفتیٔ اعظم ہند کو کسی نے کبھی ریاضت کی بھٹی میں اترتے ہوئے نہیں دیکھا۔ خانقاہیں اب ریاضتوں کے بوجھ برداشت نہیں کر پا رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب خانقاہوں کی کوکھ سے کوئی مفتیٔ اعظم ہند جنم نہیں لے رہا ہے۔ درس گاہیں تعمیر کرتی ہیں اور خانقاہیں تزئین کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ حضور مفتیٔ اعظم ہند کی تعمیر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی آغوشِ تربیت میں ہوئی تھی اور تزئین کی ذمہ داریاں خانقاہِ برکاتیہ مارہرہ شریف نے انجام دی تھیں۔ ایک طرف مرشدِ گرامی نور العارفین حضور سیّد شاہ ابوالحسین احمد نوری قادری برکاتی قدس سرہٗ، دوسری طرف والد ماجد چشم و چراغ خاندانِ برکات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ۔ یہ دونوں شخصیات شریعت وطریقت اور معرفت وحقیقت کی اس منزل پہ فائز تھیں جہاں کا تصور خواص کے لیے بھی مشکل ہی نہیں بہت مشکل تھا۔ یہ دونوں شخصیات اپنے عہد میں طاق تھیں۔ جو بچہ ایسی نابغۂ روزگار اور وحید عصر شخصیات کے زیر تربیت ونگاہ داشت میں ہوگا، اس کی عظمتوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ ان کی تربیت پہ خصوصی توجہ اس لیے دی گئی کہ انہیں ایک عہد کو سنبھالنا تھا۔ حضرت نور العارفین نے ان کی ولادت ہی کے دن ان کے مقام ومرتبت کو بھی واضح کر دیا تھا اور ان کی ذمہ داریوں کی بھی وضاحت کر دی تھی۔ حضور مفتیٔ اعظم ہند نے اپنے مرشد گرامی اور اپنے والد ماجد دونوں شخصیات کو اپنے لیے تا حیات نشانِ منزل و چراغِ رہگذر بنائے رکھا۔ تاریخ میں ایسا اطاعت شعار بیٹا اور ایسا فنا فی الشیخ مرید بہت کم دیکھا گیا ہے۔ ہر عہد اپنی مرکزی شخصیات ہی سے متعارف ہوتا ہے۔ حضور مفتیٔ اعظم ہند اپنے عہد کی علامت بھی تھے اور حفاظت بھی تھے۔ ان کا عہد خیر القرون کا ایک جیتا جاگتا عکسِ جمیل تھا۔ ان کی ذات مرکز علم بھی تھی اور کعبۂ عقیدت بھی۔ لوگوں کے قلوب ان کی مٹھی میں تھے۔ جب وہ اپنی مٹھی بند کرتے تھے تو پوری دنیا ان سے بے خبر ہو جاتی تھی اور وہ جب اپنی مٹھی کھولتے تھے تو ہجوم اکٹھا ہو جاتا تھا۔ ان کا بابِ کرم ہر شخص کے لیے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ قائد پہ کبھی غفلت طاری نہیں ہوتی اور اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار نہیں ہوتا۔ وہ جسمانی طور پہ بریلی شریف میں مقیم ہوتے تھے لیکن ان کی آنکھیں پوری دنیا کو دیکھتی تھیں۔ وہ کسی کی آنکھوں میں نمی دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بھیگی پلکوں کو دیکھ کر ان کا اضطراب بڑھ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ خلق خدا کی آنکھوں سے ان کی عقیدت کا خمار آج بھی چھلکتا ہے۔ وہ آج بھی انسانی قلوب کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ وہ سفر نذرانوں کے لیے نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے سفر کی ابتدا اور انتہا دونوں انسانی قلوب کی تزئین ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے نذرانے کے لفافے کو کبھی اپنی پسند کا حصہ نہیں بنایا۔ کوئی ضرورت مند سامنے آ گیا تو اسی لفافے سے اس کی خوشی میں شریک ہو گئے۔ وہ پوری دنیا کو سنّت و شریعت کے رنگ میں رنگ دینا چاہتے تھے۔ وہ انتہائی نرم طبیعت کے مالک تھے لیکن ضرورت پڑنے پر ان کا عزم فولادی ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے مقام ومرتبت کے اعتبار سے اپنے عہد پہ حاوی تھے لیکن شریعت ان پہ حاوی تھی۔ مزاجِ شریعت کے خلاف انہوں نے کبھی سانس لینے کی بھی جسارت نہیں کی۔ ان کی چادرِ حیات پہ ایسا کوئی دھبہ ان کا سخت مخالف بھی دکھانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ ان کا پورا وجود اپنے مرشد گرامی اور والد ماجد کا عکس ونقش تھا۔ ان کے عہد نے ان سے اچھا انسان نہیں دیکھا۔ ان کی شخصیت کو دیکھ کر لوگ پابند شریعت ہو جاتے تھے۔ ایک انسان کی ذات جن خصوصیات سے جامع ہوتی ہے، حضور مفتیٔ اعظم ہند کی ذات میں وہ ساری خصوصیات بدرجۂ کمال موجود تھیں۔ محافل ومجالس سے ان کی شخصیت معتبر نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کی شراکت سے محافل ومجالس معتبر ہو جاتی تھیں۔ وہ تا حیات ہجوم میں بھی تنہا نظر آئے۔ ان کی ذات تاریخ کا ایسا تقدس مآب چہرہ ہے جسے دنیا آسانی کے ساتھ فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے والد ماجد چشم و چراغ

خاندانِ برکات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کا خواب بھی تھے اور تعبیر بھی اور اپنے مرشد گرامی نور العارفین حضور سیّد شاہ ابو الحسین احمد نوری قادری برکاتی قدس سرہٗ کی مرضیات و نامرضیات کے پیکرِ جمیل بھی تھے۔ دیکھنے والوں نے اپنے طور پر جوان کی خیالی تصویر پیش کی ہے وہ حقیقت سے کتنی قریب ہے، ذیل کے شعر میں ملاحظہ کریں۔

ہم نشیں تم نے کبھی ان کو تو دیکھا ہوگا
چاندنی جیسا بدن چاند سا نکھرا ہوگا

ملک میں خانقاہوں کا جال بچھا ہوا ہے، ان خانقاہوں میں خانقاہِ برکاتیہ مارہرہ شریف کی جداگانہ شناخت ہے۔ خانقاہِ برکاتیہ کی خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے دنیا کی سمت کبھی نہیں دیکھا، اور ان لوگوں کی طرف بھی کبھی نہیں دیکھا، دنیا جن کی ترجیحات میں شامل رہی۔ خانقاہیں سیاست میں بھی دخیل رہتی ہیں۔ خانقاہیں ان سیاسی رہنماؤں کی پُرزور وکالت کرتی ہیں جن سے ان کا ذاتی مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ خانقاہوں میں سیاسی رہنماؤں کے سر پگڑی باندھنے کی بھی روایتیں ملتی ہیں لیکن خانقاہِ برکاتیہ نے اس طرح کی بدعات ومکروہات سے خود کو ہمیشہ بچائے رکھا ہے۔ خانقاہِ برکاتیہ دین و شریعت کے مفاد میں سیاست پہ یقین رکھتی ہے۔ یہ ایک تاریخی صداقت ہے۔ دین وشریعت کا کوئی بھی باشعور طالب علم اس صداقت سے انکار نہیں کرسکتا۔

مذہب کو سیاست سے جدا کردیجیے تو چنگیزی رہ جاتی ہے۔ مذہب کا فروغ ہمیشہ سیاست سے وابستہ رہا ہے۔ مذہب اور سیاست ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں، سیاست جہلا کا منصب نہیں، سیاست علما کا منصب ہے لیکن آج علما نے اس آگ میں کودنے سے انکار کردیا ہے۔ وہ جانتے ہیں اس میں پگڑی سلامت نہیں رہے گی۔ جو تھوڑی بہت وقعت بچی ہوئی ہے وہ بھی چلی جائے گی۔ علما کا سیاست کے میدان میں نہ اترنا قوم کے مفاد میں ہے۔ آج جو لوگ داڑھی ٹوپی میں سیاست کرتے دکھائی دیتے ہیں وہ سیاسی نہیں شعبدہ باز ہیں۔ یہ وقت آنے پر قوم کی زمین اور ضمیر دونوں کا سودا کرلیتے ہیں۔ علما پہ قوم کے تحفظ کی ذمہ داری ہے۔ ملک کے دستور میں جہاں دوسری قوموں کے حقوق متعین ہیں وہیں قوم مسلم کے بھی حقوق واضح ہیں۔ حقوق طلبی کے لیے قوم کو بیدار کرنا علما کے فرائض میں شامل ہے۔ ملک میں بڑے بڑے اجتماعات ہوتے ہیں، ان اجتماعات میں علما سے سیاسی موضوعات پہ زبان بندی کا عہد و پیمان لیا جاتا ہے۔ یہ ذہنیت ملک و ملّت کا گلا گھوٹنے کے مترادف ہے۔ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنا ہر عہد کا جبری تقاضا رہا ہے۔ چشم و چراغ خاندانِ برکات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ نے قوم وملّت کی جہاں دوسرے شعبۂ زندگی میں مثبت رہنمائی کی ہے وہیں سیاسی محاذوں پہ بھی انہوں نے قوم وملّت کو گہری کھائی سے نکالنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے ان کی کتب و رسائل میں روشن شہادتیں ملتی ہیں۔ خانقاہِ برکاتیہ ہمیشہ چشم و چراغ خاندانِ برکات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے متعین کردہ اصولوں کی پابند رہی ہے اور آج بھی تھوڑے فرق کے ساتھ اس کا یہی مزاج ہے۔ اعلیٰ حضرت کے افکار ونظریات سے غیر مشروط وفاداری خانقاہِ برکاتیہ کے منشور میں شامل ہے۔ اعلیٰ حضرت کی یہ بہت بڑی کرامت ہے کہ ان کو ان کا پیر خانہ اپنا اعتماد سمجھتا ہے۔ پہلے تو یہ اعتماد بہت سخت تھا، اعلیٰ حضرت کا جو مخالف ہوتا اسے مارہرہ شریف کی سرحد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک بہت بڑے خطیب کو کسی نے مارہرہ شریف میں بلالیا۔ اس وقت خطیب صاحب کا شمار اعلیٰ حضرت کے ناقدین میں ہوتا تھا تو خانقاہ کی جانب سے انہیں یہ پیغام دیا گیا کہ آپ کو خطاب کی اجازت ہے لیکن اعلیٰ حضرت کے خلاف آپ نے کچھ بھی کہا تو نتائج کے آپ خود ذمہ دار ہوں گے۔ حالانکہ پیغام بہت سخت تھا، ہم ان جملوں کو استعمال نہیں کر پا رہے ہیں۔ راقم الحروف سے اس واقعہ کا خود تذکرہ صاحبِ سجادہ خانقاہِ برکاتیہ حضرت والا مرتبت ڈاکٹر سیّد محمد امین میاں قادری برکاتی نے فرمایا تھا۔ اس مزاج میں بھی تھوڑی تبدیلی آئی ہے۔ اعلیٰ حضرت کل بھی چشم و چراغ خاندانِ برکات تھے، آج بھی چشم و چراغ خاندانِ برکات ہیں اور ان شاء اللہ کل بھی وہ چشم و چراغ خاندانِ برکات رہیں گے۔ بریلی شریف کی مرکزیت کی اساس اعلیٰ حضرت کی ذات ہے اور اعلیٰ حضرت چشم و چراغ خاندانِ برکات ہیں اور مرکز چشم و چراغ ہی سے بنتا ہے۔ بیرونی افراد سے کوئی شہر کبھی مرکز

نہیں ہوا ہے۔ مرکز کی یہی تاریخ رہی ہے۔ مرکز کے اس فلسفے کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مارہرہ شریف اور بریلی شریف کا آپسی ربط و تعلق پانی کا بلبلا نہیں ہے بلکہ فولادی دیوار ہے اور فولادی دیوار سے ٹکرانے کا نتیجہ عوام وخواص سب پہ روشن ہے۔

باپ بیٹے کی محبت وقتی نہیں ہوتی، بلکہ اس میں دوام ہوتا ہے۔ بیٹے سے خطائیں ہوتی ہیں لیکن بیٹے کی خطاؤں سے باپ کا جگر کہیں بڑا ہوتا ہے۔ بیٹا اگر باپ کی گود میں پیشاب کردے تو باپ بیٹے کو سزا نہیں دیتا بلکہ کپڑے بدل کر باپ بیٹے کو پھر گود میں سمیٹ لیتا ہے۔ آج کچھ لوگ مارہرہ شریف اور بریلی شریف کے درمیان فاصلے بڑھانے میں اپنا خونِ جگر جلا رہے ہیں۔ یہ خون سوزی مارہرہ شریف کی محبت میں نہیں ہو رہی ہے، اس خون سوزی کے پسِ پردہ ان کے اپنے مقاصد ہیں۔ ہزاروں آگ کے دریا سے گذرنے کے بعد بھی مقاصد تک ان کی رسائی نہیں ہو سکے گی۔

مارہرہ شریف اور بریلی شریف: نسبتوں کا وہ رشتہ جس پر مدینے کی نظر ہے

تاریخ میں بعض نسبتیں ایسی ہوتی ہیں جو محض دو مقامات کے درمیان قائم نہیں ہوتیں بلکہ دو روحانی مراکز، دو علمی روایتوں اور دو نورانی سلسلوں کو ایک لڑی میں پرو دیتی ہیں۔ ایسی نسبتوں کو نہ جغرافیہ محدود کر سکتا ہے اور نہ زمانہ ان کی تاثیر ماند کر سکتا ہے۔ ان کی بنیاد محبت، اعتماد، فیضان اور وراثتِ علم پر ہوتی ہے، اسی لیے ان کے آثار صدیوں بعد بھی اہلِ بصیرت کے دلوں میں تازہ رہتے ہیں۔ برصغیر کی مذہبی وفکری تاریخ میں مارہرہ شریف اور بریلی شریف کا تعلق بھی انہی مبارک نسبتوں میں سے ایک ہے۔ یہ صرف دو خانقاہوں کا رشتہ نہیں بلکہ ایک ایسی روحانی زنجیر کی مضبوط کڑی ہے جس کا ایک سرا بارگاہِ مصطفیٰ ﷺ سے وابستہ دکھائی دیتا ہے۔

مارہرہ شریف اور بریلی شریف کا جو آپسی رشتہ ہے، اس پہ مدینے کی نظر ہے، اس رشتے سے برصغیر ہند و پاک کا دینی وقار وابستہ ہے۔ چشم و چراغ خاندانِ برکات، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے مرشدِ گرامی، خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ کا وہ تاریخی وصیت نامہ ملاحظہ فرمائیں۔

میاں صاحب! میری اور میرے مشائخ کی تمام تصانیف مطبوعہ یا غیر مطبوعہ جب تک مولانا احمد رضا کو نہ دکھائی جائیں شائع نہ کی جائیں۔ جس کو یہ بتائیں چھپے وہ چھاپی جائے۔ جس کو منع کر دیں وہ ہرگز نہ چھاپی جائے۔ جو عبارت یہ بڑھا دیں وہ میری اور میرے مشائخ کی جانب سے بڑھی ہوئی سمجھی جائے اور جس عبارت کو کاٹ دیں وہ کٹی ہوئی سمجھی جائے۔ یہ اختیارات ان کو بارگاہِ نبوی ﷺ سے عطا ہوئے ہیں۔ (ماہنامہ ''اشرفیہ'' کا سیّدین نمبر، ص: ۲۶۳)

بعض تحریریں اپنے الفاظ سے زیادہ اپنے پس منظر کی وجہ سے زندہ رہتی ہیں۔ ان کی سطریں مختصر ہوتی ہیں لیکن ان کے اندر ایک پورا روحانی عہد سانس لے رہا ہوتا ہے۔ زیرِ نظر وصیت نامہ بھی انہی نادر دستاویزات میں سے ہے جس کے چند جملوں میں اعتماد، نسبت، نیابت اور روحانی امانت کی پوری تاریخ سمٹ آئی ہے۔

ہر مجدد بارگاہِ مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ سے مستنیر ہوتا ہے، لیکن ہر مجدد ہر وقت حضوری کی کیفیت میں ہو، واقعات سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ دربارِ مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ سے اختیارات اسی کو ملتے ہیں جو فنائیت کی منزل میں ہوتا ہے۔ جس کی زبانِ حق شناس پہ ہر وقت یہ نغمہ مچلتا رہتا ہے کہ۔۔ ع

پیشِ نظر وہ نو بہار، سجدے کو دل ہے بے قرار

مارہرہ شریف اور مدینہ شریف میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ خاتم الاکابر سیّد شاہ آلِ رسول احمدی میاں قادری برکاتی قدس سرہٗ کا پورا وجود نبوی تجلیات کا آئینہ تھا اور جو ان کے قرب کی لذت سے آشنا ہوتا تھا، وہ بھی انوار و تجلیات کا آئینہ بن جاتا تھا۔ اسی روحانی ربط کی یہ کیفیت ہے کہ کبھی وہ سینوں میں محفوظ رہتی ہے اور کبھی تاریخ کے اوراق پر ثبت ہو کر آنے والی نسلوں کے لیے حجت بن جاتی ہے۔

یہی روحانی نسبت جب تاریخ کے صفحات پر کسی تحریری شہادت کی صورت اختیار کرتی ہے تو اس کی معنویت مزید نمایاں ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اہلِ سلوک کی باطنی کیفیات اگرچہ ہمیشہ قلم بند نہیں

ہوتیں لیکن کبھی کبھی ان کے اعتماد، اعتراف اور تفویضِ اختیار کے آثار کسی وصیت، مکتوب یا دستاویز کی شکل میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ایسی تحریری شہادتیں محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتیں بلکہ ایک عہد کے روحانی شعور، علمی اعتماد اور نسبتِ اکابر کی مستند گواہی بن جاتی ہیں۔

مذکورہ وصیت نامہ بھی اسی نوع کی ایک نادر تاریخی دستاویز ہے، جس میں باطنی اعتماد نے تحریری صورت اختیار کر کے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے علمی و روحانی مقام کو ایک نئے زاویۂ نظر سے منکشف کر دیا ہے۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات تاریخ کے بڑے فیصلے میدانوں میں نہیں بلکہ قلم کی چند سطروں میں محفوظ ہو جاتے ہیں اور پھر یہی چند سطور آنے والی صدیوں کے لیے ایک پوری روایت کی معتبر ترین شہادت بن جاتی ہیں۔

یہی تحریری شہادت اس وصیت نامے کی اصل معنویت سمجھنے کی کلید بھی فراہم کرتی ہے۔ اس کی قدر و قیمت محض ایک خانقاہی دستاویز کی نہیں بلکہ ایک ایسی تاریخی گواہی کی ہے جو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے علمی مقام اور ان پر اکابر کے غیر معمولی اعتماد کو نہایت واضح انداز میں آشکار کرتی ہے۔

اس وصیت نامے کی تاریخی اہمیت تصرفِ کتب کے اختیار میں نہیں بلکہ اس حقیقت میں مضمر ہے کہ صاحبِ وصیت نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے فہم و تعبیر کو اپنی اور اپنے مشائخ کی علمی و فکری نمائندگی کا درجہ عطا کر دیا۔ یہی اعتماد انہیں روایتِ اکابر کے ایک غیر معمولی امین، معتبر شارح اور مستند ترجمان کے طور پر تاریخ میں ممتاز کرتا ہے۔

یہاں غور طلب حقیقت یہ ہے کہ اعتماد کی یہ منزل محض تعلق یا عقیدت کے اظہار سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیچھے عمر بھر کی علمی دیانت، فکری پختگی، روحانی استقامت اور مزاجِ اکابر سے کامل ہم آہنگی کارفرما ہوتی ہے۔ اسی لیے جب کوئی شیخ اپنے علمی ورثے کی تعبیر و تشریح کا حق کسی ایک شخصیت کے سپرد کرتا ہے تو درحقیقت وہ اپنے پورے علمی سرمائے کے امین کا انتخاب کرتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں یہ وصیت نامہ اپنی غیر معمولی تاریخی اہمیت کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔ کسی تاریخی دستاویز کی اصل اہمیت اس کے الفاظ میں نہیں، ان معانی میں پوشیدہ ہوتی ہے جو ان الفاظ کے پس منظر میں اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہی نکتہ زیرِ نظر وصیت نامے کو بھی محض ایک تحریر سے بلند کر کے ایک عہد کی فکری و روحانی شہادت بنا دیتا ہے۔

بعض دستاویزات اپنے ظاہری حجم سے کہیں زیادہ معنوی وسعت رکھتی ہیں۔ ان کے الفاظ مختصر ہوتے ہیں مگر ان کے پس منظر میں ایک پورا عہد، ایک مکمل فکری روایت اور ایک گہرا روحانی شعور سانس لے رہا ہوتا ہے۔ اہلِ علم و تصوف کی تاریخ میں ایسے بعض تحریری آثار محض انتظامی یا خانقاہی ہدایات نہیں ہوتے بلکہ اپنے اندر شخصیات کے باہمی اعتماد، علمی مراتب کے اعتراف اور روحانی نسبتوں کے اسرار سموئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ وہ کسی شخصیت کے مقام و مرتبے کے بارے میں وہ شہادت فراہم کرتے ہیں جو محض مدح و منقبت سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ عملی اعتماد، سپردگی اور تاریخی اعتراف کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

حضور خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول مارہروی قدس سرہٗ کا یہ وصیت نامہ بھی انہی نادر اور غیر معمولی دستاویزات میں شمار ہونے کا مستحق ہے۔ بظاہر یہ چند سطروں پہ مشتمل ایک وصیت ہے، لیکن اس کے اندر غور کیا جائے تو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی علمی امانت، فکری دیانت، روحانی مقبولیت اور نیابتِ سلسلہ کے ایسے روشن اشارات ملتے ہیں جو اسے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت عطا کرتے ہیں۔

مزید برآں اس کے الفاظ میں اعتماد و اعتراف کی وہ گہرائی پوشیدہ ہے جو کسی شخصیت کے مقام و مرتبے کا تعین محض رسمی توصیفات سے نہیں بلکہ عملی شہادت کے ذریعے کرتی ہے۔ یہ وصیت نامہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ اپنے عہد میں نہ صرف علم و فن کے مقتدا اور فقہ و فتاویٰ کے مرجع تھے بلکہ اپنے مشائخ کے نزدیک اس درجہ معتمد اور معتبر بھی تھے کہ ان کے علمی و فکری ورثے کی حفاظت، نگرانی اور ترجمانی کا حق بھی انہی کے

سپرد کیا گیا۔

یہاں یہ حقیقت بھی قابلِ توجہ ہے کہ تاریخ میں علمی عظمت کے اعتراف کی کئی صورتیں ملتی ہیں، مگر ان میں سب سے بلند درجہ وہ ہے جب ایک صاحبِ نسبت شیخ اپنی زندگی ہی میں اپنے علمی و روحانی ورثے کے تحفظ کے لیے کسی شخصیت کا انتخاب کرے۔ اس نوعیت کا اعتماد نہ رسمی تعلقات کی بنیاد پہ قائم ہوتا ہے، نہ جذباتی وابستگی کے نتیجے میں وجود پاتا ہے، بلکہ اس کے پس منظر میں برسوں کا مشاہدہ، مزاج شناسی، علمی دیانت کا تجربہ اور روحانی اطمینان کارفرما ہوتا ہے۔ اسی لیے ایسی شہادتیں تاریخ میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتی ہیں اور محققین کے لیے ہمیشہ ایک مضبوط تاریخی سند کا درجہ رکھتی ہیں۔

یہ وصیت نامہ اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ اس میں صرف تصانیف کی اشاعت کا اختیار نہیں دیا گیا بلکہ درحقیقت فہمِ اکابر کی امانت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے سپرد کی گئی۔ گویا الفاظ کی حفاظت کے ساتھ معانی کی حفاظت، عبارات کی نگرانی کے ساتھ افکار کی پاسبانی اور روایت کی بقا کے ساتھ اس کی صحیح تعبیر کی ذمہ داری بھی انہی کے حوالے کر دی گئی۔ یہی وہ پہلو ہے جو اس دستاویز کو محض ایک خانقاہی وصیت سے بلند کر کے ایک عظیم فکری اور روحانی اعلان کی حیثیت عطا کرتا ہے۔ یوں یہ دستاویز ایک طرف اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی علمی عظمت کی شاہد ہے تو دوسری طرف ان کے مقامِ اعتماد، رفعتِ نسبت اور غیر معمولی روحانی وجاہت کا ایسا تحریری اعتراف بھی ہے جو تاریخِ تصوف و سلاسل میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس وصیت نامے کو برصغیر کی علمی و روحانی تاریخ کے وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو اس کی معنویت مزید روشن ہو جاتی ہے۔ یہ صرف ایک بزرگ کی وصیت نہیں بلکہ دو عظیم مراکزِ علم و معرفت، مارہرہ شریف اور بریلی شریف، کے درمیان اس روحانی رشتے کی تحریری توثیق ہے جس نے ایک صدی سے زیادہ عرصے تک اہلِ سنّت کی علمی روایت، فکری اعتدال اور روحانی تسلسل کو استحکام بخشا۔ اس اعتبار سے یہ وصیت نامہ صرف اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے مقام کا اعتراف نہیں بلکہ خانوادۂ برکات، سلسلۂ برکاتیہ اور فکرِ رضوی کے باہمی ربط و اتحاد کی بھی ایک ناقابلِ تردید تاریخی شہادت ہے۔

بالآخر یہ وصیت نامہ مارہرہ شریف کی عظمتوں کے اعتراف اور سلسلۂ برکاتیہ کے علمی و روحانی امتیاز کی ایک خاموش مگر دائمی شہادت بن جاتا ہے۔ اس لیے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کا ذکر اگر ان کی انفرادی عظمت کا بیان ہے تو ان کی برکاتی نسبت کا ذکر اسی سرچشمۂ فیض کے اعتراف کا نام ہے جہاں سے اس علمی امانت، روحانی بصیرت اور عشقِ رسول ﷺ کی وہ روشنی پھوٹی جس نے بریلی شریف کو مذہبی و مسلکی فکر کا مرکز، اور برصغیر کو اہلِ سنّت کی ایک زندہ علمی روایت عطا کی۔ یہی وہ نسبت ہے جس پر آج بھی مدینے کی نظر ہے، اور یہی وہ رشتہ ہے جس سے برصغیر ہند و پاک کا دینی وقار وابستہ ہے۔ اسی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے اب ضروری ہے کہ اس وصیت نامے کے متن کو محض تاریخی دستاویز کے طور پہ نہیں بلکہ ایک فکری و روحانی شہادت کے طور پہ پڑھا جائے، تاکہ اس کے باطن میں پوشیدہ اشارات اور معانی پوری طرح منکشف ہو سکیں۔

زیرِ نظر سطور میں اسی وصیت نامے کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ اس کے الفاظ کے پس پردہ موجود علمی، فکری اور روحانی معانی سمجھے جا سکیں اور یہ واضح ہو سکے کہ خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ نے اپنے اس مختصر مگر بامعنیٰ بیان کے ذریعے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے کس عظیم مقام و مرتبے کی نشاندہی فرمائی ہے۔ یہ وصیت نامہ محض ایک خانقاہی ہدایت نہیں بلکہ ایک عظیم روحانی شہادت، علمی اعتماد کی بے مثال دستاویز اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی علمی و روحانی عظمت کا ایسا اعتراف نامہ ہے جس کی نظیر میری ناقص معلومات کی حد تک خانقاہی تاریخ میں نہیں ملتی۔ خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ کے یہ الفاظ: ''میری اور میرے مشائخ کی تمام تصانیف مطبوعہ یا غیر مطبوعہ جب تک مولانا احمد رضا کو نہ دکھائی جائیں شائع نہ کی جائیں۔''

وصیت نامے کے جملے ایک غیر معمولی اعتماد کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بظاہر یہ ایک علمی ہدایت ہے لیکن اس کے باطن میں ایک پورے روحانی و علمی سلسلے کی امانت کا اعلان پوشیدہ ہے۔ اس وصیت سے واضح ہوتا ہے کہ خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کو صرف ایک مرید یا خلیفہ کی حیثیت سے نہیں دیکھا بلکہ اپنے علمی و روحانی ورثے کا امین اور اپنے سلسلۂ فیض کا معتمد ترجمان قرار دیا۔ ان کے نزدیک اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ محض وابستگانِ سلسلۂ برکاتیہ کے ایک فرد نہیں تھے بلکہ وہ اس علمی و روحانی روایت کے ایسے معتبر نمائندہ تھے جو اکابر کے منہج، اذواق، افکار اور مقاصد کو صحیح طور پہ سمجھنے اور آگے منتقل کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے اور اپنے مشائخ کے علمی سرمائے کے بارے میں وہ اعتماد ظاہر فرمایا جو عام طور پہ کسی شخصیت کے لیے کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ گویا خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ کی نگاہ میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ وہ شخصیت تھے جن کے علم پہ اعتماد کیا جاسکتا تھا، جن کے فہم کو اپنے فہم کا آئینہ دار سمجھا جاسکتا تھا، جن کی رائے کو اپنے اکابر کے ذوق و منہج کا ترجمان تسلیم کیا جاسکتا تھا اور جن کی دیانتِ علمی کو اس درجہ مسلم مانا جاسکتا تھا کہ ان کے ذریعے علمی ورثے کی حفاظت بھی ہو اور اس کی صحیح تعبیر و تشریح بھی۔

اسی لیے انہوں نے اپنی اور اپنے مشائخ کی تمام تصانیف کے بارے میں آخری فیصلہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے سپرد کردیا۔ اپنی تصانیف کے بارے میں کسی شیخ کا اپنے معتمد شاگرد یا خلیفہ کو نظرِ ثانی کا اختیار دینا ایک حد تک قابلِ فہم ہے، کیونکہ مصنف اپنی تحریر کا مالک ہوتا ہے اور اپنی زندگی میں اس کے متعلق جسے چاہے اختیار دے سکتا ہے۔ لیکن یہاں معاملہ صرف اپنی کتابوں کا نہیں۔ وصیت میں صراحت کے ساتھ ''میری اور میرے مشائخ کی تمام تصانیف'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ گویا شیخ اپنی ذات سے آگے بڑھ کر اپنے اکابر، اپنے مشائخ اور اپنے پورے سلسلۂ طریقت کے علمی ذخیرے کو بھی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے سپرد کررہے ہیں۔

مزید حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اعتماد کا دائرہ محض اشاعت یا تصحیح تک محدود نہیں رہتا بلکہ حذف و اضافے تک پہنچ جاتا ہے۔ خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

''جو عبارت یہ بڑھا دیں وہ میری اور میرے مشائخ کی جانب سے بڑھی ہوئی سمجھی جائے اور جس عبارت کو کاٹ دیں وہ کٹی ہوئی سمجھی جائے۔''

یہ الفاظ اپنے اندر غیر معمولی معنویت رکھتے ہیں۔ علمی دنیا میں مصنف اپنی تحریر کے ایک لفظ کی تبدیلی بھی آسانی سے گوارا نہیں کرتا لیکن یہاں ایک شیخِ کامل اپنے مرید کو نہ صرف ترمیم کا حق دے رہا ہے بلکہ اس ترمیم کو اپنی اور اپنے مشائخ کی طرف منسوب بھی کررہا ہے۔

یہاں ایک نہایت باریک اور اہم فرق سامنے آتا ہے۔ خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ نے یہ نہیں فرمایا کہ ''جو اضافہ مولانا احمد رضا کریں اسے قبول کرلینا'' بلکہ فرمایا کہ ''وہ میری اور میرے مشائخ کی جانب سے بڑھا ہوا سمجھا جائے۔'' قبولیت اور نسبت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قبولیت محض رضامندی کا اظہار ہے، جبکہ نسبت کسی رائے یا عبارت کو اصل صاحبِ قول کی طرف منسوب کردیتی ہے۔

اسی لیے اس وصیت نامے کا سب سے نمایاں پہلو محض اعتماد نہیں بلکہ تمثیل اور نیابت (Representation) ہے۔ گویا خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ یہ اعلان فرما رہے ہیں کہ مولانا احمد رضا صرف ہمارے سلسلے کے ایک فرد نہیں بلکہ ہمارے علمی و فکری شعور کے قابلِ قدر نمائندہ ہیں۔ ان کا فہم ہمارے فہم کا ترجمان، ان کی رائے ہماری رائے کی آئینہ دار اور ان کا اجتہادِ علمی ہمارے اکابر کے ذوق و منہج کا مظہر ہے۔

یہ حیثیت براہِ راست اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی ذاتی استقلالِ رائے کی بنا پہ نہیں بلکہ خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ کی صریح تفویض اور تحریری اجازت کی بنیاد پر تھی۔ ان کے نزدیک اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ اسرارِ سلسلہ، مزاجِ اکابر اور مناہجِ اسلاف

سے اس درجہ آشنا تھے کہ ان کی علمی تعبیر کو اپنے علمی موقف کی توسیع، ان کی توضیح کو اپنی توضیح اور ان کے فیصلے کو اپنے ذوقِ علمی کے مطابق سمجھا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں محض ناقلِ افکار نہیں بلکہ شارحِ افکار، محض وارثِ نسبت نہیں بلکہ امینِ نسبت اور محض خلیفۂ سلسلہ نہیں بلکہ ترجمانِ سلسلہ کا مقام عطا کیا گیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ کی نگاہ میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ وہ شخصیت تھے جن میں علم کی گہرائی، فکر کی پختگی، امانت کی سلامتی اور نسبت کی صداقت اس درجہ جمع ہو گئی تھی کہ ان کے ذریعے سلسلۂ اکابر کا علمی و روحانی مزاج نہ صرف محفوظ رہ سکتا تھا بلکہ پوری صحت اور دیانت کے ساتھ آنے والی نسلوں تک منتقل بھی ہو سکتا تھا۔ یہی وہ غیر معمولی اعتماد ہے جو اس وصیت نامے کو ایک عام اجازت یا توثیق سے بلند کر کے نیابتِ فکری و روحانی کی ایک نادر اور تاریخ ساز سند بنا دیتا ہے۔

اسی تناظر میں یہ وصیت نامہ اہلِ سنّت و جماعت کے لیے محض ایک تاریخی یادگار نہیں بلکہ ایک ایسی مستند دستاویزی شہادت ہے جس کی روشنی میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے علمی و روحانی مقام کا ایک اہم پہلو پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ بالخصوص خانوادۂ برکاتیہ سے نسبی وابستگی رکھنے والے افراد کے لیے اس کی اہمیت غیر معمولی ہے، کیونکہ یہ دستاویز اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ خود اس خانوادے کے اکابر نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے علم، فہم، دیانت، امانت اور تعبیر دین پہ ایسا اعتماد فرمایا جو رسمی تعلقات سے کہیں بلند اور محض جذباتی عقیدت سے کہیں زیادہ عمیق تھا۔ یہ اعتماد برسوں کی صحبت، مشاہدے، آزمائش اور روحانی بصیرت کا حاصل تھا، جس نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کو اپنے علمی و فکری ذوق کا معتبر ترجمان اور اپنے روحانی ورثے کا امین قرار دیا۔

اس لیے یہ وصیت نامہ محض ایک تاریخی دستاویز نہیں بلکہ اکابرِ برکات کے اجتماعی اعتماد کا تحریری اعلان بھی ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص، خواہ وہ اسی خانوادے سے نسبی تعلق رکھتا ہو، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے بارے میں غیر علمی، غیر محقق یا بے بنیاد گفتگو کرتا ہے تو حقیقت میں وہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ سے زیادہ اپنے ہی اکابر کے فیصلۂ علمی پہ سوال قائم کرتا ہے۔ ایسی گفتگو کا ہدف اگرچہ بظاہر ایک شخصیت ہوتی ہے، لیکن اس کی زد ان نفوسِ قدسیہ تک پہنچتی ہے جنہوں نے اپنی علمی بصیرت، روحانی فراست اور حسنِ انتخاب کے بعد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کو اپنے افکار و اذواق کی ترجمانی کے منصب پہ فائز فرمایا تھا۔ گویا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی ذاتِ گرامی پہ بے دلیل اعتراض دراصل اس اعتماد پہ اعتراض ہے جسے اکابرِ برکات نے اپنے قلم سے ثبت کیا اور اپنی بصیرت سے سند عطا فرمائی۔ تاریخ کی بعض دستاویزات وقت کے ساتھ پرانی نہیں ہوتیں بلکہ ہر نئے اختلاف کے سامنے میزان بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ یہ وصیت نامہ بھی انہی زندہ دستاویزات میں سے ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ نسبتِ خانوادگی اپنی جگہ ایک شرف ہے مگر اکابر کی علمی امانت کا حقیقی وارث وہی ہو سکتا ہے جو ان کے فیصلوں کا احترام، ان کے اعتماد کی حفاظت اور ان کے علمی ذوق کی پاسبانی کرے۔ ورنہ نسب اگر روایتِ اکابر سے منقطع ہو جائے تو وہ صرف ایک انتساب رہ جاتا ہے، جبکہ اکابر کی امانت کا اصل وارث وہی ہوتا ہے جو ان کے علم، ان کی دیانت اور ان کے فیصلوں کے وقار کو اپنی زبان اور قلم دونوں سے محفوظ رکھے۔

یہ حقیقت بھی کسی حال میں فراموش نہیں کی جانی چاہیے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ اپنے علمی، فکری، فقہی اور تجدیدی کارناموں کی بنیاد پہ آج عالمِ اسلام کی ایک ہمہ گیر اور مرکزی شخصیت کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا علمی فیض برِ اعظم کی سرحدیں عبور کر چکا ہے، ان کی تصانیف نے مدارس و جامعات کے حلقوں میں استناد حاصل کیا اور ان کی فکر کی روشنی ایک صدی سے زائد عرصے سے اہلِ سنّت کے علمی افق کو منور کیے ہوئے ہے اور آج بھی اسی درخشانی کے ساتھ اربابِ علم و نظر کی رہنمائی کر رہی ہے۔ لیکن ان تمام رفعتوں کے باوجود ان کی شخصیت کا ایک ایسا روشن پہلو ہے جسے تاریخ نے کبھی اپنے حافظے سے محو نہیں کیا اور وہ ہے ان کی برکاتی نسبت۔

یہ نسبت ان کے تعارف کا کوئی ضمنی عنوان نہیں بلکہ ان کی روحانی شناخت کا وہ روشن باب ہے جس نے ان کی علمی عظمت کو ایک معتبر

روحانی سلسلے سے وابستہ رکھا۔ وہ جس قدر بھی بلند ہوئے، آسمانِ علم پہ ان کا مقام جس قدر بھی بلند تر ہوتا گیا، ان کی پیشانی پہ سلسلۂ برکاتیہ کی نسبت اسی طرح درخشاں رہی۔ وہ اس خانوادۂ علم و ولایت کے چشم و چراغ تھے اور یہی نسبت ان کے کمالات کو مارہرہ شریف کی روحانی عظمتوں سے مربوط کرتی ہے۔ گویا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی بلندی نے اس نسبت کو کم نہیں کیا بلکہ اس کے وقار میں چار چاند لگائے، ان کی شہرت نے مارہرہ شریف کا تعارف ماند نہیں کیا بلکہ اسے عالمِ اسلام کے علمی و روحانی نقشے پہ مزید نمایاں کر دیا۔

تاریخ کے بعض چراغ ایسے ہوتے ہیں جن کی روشنی صرف اپنے گرد و پیش کو منور نہیں کرتی بلکہ اس آستانے کو بھی روشن کر دیتی ہے جہاں سے انہیں نور ملا ہوتا ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ بھی انہی نفوسِ قدسیہ میں سے ہیں۔ ان کی شخصیت کا ہر روشن پہلو بالآخر مارہرہ شریف کی عظمتوں کے اعتراف اور سلسلۂ برکاتیہ کے علمی و روحانی امتیاز کی ایک خموش مگر دائمی شہادت بن جاتا ہے۔ اس لیے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کا ذکر اگر ان کی انفرادی عظمت کا بیان ہے تو ان کی برکاتی نسبت کا ذکر اس سرچشمۂ فیض کے اعتراف کا نام ہے جہاں علم نے نسبت سے اور نسبت نے علم سے اپنی تکمیل پائی۔

اسی برکاتی نسبت کا ایک نہایت روشن، مستند اور ناقابلِ تردید مظہر وہ تحریری اعتماد ہے جو اکابرِ سلسلہ نے اپنے عمل اور اپنی وصیتوں کے ذریعے ثبت فرمایا۔ نسبت کا کمال اس وقت اور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے جب وہ محض تذکرے یا دعوے کی صورت میں نہیں بلکہ ایک ایسی دستاویزی شہادت کی شکل اختیار کر لے جو آنے والی نسلوں کے لیے بھی معیارِ اعتماد بن جائے۔ زیرِ نظر وصیت نامہ اسی اعتماد کی ایک درخشاں مثال ہے، جس میں نسبت نے تحریری سند اور اعتماد نے تاریخی گواہی کی صورت اختیار کر لی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مشائخ کی تحریریں صرف علمی مباحث کا مجموعہ نہیں ہوتیں بلکہ ان کے افکار، اذواق، مشارب اور روحانی امانتوں کی نمائندہ بھی ہوتی ہیں۔ ان میں تصرف کا حق دینا گویا اس بات کا اعلان ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ اس سلسلے کے مزاج، منہاج اور مقاصد کو اس درجہ سمجھتے ہیں کہ ان کی زبان ہمارے مشائخ کے ذوق و مشرب کی ترجمان سمجھی جا سکتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں یہ وصیت نامہ محض علمی اعتماد کی دستاویز نہیں رہتا بلکہ نیابتِ فکری و روحانی کی ایک روشن سند بن جاتا ہے۔

اس وصیت کا ایک اور نہایت اہم اور حیرت انگیز جملہ وہ ہے جس میں خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

''یہ اختیارات ان کو بارگاہِ نبوی ﷺ سے عطا ہوئے ہیں۔''

یہاں معاملہ صرف علمی قابلیت کا نہیں رہتا بلکہ روحانی انتخاب کا بن جاتا ہے۔ شیخ اپنے مرید کی اہلیت کی بنیاد صرف ذاتی تجربے یا مشاہدے پہ نہیں رکھ رہا بلکہ اسے عطائے رسول ﷺ قرار دے رہا ہے۔ گویا ان کے نزدیک اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی علمی بصیرت، فقہی ژرف نگاہی، دینی فراست اور فکری امانت ایک ایسی نعمت تھی جسے بارگاہِ مصطفوی ﷺ سے خصوصی تائید حاصل تھی۔

اسی روحانی توجیہ کے باعث یہ اعتماد محض شخصی اعتماد نہیں رہتا بلکہ ایک مشہود و معتمد حقیقت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ صرف ذاتی اعتماد کا معاملہ ہوتا تو اپنی اور اپنے مشائخ کی تمام تصانیف میں اس درجہ تصرف کا اختیار دینا آسانی سے قابلِ توجیہ نہ ہوتا لیکن جب اسے عطائے رسول ﷺ قرار دیا گیا تو گویا یہ واضح ہو گیا کہ شیخ کے نزدیک یہ محض ایک علمی فیصلہ نہیں بلکہ ایک روحانی مشاہدے پر مبنی یقین تھا۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ وصیت نامہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے حق میں صرف سندِ علم نہیں بلکہ سندِ نیابتِ سلسلہ بھی ہے، ایسی نیابت جس میں ایک شیخ اپنی ذات ہی نہیں بلکہ اپنے پیچھے کھڑے پورے سلسلۂ اکابر کے علمی و فکری ورثے کی ترجمانی کا حق بھی اپنے مریدِ کامل کو تفویض کر رہا ہے۔

اسی لیے اس وصیت نامے میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی شخصیت کے تین بنیادی اوصاف بیک وقت

جلوہ گر ہوتے ہیں: علم، امانت اور نسبت۔ علم اس لیے کہ انہیں فیصلہ کن علمی اتھارٹی تسلیم کیا گیا۔ امانت اس لیے کہ پورے سلسلے کا علمی سرمایہ ان کے سپرد کیا گیا اور نسبت اس لیے کہ اس اختیار کی اصل بنیاد بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عطا شدہ فیض کو قرار دیا گیا۔

اگر خانقاہی تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو خلافت نامے، اجازت نامے اور سجادگی کی دستاویزات تو بکثرت ملتی ہیں لیکن کسی شیخ کا اپنے مشائخ کے علمی ورثے میں اس درجہ تصرف کا اختیار اپنے مرید کو عطا کرنا بلاشبہ ایک نادر المثال اور غیر معمولی واقعہ ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ وصیت نامہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی علمی امانت، فکری دیانت، روحانی مقبولیت اور نیابتِ سلسلہ پر خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ کی طرف سے صادر کردہ ایک عظیم تاریخی اعتراف نامہ ہے۔ اسی حقیقت کو خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ نے اپنے اس مختصر مگر غیر معمولی بیان کے ذریعے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔

اعتماد کی وہ منزل جو تاریخ میں کم دکھائی دیتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ اس وصیت نامے کا سب سے غیر معمولی پہلو صرف یہ نہیں کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کو تصنیفات میں حذف واضافہ یا توضیح کا اختیار عطا کیا گیا بلکہ یہ ہے کہ ان کے اس تصرف کو خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ نے اپنی ذات اور اپنے مشائخِ سلسلہ کے تصرف کے قائم مقام قرار دیا۔ گویا یہاں اعتماد کسی فرد کے علم پر نہیں بلکہ اس کے فہمِ روایت، شعورِ اکابر اور امانتِ فکر پر کیا گیا ہے۔

درحقیقت اس وصیت نامے میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ محض ایک شارح، مرتب یا ناقل کے طور پر سامنے نہیں آتے بلکہ روایتِ اکابر کے ایسے مجاز ترجمان کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتے ہیں جن کی علمی تعبیر کو اکابر کی تعبیر، جن کی توضیح کو اکابر کی توضیح اور جن کے قلمی تصرف کو اکابر کے تصرف کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ گویا یہی وہ مقام ہے جو اس دستاویز کو معمول کی اجازتوں اور روایتی توثیقات سے بلند کرکے نیابتِ فکری و روحانی کی ایک نادر اور تاریخ ساز سند بنا دیتا ہے۔

فہمِ اکابر پر غیر معمولی اعتماد

ان کے نزدیک اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ اسرارِ سلسلہ، مزاجِ اکابر اور مناہجِ اسلاف سے اس درجہ آشنا تھے کہ ان کی علمی تعبیر کو اپنے علمی موقف کی توسیع، ان کی توضیح کو اپنی توضیح اور ان کے فیصلے کو اپنے ذوقِ علمی کے مطابق سمجھا جا سکتا تھا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ کی نگاہ میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ وہ شخصیت تھے جن میں علم کی گہرائی، فکر کی پختگی، امانت کی سلامتی اور نسبت کی صداقت اس درجہ جمع ہوگئی تھی کہ ان کے ذریعے سلسلۂ اکابر کا علمی و روحانی مزاج نہ صرف محفوظ رہ سکتا تھا بلکہ پوری صحت اور دیانت کے ساتھ آنے والی نسلوں تک منتقل بھی ہوسکتا تھا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اکابر کے ذوق وفکر کے امین، ان کے منہج کے محافظ، ان کے علمی ورثے کے نگہبان اور ان کے روحانی شعور کے معتبر ترجمان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر کیا جانے والا اعتماد محض شخصی تعلق یا خانقاہی وابستگی کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طویل مشاہدے، کامل معرفت اور غیر معمولی یقین کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔

اپنی اور اپنے مشائخ کی نمائندگی

اس وصیت نامے کا سب سے بلند اور غیر معمولی پہلو یہ ہے کہ صاحبِ وصیت نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے قلمی تصرف کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے اپنے مشائخِ سلسلہ کی نمائندگی کا درجہ بھی عطا فرمایا۔ اس ایک جملے کے اندر اعتماد کے وہ معانی پوشیدہ ہیں جو عام خانقاہی اجازت ناموں میں کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔ کسی کتاب کی اصلاح، ترتیب یا توضیح کا اختیار دینا ایک الگ بات ہے، لیکن یہ کہنا کہ جو اضافہ وہ کریں وہ میری اور میرے مشائخ کی جانب سے اضافہ سمجھا جائے اور جسے حذف کریں وہ

میری اور میرے مشائخ کی جانب سے حذف شدہ تصور کیا جائے، دراصل اس امر کا اعلان ہے کہ ان کا فہمِ اکابر اس درجہ معتبر اور معتمد ہے کہ اسے روایتِ سلسلہ کی صحیح ترجمانی سمجھا جاسکتا ہے۔ گویا یہاں اعتماد کے تین مدارج جمع ہو گئے ہیں۔ اپنی ذات پر اعتماد، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ پر اعتماد اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے فہم کو اپنے مشائخ کے فہم کا آئینہ قرار دینا۔ یہی تیسرا درجہ اس وصیت نامے کو غیر معمولی اور منفرد بنا دیتا ہے۔

عام طور پر کسی بزرگ کے کلام کی شرح، توضیح یا تشریح کو شارح کی اپنی علمی کاوش اور فہم کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے اصل مصنف اور شارح کے درمیان ایک فاصلہ بہر حال باقی رہتا ہے، خواہ شارح کتنا ہی معتبر کیوں نہ ہو۔ لیکن اس وصیت نامے میں صورتِ حال اس سے مختلف نظر آتی ہے، کیونکہ یہاں خود صاحبِ وصیت نے پہلے ہی یہ اعلان فرما دیا کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی تعبیر و توضیح کو ان کی اپنی اور ان کے مشائخ کی تعبیر و توضیح سمجھا جائے۔ اس طرح شرح اور اصل، شارح اور صاحبِ متن، تعبیر اور مصدرِ تعبیر کے درمیان جو فاصلہ عموماً باقی رہتا ہے، وہ اس وصیت نامے میں غیر معمولی حد تک سمٹ جاتا ہے اور یہی امر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کے فہمِ اکابر پر کیے گئے اعتماد کی گہرائی نمایاں کرتا ہے۔

نیابتِ فکری و روحانی کی تاریخی دستاویز

چنانچہ اس وصیت نامے کی اصل اہمیت اسی حقیقت میں مضمر ہے کہ اس میں ایک شیخ کا اپنے مرید پر اعتماد ہی نہیں بلکہ اپنے علمی و روحانی ورثے کی امانت کا باقاعدہ اعلان محفوظ ہو گیا ہے۔

خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ دراصل اپنے عہد ہی سے نہیں بلکہ آنے والی نسلوں سے بھی یہ فرما رہے ہیں کہ مولانا احمد رضا وہ شخصیت ہیں جن کے علم پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، جن کی دیانت پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے، جن کے فہم کو اپنے اکابر کے فہم کا آئینہ دار سمجھا جاسکتا ہے اور جن کی رائے کو اپنے سلسلۂ فیض کی معتبر آواز تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

وہ ایسے صاحبِ نظر عالمِ دین ہیں جن کی علمی بصیرت محض معلومات کے انبار سے نہیں بلکہ اکابر کے مزاجِ فکر سے گہری ہم آہنگی سے عبارت ہے، ایسے امین ہیں جن کے سپرد کیا گیا علمی سرمایہ تحریف و تغیر کے اندیشوں سے محفوظ رہ سکتا ہے اور ایسے ترجمانِ سلسلہ ہیں جن کی زبان سے ادا ہونے والی تعبیرات میں اسلاف کے ذوق، منہج اور مقاصد کی بازگشت سنی جاسکتی ہے۔

علمی ورثے کے تحفظ کی ضمانت

اس وصیت نامے کا ایک نہایت اہم مگر کم توجہ پانے والا پہلو یہ بھی ہے کہ اسے محض اعتماد و نیابت کی دستاویز کے طور پر نہیں بلکہ علمی و روحانی ورثے کے تحفظ کے ایک مؤثر انتظام کے طور پہ بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اکابر کے وصال کے بعد ان کے ملفوظات، مکتوبات، تصنیفات اور افکار کی تعبیر و تشریح کے باب میں مختلف النوع آرا سامنے آتی ہیں۔ بسا اوقات حسنِ نیت کے باوجود ناقص فہم، محدود مطالعہ یا مزاجِ اکابر سے ناواقفیت ایسی تعبیرات پیدا کرتی ہے جو اصل منہج اور مقصود سے دور جا پڑتی ہیں۔

ایسے حالات میں خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ کا یہ وصیت نامہ ایک غیر معمولی بصیرت کا مظہر دکھائی دیتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے علمی و روحانی ورثے کی حفاظت کے لیے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کو ایک ایسے معتبر معیار اور میزانِ صحت کی حیثیت عطا فرما دی جس کی طرف رجوع کر کے آئندہ نسلیں اپنے شبہات اور اختلافات کا حل تلاش کر سکیں۔

گویا اس وصیت نامے کے ذریعے یہ واضح کر دیا گیا کہ اگر ان کی تصنیفات، افکار، منہج یا سلسلۂ اکابر کے مزاج کو سمجھنے کی ضرورت پیش آئے تو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی تعبیر و توضیح کو محض ایک فرد کی رائے نہ سمجھا جائے بلکہ اسے اسی فکری و روحانی روایت کا معتبر اظہار تصور کیا جائے جس کی نمائندگی خود صاحبِ وصیت اور ان کے مشائخِ کرام فرماتے ہیں۔ اسی زاویے سے دیکھا جائے تو

یہ وصیت نامہ صرف اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی عظمت و اعتماد کا اعلان نہیں بلکہ روایتِ اکابر کے صحیح فہم اور اس کے تسلسل کے تحفظ کی ایک دائمی ضمانت بھی ہے۔ اس نے آنے والی نسلوں کو یہ معیار فراہم کر دیا کہ اکابر کے کلام اور منہج کی تعبیر میں کن اصولوں اور کس شخصیت کے فہم پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ یوں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ نہ صرف علمی امانت کے محافظ قرار پاتے ہیں بلکہ اکابر کے فکری ورثے کے مستند شارح اور میزانِ صحت کی حیثیت سے بھی سامنے آتے ہیں۔

ایک تاریخی اعتراف نامہ

درحقیقت اس وصیت نامے میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کو محض تصنیفی اصلاح یا توضیح کا اختیار نہیں دیا گیا بلکہ انہیں اکابرِ سلسلہ کے علمی و فکری ورثے کا ایسا معتمد امین تسلیم کیا گیا ہے جس کے قلمی تصرف کو خود صاحبِ وصیت نے اپنی اور اپنے مشائخ کی نمائندگی قرار دے کر اس اعتماد کو دائمی تاریخی دستاویز کی صورت عطا کر دی۔ اسی لیے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اپنے پیر خانے اور سلسلۂ طریقت میں جس بلند ترین مقامِ اعتبار و اعتماد پر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کو فائز کیا گیا، وہ ان کا ایک نمایاں تفرد اور تاریخی امتیاز ہے۔ یہ امتیاز محض روایتی مناقب یا زبانی تذکروں میں محفوظ نہیں رہا بلکہ ایک تحریری وصیت نامے کی صورت میں تاریخ کا حصہ بن گیا۔

اس اعتبار سے یہ وصیت نامہ صرف ایک خانقاہی دستاویز نہیں بلکہ اکابرِ سلسلہ کی جانب سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی علمی امانت، فکری دیانت، روحانی اہلیت اور مقامِ اعتماد کا ایک تاریخی اعتراف نامہ ہے، ایسا اعتراف نامہ جس کے الفاظ مختصر ہیں مگر جس کے معانی ایک پوری تاریخ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ اس کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ اپنے مشائخ کی نگاہ میں صرف ایک عظیم فقیہ، محدث اور متکلم ہی نہیں تھے بلکہ اسرارِ سلسلہ، امانتِ علم اور روایتِ اکابر کے سب سے معتبر امین اور ترجمان بھی تھے۔ اس وصیت نامے کی اصل تاریخی اہمیت اس بات میں نہیں کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کو تصرفِ کتب کا اختیار دیا گیا بلکہ اس میں ہے کہ ان کے فہم و تعبیر کو صاحبِ وصیت نے اپنی اور اپنے مشائخِ سلسلہ کی نمائندگی کا درجہ عطا کر دیا، اور یہی اعتماد انہیں روایتِ اکابر کے ایک غیر معمولی امین اور ترجمان کی حیثیت سے تاریخ میں ممتاز کرتا ہے۔

تاریخِ علم و تصوف میں بعض دستاویزات ایسی ہوتی ہیں جو اپنے الفاظ کی قلت کے باوجود اپنے معانی کی وسعت کے باعث صدیوں تک اہلِ نظر کی توجہ کا مرکز بنی رہتی ہیں۔ خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ کا یہ وصیت نامہ بھی انہی نادر دستاویزات میں سے ایک ہے۔ اس کی اصل اہمیت محض اس امر میں نہیں کہ اعلی حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کو تصانیف کے بارے میں نظرِ ثانی، حذف و اضافہ یا توضیح کا اختیار عطا کیا گیا بلکہ اس حقیقت میں ہے کہ ان کے فہم، تعبیر اور قلمی تصرف کو خود صاحبِ وصیت نے اپنی اور اپنے مشائخِ سلسلہ کی علمی و فکری نمائندگی کا درجہ عطا فرمایا۔

یہ اعتماد دراصل اعلی حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی علمی بصیرت، فکری دیانت، روحانی مقبولیت اور اسرارِ سلسلہ سے گہری واقفیت کا ایک بے مثال اعتراف ہے۔ اسی لیے یہ وصیت نامہ محض ایک خانقاہی ہدایت یا انتظامی دستاویز نہیں بلکہ روایتِ اکابر کے ایک معتبر امین، مستند شارح اور معتمد ترجمان کے حق میں صادر ہونے والی ایک تاریخی شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول احمدی قادری برکاتی قدس سرہٗ نے اپنے اس مختصر مگر غیر معمولی بیان کے ذریعے نہ صرف اپنے علمی و روحانی ورثے کے تحفظ کا اہتمام فرمایا بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے یہ معیار بھی متعین کر دیا کہ اکابرِ سلسلہ کے افکار، اذواق اور مناہج کو سمجھنے کے باب میں کس شخصیت کے فہم پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ مقامِ اعتماد ہے جو اعلی حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کو اپنے عہد ہی میں ممتاز کرتا ہے اور یہی وہ تاریخی امتیاز ہے جس نے انہیں روایتِ اکابر کے ایک غیر معمولی امین اور ترجمان کی حیثیت سے ہمیشہ کے لیے تاریخ میں محفوظ کر دیا۔

□□□□

محمد ملک الظفر سہسرامی

نعتیہ شاعری میں استغاثے کی روایت

عقیدہ، تاریخ اور شعری جمالیات کا مطالعہ

محبت کی تاریخ میں کچھ در ایسے ہوتے ہیں جن کے سامنے صدیوں کی پیشانیاں جھکتی رہی ہیں اور صدیوں کے دل اپنی امیدوں کے چراغ لے کر حاضر ہوتے رہے ہیں۔ یہ وہ در ہوتے ہیں جہاں التجائیں آہستہ آہستہ دعا بن جاتی ہیں اور آنکھوں کی نمی عقیدت کے نور میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ آستانے جہاں دلوں کی بے قراری ادب کے سانچے میں ڈھل کر سکون کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور فریاد کی لرزش بھی احترام کی چادر اوڑھ لیتی ہے۔ وہ مقامات جہاں زمانے کی تھکی ہوئی روحیں اپنے دکھوں کا بوجھ رکھ کر امید کی نئی کرن لے کر لوٹتی ہیں۔ یہ وہ در ہیں جن کی دہلیز پہ وقت کی گرد ٹھہر نہیں پاتی بلکہ محبت کی صدیوں پرانی خوشبو ہر آنے والے کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ یہ وہ آستانے ہیں جہاں لفظوں سے پہلے دل حاضر ہوتے ہیں اور سوال لبوں سے کم اور نگاہوں سے زیادہ ادا ہوتے ہیں۔ یہاں جھکی ہوئی پیشانیاں عجز کا استعارہ نہیں، محبت کے وقار اور عقیدت کے کمال کی نشانی ہوتی ہیں۔ یہی نسبتیں انسان کے دل کو یہ یقین عطا کرتی ہیں کہ محبت کی تاریخ میں کچھ در ایسے بھی ہیں جہاں صدیوں کے فاصلے مٹ جاتے ہیں اور ایک عاجزانہ سلام صدیوں کی عقیدت کا ترجمان بن جاتا ہے۔ درِ مصطفیٰ ﷺ بھی ایسا ہی آستانۂ رحمت ہے جہاں عقیدت کی آندھیاں ادب کے دامن میں سمٹ جاتی ہیں اور فریاد کی صدائیں دعا کی نرمی اختیار کر لیتی ہیں۔ وہاں دل کی دھڑکنیں بھی خموشی کے پیرائے میں ادب کے ساتھ سر جھکاتی ہیں اور آنکھوں کی نمی الفاظ کی نرم روشنی میں بدل جاتی ہے۔ امید کی کرن آہستہ آہستہ دل کے آئینے پہ اترتی ہے اور خوف کے سائے رحمت کے نور میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہاں خموش زبانیں بھی عشقِ رسول ﷺ کی حکایت سناتی ہیں اور لبوں کی سادگی میں دل کی گہرائی کے اسرار جھلکنے لگتے ہیں۔ اسی آستانے پہ زمانے کی تھکن بھی مصطفوی حسن سے تازگی پا لیتی ہے اور دل کے بوجھ ہلکے ہو کر سکون کے لہجے میں ڈھل جاتے ہیں۔ التجاؤں کی نرم سرگوشیاں دعاؤں کی خوشبو میں بدل جاتی ہیں اور دل کی بے قراری ادب کا ریشمی لباس زیب تن کر کے سکون حاصل کر لیتی ہے۔ عشق کی تپش صبر کی چادر اوڑھ لیتی ہے اور فریاد کے لہجے میں عاجزی کی نرم روشنی نمودار ہو جاتی ہے۔

یہ وہ مقام ہے جہاں صدیوں کے فاصلے مٹ جاتے ہیں، جہاں جھکی ہوئی پیشانیاں شکست کی علامت نہیں بلکہ محبت کی معراج اور عقیدت کی تکمیل بن جاتی ہیں اور جہاں ہر عاجزانہ سلام صدیوں کی عقیدت کا ترجمان بن کر دلوں میں روشنی کی کرن بکھیر دیتا ہے۔ ایسے در صرف الفاظ میں نہیں بلکہ دل کی آواز، روح کی تڑپ اور امید کے پُر اثر امتزاج سے پہچانے جاتے ہیں، وہ آستانے جو صدیوں سے اہلِ دل کو اپنی طرف متوجہ کرتے آئے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ یہی وہ آستانہ ہے جس کی طرف نگاہ اٹھتے ہی دلوں میں یقین کی روشنی اور امید کی ایک لطیف لہر پیدا ہو جاتی ہے۔ اہلِ محبت نے اس نسبت کو صرف عبادت کے رسمی دائروں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے اپنی تہذیب، اپنے احساسات اور اپنے ادب کا حصہ بنا لیا۔ چنانچہ جب عشقِ رسول ﷺ نے زبان و بیان کا پیرایہ اختیار کیا تو نعتیہ شاعری کی وہ دل آویز روایت وجود میں آئی جس میں مدح کی رفعتیں بھی ہیں، درود و سلام کی خوشبو بھی اور عاجزانہ فریادوں کی نرم سرگوشیاں

بھی۔ درحقیقت نعت کا آغاز اسی لمحے سے ہو جاتا ہے جب انسانی دل پہلی بار حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے سامنے ادب سے جھکنا سیکھتا ہے۔ پھر یہی جھکا ہوا دل کبھی مدح کے الفاظ میں اپنی عقیدت پیش کرتا ہے، کبھی درود و سلام کے پھول نچھاور کرتا ہے اور کبھی اپنی محرومیوں اور امیدوں کو عرض و نیاز کی صورت میں بارگاہِ رسالت میں پیش کر دیتا ہے۔ اسی کیفیت سے نعتیہ شاعری میں استغاثے کی روایت جنم لیتی ہے، وہ روایت جس میں عشاقِ رسول ﷺ اپنی بے بسی اور اپنی امید دونوں ایک ساتھ درِ مصطفیٰ ﷺ پہ پیش کرتا ہے۔ یہاں فریاد بھی ادب کے ساتھ ہوتی ہے اور امید بھی یقین کے ساتھ۔ شاعر کا دل اپنی تمام خطاؤں اور محرومیوں کے باوجود اس اعتماد کے ساتھ اس در کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ یہ درِ کرم سائل کو کبھی مایوس نہیں لوٹاتا۔ یہ استغاثہ محض فریاد نہیں بلکہ محبت کی ایک باوقار صورت ہے جس میں عقیدت کا وقار بھی شامل ہوتا ہے اور امید کی روشنی بھی۔ یہ صرف زبان کی صدا نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی ایک خموش مگر پُر اثر آواز ہے جو عشقِ مصطفی ﷺ اور ایمان کی روشنی کے سنگم سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں عاجزی کی لطافت بھی ہے اور عشق کی حرارت بھی گویا دل کی تمام کیفیات ادب اور محبت کے پیرائے میں جلوہ گر ہو گئی ہوں۔ یہ محض شخصی التجا نہیں بلکہ ایک روحانی مکالمہ ہے جہاں ہر لفظ عاجزی کے ساتھ اٹھتا ہے اور ہر سانس امید کے چراغ کی مانند روشن ہو جاتی ہے۔ دل کی صدا ادب کی چادر اوڑھ کر درِ مصطفی ﷺ کی طرف روانہ ہوتی ہے اور ہر شوق، ہر نازک خواہش کو رحمت کی نرم روشنی میں ڈھال دیتی ہے۔ اس استغاثے میں محبت کی ایک روحانی پناہ گاہ پوشیدہ ہے جہاں عقیدت کی روشنی دل کے روزنوں سے جھلکتی ہے اور امید کی لطیف ہوا روح کو تازگی بخشتی ہے۔

یوں استغاثہ نہ صرف ایک احساس بلکہ ایک تجربہ بھی ہے، ایک ایسا تجربہ جس میں دل، زبان اور روح ایک ساتھ درِ مصطفی ﷺ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور ہر فریاد دعا کی صورت میں محبت، عقیدت اور امید کی روشنی بکھیر دیتی ہے۔ جب شاعر اس درِ کرم کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کے الفاظ میں ایک خاص روحانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دل کی دھڑکنیں بھی ادب کے ساتھ عرض گذار ہوں، آنکھوں کی نمی خموش دعا بن گئی ہو اور ہر سانس محبت کے پیرائے میں درِ مصطفیٰ ﷺ کی طرف سفر کر رہی ہو۔ الفاظ کی دھڑکن دل کی گہرائیوں سے اٹھ کر عقیدت کے نور میں ڈھلنے لگتی ہے اور دل کے تمام احساسات ادب کے سانچے میں سمٹ کر حضور ﷺ کے آستانے پہ حاضر ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہر سوچ، ہر فریاد اور ہر امید ادب کے نرم دامن میں لپٹ کر روح کے دروازے پہ دستک دیتی ہے۔ یہاں تک کہ دل کی خاموشی بھی ایک موزوں نغمہ بن کر درِ مصطفی ﷺ پہ گونجنے لگتی ہے اور دل کی ہر دھڑکن، ہر خواہش اور ہر آرزو محبت کے ساتھ ایک مشترک دعا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

یہ ایک ایسا منظر ہے جہاں لفظوں سے پہلے دل حاضر ہوتا ہے اور ہر خاموش نوا دعا کی طرح دلوں میں اتر جاتی ہے۔ جہاں نگاہیں پہلے سے جھکی ہوتی ہیں اور دل کی ہر دھڑکن دعا کی طرح گونجتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں فریاد کے ہر لہجے سے پہلے روح کی عاجزی اپنا اثر دکھاتی ہے اور ہر جذبہ لفظوں کے بندھن سے آزاد ہو کر محبت کے دروازے پہ دستک دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا در ہے جہاں صدیوں کی امیدیں اور خواہشیں پہلے سے حاضر ہو کر درِ مصطفی ﷺ کی طرف جھکتی ہیں۔ جہاں سکوت بھی آواز بن جاتا ہے اور خاموشی دل کی گہرائیوں میں روشنی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں ہر نظر اور ہر سوچ الفاظ کی ادائیگی سے پہلے عبادت کی کیفیت اختیار کر لیتی ہے اور دل کی پوری دنیا عقیدت، محبت اور امید کی روشنی میں جھلکنے لگتی ہے۔

یوں یہ منظر محض ادبی حسن نہیں بلکہ ایک روحانی تجربہ ہے۔ ایک ایسا عالم جہاں دل کی ہر دھڑکن ادب کے ساتھ عرض گذار ہو رہی ہے اور ہر لفظ، ہر احساس اور ہر نگاہ عشق و ایمان کے ساتھ درِ مصطفی ﷺ پہ حاضر ہو کر دلوں میں روشنی کی کرن بکھیر دیتی ہے۔

اردو نعتیہ شاعری کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ اہلِ محبت نے یہ روایت ہمیشہ ادب، عقیدت اور روحانی شعور کے ساتھ نبھائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نعت کے اشعار میں جب استغاثے کی لہر ابھرتی ہے تو وہ محض ادبی اظہار نہیں رہتی بلکہ دعا، امید اور محبت کا ایک دل آویز

امتزاج بن جاتی ہے۔

یوں نعتیہ شاعری میں استغاثے کی روایت دراصل محبت، عقیدت اور روحانی وابستگی کی اسی طویل تاریخ کا شعری اظہار ہے، ایسی تاریخ جس میں اہلِ دل نے اپنے الفاظ دعا کی صورت میں پیش کیے اور اپنے اشعار کو درِ مصطفیٰ ﷺ کی طرف اٹھے ہوئے ہاتھوں کی طرح مؤدب اور روشن رکھا۔

چنانچہ نعتیہ شاعری میں استغاثے کی روایت کا مطالعہ دراصل اسی روحانی احساس کے مطالعے کا نام ہے جو امت کے دلوں کو درِ مصطفیٰ ﷺ سے وابستہ رکھتا ہے۔ یہی نسبت اس روایت کو محض ایک شعری مضمون نہیں رہنے دیتی بلکہ اسے عشقِ رسول ﷺ کی ایک زندہ اور تابندہ علامت بنا دیتی ہے۔

اردو نعتیہ شاعری کا دامن محض مدح وثنا کے چند رسمی الفاظ تک محدود نہیں بلکہ یہ محبت، عقیدت، نیازمندی اور روحانی وابستگی کی ایک وسیع وعمیق روایت کا امین ہے۔ اس روایت میں جہاں حضور اکرم ﷺ کی شانِ اقدس کے بیان کی رفعتیں جلوہ گر ہیں، وہیں عاشقانہ التجاؤں اور دل گداز فریادوں کی ایک دلکش لہر بھی نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ اسی لہر کو نعتیہ ادب کی اصطلاح میں استغاثہ کہا جاتا ہے۔

استغاثہ دراصل اس دل کی صدا ہے جو اپنی بے بسی، اپنی محرومی اور اپنی خطا کاری کے احساس کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں دستِ سوال دراز کرتا ہے۔ یہ محض شعری صنعت یا فنی مہارت کا اظہار نہیں بلکہ عشقِ رسول ﷺ کے اس سوزِ دروں کا بیان ہے جو صدیوں سے اہلِ محبت کے دلوں میں موجزن رہا ہے۔ نعتیہ شاعری میں استغاثے کی روایت اسی سوزِ محبت کی شعری تعبیر ہے جس میں ایک غلام اپنے آقا ﷺ کے حضور اپنی حاجت، اپنی فریاد اور اپنی امیدیں پیش کرتا ہے۔ درحقیقت استغاثے کی یہ روایت اسلامی عقیدے کے اس بنیادی تصور سے وابستہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین بندے اور امت کے سب سے بڑے شفیع ہیں۔ قرآن کریم نے آپ ﷺ کو رحمۃ للعالمین قرار دیا اور امت کو یہ تعلیم دی کہ جب خطا کا احساس ہو تو بارگاہِ رسالت میں حاضری دے کر مغفرت طلب کی جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو حکم صادر فرماتا ہے۔

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا﴾ (سورۂ نساء: 64)

ترجمہ: اور اگر جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب! تمہارے حضور حاضر ہوں، پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول ان کی شفاعت فرمائے تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں۔

مفسرین کرام کے نزدیک اس آیت کا واضح مفہوم یہ ہے کہ جب بندہ گناہ کرے تو محض استغفار پہ اکتفا نہ کرے بلکہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر معافی طلب کرے۔

مشہور مفسر حضرت علامہ سید نعیم الدین مرادآبادی اپنی تفسیر ''خزائن العرفان'' میں لکھتے ہیں: اس آیت میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ گنہگار حضور سید عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر استغفار کریں اور حضور ﷺ ان کے لیے دعا فرمائیں تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ بارگاہ الٰہی میں رسول اللہ ﷺ کا وسیلہ اور آپ کی شفاعت حاجت روائی کا ذریعہ ہے۔ سید عالم ﷺ کی وفات شریف کے بعد ایک اعرابی روضۂ اقدس پہ حاضر ہوا اور روضہ شریف کی خاک پاک اپنے سر پر ڈالی اور عرض کرنے لگا: یا رسول اللہ ﷺ! جو آپ نے فرمایا ہم نے سنا اور جو آپ پر نازل ہوا اس میں یہ آیت بھی ہے ''و لو انھم إذا ظلموا'' میں نے بیشک اپنی جان پر ظلم کیا اور میں آپ کے حضور میں اللہ سے اپنی بخشش چاہنے حاضر ہوا تو میرے رب سے میرے گناہوں کی بخشش کرائیے، اس پر قبر شریف سے ندا آئی کہ تیری بخشش کی گئی۔ اس کے بعد وہ مزید رقم طراز ہیں: اس سے چند مسائل معلوم ہوئے۔ مسئلہ: اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض حاجت کے لیے اس کے مقبولوں کو وسیلہ بنانا ذریعۂ کامیابی ہے۔ مسئلہ: قبر پر حاجت کے لیے جانا بھی ''جاوک'' میں داخل ہے اور خیر القرون کا معمول ہے۔ مسئلہ: بعد وفات مقبولان کو ''یا'' کے ساتھ ندا کرنا جائز ہے۔ مسئلہ: مقبولان

حق مدد فرماتے ہیں اور ان کی دعا سے حاجت روائی ہوتی ہے۔

مشہور مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی احمد یار خان نعیمی اپنی تفسیر ''نور العرفان'' میں فرماتے ہیں: ''اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کی تاثیر بیان کی گئی ہے۔''

صرف استغفار ہی کافی نہیں بلکہ رسولِ کریم ﷺ کی دعا اور سفارش بندے کے لیے قبولیت کا ذریعہ بنتی ہے۔اسی لیے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین حضور ﷺ کے پاس آکر استغفار کرواتے تھے۔اہلِ سنّت کے نزدیک یہ حکم حیاتِ ظاہری تک محدود نہیں بلکہ بعدِ وصال بھی جاری ہے۔امام اہلِ سنّت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی فرماتے ہیں کہ: اس آیت میں مطلق حکم ہے، اس میں حیات و وصال کی کوئی قید نہیں۔لہٰذا حضور ﷺ کے وصال کے بعد بھی روضۂ اقدس پہ حاضر ہو کر استغفار اور عرضِ حاجت کرنا اسی آیت کے تحت داخل ہے۔اسی مفہوم کو بہت سے مفسرین نے بیان کیا ہے اور قبرِ انور پہ حاضری اور استغاثے کو اس آیت کا مصداق قرار دیا ہے۔حضرت امام مالک کا مشہور واقعہ ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک شخص نے روضۂ رسول ﷺ پہ حاضر ہو کر یہی آیت پڑھی اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! میں نے اپنی جان پہ ظلم کیا، آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔ یہ واقعہ متعدد تفاسیر اور کتب میں نقل ہوا ہے اور اہلِ سنّت کے نزدیک توسل و استغاثے کی مشروعیت کی دلیل ہے۔

اس آیت سے چند بنیادی عقائد واضح ہوتے ہیں: گناہ کے بعد رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہونا مشروع ہے۔

حضور ﷺ کی دعا اور شفاعت بندے کے لیے قبولیت کا ذریعہ بنتی ہے۔حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے دربار میں وسیلۂ رحمت ہیں۔یہ حکم بعدِ وصال بھی جاری ہے۔اسی لیے علمائے اہلِ سنّت اس آیت کو توسل و استغاثہ اور شفاعتِ مصطفیٰ ﷺ کی نہایت روشن دلیل قرار دیتے ہیں۔اگر اس موضوع کو مزید علمی وسعت کے ساتھ دیکھا جائے تو اس آیت پہ تفسیر روح المعانی، تفسیر قرطبی، تفسیر کبیر میں بھی نہایت مفصل مباحث ملتے ہیں، جن میں ائمۂ تفسیر نے بارگاہِ رسالت ﷺ کی طرف رجوع کو بندگانِ خدا کے لیے عظیم وسیلہ قرار دیا ہے۔یہی عقیدہ جب دل کی دنیا میں شعر کا جامہ پہنتا ہے تو نعتیہ شاعری میں استغاثے کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔اردو نعتیہ شاعری کی تاریخ پہ نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے اس میں استغاثے کی ایک پُر تاثیر پاکیزہ روایت موجود رہی ہے۔قدیم شعرا نے مدحِ مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ ساتھ اپنی حاجات اور فریادیں بھی نہایت عقیدت اور ادب کے ساتھ پیش کی ہیں۔ان کے اشعار میں حضور ﷺ کی بارگاہ کو امید و رحمت کا مرکز تصور کیا گیا اور شاعر اپنے دل کی بے قراری اسی درِ کرم پہ لے جا کر سکون حاصل کرتا ہے۔

اگر اس روایت کو وسعت و گہرائی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس میں تین نمایاں رنگ نظر آتے ہیں۔

پہلا رنگ: انکسار و نیاز مندی

اس رنگ میں شاعر اپنی خطاؤں کا اعتراف کرتے ہوئے آقائے نامدار محمد عربی ﷺ کے حضور دست بستہ کھڑا نظر آتا ہے۔اس کی زبان پہ عجز کے الفاظ ہوتے ہیں اور دل میں امید کی روشنی موجزن رہتی ہے۔ہر فریاد ایک عاجزانہ دعا کی مانند محسوس ہوتی ہے اور ہر التجا دل کی گہرائیوں سے اُبھرتی ہوئی روشنی کی طرح جلوہ گر ہوتی ہے۔

نگاہیں سکوت کے ساتھ ادب کی چوکھٹ پہ جھکی ہوئی ہوتی ہیں اور ہر سانس عشق و امید کے چراغ کی مانند روشن رہتی ہے۔دل کی نرم کیفیت ہر لفظ کے ساتھ ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے، گویا ہر حرف عجز اور محبت کا استعارہ بن جاتا ہے۔جھکی ہوئی پیشانی عقیدت کے وقار سے منور ہوتی ہے اور ہر التجا رحمت کی کرن کے استقبال میں آمادہ دکھائی دیتی ہے۔زبان پہ عاجزی کے الفاظ ہوتے ہیں مگر دل کی گہرائیوں میں یقین و امید کی تابناک روشنی موجزن رہتی ہے۔شاعر کی ہر فریاد صدیوں کی محبت کا مجموعہ محسوس ہوتی ہے جو درِ مصطفیٰ ﷺ پہ پہنچ کر روح کو سکون عطا کرتی ہے۔ہر التجا میں نرمی اور حسن کی ایک خاص کیفیت موجود ہوتی ہے اور دل کی دھڑکنیں ادب و محبت کے پیرائے میں خود بخود دعا کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔گویا دل کے تمام احساسات، خواہشات اور شوق ادب کے نرم دامن میں لپٹ کر عشقِ مصطفی ﷺ کی تابنا کی کے ساتھ درِ کریم کی طرف بلند ہو جاتے ہیں۔یہی کیفیت استغاثے کی حقیقی

روح ہے، عجز، محبت، عقیدت اور امید کا حسین امتزاج جو عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل کو ہمیشہ روشن رکھتا ہے۔

دوسرا رنگ: امید و توسل

اس مرحلے میں شاعر اپنے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے در کا گدا قرار دے کر اسی نسبت کو اپنی نجات کا وسیلہ سمجھتا ہے۔ اس کے اشعار میں یقین کی وہ روشنی ہوتی ہے جو عاشق کو مایوسی کے اندھیروں سے نکال کر امید کے چراغ تک پہنچا دیتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاعر اپنی عاجزی کو درِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چوکھٹ پہ رکھ کر رحمت کی بارش میں بھیگنے کا سہارا پاتا ہے۔ ہر لفظ التجا کا حامل ہوتا ہے اور ہر سانس یقین کی روشنی میں منور و تابناک ہو کر دل کو سکون عطا کرتا ہے۔ شاعر اپنی کمزوریوں اور خطاؤں کو اسی در کے سامنے رکھ کر امید کے چراغ سے روشنی حاصل کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کا دل خود ایک لطیف دعا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے اشعار میں عاجزی اور یقین کا حسین امتزاج ہوتا ہے جو مایوسی کی تاریکیوں میں بھی امید کی کرن روشن کر دیتا ہے۔ شاعر خود کو اپنے آقا کے در کا گدا تصور کرتا ہے مگر اسی کے ساتھ دل میں اعتماد اور عشق کی طاقت بھی موجزن رہتی ہے۔ یہاں ہر التجا اور ہر عاجزانہ عرض گویا درِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں ڈوب کر روح کو تازگی بخشتی ہے۔ شاعر کے دل کی یہ کیفیت امید، توکل اور عشق کی ایک ایسی مثلث قائم کر دیتی ہے جو ہر عاشق کے دل کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔

تیسرا رنگ: عشق و وارفتگی

اس مرحلے میں استغاثہ محض فریاد نہیں رہتا بلکہ محبت کا ایک والہانہ اظہار بن جاتا ہے۔ شاعر کو یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کا تعلق اس در سے ہے جہاں سے کوئی سائل خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔ یہاں ہر لفظ، ہر التجا اور ہر فریاد دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی روشنی اور روح کی مکمل وارفتگی کی ترجمانی کرتی ہے۔ شاعر اپنی کمزوریوں، خطاؤں اور خواہشات کے ساتھ اس در کے سامنے حاضر ہوتا ہے اور یقین کے ساتھ جانتا ہے کہ یہ درِ محبت، رحمت اور کرم کا سرچشمہ ہے۔ استغاثہ اس مرحلے پہ محض ضرورت یا التجا نہیں رہتا بلکہ ایک والہانہ تعلق اور مکمل وارفتگی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ دل کی ہر دھڑکن گویا ادب کے ساتھ عرض گذار ہو رہی ہوتی ہے اور روح کی ہر لہر محبت کے ساتھ درِ کرم کی طرف متوجہ دکھائی دیتی ہے۔ یہاں فریاد بھی ہے اور سکوت بھی، عاجزی بھی ہے اور یقین بھی، یہ تمام عناصر عشق و وارفتگی کے حسین امتزاج میں ڈھل جاتے ہیں۔

شاعر کے لیے یہ مرحلہ اس قدر روحانی اور جذباتی ہوتا ہے کہ ہر لفظ، ہر احساس اور ہر سوچ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قربت کے تجربے میں ڈوب کر ایک دعا، ایک عرض اور ایک عاجزانہ سلام بن جاتی ہے۔ اردو نعتیہ ادب میں جب استغاثے کی اس روایت کا ذکر آتا ہے تو کئی بلند آہنگ نام ذہن میں ابھرتے ہیں۔ کلاسیکی شعرا سے لے کر جدید نعت گو شعرا تک اس اسلوب نے ایک مستقل ادبی اور روحانی روایت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ کہیں یہ عاجزی کے پیرائے میں جلوہ گر ہے، کہیں شفاعت کی امید کے ساتھ اور کہیں عشق کی بے ساختہ وارفتگی کے طور پہ۔ خاص طور پہ برصغیر کی نعتیہ شاعری میں اس روایت کو غیر معمولی فروغ ملا۔ یہاں کے شعرا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی نسبت کو محض ایک عقیدے کے طور پہ نہیں بلکہ ایک زندہ روحانی تعلق کے طور پہ محسوس کیا۔ اسی لیے ان کے کلام میں استغاثہ محض التجا نہیں بلکہ ایک روحانی مکالمہ بن جاتا ہے، ایسا مکالمہ جس میں ایک غلام اپنی محرومیوں کا ذکر بھی کرتا ہے اور اپنے آقا کی رحمتوں کا یقین بھی دہراتا ہے۔

یہ حقیقت بھی قابلِ توجہ ہے کہ نعتیہ شاعری میں استغاثے کی روایت ہمیشہ ادب و تعظیم کے دائرے میں رہی ہے۔ عاشق کی زبان پہ فریاد ضرور ہوتی ہے مگر لہجہ ہمیشہ مؤدب رہتا ہے۔ یہی وہ باریک نکتہ ہے جس نے اس روایت کو محض جذباتی اظہار کی بجائے ایک باوقار ادبی و روحانی اسلوب بنا دیا ہے۔ اگر نعتیہ ادب کے وسیع منظرنامے پہ نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ استغاثہ دراصل اس صنف کی روحانی گہرائی کا ایک اہم مظہر ہے۔ مدح کے بلند آہنگ جملوں کے ساتھ جب عاجزی کی نرم لہریں شامل ہو جاتی ہیں تو نعت کا اسلوب اور بھی دل آویز ہو جاتا ہے۔ اس میں محبت بھی ہوتی ہے، عقیدہ بھی اور بندگی کا احساس بھی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ نعتیہ شاعری میں استغاثے کی

روایت صرف شعری روایت نہیں بلکہ عشقِ رسول ﷺ کی ایک زندہ علامت ہے۔ یہ اس دل کی آواز ہے جو اپنی تمام محرومیوں کے باوجود اس یقین کے ساتھ بارگاہِ رسالت کی طرف متوجہ رہتا ہے کہ یہاں رحمت کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ اسی یقین اور اسی محبت نے اردو نعتیہ شاعری کو وہ روحانی حرارت عطا کی ہے جس کے باعث اس کے اشعار محض الفاظ نہیں رہتے بلکہ دعا کی طرح دلوں میں اترتے اور عقیدت کی طرح روحوں میں بس جاتے ہیں۔

نعتیہ شاعری میں استغاثے کا تاریخی ارتقا

برصغیر کی نعتیہ شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ یہاں استغاثے کی روایت محض ایک شعری اسلوب کے طور پہ سامنے نہیں آئی بلکہ ایک زندہ روحانی احساس کے طور پہ پروان چڑھی۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں شاعر اپنے دل کے تمام احساسات وجذبات بارگاہِ رسالت میں عرض کر دیتا ہے، محبت، عاجزی، یقین اور امید، سب ایک ساتھ حضور سرورِ کائنات محمد مصطفی ﷺ کی بارگاہ میں پیش کرتا ہے۔ اس فضا میں ہر لفظ، ہر فریاد اور ہر التجا محض ادبی اظہار نہیں رہتی بلکہ قلب وروح کی ایک عاجزانہ مگر پُر اثر صدا بن جاتی ہے۔ یہ روایت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ برصغیر کے اہلِ محبت نے نعتیہ شاعری کو صرف لفظوں کا کھیل یا فن کی مشق نہیں بنایا بلکہ اسے عشقِ رسول ﷺ کی تابناکی، روحانی وارفتگی اور عقیدت کی عملی ترجمانی کے طور پہ اختیار کیا۔ شاعر یہاں اپنی تمام کمزوریوں، خطاؤں اور مایوسیوں کے ساتھ درِ مصطفی ﷺ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس یقین کے ساتھ کہ یہ آستانہ ہر عاجز، ہر سائل اور ہر عاشق کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا ہے، اپنا استغاثہ محبت، امید اور وارفتگی کے بلند ترین احساس کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

یہاں ہر شعر اور ہر استعاراتی اظہار گویا دل کی دھڑکنوں اور روح کی سرگوشیوں کا مجموعہ ہوتا ہے جو درِ مصطفیٰ ﷺ کی عظمت، کرم اور رحمت کے تجربے کو شاعرانہ رنگ میں ڈھال دیتا ہے۔ اس روایت میں نہ صرف ادب اور شاعری کی دلکشی موجود ہے بلکہ ایک زندہ روحانی احساس بھی پوشیدہ ہے جو نسل در نسل جاری رہ کر ہر عاشق کو اس در کی طرف کھینچتا رہا ہے۔ یوں برصغیر کی نعتیہ شاعری میں استغاثہ محض ایک شعری موضوع نہیں بلکہ ایک روحانی تجربہ، ایک محبت بھرا تعلق اور ایمان کی ایک تابناک کرن بن کر جلوہ گر ہوتا ہے جو دلوں کو امید، روحوں کو سکون اور ہر فریاد کو دعا کی روشنی عطا کرتا ہے۔ اس خطے کے شعرا نے حضور اکرم ﷺ سے اپنی نسبت کو عقیدے، محبت اور توسل کے ایک ایسے رشتے میں ڈھالا جس نے نعتیہ شاعری کو ایک خاص روحانی رنگ عطا کیا۔ اسی لیے برصغیر کی نعت میں مدح کے ساتھ ساتھ استغاثہ، توسل اور عرضِ نیاز کی کیفیات بھی کثرت سے دکھائی دیتی ہیں۔ اگر اس روایت کے تاریخی ارتقا پہ نظر ڈالی جائے تو انیسویں صدی اور اس کے بعد کا دور اس اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس عہد میں نعتیہ شاعری نے ایک طرف فنی پختگی حاصل کی اور دوسری جانب عقیدے اور محبت کے اظہار میں بھی نئی وسعت پیدا ہوئی۔ اسی عہد میں ایسے شعرا سامنے آئے جنہوں نے استغاثے کے مضمون کو نہایت مؤدب، باوقار اور پُراثر انداز میں اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔

اس سلسلے میں سب سے نمایاں اور درخشاں نام اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ہے۔ آپ کی نعتیہ شاعری میں استغاثہ محض ایک ادبی صنعت نہیں بلکہ ایک راسخ عقیدے اور والہانہ محبت کی شعری صورت کے طور پہ جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہاں الفاظ محض فنی اظہار نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والا وہ احساس ہیں جو عقیدت اور محبت کے حسین امتزاج سے روشن ہو جاتا ہے۔ آپ کے کلام میں ہر شعر اور ہر التجا گویا دل کی دھڑکنوں، روح کی سرگوشیوں اور ایمان کی روشنی کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔ فریاد یہاں دعا کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور شاعر کی عاجزانہ عرض ایک زندہ روحانی تجربے میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ محض استعارات یا تشبیہات کا استعمال نہیں بلکہ ایک ایسا تعلق ہے جو شاعر کے دل کو حضور ﷺ کی قربت کے احساس سے ہم رشتہ کر دیتا ہے۔

استغاثہ نعتیہ شاعری میں اس قدر باوقار اور گہرا ہو جاتا ہے کہ شاعر کی ذات، دل اور روح کے تمام گوشے عشق و ادب کے پیرائے

میں ایک ساتھ درِ مصطفی ﷺ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ہر فریاد، ہر التجا اور ہر لفظ اپنی جگہ ایک دعا، ایک عرض اور ایک عاجزانہ سلام کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ آپ کے اشعار میں بارگاہِ رسالت میں فریاد بھی ہے، امید بھی اور اس یقین کی روشنی بھی کہ حضور اکرم ﷺ امت کے سب سے بڑے شفیع اور مددگار ہیں۔ اسی لیے آپ کے کلام میں استغاثہ کبھی عاجزی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی توسل وشفاعت کے پیرائے میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

یہ کیفیت شاعر کے دل، روح اور زبان کو ایک ساتھ درِ رحمت کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اور ہر التجا ایک والہانہ عشق اور یقین کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بعض مقامات پہ آپ کے اشعار میں استغاثہ خوف و عجز کے رنگ میں نظر آتا ہے اور بعض جگہ امید، توکل اور شفاعت کے نور میں روشن دکھائی دیتا ہے۔ یہی جمال استغاثہ کی وہ روحانی گہرائی ہے جو برصغیر کی نعتیہ شاعری کو محض ادبی اظہار نہیں بلکہ عشق و ایمان سے معمور ایک زندہ تجربہ بنا دیتی ہے۔ اسی اسلوب نے بعد کی نعتیہ روایت پہ بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔

اسی طرح اردو کے معروف نعت گو شاعر محسن کاکوروی کا نام بھی اس روایت کے اہم معماروں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں عشقِ رسول ﷺ کی لطافت اور عقیدت کی شیرینی کے ساتھ عرضِ نیاز کی ایک دل نشیں کیفیت بھی موجود ہے۔ ان کے کلام میں درِ مصطفیٰ ﷺ کو امید و کرم کا مرکز سمجھ کر فریاد پیش کرنے کا انداز نہایت دلکش اور مؤدبانہ ہے۔ بعد کے شعرا میں بھی اس روایت کی جھلک نمایاں طور پہ نظر آتی ہے۔ متعدد نعت گو شعرا نے اپنے اشعار میں بارگاہِ رسالت سے مدد اور شفاعت کی امید نہایت لطیف اور باوقار انداز میں بیان کی۔ اس طرح استغاثہ برصغیر کی نعتیہ شاعری کا ایک مستقل اور معروف موضوع بن گیا۔ البتہ اس روایت کے ساتھ ایک فکری اور اعتقادی بحث بھی ہمیشہ جاری رہی ہے۔ برصغیر کے علمی ماحول میں استغاثے کے مسئلے پہ عمومی طور پہ دو بڑے طبقات سامنے آتے ہیں۔ یہاں ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ نعتیہ شاعری میں استغاثے کی یہ روایت صرف ادبی یا جذباتی اظہار تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کے ساتھ ایک فکری اور اعتقادی بحث بھی صدیوں سے جاری رہی ہے۔ برصغیر کی علمی روایت میں اہلِ علم نے اس مسئلے کو مختلف زاویوں سے دیکھا، اس کی شرعی حدود متعین کرنے کی کوشش کی اور کتاب وسنت، آثارِ صحابہ اور اقوالِ اکابر کی روشنی میں اس کے مفاہیم واضح فرمائے۔ چنانچہ جب استغاثہ کو صرف شعری روایت یا جذباتی اظہار کی بجائے ایک علمی مسئلہ سمجھ کر دیکھا جاتا ہے تو اس کے پس منظر میں ایک وسیع تاریخی اور فقہی مباحثہ بھی سامنے آتا ہے۔ اس پہلو کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ استغاثہ اور ندا کے مسئلے کا ایک مختصر علمی جائزہ بھی پیش کیا جائے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ امت کے اکابرین نے اس مسئلے کو کن اصولوں اور حدود کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اس مقصد کے پیش نظر ذیل میں استغاثہ وندا کے مسئلے کا ایک علمی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے جس میں مختصر تاریخی شواہد، اکابرینِ امت کی تصریحات اور فقہی اصولوں کی روشنی میں اس مسئلے کی وضاحت کی گئی ہے۔ اسلام کی فکری اور روحانی روایت میں بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جو محض فقہی بحث تک محدود نہیں رہتے بلکہ دلوں کی کیفیت، عقیدے کی نزاکت اور محبت کے جذبے سے بھی گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ استغاثہ اور ندا کا مسئلہ بھی انہی مباحث میں سے ہے۔ اس موضوع پہ صدیوں سے اہلِ علم نے گفتگو کی، دلائل پیش کیے، تشریحات بیان کیں اور اپنے اپنے فہم کے مطابق اس کی حدود متعین کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان تمام علمی مباحث کے پس منظر میں ایک حقیقت ہمیشہ روشن رہی کہ مسلمانوں کے دل میں حضور اقدس ﷺ کی محبت وہ مرکزی چراغ ہے جس کی روشنی میں اس کے عقیدے کی راہیں بھی روشن ہوتی ہیں اور اس کے احساسات کی سمت بھی متعین ہوتی ہے۔

اسلامی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے روحانی نسبت اور آپ کی بارگاہ میں عرضِ حال پیش کرنا امت کے دلوں کی ایک قدیم کیفیت رہی ہے۔ کبھی یہ کیفیت دعا کے انداز میں ظاہر ہوئی، کبھی مناجات اور اشعار کی صورت میں اور کبھی میدانِ عمل میں ایک پکار بن کر ابھری۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے لے کر اولیاء وصلحاء تک اس نسبت کے مختلف مظاہر تاریخ کے اوراق

میں محفوظ ہیں۔تاہم بعد کے ادوار میں جب فقہی تعبیرات اور اعتقادی توضیحات کا دائرہ وسیع ہوا تو اس مسئلے کے گرد علمی اختلافات بھی پیدا ہوئے۔بعض اہلِ علم نے اس کے بعض پہلوؤں کو محدود کرنے کی کوشش کی اور بعض نے اس کی روحانی جہت نمایاں رکھی۔یہی اختلاف جب اعتدال کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے تو امت کے درمیان الجھن اور انتشار کا سبب بن جاتا ہے، حالانکہ اکابرینِ امت کی تصریحات یہ حقیقت واضح کرتی ہیں کہ اصل مدار اعتقادِ استقلال یا عدمِ استقلال پہ ہے، نہ کہ محض الفاظ یا اظہار کے انداز پہ۔اسی پس منظر میں ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مسئلے کو تعصب کی عینک سے نہیں بلکہ تاریخ، نصوص اور اکابر کے اقوال کی روشنی میں دیکھا جائے۔جب صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے آثار، اولیائے امت کی مناجات اور مختلف مکاتبِ فکر کے اکابرین کی تصریحات کو یکجا سامنے رکھا جاتا ہے تو ایک ایسا متوازن نقشہ ابھرتا ہے جو افراط وتفریط دونوں سے پاک ہوتا ہے۔

زیرِ نظر تحریر میں اسی زاویۂ نظر سے استغاثہ وندا کے مسئلے کا جائزہ لیا جارہا ہے۔تاریخی شواہد، اکابرین کی عبارات اور ان کے بیانات کی روشنی میں۔تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اس باب میں اصل حقیقت کیا ہے اور کن بنیادوں پہ بعض اوقات اختلاف غیر ضروری نزاع کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔اس کا مقصد مناظرانہ بحث نہیں بلکہ اس علمی مسئلے کو اس وقار اور توازن کے ساتھ سمجھنا ہے جس کا تقاضا ہماری دینی روایت اور محبتِ رسول ﷺ کا ادب کرتا ہے۔اسلامی عقیدہ و روحانیت کی تاریخ میں استغاثہ اور ندا کا مسئلہ محض ایک فقہی جزئیہ نہیں بلکہ عشقِ رسالت ﷺ، روحانی تعلق اور توسل وشفاعت کے باب سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔جب اس موضوع کو تاریخی شواہد، اکابر کے اقوال اور فقہی تصریحات کی روشنی میں دیکھا جائے تو ایک متوازن حقیقت سامنے آتی ہے جو افراط وتفریط دونوں سے بلند تر دکھائی دیتی ہے۔

اہلِ سنّت کی علمی روایت ہمیشہ اس اصول پہ قائم رہی ہے کہ کسی مسئلے کو سمجھنے کے لیے کتاب، سنت، آثارِ صحابہ اور اقوالِ اکابر کو یکجا دیکھا جائے۔یہی طرزِ تحقیق اس مسئلے میں بھی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

تاریخِ اسلام میں ایک نہایت معروف روایت وہ ہے جو حضرت سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر صحابۂ کرام کے حوالے سے منقول ہے۔مشہور مورخ ابن کثیر لکھتے ہیں: ''**كان شعارهم يومئذ يا محمداه**'' یعنی اس دن مسلمانوں کا شعار اور نعرہ ''**یا محمداہ**'' تھا۔(البدایہ والنہایہ، امام ابن کثیر، دار الفکر بیروت، جلد 6، صفحہ 324)

یہ روایت اس بات کی تاریخی شہادت ہے کہ میدانِ جہاد میں مسلمانوں نے حضور اکرم ﷺ کو ندا دی۔اہلِ علم اس کی تشریح میں واضح کرتے ہیں کہ یہ ندا محبت، استمداد اور روحانی نسبت کے اظہار کے طور پہ تھی، نہ کہ استقلالِ قدرت کے عقیدے کے ساتھ۔اور بھی متعدد مواقع پہ اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے استغاثے کی روایت تاریخ کے حافظے میں نقش ہیں۔

صوفیانہ ادب اور اولیائے کرام کی مناجات میں حضور اکرم ﷺ سے عرضِ حال اور استمداد کا انداز صدیوں سے موجود رہا ہے۔مثال کے طور پہ محبوب سبحانی سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منسوب یہ اشعار:

یارسول الله انظر حالنا
یاحبیب الله اسمع قالنا
إننی فی بحر همٍ مغرقٌ
خذ یدی سهّل لنا إشكالنا

یہ اشعار اس روحانی نسبت کا اظہار ہیں جس میں بندہ اللہ تعالیٰ کے حبیب ﷺ کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ ہی سے مدد چاہتا ہے۔اسی مسئلے کے بارے میں مولانا رشید احمد گنگوہی سے سوال کیا گیا تو انہوں نے لکھا: ''ایسے کلمات کو نظم ہوں یا نثر ورد کرنا مکروہ تنزیہی ہے، کفر و فسق نہیں۔'' (فتاویٰ رشیدیہ، کامل مبوب صفحہ 68 مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز، کراچی)

اسی مقام پہ وہ مزید وضاحت کرتے ہیں:

''یہ خود آپ کو معلوم ہے کہ نداء غیر اللہ تعالیٰ کو کرنا دور سے شرک حقیقی جب ہوتا ہے کہ ان کو عالم سامع مستقل اعتقاد کرے ورنہ شرک نہیں مثلاً یہ جانے کہ حق تعالیٰ ان کو مطلع فرمادیوے گا یا باذنہ تعالیٰ انکشاف ان کو ہوجاوے گا یا باذنہ تعالیٰ ملائکہ پہنچادیویں گے جیسا درود

کی نسبت وارد ہے یا محض شوقیہ کہتا ہو محبت میں یا عرض حال محل تحسر و حرمان میں کہ ایسے مواقع میں اگر چہ کلمات خطاب بولتے ہیں لیکن ہرگز نہ مقصود اسماع ہوتا ہے نہ عقیدہ پس انہی اقسام سے کلمات مناجات و اشعار بزرگان کے ہوتے ہیں کہ فی حد ذاتہ نہ شرک نہ معصیت'' (فتاویٰ رشیدیہ کامل مبوب صفحہ ٦٨ مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی)

یہ عبارت واضح کرتی ہے کہ اگر استقلال کا عقیدہ نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی عطا و اذن کا اعتقاد ہو تو ایسے کلمات شرک قرار نہیں دیے جا سکتے۔

اسی مفہوم کو مولانا اشرف علی تھانوی نے مزید صراحت کے ساتھ بیان کیا: ''جو استعانت واستمداد باعتقاد علم وقدرت مستقل ہو (یعنی کسی نے اس کو نہ دیے اور نہ کسی کا محتاج ہے) وہ شرک ہے اور جو باعتقاد علم و قدرت غیر مستقل ہو (یعنی اللہ نے انہیں دی اور اللہ ہی کے محتاج ہیں) اور وہ علم وقدرت کسی دلیل سے ثابت ہو جائے تو جائز ہے خواہ مستمد منہ (جس سے مدد طلب کی جا رہی ہے) حی (زندہ) ہو یا میت (مردہ)۔ (امداد الفتاویٰ، کتاب العقائد جلد 2، صفحہ 99)

یہ عبارت اس بحث کا بنیادی اصول بیان کرتی ہے کہ اصل مسئلہ استقلال و عدمِ استقلال کے اعتقاد کا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اسی مفہوم کا اظہار خود مولانا اشرف علی تھانوی کے اشعار میں بھی ملتا ہے:

یا شفیع العباد خذ بیدی
دستگیری کیجیے میری نبی
انت فی الاضطرار معتمدی
کشمکش میں تم ہی ہو میرے ولی
لیس لی ملجاء سواک اغث
جز تمہارے ہے کہاں میری پناہ
مسنی الضر سیدی سندی
فوج کلفت مجھ پہ آ غالب ہوئی
غشنی الدہر ابن عبد اللہ
ابن عبد اللہ زمانہ ہے خلاف
کن مغیثا فانت لی مدری
اے مرے مولا خبر لیجے مری
نام احمد چوں حصینے شد حصین
پس چہ باشد ذات آن روح الامین
کچھ عمل ہی اور نہ اطاعت میرے پاس
ہے مگر دل میں محبت آپ کی
میں ہوں بس اور آپ کا در یا رسول
ابر غم گھیرے نہ پھر مجھ کو کبھی
خواب میں چہرہ دکھا دیجے مجھے
اور مرے عیبوں کو کر دیجے خفی
در گذر کرنا خطا و عیب سے
سب سے بڑھ کر ہے یہ خصلت آپ کی
سب خلایق کے لیے رحمت ہیں آپ
خاص کر جو ہیں گنہ گار و غوی
کاش ہو جاتا مدینہ کی میں خاک
نعل بوسی ہوتی کافی آپ کی
آپ پر ہوں رحمتیں بے انتہا
حضرت حق کی طرف سے دائمی
جس قدر دنیا میں ہے ریت اور سانس
اور بھی ہے جس قدر روئیدگی
اور تمہاری آل پر اصحاب پر
تا بقائے عمر دار اخروی

دیوبندی اکابر کے مرشد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس مسئلے میں ایک اہم اصول بیان کرتے ہیں: ''الصلاۃ والسلام علیک یا رسول اللہ پڑھنے کے جواز میں کوئی شک نہیں، کیونکہ عالمِ امر مقید نہیں اور دور و نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔'' (امداد المشتاق، صفحہ 60)

یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عالمِ ارواح اور عالمِ امر کی حقیقتیں مادی فاصلے کی پابند نہیں ہوتیں۔ بعد کے شعرا میں بھی اس روایت کی جھلک نمایاں طور پہ نظر آتی ہے اور بہت سے نعت گو شعرانے بارگاہِ رسالت سے مدد اور شفاعت کی امید نہایت لطیف اور

مؤدبانہ انداز میں بیان کی۔اس کی ایک معروف مثال اردو کے ممتاز شاعر الطاف حسین حالی کی وہ مشہور نعت ہے جس کا مطلع زبان زدِ خاص وعام ہے:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

یہ نظم دراصل ایک اجتماعی فریاد کی صورت رکھتی ہے جس میں شاعر پوری امت کی طرف سے بارگاہِ رسالت میں عرض گذار ہوتا ہے۔یوں برصغیر کی نعتیہ روایت میں استغاثے کا مضمون نہ صرف ایک ادبی حقیقت ہے بلکہ ایک فکری و اعتقادی بحث کا مرکز بھی رہا ہے۔ جب یہ تمام اقوال وروایات یکجا دیکھی جائیں تو ایک اہم سوال سامنے آتا ہے: اگر اکابرین خود اس ندا کو شرک نہیں کہتے اور استقلال کے بغیر استمداد کو جائز قرار دیتے ہیں تو پھر یہی کلمات جب عام مسلمان کی زبان پہ آتے ہیں تو ان پہ شرک کے فتوے کیوں صادر کیے جاتے ہیں؟

علمی انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ اس مسئلے میں چند اصول ملحوظ رکھے جائیں: مددِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔انبیائے کرام علی نبینا علیہم الصلوٰۃ والسلام واولیائے عظام رحمہم اللہ تعالیٰ سے مدد باذنِ الٰہی اور بطور وسیلہ سمجھی جائے۔استقلال کا عقیدہ ہو تو شرک ہے، ورنہ نہیں۔

محبت اور عرضِ حال کے اشعار کو شرک قرار دینا درست نہیں۔

استغاثہ و ندا کا مسئلہ دراصل عقیدۂ توحید اور محبتِ رسالت ﷺ کے امتزاج کا مسئلہ ہے۔ تاریخِ اسلام، اقوالِ صحابہ اور اکابرینِ امت کی تصریحات یہ حقیقت واضح کرتی ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی عطا اور اذن کا اعتقاد موجود ہو تو یہ عمل شرک نہیں بلکہ روحانی تعلق اور توسل کی ایک صورت ہے۔لہٰذا امت کے لیے زیادہ مناسب یہی ہے کہ وہ اس اختلاف کو علمی دائرے میں رکھے اور تکفیر و تفسیق کے دروازے کھول کر امت کے اندر مزید انتشار پیدا نہ کرے۔

محبتِ رسول ﷺ وہ مرکز ہے جس پہ پوری امت کا دل دھڑکتا ہے۔ یہی وہ محور ہے جس کے گرد ایمان کی تمام کیفیات طواف کرتی ہیں، اسی کی روشنی میں عقیدے کی راہیں بھی منور رہتی ہیں اور عمل کی منزلیں بھی واضح ہوتی ہیں، یہ محبت محض ایک جذباتی وابستگی کا نام نہیں بلکہ ایک زندہ اور بیدار حقیقت ہے، یہی وہ نسبت ہے جو دلوں کو ادب سکھاتی ہے، زبانوں کو درود و سلام کی خوشبو سے معطر کرتی ہے اور نگاہوں کو اسوۂ مصطفوی ﷺ کی روشنی میں راستہ دکھاتی ہے۔ چنانچہ جب ایک امتی حضور اکرم ﷺ کا نام سنتا ہے تو اس کے دل میں احترام کی ایک لطیف لہر اٹھتی ہے اور اس کی زبان بے اختیار درود وسلام سے تر ہو جاتی ہے۔درحقیقت یہی وہ روحانی رشتہ ہے جس نے صدیوں سے امت کے بکھرے ہوئے قلوب کو ایک لڑی میں پرو رکھا ہے۔ رنگ، نسل، زبان اور علاقوں کے تمام امتیازات اس دربارِ محبت میں آ کر مٹ جاتے ہیں اور ہر دل ایک ہی صدا کے ساتھ دھڑکتا ہے کہ ہم سب محمد مصطفیٰ ﷺ کے امتی اور ان کے غلام ہیں۔

اسی نسبتِ محبت نے علم کو وقار دیا، عبادت کو اخلاص بخشا اور تہذیب کو وہ لطافت عطا کی جس سے اسلامی تمدن کی شناخت بنی۔اسی نے فکر کو شائستگی، کردار کو پاکیزگی اور معاشرت کو رحمت و مروّت کی خوشبو سے آراستہ کیا۔اس کے زیرِ سایہ دلوں میں ادبِ رسالت کی وہ کیفیت پیدا ہوئی جس نے زبانوں کو درود وسلام کا عادی بنا دیا اور نگاہوں کو سنتِ مصطفیٰ ﷺ کی پیروی کا خوگر کر دیا، یہی وہ جذبہ ہے جس نے علم کو محض معلومات کا ذخیرہ بننے سے بچا کر اسے حکمت کا وقار عطا کیا، عبادات کو رسم ورواج کے دائرے سے نکال کر انہیں اخلاص و حضوری کی لذت بخشی اور تہذیب کو ایسی روحانی لطافت سے آراستہ کیا کہ اسلامی تمدن تاریخ عالم میں ایک منفرد شان کے ساتھ نمایاں ہوا۔

درحقیقت محبتِ رسول ﷺ ہی وہ سرچشمۂ نور ہے جس سے ایمان کی حرارت بھی پیدا ہوتی ہے اور کردار کی استقامت بھی، اسی نسبت کے طفیل امت کے دلوں میں امید کی شمع روشن رہتی ہے اور اسی کی برکت سے اختلاف کے اندھیروں میں بھی احترام اور اعتدال کی روشنی باقی رہتی ہے، یہی وہ پاکیزہ جذبہ تھا جس نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو ایثار وقربانی کا پیکر بنایا، یہی محبت اولیاء وصلحاء کے دلوں میں ادب و نیاز کی شمع بن کر جلتی رہی اور یہی نسبت آج بھی امت کے دلوں کو امید کی حرارت عطا کرتی ہے۔

آج کے ان قیامت بردوش حالات میں، جب زمانے کی تیز

آندھیاں امت کا شیرازہ بکھیرنے کے درپے ہیں، اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ امتِ محمدیہ علیہ التحیۃ والثناء اپنے اسی مشترک مرکز اور نقطۂ اجتماع پہ دوبارہ سمٹ آئے، وہ مرکز جہاں دلوں کی پراگندگی دور ہوتی ہے اور سکون پاتی ہے، وہی نقطہ جہاں دلوں کے فاصلے مٹتے ہیں، جہاں فکر کی پراگندگی سمٹتی ہے اور جہاں اختلافات کی گرد بیٹھ جاتی ہے۔

یہی وہ رشتہ ہے جو بکھری ہوئی صفوں کو پھر سے جوڑ سکتا ہے، یہی وہ عقدِ وحدت ہے جو منتشر قوتوں کو ایک لڑی میں پرودیتا ہے، یہی وہ مرکزِ اجتماع ہے جس کے گرد امت کی قوتیں مجتمع ہوسکتی ہیں اور یہی وہ سلسلۂ اخوت ہے جسے تھام لینے میں عزتِ اجتماع بھی ہے اور بقا و سلامتی کی ضمانت بھی۔ دراصل یہی وہ حبلُ اللہ ہے جس سے وابستگی امت کے لیے اتحاد، استقامت اور فلاح کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک دلوں میں محبتِ رسول ﷺ کی یہ شمع روشن رہے گی، ایمان کی روشنی مدھم نہیں پڑے گی۔ اختلافات کے طوفان آئیں گے مگر اس محبت کی پناہ میں وہ بھی اعتدال کی صورت اختیار کرلیں گے کیونکہ جس دل میں مصطفیٰ کریم ﷺ کی محبت زندہ ہو وہاں سختی کی جگہ نرمی، نفرت کی جگہ الفت اور انتشار کی جگہ اتحاد جنم لیتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ محبتِ رسول ﷺ ہی وہ مرکز ہے جس کے گرد امت کے دلوں کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہوتی ہیں اور اسی محبت کے دامن میں اختلاف بھی شائستگی اور اعتدال کے ساتھ باقی رہ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس دل میں حضور اقدس ﷺ کی عظمت کا چراغ روشن ہو جاتا ہے وہاں اختلاف بھی احترام کی حدوں سے باہر نہیں جاتا۔ عقیدۂ توحید کی پاسبانی اور ادبِ رسالت کی پاسداری دراصل ایک ہی حقیقت کے دو روشن پہلو ہیں۔ ایک پہلو بندے کو اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے سامنے جھکاتا ہے اور دوسرا اسے اس ذاتِ مقدس کے آستانے پہ ادب واحترام سے کھڑا ہونا سکھاتا ہے جسے ربِّ کائنات نے رحمۃٌ للعالمین بنا کر بھیجا۔

اسی لیے تاریخِ امت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اہلِ علم نے فروعی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے ایمان اور اخلاص پہ حملہ کرنے سے ہمیشہ احتراز کیا۔ علمی بحثیں ہوئیں، دلائل پیش کیے گئے مگر دلوں کے رشتے باقی رہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ محبتِ مصطفیٰ ﷺ وہ رشتہ ہے جو امت کے منتشر قلوب کو ایک لڑی میں پرودیتا ہے۔

جب نگاہ اس حقیقت پہ ٹھہر جاتی ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ استغاثہ، ندا اور توسل کے مباحث بھی دراصل اسی محبت کے مختلف اظہارات ہیں۔ کوئی اسے دعا کی صورت میں بیان کرتا ہے، کوئی مناجات کے پیرائے میں اور کوئی اشعار کی نرمی میں ڈھال کر پیش کرتا ہے مگر ان سب کے پس منظر میں ایک ہی احساس موجزن ہوتا ہے: بارگاہِ رسالت ﷺ سے روحانی نسبت اور امیدِ شفاعت۔

لہٰذا دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ اس مسئلے کو تعصب کی آنکھ سے نہیں بلکہ علم، دیانت اور وسعتِ قلبی کے ساتھ دیکھا جائے۔ جہاں اختلاف ہو وہاں دلیل پیش کی جائے اور جہاں محبتِ رسول ﷺ کا ذکر آئے وہاں زبان ودل دونوں کو ادب کے نور سے آراستہ رکھا جائے۔

یہی وہ طرزِ فکر ہے جو امت کو افتراق کی گرد سے نکال کر اتحاد کی فضا میں لے جاتا ہے۔ کیونکہ جب دلوں میں حضور اکرم ﷺ کی محبت زندہ ہو تو اختلاف بھی نفرت میں تبدیل نہیں ہوتا بلکہ علم وادب کی حدود میں رہ کر ایک مہذب مکالمہ بن جاتا ہے اور یہی وہ اعتدال ہے جس میں امت کی فکری بقا اور روحانی سلامتی مضمر ہے۔

ان علمی توضیحات اور تاریخی شواہد کے بعد جب نعتیہ شاعری کے وسیع منظرنامے کی طرف دوبارہ نگاہ ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ استغاثے کی روایت محض ایک اعتقادی بحث نہیں بلکہ محبتِ رسول ﷺ کی اسی روحانی کیفیت کا شعری اظہار ہے جس نے صدیوں سے اہلِ دل کے احساسات کو زبان دی ہے، دلوں کی بے سمت دھڑکنوں کو بیان کا قرینہ عطا کیا ہے، آنکھوں کی نمی کو لفظوں کی حرمت بخشی ہے اور محبت کے خموش نغموں کو اظہار کی صورت دے دی ہے۔

یہی وہ کیفیت ہے جس میں عقیدت کی لرزشیں شعر کی صورت اختیار کرتی ہیں، شوق کی سرگوشیاں مصرعوں میں ڈھل جاتی ہیں اور دل کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی محبت نعت ومناجات کے پُرنور الفاظ میں جلوہ گر ہوکر اہلِ ایمان کے دلوں تک اپنی تاثیر پہنچاتی ہے۔

جس کی جھلک اردو نعتیہ ادب کے بے شمار اشعار میں دیکھی جا

سکتی ہے۔

شعری جمالیات اور اسلوبیاتی خصوصیات

نعتیہ شاعری میں استغاثے کی روایت اگر صرف عقیدے یا تاریخی ارتقا کے تناظر میں دیکھی جائے تو اس کا ایک اہم پہلو ضرور سامنے آتا ہے مگر اس روایت کی اصل تاثیر اس وقت پوری طرح نمایاں ہوتی ہے جب اسے شعری جمالیات اور اسلوبیاتی خصوصیات کے زاویے سے پرکھا جائے۔ درحقیقت استغاثہ نعتیہ شاعری میں ایک ایسی کیفیت پیدا کرتا ہے جس میں عقیدہ، محبت اور فنی لطافت اس طرح ہم آغوش ہو جاتے ہیں کہ شعر محض بیان نہیں رہتا بلکہ ایک روحانی تجربے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ استغاثے کے اشعار میں سب سے نمایاں عنصر انکسار اور نیاز مندی کا ہوتا ہے۔ شاعر جب بارگاہِ رسالت میں اپنی فریاد پیش کرتا ہے تو اس کی زبان میں عاجزی اور دل میں امید کی ایک نرم روشنی جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہی امتزاج استغاثے کے اشعار کو ایک خاص تاثیر عطا کرتا ہے۔ یہاں مدح کی رفعت بھی موجود ہوتی ہے اور غلامی کی نرمی بھی، جس سے شعر میں ایک دلنشیں توازن پیدا ہو جاتا ہے۔

اس اسلوب کی دوسری نمایاں خصوصیت روحانی مکالمے کی کیفیت ہے۔ استغاثے کے اشعار میں شاعر گویا براہِ راست بارگاہِ مصطفوی ﷺ میں مخاطب ہوتا ہے۔ یہ خطاب رسمی یا محض روایتی انداز کا نہیں ہوتا بلکہ اس میں محبت کی گرم جوشی اور عقیدت کی سنجیدگی شامل ہوتی ہے۔ اسی لیے ایسے اشعار پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا دل اپنے محبوب کے حضور کھل کر ہم کلام ہو رہا ہے۔ تیسری خصوصیت امید اور یقین کا حسین امتزاج ہے۔ استغاثے میں فریاد ضرور ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ مایوسی نہیں ہوتی۔ شاعر کو یقین ہوتا ہے کہ درِ مصطفیٰ ﷺ سے رحمت اور شفاعت کی کرنیں ضرور نصیب ہوں گی۔ یہی یقین استغاثے کے اشعار کو محض حزن و ملال کی فضا تک محدود نہیں رہنے دیتا بلکہ انہیں امید کی روشنی سے منور کر دیتا ہے۔

اردو نعتیہ ادب میں اس کیفیت کو متعدد شعرا نے اپنے اپنے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ بعض کے یہاں استغاثہ نرم اور دبی ہوئی فریاد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جب کہ بعض شعرا کے ہاں یہ والہانہ عقیدت اور پُرسوز التجا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تاہم ہر صورت میں اس کا بنیادی جوہر ادب، عقیدت اور محبت ہی رہتا ہے۔

شعری جمالیات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو استغاثے کے اشعار میں عموماً سادگی اور اثر آفرینی کا خاص اہتمام ملتا ہے۔ شاعر پیچیدہ تراکیب یا مشکل استعارات کی جگہ ایسی زبان اختیار کرتا ہے جو دل سے نکل کر براہِ راست دل تک پہنچ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ استغاثے کے بہت سے اشعار عوام و خواص دونوں کے دلوں میں یکساں طور پہ اثر پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح استغاثے کی روایت میں خطابیہ انداز بھی ایک اہم اسلوبیاتی عنصر کے طور پہ سامنے آتا ہے۔ شاعر جب براہِ راست حضور اکرم ﷺ کو مخاطب کرتا ہے تو اس کے الفاظ میں ایک خاص روحانی حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی خطابیہ کیفیت نعتیہ شاعری کے اس حصے کو زیادہ پُرتاثیر اور دل آویز بنا دیتی ہے۔

یہ بھی ایک قابلِ توجہ حقیقت ہے کہ نعتیہ شاعری میں استغاثہ صرف فرد کی ذاتی فریاد تک محدود نہیں رہتا بلکہ بسا اوقات پوری امت کے اجتماعی احساس کا ترجمان بن جاتا ہے۔ شاعر اپنے ذاتی دکھ درد کو امت کے مجموعی حالات کے ساتھ جوڑ دیتا ہے اور اس طرح اس کی فریاد ایک وسیع انسانی اور دینی احساس کی نمائندہ صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسی بنا پہ اردو نعتیہ ادب میں استغاثے کی روایت کو ایک ایسی شعری جہت کے طور پہ دیکھا جا سکتا ہے جس میں محبت کی حرارت، عقیدے کی پختگی اور فن کی لطافت ایک ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اس روایت نے نعتیہ شاعری کو محض رسمی مدح کے سانچے تک محدود نہیں رہنے دیا بلکہ اسے دعا، فریاد اور روحانی وابستگی کے ایک گہرے تجربے میں تبدیل کر دیا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ نعتیہ شاعری میں استغاثہ دراصل اس روحانی رشتے کا شعری اظہار ہے جو امت کو اپنے نبی کریم ﷺ سے حاصل ہے۔ یہ رشتہ کبھی مدح کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، کبھی درود و سلام کی شکل میں اور کبھی عاجزانہ فریاد کے انداز میں

اپنی جھلک دکھاتا ہے اور شاید یہی اس روایت کا سب سے بڑا حسن ہے کہ یہاں شعر عبادت کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے اور الفاظ دعا کی طرح دلوں میں اترنے لگتے ہیں۔ جب عاشقِ رسول ﷺ اپنے دل کی فریاد نعت کے قالب میں ڈھالتا ہے تو اس کے اشعار محض ادبی تخلیق نہیں رہتے بلکہ عقیدت کے چراغ بن کر دلوں میں روشنی پھیلاتے ہیں۔

اسی زاویۂ نظر سے جب نعتیہ شاعری میں استغاثے کی روایت دیکھی جائے تو یہ صرف ایک شعری مضمون نہیں بلکہ عشقِ رسول ﷺ کی ایک زندہ اور تابندہ روایت معلوم ہوتی ہے، ایسی روایت جس نے صدیوں سے اہلِ محبت کے دلوں کو درِ مصطفیٰ ﷺ کی طرف متوجہ رکھا ہے اور جس کی تاثیر آئندہ بھی برقرار رہے گی۔

نعتیہ شاعری میں استغاثے کی روایت دراصل اس گہرے روحانی تعلق کی علامت ہے جو امتِ محمدیہ علیہ التحیۃ والثناء کو اپنے نبیِ مکرم ﷺ سے حاصل ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں اس روایت نے کبھی عقیدت کی نرم روشنی میں، کبھی عشق کی تپش میں اور کبھی اجتماعی فریاد کی صورت میں اپنا اظہار کیا ہے۔ برصغیر کی علمی اور ادبی فضا میں اس نے ایک مستقل موضوع کی حیثیت اختیار کی اور بڑے شعرا نے اسے اپنے اپنے اسلوب میں بیان کیا۔ اگرچہ اس مسئلے پہ فکری اختلافات بھی سامنے آئے اور بعض حلقوں نے اس کی تعبیرات پہ سوالات اٹھائے مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ نعتیہ ادب کے وسیع منظرنامے میں استغاثہ ایک زندہ، مضبوط اور مؤثر روایت کے طور پہ موجود رہا ہے۔ یہاں فریاد بھی ہے مگر ادب کے دائرے میں، نیاز بھی ہے مگر عقیدت کے وقار کے ساتھ اور امید بھی ہے مگر ایمان کے یقین کے ساتھ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب عاشقِ رسول ﷺ کے لبوں پہ عرضِ نیاز کے الفاظ آتے ہیں تو وہ محض شعر نہیں رہتے بلکہ دل کی دعا بن جاتے ہیں۔ اسی دعا کی حرارت نے صدیوں سے نعتیہ شاعری کو زندگی بخشی ہے اور اسی نسبتِ محبت نے اسے محض ادبی صنف کی بجائے ایک روحانی روایت کی حیثیت عطا کر دی ہے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ نعتیہ شاعری میں استغاثے کی روایت دراصل محبت، عقیدت اور امید کے وہ چراغ ہیں جو درِ مصطفیٰ ﷺ کی نسبت سے روشن ہوئے اور جن کی روشنی میں اہلِ دل اپنے ایمان کی حرارت اور اپنی محبت کی صداقت ہمیشہ محسوس کرتے رہیں گے۔ یہی وہ چراغ ہیں جن کی لو سے دلوں کے اندھیرے اجالوں میں بدلتے ہیں، جن کی ضیا پاشیوں سے بے چین روح کو قرار ملتا ہے اور جن کی تابانی سے عقیدت کے راستے منور ہوتے ہیں۔ صدیوں سے اہلِ محبت نے انھی چراغوں کی روشنی میں اپنے دل کی التجائیں عرض کی ہیں، اپنے آنسوؤں کو دعا کی صورت دی ہے اور اپنی امیدوں کو بارگاہِ رسالت میں نذر کیا ہے۔

استغاثے کی یہ روایت محض شعری اسلوب نہیں بلکہ عشق و ایمان کی وہ زندہ علامت ہے جو ہر عہد میں دلوں کو درِ مصطفیٰ ﷺ کی طرف متوجہ کرتی ہے، جہاں سے امید کی کرنیں بھی پھوٹتی ہیں اور رحمت کے اجالے بھی اہلِ دل کی راہوں کو ہمیشہ روشن رکھتے ہیں، استغاثے کی یہ روایت نعتیہ شاعری میں محض ایک فنی پیرایۂ اظہار نہیں بلکہ عشقِ رسول ﷺ کی ایک زندہ اور متحرک علامت ہے۔ اس کے دامن میں محبت کی حرارت بھی ہے، عقیدت کی نزاکت بھی اور امید کی وہ روشنی بھی جو دلوں کو مایوسی کے اندھیروں سے بچائے رکھتی ہے۔

اسی لیے جب تک اہلِ ایمان کے دلوں میں حضور اکرم ﷺ کی محبت کی شمع روشن رہے گی، نعتیہ شاعری میں استغاثے کی یہ صدا بھی اسی طرح گونجتی رہے گی۔ یہ صدا دراصل اسی ازلی تعلق کا اظہار ہے جو امت کے دلوں کو درِ مصطفیٰ ﷺ سے وابستہ رکھتا ہے، وہ تعلق جس میں ادب بھی ہے، امید بھی اور وہ یقین بھی کہ اسی مقدس نسبت سے دلوں کو سکون، روح کو قرار اور ایمان کو تازگی نصیب ہوتی ہے۔

□□□□

محمد ملک الظفر سہسرامی

جن کے سائے میں صبا چلتی تھی

یہ یادداشت افسانوی ادب کے اسلوب میں ڈھال کر ایک تخیل آفریں نثر پارے کی صورت میں پیش کی جا رہی ہے، جہاں واقعہ نگاری، کردار نگاری، منظر نگاری اور جذبہ آفرینی سب ایک ساتھ چلتے ہیں مگر حقیقت کی بنیاد پہ۔ اس میں میری معصوم نگاہ، والد گرامی فخر بہار حضرت علامہ محمد میاں کامل سہسرامی کی وقار آفریں شخصیت اور خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی کی دردمندانہ قامت، سارے عناصر ایک ادبی رنگ میں پرو دیے گئے ہیں۔

باب اوّل

یادیں کبھی محض واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتیں، وہ وقت کی تہوں میں محفوظ خوشبو بھی ہوتی ہیں۔ یہ باب میرے بچپن کی انہی خوشبوؤں، خاندانی محبتوں اور ان ابتدائی نقوش کی داستان ہے جس نے میری شخصیت کی بنیاد رکھی اور مجھے علم و ادب کی دنیا سے آشنا کیا۔

یادوں کا الہ آباد: ایک بچپن، دو بزرگ اور ایک شہر کی خوشبو

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندستانی معاشرہ ابھی خاندانی رشتوں کی حرارت، بزرگوں کی سرپرستی اور مشترکہ خاندانی نظام کی مضبوط روایتوں سے وابستہ تھا۔ گھروں میں مادی آسائشیں اگرچہ محدود تھیں مگر محبت، اپنائیت اور باہمی تعلقات کی دولت فراواں تھی۔ دینی خانوادوں میں علم، تہذیب، خدمتِ خلق اور بزرگوں کے احترام کو زندگی کی بنیادی اقدار سمجھا جاتا تھا۔

سہسرام اور الہ آباد جیسے علمی و دینی مراکز میں اس دور کی فضا خاص طور پر علمی مجالس، مذہبی اجتماعات اور ادبی نشستوں سے معطر رہتی تھی۔ یہی وہ ماحول تھا جس میں دارالعلوم خیریہ نظامیہ جیسے ادارے نئی نسل کی دینی و فکری تربیت کا فریضہ انجام دے رہے تھے اور اہلِ علم شخصیات گھروں اور اداروں دونوں کے لیے مرکزِ رجوع سمجھی جاتی تھیں۔

زیرِ نظر باب اسی عہد کی خاندانی زندگی، تہذیبی قدروں اور ان محبتوں کی جھلک پیش کرتا ہے جس نے ایک بچے کے شعور، مزاج اور شخصیت کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا۔

گلی کے نکڑ پہ کھلے دروازے سے چھنتی دھوپ جب آنگن میں گرتی، تو میری دادی جان کی آواز سنائی دیتی:

’’جاؤ بیٹا باہر جا کے کھیلو۔ کب تک کمرے میں بیٹھے رہو گے؟ تیل بھی لگا دیا، کاجل بھی، اب نظرِ بد بھی نہ لگے گی۔‘‘

یہ محض چند جملے نہ تھے بلکہ ایک ایسی ممتا بھری چھاؤں تھی جس میں پورا بچپن محفوظ محسوس ہوتا تھا۔ دادی جان کی محبت کا انداز بھی نرالا تھا۔ کبھی سر پر ہاتھ پھیرتیں، کبھی پیشانی کو چوم لیتیں اور کبھی بے ساختہ دعاؤں کے پھول نچھاور کر دیتیں۔ ان کی نگاہ ہر وقت بچوں پر رہتی، دھوپ تیز ہو تو فکر، بارش آئے تو پریشانی، دیر سے گھر لوٹیں تو بے چینی۔

وہ اپنے ہاتھوں سے بالوں میں تیل لگاتیں، آنکھوں میں کاجل ڈالتی تھیں اور پھر نظرِ بد سے بچانے کے لیے دعاؤں کا حصار بھی باندھ دیتیں۔ ان کی شفقت میں ماں کی ممتا بھی شامل تھی اور بزرگوں کی دانائی بھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے دل کی دنیا کا سب سے قیمتی سرمایہ ان کے بچے پوتے اور پوتیاں ہی تھے۔

آج جب وہ آوازیں یادوں کے دریچوں سے ابھرتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ دادی جان صرف ایک فرد نہیں تھیں بلکہ محبت، دعا، تحفظ اور خاندانی وابستگی کا ایک مکمل جہان تھیں، جس کی حرارت آج بھی یادوں کے آنگن میں محسوس ہوتی ہے۔

دادی جان کی یہی بے پناہ محبت شاید میرے مزاج کا بھی حصہ

بن گئی تھی۔ ان کی گود کی راحت، ان کی دعاؤں کا حصار اور گھر کے اندر کی محفوظ دنیا مجھے اس قدر عزیز تھی کہ باہر کی ہنگامہ خیز دنیا کبھی پوری طرح اپنی طرف کھینچ نہ سکی۔

دادی کے حکم پہ میں برآمدے کی منڈیروں پہ انگلیاں پھیرتا ہوا نکلتا مگر دل اندر کے کھلونوں میں اٹکا رہتا۔ باہر کے بچے شور مچاتے، چلاتے، مٹی میں لوٹتے اور کھیل کے جوش میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے مگر میں... میں تو بس تماشا دیکھتا رہتا۔ کچھ دیر خموش کھڑا رہتا، پھر نہ جانے کس کشش کے تحت آہستہ آہستہ گھر کی طرف لوٹ آتا۔ کسی نے ڈانٹا بھی نہیں ہوتا، کسی نے روکا بھی نہیں ہوتا مگر دل جیسے باہر ٹھہرنے کی اجازت ہی نہ دیتا۔ گھر کی دیواروں کے اندر دادی جان کی آواز، ان کی شفقت اور اپنائیت کا جو احساس تھا، وہ شاید کسی کھیل کے شور سے زیادہ دلکش تھا۔

میرے بچپن کا عالم کچھ ایسا ہی تھا-- پُرسکون، غیر ہنگامہ خیز، نرم لہروں والا۔ باہر کی دنیا میرے لیے کبھی کشش کا سبب ہی نہ بنی۔ اندر کے رشتے اتنے محبت آفریں اور دل پذیر تھے کہ باہر کی دنیا اپنی جانب متوجہ نہ کر سکی۔ انسان خوب سے خوب تر کی تلاش میں ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف بڑھتا ہے لیکن اگر کسی کا اپنا گھر خود حسن کا مرکز ہو، دلکشی کی تمام تر بہشت اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہو تو پھر کیوں وہ کسی اور طرف دیکھے--؟

ایسا نہیں کہ ہمارا گھر جنت نشان تھا، تمام مادی بہاریں گھر میں مہیا اور میسر ہوں۔ جنت نشان سے مراد اسلامی تہذیب سے گھر آنگن خوشبو رہتا تھا مگر دنیوی چمک کا یہ حال تھا کہ گھر میں پنکھا تک نہ تھا۔ مگر دادی جان کا وجود، ان کا آنچل، ان کی گود، ان کی کہانیاں، ان کا پیار بھرا لب ولہجہ-- سب کچھ کسی خلد مکاں سے کم نہ تھا۔ زندگی کی ساری بہاریں اور ساری رونقیں مجھے ان کے آنچل تلے محسوس ہوتی تھیں

پھر میری ماں تھیں--- سادہ مزاج، نرم خو، نہایت شریف الطبع اور خاموشی میں محبت بانٹنے والی ایک ایسی ہستی، جن کے وجود سے گھر میں سکون کی ایک لطیف فضا قائم رہتی تھی۔ ان کی شخصیت میں نہ بناوٹ تھی، نہ نمود و نمائش، سادگی ہی ان کی زینت تھی اور خلوص ان کی پہچان۔ ان کی محبت کا انداز بھی بڑا منفرد تھا۔ وہ بہت کم ڈانٹتی تھیں مگر جب کبھی کوئی شرارت حد سے بڑھ جاتی تو ان کی محبت آمیز ڈانٹ میں بھی شفقت کا رنگ غالب رہتا۔ ''کتنی بار کہا ہے، ذرا سنبھل کر چلا کرو!''

''ہر وقت کتابیں اور کھلونے پھیلائے رکھتے ہو، آخر سمیٹے گا کون؟، دھوپ میں اتنا مت دوڑا کرو، بیمار پڑ جاؤ گے۔''

یہ جملے بظاہر تنبیہ تھے مگر حقیقت میں دعاؤں اور فکرمندی کے دوسرے لب و لہجے تھے۔ ان کی آواز میں سختی کم اور محبت زیادہ ہوتی تھی۔ وہ ناراض بھی ہوتیں تو آنکھوں میں ممتا کی نمی باقی رہتی اور چند لمحوں بعد خود ہی پاس بلا کر کوئی پسندیدہ چیز کھلا دیتیں، جیسے ناراضی کا اعلان بھی صرف محبت کی ایک ادا ہو۔

میری ماں کا دل بے حد نرم تھا۔ گھر کے ہر فرد کا خیال رکھنا، سب کی ضروریات کو اپنی ضرورتوں پر مقدم رکھنا، اور خموشی سے خدمت کرتے رہنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ میں نے انہیں کبھی اونچی آواز میں بولتے نہیں دیکھا۔ صبر گویا ان کی گھٹی میں پڑا تھا اور قناعت ان کے مزاج کا حصہ تھی۔

بچپن میں شاید ہم ان باتوں کی قدر نہ کر سکے مگر آج جب زندگی کے طویل راستوں پر چلتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ میری ماں صرف ایک ماں نہیں تھیں بلکہ گھر کی دھڑکن تھیں۔ ان کی محبت نے ہمیں سنوارا، ان کی دعاؤں نے ہمیں تھاما اور ان کی خموش قربانیوں نے ہماری زندگی کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔

آج بھی یادوں کی کھڑکی کھلتی ہے تو ان کی وہ مانوس آواز کانوں میں رس گھول دیتی ہے، وہی نرم جھڑکیاں، وہی فکرمندی، وہی بے لوث محبت۔ تب محسوس ہوتا ہے کہ بعض لوگ بظاہر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں مگر ان کی شفقت عمر بھر انسان کے دل میں ایک روشن چراغ کی طرح جلتی رہتی ہے اور ماں تو شاید وہ واحد ہستی ہے جس کی محبت وقت کے گذرنے سے کبھی پرانی نہیں ہوتی۔

شاید اسی بے مثال محبت اور احساسِ تحفظ کا نتیجہ تھا کہ ہمارا بچپن ایک ایسی دنیا میں گذرا جہاں محرومی کا احساس کبھی قریب نہ آ سکا۔ ماں کی آغوش ہمارے لیے جنت کدہ تھی اور گھر کا ہر گوشہ اپنائیت سے بھرا

ہوا۔ جب یادوں کے دریچے کھلتے ہیں تو ماں کی شفقت کے ساتھ ساتھ وہ پورا ماحول بھی نگاہوں کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے جس میں ہماری زندگی کے ابتدائی رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

بہن بھائیوں کی شرارتیں، ابا کی نرمی سے بھری ہوئی ڈانٹ پھر دوسرے رشتہ داروں کے آنچل سے لپٹ کر شرارتیں، پرانے قصے کہانیوں کا لطف ــ یہی تو میرے ننھے وجود کی کائنات تھی۔

والد گرامی ــ وہ تو خود ایک رواں دواں داستان تھے ــ ان کی ایک الگ دنیا تھی ــ وہ بے پناہ تہہ دار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد نرینہ تھے ــ نہ بھائی نہ بہن ــ ایک بہن تھیں بھی تو وہ جلد ہی رخصت ہو گئیں مگر انہوں نے کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ہم تنہا ہیں اور ایک محدود دائرے میں جی رہے ہیں۔ دور کے رشتے داروں سے اس قدر قلبی تعلق، اس درجہ بے تکلف محبت کہ یوں لگتا جیسے ساری کائنات ایک ہی خاندان کی لڑی میں پرو دی گئی ہو۔

کیا ہی عجیب مزاج پایا تھا انہوں نے: ہر ایک سے بے ساختہ محبت، ہر ایک کی دلجوئی، ہر رشتے کی توقیر۔

ہمارے گھر کا ہر دن، ہر لمحہ مہمان داری کا، ملاقاتوں کا، رشتوں کے سنگم کا منظر پیش کرتا۔ کیسے تھے وہ لوگ؟ اور کیسی پاکیزہ طبیعت کے حامل تھے؟ کہ دور کے رشتوں میں بھی اپنائیت کی ایسی بے پناہ خوشبو رچی بسی تھی جیسے برسوں کا ساتھ ہو، جیسے دلوں کے درمیان کوئی فاصلہ سرے سے موجود ہی نہ ہو۔

آج سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ لوگ رشتے نبھاتے نہیں تھے، رشتوں میں وفا کی روح پھونک دیتے تھے۔ خوشی کسی ایک گھر میں آتی تو پورا خاندان مسرور ہو جاتا اور اگر کہیں غم کا سایہ پڑتا تو سب کے دل ایک ساتھ بوجھل ہو جاتے۔ دروازے بند نہیں ہوتے تھے، دل کھلے ہوتے تھے، تعلقات رسم و رواج کے محتاج نہیں تھے بلکہ خلوص اور محبت کے سہارے قائم رہتے تھے۔

مگر آج... آج تو صورتِ حال یکسر بدل چکی ہے۔ سگے رشتہ داروں کے درمیان بھی ایسی اجنبیت در آئی ہے کہ خدا کی پناہ۔ ایک ہی خون کے رشتے فاصلے ناپ رہے ہیں، ایک ہی خاندان کے لوگ ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر ہیں۔ ملاقاتیں کم، مصروفیتوں کے بہانے زیادہ ہیں، قربت کے وسائل بڑھ گئے ہیں مگر دلوں کے درمیان فاصلے بھی بڑھتے چلے گئے ہیں۔

کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے ترقی کی دوڑ میں بہت کچھ حاصل کیا مگر وہ بے لوث محبت، وہ خاندانی یگانگت، وہ بزرگوں کی شفقت اور چھوٹوں کے لیے دل میں دھڑکنے والی مروّت کہیں راستے ہی میں کھو دی۔ اب یادوں کے دریچے کھلتے ہیں تو ماضی کے وہ روشن چہرے، وہ آباد آنگن اور وہ محبت سے لبریز محفلیں ایک حسرت بن کر نگاہوں کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں اور دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ واقعی، وہ لوگ کچھ اور ہی تھے، ان کے پاس مادی دولت شاید کم تھی مگر دلوں کی وسعت اور رشتوں کی حرارت بے حساب تھی۔

انہی محبتوں، انہی شفقتوں اور انہی بے لوث تعلقات نے ہمارے بچپن اور شعور کی ایسی آبیاری کی تھی کہ گھر ہی ہمارے لیے سب کچھ بن گیا تھا۔ اپنوں کی قربت میں ایک ایسا سکون، ایک ایسی معنوی آسودگی تھی کہ باہر کی چکاچوند اور مصنوعی کشش کبھی دل کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔

یہی وہ دنیا تھی جس کی خوشبو نے ہمیں باہر کی خاک سے بے نیاز رکھا ــ لیکن وقت کے پاس کسی کیفیت کو ہمیشہ قائم رکھنے کا اختیار نہیں ہوتا اور شاید یہی زندگی کا سب سے بڑا المیہ بھی ہے۔

اس طرح باہر کی دنیا کبھی ہمارا دامن اپنی جانب نہیں کھینچ سکی۔

لیکن وقت تو کبھی رکتا نہیں۔ رفتہ رفتہ سب بدلنے لگا۔

اخلاقی قدریں جیسے پرانی الماریوں میں رکھے مٹی زدہ نوشتے بن گئیں، جن پر زمانے کی گرد تو مسلسل بڑھتی رہی مگر جن کی سطروں میں چھپی روشنی تک پہنچنے کی فرصت کسی کو نہ رہی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے تہذیب کی پوری ایک داستان خموشی سے بند الماریوں میں قید ہو گئی ہو۔

ہماری پاکیزہ تہذیبی وراثت کی امانت مادیات کے طوفان کی نذر ہونے لگی ــ اور پھر دھیرے دھیرے وقت کے ساتھ رشتوں کی رونقیں بھی ماند پڑنے لگیں، بہت سارے رشتے وقت کے بہتے دریا میں نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔

مادیات کی اس دوڑ میں وہ اپنائیت، وہ تعلق، وہ ایک دوسرے کے لیے جینے مرنے کا جذبہ سب دھندلا گیا۔ جن رشتوں کی پاکیزہ روشنی کے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہیں تھا اور جن رشتوں کے درمیان ہم جیتے تھے، وہی رشتے اب زندگی کی دوڑ میں کہیں پیچھے رہ گئے۔

رفتہ رفتہ حال یہ ہوا کہ تعلقات دلوں کی ضرورت کی جگہ وقت کی مجبوری بننے لگے۔ ملاقاتیں باقی رہیں مگر ان میں وہ وارفتگی نہ رہی، گفتگو جاری رہی مگر اس میں دلوں کی دھڑکنیں شامل نہ رہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ رشتے انسان کی پہچان ہوتے تھے، آج اکثر شناخت رشتوں سے بے نیاز دکھائی دیتی ہیں۔

وہ آنگن، جو کبھی ہنسی، محبت اور باہمی اعتماد کی آوازوں سے آباد رہتے تھے، خاموش ہونے لگے۔ وہ دروازے، جو بنا اطلاع کھل جاتے تھے، اب رسمی دستکوں اور طے شدہ اوقات کے منتظر رہنے لگے۔ قربت کے ذرائع بڑھتے گئے مگر قربت کا احساس کم ہوتا گیا، فاصلے سمٹ گئے مگر دل ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔

کبھی کبھی ماضی کی طرف نگاہ لوٹتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے سہولتوں کے عوض کچھ ایسا کھو دیا ہے جس کی کوئی قیمت متعین نہیں کی جا سکتی۔ ہم نے بہت کچھ حاصل کیا مگر وہ سکونِ قلب، وہ خلوصِ تعلق اور وہ بے لوث اپنائیت کہیں راستے میں بکھر گئی، جو زندگی کو صرف گذارنے کے لیے نہیں بلکہ جینے کے لیے ضروری تھی۔

اور یہی احساس دل میں ایک خموش کسک بن کر ابھرتا ہے کہ شاید انسان کی اصل دولت اس کے پاس موجود چیزیں نہیں بلکہ اس کے گرد موجود وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے دلوں میں اس کے لیے محبت، مروّت اور اخلاص زندہ ہو۔

شاید یہی زندگی کا سب سے مشکل سبق ہے کہ انسان ہمیشہ اپنی پسند کی دنیا میں نہیں رہ سکتا، اسے آخر کار اسی دنیا کے ساتھ سمجھوتا کرنا پڑتا ہے جسے وقت اس کے لیے منتخب کرتا ہے۔ کچھ یادیں دل میں چراغوں کی طرح روشن رہتی ہیں، کچھ حسرتیں خاموشی سے ساتھ چلتی رہتی ہیں اور پھر ایک دن انسان یہ سیکھ لیتا ہے کہ ماضی کو سینے میں بسائے رکھتے ہوئے بھی حال میں جیا جا سکتا ہے۔

...اور پھر رفتہ رفتہ یہ ادراک بھی ہوا کہ زندگی صرف یادوں کے سہارے نہیں گذرتی۔ وقت اپنے تقاضے منواتا ہے، موسم رنگ بدلتے ہیں اور انسان کو بھی بدلتے زمانوں کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنا پڑتا ہے۔

سو میں نے بھی وقت کے بہاؤ کے ساتھ خود کو ڈھالنا سیکھ لیا مگر دل کے کسی گوشے میں وہ پرانی دنیا آج بھی ویسی ہی آباد ہے، محبتوں، شفقتوں اور ان چہروں کے ساتھ جو میرے لیے زندگی کی اصل دولت تھے۔

ان بستیوں میں جہاں یادیں آج بھی چراغوں کی طرح روشن ہیں، ایک چراغ ایسا بھی ہے جس کی روشنی کبھی مدھم نہیں پڑی۔

ابا۔ وہ تو جیسے ہمارے درمیان ایک چلتی پھرتی داستان تھے۔

گھر میں کم، مگر یادوں میں زیادہ۔

ان کی مصروفیات، ان کے سفر، ان کی مجلسیں، ان کی تحریریں ---سب کچھ ایک وجد آفریں سلسلے کی مانند تھا۔

کہیں اجلاس میں خطیب بن کر، کہیں دارالعلوم کے جلسے میں صدرِ مجلس کی حیثیت سے، کہیں ''تاجدار''، ''پاسبان'' یا ''استقامت'' کے صفحات پہ جھکے ہوئے۔ اور میں، اکثر دروازے کے شگاف سے جھانک کر دیکھتا، شمع کی لو میں ان کے سائے کو دیواروں پہ بولتے ہوئے محسوس کرتا۔ وہ لکھ رہے ہوتے اور میں سوچتا کہ شاید لفظوں کے یہ قافلے کبھی میرے دل کے شہر میں بھی اتریں گے۔ ان کا قیام اگرچہ عارضی ہوتا، مگر دلوں پہ اس کا نقش مستقل ہوتا۔ ہر ایک سے بات، ہر ایک کو وقت، ہر لمحے میں احساسِ محبت۔ گھر جیسے ان کے ہونے سے روشن ہو جاتا اور ان کے نہ ہونے پہ بھی ان کی تحریریں، ان کی خوشبو، ان کے نقشِ قدم گھر کے ہر گوشے میں زندہ رہتے۔

یادوں کے اس سفر میں، جہاں بچپن کے کھلونے مٹی میں دبا دیے گئے، وہاں کچھ خوشبوئیں اب بھی قائم ہیں۔ کچھ دروازے اب بھی کھلے ہیں۔ کچھ دعائیں آج بھی آسمان کی طرف بلند ہوتی ہیں۔

ایک دن عجیب ہوا۔ والد صاحب نے مجھے بلایا اور کہا: ''چلو، الہ آباد چلتے ہیں۔'' میں چونکا۔ گھر سے باہر؟ پہلی بار؟

راستے میں ہر منظر اجنبی تھا -- درخت، پٹریاں، پلیٹ فارم، اسٹال والے اور بادلوں کے درمیان جھانکتی سورج کی دھوپ۔ میں نے کبھی اتنے چہرے اور اتنے کردار ایک ساتھ نہیں دیکھے تھے۔ دل میں ایک خفیف سا خوف اور ایک نامعلوم سی خوشی تھی۔

الہ آباد... نام بھی بڑا لگتا تھا، شہر بھی۔

ہم پہنچے تو ایک دروازے پہ رکے، جہاں دروازہ نہیں کھلتا تھا، دل کھلتے تھے۔ یہ خطیبِ مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا گھر تھا۔ جب دروازہ کھلا، تو اندر کوئی رسمی مہمان نوازی نہ تھی، ایک آغوش تھی، جس میں میں خود کو گم کرتا چلا گیا۔ یہاں سب اپنے جیسے تھے۔ اس گھر میں رشتے تعارف کے محتاج نہ تھے۔ بزرگوں کی دیرینہ محبت نے دلوں کے درمیان ایسے پل باندھ دیے تھے کہ آنے والا بھی خود کو اپنا ہی محسوس کرتا تھا۔

محبت اور تعلق کی انتہا یہ تھی کہ ان کے مکان کا ایک کمرہ مستقل کامل میاں کے کمرے کے نام سے مشہور تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس گھر کی دیواروں نے بھی اس دیرینہ رفاقت کو اپنے اندر محفوظ کر لیا ہو۔ یہ محض ایک گھر نہیں تھا، تعلق اور اپنائیت کی ایک ایسی دنیا تھی جس میں قدم رکھتے ہی اجنبیت کے سارے پردے اٹھ جاتے تھے۔

افاق، وقار، منا -- ان تینوں کے ساتھ میری ان بن، مان، ہنسی، کھیل... سب کچھ ہونے لگا۔ میں بھول گیا کہ میں مہمان ہوں۔ جیسے میں ہمیشہ سے ان کے ساتھ رہا ہوں۔ جیسے یہ گھر میرا ہے۔ جیسے علامہ نظامی میرے خاندان کے بزرگ ہیں، اور وہ تھے بھی ایسے ہی -- ایک بڑے... مگر رُوح کے بڑے۔ چہرے پر نور، گفتگو میں گہرائی، لب و لہجے میں حلم اور قلم میں بجلی کی سرعت، زبان و گفتار میں شہد جیسی مٹھاس۔

ان کی ہر بات، ہر حرکت، ہر خاموشی میں کوئی نہ کوئی راز پوشیدہ ہوتا اور ایک خموش پیغام بھی۔ ان کی محرومی -- اولاد سے، تین ہم درسوں سمیت -- ایک ایسا غم تھا جسے وہ الفاظ کے پردے میں لپیٹ کر علم و عمل کی روشنی میں بدل دیتے۔ میں انہیں دیکھتا اور سوچتا: ''کیا سب بڑے ایسے ہی ہوتے ہیں؟'' نہیں، سب نہیں۔ مگر کچھ ہوتے ہیں، جو عمر سے نہیں، دل کی وسعت سے بڑے ہوتے ہیں۔

لیکن اس گھر کی محبت صرف ایک شخصیت تک محدود نہ تھی۔ اس آنگن کی فضا میں چند اور ہستیاں بھی تھیں جن کی شفقتوں نے میرے کم سن دل کو ایک عجیب اعتماد اور اپنائیت عطا کی۔

ان میں سب سے نمایاں لالی تھیں -- یعنی حضرت علامہ نظامی علیہ الرحمہ کی اہلیہ محترمہ۔ گھر کے سارے افراد انہیں اسی محبت بھرے نام سے پکارتے تھے۔ ان کی شخصیت میں ماں جیسی شفقت، بہن جیسی دلجوئی اور گھر کی بزرگ خاتون جیسا وقار یکجا تھا۔ ان کی نگاہوں میں ایک خموش محبت تھی اور ان کے رویّے میں ایسا خلوص کہ اجنبیت کا احساس چند لمحوں میں تحلیل ہو جاتا۔ مجھے آج بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شفقت نے میرے گرد ایک ایسا حفاظتی حصار کھینچ دیا تھا جس میں ہر لمحہ اپنائیت کی خوشبو بسی رہتی تھی۔

اور پھر مولانا انوار احمد نظامی تھے۔ نرم مزاج، خوش اخلاق اور محبت بانٹنے والے۔ ان کی قربت میں ایک ایسا بے تکلف پن تھا جو عمر اور تعلق کے تمام فاصلے مٹا دیتا تھا۔ ان کی گفتگو، ان کی مسکراہٹ اور ان کا اندازِ التفات میرے لیے حوصلے اور دل آسائی کا سرچشمہ بن گیا۔ بچپن کے وہ دن گذر گئے مگر ان کی شفقت کا احساس آج بھی حافظے کے دریچوں میں تازہ ہے۔

شاید اسی لیے وہ گھر میرے لیے محض ایک مکان نہ تھا، بلکہ محبتوں، دعاؤں اور شفقتوں کا ایک ایسا سایہ دار شجر تھا جس کی ٹھنڈی چھاؤں نے میرے بچپن کو ایک نئی معنویت عطا کی۔

والد صاحب کبھی آتے، کبھی جاتے۔ پروگراموں کی مصروفیات انہیں لے جاتی رہیں مگر میرے لیے یہ چند دن خواب جیسے ہو گئے۔ جب والد صاحب رخصت ہوتے تو نظامی صاحب کا گھر مجھے اور مضبوطی سے تھام لیتا۔ گلی کے اس سرے پر دو علمبردار کھڑے تھے -- ایک تاجدار صحافت، دوسرا دار العلوم خیریہ نظامیہ کا میر کارواں۔ ان کی دوستی، محبت اور فکری ہم آہنگی ایک مثال تھی۔ تاجدار کے صفحات ہوں یا پاسبان کی فائل یا مجلسِ مشاورت، علمائے کرام کے اجتماعات ہوں یا اصلاحِ ملت کے مشورے -- ان دونوں بزرگوں کا ایک سادہ،

خاموش، اور مؤثر اشتراک تھا۔

والد گرامی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں، علامہ مشتاق احمد نظامی بھی وقت کی بلندیاں عبور کرتے کرتے رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہو گئے -- مگر الہ آباد کی وہ گلی، وہ دروازہ، وہ قہقہے، وہ مہربان آنکھیں اور میرے بچپن کی وہ پہلی مہم... سب کچھ آج بھی میرے اندر زندہ ہے۔

یادوں کی ریشمی چادر

جب کبھی شام کو تنہا بیٹھتا ہوں اور دھوپ کھڑکی سے گذر کر کمرے کی دیوار پہ نقش بناتی ہے تو میں ایک بار پھر الہ آباد کی ان گلیوں میں جانکلتا ہوں۔

نظامی صاحب کی خوبصورت آواز پیار بھرا لہجہ سنائی دیتا ہے۔

آفاق کا ہنسنا، وقار کا چھیڑنا، منا کا روٹھنا، سب کچھ واپس آجاتا ہے۔

بچپن گذر گیا۔ والد گرامی کی گود اب یادوں میں ہے۔ مگر جو بچا ہے، وہ محبت کا لمس، علم کی خوشبو اور وہ مہربان شہر-- الہ آباد، جو میرے بچپن کا پہلا خواب تھا، پہلا پڑاؤ شاید پہلی منزل بھی اور میری روح کی پہلی پرواز بھی۔

باب دوم

وقت کے بعض دریچے ایسے ہوتے ہیں جہاں سے جھانک کر ہم ایک پورے عہد کی دھڑکن سن سکتے ہیں۔ یہ باب قلم، صحافت، نظامت اور فکری رفاقت کے اسی روشن دور کی جھلک پیش کرتا ہے، جس میں " تاجدار" اور" پاسبان" صرف اخبارات و رسائل نہیں بلکہ ایک فکری تحریک کی آواز تھے۔

قافلۂ قلم اور نظامت کے نگینے

علامہ کامل سہسرامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور تاجدار کی کہانی

بیسویں صدی کے آخری عشروں میں جب ذرائع ابلاغ کی دنیا آج کی طرح وسیع اور برق رفتار نہ تھی، اُس وقت مذہبی صحافت ملت کی فکری رہنمائی کا ایک مؤثر ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ اہلِ سنّت و جماعت کے حلقوں میں ''تاجدار'' اور ''پاسبان'' جیسے رسائل و جرائد محض اخبارات نہیں تھے بلکہ ایک فکری تحریک، علمی مکالمے اور دینی شعور کے ترجمان تھے۔

''تاجدار'' نے جہاں مذہبِ اہلِ سنّت کے علمی اور فکری مؤقف کو مضبوط آواز بخشی، وہیں ''پاسبان'' نے قومی، ملی اور تنظیمی مسائل پر اہلِ سنّت کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کی۔ ان رسائل کے صفحات پر اس دور کے ممتاز علماء، خطباء، ادباء اور اہلِ قلم کی تحریریں شائع ہوتی تھیں، جن کے ذریعے دینی فکر، ملی شعور اور علمی ذوق کی آبیاری کا کام انجام پاتا تھا۔ علامہ مشتاق احمد نظامی اور علامہ کامل سہسرامی اسی صحافتی وفکری تحریک کے دو درخشاں ستون تھے، جن کی قلمی رفاقت نے اس عہد کی مذہبی صحافت کو ایک خاص وقار اور اعتبار عطا کیا۔

کمرے کے کونے میں رکھی ہوئی الماری اور الماری میں کچھ کاغذات پڑے تھے-- سفرنامے نہیں تھے مگر ان میں سفر کی خوشبو تھی۔ ''تاجدار'' اور'' پاسبان'' کے کچھ پرانے شمارے، کناروں سے زرد مگر الفاظ سے چمکتے دمکتے ہوئے۔ ان میں وہ تحریریں تھیں جو محض جملے نہیں بلکہ علامہ کامل سہسرامی علیہ الرحمۃ والرضوان کے مضطرب اور بے چین دل کی دھڑکنیں تھیں۔ وہ تحریریں جنہیں والد گرامی لکھا نہیں کرتے تھے، ادا کرتے تھے۔ جیسے کوئی نیند میں بھی تسبیح پڑھ رہا ہو۔

تاجدار اور پاسبان ان کے لیے صرف رسالہ اور اخبار نہیں تھا، ایک اذان تھی جو وقتاً فوقتاً ان کے دل سے نکل کر کاغذ پہ اترتی۔ اور اس اذان کے مؤذن تھے علامہ مشتاق احمد نظامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔

جب تاجدار کا پہلا شمارہ شائع ہوا، تو اسے صرف ایک صحافتی تجربہ نہ سمجھا گیا-- بلکہ یہ اہلِ سنّت و جماعت کے فکری کارواں کا قافلۂ قلم بن گیا، مسلک اعلیٰ حضرت کا بے باک ترجمان اور حق و حقانیت کا موذن بھی۔ اس قافلے کے آگے آگے علامہ مشتاق احمد نظامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے اور جن کے ہاتھ میں مشعل تھی، وہ میرے والد گرامی حضرت علامہ کامل سہسرامی علیہ الرحمۃ والرضوان تھے۔

میں بچہ تھا مگر ''تاجدار'' کی اشاعت کے دنوں میں گھر کے ماحول میں جو نمایاں تبدیلی آتی، وہ مجھے بھی چھو کر گذرتی۔ والد صاحب کے کمرے میں کاغذات کے ڈھیر، خطوط، حاشیے، مسودے اور درمیان

میں ایک مکمل سکون -- جیسے وہ کاغذوں سے نہیں، کسی روحانی فریضے سے نبردآزما ہوں۔ جب وہ ''تاجدار'' کے لیے کچھ لکھتے، تو ان کے چہرے پہ ایک خاص سنجیدگی اترتی۔ کبھی ایک لفظ پہ طویل توقف، کبھی کسی جملے کے بعد لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ اور کبھی ایک ٹھنڈی سانس، جیسے کسی دکھ کی تہہ سے کوئی حقیقت نکال لائے ہوں۔

''تاجدار'' کے لیے لکھنا ان کے لیے صرف مضمون نگاری نہیں تھا بلکہ یہ عقیدت کی پیش کش تھی۔ وہ اسے ایک ادبی عبادت جانتے تھے۔ اس لیے مہینے میں چاہے کتنی ہی مصروفیات ہوتیں، چند دن وہ ضرور مختص کرتے، جب صرف اور صرف ''تاجدار'' اور ''پاسبان'' کی خدمت کی جاتی۔ ایک بار میں نے والد صاحب سے پوچھا: ''ابا! آپ ہمیشہ ''تاجدار'' اور ''پاسبان'' کے لیے اتنی سنجیدگی سے کیوں لکھتے ہیں؟'' وہ کچھ لمحے خموش رہے۔ ان کے ہاتھ میں قلم تھا، سامنے چند مسودے بکھرے پڑے تھے۔ انہوں نے چشمہ ذرا سا اوپر کیا، میری طرف دیکھا اور مسکرا پڑے۔ وہ مسکراہٹ آج بھی مجھے بخوبی یاد ہے، شفقت سے بھری ہوئی، جیسے کسی معصوم سوال میں انہیں اپنے بچپن کی کوئی جھلک نظر آ گئی ہو۔

پھر بولے: ''بیٹا! یہ محض ایک پرچہ نہیں۔ یہ ایک زندہ عہد ہے جو اپنے دامن میں جماعتی درد، احساسِ ملت اور مستقبل کی منصوبہ بندیوں کی تحریک سمیٹے ہوئے ہے اور عہد نبھانے کے لیے جذبہ بھی چاہیے، ترتیب بھی اور صداقت بھی۔''

میں خموشی سے ان کا چہرہ دیکھتا رہا۔ شاید اس وقت ان کے الفاظ کی معنویت پورے طور پہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی، لیکن ان کے لہجے کی سنجیدگی میرے دل میں اترتی جا رہی تھی۔

انہوں نے میری خموشی پڑھ لی۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگے: ''دیکھو بیٹا! لکھنا آسان ہے، مگر ذمہ داری کے ساتھ لکھنا آسان نہیں۔ بہت سے لوگ لکھتے ہیں لیکن کچھ لوگ الفاظ کے ذریعے اپنی قوم کا درد بھی لکھتے ہیں۔ صحافت صرف خبروں کا کاروبار نہیں، یہ شعور کی امانت ہے۔''

پھر ذرا رکے، جیسے ماضی کے کسی دریچے میں جھانک رہے ہوں۔ ''ایک اچھا قلم کار صرف یہ نہیں دیکھتا کہ آج کیا ہو رہا ہے بلکہ یہ بھی سوچتا ہے کہ کل کیا ہونا چاہیے۔ وہ اپنے عہد کا گواہ بھی ہوتا ہے اور آنے والے وقت کا راہ نما بھی۔''

میں ہمہ تن گوش تھا۔ انہوں نے مسودے کے ایک صفحے پر نظر ڈالی اور دھیرے سے بولے: ''بیٹا یہ رسائل ہمارے لیے کاغذ کے چند صفحات نہیں ہیں۔ یہ ایک پیغام ہیں، ایک ذمہ داری ہیں۔ ان میں ہمارے بزرگوں کی محنتوں کی خوشبو ہے، ہمارے اکابر کے خواب ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے راستے کے نشان بھی۔''

پھر انہوں نے قلم اٹھایا، کاغذ پر چند الفاظ لکھے اور مسکراتے ہوئے کہا: ''اور یاد رکھو قلم کی اصل عزت اس کی خوبصورتی میں نہیں، اس کی صداقتوں میں ہوتی ہے۔''

اس روز گفتگو تو ختم ہو گئی، مگر ان کے یہ الفاظ میرے اندر کہیں محفوظ ہو گئے۔ وقت گذرتا رہا، عمر کے موسم بدلتے رہے مگر آج جب کبھی کسی کاغذ پر قلم رکھتا ہوں اور کچھ لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے والد صاحب کی وہی نرم آواز وہی ہدایت و رہنمائی کے جملے اب بھی کانوں میں گونج رہے ہوں: ''عہد نبھانے کے لیے جذبہ بھی چاہیے، ترتیب بھی اور صداقت بھی۔''

ان کا یہ جملہ، برسوں بعد بھی میرے دل میں بجتا ہے، جیسے کسی قدیم قلعے کی فصیل پہ لکھی ہوئی کوئی عبارت، جو بارشوں میں بھی نہیں مٹتی، دھوپ کی تپش اور تمازت بھی اس کے رنگ پھیکے نہیں کرتی۔

''تاجدار'' کی نشستوں میں، جب محفل سجی ہوتی، ادباء، شعراء، علماء جمع ہوتے -- اس وقت میرے والد گرامی کے لب کھلتے۔ وہ نثر و نظم دونوں میدان کے شہ سوار تھے۔ نظامت خطابت اور شاعری ان کے لیے صرف تفریحی ترتیب نہیں تھی بلکہ وہ سامعین کو خیال کی لکیر پہ چلانے کا ہنر رکھتے تھے۔ وہ آغاز کرتے تو الفاظ اپنی جگہ چھوڑ دیتے، آہنگ و انداز سامع کو اپنی گرفت میں لے لیتے۔ نہ بلند آہنگ، نہ خطیبانہ جوش، بس دل کی بات، دل کے انداز میں۔ ایک مرتبہ، کسی مقامی محفل میں جب والد صاحب نے نظامت کے دوران کوئی شعر پڑھ کر اس پہ ایسا تبصرہ کیا کہ حاضرین کی آنکھیں نم ہو گئیں -- تب

ایک بزرگ نے مجھ سے کہا: ''تم جانتے ہو؟ تمہارے ابا صرف بولتے نہیں، احوالِ دل سناتے ہیں۔''

علامہ مشتاق احمد نظامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ان پہ نہ صرف اعتماد کرتے تھے بلکہ تاجدار کی معنوی وظاہری اساس میں وہ ان کے وجود کو مرکزی حیثیت سمجھتے تھے۔ ہر بار جب رسالے کی اشاعت قریب آتی، والد گرامی کی طبیعت میں ایک فکری اضطراب و بے چینی پیدا ہو جاتی۔

وہ خطوط کے ذریعے نظامی صاحب سے مشورے کرتے، بعض دفعہ وہ سفر میں ٹرین چھوڑ کر الہ آباد ٹھہر جاتے، صرف اس لیے کہ رسالے کی روحانی صحت کا جائزہ لے سکیں۔

ان کی فکری وابستگی میں کوئی رسمی رشتہ نہیں تھا۔

یہ دو قلوب کی ہم آہنگی تھی، دو اہلِ قلم کی خاموش قربت، ایسا تعلق، جو لفظوں سے نہیں، رفاقت کی خموشی سے زندہ رہتا ہے۔ یاد پڑتا ہے، ایک بار والد گرامی نے تاجدار کے کسی شمارے میں لکھا تھا:

''ہم لکھتے نہیں، لوٹاتے ہیں... دل کی قیمتی قاش، نظامی بھائی کی امانت بنا کر۔''

مجھے لگا جیسے یہ الفاظ رسالے کی پیشانی پہ کندہ ہونے چاہئیں تھے۔ اور پھر، وقت گذرتا رہا... تاجدار شائع ہوتا رہا... محفلیں سجتی رہیں... نظامت کے نگینے دمکتے رہے... اور میرے والد، اس قافلۂ قلم کے درویش بنے، خموشی سے لکھتے، جھکتے اور مسکراتے رہے۔ آج بھی کبھی کسی پرانے شمارے کے زرد صفحات ہاتھ میں آ جائیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کاغذ نہیں، ایک پورا زمانہ سانس لے رہا ہو۔ لفظ خاموش ہیں مگر ان کے پیچھے دو آوازیں اب بھی سنائی دیتی ہیں، ایک نظامی صاحب کی اور دوسری کامل سہسرامی کی۔ قافلہ آگے بڑھ چکا ہے، مسافر رخصت ہو چکے ہیں، مگر قافلۂ قلم کی گرد آج بھی یادوں کے افق پر چمکتی دکھائی دیتی ہے۔ علامہ کامل سہسرامی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ نظامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا تعلق دو دلوں کا مکالمہ تھا۔۔ ایسا مکالمہ جو چھپتا نہیں، مگر سننے والوں کو بدل دیتا ہے۔۔ جاری۔۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

□□□□

باقی صفحہ 63 کا ملاحظہ فرمائیں۔۔۔

یہ دراصل محض میڈیا کی تکنیک میں تبدیلی نہیں بلکہ فکر کی ساخت میں ایک گہرا انقلاب ہے۔ اس عہد میں ساقی بھی بدل چکا ہے، اس کا کام پیاس بجھانا نہیں، طلب پیدا کرنا ہے، اب وہ تشنگی کا مداوا نہیں کرتا بلکہ اسے کاروبار میں بدل دیتا ہے، سوال کی صداقت سے نہیں، اس کی مارکیٹنگ سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں جو جام ہے وہ معرفت سے خالی مگر چمک سے بھرپور ہے لبوں کو تر کرتا ہے مگر شعور کو سیراب نہیں کرتا۔ اس میخانے میں پینے والے کی ضرورت نہیں دیکھی جاتی، صرف اس کی کمزوری پہچانی جاتی ہے اور پھر اسی کمزوری کے مطابق ذائقہ بدلا جاتا ہے۔ یوں پیاس باقی رہتی ہے، جام بدلتے رہتے ہیں اور گمان کیا جاتا ہے کہ تشنگی بڑھ جانا ہی زندگی کی علامت ہے۔ درحقیقت یہ بیداری نہیں، ایک منظم غفلت ہے جسے تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ میخانہ نیا ہے، جہاں نشہ بیداری کا نہیں، غفلت کا ہے اور پیمانہ بھی نیا ہے، جس میں عقل نہیں، جذبات ناپے جاتے ہیں۔ یہاں دلیل کی قدر اس کی صحت سے نہیں، اس کی تیزی سے متعین ہوتی ہے، ظرف کی وسعت نہیں دیکھی جاتی، صرف آواز کی بلندی ناپی جاتی ہے۔ ایسے میں اگر ذمہ دار علما اور حساس صحافی اس میدان سے الگ رہیں تو یہ فرار نہیں، ایک اخلاقی انتخاب ہے۔ کیونکہ ہر پلیٹ فارم اظہار کے لائق نہیں ہوتا اور ہر دعوت قبول کرنا حکمت نہیں۔ کچھ محفلیں ایسی ہوتی ہیں جہاں شرکت خود اپنی بات کو بھی مشتبہ بنا دیتی ہے۔

قوم وملت کی خدمت کا راستہ ہمیشہ اسٹیج سے نہیں گذرتا۔ بعض اوقات اصل خدمت یہ ہوتی ہے کہ علم کو اس تماشا گاہ میں داخل ہی نہ ہونے دیا جائے جہاں اس کی حرمت برقرار نہ رہ سکے۔ خاموشی یہاں کمزوری نہیں، مزاحمت بن جاتی ہے اور انکار ایک بامعنیٰ موقف۔

شاید یہی ہمارے عہد کا سب سے بڑا فلسفیانہ المیہ ہے کہ ہم بولنے کے حق پر تو زور دیتے ہیں مگر نہ بولنے کے اخلاق کو بھول گئے ہیں۔ حالانکہ تاریخ گواہ ہے۔ کچھ زمانوں میں الفاظ بول کر ضائع ہوتے ہیں اور کچھ زمانوں میں بچا لیے جاتے ہیں۔ خاموشی اگر وقار کی حفاظت کے لیے ہو، تو وہ بھی ایک بلیغ جواب ہوتی ہے۔

□□□□

محمد ملک الظفر سہسرامی

مذہبی صحافت: خون دل سے روشن چراغ

علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور مذہبی صحافت کی داستان

قلم جب اخلاص کے نور سے منور ہو اور اس کی روشنائی عشقِ مصطفیٰ ﷺ کے جذبوں سے رنگ اختیار کر لے تو اس کے لکھے ہوئے الفاظ صرف اوراق کی زینت نہیں بنتے بلکہ ایمان کی حرارت، محبت کی لطافت اور دعوتِ حق کی تاثیر کے امین بن جاتے ہیں۔ جب تحریر کا مقصد شہرت نہیں بلکہ خدمتِ دین بن جائے تو پھر صحافت محض خبروں کی ترسیل کا نام نہیں رہتی بلکہ وہ حق وصداقت کی اذان، امت کے ضمیر کی آواز اور فکری محاذ پر لڑی جانے والی ایک مقدس جنگ بن جاتی ہے۔

ایسی صحافت کے اوراق پہ صرف قلم کی روشنائی نہیں بکھرتی بلکہ عقیدت کے آنسو، دردِ ملت کی کسک اور اصلاحِ معاشرہ کی تڑپ بھی رقم ہوتی ہے۔ اس کے ایک ایک حرف میں دعوتِ حق کی روشنی، ہر ہر سطر میں اخلاص کا پیغام اور ہر ایک مضمون میں بیداریِ فکر کا چراغ فروزاں نظر آتا ہے۔ وہ باطل کے اندھیروں سے سمجھوتہ نہیں کرتی بلکہ صداقت کے چراغ ہاتھ میں لیے زمانے کے طوفانوں کا مقابلہ کرتی ہے۔

یہی وہ صحافت ہے جو قوموں کے شعور کو جلا بخشتی، نسلوں کی فکری رہنمائی کرتی اور تاریخ کے دھارے کو مثبت سمت عطا کرتی ہے۔ اس کے نزدیک قلم ایک امانت، تحریر ایک ذمہ داری اور اظہارِ حق عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ ایسے قلم کار اپنے الفاظ کی قیمت شہرت کے بازار سے نہیں لیتے بلکہ اپنے ضمیر، اپنے ایمان اور اپنے رب ذوالجلال اور اس کے محبوب رسول ﷺ کی رضا سے متعین کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک قلم محض اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ امانتِ حق کی ادائیگی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ لفظوں کو فروخت نہیں کرتے بلکہ انہیں مقصد و پیغام کا لباس پہناتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں وقتی مقبولیت کی چمک نہیں بلکہ اخلاص کی وہ حرارت ہوتی ہے جو دلوں کو حرارت بخشتی اور ذہنوں کو روشن کرتی ہے۔ وہ حالات کے دباؤ سے مرعوب نہیں ہوتے، مصلحتوں کے جال میں نہیں الجھتے اور نہ ہی باطل کی تائید میں اپنے قلم کو جھکنے دیتے ہیں۔ ان کے لیے سب سے بڑا اعزاز یہ ہوتا ہے کہ ان کی لکھی ہوئی سطریں حق کی گواہی بن جائیں، ملت کی رہنمائی کا سبب بنیں اور بارگاہِ الٰہی میں قبولیت کا شرف حاصل کر لیں۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے خونِ جگر سے تاریخ کے اوراق پہ ایسی روشن تحریریں ثبت کر جاتے ہیں جن کی روشنی نسلوں تک راہِ حق کے مسافروں کی رہنمائی کرتی رہتی ہے۔

لیکن تاریخ کے ہر دور کی طرح آج بھی حق اور مصلحت، دیانت اور مفاد، تحقیق اور سنسنی کے درمیان ایک کشمکش جاری ہے، اور موجودہ صحافتی فضا اسی کشمکش کا ایک تشویش ناک منظر پیش کر رہی ہے۔

لیکن تاریخ کے ہر دور کی طرح آج بھی حق اور مصلحت، دیانت اور مفاد، تحقیق اور سنسنی کے درمیان ایک کشمکش جاری ہے اور موجودہ صحافتی فضا اسی کشمکش کا ایک تشویش ناک منظر پیش کر رہی ہے۔

ایسے ماحول میں جہاں شور کو خبر، سنسنی کو تجزیہ اور افواہ کو حقیقت بنا کر پیش کیا جا رہا ہو، وہاں حق گوئی ایک عظیم جہاد کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اطلاعات کی رفتار بے شک تیز ہو گئی ہے مگر تحقیق کی روح کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ خبر پہلے پھیلائی جاتی ہے اور اس کی صداقت بعد میں تلاش کی جاتی ہے۔

نتیجتاً معاشرے شکوک وشبہات کے شکار، عوام فکری انتشار میں

مبتلا اور حق و باطل کی تمیز دھندلاہٹ کی شکار ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حق پرست قلم کی اہمیت ہر دور میں مسلّم رہی ہے لیکن آج کے پُرآشوب ابلاغی ماحول میں اس کی ضرورت کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ جب اطلاعات کی دنیا میں آوازوں کا ہجوم سچائی کی شناخت کو مشکل بنا دے، تب دیانت دار قلم ہی حق و صداقت کا سب سے معتبر ترجمان بن کر سامنے آتا ہے۔

اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ کا ایک بڑا حصہ رہنمائی کی بجائے رائے سازی اور ذہن سازی کا آلہ بن گیا ہے۔ الفاظ کے ذریعے جذبات بھڑکائے جاتے ہیں، تصویروں کے ذریعے تصورات بدلے جاتے ہیں اور خبروں کے انتخاب کے ذریعے لوگوں کی ترجیحات متعین کی جاتی ہیں۔ یوں بسا اوقات حقیقت وہ نہیں رہتی جو واقع ہوتی ہے بلکہ وہ بن جاتی ہے جو دکھائی جاتی ہے۔

ایسے حالات میں ذمہ دار صحافت کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ وہ صحافت جو سچائی کو مصلحت پر، اصول کو مفاد پر اور امانت کو شہرت پر ترجیح دے۔ جو اقتدار کے ایوانوں کی ترجمان نہیں بلکہ عوام کے ضمیر کی آواز ہو۔ جو اختلاف کو نفرت میں اور تنقید کو دشمنی میں تبدیل کرنے کی بجائے فہم، اعتدال اور مکالمے کی فضا پیدا کرے۔

بالخصوص مذہبی صحافت کی ذمہ داری اور بھی عظیم ہے، کیونکہ اس کا تعلق صرف معلومات کی ترسیل سے نہیں بلکہ افکار کی اصلاح، عقائد کے تحفظ اور اخلاقی اقدار کے فروغ سے بھی ہے۔ جب دنیا کے بیشتر منبر مفادات کے گرد گھوم رہے ہوں تو دینی صحافت کا فرض ہے کہ وہ حق، دیانت، اعتدال اور اخلاص کی شمع روشن رکھے تاکہ آنے والی نسلیں شورِ باطل کے ہجوم میں بھی صدائے حق کی معرفت حاصل کر سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی فکری زندگی صرف اسلحوں، معیشت اور سیاست سے محفوظ نہیں رہتی بلکہ سچی، دیانت دار اور بااصول صحافت بھی ان کی بقا کی ضامن ہوتی ہے۔ جب قلم حق کے لیے اٹھتا ہے تو وہ محض روشنائی نہیں بکھیرتا بلکہ ذہنوں کو روشنی، دلوں کو یقین اور معاشروں کو صحیح سمت عطا کرتا ہے۔ یہی وہ صحافت ہے جو وقت کے طوفانوں میں بھی چراغِ ہدایت بن کر نسلوں کی رہنمائی کرتی ہے۔ یہ تو صحافت کے وہ ثمرات ہیں جو معاشروں کی فکری اور اجتماعی زندگی کو جِلا بخشتے ہیں، لیکن جب یہی چراغِ قلم ایمان کی وادیوں کو منور کرنے لگے اور دینی شعور کی آبیاری کا ذریعہ بن جائے تو اس کی روشنی اور بھی بابرکت اور دوررس ہو جاتی ہے۔

لیکن صحافت کا سب سے روشن اور مقدس پہلو وہ ہے جو محض قومی یا سماجی مفادات تک محدود نہیں رہتا بلکہ انسان کے ایمان، فکر اور اخلاق کی نگہبانی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مذہبی صحافت اپنی حقیقی معنویت اور غیر معمولی اہمیت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

ایسے ماحول میں مذہبی صحافت کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

مذہبی صحافت محض ایک صحافتی سرگرمی نہیں بلکہ امانتِ نبوت ﷺ کی ایک ادنیٰ جھلک ہے۔ یہ انبیائے کرام علیٰ نبینا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اس فریضۂ تبلیغ کا عصری تسلسل ہے جس کا مقصد انسان کو حق سے جوڑنا، باطل سے آگاہ کرنا اور خیر و شر کے درمیان امتیاز پیدا کرنا ہے۔ جب فکری انتشار کی آندھیاں چل رہی ہوں، جب الحاد نئے نئے چہروں کے ساتھ نوجوان نسل کے اذہان پر حملہ آور ہو، جب مادہ پرستی روحانیت کو نگلنے کے درپے ہو، جب عشقِ رسول ﷺ کو انتہا پسندی اور دینی حمیت کو رجعت پسندی قرار دیا جا رہا ہو، تو ایسے میں مذہبی صحافت ایمان کے قلعے کی فصیل بن جاتی ہے۔

یہ وہی صحافت ہے جو بتاتی ہے کہ دین کوئی ماضی کا قصہ نہیں بلکہ حال کا شعور اور مستقبل کی ضمانت ہے۔ یہ وہی آواز ہے جو اعلان کرتی ہے کہ اسلام کسی مخصوص زمانے کی ضرورت نہیں بلکہ ہر زمانے کی رہنمائی ہے۔

مذہبی صحافت کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس کا محور خبر نہیں بلکہ ہدایت ہوتی ہے۔ دنیاوی صحافت اکثر واقعات بیان کرتی ہے جبکہ مذہبی صحافت واقعات کے پس منظر میں چھپے ہوئے اخلاقی، روحانی اور فکری اسباق آشکار کرتی ہے۔ وہ صرف یہ نہیں بتاتی کہ کیا ہوا بلکہ یہ بھی بتاتی ہے کہ کیوں ہوا، اس سے کیا سبق ملتا ہے اور اس کے

تناظر میں شریعت واخلاق کا موقف کیا ہے۔

یہ صحافت قوموں کو صرف باخبر نہیں کرتی بلکہ بیدار کرتی ہے۔

یہ دلوں میں سوال پیدا کرتی ہے، ضمیر کو جھنجھوڑتی ہے، ایمان کو تازگی بخشتی ہے اور فکر وعمل کی نئی راہیں متعین کرتی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی امت پر فکری یلغار ہوئی، مذہبی صحافت نے مورچے سنبھالے۔ برصغیر میں اکابر اہلِ سنّت نے رسائل وجرائد کے ذریعے جس فکری جہاد کو زندہ رکھا، وہ دراصل قلم کی اسی مقدس جنگ کا روشن باب ہے۔ ان کے نزدیک صحافت کاروبار نہیں تھی بلکہ دعوت دین تھی، شہرت نہیں تھی بلکہ خدمت تھی اور منصب نہیں تھی بلکہ ذمہ داری تھی۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی اپنے قلم کو اسی مقصد کے لیے وقف کیا۔ آپ نے محسوس کر لیا تھا کہ فتنے صرف تلواروں سے نہیں آتے، بعض اوقات وہ کتابوں، رسالوں اور نظریات کی شکل میں بھی در آتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے قلم کو سپر بھی بنایا اور شمشیر بھی۔ آپ کی تحریریں آج بھی اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ جب اہلِ حق قلم اٹھاتے ہیں تو زمانوں کا رخ بدل جاتا ہے۔

آپ نے اپنے عہد کے فکری، اعتقادی اور مذہبی چیلنجوں کا مقابلہ محض جذباتی نعروں سے نہیں بلکہ علم، تحقیق اور استدلال کی قوت سے کیا۔ باطل نظریات کے تعاقب میں آپ کی نگاہ اتنی گہری تھی کہ فتنوں کے ابتدائی آثار ہی سے ان کے نتائج کا اندازہ فرما لیتے تھے اور حق کی توضیح میں آپ کا اسلوب ایسا جامع تھا کہ مخالف بھی آپ کے تبحر علمی کا اعتراف کیے بغیر نہ رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تصنیفات محض کتابیں نہیں بلکہ عقیدۂ اہلِ سنّت کی مضبوط فصیلیں اور فکری رہنمائی کے روشن مینار ہیں۔ آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ قلم جب اخلاص، علم اور عشقِ رسول ﷺ سے وابستہ ہو جائے تو اس کی تاثیر سرحدوں اور زمانوں کی قید سے آزاد ہو جاتی ہے۔ ایک طرف آپ کی تحریروں نے اہلِ ایمان کے عقائد کو استحکام بخشا، دوسری طرف گمراہ کن افکار و نظریات کے سیلاب کے آگے بند باندھ دیا۔ آپ کے رسائل اور فتاوے نے امت کو یہ شعور عطا کیا کہ حق کی حفاظت صرف میدانِ کارزار میں نہیں بلکہ میدانِ قلم میں بھی کی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی صحافتی وقلمی جدوجہد ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ افکار کی دنیا میں سب سے مؤثر طاقت دلیل سے آراستہ قلم کی ہوتی ہے۔ تلوار جسموں کو زیر کر سکتی ہے مگر قلم دلوں اور ذہنوں کو مسخر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے عہد کے بہت سے شور وغوغا تاریخ کے گرد وغبار میں گم ہو گئے مگر آپ کی تحریروں کی روشنی آج بھی اہلِ حق کے لیے مشعلِ راہ بنی ہوئی ہے اور آنے والی نسلوں کو یہ پیغام دے رہی ہے کہ جب علم، اخلاص اور حق گوئی یکجا ہو جائیں تو ایک قلم بھی ایک عہد کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ مذہبی صحافت دراصل فکری سرحدوں کی نگہبان ہے۔

یہ عقائد کی حفاظت کرتی ہے، نسلوں کی تربیت کرتی ہے، تاریخ کی امانتوں کو محفوظ رکھتی ہے، اکابر کے افکار زندہ رکھتی ہے اور امت کو اپنی اصل شناخت سے وابستہ رکھتی ہے۔

آج سوشل میڈیا کے طوفانی دور میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ چند لمحوں میں جھوٹ لاکھوں لوگوں تک پہنچ جاتا ہے، افواہیں حقیقت کا لبادہ اوڑھ لیتی ہیں اور فتنے خبر کے روپ میں گھر گھر داخل ہو جاتے ہیں۔ ایک غیر مصدقہ بات پلک جھپکتے ہی رائے عامہ کو متأثر کر دیتی ہے، کردار کشی کو تحقیق کا نام دے دیا جاتا ہے اور سنسنی خیزی کو صحافت سمجھ لیا جاتا ہے۔ ایسے میں حق وصداقت کی آواز اکثر شور کے ہجوم میں دب جاتی ہے اور تحقیق ودیانت کی روایت تیزی اور مقبولیت کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جہاں ہر شخص کے ہاتھ میں ابلاغ کا ایک طاقتور ذریعہ موجود ہے مگر ہر صاحب ذریعہ، امانتِ خبر اور ذمہ داریِ اظہار کا اہل نہیں۔ الفاظ پہلے سے کہیں زیادہ تیزی سے سفر کرتے ہیں لیکن ان کی سچائی کی جانچ پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہو گئی ہے۔ ایک بٹن دبانے سے کوئی خبر براعظم کی سرحدیں عبور کر لیتی ہے، ایک افواہ چند لمحوں میں ہزاروں ذہنوں کو متأثر کر دیتی ہے اور ایک غیر مصدقہ بات دیکھتے دیکھتے اجتماعی رائے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ایسے ماحول میں قلم اور زبان کی ذمہ داری کئی گنا بڑھ جاتی ہے، کیونکہ ایک جھوٹی خبر

دلوں میں نفرت، خاندانوں میں اختلاف، جماعتوں میں بداعتمادی اور معاشروں میں انتشار پیدا کرسکتی ہے، جبکہ ایک سچی، متوازن اور ذمہ دار تحریر اعتماد، اتحاد، فکری استحکام اور اجتماعی خیر کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

اسی حقیقت کی طرف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدیوں پہلے نہایت حکیمانہ انداز میں رہنمائی فرمائی تھی:

''كَفَى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ''

یعنی: ''آدمی کے جھوٹے ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ جس سے جو بات سنی شیئر کرتا چلا جائے۔''

یہ حدیثِ مبارکہ دراصل ابلاغ اور خبر رسانی کے پورے اسلامی تصور کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ اس میں صرف جھوٹ گڑھنے سے منع نہیں کیا گیا بلکہ بلا تحقیق ہر سنی سنائی بات کو آگے بڑھانے کو بھی جھوٹ کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے۔ گویا اسلام نے صدیوں پہلے یہ اصول واضح کر دیا تھا کہ خبر کی اشاعت سے پہلے اس کی تحقیق، جانچ اور تصدیق ضروری ہے۔

آج جب ذرائع ابلاغ کی وسعت نے ہر فرد کو ایک غیر رسمی صحافی بنا دیا ہے، اس حدیثِ پاک کی معنویت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایسے دور میں مذہبی صحافت کی ذمہ داری محض خبروں کی ترسیل تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ حقائق کی تحقیق، افکار کی اصلاح، عقائد کی حفاظت اور اخلاقی اقدار کے فروغ کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔ مذہبی صحافت لوگوں کو یہ احساس دلاتی ہے کہ خبر صرف ایک اطلاع نہیں بلکہ ایک امانت ہے اور امانت میں خیانت صرف صحافتی لغزش نہیں بلکہ ایک اخلاقی اور دینی جرم بھی ہے۔

چنانچہ مذہبی صحافت کا اصل امتیاز یہی ہے کہ وہ رفتار سے زیادہ صداقت، سنسنی سے زیادہ تحقیق، مقبولیت سے زیادہ دیانت اور وقتی فائدے سے زیادہ رضائے الٰہی کو اہمیت دیتی ہے۔ وہ خبر کو محض فروخت ہونے والی شی نہیں سمجھتی بلکہ اسے ایک ایسی امانت تصور کرتی ہے جس کے بارے میں بارگاہِ الٰہی میں جواب دہ ہونا ہے۔ یہی احساسِ جواب دہی مذہبی صحافت کو عام صحافت سے ممتاز کرتا اور اسے معاشرے کی فکری و اخلاقی زندگی کا ایک ناگزیر ستون بنا دیتا ہے۔

ایسے حالات میں دینی اور مذہبی صحافت کی ذمہ داری کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ جذبات کی بجائے بصیرت، تعصب کی جگہ انصاف اور افواہوں کی بجائے تحقیق کو اپنا شعار بنائے۔ اسے چاہیے کہ وہ امت کے سامنے حقائق امانت و دیانت کے ساتھ پیش کرے، فتنوں کی نشاندہی کرے، شبہات کا ازالہ کرے اور فکری انتشار کے اس دور میں اعتدال، حکمت اور خیر خواہی کی شمع روشن رکھے۔ آج ضرورت صرف خبروں کی اشاعت کی نہیں بلکہ شعور کی بیداری کی ہے، صرف معلومات کی فراہمی کی نہیں بلکہ بصیرت کی آبیاری کی ہے۔ یہی وہ فریضہ ہے جو سچی صحافت کو محض ایک پیشہ نہیں بلکہ ایک دینی، اخلاقی اور ملی ذمہ داری بنا دیتا ہے۔ جب قلم حق، دیانت اور خیر خواہی کے اصولوں سے وابستہ ہو جائے تو وہ سوشل میڈیا کے طوفانوں میں بھی چراغِ ہدایت بن کر لوگوں کو گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر حقیقت کی روشنی تک پہنچا سکتا ہے۔

ایسے میں مذہبی صحافت کا فرض ہے کہ وہ تحقیق، دیانت اور حق گوئی کے چراغ روشن کرے اور امت کو فکری گمراہیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔ یہ صحافت نفرت نہیں پھیلاتی بلکہ محبت سکھاتی ہے۔ یہ انتشار نہیں پیدا کرتی بلکہ وحدت کا درس دیتی ہے۔ یہ تعصب نہیں ابھارتی بلکہ عدل و انصاف کی تعلیم دیتی ہے۔ یہ انسان کو انسان سے اور بندے کو اپنے رب سے جوڑتی ہے۔ درحقیقت مذہبی صحافت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں امت اپنا ماضی بھی دیکھتی ہے، حال کا جائزہ بھی لیتی ہے اور مستقبل کی سمت بھی متعین کرتی ہے۔ یہ علم کا چراغ، بصیرت کا منبع اور روحانیت کا دروازہ ہے۔ اس کے صفحات محض قلم کی روشنائی سے نہیں لکھے جاتے بلکہ ان میں اہلِ حق کے اخلاص، دردِ ملت اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرارت شامل ہوتی ہے۔

آج اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نسلیں اپنے دین، عقیدے، تہذیب اور روحانی ورثے سے وابستہ رہیں، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ایمان کی شمعیں روشن رہیں، اگر ہم چاہتے ہیں کہ باطل کے شور میں حق کی آواز گم نہ ہو تو ہمیں مذہبی صحافت کی سرپرستی، ترویج اور تقویت کو اپنا دینی و ملی فریضہ سمجھنا ہوگا۔ کیونکہ مذہبی صحافت محض کاغذ پہ لکھی ہوئی تحریر

نہیں، یہ ایمان کی پاسبانی کا نام ہے۔

یہ محض رسائل و جرائد کا سلسلہ نہیں، یہ انبیائے کرام کے مشن کی ایک جھلک ہے۔ یہ صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں، یہ حق و صداقت کی اذان ہے۔ یہ صرف ایک قلم نہیں، یہ عشقِ رسول ﷺ کا پرچم ہے اور جب تک یہ پرچم بلند رہے گا، باطل کی تاریکیاں کبھی روشنی کو شکست نہیں دے سکیں گی۔ مذہبی صحافت دراصل امت کے زندہ ضمیر کی وہ صدا ہے جو ہر دور میں یہ اعلان کرتی رہتی ہے کہ حق باقی ہے، باطل مٹنے والا ہے اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ ہی ایمان کی سب سے روشن دلیل ہے۔

یہی وہ فکری پس منظر ہے جس میں مذہبی صحافت کی تاریخ بعض ایسی عظیم شخصیات سے مزین نظر آتی ہے جن کے قلم نے حق کی آواز کو دوام بخشا۔ علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ انہی درخشاں ستاروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے صحافت کو دین وملت کی بیداری کا مؤثر وسیلہ بنایا۔

علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ: مذہبی صحافت کا درخشاں باب

قلم جب ایمان کی حرارت سے روشن ہو، الفاظ جب عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی خوشبو سے معطر ہونے لگیں اور تحریر جب ملت کے درد کی ترجمان بن جائے تو پھر صحافت محض خبر رسانی کا نام نہیں رہتی بلکہ ایک تحریک، ایک دعوت اور ایک انقلاب بن جاتی ہے۔

ایسی صحافت کا ایک ایک حرف بیداریٔ فکر کا پیامبر، ہر سطر حق گوئی کی شہادت اور ہر مضمون اصلاحِ امت کا منشور بن جاتا ہے۔ اس کے صفحات پہ صرف خبریں نہیں لکھی جاتیں بلکہ عقیدت کی روشنی، کردار کی پاکیزگی اور ملت کی فکری رہنمائی کے نقوش ثبت ہوتے ہیں۔ وہ قلم جو سچائی کے لیے اٹھتا ہے، باطل کی تاریکیوں میں چراغ بن جاتا ہے اور وہ آواز جو اخلاص کے ساتھ بلند ہوتی ہے، زمانے کے شور میں بھی اپنی تاثیر برقرار رکھتی ہے۔

مذہبی صحافت دراصل دعوت و اصلاح کا وہ مقدس فریضہ ہے جس کے ذریعے دین کی حقانیت، اہلِ حق کی ترجمانی اور امت کے مسائل کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ یہ دلوں میں ایمان کی تازگی پیدا کرتی ہے، ذہنوں کو فتنوں کے غبار سے پاک کرتی ہے اور نسلوں کو اپنے اسلاف کی روشن روایات سے جوڑتی ہے۔ جب صحافت کا رشتہ ایمان، اخلاص اور عشقِ رسول ﷺ سے استوار ہو جائے تو اس کی تحریریں محض الفاظ کا مجموعہ نہیں رہتیں بلکہ دلوں کی دھڑکن، روحوں کی غذا اور معاشرے کی اصلاح کا مؤثر ذریعہ بن جاتی ہیں۔

اسی لیے تاریخ گواہ ہے کہ جن اہلِ قلم نے اپنی تحریروں کو دین وملت کی خدمت کے لیے وقف کر دیا، ان کے الفاظ وقت کی گرد میں گم نہیں ہوئے بلکہ چراغِ راہ بن کر آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ ان کی صحافت نے نہ صرف حق و صداقت کا پرچم بلند رکھا بلکہ عشقِ مصطفیٰ ﷺ، تحفظِ عقیدہ اور بیداریٔ ملت کے ایسے نقوش چھوڑے جو آج بھی اہلِ حق کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔

برصغیر کی مذہبی صحافت کی تاریخ میں بعض نام ایسے ہیں جنہوں نے اپنے قلم کی روشنائی کو خونِ جگر سے سینچا، اپنے افکار کو ملت کے درد سے جوڑا اور اپنی تحریروں کو عشقِ رسول ﷺ کی حرارت عطا کی۔ انہی درخشاں ناموں میں ایک عظیم اور تابندہ نام علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ہے۔

وہ صرف ایک عالم، خطیب، مصنف اور مفکر ہی نہ تھے بلکہ مذہبی صحافت کے اس میدان کے مردِ مجاہد تھے جہاں الفاظ تلوار بنتے ہیں، جملے مورچے بن جاتے ہیں اور تحریریں فتنوں کے مقابلے میں سپاہیوں کی صفیں آراستہ کرتی ہیں۔ ہر عہد اپنے محافظوں کو خود پہچانتا ہے اور علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قلم کی اصل قدر و قیمت بھی اسی وقت واضح ہوتی ہے جب ہم اس دور کے فکری طوفانوں اور اعتقادی چیلنجوں پہ نظر ڈالتے ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب تجدد، لادینیت، مادہ پرستی اور فکری انتشار کے بادل ملت کے افق پر منڈلا رہے تھے۔ عقائد پر حملے ہو رہے تھے، عشقِ رسول ﷺ کو جذباتیت قرار دیا جا رہا تھا اور نئی نسل کو اپنی تہذیبی و دینی شناخت سے دور کرنے کی منظم کوششیں جاری تھیں۔ ایسے میں علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے قلم اٹھایا اور اسے محض تحریر کا ذریعہ نہیں بلکہ دفاعِ اسلام کا ہتھیار بنا دیا۔

چنانچہ جب ملت کو فکری یلغار کا سامنا ہوا تو ان کی شخصیت کا ایک

اور درخشاں پہلو سامنے آیا اور وہ مذہبی صحافت کے محاذ پر ایک بے باک مردِ مجاہد کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ ان کی صحافت کسی جماعتی مفاد کی اسیر نہ تھی، نہ کسی سیاسی مصلحت کی پابند۔ ان کا قلم صرف حق کا ترجمان تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جب باطل کے پاس ذرائع ابلاغ کی قوت ہو تو اہلِ حق کے پاس صداقتِ بیان کی قوت ہونی چاہیے۔ اسی لیے انہوں نے صحافت کو دعوت و اصلاح کا مؤثر ترین وسیلہ بنایا۔

ان کی تحریروں میں علم کی گہرائی تھی، استدلال کی قوت تھی، عشقِ رسول ﷺ کی چاشنی تھی اور ملت کے درد کی تپش تھی۔ وہ لکھتے تو محسوس ہوتا کہ قلم نہیں چل رہا بلکہ ایک بیدار ضمیر اپنے عہد کے فتنوں کے خلاف احتجاج کر رہا ہے۔ یہ محض الفاظ کی ترتیب نہیں بلکہ احساسِ ذمہ داری کی وہ صدا ہے جو باطل کے شور میں حق کی آواز زندہ رکھنے کے لیے بلند ہو رہی ہے۔ اس کے نوکِ قلم سے روشنائی نہیں ٹپکتی بلکہ دردِ ملت، سوزِ دل اور خیر خواہیِ انسانیت کے جذبات صفحۂ قرطاس پہ بکھر جاتے ہیں۔ ہر سطر میں حق گوئی کی جرأت، ہر جملے میں صداقت کی حرارت اور ہر مضمون میں اصلاحِ معاشرہ کی تڑپ موجزن دکھائی دیتی ہے۔

یہ قلم زمانے کے جبر کے سامنے خموش رہنے کا قائل نہیں بلکہ وہ چراغ ہے جو اندھیروں کے ہجوم میں بھی اپنی روشنی برقرار رکھتا ہے۔ جب افواہیں حقیقت کا روپ دھار لیتی ہیں، جب مفادات اصولوں پر غالب آنے لگتے ہیں اور جب حق و باطل کی سرحدیں دھندلانے لگتی ہیں، تب یہی بیدار ضمیر قلم کی صورت اختیار کر کے لوگوں کو شعور، بصیرت اور فکری دیانت کا پیغام دیتا ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والا صرف ایک مضمون نہیں تحریر کر رہا بلکہ اپنے عہد کی فکری گمراہیوں کے خلاف ایک خموش مگر مؤثر جہاد انجام دے رہا ہے، ایسا جہاد جس کا ہتھیار دلیل ہے، جس کی قوت اخلاص ہے اور جس کا مقصد حق کی سربلندی اور انسانیت کی رہنمائی ہے۔ یہی وہ قلم ہے جو زمانوں کو بدلنے، افکار کو جگانے اور آنے والی نسلوں کے لیے حق و صداقت کے نقوش محفوظ رکھنے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایسے صاحبانِ قلم کی تحریریں وقتی حالات کی ترجمان بن کر نہیں رہ جاتی بلکہ وہ ایک زندہ فکری روایت کا حصہ بن کر دلوں میں اترتی، ذہنوں کو بیدار کرتیں اور حق کی آواز کو نسل در نسل منتقل کرتی رہتی ہیں۔ ان کے جملے محض الفاظ نہ تھے بلکہ ایمان کی دھڑکنیں تھے، ان کے مضامین محض تحریریں نہ تھے بلکہ فکری محاذوں پر نصب پرچم تھے۔

علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مذہبی صحافت کو منبر و محراب کی توسیع بنا دیا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ اگر خطیب کا خطاب چند ہزار لوگوں تک پہنچتا ہے تو صحافی کا قلم نسلوں تک سفر کرتا ہے۔ اگر منبر کی آواز چند لمحوں میں خموش ہو جاتی ہے تو قلم کی آواز صدیوں تک زندہ رہتی ہے۔ ان کی صحافت کا سب سے روشن پہلو یہ تھا کہ وہ دفاعی نہیں بلکہ تعمیری صحافت کے علمبردار تھے۔ وہ صرف فتنوں کا رد نہیں کرتے تھے بلکہ ایمان کی تعمیر بھی کرتے تھے۔ صرف باطل کی تردید نہیں کرتے تھے بلکہ حق کی عظمت بھی اجاگر کرتے تھے۔ صرف اندھیروں کی شکایت نہیں کرتے تھے بلکہ روشنی کے چراغ بھی جلاتے تھے۔

ان کے نزدیک مذہبی صحافت کا مقصد محض معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ شعور پیدا کرنا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان صرف خبر نہ پڑھے بلکہ خبر کا پس منظر بھی سمجھے۔ صرف واقعات نہ جانے بلکہ ان سے سبق بھی حاصل کرے۔ صرف حالات سے واقف نہ ہو بلکہ ان کے مقابلے کی صلاحیت بھی پیدا کرے۔

علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تحریروں میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کا رنگ نمایاں تھا۔ ان کے نزدیک محبتِ رسول ﷺ محض ایک جذباتی کیفیت نہیں بلکہ ایمان کی روح، دین کا مرکز اور ملت کی زندگی کا سرچشمہ تھی۔ اسی لیے ان کا قلم جہاں بھی چلتا، وہاں عشقِ رسول ﷺ کی خوشبو بکھیر دیتا تھا۔

انہوں نے مذہبی صحافت کو مسلک اعلیٰ حضرت کے فکری دفاع کا قلعہ بنایا۔ وہ جانتے تھے کہ تلوار سے جیتی ہوئی جنگیں وقتی ہوتی ہیں مگر قلم سے جیتی ہوئی جنگیں صدیوں تک اثر انداز رہتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے قلم کو عقائدِ اہلِ سنّت کی پاسبانی، افکارِ اکابر کی ترویج اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ کے فروغ کے لیے وقف کر دیا۔ آج جب میڈیا

سرمایہ داروں کے اشاروں پہ رقص کر رہا ہے، جب صداقت مفادات کے پردوں میں چھپائی جا رہی ہے، جب ایمان کو دقیانوسیت اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شدت پسندی کا نام دیا جا رہا ہے، تو علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی صحافتی جدوجہد پہلے سے کہیں زیادہ یاد آتی ہے۔ ان کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ مذہبی صحافت صرف ایک پیشہ نہیں بلکہ ایک امانت ہے۔ یہ صرف الفاظ کی ترتیب نہیں بلکہ عقائد کی حفاظت ہے۔ یہ صرف کاغذ اور روشنائی کا کھیل نہیں بلکہ ملت کے مستقبل کی تعمیر ہے۔ آج اگر مذہبی صحافت کو اپنی اصل روح کے ساتھ زندہ ہونا ہے تو اسے علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہ اسلوب اپنانا ہوگا جس میں اخلاص بھی تھا، جرأت بھی، محبت بھی تھی، بصیرت بھی، تحقیق بھی تھی اور دعوت بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مذہبی صحافت کے میدان میں ایک فرد نہیں بلکہ ایک عہد تھے۔ وہ ایک ایسا چراغ تھے جس کی روشنی نے فکری تاریکیوں کو چیر دیا۔ وہ ایک ایسی صدا تھے جس نے خموش ضمیروں کو جگایا۔ وہ ایک ایسا قلم تھے جس نے باطل کے ایوانوں میں لرزہ طاری کر دیا۔ وہ ایک ایسی فکر تھے جس نے نسلوں کو شعورِ دین عطا کیا، ایک ایسا جذبہ تھے جس نے ملت کے منتشر قافلوں کو سمت بخشی اور ایک ایسی دعوت تھے جس نے دلوں میں ایمان کی حرارت اور عمل کی تازگی پیدا کی۔ ان کا قلم محض الفاظ کا مجموعہ نہیں تھا بلکہ دردِ ملت کی ترجمانی، حق کی وکالت اور باطل کے خلاف اعلانِ جہاد تھا۔

انہوں نے صحافت کو محض خبر رسانی کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اسے اصلاحِ امت، تحفظِ عقائد اور بیداریِ افکار کا مؤثر وسیلہ بنا دیا۔ ان کے مضامین میں استدلال کی قوت بھی تھی، اخلاص کی حرارت بھی اور دعوت و اصلاح کا وہ سوز بھی جو قاری کے دل میں اتر کر اسے سوچنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ وہ جب لکھتے تھے تو الفاظ بولتے تھے، دل دھڑکتے تھے اور ضمیر جاگ اٹھتے تھے۔ ان کی تحریریں وقتی جذبات کی ترجمان نہیں بلکہ ایک زندہ تحریک کی آواز تھیں۔ اسی لیے ان کے انتقال کے بعد بھی ان کا قلم خموش نہیں ہوا، ان کے افکار آج بھی ان کے مضامین کے صفحات سے جھلکتے ہیں، ان کی صدائیں آج بھی اہلِ حق کے کانوں میں گونجتی ہیں اور ان کی صحافتی میراث آج بھی راہِ حق کے مسافروں کو منزل کا پتا دیتی ہے۔ آج بھی جب مذہبی صحافت کے افق پر نظر دوڑائی جاتی ہے تو ان کی شخصیت ایک مینارۂ نور کی طرح دکھائی دیتی ہے، جو اہلِ قلم کو یہ پیغام دیتی ہے کہ قلم کا وقار اس وقت باقی رہتا ہے جب وہ حق کے لیے اٹھے، عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے لکھے اور ملت کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرے۔

علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا صحافتی ورثہ دراصل حق وصداقت کی وہ اذان ہے جو آج بھی زمانے کے شور میں گونج رہی ہے اور اہلِ ایمان کو یہ پیغام دے رہی ہے کہ قلم اگر ایمان کے ہاتھ میں ہو تو وہ تنہا بھی ایک امت کی بیداری کا سامان بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی صحافتی خدمات کو محض چند رسائل و جرائد کی ادارت یا چند مضامین کی تصنیف تک محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کی صحافت ایک فکری جہاد، ایک دعوتی تحریک اور ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی شعور کی بیداری کا مؤثر وسیلہ تھی۔ اسی پس منظر میں ان کی مذہبی صحافت کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔

علامہ ارشد القادری اور مذہبی صحافت: قلم کی تلوار، فکرِ اسلامی کا محاذ اور ملت کے ضمیر کی پکار

قلم جب دردِ ملت سے آشنا ہو جائے، جب اس کی روشنائی میں عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرارت شامل ہو جائے، جب الفاظ کسی شخصی شہرت کے نہیں بلکہ دینِ حق کی سربلندی کے لیے ترتیب دیے جائیں، تو پھر صحافت محض پیشہ نہیں رہتی، عبادت بن جاتی ہے وہ محض اشاعت نہیں رہتی، دعوت بن جاتی ہے، محض خبر نہیں رہتی، تحریک بن جاتی ہے۔

برصغیر کی مذہبی صحافت کی تاریخ میں بعض نام ایسے ہیں جنہوں نے رسائل و جرائد نہیں نکالے بلکہ فکری محاذ قائم کیے، قلم نہیں اٹھائے بلکہ باطل کے مقابلے میں لشکر تیار کیے اور تحریریں نہیں پیش کیں بلکہ نسلوں کے اذہان میں ایمان، شعور اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چراغ روشن کیے۔ علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ انہی رجالِ حق میں سے ایک تھے۔ انہوں نے اس وقت قلم سنبھالا جب فتنوں کی یلغار تیز ہو رہی تھی، جب اہلِ سنّت کی اکثریت فکری انتشار کی شکار تھی، جب

جماعتی قوتیں موجود ہونے کے باوجود اجتماعی شعور مفقود تھا، جب نوجوان نسل کے اذہان تک دوسروں کا لٹریچر پہنچ رہا تھا اور اہلِ حق کے پاس اپنے افکار ونظریات مؤثر انداز میں پیش کرنے کے وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب بہت سے لوگ حالات کا ماتم کر رہے تھے مگر ایک مردِ درویش حالات بدلنے کے لیے میدان میں اتر چکا تھا۔

پہلے ''جامِ کوثر جدید'' اور پھر فروری 1967ء میں ''جامِ نور'' کا اجرا دراصل ایک رسالے کا اجرا نہیں تھا بلکہ فکرِ اسلامی کے ایک نئے محاذ کا قیام تھا۔

کلکتہ کی سرزمین سے اٹھنے والی یہ آواز دراصل ملت کے سوئے ہوئے ضمیر کو جگانے کی کوشش تھی۔ یہ محض الفاظ کا مجموعہ نہ تھا بلکہ دردِ دل کی ایک پکار، احساسِ ذمہ داری کا ایک اعلان اور فکری بیداری کا ایک مؤثر پیغام تھا۔ اس آواز میں قوم کی زبوں حالی کا کرب بھی تھا اور اس کے روشن مستقبل کی امید بھی۔ یہ صدا لوگوں کو غفلت کی تاریکیوں سے نکال کر شعور وآگہی کی روشنی میں لانے، منتشر قوتوں کو یکجا کرنے اور ملت کو اس کے دینی، ملی اور تہذیبی فرائض کا احساس دلانے کے لیے بلند ہوئی تھی۔ یہ آواز اس یقین سے سرشار تھی کہ قوموں کی تقدیر اس وقت بدلتی ہے جب ان کے دلوں میں احساسِ جواب دہی بیدار ہو، ان کی فکر میں مقصدیت پیدا ہو اور ان کے کردار میں اخلاص وعمل کی قوت جلوہ گر ہو۔ چنانچہ اس نے خوابیدہ اذہان کو جھنجھوڑا، مایوس دلوں میں امید کے چراغ روشن کیے اور ملت کے افراد کو یہ پیغام دیا کہ عزت ووقار کا راستہ خود شناسی، دینی وابستگی اور اجتماعی شعور سے ہو کر گذرتا ہے۔ یوں یہ صدا اپنے عہد کی ایک فکری تحریک، ایک اصلاحی دعوت اور ایک بیدار کن پیغام بن کر ابھری، جس کی بازگشت صرف کلکتہ کی گلیوں تک محدود نہ رہی بلکہ دور دراز علاقوں تک پہنچ کر اہلِ ملت کے دلوں میں احساسِ بیداری کی نئی لہر پیدا کرتی رہی۔ لیکن یہ راستہ گل وگلزار کا راستہ نہیں تھا۔ یہ کانٹوں کی وادی تھی۔ یہ قربانیوں کا سفر تھا۔ یہ تنہائیوں کی داستان تھی۔

''جامِ نور'' کے پہلے شمارے کی اشاعت کے وقت پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مارچ 1967ء کے اداریے میں جو الفاظ لکھے، وہ آج بھی اہلِ قلم کے دلوں کو لرزا دیتے ہیں:

''جام نور کی پہلی کاپی جب پریس جا رہی تھی تو ماحول پر مشکلات کا اتنا گھنا اندھیرا تھا کہ قدم رکھنے کے لیے بھی کوئی صاف جگہ نظر نہیں آ رہی تھی، جو امر سب سے زیادہ پریشان کن تھا وہ موانع کے ہجوم میں اپنی تنہائی کا احساس تھا۔''

یہ صرف ایک جملہ نہیں، مذہبی صحافت کے ہر مجاہد کی داستان ہے۔حق کی راہ ہمیشہ تنہائی سے شروع ہوتی ہے۔ چراغ ہمیشہ اندھیروں کے درمیان جلتے ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ جو لوگ زمانے کو روشنی دیتے ہیں، انہیں اکثر اپنے عہد میں تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے۔

لیکن اس مردِ مومن کی استقامت دیکھیے کہ مشکلات کے اس طوفان کے باوجود اس کے قدم متزلزل نہ ہوئے۔ البتہ اس کے دل میں ایک کسک ضرور تھی۔ وہ کسک اپنوں کی بے اعتنائی کی تھی۔ وہ دردِ اہلِ سنّت کی خموشی کا تھا۔ وہ شکوہ ان لوگوں سے تھا جو عشقِ رسول ﷺ کے دعوے تو کرتے تھے مگر اس عشق کے فکری محاذ پہ لڑنے والے سپاہی کو تنہا چھوڑ دیتے تھے۔ انہیں اس بات کا درد تھا کہ زبانوں پر محبتِ مصطفیٰ ﷺ کے ترانے تو بہت ہیں مگر جب اسی محبت کے دفاع، اشاعت اور ترجمانی کے لیے قلم اٹھانے، وقت دینے اور وسائل صرف کرنے کا مرحلہ آتا ہے تو قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ چنانچہ ان کے دل کی یہ کسک اور ملت سے یہ خموش شکایت جنوری 1968ء کے اداریے میں ایک سوزِ دروں بن کر ابھری، جہاں الفاظ محض سطریں نہیں رہے بلکہ ایک مجاہدِ صحافت کے زخمی احساسات کی ترجمانی بن گئے۔

یہ دراصل ایک ایسے شخص کی فریاد تھی جس نے مذہبی صحافت کو محض پیشہ نہیں بلکہ خدمتِ دین کا میدان سمجھا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جس مشن کے لیے خونِ جگر صرف کیا جا رہا ہے، جس مقصد کے لیے شب وروز کی راحتیں قربان کی جا رہی ہیں، اسی مشن کے داعیوں اور ہمدردوں کی اکثریت تماشائی بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ جنوری 1968ء کے اداریے میں ان کا یہ درد الفاظ کا روپ دھار کر یوں سامنے آیا:

''اہل سنّت کے ایک ترجمان کو زندہ رکھنے کے لیے جن حوصلہ

شکن مشکلات سے ہمیں گذرنا پڑا یہ ہماری زندگی کی ایک نہایت دردناک کہانی ہے۔۔۔صبر وتحمل کے ساتھ اس نشتر کی اجازت دی جائے کہ عاشقانِ رسول کی وہ معزز جماعت جس کی آنکھ کے آنسو یادِ جاناں میں چشمۂ کوثر کی طرح رواں دواں رہتے ہیں، اس نے بھی اپنے ایک جنگجو سپاہی کو جو ناموسِ رسول کے محاذ پر دشمنوں سے دفاعی جنگ لڑ رہا تھا، یکہ وتنہا چھوڑ دیا۔''

یہ شکوہ نہیں، ایک آہ ہے۔ یہ شکایت نہیں، ایک مجاہد کے زخمی دل کی صدا ہے اور شاید یہی وہ مقام ہے جہاں علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی عظمت پوری آب وتاب کے ساتھ سامنے آتی ہے۔انہوں نے صرف مسائل کی نشاندہی نہیں کی بلکہ ان کا حل بھی بتایا۔انہوں نے جماعتی انتشار کا ماتم نہیں کیا بلکہ اس کے علاج کی نشاندہی کی۔

مارچ 1967ء کے اداریے میں وہ اہلِ سنّت کی اجتماعی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک ایسی حقیقت بیان کرتے ہیں جو آج بھی اتنی ہی سچی ہے جتنی نصف صدی قبل تھی۔فرماتے ہیں: ''جب تک کہ ہم دلنشیں اور پرکشش لٹریچر کے ذریعہ سن نوجوانوں کا ذہن جماعتی مزاج کے سانچے میں نہیں ڈھال لیتے ہماری کوئی تنظیم قابلِ ذکر کردار ادا نہیں کر سکے گی۔''

یہ جملہ دراصل علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پورے صحافتی فلسفے کا نچوڑ ہے۔ وہ جانتے تھے کہ تنظیمیں محض جلسوں کی گونج سے قائم نہیں ہوتیں بلکہ اذہان کی خموش مگر گہری تعمیر سے وجود پاتی ہیں۔قیادت نعروں کے شور سے جنم نہیں لیتی بلکہ فکری تربیت، علمی پختگی اور کردار کی آبیاری سے پروان چڑھتی ہے اور فکری تربیت کا سب سے مؤثر، دیرپا اور ہمہ گیر ذریعہ قلم اور لٹریچر ہے۔اسی لیے انہوں نے صحافت کو دعوت، اصلاح اور تنظیمِ ملت کا بنیادی وسیلہ قرار دیا۔ان کے نزدیک اخبار ورسائل صرف خبروں کی ترسیل کا ذریعہ نہیں تھے بلکہ وہ ملت کے فکری قلعے، علمی درسگاہیں اور شعوری بیداری کے مراکز تھے۔وہ سمجھتے تھے کہ ایک تقریر چند لمحوں کے لیے دلوں کو گرماتی ہے مگر ایک مضبوط تحریر نسلوں کے ذہنوں میں اتر کر فکر وعمل کی نئی راہیں متعین کرتی ہے۔ جلسے اپنے اثرات چھوڑ کر گذر جاتے ہیں لیکن قلم کا نقش زمانے کی پیشانی پر ثبت ہو جاتا ہے۔وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ ملت کی تعمیر صرف جذباتی وابستگی سے ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے صحیح فکر، درست شعور اور واضح نصب العین درکار ہے۔ چنانچہ انہوں نے صحافت کو محض پیشہ نہیں بلکہ ایک دینی فریضہ، ایک اصلاحی مشن اور ایک فکری جہاد کی حیثیت دی۔ان کا قلم ملت کے زخموں کی نشاندہی بھی کرتا تھا اور ان کے علاج کی تدبیریں بھی پیش کرتا تھا۔وہ مسائل کا ماتم کرنے کی بجائے ان کے حل کی راہیں تلاش کرتے تھے اور قوم کو مایوسی کے اندھیروں سے نکال کر امید، عمل اور خود اعتمادی کی روشنی کی طرف بلاتے تھے۔

ان کا یقین تھا کہ جب تک ملت کے ہاتھ میں مضبوط لٹریچر نہیں ہوگا، اس کی فکری سرحدیں محفوظ نہیں رہ سکتیں۔ اسی لیے وہ کتاب، رسالہ اور اخبار کو محض کاغذ کے چند صفحات نہیں بلکہ ایک زندہ تحریک، ایک خاموش داعی اور ایک بیدار نگہبان تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک قلم کی سیاہی درحقیقت قوموں کی تقدیر لکھنے والی روشنائی تھی اور صحافت وہ منبر تھا جس سے افکار کی اصلاح، کردار کی تعمیر اور ملت کی شیرازہ بندی کا عظیم کام انجام دیا جا سکتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی صحافتی جدوجہد کو محض اشاعتِ مضامین تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ملت کی فکری بیداری، دینی استحکام اور اجتماعی تنظیم کے ایک ہمہ گیر منصوبے کی صورت عطا کی۔ان کے نزدیک مضبوط قلم ہی مضبوط قیادت کو جنم دیتا ہے اور مضبوط قیادت ہی ایک منتشر قوم کو وحدت، شعور اور عمل کی شاہراہ پر گامزن کر سکتی ہے۔

قرآن کریم نے قلم کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ''

قلم شعور کا پہلا زینہ ہے۔قلم تہذیبوں کا معمار ہے۔قلم افکار کا محافظ ہے۔قلم علم کا امین ہے۔قلم حکمت کا ترجمان ہے۔قلم تاریخ کا حافظ ہے۔قلم قوموں کی یادداشت ہے۔قلم دل کی آواز اور ذہن وفکر کی زبان ہے۔قلم اندھیروں میں روشنی کی کرن ہے۔قلم حقائق کا آئینہ اور حق وصداقت کا سفیر ہے۔قلم اصلاحِ معاشرہ کا مؤثر وسیلہ ہے۔قلم

انقلابِ فکر کا خموش پیامبر ہے۔قلم مردہ احساسات میں زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے۔قلم نسلوں کو ان کے ماضی سے جوڑتا اور مستقبل کی راہیں روشن کرتا ہے۔قلم ظلمت کے مقابل چراغ اور جہالت کے مقابل ہتھیار ہے۔قلم انسان کے علم، تجربے اور مشاہدے کو دوام بخشتا ہے۔قلم اہلِ حق کی قوت، اہلِ علم کی شناخت اور اہلِ فکر کا سرمایہ ہے۔قلم وہ امانت ہے جس کے ذریعے خیالات لفظوں کا لباس پہن کر زمانوں کے سفر پر نکلتے ہیں۔قلم کی نوک سے نکلنے والے حروف کبھی کتابیں بنتے ہیں، کبھی تحریکیں اور کبھی تاریخ کا رخ موڑ دینے والے فیصلے۔قلم اگر اخلاص، دیانت اور حق گوئی کے ساتھ اٹھایا جائے تو یہ محض ایک وسیلۂ تحریر نہیں رہتا بلکہ قوموں کی تقدیر سنوارنے والا ایک عظیم ذریعہ بن جاتا ہے۔قلم ہی وہ قوت ہے جو نسلوں کے مزاج بدل دیتی ہے۔علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ حقیقت نہ صرف سمجھی بلکہ پوری زندگی اس پر عمل بھی کیا۔مگر ان کا سب سے بڑا درد یہ تھا کہ ملت کے مقتدر طبقات یہ حقیقت سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔اسی لیے جنوری 1968ء میں انہوں نے نہایت دردمندانہ انداز میں لکھا:''پیشانی پر شکن ڈالے بغیر ہماری ملتِ طیبہ کے مقتدر رہنما ایک آزردہ التفات کا یہ شکوہ سن لیں کہ انہوں نے اپنی نوجوان نسل کے مستقبل کی طرف سے جس فراغت کے ساتھ آنکھیں بند کر لی ہیں اس کا انجام ہم دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہیں گے۔''

یہ الفاظ نہیں، آنے والے خطرات کی دستک ہیں۔یہ ایک صاحبِ بصیرت مفکر کی وہ چیخ ہے جو مستقبل کے اندھیروں کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔یہ ایک دردمند دل کی وہ صدا ہے جو قوم کی فکری بے حسی، علمی زوال اور تہذیبی انحطاط کے آثار کو وقت سے پہلے محسوس کر چکی تھی۔اس کی آواز میں صرف شکایت نہیں تھی بلکہ ایک بیدار مغز راہبر کی اضطراب انگیز تنبیہ بھی شامل تھی، جو اپنی ملت کو غفلت کی نیند سے جگانا چاہتا تھا۔اس نے جو خطرات دیکھے تھے وہ محض وقتی مسائل نہ تھے بلکہ ایک ایسے فکری جمود، ذہنی تعطل اور میدانِ عمل سے کنارہ کشی کے مظاہر تھے جو آہستہ آہستہ پوری اجتماعی زندگی کو اپنی گرفت میں لیتے جا رہے تھے۔اس لیے اس کی تحریر کے ہر لفظ میں درد بھی ہے، دور اندیشی بھی اور آنے والے زمانوں کے لیے ایک خموش پیغام بھی۔افسوس کہ برسوں پہلے بلند کی گئی یہ حقیقت بردوش اذان آج بھی فضاؤں میں گونج رہی ہے مگر وہ مقتدر طبقہ جسے اس صدا پر لبیک کہنا چاہیے تھا، اب بھی اسی فکری جمود اور ذہنی بے حسی کا شکار دکھائی دیتا ہے۔حالات بدل گئے، زمانے نے کئی کروٹیں لیں، مسائل کی صورتیں تبدیل ہوئیں لیکن فکر و نظر کی وہ بندشیں جوں کی توں باقی رہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس صاحبِ بصیرت مفکر کی پکار محض اپنے عہد ہی کے لیے نہ تھی بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک وارننگ تھی، جس کی معنویت آج شاید پہلے سے کہیں زیادہ نمایاں ہو چکی ہے۔اور پھر جب 1969ء تک بھی حالات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ آئی تو ان کا درد اور زیادہ گہرا ہو گیا۔فروری 1969ء کے اداریے میں وہ پوری ملت کو جھنجھوڑتے ہوئے لکھتے ہیں:''ایک عرصے سے چیخ رہا ہوں کہ زندہ رہنا ہے تو سوچنے اور برتنے کا انداز بدلنا ہوگا۔فولاد کی تلوار کا زمانہ ختم ہو گیا اب قلم کی تلوار سے معرکے سر کیے جا رہے ہیں۔''

کتنی بڑی حقیقت ہے! یہ دراصل مذہبی صحافت کا منشور ہے۔یہ وہ اعلان ہے جسے آج سوشل میڈیا، الیکٹرانک میڈیا اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے اس دور میں سونے کے پانی سے لکھنے کی ضرورت ہے۔علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے نصف صدی پہلے دیکھ لیا تھا کہ آنے والے زمانوں میں جنگیں میدانوں میں نہیں، اذہان میں لڑی جائیں گی۔سرحدیں توپوں سے نہیں، نظریات سے فتح کی جائیں گی، اور نسلیں تلواروں سے نہیں، قلموں سے جیتی جائیں گی۔اسی لیے وہ بار بار اہلِ سنّت کو متوجہ کرتے رہے کہ اگر تم اپنی فکر، اپنے عقیدے اور اپنی تہذیب محفوظ رکھنا چاہتے ہو تو قلم کی طاقت پہچانو، صحافت کی اہمیت سمجھو اور فکری محاذوں پہ اپنی موجودگی کو یقینی بناؤ۔

آج جب ہم ''جامِ نور'' کے ان اداریوں کو پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ گویا ایک مردِ درویش نصف صدی پہلے ہمارا آج دیکھ رہا تھا۔وہ جو خطرات بتا رہا تھا، وہ ہمارے سامنے ہیں۔وہ جس فکری یلغار سے خبردار کر رہا تھا، وہ ہمارے گھروں تک پہنچ چکی ہے۔وہ جس قلمی محاذ کی ضرورت محسوس کر رہا تھا، آج وہ پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہو

چکا ہے۔علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی صحافتی جدوجہد دراصل یہ پیغام دیتی ہے کہ مذہبی صحافت محض رسائل کی اشاعت کا نام نہیں بلکہ عقائد کی پاسبانی، نسلوں کی تربیت، افکار کی حفاظت اور عشقِ رسول ﷺ کی شمع روشن رکھنے کا نام ہے۔

جامِ نور صرف ایک رسالہ نہیں تھا۔ وہ ایک فکر تھا۔ ایک تحریک تھا۔ ایک اذان تھی۔ ایک چراغ تھا اور علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس چراغِ حق کے وہ بیدار مغز پاسبان تھے جنہوں نے اپنی تنہائیوں، محرومیوں، مسلسل جدوجہد، بے شمار قربانیوں اور خونِ جگر سے اس کی لو روشن رکھی، تاکہ آنے والی نسلیں ایمان کی حرارت، شعور کی بصیرت اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی نورانی دولت سے بہرہ ور ہو سکیں۔ انہوں نے حالات کے طوفانوں کے سامنے سپر ڈالنے کی بجائے اپنے عزم واستقامت کو ڈھال بنایا اور فتنوں کی تاریکیوں میں حق وصداقت کی شمع فروزاں رکھی۔

وہ جانتے تھے کہ چراغ صرف روغن سے نہیں جلتے، بعض چراغ اہلِ درد کے آنسوؤں، اہلِ وفا کی قربانیوں اور اہلِ بصیرت کے خونِ دل سے روشن رہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی پوری زندگی اسی مقصد کے لیے وقف کر دی کہ اہلِ سنّت کا فکری سرمایہ محفوظ رہے، عشقِ رسول ﷺ کی خوشبو دلوں میں بسی رہے اور امت کا رشتہ اپنے اسلاف کی روشن روایتوں سے منقطع نہ ہونے پائے۔

آج اگر عقیدت کے چراغ روشن ہیں، عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی محفلیں آباد ہیں اور حق پرستی کی آوازیں سنائی دیتی ہیں تو ان میں علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ان جیسے دوسرے اہل سنّت کے دانشوروں کی شبانہ روز محنتوں، خموش قربانیوں اور بے لوث جدوجہد کا ایک نمایاں حصہ شامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ محض ایک فرد نہیں تھے بلکہ ایک عہد، ایک تحریک، ایک فکر اور ایک روشن روایت کے امین تھے، جنہوں نے اپنے بعد آنے والوں کے لیے روشنی کا ایسا مینار قائم کر دیا جو زمانے کی گرد اور حوادثِ روزگار کے باوجود آج بھی راہِ حق کے مسافروں کو منزل کا سراغ دے رہا ہے۔

لوح وقلم کا مجاہد اور صحافت کا مردِ درویش:

علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ نے جس زمانے میں مذہبی صحافت کو اپنا میدانِ عمل بنایا، وہ محض ایک رسالے کے اجراء کا زمانہ نہیں تھا بلکہ فکری کشمکش، اعتقادی یلغار اور نظریاتی معرکہ آرائی کا دور تھا۔ باطل قوتیں جدید ذرائعِ ابلاغ سے لیس ہو کر اپنے افکار ونظریات برق رفتاری کے ساتھ عام کر رہی تھیں اور اہلِ سنّت کی اکثریت اپنی تمام تر مذہبی وابستگیوں کے باوجود اس محاذ پر کمزور اور منتشر دکھائی دیتی تھی۔ ایسے نازک اور فیصلہ کن وقت میں علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ نے پریس کی طاقت کی اصل معرفت کا شعور دیا، قلم کی قوت محسوس کی اور صحافت کو دعوت واصلاح کا ایک مؤثر ترین ذریعہ بنا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ پریس کی قوت، افکار کی اشاعت اور ذہنوں کی تعمیر میں جو کردار ادا کرتی ہے، اس کا صحیح ادراک ہمارے معاشرے میں بہت کم لوگوں کو ہوا۔ حالانکہ تاریخ گواہ ہے کہ قلم اور پریس نے وہ انقلاب برپا کیے ہیں جو کبھی تلواروں اور لشکروں سے بھی ممکن نہ ہو سکے۔ پریس محض خبروں کی ترسیل کا ذریعہ نہیں بلکہ افکار ونظریات کا امین، قوموں کے شعور کا معمار اور اجتماعی ضمیر کی آواز ہوتا ہے۔ یہی وہ طاقت ہے جو خموش اذہان کو بیدار کرتی، منتشر خیالات کو سمت عطا کرتی اور فکری تاریکیوں میں آگہی کے چراغ روشن کرتی ہے۔ پریس کی سطروں میں بسا اوقات وہ اثر پوشیدہ ہوتا ہے جو ایوانوں کے فیصلوں پہ غالب آ جاتا ہے۔ ایک سچا اور باکردار قلم معاشرے کی فکری رہنمائی کرتا، حق وباطل کے درمیان امتیاز پیدا کرتا اور آنے والی نسلوں کے اذہان میں علم وشعور کے نقوش ثبت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بڑی تحریکیں، فکری بیداریاں اور اصلاحی انقلابات پریس کی طاقت سے جڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔

جب پریس دیانت، بصیرت اور اخلاص کے ساتھ اپنی ذمہ داری ادا کرے تو وہ قوموں کے لیے چراغِ راہ بن جاتی ہے، دلوں میں امید جگاتی ہے، ذہنوں کو جلا بخشتی ہے اور تاریخ کے دھارے کو نئی سمت عطا کرتی ہے۔ اس اعتبار سے پریس محض ایک ادارہ نہیں بلکہ ایک ایسی خموش مگر مؤثر قوت ہے جو نسلوں کے افکار، معاشروں کے مزاج اور قوموں کی تقدیر تک کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ علیہ الرحمہ کو بار بار اپنی جماعت کی اس غفلت پر اظہارِ افسوس کرنا پڑا۔ ان کا درد یہ تھا کہ ہم نے مذہبی جذبات کو تو محفوظ رکھا لیکن فکری محاذ کو مضبوط نہ بنا سکے۔ ہمارے یہاں عرس و اجتماعات کی رونقیں تو موجود رہیں لیکن مطالعات و تحقیقات کا ذوق پروان نہ چڑھ سکا۔ جلسوں اور جلوسوں کی گرم جوشی تو برقرار رہی مگر منصوبہ بندی، فکری تربیت اور علمی سرمایہ کاری کی روایت کمزور رہی۔ چنانچہ وہ نہایت حسرت کے ساتھ لکھتے ہیں: ''اب لے دے کے اپنے رسالوں کی زندگی کے وسائل کی اگر کوئی امید کی جاسکتی ہے تو صرف اپنی جماعت ہے۔ تو اس کی سرگذشت اتنی شاندار ہے کہ بس ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اول تو ہمارے یہاں مطالعے کا ذوق ہی بہت کم ہے اور اگر کچھ ہے بھی جماعتی بہبود کا جذبہ برائے نام ہے۔'' (جام نور، ۱۹۶۹ء)

یہ محض ایک جملہ نہیں بلکہ ایک جماعت کے پورے فکری مزاج کا نوحہ ہے۔ ایک ایسے درد کی بازگشت ہے جو الفاظ کی حدود سے نکل کر دلوں کی گہرائیوں تک اتر جاتا ہے۔ یہ اُن آرزوؤں کی شکستگی کا بیان ہے جو ملت کی سربلندی کے خواب لے کر بیدار ہوئیں اور اُن حسرتوں کا مرثیہ ہے جو زمانے کی بے اعتنائیوں کے درمیان دم توڑتی رہیں۔ اس کے پس منظر میں صرف ایک فرد کا کرب نہیں بلکہ ایک پورے قافلۂ حق کی بے قراری، ایک دعوتی مشن کی تڑپ اور ایک فکری تحریک کی خموش آہیں پوشیدہ ہیں۔ یہ عبارت دراصل اُن دلوں کی ترجمان ہے جو دین و ملت کی خدمت میں گھلتے رہے مگر صلہ و ستائش کی بجائے آزمائشوں، محرومیوں اور نامرادیوں کا سامنا کرتے رہے۔ اس لیے یہ جملہ پڑھا نہیں جاتا، محسوس کیا جاتا ہے، سنا نہیں جاتا بلکہ دل کی دھڑکنوں میں گونجتا ہے۔ اس کے بعد جس ظریفانہ بے باکی اور درد بھرے طنز کے ساتھ انہوں نے ہماری ترجیحات کا جائزہ لیا، وہ ان کی صحافتی بصیرت کا شاہکار ہے: ''البتہ ہمارے یہاں جس کام کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے وہ تقریروں کا اسٹیج ہے۔ اس مد پر ہم لاکھوں روپے بے دریغ لٹا دیتے ہیں اور ہمیں ذرا بھی تکان نہیں محسوس ہوتی۔ البتہ قلم کے ذریعے دین کی خدمت کے سوال پر ہماری سرد مہری کا تماشہ قابل دید ہوتا ہے۔''

گویا علامہ علیہ الرحمۃ نے نصف صدی قبل جس مرض کی تشخیص کی تھی، آج بھی وہ پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ آج بھی ہمارے ہاں آواز کی گونج کو حرف کی تاثیر پر ترجیح دی جاتی ہے، وقتی جوش کو مستقل فکری تعمیر پر فوقیت حاصل ہے اور نعرے کی کشش کتاب کے اثرات سے زیادہ محسوس کی جاتی ہے۔ حالانکہ تاریخ گواہ ہے کہ قومیں جلسوں سے نہیں بلکہ مطالعے، تحقیق اور فکری سرمایہ سے زندہ رہتی ہیں۔ اسی پس منظر میں علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ نے پریس کی شکست کو اہلِ سنّت کی سب سے بڑی فکری ناکامی قرار دیا۔ ان کا یہ تجزیہ آج بھی حیرت انگیز حد تک تازہ اور حقیقت پسندانہ محسوس ہوتا ہے: ''اس امر میں قطعاً دورائے نہیں ہوسکتی کہ پریس کی طاقت کے محاذ پر ہم اپنے مذہبی حریفوں سے شکست کھا چکے ہیں اور نہایت تیزی کے ساتھ اپنے معاشرے کے علمی حلقوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں رہ گیا ہے کہ ہم اپنی آواز کو یکلخت سارے ہندوستان میں پھیلا سکیں۔ اسٹیج پر ضرور قابض ہیں لیکن اس کے زود رو اثرات کو مثبت و قائم شکل میں تبدیل کرنے والی ہمارے پاس کوئی مشین نہیں ہے۔'' (جام نور، اگست ۱۹۶۷ء)

یہ الفاظ دراصل ایک دوراندیش مفکر کی فکری چیخ ہیں، جو زمانے کی سطحی چمک دمک کے پیچھے چھپے ہوئے فکری اندھیروں کو بہت پہلے دیکھ چکا تھا۔ یہ محض ایک مدیر کے شکوے کے الفاظ نہیں بلکہ ایک ایسے دردمند داعیِ ملت کے دل کی صدا ہیں جس نے اپنے خونِ جگر سے چراغ جلائے، اپنی آسائشوں کو قربان کر کے افکار کی شمع روشن رکھی اور قوم کے فکری افق پر بیداری کی کرنیں بکھیرنے کی کوشش کی۔ ان سطور میں محرومی کی کسک بھی ہے، دعوت و اصلاح کے سفر کی تھکن بھی اور ملت کی بے اعتنائی کا درد بھی مگر اس کے باوجود ان میں ناامیدی نہیں بلکہ عزم و حوصلے کی ایک خموش روشنی بھی جھلکتی ہے۔ گویا قلم کا یہ مجاہد اپنے زخموں کو چھپاتے ہوئے آنے والی نسلوں کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ حق کی آواز بلند کرنے والے قافلے ہمیشہ گل و گلزار کے راستوں سے نہیں گذرتے، انہیں اکثر خارزار وادیوں میں چلنا پڑتا ہے اور اپنے خونِ

دل سے تاریخ کے اوراق کو رنگین کرنا پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسے الفاظ صرف وہی شخص لکھ سکتا ہے جس کے سینے میں ملت کا درد موجزن ہو، جس کی نگاہ حال سے آگے مستقبل تک پہنچتی ہو اور جو صحافت کو محض خبر رسانی کا ذریعہ نہیں بلکہ دین وملت کی امانت اور اصلاحِ معاشرہ کا مؤثر وسیلہ سمجھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان الفاظ میں ایک فرد کی آواز نہیں بلکہ ایک پورے عہد کی بے بسی، ایک تحریکی جدوجہد اور ایک مصلح کی تڑپ سمٹ آئی ہے۔

آج بھی جب یہ سطور پڑھی جاتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف ماضی کا نوحہ نہیں بلکہ ہر اس دور کے لیے ایک زندہ پیغام ہے جس میں اہلِ حق کو وسائل کی کمی، بے التفاتی اور نامساعد حالات کا سامنا ہو۔ یہ الفاظ یاد دلاتے ہیں کہ افکار کے چراغ ہمیشہ روغن کے مرہون منت نہیں ہوتے، بعض اوقات انہیں روشن رکھنے کے لیے اہلِ درد کو اپنے خونِ جگر کی سرخی بھی شامل کرنا پڑتی ہے۔

علامہ جانتے تھے کہ اسٹیج وقتی جذبہ پیدا کرسکتا ہے مگر نسلوں کی تعمیر کتابیں کرتی ہیں، تقریریں لمحاتی اثر چھوڑتی ہیں مگر صحافت اور لٹریچر صدیوں تک ذہنوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

اسی لیے انہوں نے صرف تنقید پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جماعتی انتشار کی بنیادی وجوہات کی نشاندہی بھی کی۔ ان کے نزدیک اہلِ سنّت کا سب سے بڑا المیہ فکری اختلاف نہیں بلکہ تنظیمی بکھراؤ تھا۔ وہ لکھتے ہیں: ''وحدتِ فکر وخیال کے لحاظ سے دنیا کی ہم منظم ترین جماعت ہیں۔۔۔لیکن ہم آہنگ ہوکر کسی مقصد کے گرد جمع ہو جانا ہمارے لئے سب سے مشکل کام ہے۔'' (جام نور، اگست ۱۹۶۸ء)

یہ جملہ آج بھی اہلِ سنّت کی اجتماعی زندگی کا آئینہ معلوم ہوتا ہے۔ عقائد ایک، محبتیں ایک، اکابر ایک، مشرب ایک مگر عملی میدان میں قوتیں منتشر، وسائل بکھرے ہوئے اور کاوشیں غیر مربوط نظر آتی ہیں۔

علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ اسی انتشار کو ملت کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک کوئی قوم اس وقت تک عزت، وقار اور اجتماعی قوت حاصل نہیں کرسکتی جب تک اس کے افراد مقصدِ حیات، دینی شعور اور ملی مفادات کے حوالے سے ایک صف میں کھڑے نہ ہوں۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں اتحادِ ملت، فکری یکسوئی اور اجتماعی بیداری کی دعوت بار بار سنائی دیتی ہے۔ وہ اختلاف کو دشمنی میں تبدیل ہوتے دیکھ کر رنجیدہ ہوتے اور اپنے قلم کے ذریعے امت کو اس کے مشترکہ دینی ورثے اور اجتماعی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرتے تھے۔

ان کی صحافت کا ایک اور نمایاں پہلو حق گوئی اور بے باکی تھا۔ انہوں نے حکومتِ وقت کی ناراضگی، مقدمات، گرفتاریوں اور پابندیوں کی کبھی پروا نہ کی۔ ان کے نزدیک صحافت کا مقصد محض خبروں کی ترسیل نہیں بلکہ حقائق کی ترجمانی، مظلوم کی حمایت اور باطل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا تھا۔ جب کبھی انہیں محسوس ہوا کہ دین، ملت یا قومی مفادات پر کوئی ضرب لگائی جارہی ہے تو انہوں نے پوری جرأت واستقامت کے ساتھ اپنے قلم کو میدانِ عمل میں اتارا۔ ان کا قلم مصلحتوں کا اسیر نہیں بلکہ ضمیر کی آواز کا ترجمان تھا۔

وہ جانتے تھے کہ حق کی راہ ہمیشہ آسان نہیں ہوتی، اس میں مخالفتوں کے طوفان بھی آتے ہیں اور آزمائشوں کے کانٹے بھی بچھے ہوتے ہیں لیکن انہوں نے کبھی اپنے موقف کی قیمت پر خموشی اختیار نہیں کی۔ ان کی تحریروں میں ایک مردِ مجاہد کا عزم، ایک مصلح کی دردمندی اور ایک داعیِ حق کی بے خوفی جھلکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اداریے اور مضامین محض صحافتی تحریریں نہیں بلکہ فکری بیداری کے منشور اور ملی غیرت کے ترجمان بن گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ نے صحافت کو اقتدار کے ایوانوں کی خوشنودی کا ذریعہ نہیں بلکہ حق وصداقت کا علَم بلند رکھنے کا وسیلہ بنایا۔ ان کا قلم نہ دباؤ کے سامنے جھکا، نہ ترغیب وترہیب سے مرعوب ہوا اور نہ وقتی مفادات کے ہاتھوں فروخت ہوا۔ وہ اس قافلۂ حق کے سالاروں میں تھے جنہوں نے ثابت کیا کہ جب قلم ایمان، بصیرت اور اخلاص سے آراستہ ہوجائے تو وہ تنہا بھی ایک امت کا ضمیر بیدار کرنے کی قوت رکھتا ہے۔

چنانچہ جب ''جام نور'' حکومتی عتاب کا نشانہ بنا تو انہوں نے نہایت جرأت کے ساتھ اعلان کیا: ''ادارہ 'جام نور' نے فیصلہ کرلیا ہے

کہ حکومت کے قہر و جور کے آگے سپر ڈالنے کی بجائے وہ آئینی سطح پر اپنا دفاع کرے گا۔'' (جام نور، دسمبر ۱۹۶۸ء)

یہی وہ مقام ہے جہاں علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ محض ایک مدیر نہیں رہتے بلکہ ایک مجاہدِ قلم بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان کے نزدیک صحافت کا مقصد حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنا نہیں بلکہ مظلوموں کی آواز بننا تھا۔ وہ قلم کو اقتدار کے دربار کی زینت نہیں بلکہ حق و صداقت کے محاذ کا سپاہی سمجھتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ صحافت اگر ظلم کے سامنے خموش ہو جائے تو اپنے وجود کا جواز کھو دیتی ہے اور اگر حق کی حمایت میں زبان کھولے تو وہ ایک مؤثر دعوت، ایک بیدار ضمیر اور ایک زندہ تحریک بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے قلم کو ہمیشہ محروموں، محکوموں اور بے زبان طبقات کے درد و کرب کا ترجمان بنایا۔ ان کی تحریروں میں مصلحت کی سرد مہری نہیں بلکہ حق گوئی کی حرارت، اخلاص کی روشنی اور ملت کے درد کی تڑپ نمایاں نظر آتی ہے۔

وہ صحافت کو محض خبروں کی ترسیل کا ذریعہ نہیں بلکہ اصلاحِ معاشرہ، بیداریِ افکار اور احقاقِ حق کی ایک مقدس ذمہ داری تصور کرتے تھے اور اسی احساسِ ذمہ داری نے ان کی صحافت کو جرأت، دیانت اور بے باکی کی ایک روشن مثال بنا دیا۔

فرقہ وارانہ فسادات، مسلم پرسنل لاء، اردو زبان، مسلم قیادت کی ناکامیوں اور ملت کے اجتماعی مسائل پر انہوں نے جس جرأت و صراحت کے ساتھ قلم اٹھایا، وہ اردو مذہبی صحافت کی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ''جام نور'' صرف ایک رسالہ نہیں تھا بلکہ ایک فکری تحریک، ایک تعمیری دعوت اور ایک بیدار مغز مفکر کی مسلسل جدوجہد کا نام تھا۔ اس کے صفحات میں صرف روشنائی نہیں بہتی تھی بلکہ خونِ جگر کی سرخی شامل ہوتی تھی۔ خود علامہ نے کتنے درد بھرے انداز میں یہ حقیقت بیان کی ہے: ''جام نور کے صفحات کی آرائش کے لئے وہ روشنائی کہاں سے آئی ہے جس میں نامرادیوں کی سیاہی سے زیادہ خونِ جگر کی سرخی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔'' (جام نور، جنوری ۱۹۶۸ء)

یہی خونِ جگر تھا جس نے جام نور کو محض ایک رسالہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے ایک عہد کی فکری تاریخ بنا دیا۔ آج جب ہم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمۃ کی صحافتی خدمات کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے آنے والی نسلوں کے لیے صرف مضامین نہیں چھوڑے بلکہ فکر کے چراغ روشن کیے، شعور کے دریچے وا کیے اور قلم کی عظمت کا وہ سبق دیا جس کی ضرورت آج شاید پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ واقعی ان معدودے چند شخصیات میں سے تھے جنہوں نے تلوار کے بغیر جہاد کیا، لشکر کے بغیر معرکے سر کیے اور صرف قلم کے سہارے ایک پورے عہد کے فکری دھارے کو متاثر کر دیا۔

خونِ جگر کی روشنائی اور مذہبی صحافت کا مجاہد

بعض جملے محض الفاظ نہیں ہوتے، ایک پوری زندگی کا نوحہ ہوتے ہیں۔ بعض سطریں صرف تحریر نہیں ہوتیں بلکہ ایک مردِ مومن کے دل کے زخموں سے ٹپکتے ہوئے آنسوؤں کی تفسیر بن جاتی ہیں۔ علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کا یہ جملہ بھی انہی زندہ اور جاوداں جملوں میں سے ہے: ''جام نور کے صفحات کی آرائش کے لئے وہ روشنائی کہاں سے آئی ہے جس میں نامرادیوں کی سیاہی سے زیادہ خونِ جگر کی سرخی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔'' (جام نور، جنوری ۱۹۶۸ء)

یہ محض ایک ادبی تعبیر نہیں، بلکہ ایک ایسے مجاہدِ قلم کی پوری داستانِ حیات کا خلاصہ ہے جس نے مذہبی صحافت کو پیشہ نہیں، عبادت سمجھا، جس نے رسالہ نکالنے کو کاروبار نہیں، دعوت و اصلاح کی ایک مقدس ذمہ داری تصور کیا اور جس نے قلم کو صرف لکھنے کا ذریعہ نہیں بلکہ ناموسِ رسالت، تحفظِ عقائد اور بیداریٔ ملت کا مضبوط اور موثر اسلحہ بنایا۔

علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے نزدیک ''جام نور'' کاغذ کے چند صفحات کا نام نہیں تھا بلکہ ان کے دل کی دھڑکن، ان کی فکری بے چینی، ان کے دینی اضطراب اور ان کی ملی آرزوؤں کا ترجمان تھا۔

یہ ایک ایسا روشن چراغ تھا جس کی لو میں ان کے افکار کی حرارت، ان کے احساسات کی صداقت اور ان کے مشن کی تابندگی جھلکتی تھی۔ اس کے ہر صفحے میں ان کے خونِ جگر کی سرخی، ان کے اشکِ سحر گاہی کی نمی اور ملتِ اسلامیہ کے مستقبل کے لیے ان کی بے قرار

دعاؤں کی خوشبو رچی بسی محسوس ہوتی ہے۔

''جامِ نور'' ان کے لیے محض ایک صحافتی ادارہ نہ تھا بلکہ ایک فکری محاذ، ایک دینی مرکزِ فکر وعمل اور ایک اصلاحی تحریک تھا۔ اس کے ذریعے وہ امت کے زخموں پہ مرہم رکھتے، فکری انتشار کے اندھیروں میں چراغ جلاتے، گمراہ کن افکار ونظریات کے سیلاب کے سامنے بند باندھتے اور اہلِ حق کی آواز قوت و وقار کے ساتھ دنیا تک پہنچاتے تھے۔ اس کے صفحات میں ان کے دل کی تڑپ، قلم کی امانت اور فکر کی بلندی ایک ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ''جامِ نور'' کی کامیابی ان کے لیے کسی ادارے کی کامیابی نہیں بلکہ ایک مقصد کی پیش رفت تھی اور اس کی مشکلات کسی اشاعتی پرچے کی مشکلات نہیں بلکہ ایک داعیِ ملت کے دل کے زخم تھے۔ جب وہ اس کے لیے لکھتے تھے تو محض الفاظ نہیں بکھیرتے تھے بلکہ اپنے احساسات، اپنی تمناؤں اور اپنی زندگی کے قیمتی لمحات اس کے سپرد کر دیتے تھے۔ یوں ''جامِ نور'' ان کی شخصیت کا آئینہ، ان کے فکر و درد کا مظہر اور ان کے دینی وملی خوابوں کی جیتی جاگتی تعبیر بن گیا تھا۔

وہ جانتے تھے کہ ایک مذہبی رسالہ جاری کرنا صرف مالی وسائل کا مسئلہ نہیں بلکہ صبر، استقامت، قربانی اور مسلسل جدوجہد کا امتحان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ ''روشنائی'' کا ذکر کرتے ہیں تو درحقیقت اس روشنائی کے اندر پوشیدہ ان قربانیوں، محرومیوں اور تلخیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو انہوں نے اپنی زندگی میں برداشت کیں۔ یہاں ''نامرادیوں کی سیاہی'' اور ''خونِ جگر کی سرخی'' کا استعارہ نہایت معنیٰ خیز ہے۔ گویا وہ کہنا چاہتے ہیں کہ ''جامِ نور'' کے صفحات صرف چھاپہ خانے کی سیاہی سے نہیں لکھے گئے بلکہ ان میں ایک داعیٔ ملت کے خواب، ایک مصلح کے آنسو، ایک عاشقِ رسول کے جذبات اور ایک مجاہد کے لہو کی آمیزش شامل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ علیہ الرحمہ کی مذہبی صحافت کا سب سے نمایاں وصف یہی تھا کہ اس کے پس منظر میں کوئی دنیاوی مفاد کارفرما نہیں تھا۔ نہ سیاسی اقتدار کا لالچ تھا، نہ شہرت و ناموری کی خواہش، نہ مالی منفعت کی آرزو اور نہ جاہ و منصب کی طلب۔ ان کا قلم کسی جماعتی مفاد کا ترجمان نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کے درد کی آواز تھا۔ وہ جب لکھتے تھے تو ان کے الفاظ میں ذاتی اغراض کی چمک نہیں بلکہ اخلاص، دردمندی اور احساسِ ذمہ داری کی حرارت محسوس ہوتی تھی۔ ان کے نزدیک صحافت کوئی پیشہ نہیں بلکہ ایک دینی امانت، ایک اصلاحی فریضہ اور ایک مقدس جہاد تھا۔

آج کے دور میں جب بعض افراد ملت کے زخموں پہ مرہم رکھنے، دینی حمیت بیدار کرنے اور قومی مسائل کے حل کے نام پہ میدان میں آتے ہیں تو بسا اوقات ان کے پس پردہ سیاسی مفادات، اقتدار کی خواہش، جاہ ومنصب کا حصول اور درہم و دینار کی کشش کارفرما ہوتی ہے۔ ملت کا درد محض ایک نعرہ بن جاتا ہے اور قومی خدمت کا عنوان ذاتی مفادات کی سیڑھی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایسے پرآشوب ماحول میں علامہ علیہ الرحمہ کی صحافتی زندگی اخلاص واستقامت کا ایک روشن مینار بن کر سامنے آتی ہے۔ ان کی فکر ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ ملت کی حقیقی خدمت وہی ہے جو نمود و نمائش، مفاد پرستی اور اقتدار کی حرص سے پاک ہو اور جس کا مقصد صرف رضائے الٰہی، دین کی سربلندی اور امت کی فلاح وبہبود ہو۔ یہی وہ معیار ہے جو ہر دور کے داعیوں، مصلحوں، قلم کاروں اور صحافیوں کے لیے ایک مثالی نمونہ اور قابلِ تقلید آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان کے سامنے صرف ایک مقصد تھا: فکرِ اسلامی کی حفاظت، اہلِ سنّت کی فکری تربیت اور ملت کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنا۔ اسی لیے جب وہ جماعت کی بے اعتنائی کا شکوہ کرتے ہیں تو اس میں ذاتی دکھ کم اور دینی درد زیادہ ہوتا ہے۔ ان کے دل کو یہ احساس زخمی کرتا تھا کہ جس ملت کے عقائد ونظریات کے تحفظ کے لیے وہ شب وروز جدوجہد کر رہے ہیں، وہی ملت قلم کی اس جنگ کی اہمیت پوری طرح محسوس نہیں کر رہی۔ ان کی تحریروں میں بار بار جو کرب ابھرتا ہے، وہ دراصل ایک داعی کی وہ بے چینی ہے جو اپنی قوم کو فکری محاذ پہ کمزور دیکھ کر مضطرب ہو جاتا ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ دنیا بدل رہی ہے، افکار ونظریات کی جنگ شدت اختیار کر رہی ہے، پریس اور اشاعت نئے نئے معرکے سر کر رہے ہیں مگر اہلِ سنّت کا بڑا طبقہ ابھی تک روایتی دائرے سے باہر

نکل کر اس میدان کی اہمیت نہیں سمجھ سکا۔

ایسے حالات میں ''جام نور'' کا ہر شمارہ گویا ان کے عزم و حوصلے کا ایک نیا اعلان تھا۔ مالی خسارے، جماعتی بے اعتنائی، مخالفین کی سازشوں اور حکومتی دباؤ کے باوجود وہ قلم اٹھاتے رہے، لکھتے رہے، للکارتے رہے اور بیدار کرتے رہے۔ ان کے نزدیک خموشی جرم تھی اور حق گوئی فرض۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی صحافت میں ہمیں ایک طرف عشقِ رسول ﷺ کی وارفتگی نظر آتی ہے تو دوسری طرف ملت کے مسائل پر ایک دردمند رہنما کی بے چینی بھی دکھائی دیتی ہے۔ ایک طرف عقائدِ اہلِ سنّت کا تحفظ ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور تعلیمی مسائل پہ بے لاگ تبصرہ۔ ایک طرف روحانیت کی خوشبو ہے تو دوسری طرف حالاتِ حاضرہ کا گہرا شعور۔

اگر غور کیا جائے تو اس ایک جملے میں علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی پوری صحافتی زندگی سمٹ آئی ہے۔ جام نور کی روشنائی دراصل ان کے خونِ جگر کی روشنائی تھی۔ اس کے ہر صفحے کے پیچھے ایک مجاہد کی قربانی، ایک مفکر کی بصیرت اور ایک عاشقِ رسول کی تڑپ کارفرما تھی۔

آج جب ہم ان کے اداریے پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنے عہد سے گفتگو نہیں کر رہے تھے بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی ایک پیغام دے رہے تھے۔ وہ گویا بتا رہے تھے کہ ملت کی تعمیر صرف جلسوں اور نعروں سے نہیں ہوتی بلکہ قلم، مطالعہ، تحقیق اور فکری جدوجہد سے ہوتی ہے۔ قوموں کے مستقبل کا فیصلہ میدانِ جنگ سے پہلے میدانِ فکر میں ہوتا ہے اور جو قومیں قلم کی طاقت نظرانداز کر دیتی ہیں وہ رفتہ رفتہ اپنی فکری قیادت بھی کھو دیتی ہیں۔

علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کی زندگی اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ مذہبی صحافت صرف خبر رسانی کا نام نہیں بلکہ ایک عظیم دینی فریضہ ہے۔ اس فریضے کی ادائیگی میں انہوں نے اپنی آسائشیں قربان کیں، اپنی توانائیاں صرف کیں اور اپنی زندگی کے بہترین اوقات نذر کر دیے۔ اسی لیے ان کا یہ درد بھرا اعتراف آج بھی دلوں کو جھنجھوڑ دیتا ہے کہ: ''جام نور کے صفحات کی آرائش کے لئے وہ روشنائی کہاں سے آئی ہے جس میں نامرادیوں کی سیاہی سے زیادہ خونِ جگر کی سرخی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔''

واقعہ یہ ہے کہ ''جام نور'' کے صفحات پر چھپنے والی وہ روشنائی خشک ہو گئی مگر اس میں شامل خونِ جگر کی سرخی آج بھی تازہ ہے وہ سرخی آج بھی اہلِ قلم کو دعوتِ عمل دیتی ہے، اہلِ فکر کو جھنجھوڑتی ہے اور ملت کو یہ پیغام دیتی ہے کہ قلم کی شمع خونِ دل سے جلتی ہے اور تاریخ کے روشن ابواب ہمیشہ انہی لوگوں کے نام سے رقم ہوتے ہیں جو اپنے لہو سے چراغِ فکر روشن کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی صحافتی زندگی محض ایک فرد کی جدوجہد کی داستان نہیں بلکہ مذہبی صحافت کے پورے فلسفۂ حیات کی عملی تفسیر ہے۔ ان کے اداریوں میں ابھرنے والا درد، ان کے جملوں میں جھلکنے والی کسک اور ان کی تحریروں میں موجزن اضطراب دراصل ایک ایسے داعیِ ملت کے دل کی آواز ہے جو اپنی قوم کو فکری زوال کے کنارے کھڑا دیکھ کر بے چین تھا۔ وہ جانتے تھے کہ قومیں صرف جذبات سے زندہ نہیں رہتیں، ان کی بقا کے لیے شعور، مطالعہ، تحقیق اور فکری استحکام بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ بار بار قلم کی قوت، صحافت کی اہمیت اور لٹریچر کی ضرورت کی طرف متوجہ کرتے رہے۔

آج نصف صدی گذر جانے کے باوجود جب ہم ان کے اداریے پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی صدائیں ماضی کی بازگشت نہیں بلکہ حال کی پکار ہیں۔ جن خطرات کی نشاندہی انہوں نے کی تھی، وہ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ جن کمزوریوں پہ انہوں نے توجہ دلائی تھی، وہ اب بھی ہماری اجتماعی زندگی کا حصہ ہیں۔ اور جن ذمہ داریوں کی یاد دہانی کرائی تھی، ان کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے۔ اس دور میں جبکہ افکار کی جنگ پہلے سے زیادہ شدید ہو چکی ہے، جب سوشل میڈیا لمحوں میں ذہن سازی کر رہا ہے، جب باطل نظریات جدید اسالیب کے ساتھ نئی نسل کے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں، تو مذہبی صحافت کی اہمیت محض برقرار نہیں رہی بلکہ کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ آج بھی ملت کو ایسے ہی دردمند، باکردار اور بااصول قلم کاروں کی ضرورت ہے جو حق و صداقت کو مصلحتوں پر ترجیح دیں، جو تحقیق کو افواہ

پر اور دیانت کو شہرت پر مقدم رکھیں اور جو اپنے قلم کو دین وملت کی امانت سمجھ کر استعمال کریں۔

یہ بھی اس پوری داستان کا ایک ایسا باب ہے جسے نظر انداز کر دیا جائے تو علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شخصیت کا مکمل تعارف سامنے نہیں آتا کہ وہ صرف ایک ممتاز صحافی، بلند پایہ خطیب، صاحبِ طرز مصنف اور صاحبِ بصیرت مفکر ہی نہ تھے بلکہ مسلکِ اعلیٰ حضرت کے بے باک نقیب، جری ترجمان اور حقیقی نمائندہ بھی تھے۔

ان کی نسبت مسلکِ اعلیٰ حضرت سے محض ایک جذباتی وابستگی، ایک موروثی شناخت یا چند معروف نعروں کی تکرار تک محدود نہ تھی۔ یہ نسبت ان کے لیے ایک فکری عہد، ایک علمی ذمہ داری، ایک روحانی امانت اور ایک عملی تحریک تھی، ایسی تحریک جس نے ان کے قلم کو سمت عطا کی، ان کی زبان کو جرأت اظہار بخشی اور ان کی زندگی کو ایک مقصد عطا کیا۔

انہوں نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو صرف ایک عظیم فقیہ، عاشقِ رسول ﷺ یا مجددِ دین کی حیثیت سے نہیں پڑھا بلکہ ان کے افکار کے اندر پوشیدہ اس ہمہ گیر فکری منصوبے کو بھی سمجھا جو اصلاحِ فرد سے تعمیرِ ملت، تحفظِ عقیدہ سے استحکامِ تہذیب، تعلیمِ دین سے بیداریِ شعور اور عشقِ رسول ﷺ سے کردار سازی تک پھیلا ہوا تھا۔ اعلیٰ حضرت کے پیش کردہ اصلاحِ ملت کے جامع اصول ان کے لیے محض کتابوں کے صفحات پہ محفوظ ایک تاریخی سرمایہ نہیں تھے، وہ ان کی عملی زندگی کے چراغ تھے۔ انہوں نے ان چراغوں کی روشنی میں اپنے عہد کے اندھیروں کو دیکھا، اپنے زمانے کے فتنوں کو پہچانا اور پھر اپنے قلم، اپنی تقریر اور اپنی جدوجہد کو اسی روشنی کا امین بنا دیا۔

اعلیٰ حضرت کے فکری ورثے میں دین صرف محراب ومنبر تک محدود نہیں بلکہ تعلیم، تربیت، صحافت، تصنیف، اشاعت، معاشرت، معیشت، تنظیم اور اجتماعی شعور۔۔۔ زندگی کے ہر میدان سے اس کا تعلق ہے۔ علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ حقیقت صرف سمجھی نہیں بلکہ زبان وقلم کے دائرے میں پھیلا کر اپنی زندگی کے شب وروز میں اسے مجسم کر کے دکھا دیا۔ ان کا قلم عشقِ رسول ﷺ کی حرارت سے روشن تھا، عقائدِ اہلِ سنّت کے تحفظ کے لیے بیدار تھا، علمِ دین کی اشاعت کے لیے متحرک تھا، معاشرتی اصلاح کے لیے بے چین تھا اور ملت کے اجتماعی شعور کو زندہ رکھنے کے لیے مسلسل مصروفِ عمل تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مسلک کسی ایک اصطلاح کا نام نہیں بلکہ ایک مکمل فکری وتہذیبی روایت ہے، ایک ایسا منہج ہے جس میں محبت بھی ہے اور معرفت بھی، عقیدہ بھی ہے اور دلیل بھی، ادب بھی ہے اور بصیرت بھی، نسبت بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔

اسی لیے انہوں نے مسلکِ اعلیٰ حضرت کا دفاع محض ردِّ عمل کے طور پہ نہیں کیا۔ وہ ہر اعتراض کا جواب دینے کے لیے نہیں لکھتے تھے، وہ ایک پورے فکری نظام کی ترجمانی کے لیے لکھتے تھے۔ ان کے نزدیک اہلِ سنّت کے عقائد کی حفاظت ۔صرف مخالفین کے اعتراضات کا جواب دینے تک محدود نہیں تھی بلکہ ایک وسیع تر فکری، علمی اور دعوتی جد وجہد کی سمت تھی، نئی نسل کے ذہنوں میں صحیح عقیدے کی بنیاد رکھنے، انہیں اپنی علمی وتہذیبی روایت سے وابستہ کرنے اور انہیں فکری یلغار کے مقابلے میں مضبوط بنانے کی عملی کوشش بھی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جس قوم کا اپنا علمی لٹریچر کمزور ہو جائے، جس کے قلم کار میدان چھوڑ دیں اور جس کے نوجوانوں کے ذہن دوسروں کی تحریروں سے تشکیل پانے لگیں، اس قوم کے عقائد اور تہذیبی شناخت دونوں خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی صحافت محض واقعات کی ترجمانی نہیں تھی، وہ فکر کی تعمیر کی ایک راہ تھی۔ ان کی تقریریں محض خطابت کی جولانی نہیں تھیں، وہ دلوں میں یقین پیدا کرنے کی کوشش تھیں۔ ان کی تحریریں محض الفاظ کا مجموعہ نہیں تھیں، وہ ایک ایسے فکری مورچے کی دیواریں تھیں جسے انہوں نے اپنے عہد کے فتنوں کے مقابلے میں تعمیر کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کبھی ایک مضمون کسی بھٹکے ہوئے ذہن کو راستہ دکھا دیتا ہے، کبھی ایک جملہ کسی نوجوان کے ایمان کو متزلزل ہونے سے بچا لیتا ہے، کبھی ایک تقریر کسی سوئی ہوئی قوم کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلا دیتی ہے اور کبھی ایک کتاب کئی نسلوں کے لیے فکری چراغ بن جاتی ہے

اس راہ میں انہیں آسانیاں کم اور آزمائشیں زیادہ ملیں۔ مخالفتیں

ہوئیں، الزام تراشیاں ہوئیں، طعن وتشنیع کے تیر چلائے گئے، ان کی نیتوں پر سوالات اٹھائے گئے اور ان کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ مگر جن لوگوں نے اپنی زندگی کسی بلند مقصد کے نام کردی ہو، وہ راستے کی دشواریوں سے اپنا سفر ختم نہیں کرتے۔ علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی ایسے ہی مسافر تھے۔ انہوں نے مشکلات کو اپنی رفتار کا عذر نہیں بنایا، مخالفتوں کو اپنی زبان کی زنجیر نہیں بننے دیا اور مصلحتوں کو اپنے قلم کا پاسبان نہیں بننے دیا۔ وہ ہر آزمائش کے سامنے پامردی سے کھڑے رہے؛ کبھی خندہ پیشانی کے ساتھ، کبھی خموش استقامت کے ساتھ اور کبھی اس بے باکی کے ساتھ جو صرف ان لوگوں کا سرمایہ ہوتی ہے جن کے دل میں اپنے رب کی رضا اور اپنے مقصد کی صداقت کا یقین ہو۔

ان کی اس بے باکی اور حق کے لیے ہر مصلحت سے بے نیاز ہو جانے کی روح کو سمجھنے کے لیے خود ان کی تحریروں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شخصیت اور ان کی عظیم مجاہدانہ جدوجہد کے بارے میں لکھتے ہوئے علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے مضمون میں جو جذباتی اور دل نشیں الفاظ قلم بند کیے، وہ دراصل خود ان کے اپنے فکری و روحانی مزاج کی بھی ایک گہری ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ویسے کہنے کے لیے ساری دنیا رسولِ مجتبیٰ کے پروانوں سے بھری ہوئی تھی لیکن 'نجد' کے گستاخوں کے منھ میں لگام دینے کے لیے تمہارے سوا کون کھڑا ہوا۔ کس نے اپنی ہستی کی ساری صلاحیتوں کو حمایتِ حق کے مورچے پہ لگا کر اسلام کی فصیل کو کفر و الحاد کے طوفان سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ مزارات کے وارث اور خانقاہوں کے سجادہ نشین کہاں نہیں تھے۔ لیکن کسے ہمت ہوئی کہ ابلیس کے رقص کرتے ہوئے لشکر کو شکستِ فاش دینے کے لیے خون کا آخری قطرہ تک نثار کر دے۔

ہر محفل کا چراغ بننا اور ہر طبقے میں نیک نام کہلانا کون نہیں پسند کرتا لیکن پیارے یہ تمہارا ہی جگر تھا کہ حق کی خوشنودی کے آگے تم نے کسی کے روٹھنے کی پرواہ نہ کی، نہ کسی کے طعن وتشنیع سے آزردہ ہوئے۔ ایک اپنے محبوب کو راضی کر کے تم سارے جہان سے مستغنی ہو گئے۔ اہلِ حق کی دنیا آج بھی اعتراف کرتی ہے کہ تم نے غیرتِ عشق کی یہ بھٹی نہ سلگائی ہوتی تو اس عہدِ نفاق آشوب میں یقین و عرفان کا یہ نکھرا ہوا سونا کسے میسر آتا۔'' (تجلیاتِ رضا، ص: ۲۱۱، دارالکتاب، دہلی)

یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ یہ الفاظ کسی بیرونی مداح یا کسی غیر جانب دار سوانح نگار کے نہیں، خود علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قلم سے نکلے ہیں۔ وہ اعلیٰ حضرت کے بارے میں لکھتے ہوئے جس جگر سوزی، جس بے نیازی، جس غیرتِ عشق اور جس حمایتِ حق کو عظمت کا معیار قرار دے رہے ہیں، ان کی اپنی زندگی بھی اسی معیار کی عملی تفسیر بن کر سامنے آتی ہے۔ انہوں نے جس شخصیت کے بارے میں لکھا کہ ''ہر محفل کا چراغ بننا اور ہر طبقے میں نیک نام کہلانا کون نہیں پسند کرتا''، خود بھی ہر محفل کی مقبولیت اور ہر طبقے کی خوشنودی کو اپنا مقصد نہیں بنایا۔ انہوں نے جس عظیم مجاہد کی تعریف میں کہا کہ ''حق کی خوشنودی کے آگے تم نے کسی کے روٹھنے کی پرواہ نہ کی''، خود بھی حق کی خوشنودی کو اپنی ترجیحات میں سب سے بلند رکھا۔

یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کے بارے میں علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہ جذباتی اظہار محض عقیدت کا ایک خوب صورت نمونہ نہیں بلکہ ان کے اپنے فکری اور روحانی شخصیت کی ایک غیر شعوری خودنوشت بھی محسوس ہوتی ہے۔ وہ اعلیٰ حضرت میں جس کردار کو دیکھ کر متأثر ہوتے ہیں، جس استقامت کو اپنی عقیدتوں کا سلام پیش کرتے ہیں اور جس غیرتِ عشق کو عظمت کا معیار قرار دیتے ہیں، ان کی اپنی زندگی میں بھی اسی کردار، اسی استقامت اور اسی غیرتِ عشق کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ یہی نسبت کی حقیقی معنویت ہے کہ انسان جس عظیم شخصیت کو اپنا امام، اپنا رہبر اور اپنا فکری مرکز مانتا ہے، وقت کے ساتھ اس کی تعلیمات صرف اس کے الفاظ میں نہیں رہتیں بلکہ اس کے کردار میں بھی جلوہ گر ہونے لگتی ہیں۔

ان کی زندگی کا یہ پہلو خاص طور پہ قابلِ غور ہے کہ انہوں نے اپنے نظریے کی قیمت کبھی وقتی مقبولیت سے وصول نہیں کی۔ وہ جانتے تھے کہ ہر سچی بات فوراً پسند نہیں کی جاتی، ہر حق گو شخص فوراً مقبول نہیں

ہوتا اور ہر مجاہدِ قلم کو اپنے عہد میں داد نہیں ملتی۔ بعض اوقات تاریخ اپنے حقیقی محسنوں کو پہچاننے میں دیر کرتی ہے مگر وقت، جو بظاہر سب سے بڑا منصف ہے، بالآخر ان ناموں کو نمایاں کر دیتا ہے جنہوں نے اپنے عہد کے شور میں حق کی آواز زندہ رکھی تھی۔ علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی زندگی بھی اسی حقیقت کی گواہی ہے۔

بے نشانوں کا نشاں مٹتا نہیں
مٹتے مٹتے نام ہو ہی جائے گا

آج جب ان کی علمی، صحافتی، فکری اور مسلکی خدمات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ احساس اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے کہ انہوں نے محض اپنے زمانے کے لیے نہیں لکھا تھا۔ ان کی تحریروں میں اپنے عہد کا درد ضرور ہے مگر ان کی فکر اپنے عہد کی حدود سے کہیں آگے جاتی ہے۔ انہوں نے جن خطرات کا احساس فرمایا تھا، وہ آج زیادہ نمایاں ہو چکے ہیں جن فکری یلغاروں سے انہوں نے خبردار کیا، وہ آج جدید ذرائع اور نئے اسالیب کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہیں اور جن ذمہ داریوں کی طرف انہوں نے اہلِ حق کو متوجہ کیا، آج ان کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج ان کی خدمات کا اعتراف محض عقیدت کا اظہار نہیں، تاریخ کا ایک لازمی فیصلہ بھی ہے۔ مخالفین نے بھی ان کی علمی قوت محسوس کی، اہلِ علم نے ان کی فکری بصیرت تسلیم کی اور اہلِ محبت نے ان کی نسبتوں کی صداقت پہچانی۔ انہوں نے مسلکِ اعلیٰ حضرت کو صرف زبانی نعرہ نہیں بنایا بلکہ اسے اپنی فکر میں جگہ دی، اپنے قلم میں قوت دی، اپنی تقریر میں حرارت دی اور اپنی زندگی میں عمل کا لباس پہنایا۔ اسی لیے وہ مسلکِ اعلیٰ حضرت کے محض ایک گرم جوش خطیب یا باصلاحیت قلم کار نہیں تھے، وہ اس فکر کے حقیقی ترجمان تھے---ایسے ترجمان جنہوں نے اپنے عہد کے فکری ہنگاموں میں یہ آواز بلند رکھی جو عشقِ رسول ﷺ، تحفظِ عقیدہ، تعظیمِ اولیاء، محبتِ اہلِ بیت واصحابِ رسول رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور اصلاحِ ملت کی جامع روایت سے پھوٹتی ہے۔

ان کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ کسی عظیم نسبت کا دعویٰ آسان ہے مگر اس نسبت کا حق ادا کرنا دشوار۔ نسبت صرف نام سے نہیں، کردار سے ثابت ہوتی ہے، صرف نعرے سے نہیں، قربانی سے پہچانی جاتی ہے، صرف وابستگی کے اظہار سے نہیں، آزمائش کے وقت استقامت سے معتبر ہوتی ہے۔ علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس نسبت کا حق اپنے عزم، اپنے علم، اپنے قلم اور اپنی قربانی سے ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ان کی شخصیت دھندلی نہیں ہوئی بلکہ اور نمایاں ہوتی گئی، ان کی آواز مدھم نہیں پڑی بلکہ نئی نسلوں کے سوالات کے درمیان اور زیادہ سنائی دینے لگی اور ان کی خدمات ماضی کا ایک بند باب نہیں رہیں بلکہ آج بھی فکر وعمل کے لیے ایک زندہ حوالہ بنی ہوئی ہیں۔

علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا سب سے بڑا پیغام یہی ہے کہ فکری محاذ خالی نہیں چھوڑے جا سکتے۔ اگر اہلِ حق قلم سے دست بردار ہو جائیں تو باطل اپنے نظریات سے ذہنوں کو فتح کر لے گا۔ اگر ہم نے مطالعہ، تحقیق، تصنیف، صحافت اور اشاعت کے میدان کو نظر انداز کیا تو ہماری آئندہ نسلیں فکری یتیمی کا شکار ہو جائیں گی۔ اس لیے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم مذہبی رسائل و جرائد، علمی اداروں، تحقیقی مراکز اور دعوتی ذرائع کی سرپرستی کو محض ایک سماجی خدمت نہیں بلکہ ایک دینی فریضہ سمجھیں۔ علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے خونِ جگر سے روشن ہونے والے چراغ آج ہم سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ کیا ہم نے قلم کی اس امانت کا حق ادا کیا؟ کیا ہم نے فکری محاذ کی حفاظت کے لیے اپنا کردار ادا کیا؟ کیا ہم نے آنے والی نسلوں تک حق کی آواز پہنچانے کے لیے کوئی سرمایہ چھوڑا؟

اگر ہم ان سوالات پہ سنجیدگی سے غور کر سکیں تو یہی علامہ کی صحافتی جدوجہد کا سب سے بڑا اخراجِ عقیدت ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہبی صحافت محض کاغذ اور روشنائی کا نام نہیں، یہ ایمان کی پاسبانی، عقیدے کی حفاظت، فکر کی تعمیر اور ملت کے زندہ ضمیر کی آواز ہے۔ اور جب تک ایسے اہلِ درد اپنے خونِ جگر سے یہ چراغ روشن کرتے رہیں گے، حق و صداقت کی یہ اذان زمانے کے شور میں بھی گونجتی رہے گی اور آنے والی نسلوں کو یہ پیغام دیتی رہے گی کہ باطل کے مقابلے میں قلم کی شمع کبھی بجھنی نہیں چاہیے۔

□□□□

محمد ملک الظفر سہسرامی

فقہی بصیرت سے عصری رہنمائی تک

مفتی اختر حسین قادری کا علمی وفکری امتیاز

اسلامی تہذیب کی فکری عمارت میں فقہ وفتاویٰ روح کی مانند ہیں جو پورے نظام کو زندگی عطا کرتے ہیں۔ یہی وہ روشن چراغ ہے جس کی ضیا پاشیوں میں امتِ مسلمہ نے صدیوں تک اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی منظم رکھی۔ فقہ وہ میزان ہے جس نے بدلتے حالات میں شریعت کے ابدی اصولوں کو عملی زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھا۔ اس کے ذریعے عبادات کی روح بھی محفوظ رہی اور معاملات کی سمت بھی متعین ہوئی۔

خانگی زندگی سے لے کر معاشرتی نظام تک، تجارت سے لے کر سیاست تک، ہر میدان میں فقہی رہنمائی نے امت کو اعتدال، توازن اور حکمت کا راستہ دکھایا۔ فتاوے دراصل وہ زندہ رابطے ہیں جو نصوصِ شرعیہ کو زمانے کے نئے سوالات سے جوڑتے ہیں۔ جب بھی حالات نے نئی کروٹ لی، فقہاء نے اجتہاد واستنباط کی روشنی میں ایسے جوابات فراہم کیے جن سے دین کی روح بھی برقرار رہی اور زندگی کی روانی بھی متاثر نہ ہوئی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فقہ اسلامی تہذیب کی وہ خموش مگر باوقار دھڑکن ہے جو صدیوں سے امت کے وجود میں حرکت اور معنویت پیدا کرتی آ رہی ہے۔ اسی علمی روایت نے امت کو انتشار سے بچایا، اختلاف کو نظم میں بدلا اور زندگی کو شریعت کے نور سے ہم آہنگ رکھا۔ حالی نے ایک غیر حقیقت پسندانہ گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا:

امت کو بانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر
اسلام اے فقیہو! ممنوں بہت تمہارا

فقہائے کرام کا امت پہ احسان رہا ہے کہ انہوں نے حق وباطل، کفر واسلام اور توحید وشرک کے درمیان جو واضح اور نمایاں فرق ہے اسے بیان فرمایا۔ فقہائے کرام پر کسی مسلمان کو کافر بنانے کا الزام قطعی خلافِ واقعہ ہے۔ جو شخص اپنے کفریہ قول وفعل سے مرتکب کفر ہو چکا ہو، اس کے کفر کی بنیاد پر اسے کافر بتایا گیا ہے۔

جہاں فقہ کی روشنی کمزور پڑتی ہے وہاں زندگی کے گوشے دھندلانے لگتے ہیں اور جہاں اس کی تابانی برقرار رہتی ہے وہاں افکار بھی روشن رہتے ہیں اور اعمال کی دنیا بھی روشن وتابناک ہو جاتی ہے۔

جب حالات بدلے، زمانے نے نئے سوالات پیدا کیے اور زندگی کے میدان میں نئے مسائل ابھرے تو فقہائے کرام نے قرآن وسنت کی ابدی تعلیمات کی روشنی میں ان کا حل پیش فرمایا، یوں دین کی رہنمائی ہر دور میں تازہ اور زندہ رہی۔ انہوں نے محض ظاہری احکام کی توضیح پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اصولِ شریعت کی گہرائی میں اتر کر ایسے رہنما ضابطے مرتب کیے کہ بدلتے ہوئے زمانے میں بھی اس نے اپنی معنویت برقرار رکھی۔

اجتہاد کی یہی روشن روایت امت کے لیے سہارا بنتی رہی، جس کے ذریعے نئے پیش آمدہ مسائل کو دین کی روح کے مطابق سمجھا اور سلجھایا جاتا رہا۔ فقہ اسلامی نے زمانے کے تغیر کو چیلنج کی بجائے ایک موقع بنایا اور ہر نئے سوال کو حکمت کے ساتھ جواب میں بدل دیا۔ کبھی تجارت کی نئی صورتوں میں رہنمائی فراہم کی، کبھی معاشرتی پیچیدگیوں کو اعتدال میں ڈھالا اور کبھی عبادات کے دقیق پہلوؤں کو سہولت وآسانی کے ساتھ واضح کیا۔ یہ تسلسل اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ شریعت محض ماضی کی یادگار نہیں بلکہ ہر عہد کی زندہ رہنما ہے۔ فقہاء کی بصیرت نے دین کی یہ ابدی تازگی محفوظ رکھی اور امت کو یہ اعتماد عطا کیا کہ زندگی

کا کوئی مرحلہ ایسا نہیں جس کے لیے اسلام کی رہنمائی موجود نہ ہو۔

یہی علمی تسلسل کبھی "فتاویٰ عالمگیری" کی صورت میں جلوہ گر ہوا، کبھی "فتاویٰ رضویہ" کی شکل میں فقہی بصیرت کا مینار بنا اور کبھی معاصر اہلِ علم کے فتاوے میں نئی معنویت کے ساتھ سامنے آیا۔ درحقیقت فتویٰ نویسی محض مسائل کے جوابات کا نام نہیں بلکہ یہ ایک عظیم امانت ہے جو علم، تقویٰ، بصیرت اور زمانہ شناسی کا تقاضا کرتی ہے۔

اس امانت کو ادا کرنے والے علماء نے نہ صرف شریعت کے اصولوں کی حفاظت کی بلکہ بدلتے ہوئے حالات میں امت کا اعتدال، حکمت، سہولت کی راہ بھی دکھائی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرے کی فکری تشکیل میں فقہ وفتاوے کو بنیادی حیثیت حاصل رہی اور آج بھی اس روایت کی روشنی امت کے فکری افق کو منور کر رہی ہے۔

فقہ وفتاویٰ کی ضرورت اور اسلامی نظام کی عملی تعبیر

جب اسلام ایک کامل نظامِ حیات ہے تو اس نظام کو زندگی کے بدلتے حالات میں نافذ کرنے کے لیے فقہ و فتاوے کی ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ فقہ کے بغیر شریعت کے احکام محض نظری رہ جاتے ہیں، لیکن فقہ نے انہیں روزمرہ کے فیصلوں، معاملات اور اجتماعی نظم میں ڈھال دیا۔ اسی کے ذریعے عبادات کی حدود متعین ہوئیں، معاملات کی راہیں روشن ہوئیں اور معاشرتی زندگی کو اعتدال کا راستہ ملا۔ گویا فقہ وہ آئینہ ہے جس میں اسلام کا مکمل نظامِ حیات واضح صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ فتاوے دراصل اسی فقہی بصیرت کی عملی تعبیر ہیں جو نئے حالات میں رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ جب زمانہ نئی پیچیدگیاں پیدا کرتا ہے تو فقہاء اپنے اجتہادی ذوق کے ساتھ ان مسائل کو شریعت کے اصولوں پر پرکھتے ہیں اور ایسا حل پیش کرتے ہیں جس میں دین کی روح بھی محفوظ رہتی ہے اور زندگی کی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے۔ یوں فقہ وفتاوے اسلام کے اس کامل نظام کو ہر دور میں متحرک رکھتے ہیں۔ یہ نہ صرف شریعت کے احکام زندہ رکھتے ہیں بلکہ انہیں زمانے کی رفتار کے ساتھ ہم آہنگ بھی کرتے ہیں تاکہ دین کا نور زندگی کے ہر گوشے کو منور کرتا رہے اور انسان ہر حال میں ہدایت کی روشنی سے وابستہ رہے۔

قرآن وسنت نے اصول فراہم کیے اور فقہائے امت نے انہی اصولوں کی روشنی میں زندگی کے مختلف مسائل کا حل پیش کیا۔ عبادات ہوں یا معاملات، معاشرت ہو یا سیاست، معیشت ہو یا اخلاق، ہر میدان میں شریعت کی عملی رہنمائی فقہ کے ذریعے سامنے آتی ہے۔ فقہ دراصل اسی نورِ نبوت کی عملی تعبیر ہے جو بدلتے زمانوں میں امت کو راستہ دکھاتی ہے۔ فتاوے وہ چراغ ہیں جو نئے مسائل کے اندھیروں میں روشنی فراہم کرتے ہیں۔ جب نئے حالات پیدا ہوتے ہیں تو قرآن و حدیث کے اصولوں کو سامنے رکھ کر فقہا مسائل کا حل پیش کرتے ہیں، تاکہ امت دین کے دائرے میں رہ کر اپنی زندگی کے گوشے منظم کر سکے۔ اسی لیے اسلامی تاریخ میں فقہ وفتاوے نے نہ صرف مذہبی زندگی سنواری بلکہ سماجی، معاشی اور تمدنی ڈھانچے کو بھی استحکام بخشا۔ اسی فقہی بصیرت نے فرد کے باطن کو عبادت کی روشنی دی اور معاشرے کے ظاہر کو نظم وضبط کی بنیاد عطا کی۔

گھریلو تعلقات ہوں یا کاروباری معاملات، عدالتیں ہوں یا معاشرتی رسوم، ہر شعبے میں فقہی رہنمائی نے اعتدال، انصاف اور ذمہ داری کا شعور پیدا کیا۔ یوں زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا جو شریعت کے نور سے بے نیاز ہو۔

اسلامی تہذیب کی وسعت کا راز بھی اسی علمی روایت میں پوشیدہ ہے کہ اس نے زمانے کے بدلتے رجحانات قبول کرتے ہوئے اپنی بنیادیں مضبوط رکھیں۔ فقہ نے روایت کی حفاظت بھی کی اور ضرورت کے مطابق سہولت بھی فراہم کی، تاکہ دین سختی نہیں بلکہ توازن اور حکمت کی علامت بن کر سامنے آئے۔ فقہ وفتاوے محض احکام کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک زندہ علمی میراث ہیں جس نے صدیوں تک امت کی فکری سمت متعین کی، یہی وہ سرمایہ ہے جس نے اسلامی معاشرے کو استحکام، اعتدال اور معنویت عطا کی اور جس کی روشنی میں آج بھی زندگی کے نئے مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ اسلام نے عبادت کو بھی منظم کیا اور معاملات کو بھی، فرد کو بھی سنوارا اور معاشرے کو بھی، قانون بھی دیا اور اخلاق بھی اور یہی توازن اسلام کی اصل خوبی ہے کہ

اس نے مسجد کی محراب کو بھی اہمیت دی اور بازار کی دیانت کو بھی، دل کی پاکیزگی کو بھی سراہا اور کردار کی صداقت کو بھی لازم قرار دیا۔

عبادات کے ذریعے انسان کو اپنے رب کی چوکھٹ سے جوڑا گیا اور معاملات کے ذریعے بندوں کے اندر تقوے کی روشنی پیدا کی اور اس طرح معاشرے میں عدل وانصاف کی بنیاد مضبوط کی۔ قانون نے نظم دیا، اخلاق نے نرمی پیدا کی اور یوں دونوں کے امتزاج نے ایسی تہذیب کا عملی تصور پیش کیا جس میں سختی کی بجائے توازن اور حکمت جلوہ گر ہوئی۔ اسلام کی تعلیمات ایک مکمل دائرہ تشکیل دیتی ہیں جہاں عبادت روح کو جلا بخشتی ہے اور معاملات زندگی کو وقار دیتے ہیں، اسی ہمہ گیر رہنمائی نے اسلامی تہذیب کو وہ استحکام عطا کیا جس کی مثال تاریخ میں کم ہی ملتی ہے اور یہی جامعیت آج بھی انسان کو متوازن زندگی کا راستہ دکھاتی ہے، فقہ اسی جامعیت کا عملی مظہر ہے۔

اگر قرآن اصول ہے تو فقہ اس کی تطبیق، اگر سنت نمونہ ہے تو فتاوے اس نمونے کی عملی تشریح ہیں۔ فقہ نے اصول کو ضابطہ بنایا اور ضابطے کو عمل کی صورت عطا کی، اس نے نظریات کو زمین پر اتارا اور احکام کو انسانی زندگی کی رفتار کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔ یوں شریعت کی وسعت محض الفاظ میں نہیں رہی بلکہ زندگی کے فیصلوں، تعلقات اور اجتماعی نظم میں نمایاں ہوگئی۔

فتاوے اسی فقہی بصیرت کے زندہ ترجمان ہیں جو ہر نئے سوال کے جواب میں دین کی روشنی تازہ کر دیتے ہیں، ان کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت جامد نہیں بلکہ متحرک ہے اور اس کی رہنمائی ہر دور کے تقاضے اپنے دامن میں سمیٹنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ چنانچہ فقہ اس جامع اسلامی نظام کی عملی روح ہے جو قرآن وسنت کی تعلیمات کو زندگی کے ہر مرحلے میں موثر بناتی ہے اسی کے باعث دین کا نور محض نظری نہیں رہتا بلکہ انسان کے افکار، اعمال اور معاشرت میں ایک زندہ حقیقت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ ہر دور میں فقہ و فتاوے کو اپنی زندگی کی رہنمائی کا بنیادی ذریعہ سمجھتی رہی ہے۔ اسلام کا پیغام صرف نظریہ نہیں بلکہ عملی نظام ہے اور فقہ اس نظام کی روحانی و عملی تطبیق کا نام ہے۔ جس طرح حضور اکرم ﷺ نے انسانیت کو کامل رہنمائی عطا فرمائی اسی طرح امت نے اس رہنمائی کو ہر دور کے مسائل پہ منطبق کر کے دین کو زندہ رکھا یہی وہ نور ہے جو زمانوں کی گرد سے مدھم نہیں ہوتا بلکہ ہر دور میں نئی آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نظام حیات کا آفتاب ہے اور فقہ وفتاوے اس آفتاب کی وہ کرنیں ہیں جو انسانی زندگی کے ہر گوشے کو روشن کرتی رہتی ہیں۔ مہد سے لے کر لحد تک، فرد سے لیکر معاشرے تک اور زمانہ حال سے لیکر قیامت تک۔

فقہ وفتاوے کا تعلق اسلامی معاشرے سے چولی دامن کا ہے۔ اربابِ فقہ وفتاویٰ کے ذریعے بیان کردہ مسائل کی روشنی میں ہم اپنی زندگی کا قبلہ درست کرتے ہیں۔ لاریب مسلم معاشرے پر فقہائے کرام کا احسانِ عظیم ہے کہ انہوں نے قرآن وحدیث اور دیگر ادلۂ شرعیہ کی روشنی میں مسائل واحکام کا استخراج فرما کر دینی ومذہبی مسائل میں قوم کی منزل رسائی کی راہ آسان فرما دی۔ آج انہی حضرات کے تعمیر کردہ علمی نظام کی روشنی سے دینی ودنیوی زندگی کی راہ نہ صرف منور ہے بلکہ سہل وآسان بھی ہو چکی ہے۔ انہی کے بیان کردہ مسائل کی روشنی میں آج کے مفتیان کرام قوم وملت کی رہنمائی کا خوشگوار فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ اربابِ فقہ وفتاویٰ کی حیثیت بنیادی طور پر ناقل کی ہوتی ہے۔ وہ ائمۂ مجتہدین کے بیان کردہ مسائل کو سائل کے احوال کے پیش نظر نقل کرتے ہیں تا کہ شریعت کا حکم واضح ہو جائے۔ لیکن اس منصب سے گذرنا آسان نہیں، کیونکہ یہ محض معلومات نہیں بلکہ دیانت، تقویٰ اور ذمہ داری کا تقاضا کرتا ہے۔ افسوس کہ آج کل فتویٰ نویسی میں ایک غیر محتاط رجحان پیدا ہوگیا ہے اور بعض اوقات یہ کیفیت محسوس ہوتی ہے:

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

یہ صورتِ حال اس لیے خطرناک ہے کہ فتویٰ دین کی ترجمانی ہے۔ اس میں معمولی لغزش بھی عوام کے لیے اضطراب کا سبب بن سکتی ہے۔ اسی لیے اکابر فقہا نے اس منصب کے لیے سخت احتیاط کی تلقین

فرمائی ہے، انہوں نے واضح کیا کہ فتویٰ محض معلومات کا اظہار نہیں بلکہ ایک ذمہ دارانہ فیصلہ ہے جس کے پیچھے علم کی گہرائی، تقوے کی پختگی اور حالات کی صحیح شناخت ضروری ہوتی ہے۔ اس منصب پر بیٹھنے والا دراصل شریعت کی آواز بن کر بولتا ہے، اس لیے اس کی زبان میں توازن فکر میں اعتدال اور اس کے قلم میں احتیاط ہونا لازمی ہے۔

اسی احساس ذمہ داری کے تحت اسلاف فتویٰ دینے میں جلد بازی سے گریز کرتے تھے، وہ مسئلے کو بار بار پرکھتے، دلائل کا جائزہ لیتے اور بسا اوقات دوسرے اہل علم سے مشورے بھی کرتے تاکہ کوئی فیصلہ شریعت کی روح کے خلاف نہ ہو ان کی یہ احتیاط دراصل امت کی عملی زندگی کو انتشار سے بچانے کا ذریعہ بنتی رہی۔

چنانچہ فتویٰ دینا محض ایک علمی کام نہیں بلکہ ایک امانت ہے جس کی ادائیگی میں سنجیدگی اور دیانت بنیادی شرط ہے۔ جب یہ اصول ملحوظ نظر رہتے ہیں تو رہنمائی میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور جب اس میں کوتاہی ہوتی ہے تو فکری انتشار جنم لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ فقہا نے ہمیشہ اس منصب کو وقار احتیاط اور خوف خدا کے ساتھ وابستہ رکھا۔

حضرت علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

"المفتی ھو المجتھد، فاما غیر المجتھد ممن یحفظ اقوال المجتھد فلیس بمفتٍ، والواجب علیہ اذا سئل ان یذکر قول المجتھد..."

ترجمہ: مفتی دراصل مجتہد ہوتا ہے اور جو مجتہد نہ ہو بلکہ صرف اقوال یاد رکھتا ہو وہ حقیقی مفتی نہیں۔ اس پر لازم ہے کہ وہ مجتہد کا قول نقل کرے۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں اکثر فتاوے دراصل نقل و روایت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صاحب ''منجد'' کے مطابق: مفتی وہ فقیہ ہے جو مسائل سامنے آنے پر شریعت کے مطابق ان کا حکم بیان کرتا ہے۔ ان اقوال سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ فتویٰ دینا محض ایک رسمی عمل نہیں بلکہ امت کی عملی زندگی کی رہنمائی کا عظیم فریضہ ہے۔ یہ منصب دراصل علم، بصیرت اور تقوے کے امتزاج کا تقاضا کرتا ہے۔

مفتی کا ہر لفظ صرف ایک بیان نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی رہنمائی ہوتی ہے جس پر لوگوں کے اعمال کی بنیاد قائم ہوتی ہے اسی لیے اس ذمہ داری میں عجلت کی جگہ غور و فکر، سہولت کے نام پر بے احتیاطی کی جگہ اصولوں کی پاسداری ضروری سمجھی گئی ہے۔ جب فتویٰ علم، دیانت اور احتیاط کے ساتھ دیا جاتا ہے تو امت کے لیے سکون اور اعتماد کا ذریعہ بنتا ہے لیکن اگر اس میں سطحیت یا جلد بازی شامل ہو جائے تو یہی عمل الجھن اور انتشار کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ اس لیے اکابر اہل علم نے ہمیشہ اس منصب کو خوف خدا، ذمہ داری کے احساس اور عمیق مطالعے سے وابستہ رکھا۔ فتویٰ نویسی دراصل ایک عظیم امانت کی ادائیگی ہے جس کے ذریعے دین کی روشنی عملی زندگی تک پہنچتی ہے اور مسلمان اپنا ہر قدم شریعت کی ہدایت کے مطابق ڈھالنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہی وہ خدمتِ جلیلہ ہے جس کے سبب صدیوں سے امت کی فکری اور عملی رہنمائی کا سلسلہ تابندہ ہے۔ فقہ و فتاویٰ دراصل وہ چراغ ہے جو بدلتے زمانے کے اندھیروں میں راستہ دکھاتے ہیں۔ جب نئے مسائل جنم لیتے ہیں تو انہی اصولوں کی روشنی میں ان کا حل تلاش کیا جاتا ہے اور یہی عمل اسلامی معاشرت کو اعتدال، توازن اور استحکام عطا کرتا ہے۔ فقہائے کرام نے اپنی زندگیاں اسی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ انہوں نے کتابوں کے انبار نہیں بلکہ زندگی کے مسائل کے حل مرتب کیے، انہوں نے نظریات نہیں بلکہ عملی راہیں دکھائیں، ان کی نگاہ محض مباحث کی گہرائی تک محدود نہ تھی بلکہ وہ زندگی کے میدان میں اتر کر انسان کے سوالات کا جواب تلاش کرتے تھے، انہوں نے عبادات کے آداب بھی واضح کیے اور معاملات کے ضابطے بھی، فرد کی اصلاح بھی کی اور معاشرے کی تشکیل بھی۔ یوں ان کی کاوشیں صرف علمی سرمایہ نہیں بلکہ عملی رہنمائی کا زندہ ورثہ بن گئیں۔

فقہائے کرام کی یہی خدمات تھیں کہ انہوں نے دین کو کتابوں کی حدود سے نکال کر زندگی کی رفتار سے ہم آہنگ کیا۔ انہوں نے پیچیدہ مسائل سہل انداز میں بیان کیے، اختلافات اصولوں میں ڈھالے اور امت کو ایسی راہیں دکھائیں جن پر چل کر وہ اعتدال و توازن کے ساتھ آگے بڑھ سکے۔ چنانچہ ان کی تصنیفات محض صفحات کا مجموعہ نہیں بلکہ صدیوں کے تجربات، فکر اور بصیرت کا عصارہ ہیں۔

یہی وہ علمی چراغ ہیں جن کی روشنی میں امت نے اپنے حالات سنوارے اور زندگی کے نشیب و فراز میں بھی شریعت کی رہنمائی کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔ ان کی محنتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی مسلمان اپنی عبادات اور معاملات میں ان کی رہنمائی سے استفادہ کرتا ہے۔

یوں فقہ و فتاویٰ اسلامی معاشرے کی فکری اساس اور عملی رہنمائی کا وہ سرچشمہ ہیں، یہ وہ علمی ورثہ ہے جس نے امت کو ہر دور میں استحکام بخشا اور آج بھی اسی نور کی کرنیں ہماری دینی و دنیوی زندگی کے محلات روشن کر رہی ہیں اور جب تک یہ سلسلہ قائم رہے گا اسلامی معاشرہ فکری انتشار سے محفوظ اور شریعت کی شاہراہ پر گامزن رہے گا۔

حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری:

فقہی بصیرت اور عصری شعور کا روشن امتزاج

اسلامی علمی روایت میں فتویٰ نویسی محض ایک علمی سرگرمی نہیں بلکہ امت کی فکری رہنمائی کا ایک نہایت حساس اور باوقار منصب رہی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں علم، تقویٰ، بصیرت اور زمانہ شناسی باہم مربوط ہو کر دین کی عملی تعبیر کو زندگی سے جوڑ دیتے ہیں۔ تاریخ اسلام کا مطالعہ یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ ہر عہد میں ایسے اہلِ علم سامنے آتے رہے جن کی فقہی بصیرت نے نہ صرف علمی ذخیرے محفوظ رکھے بلکہ عملی زندگی کے پیچیدہ مسائل میں بھی شریعت کی روشنی فراہم کی۔ یہ حضرات محض کتابی علم کے امین نہیں ہوتے بلکہ نصوص کے معانی کو حالات کے تقاضوں کے ساتھ سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے فیصلوں میں علم کی وسعت کے ساتھ حکمت کی لطافت بھی جھلکتی ہے۔ ان کے فتاوے صرف مسائل کے جوابات نہیں ہوتے بلکہ فکر کی روشنی، حکمت کی لطافت اور اعتدال کی راہنمائی کا حسین امتزاج بن جاتے ہیں۔ جب نئے مسائل سامنے آتے ہیں تو اہلِ نظر علما اصولِ دین کی بنیاد پر ایسے معتدل اور قابلِ عمل جوابات پیش کرتے ہیں جن میں سہولت اور احتیاط دونوں کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ انھی اہلِ علم کی فتویٰ نویسی ایک نمایاں اور منفرد جہت کے طور پر سامنے آتی ہے، جس میں روایت کی پختگی بھی شامل ہوتی ہے اور درایت کی تازگی بھی جلوہ گر رہتی ہے۔ ان کی رہنمائی سے عبادات میں اخلاص پیدا ہوتا ہے اور معاملات میں دیانت کو فروغ ملتا ہے۔ وہ فرد کے ضمیر کو بھی بیدار کرتے ہیں اور معاشرتی نظام کو بھی مضبوط بناتے ہیں، تاکہ دین محض عقیدہ نہ رہے بلکہ ایک زندہ طرزِ حیات کی صورت میں جلوہ گر رہو۔

یقیناً یہ اہلِ علم شریعت کے فانوس بردار بن کر امت کی فکری اور عملی زندگی روشن و تابناک رکھتے ہیں۔ ان کی فقہی بصیرت سے دشواریاں آسان ہوتی ہیں، راستے واضح ہوتے ہیں اور دین کی روشنی ہر دور میں تازہ اور تابندہ نظر آتی ہے۔ عصرِ حاضر میں حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری ایسی ہی ایک ممتاز علمی شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں، جو اپنے گہرے مطالعے، توازنِ فکری اور دور اندیشی کے سبب علمی دنیا میں مقامِ اعتبار و اعتماد رکھتے ہیں۔ وہ مسائل کو محض نقل کے انداز میں نہیں بلکہ اصولی بصیرت کے ساتھ پرکھتے ہیں۔ ان کے یہاں روایت کا احترام بھی ہے اور حالات کی رعایت بھی، فکر کی گہرائی بھی ہے اور اظہار کی شائستگی بھی، دلائل کی مضبوطی بھی ہے اور اندازِ بیان کی دلکشی بھی، اصولوں کی پاسداری بھی ہے اور حکمت کی نرمی بھی۔

اگر دیکھا جائے تو ان کی تحریر میں توازن کی ایسی روشنی جھلکتی ہے کہ قاری کی ذہنی الجھنیں دور ہوتی ہیں اور فہم کی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ یہی امتزاج ان کی علمی شخصیت کو وقار بھی عطا کرتا ہے اور تاثیر بھی۔ اسی لیے ان کی آراء میں اعتدال اور توازن نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ اختلاف کے ماحول میں بھی علمی و فقہی وقار برقرار رکھتے ہیں اور گفتگو سنجیدہ علمی دائرے میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے لہجے میں شائستگی بھی ہوتی ہے اور استدلال میں پختگی بھی۔ وہ اختلاف کو انتشار نہیں بننے دیتے بلکہ اسے فہم کے نئے دریچوں میں بدل دیتے ہیں۔

ان کے دلائل میں متانت بھی ہوتی ہے اور اندازِ بیان میں ایسی نرمی کہ مخاطب کو احترام کا احساس رہے۔ اس طرح بحث محض رد و قبول تک محدود نہیں رہتی بلکہ تحقیق کی ایک سنجیدہ روایت بن جاتی ہے۔ یہی طرزِ گفتگو ان کی شخصیت کو اعتدال، وقار اور علمی تاثیر کا حسین امتزاج بنا دیتی ہے، جس سے ان کی شخصیت کی متانت مزید نمایاں ہو جاتی ہے۔

ان کی علمی خدمات کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ پیچیدہ مسائل

واضح اور قابلِ فہم انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے فتاوے میں نہ شدت کا غلبہ ہوتا ہے اور نہ بے جا سہولت کا رجحان بلکہ شریعت کے اصولوں کے مطابق ایک معتدل اور حکیمانہ راہ سامنے آتی ہے۔ یہی وصف انہیں معاصر علمی حلقوں میں ممتاز بناتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ذات عصرِ حاضر میں فقہی بصیرت اور علمی ذمہ داری کی ایک روشن مثال ہے، جہاں علم کی گہرائی، فکر کی پختگی اور امت کی رہنمائی کا جذبہ ایک ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ ان کی کاوشیں نہ صرف علمی دنیا کے لیے سرمایہ ہیں بلکہ عملی زندگی میں بھی دین کی روشنی تازہ رکھنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ یقیناً ان کے فتوے دینی مسائل میں رہنمائی فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ عملی زندگی کے دشوار معاملات میں بھی ایک تابناک راہ دکھاتے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری ایک ممتاز اسلامی اسکالر اور ماہر فقیہ ہیں انھیں ان کے علم، تقویٰ اور دور اندیشی کی بنیاد پر علمی دنیا میں اعتماد حاصل ہے۔ ان کی شخصیت میں تحقیق کی سنجیدگی بھی ہے اور بصیرت کی روشنی بھی۔ وہ نصوص کی گہرائی تک رسائی رکھتے ہیں اور حالات کے تقاضے بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے فتاوے میں اصول کی مضبوطی بھی جھلکتی ہے اور اعتدال کی حکمت بھی۔ وہ اختلافی مسائل میں بھی ایسی متوازن راہ اختیار کرتے ہیں کہ الجھنیں کم ہوتی ہیں اور فہم کی راہیں ہموار اور کشادہ ہو جاتی ہیں۔

ان کے یہاں روایت کا وقار بھی محفوظ رہتا ہے اور زمانے کی ضرورت کا شعور بھی۔ ان کی علمی کاوشیں محض نظری گفتگو نہیں رہتیں بلکہ عملی رہنمائی کا معتبر سرچشمہ بن جاتی ہیں۔ وہ مسائل کو محض ظاہری پہلو سے نہیں دیکھتے بلکہ ان کی تہہ میں جا کر اصولِ فقہ کی روشنی میں ان کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کے فتاوے میں نہ صرف نصوص کا استناد ہوتا ہے بلکہ حالات زمانہ کی صحیح ترجمانی بھی ملتی ہے، جس سے ان کی فقہی بصیرت کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رہنمائی میں اعتدال، حکمت اور شریعت کی روح کا خوبصورت امتزاج دکھائی دیتا ہے۔

ان کا اندازِ بیان بھی علمی وقار کا آئینہ دار ہے۔ ان میں ایسی روانی ہوتی ہے کہ دشواریاں خود بخود آسانی میں بدل جاتی ہیں، جس سے عام افراد کے لیے بھی دین کی رہنمائی آسان ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی اہلِ علم کے لیے ان کی تحریروں میں تحقیق کی گہرائی اور استدلال کی مضبوطی موجود رہتی ہے۔ یوں حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری کی ذات عصرِ حاضر میں فقہی شعور اور علمی ذمہ داری کی ایک روشن مثال کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ان کی خدمات نہ صرف علمی دنیا کے لیے قیمتی سرمایہ ہیں بلکہ عملی زندگی میں شریعت کی روشنی کو برقرار رکھنے کا مؤثر ذریعہ بھی ثابت ہو رہی ہیں۔ ان کے فتوے درج ذیل خصوصیات کے حامل ہیں۔

قرآن وسنت کی بنیاد

حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری کے فتوے ہمیشہ قرآن و سنّت کی مضبوط اساس و بنیاد پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ اپنے فتاوے کی تشکیل میں اسلامی تعلیمات اور شریعت کے اصول وقواعد کو مقدم رکھتے ہیں اور یہ بات یقینی بناتے ہیں کہ ہر فیصلہ قرآن وحدیث اور فقہائے احناف کے فرمودات کی روشنی میں ہو۔ ان کے یہاں نصوص کی پاسداری بھی ہے اور استنباط کی بصیرت بھی۔ وہ جزئیات کو کلیات سے مربوط کرتے ہیں اور اصول کو تطبیق کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے دلائل میں تحقیق کی گہرائی بھی ہوتی ہے اور توازن کی حکمت بھی۔ یوں ان کے فتاوے میں روایت کا وقار بھی محفوظ رہتا ہے اور عصری مسائل کا حل بھی میسر آتا ہے۔ وہ اختلافی پہلوؤں کو بھی نہایت احتیاط سے پرکھتے ہیں، معتبر مراجع سے رہنمائی لیتے ہیں اور ایسی معتدل راہ اختیار کرتے ہیں جو امت کے لیے آسانی اور اطمینان کا سبب بنے۔ اسی وجہ سے ان کی آراء محض علمی مباحث نہیں رہتیں بلکہ عملی زندگی کے لیے قابلِ اعتماد رہنمائی کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ بنیاد کی یہ مضبوطی ان کے فتاوے کو علمی استحکام عطا کرتی ہے اور ان کی آراء کو قابلِ اعتماد بناتی ہے۔

مذہبِ اہلِ سنت کی بے باک ترجمانی

ان کی فتویٰ نویسی کا ایک اور نمایاں تفرد یہ ہے کہ وہ مذہبِ اہلِ سنّت، یعنی مسلکِ اعلیٰ حضرت کی ترجمانی مکمل اعتماد اور جرأت کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کے فتاوے میں مسلکی وابستگی کی مضبوطی سطر سطر

میں محسوس ہوتی ہے۔ وہ عقیدے کے مسائل میں غیر ضروری ابہام سے گریز کرتے ہیں اور دلائل کی روشنی میں واضح موقف اختیار کرتے ہیں۔ ان کے بیان میں استقامت بھی ہوتی ہے اور اصول کی پختگی بھی، وہ حق کی وضاحت میں تذبذب کے شکار نہیں ہوتے بلکہ علمی وقار کے ساتھ مذہبِ اہلِ سنّت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے قلم سے صادر ہونے والے فتاوے میں تحقیق کی سنجیدگی بھی جھلکتی ہے اور مسلکی غیرت کی حرارت بھی۔ یوں ان کی تحریر اعتدال کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی اپنے موقف کی وضاحت پوری جرأت کے ساتھ کرتی ہے۔ یہی وصف ان کی فتویٰ نویسی کو ایک خاص رنگ عطا کرتا ہے اور انہیں معاصر علمی حلقوں میں ایک واضح شناخت فراہم کرتا ہے۔

علمی گہرائی اور استدلال

ان کے فتوے گہرے علمی مطالعے اور مضبوط استدلال کی بنیاد پر تشکیل پاتے ہیں۔ وہ مسئلے کے تمام پہلوؤں کا باریک بینی سے جائزہ لیتے ہیں اور نصوصِ شرعیہ کو اصولی ترتیب کے ساتھ سامنے رکھ کر نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ ان کی تحریر میں وسعتِ علمی کی جھلک بھی نمایاں ہوتی ہے اور استدلال کی پختگی بھی، جس کے سبب ان کی رائے محض رائے نہیں رہتی بلکہ دلیل کی قوت سے مستحکم ہو جاتی ہے۔ وہ کسی بھی مسئلے کو سطحی انداز میں نہیں لیتے بلکہ اس کے پس منظر، علت اور نتائج پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ان کے دلائل میں ترتیب، ربط اور جامعیت کا ایسا حسین امتزاج ہوتا ہے کہ قاری کو مسئلے کی گہرائی تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔

اسی علمی وسعت اور قوتِ استدلال کے باعث ان کے فتاوے میں سنجیدگی بھی جھلکتی ہے اور وقار بھی۔ ان کی گفتگو میں تحقیق کا ٹھہراؤ بھی محسوس ہوتا ہے اور دلیل کی روشنی بھی۔

وہ محض مسائل بیان نہیں کرتے بلکہ ان کی تہہ تک پہنچ کر رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ ان کی آراء میں اعتماد کی پختگی بھی ہوتی ہے اور فکر کی متانت بھی۔ ان کی یہی استدلالی قوت قاری کے ذہن میں اطمینان پیدا کرتی ہے اور فہم کے نئے دریچے وا کرتی ہے۔ ان کی علمی سنجیدگی اس بات کی شہادت پیش کرتی ہے کہ ان کا ہر فیصلہ گہرے مطالعے اور ذمہ دارانہ بصیرت کا نتیجہ ہے۔ یہی اوصاف ایک بالغ نظر اور صاحبِ بصیرت مفتی کی پہچان بن جاتے ہیں۔ ان کے کلمات میں علم کی پختگی بھی جھلکتی ہے اور حکمت کی نرمی بھی۔ اسی توازن کے باعث ان کی فقہی آراء محض نظری گفتگو نہیں رہتیں بلکہ عملی زندگی کے لیے معتبر رہنمائی کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں اور یہی خوبی ان کی علمی شخصیت کو وقار، اعتدال اور بصیرت کا حسین امتزاج بنا دیتی ہے۔

عصری مسائل کا حل

حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری عصری مسائل اور جدید دور کے چیلنجز کو مدنظر رکھتے ہیں۔ وہ جدید ٹیکنالوجی، معیشت اور سماجی مسائل کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے ان کا قابلِ عمل حل پیش کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں زمانے کی تبدیلی بھی ہے اور اصولوں کی پختگی بھی۔ وہ نئے دور کے تقاضے سمجھتے ہیں مگر روایت کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھتے ہیں۔ ان کی آراء میں جدت کی آگہی بھی ہوتی ہے اور شریعت کی رہنمائی بھی۔

وہ مسائل کو محض نظری بحث تک محدود نہیں رکھتے بلکہ عملی زندگی کی ضرورتوں سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ ان کے استنباط میں حکمت کی گہرائی بھی ہوتی ہے اور سہولت کی روشنی بھی۔ چنانچہ ان کی فقہی رہنمائی جدید دور کی پیچیدگیوں میں بھی اطمینان اور وضاحت کا احساس پیدا کرتی ہے اور یہی خصوصیت ان کے فتاوے کو محض نظری نہیں بلکہ عملی زندگی کے لیے مفید بناتی ہے۔

اعتدال پسندی اور حکمت

ان کے فتاوے ہمیشہ اعتدال پسندی اور حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ کسی بھی قسم کی انتہا پسندی سے گریز کرتے ہوئے امت مسلمہ کو دینِ اسلام کی اصل روح کے مطابق رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ ان کے یہاں نرمی کی شائستگی بھی ہے اور اصول کی مضبوطی بھی۔ وہ شدت کی جگہ توازن کی راہ اختیار کرتے ہیں اور آسانی کا پہلو نمایاں رکھتے ہیں۔ ان کی آراء میں اعتدال کی روشنی بھی ہوتی ہے اور حکمت کی لطافت بھی۔ وہ مسئلے کے ہر پہلو کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لے کر ایسا فیصلہ دیتے ہیں جو نہ سختی کا باعث بنے اور نہ بے جا سہولت کا۔ ان کے استنباط میں

دین کی روح بھی جھلکتی ہے اور امت کی مصلحت بھی۔ چنانچہ ان کی فقہی رہنمائی دلوں میں اطمینان پیدا کرتی ہے اور عمل کے لیے سہل راستہ فراہم کرتی ہے۔ ان کے اسلوب میں نہ شدت کی انتہا ہے نہ نرمی کی بے جا وسعت بلکہ ایک متوازن اور حکیمانہ انداز نمایاں نظر آتا ہے۔

عوامی فہم کے مطابق انداز

حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری نے اپنے فتاوے میں زبان سادہ اور عام فہم استعمال فرمائی ہے تاکہ ہر شخص ان کا فتویٰ آسانی سے سمجھ سکے۔ ان کے اسلوب میں سلاست بھی ہے اور وضاحت بھی۔ وہ علمی نکات کو پیچیدہ اصطلاحات میں الجھانے کی بجائے سہل انداز میں بیان کرتے ہیں۔ یوں مشکل مسائل بھی فہم کے قریب آجاتے ہیں اور قاری کسی ابہام کا شکار نہیں ہوتا۔ ان کی تحریر میں روانی بھی محسوس ہوتی ہے اور ترتیب بھی۔ وہ مسائل بیان کرنے میں مرحلہ وار طریقۂ گفتگو اختیار کرتے ہیں تاکہ ذہن خود بخود نتیجے تک پہنچ جائے۔ چنانچہ ان کے فتاوے نہ صرف اہلِ علم کے لیے مفید ہوتے ہیں بلکہ عام لوگوں کے لیے بھی عملی رہنمائی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ وہ پیچیدہ فقہی مسائل عام فہم انداز میں بیان کرتے ہیں تاکہ ان کے مخاطبین ان کی بات بہتر انداز میں سمجھ سکیں۔ یہ وصف ان کے فتاوے کو عوامی سطح پر بھی مفید بنا دیتا ہے۔

سماجی اور اخلاقی پہلوؤں کا خیال

حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری فتویٰ نویسی کے عمل میں سماجی اور اخلاقی پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں فتویٰ نویسی دین کی روح بھی ہے اور معاشرے کی اصلاح بھی۔ وہ ایسا حل پیش کرتے ہیں جو دلوں کو قریب کرے اور باہمی احترام کو فروغ دے۔ ان کی آراء میں خیر خواہی کی جھلک بھی ہوتی ہے اور اصلاحِ معاشرہ کی فکر بھی۔ وہ اخلاقی اقدار کو مضبوط بنانے اور باہمی رواداری کو بڑھانے پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں اخوت کی خوشبو بھی محسوس ہوتی ہے اور خیر خواہی کی حرارت بھی۔ وہ اختلاف کے باوجود احترام کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور دلوں کو جوڑنے کی راہ دکھاتے ہیں۔ ان کی رہنمائی میں نرمی کا حسن بھی ہوتا ہے اور اصلاح کی سنجیدگی بھی۔ ان کی فکر معاشرے میں حسنِ سلوک کو فروغ دیتی ہے اور باہمی اعتماد کو مستحکم کرتی ہے۔ چنانچہ ان کے پیش کردہ اصول نہ صرف اخلاقی تربیت کا ذریعہ بنتے ہیں بلکہ سماجی ہم آہنگی کی مضبوط بنیاد بھی فراہم کرتے ہیں۔ ان کے فتاوے میں اعتدال، حسنِ سلوک اور اجتماعی فلاح و بہبود کا واضح پیغام ملتا ہے۔ ان کی رہنمائی نہ صرف فرد کی اصلاح کا ذریعہ بنتی ہے بلکہ معاشرتی ہم آہنگی کو استحکام بھی عطا کرتی ہے۔

وہ امت مسلمہ کے اتحاد، اخلاقی ترقی اور سماجی ہم آہنگی پر زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک فتویٰ نویسی صرف حکمِ شرعی کا بیان نہیں بلکہ معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بھی ہے۔

مسائل کے حل میں نرمی اور سہولت

حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری اسلامی اصول وقواعد کے دائرے میں رہتے ہوئے سہولت اور نرمی کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ ان کے یہاں شریعت کی پاسداری بھی ہے اور سہولت کی حکمت بھی۔ وہ سختی کی بجائے اعتدال کی راہ دکھاتے ہیں اور عمل کو سہل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی آراء میں توازن کی جھلک بھی ہوتی ہے اور رحمت کی خوشبو بھی۔ وہ ایسے حل پیش کرتے ہیں جو اصول سے ہم آہنگ بھی ہوں اور زندگی کے لیے قابلِ عمل بھی۔ ان کے استنباط میں دین کی وسعت بھی نمایاں ہوتی ہے اور امت کے لیے آسانی کا پہلو بھی۔

چنانچہ ان کی فقہی رہنمائی دلوں میں اطمینان پیدا کرتی ہے اور عمل کی راہوں کو ہموار کر دیتی ہے۔ وہ ان مسائل پر زیادہ زور دیتے ہیں جن سے عوام کو آسانی اور سکون ملے۔ اس انداز سے ان کے فتاوے شریعت کی روح، یعنی آسانی، کا عملی اظہار بن جاتے ہیں۔

ان کے فتاوے میں سہولت کی جھلک بھی ہوتی ہے اور رحمت کی تاثیر بھی۔ وہ مشکل کم کرنے اور عمل کو سہل بنانے کی راہ دکھاتے ہیں۔ ان کی آراء میں حکمت کی نرمی بھی محسوس ہوتی ہے اور رہنمائی کی شفافیت بھی، وہ مسائل کے حل اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ دلوں پر بوجھ نہ ڈالیں بلکہ اطمینان پیدا کریں، ان کی فقہی بصیرت میں اصول کی مضبوطی بھی برقرار رہتی اور آسانی کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے، چنانچہ ان کے فتوے شریعت کی وسعت، اعتدال اور رحمت کی روشنی کے مظہر

بن کر سامنے آتے ہیں۔

دلائل کے ساتھ وضاحت

وہ اپنے فتوے میں دلائل کے ساتھ وضاحت پیش کرتے ہیں تا کہ لوگوں کو فیصلے کی وجوہات اور دینی بنیادوں کا علم ہو۔

ان کے اندازِ بیان میں ترتیب بھی ہوتی ہے اور استدلال کی روشنی بھی۔ وہ مسئلے کو مرحلہ وار بیان کرتے ہیں اور ہر نکتہ دلیل کے ساتھ واضح کرتے ہیں۔ یوں قاری کے ذہن میں اعتماد بھی پیدا ہوتا ہے اور فہم کی گہرائی بھی۔ ان کے کلام میں وضاحت کی شفافیت بھی نمایاں ہوتی ہے اور تحقیق کی سنجیدگی بھی۔ وہ صرف حکم بیان نہیں کرتے بلکہ اس کا پس منظر اور حکمت بھی اجاگر کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے فتاوے دلیل کی قوت اور رہنمائی کی تاثیر کا حسین امتزاج بن جاتے ہیں۔ یہ انداز لوگوں کے دلوں میں اعتماد پیدا کرتا ہے اور فتوے کو محض حکم نہیں بلکہ سمجھ بوجھ کا ذریعہ بنا دیتا ہے اور اس طرح قاری احکام کی روح بھی سمجھتا ہے اور اس کی حکمت سے بھی آشنا ہوتا ہے، ان کی وضاحت میں اطمینان کی کیفیت بھی ہوتی ہے اور فہم کی روشنی بھی، چنانچہ بات دل میں اترتی اور عمل کے لیے آمادگی پیدا کرتی ہے، ان کے استدلال کی یہی شفافیت شبہ دور کرتی ہے اور ذہنی الجھنیں کم کرتی ہے۔

ان کی سنجیدہ توضیح فتوے کو رہنمائی کے ایک ایسے منبع میں بدل دیتی ہے جو علم بھی دیتا ہے اور یقین بھی، ان کے بیان میں دلیل کی پختگی بھی ہوتی ہے اور انداز گفتگو میں نرمی بھی چنانچہ بات نہ صرف سمجھی جاتی ہے بلکہ قبولیت کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی یہی طرزِ وضاحت شبہات دور کرتی ہے اور ذہنی الجھنیں کم کرتی ہے۔ ان کے فتاوے علمی رہنمائی، حکمت کی بصیرت اور اعتماد کی مضبوط بنیاد بن کر سامنے آتے ہیں۔

”فتاویٰ علیمیہ“ فقہی بصیرت کا عملی سرمایہ

حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری کی فتویٰ نویسی کے یہ نظری امتیازات ان کی تصنیفی کاوشوں میں عملی صورت اختیار کرتے نظر آتے ہیں، جن میں ”فتاویٰ علیمیہ“ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ آپ کی فتویٰ نویسی کے عملی سرمایے کا ذکر کیا جائے تو ”فتاویٰ علیمیہ“ اس سلسلے میں ایک معتبر اور وقیع علمی شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مجموعہ تین جلدوں پر مشتمل ہے جو موصوف کی فقہی بصیرت، تحقیقی وسعت اور عصری شعور کی جامع نمائندگی کرتا ہے۔

جلدِ اوّل کے ایز ٹائیٹل پر ”کتاب النکاح سے کتاب الوقف تک“ کی تصریح درج ہے، تاہم اس کی عملی ترتیب ”کتاب الطہارت“ سے شروع ہو کر ”کتاب الحج“ تک محیط ہے۔ جلدِ دوم کے ایز ٹائیٹل پر بھی ”کتاب النکاح سے کتاب الوقف تک“ کی وضاحت موجود ہے اور اس جلد کی ترتیب اسی کے مطابق منظم نظر آتی ہے۔ جبکہ جلدِ سوم ”کتاب البیوع“ سے ”کتاب الشتی“ تک کے ابواب پر مشتمل ہے۔

تینوں جلدوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ہر جلد کے اختتام پر جدید اور پیش آمدہ مسائل کے جوابات بھی شامل کیے گئے ہیں، جو اس مجموعے کو محض روایتی فقہی ترتیب تک محدود نہیں رہنے دیتے بلکہ اسے عصرِ حاضر کی ضروریات سے مربوط کر دیتے ہیں۔ اس ضخیم مجموعۂ فتاوی میں بعض جوابات مختصر ہیں اور بعض فتاوے تفصیلی بھی۔

حجم کے اعتبار سے جلدِ اوّل پانچ سو دو صفحات، جلدِ دوم پانچ سو چھتیس صفحات اور جلدِ سوم پانچ سو چھیانوے صفحات پر مشتمل ہے۔ مزید یہ کہ ہر جلد کے آخر میں مراجع ومصادر کی تفصیلی فہرست بھی شامل کی گئی ہے، جس سے موصوف کی علمی وسعت، مطالعے کی گہرائی اور تحقیقی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت اس امر کی نشان دہی کرتی ہے کہ ان کی فتویٰ نویسی محض رائے پر مبنی نہیں بلکہ مستند علمی ذخیرے کی مضبوط بنیاد پر قائم ہے بالخصوص اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ العزیز کے مجموعۂ فتاوی ”فتاوی رضویہ“ سے انہوں نے خوب استفادہ کیا ہے۔ اسی سلسلے کی تکمیل کے طور پر حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری نے ”جدید مسائل اور ان کا شرعی حل“ کے عنوان سے پانچ سو چوالیس صفحات پر مشتمل ایک مستقل کتاب بھی پیش فرمائی ہے، جس میں عصری نوعیت کے مسائل نہایت منظم اور مدلل انداز میں زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ یہ تصنیف ان کی فقہی فکر کے اس پہلو کو مزید واضح کرتی ہے کہ وہ روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ

زمانے کے نئے تقاضے بھی پوری سنجیدگی سے سمجھتے اور ان کا شرعی حل پیش کرتے ہیں۔ یوں ''فتاویٰ علیمیہ'' کی یہ تینوں جلدیں اور جدید مسائل پر ان کی مستقل تصنیف مجموعی طور پر اس حقیقت کی روشن دلیل بن جاتی ہیں کہ حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری کی فتویٰ نویسی محض جزوی آراء کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک منظم فقہی منہج، وسیع مطالعہ اور عصری رہنمائی پر مبنی ایک مکمل علمی نظام کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

یہ علمی سرمایہ ان کی فقہی بصیرت بھی نمایاں کرتا ہے اور معاصر دور میں ان کی فکری امتیازی حیثیت کو بھی مضبوط اور مستحکم بناتا ہے۔ ''فتاویٰ علیمیہ'' اپنی ظاہری پیش کش کے اعتبار سے نہایت باوقار اور معیاری مجموعہ ہے، تاہم مادی سہولیات کے اس دور نے ہماری طبیعت میں سہل پسندی کا جو چراغ جلا دیا ہے اس نے بہت ساری سہولتوں کے ساتھ مشکلات کی راہ بھی کھول دی ہے، اس کے اثرات بعض اوقات علمی کاوشوں میں بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقیع مجموعۂ فتاویٰ میں بھی پروف ریڈنگ کی قابلِ توجہ اغلاط نظر آتی ہیں، جن کے باعث بعض مقامات پر عبارت اپنی پوری وضاحت کے ساتھ مفہوم ادا نہیں کر پاتی۔

جلدِ اوّل کے اینر ٹائٹل پہ جب نگاہ پڑی تو ابتدا میں مجھے سخت حیرت ہوئی فقہ و فتاوے کے کسی مجموعے میں یہ غیر طبعی ترتیب مگر فہرست کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ سہوِ کتابت کا معاملہ ہے۔ اگرچہ یہ ایک فنی لغزش ہے، تاہم ایسے امور کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں، کیونکہ علمی تصانیف میں باریکیاں ہی ان کی وقعت اور اعتماد کو مزید مضبوط بناتی ہیں۔

لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ان پہلوؤں پر نہایت گہری اور محتاط نظر رکھی جائے، تاکہ علمی سرمایہ اپنی ظاہری و باطنی دونوں حیثیتوں میں اسی شان کے ساتھ محفوظ رہے جس کی وہ بجا طور پر مستحق ہے

علمی و فکری شخصیت کا امتیاز

حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری کی علمی شخصیت میں روایت اور درایت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ ایک طرف کلاسیکی فقہی ذخیرے سے گہری وابستگی رکھتے ہیں تو دوسری طرف جدید دور کے تقاضوں سے بھی آگاہ ہیں۔ ان کے یہاں ماضی کی علمی بنیاد بھی محفوظ ہے اور حال کی ضرورتوں کا شعور بھی۔

وہ قدیم مصادر و مراجع سے روشنی لیتے ہیں اور اسے عصری مسائل کی رہنمائی میں ڈھالتے ہیں۔ یوں ان کی فکر میں تسلسل کی خوبصورتی بھی جلوہ گر ہوتی ہے اور تجدید کی تازگی بھی محسوس ہوتی ہے۔ ان کا انداز اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ وہ روایت کو جمود نہیں بننے دیتے اور جدت کو بے اصولی نہیں ہونے دیتے بلکہ دونوں کے درمیان ایسا معتدل ربط قائم کرتے ہیں جو علم کو وقار دیتا ہے اور رہنمائی کو اثر بخشتا ہے۔ چنانچہ ان کی علمی کاوشیں ماضی کی پختگی، حال کی بصیرت اور مستقبل کی رہنمائی کا حسین سنگم بن کر سامنے آتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں تحقیق کی سنجیدگی، استدلال کی مضبوطی اور اسلوب کی شائستگی یکجا دکھائی دیتی ہے۔ ان کا انداز نہایت متوازن ہے، اس میں علم کی وسعت بھی محسوس ہوتی ہے اور بیان کی سلاست بھی نمایاں رہتی ہے۔ وہ اپنی بات دلیل کی قوت سے پیش کرتے ہیں مگر لہجے کی نرمی برقرار رکھتے ہیں۔ اسی اعتدال پسندی کے سبب ان کی تحریر میں متانت کی شائستگی بھی جلوہ گر ہوتی ہے اور تاثیر کی دلکشی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے فتاوے میں ترتیب کا حسن نمایاں نظر آتا ہے اور وضاحت کی شفافیت بھی متوجہ کرتی ہے۔ چنانچہ قاری نہ صرف علمی نکات سے آگاہ ہوتا ہے بلکہ اسلوب کی نفاست سے بھی متاثر ہوتا ہے اور یہی توازن ان کی تحریروں کو وقار، اعتماد اور دل نشینی کا حسین امتزاج بنا دیتا ہے۔

وہ اختلاف کو نزاع نہیں بننے دیتے بلکہ علمی مکالمے کا درجہ دیتے ہیں۔ ان کے لہجے میں احترام کی نرمی بھی ہوتی ہے اور دلیل کی مضبوطی بھی نمایاں رہتی ہے۔ وہ اختلاف کو تصادم میں تبدیل نہیں کرتے بلکہ اسے فہم کے نئے پہلوؤں تک رسائی کا ذریعہ بنا دیتے ہیں۔ یوں ان کی گفتگو میں متانت بھی جھلکتی ہے اور علمی وقار بھی نمایاں ہوتا ہے۔

ان کا انداز دلوں کو قریب لانے والا ہوتا ہے اور بحث کو سنجیدہ سمت عطا کرتا ہے۔ چنانچہ ان کی مجلس میں اختلاف بھی شائستگی کے دائرے میں رہتا ہے اور تحقیق کی روایت مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔

ان کی فکری جہت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ فتوے کو معاشرتی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک مفتی کا قلم صرف مسائل کا جواب نہیں دیتا بلکہ امت کی فکری سمت بھی متعین کرتا ہے۔اسی لیے ان کے فتاوے میں اعتدال، حکمت اور اصلاح کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری کے فتاوے اسلامی تعلیمات اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کے درمیان ایک مؤثر رابطہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ان کی خصوصیات امت مسلمہ کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ ہیں اور ان کے فتاوے لوگوں کی دینی و دنیوی زندگی سنوارنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ان کی علمی قابلیت اور تقوے کی بدولت ان کے فتاوے دینی معاملات میں ایک معتبر رہنمائی کا ذریعہ ہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی علمی کاوشیں فقہی روایت کے تسلسل کی ایک روشن کڑی ہیں، جہاں ماضی کی علمی گہرائی اور حال کی عملی ضرورتیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر امت کے لیے راہِ ہدایت مزید واضح کر دیتی ہیں۔

اس تناظر میں ان کی فقہی خدمات صرف انفرادی رہنمائی تک محدود نہیں رہتیں بلکہ ایک وسیع علمی روایت کی تجدید کا احساس بھی دلاتی ہیں۔ان کی کاوشوں میں تسلسل کا شعور بھی نمایاں ہوتا ہے اور مستقبل کی سمت کا اشارہ بھی۔ان کی فقہی بصیرت ماضی کے سرمایۂ علم کو حال کی ضرورتوں سے جوڑ کر ایک زندہ اور متحرک روایت کی شکل دے دیتی ہے۔مجموعی طور پر حضرت مولانا مفتی اختر حسینقادری کی فتویٰ نویسی اپنے اندر کئی نمایاں تفردات سمیٹے ہوئے ہے۔ان کے یہاں اصول کی پختگی بھی ہے، روایت کی گہرائی بھی، درایت کی تازگی بھی، مسلکی استقامت بھی، اعتدال کی روشنی بھی اور حکمت کی لطافت بھی۔وہ روایت کو زندہ رکھتے ہیں اور عصری مسائل کو سمجھ کر امت کے لیے قابلِ عمل رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ان کی فقہی کاوشیں اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ فتویٰ نویسی محض علمی اظہار نہیں بلکہ ایک ذمہ دارانہ کردار ہے،جس کے ذریعے دین کی روشنی عملی زندگی تک پہنچتی ہے۔

یہی تفردان کی علمی شخصیت کو وقار بھی دیتا ہے اور ان کی خدمات کو زندہ فقہی روایات کا ایک روشن تسلسل بنا دیتا ہے۔ان کے فتاوے اسلامی تعلیمات اور عصری ضروریات کے درمیان ایک مضبوط رابطے کا کردار ادا کرتے ہیں۔درحقیقت ان کی یہ علمی کاوشیں اس وسیع فقہی روایت کا تسلسل ہیں جس نے ہر دور میں امت کی فکری رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔

یوں یہ حقیقت مکمل آب وتاب کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ فقہ و فتاوے کی روایت محض ماضی کا علمی سرمایہ نہیں بلکہ حال کی ضرورت اور مستقبل کی ضمانت بھی ہے۔یہ وہ روشن سلسلہ ہے جس نے امت کو فکری انتشار سے بچایا، زندگی کے پیچیدہ مرحلوں میں درست سمت عطا کی اور شریعت کی شاہراہ ہر دور میں واضح رکھی۔جب تک یہ علمی چراغ فروزاں رہیں گے، اسلامی معاشرہ اپنے اصولوں سے وابستہ اور اپنی شناخت سے ہم آہنگ رہے گا۔آج کے تیز رفتار زمانے میں جہاں مسائل کی نوعیت بدل رہی ہے، وہاں اہلِ علم کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں کہ وہ اس عظیم فقہی ورثے کو سامنے رکھ کر امت کی رہنمائی کریں۔یہی وہ علمی امانت ہے جو دلوں کو یقین، ذہنوں کو سکون اور معاشرے کو اعتدال عطا کرتی ہے۔فقہ و فتاوے کی یہی تابناک روایت امت کے فکری سفر کی رہنما ہے اور رہے گی، کہ اس کی روشنی میں نہ صرف احکام کی وضاحت ہوتی ہے بلکہ زندگی کے منتشر گوشے بھی نظم وتوازن سے آشنا ہوجاتے ہیں۔یوں کہا جاسکتا ہے کہ فقہ کی یہ علمی روایت ایک دریا کی مانند ہے جو صدیوں سے بہہ رہا ہے۔اس کا سرچشمہ قرآن وسنت ہیں، اس کے کنارے فقہائے کرام کی محنتیں ہیں اور اس کی موجوں میں امت کی رہنمائی کی وہ تازگی ہے جو ہر دور میں نئی زندگی بخشتی رہتی ہے۔یہی دریا آج بھی بہہ رہا ہے اور آنے والے زمانوں تک ایمان وعمل کی زمین کو سیراب کرتا رہے گا۔

دعا ہے کہ حضرت مولانا مفتی اختر حسین قادری کا قلم فقہ وفتاوی کے میدان میں اپنی جداگانہ شناخت کے ساتھ فکر وتحقیق کی روشنی بکھیرتا رہے اور اسلامی معاشرے کو اعتدال، توازن اور نور بصیرت عطا کرتا رہے آمین۔

□□□□

محمد ملک الظفر سہسرامی

شیراز سے بریلی شریف تک: ایک نورانی تسلسل

زیرِ نظر کتاب ''نسبتوں کے چراغ'' حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے احوال و آثار، فیوض و برکات، کرامات و اشارات پر گجراتی زبان میں مرتب ایک وقیع تصنیف کا اردو قالب ہے اور یہ ترجمہ دراصل ایک روحانی امانت کی توسیع ہے۔

گیارہویں صدی ہجری کے آستانۂ آغاز پر جب تاریخ عصرِ جدید کے ایک نئے دریچے کھول رہی تھی، اسی وقت سرزمینِ ایران کا وہ بابرکت خطہ شیراز اپنے دامن میں علم، عرفان اور تہذیب کی ایک ایسی درخشاں تہذیبی کہکشاں سمیٹے ہوئے تھا جس کی مثال تاریخ عالم میں بہت کم ملتی ہے۔ یہ محض ایک شہر نہ تھا، ایک زندہ تہذیبی گہوارہ تھا، ایک ایسا گلشن تھا جہاں کی خاک بھی خوشبوئے دانش سے معطر تھی اور فضائیں بھی فنونِ لطیفہ کی نغمہ ریز ہواؤں سے سرشار۔ یہاں علم نے صرف درس گاہوں میں نہیں، گلیوں، خانقاہوں، باغوں اور محرابوں میں بھی سانس لی تھی۔

یہ وہی شیراز ہے جسے کبھی دار العلوم کہا گیا، جہاں فکر نے عبادت کا درجہ پایا اور عرفان نے ادب کا جامہ پہنا۔ وہی شیراز جس کی مٹی نے حضرت شیخ شرف الدین سعدی شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (406ھ/ 691ھ) کے قدموں کا بوسہ لیا، جن کے سخن میں حکمت نے انسانیت سے ہمکلام ہونا سیکھا، وہی سرزمین جس کی خموش فضاؤں نے حضرت خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (1315ء/ 1390ء) کے وجدان کو جِلا بخشی، وہ لسان الغیب کہ جن کے اشعار میں غیب کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں اور وہی شیراز جہاں جمال الدین محمد عرفی شیرازی (1556ء/ 1591ء) نے فکر و فن کے ایسے نقوش ثبت کیے کہ صدیوں کے فاصلے بھی انہیں دھندلا نہ سکے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شیراز محض ایک جغرافیہ نہ تھا بلکہ روحانی و فکری انوار کا ایسا مینار تھا جہاں سے صدیوں تک ہدایت، حکمت اور جمال کے چراغ روشن ہوتے رہے۔ یہاں علم صرف کتابوں میں محفوظ نہ تھا بلکہ دلوں میں اترتا، اذہان کو منور کرتا اور زمانوں کے رخ بدل دیتا تھا۔ اس سرزمین کی فضاؤں میں ایک عجیب تقدس تھا، جیسے ہر جھونکا کسی پوشیدہ بشارت کا پیامبر ہو اور ہر سمت کسی آنے والی معنوی تجلی کے ظہورِ ولایت کا دیباچہ اور شاید یہی وجہ ہے کہ جب تاریخِ اسلام کے بعض عظیم روحانی ابواب کے ابتدائی نقوش تلاش کیے جائیں تو شیراز کی سرزمین محض پس منظر کے طور پر نہیں، ایک فعال روحانی کردار کے انداز میں سامنے آتی ہے۔

گویا یہ شہر صرف اہلِ علم کا باوقار دبستان نہ تھا بلکہ مشیت کے بعض رازوں کا امین بھی تھا، ایسا امین، جس کی گود سے کبھی بشارتیں جنم لیتی ہیں، کبھی مجددانہ اشارات اور کبھی وہ چراغ روشن ہوتے ہیں جن کی لو صدیوں بعد بھی زمانے کو روشنی دیتی رہتی ہے اور جب کسی سرزمین کی مٹی صدیوں تک علم، عرفان اور بشارت کے انوار سمیٹے رہے تو بعید نہیں کہ اسی خاک سے کبھی کوئی ایسا مردِ خدا آگاہ، روشن ضمیر بھی طلوع ہو، جو اس پورے روحانی ورثے کا زندہ مظہر بن جائے۔ شیراز کی یہی مقدس فضا، جہاں حکمت نے سانس لی اور ولایت نے شعور پایا، بالآخر ایک ایسی ہستی کے ظہور کا پیش لفظ بنی جس میں ان تمام نسبتوں کی روشنی سمٹ آئی۔ گویا وہ شہر، جو صدیوں سے چراغ جلا رہا تھا، اب ایک ایسا چراغ عطا کرنے والا تھا جس کی لو سرزمینِ ہند تک پہنچ کر زمانوں کو منور کرنے والی تھی۔

انہی روحانی بشارتوں کے اس مبارک و مسلسل فیضان میں ایک

ایسی تابناک اور نورانی شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے، جو درحقیقت شیراز کی علمی رفعتوں، عرفانی گہرائیوں اور روحانی برکتوں کی ایک زندہ و درخشاں میراث تھی۔اسی سرزمینِ مقدس شیراز سے---جہاں صدیوں سے حکمت کے چراغ فروزاں رہے، جہاں اہلِ دل کی آہٹوں میں بشارتوں کی خوشبو بسی رہی اور جہاں علم وعرفان کی ندیاں خاموشی سے بہتی رہیں---گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں ایک ایسی برگزیدہ ہستی نے عالمِ رنگ و بو میں قدم رکھے، جسے ازل ہی سے غیر معمولی امانتوں اور بلند روحانی مناصب کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔

وہ ذاتِ گرامی ہے----شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سیّد محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ (۱۰۰۰ھ/۱۱۰۷ھ) کی---جن کی ولادت محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ روحانی تسلسل کی ایک نئی کڑی، بشارت کی ایک جیتی جاگتی تعبیر اور ایک ایسے چراغ کا ظہور ہے جس کی روشنی آنے والے زمانوں کے لیے ہدایت ومعرفت کے راستے منور کرنے والی تھے۔

زیرِ نظر کتاب محض ایک بزرگ کی سوانح نہیں بلکہ اُن روحانی اشارات و بشارات کی داستان ہے جن میں تقدیر، ولایت اور نسبتِ مصطفوی ﷺ ایک ہی نورانی تسلسل میں رواں دواں دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ایک ایسی ہستی کا تذکرہ ہے جس کی آمد سے قبل فلکِ بشارت پر اس کے ظہور کا اعلان ہو چکا تھا اور جس کی پوری زندگی ابتدا سے انتہا تک مشیت کے خاص نظم، نبوی اشارات اور روحانی امانتوں کی ایک دل آویز سرگزشت بن کر سامنے آتی ہے۔

یہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ زیرِ نظر مقالہ محض حالات ومناقب کی روایت نہیں بلکہ ایک روحانی دستاویز ہے اور اس کے اردو قالب میں ظہور کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان بشارتوں، نسبتوں اور فیوض کا وہ سلسلہ جو اب تک ایک محدود لسانی دائرے میں محفوظ تھا، اب اردو خواں اہلِ ذوق تک بھی اپنی پوری معنوی تابانی کے ساتھ پہنچے۔ چنانچہ تمہید کے یہ صفحات قاری کو اس روحانی فضا میں داخل کرتے ہیں جہاں سوانح تاریخ سے بلند ہو کر اشارت بن جاتی ہے اور اب آگے اسی اشارت کا وہ باب کھلتا ہے جہاں بشارت واقعات میں ڈھلتی اور نسبت سفر میں تبدیل ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

یہاں سے اس داستان کا باب روشن ہوتا ہے جہاں یہ روحانی اشارات محض بیان نہیں رہتے بلکہ واقعات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اب اس مردِ خدا شناس کا تذکرہ جس کے ظہور کی نوید عالمِ غیب میں پہلے ہی ثبت ہو چکی تھی---جب والدِ گرامی کو خواب میں سرکارِ دوعالم ﷺ کی طرف سے یہ پیغام نورانی ملا کہ ''تمہارے گھر میں ایک فرزند پیدا ہوگا، اس کا نام محمد صالح رکھنا، وہ پیدائشی صاحبِ ولایت اور اپنے زمانے کا قطب ہوگا اور اس کی تعلیم وتربیت کا خاص اہتمام کرنا۔''

غور کیجیے! یہ صرف رسمی تسمیہ نہیں، ولادت سے پہلے منصبِ روحانیت کی نشاندہی ہے۔ پھر وہ طفلِ نور، جس نے فقط پانچ برس کی مختصر عمر میں حفظِ قرآن کی سعادت پائی--ایسی سعادت جو تاریخ میں کم ہی نوخیز اذہان کے نصیب میں آئی--اور بارہ سال کی قلیل مدت میں علومِ دینیہ کی تکمیل کر کے عالمیت کے مرتبے پر فائز ہوا، بیس برس میں علوم ومعارف کی وسعتوں پر دسترس حاصل کی۔ یہ سب اس بات کے اشارات ہیں کہ یہ زندگی معمول کے پیمانوں سے نہیں، مشیت کے پیمانوں سے ناپی جانے والی تھی۔

پھر بغداد کی روحانی فضاؤں میں غوثی اشارہ، پیرِ کامل کے دستِ حق پرست پر بیعت، خلافت، خرقہ، عمامہ اور غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ مبارک تسبیح--جو نسبت کی امانت بن کر آج تک ایک زندہ علامت بنی ہوئی ہے۔ مگر اس داستان کا اصل اضطراب آفریں باب تو وہاں شروع ہوتا ہے جہاں خواب میں حضور اقدس ﷺ جلوہ فرما ہوتے ہیں اور حکم دیتے ہیں: ''مدینہ آؤ، پھر ہندستان جاؤ، وہاں مسلمانوں پہ ظلم ہو رہا ہے دین کی اشاعت وہاں تمہارا مقدر ہے۔'' اور کیا شان ہے اُس سوال کی، جو ایک عاشق نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! میں نے ہندستان دیکھا ہے نہ اس کی راہوں سے واقف ہوں'' تو ارشاد ہوا: ''منزل تمہیں خود اپنا پتا دے گی۔''

یہ ایک جملہ نہیں، صدیوں پر محیط توکل کا منشور ہے، ایک ایسا روحانی اعلان جس میں مسافر راستہ نہیں ڈھونڈتا بلکہ مسافر کو راستہ خود اپنی طرف بلا لیتا ہے۔ پھر مدینہ منورہ کی وہ حاضری--جس کے تصور ہی سے دل پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ جب روضۂ اقدس پر عرض کیا: ''السلام علیکم یا جدی اور جواب آیا: وعلیکم السلام یا ولدی۔''

یہ نسبت نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ قرب نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر دستِ مبارک کا ظہور، بوسۂ ادب، ایک سو اسی سال عمر کی بشارت اور بغداد سے نسبت خلافت لے کر ہندروانگی کا حکم۔۔۔یہ تمام واقعات مل کر اس شخصیت کو سوانح کے دائرے سے اٹھا کر روحانی اساطیر کے افق پر لے جاتے ہیں اور پھر اس داستان کا وہ باب۔۔۔جو اضطرابِ شوق کو اور بڑھا دیتا ہے۔۔۔کہ ہندستان کی سرزمین پہ اشاعتِ دین کے لیے خود سرکارِ دوعالم ﷺ کے براہ راست صریح حکم سے روانگی! یہ سعادت تاریخ میں کس کس کو نصیب ہوئی؟

نگاہ جب اس سوال پر ٹھہرتی ہے تو حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی سنجری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۵۳۷ھ-1142ء/ ۶۳۳ھ-1236ء) کا مقدس نام ابھرتا ہے، کہ وہ بھی بارگاہِ نبوت کے اذن سے ہند تشریف لائے۔ مگر جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ وہ دوسری جلیل القدر ہستی ہیں جنہیں حضور اقدس ﷺ نے براہِ راست حکم دے کر تبلیغ و اشاعتِ دین کے لیے ہندستان روانہ فرمایا، تو یہ واقعہ محض ایک تاریخی روایت نہیں رہتا، ایک روحانی انکشاف بن جاتا ہے۔

زیر نظر کتاب ''نسبتوں کے چراغ''، محض ایک سوانحی مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ اُن امانتوں کی جستجو ہے جو خواب سے شروع ہوئیں، مدینہ میں نکھریں، بغداد میں سنوریں اور ہندستان میں نور بن کر پھیل گئیں۔ قاری جب ان صفحات میں داخل ہوگا تو اسے محسوس ہوگا کہ وہ کوئی مضمون نہیں پڑھ رہا، ایک ایسے روحانی قافلے کے ساتھ چل رہا ہے جس کی رہنمائی میں بشارت بھی ہے، کرامت بھی، نسبت بھی ہے اور وہ راز بھی۔۔۔کہ کبھی کبھی منزل واقعی خود اپنا پتا دے دیتی ہے۔

اس تحریر کے اوراق میں داخل ہونے سے پہلے قاری یہ محسوس کرے کہ وہ محض کسی سوانحی کتاب کا مطالعہ نہیں کر رہا بلکہ ایک مقدس روحانی رفاقت میں شریک ہو رہا ہے۔۔۔ایسا سفر جہاں شیراز سے بغداد، بغداد سے مدینہ اور مدینہ سے ہندستان تک نسبتوں کے چراغ ایک دوسرے سے روشنی لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس داستان کا ہر ورق دل میں یہ سوال جگاتا ہے کہ آخر وہ کون ہستی تھی جسے ولادت سے قبل بشارت ملی، جس کے لیے غیبی راہیں کھلتی چلی گئیں اور جس کے سفر کو خود سرکارِ دوعالم ﷺ کی نسبت نے سمت عطا فرمائی۔

آیئے، ان اوراق میں داخل ہوں۔۔۔اس احساس کے ساتھ کہ یہاں ایک ایسے مردِ حق کا ذکر ہے جس کی طفلی میں قرآن تھا، شباب میں ولایت تھی اور عہدِ پیری میں دعوتِ محمدی ﷺ کا عالمی پیغام۔ یہاں تاریخ نہیں بولتی، بشارت بولتی ہے اور نسبتوں کے چراغ اپنی روشنی میں قاری کے دل میں تجسّس، عقیدت اور اضطرابِ شوق کی ایک نئی لہر پیدا کرتے ہیں۔

اور حقیقت یہ ہے کہ یہ داستان صرف ایک فرد کے احوال کا بیان نہیں، اُن نفوسِ قدسیہ کی شناخت کا دریچہ بھی ہے جنہیں مشیت اپنے خاص مقاصد کے لیے منتخب فرماتی ہے۔ جب قاری اس روحانی قافلے کے ساتھ چلتے چلتے اس مقام پر پہنچتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا تذکرہ محض ایک بزرگ کی سوانح نہیں، اُن نابغۂ روزگار ہستیوں کے سلسلۂ نور کا ایک روشن باب ہے جن سے تاریخیں جنم لیتی ہیں۔ اور یہیں سے گفتگو ایک شخصیت کے ذکر سے بلند ہو کر اُن عظیم نفوس کے عمومی مقام و مرتبے کی طرف منتقل ہوتی ہے جن کے بارے میں کہنا پڑتا ہے کہ

کچھ شخصیات تاریخ میں درج نہیں ہوتیں، بلکہ تاریخ اُن کے نقشِ قدم سے رقم ہوتی ہے۔ بعض نفوس ایسے ہوتے ہیں جن کے ذکر سے صرف ایک فرد کی سوانح نہیں کھلتی بلکہ ایک پورا روحانی منظرنامہ سامنے آجاتا ہے۔ ان کی حیات کے نقوش زمانوں کے صفحات پر محض ثبت نہیں ہوتے، زندہ رہتے ہیں، ان کے افکار صرف اپنے عہد کو روشن نہیں کرتے، آنے والی صدیوں کے لیے بھی مینارۂ نور بن جاتے ہیں۔ ان کا وجود یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کاتب تقدیر نے کسی خاص مقصد کے لیے انہیں زمانے کے افق پر طلوع کیا ہو۔

وہ ایسے چراغ ہوتے ہیں جو صرف اپنے گرد و پیش کو منور نہیں کرتے بلکہ دور تک پھیلے اندھیروں کو بھی راستہ دکھاتے ہیں۔ ان کے تذکرے میں واقعات سے زیادہ اشارات ہوتے ہیں اور حکایات سے زیادہ حقائقِ باطن جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کے ملفوظات کبھی نصیحت بن کر دلوں میں اترتے ہیں، کبھی پیش گوئی بن کر زمانے کی پیشانی پر لکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ایسی ہستیاں وقت کے تسلسل میں بہتی نہیں، خود دھارے کا رخ موڑ دیتی ہیں۔ وہ زمانے کے تابع ہو کر نہیں جیتیں بلکہ زمانہ ان کے نقشِ قدم پر اپنی سمتیں متعین کرتا ہے۔

ان کا وجود کسی ایک پیکر تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایک عہد کی ترجمانی کرتا ہے۔ ایک روایت کی تشکیل ہوتی ہے۔ وہ تاریخ کے حاشیوں پر رقم نہیں ہوتیں بلکہ تاریخ کے متون ان ہی کے نام سے روشن ہوتے ہیں۔ ان کے افکار محض اپنے زمانے کے سوالات کا جواب نہیں ہوتے، آنے والے زمانوں کے لیے بھی چراغِ راہ بن جاتے ہیں۔ وہ روایت کو صرف محفوظ نہیں رکھتیں، اس میں معانی کی نئی جہتیں پیدا کرتی ہیں اور فکر کو صرف دہراتی نہیں، اسے ارتقا عطا کرتی ہیں۔ ان کے وجود سے زمانہ صرف متاثر نہیں ہوتا، مہذب بھی ہوتا ہے۔

ایسی شخصیات جب اٹھتی ہیں تو محض ایک آواز بلند نہیں ہوتی، ایک عہد بولنے لگتا ہے، جب چلتی ہیں تو راستے بنتے ہیں اور جب خموش ہوتی ہیں تو ان کی خموشی بھی صداؤں کی طرح سنائی دیتی ہے۔ وہ افراد کم، تقدیرِ ملت کے استعارے زیادہ ہوتی ہیں، جن کے ذکر سے صرف سوانح نہیں، ایک پورا تہذیبی اور روحانی منظرنامہ روشن ہو جاتا ہے۔ ان کی حیات محض واقعات کا تسلسل نہیں ہوتی، ایک معنوی روایت کا زندہ تاریخی تواتر ہوتی ہے، جس میں فکر کی رفعت، کردار کی حرارت اور روحانیت کی لطافت ایک ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

ان کے تذکرے میں صرف ماضی نہیں بولتا، مستقبل بھی اپنی آہٹ سناتا ہے۔ ان کے نقوش میں زمانوں کی گرد نہیں جمتی بلکہ ہر عہد ان سے تازہ معنیٰ اخذ کرتا ہے۔ وہ اپنے دور کے مسائل کا جواب بھی ہوتے ہیں اور آنے والے زمانوں کے لیے امکان کی بشارت بھی۔ ان کے افکار چراغ کی مانند نہیں کہ ایک گوشہ روشن کریں بلکہ افق در افق روشنی بکھیرتے ہیں۔

ایسی ہستیاں تاریخ کے اوراق میں محفوظ نہیں ہوتیں، تاریخ ان کے دم سے معنیٰ پاتی ہے۔ ان کے نام سے محض ایک شخصیت یاد نہیں آتی، ایک تہذیب، ایک روایت، ایک روحانی وراثت بیدار ہو جاتی ہے۔ ان کا ذکر گویا عہدِ رفتہ کی بازگشت نہیں، زندہ اقدار کی بازیافت ہوتا ہے اور ان کی یاد، محض عقیدت کا باب نہیں، شعور و بصیرت کا ایک روشن باب بن کر سامنے آتی ہے۔

ان کی صحبتوں سے افراد بدلتے ہیں، ان کی نگاہ سے تقدیریں سنورتی ہیں اور ان کے فیضان سے بستیوں کے مزاج بدل جاتے ہیں۔

ان کی مجلسیں محض نشست گاہ نہیں ہوتیں، تربیت گاہ ہوتی ہیں، جہاں لفظوں سے زیادہ کردار بولتے ہیں اور خموشیوں سے بھی معرفت پھوٹتی ہے۔ ان کی ایک نظر دلوں کی ویرانی کو گلزار کر دیتی ہے اور ایک اشارہ زندگی کے منتشر دھاگوں کو معنیٰ کی لڑی میں پرو دیتا ہے۔

ان کے قرب سے صرف انسانوں کی عادتیں نہیں بدلتیں، زاویۂ فکر بدل جاتا ہے، نگاہِ حیات بدل جاتی ہے۔ وہ دلوں میں ایسی روشنی اتارتے ہیں جو محض علم نہیں دیتی، شعور بھی جگاتی ہے، محض جذبہ نہیں بخشتی، سمت بھی عطا کرتی ہے۔ ان کے فیوض روحانی سے افراد سنورتے ہیں، خاندانوں میں وقار آتا ہے، معاشروں میں اخلاق کی خوشبو پھیلتی ہے اور بستیوں میں روحانی ذوق بیدار ہوتا ہے۔

ایسی ہستیاں جہاں قدم رکھتی ہیں وہاں صرف آبادیاں نہیں بستیں، تہذیبیں نمو پاتی ہیں۔ ان کے اثرات سے زمانے کا مزاج نرم پڑتا ہے، دلوں میں اخلاص کے چشمے پھوٹتے ہیں اور زندگی محض گذارنے کی شے نہیں رہتی، ایک مقصد، ایک امانت اور ایک عبادت بن جاتی ہے۔ یہی وہ نفوس ہوتے ہیں جن کے وجود سے افراد نہیں، عہد سنورتے ہیں۔

یوں لگتا ہے جیسے ان کی زندگی ایک فرد کی زندگی نہیں بلکہ ایک زندہ سلسلۂ نور ہو، جس کی ایک کڑی ماضی میں، ایک حال میں اور ایک مستقبل میں پیوست ہوتی ہے۔

بعض اوقات ان کے ایک جملے میں صدیوں کی رہنمائی سمٹ آتی ہے، ایک دعا میں نسلوں کی بہار پوشیدہ ہوتی ہے اور ایک بشارت میں آنے والے زمانوں کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ یہی وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جن کے تذکرے پڑھے نہیں جاتے، دل پر اترتے ہیں جنہیں سمجھا نہیں جاتا، محسوس کیا جاتا ہے اور تب معلوم ہوتا ہے کہ بعض ہستیاں واقعتاً تاریخ کا حصہ نہیں ہوتیں ---تاریخ ان کی شرح ہوتی ہے۔

ان کی زندگی کے واقعات محض حکایات نہیں ہوتے، اشارات ہوتے ہیں ان کی خموشیاں بھی معانی کی گہرائیاں رکھتی ہیں اور ان کے

ملفوظات صدیوں تک رہنمائی کے چراغ بنے رہتے ہیں۔

حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا تذکرہ بھی اسی نوع کا ایک ذکرِ جمیل ہے۔ یہاں ہم ایک ایسے مردِ خدا کے احوال کے روبرو ہیں جس کی ذات میں علم و عرفان، دعوت و عزیمت، کرامت و شریعت اور عشق و مجاہدہ ایک ساتھ جلوہ گر ہیں۔ ان کی حیات کا مطالعہ کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے روحانی تاریخ کے بند دریچے یکے بعد دیگرے روشن ہو رہے ہوں۔ یہ داستان وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں ایک خواب بشارت بن جاتا ہے، ایک سفر مشن بن جاتا ہے، ایک صندوق امانت بن جاتا ہے اور ایک اجنبی بستی مرکزِ ہدایت۔ پھر یہی سلسلہ بت خانوں سے آتش کدوں تک، مدرسوں سے میدانِ تبلیغ تک، خلفا و مریدین سے سمرہ حضرات کی کرامتوں تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اور اس پورے روحانی افق پر ایک نہایت درخشاں منظر وہ بھی ہے جہاں صدیوں پہلے ایک مجدد کے ظہور کی خبر دی جاتی ہے، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۱۲۷۲ھ۔ ۱۸۵۶ء/ ۱۳۴۰ھ ۱۹۲۱ء) کے لیے بشارت صادر ہوتی ہے اور ایک ایسا وصیت نامہ مرتب ہوتا ہے جو صرف اپنے عہد کے لیے نہیں، آنے والی نسلوں کے اعتقادی تحفظ کے لیے بھی امانت بن جاتا ہے۔

یوں یہ محض ایک بزرگ کے حالات نہیں، ایک نورانی سلسلے کا بیانیہ ہے ایک ایسی روایت کا تذکرہ جس میں کرامت بھی ہے، بصیرت بھی، پیش گوئی بھی ہے، تجدید بھی اور صحبتِ اولیاء کے وہ اسرار بھی، جن سے تقدیریں بدلتی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب اسی وسیع روحانی پس منظر کا دروازہ ہے۔۔اس امید کے ساتھ کہ قاری جب ان اوراق میں داخل ہو تو صرف واقعات نہ پڑھے، بلکہ اس نورانی روایت کی دھڑکن بھی محسوس کرے جس کی بازگشت آج بھی اہلِ محبت کے دلوں میں سنائی دیتی ہے۔

تاریخ کے بعض اوراق صرف ماضی کے ابواب نہیں ہوتے، وہ مستقبل کے صحیفے بھی ہوتے ہیں۔ بعض ہستیاں صرف اپنے عہد کی رہنما نہیں ہوتیں، آنے والے زمانوں کے لیے بھی چراغ رکھ جاتی ہیں۔ ان کی زبان سے نکلے ہوئے بعض الفاظ وقتی خطاب نہیں ہوتے، تقدیر کے صحیفے ہوتے ہیں اور ان کے ارشادات محض نصیحت نہیں، آئندہ نسلوں کے لیے وصیت نامے بن جاتے ہیں۔ حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ اسی احساس سے معمور ہے۔ یہ تذکرہ محض ایک بزرگ کی سوانح نہیں، ایک ایسے روحانی و فکری سلسلے کی داستان ہے جس میں بغداد شریف کا فیضان، مدینہ منورہ کی نسبت، کلاریا شریف کی بنیاد، دعوت و مجاہدہ، علم و ولایت، کرامت و استقامت۔۔سب ایک جامع روحانی روایت کے طور پر جلوہ گر ہیں۔ یہاں ایک ولی کی زندگی واقعات کا مجموعہ نہیں، نور کے تسلسل کی ایک ایسی زنجیر ہے جس کی ہر کڑی میں معنیٰ کا ایک نیا جہان آباد ہے۔ ان واقعات میں جہاں بت خانوں میں توحید کی صدا بلند ہوتی ہے، آتش کدوں میں اسلام کی حقانیت جلوہ گر ہوتی ہے، جادوگر ولایت کے آستانے پر سرنگوں ہوتے ہیں، سادھو شاہ دلہ بن جاتا ہے، سمرہ حضرات کی رفاقت میں کرامت کے اسرار منکشف ہوتے ہیں، وہیں اس داستان کا ایک نہایت اہم، درخشاں اور عہد ساز باب وہ بھی ہے جہاں حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی زبان سے مجددِ اہل سنّت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ظہور کی پیش گوئی صدیوں پہلے صادر ہوتی ہے۔

یہ صرف ایک پیش گوئی نہیں، روحانی بصیرت کا وہ چراغ ہے جو ایک سو ستر برس سے زیادہ فاصلے پر جلوہ گر ہونے والے ایک مجدد کی آمد کو پہلے ہی زمانے کے اوراق پر ثبت کر دیتا ہے۔ ہجری 1102 میں کلاریا کی درسگاہ میں وہ مکاشفہ، وہ وجدانی اعلان، وہ خبر کہ چودھویں صدی ہجری میں ایک عظیم فتنہ اٹھے گا اور احمد نام کا ایک مردِ حق اس کے مقابل کھڑا ہوگا۔۔یہ محض ایک غیبی اطلاع نہیں، اہل سنّت کے فکری مستقبل کا اعلان تھا۔

پھر صرف بشارت پر اکتفا نہیں ہوا، حضرت نے اپنی اولاد، مریدوں اور ماننے والوں کے لیے ایک روحانی وصیت نامہ بھی جاری فرمایا کہ جب وہ مجدد ظاہر ہو تو اس کے دامن سے وابستہ رہنا، اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا، کہ وہی اللہ تعالیٰ و رسول اللہ ﷺ، صحابہ، تابعین، اولیاء اور مجددین کا راستہ ہوگا۔ اور یہ ارشاد کہ اگر میری اولاد اور میرے مریدوں نے اس ہدایت کی طرف التفات نہ کیا تو میں قیامت کے دن ان کا دامن پکڑوں گا۔۔یہ محض تاکید نہیں، سلسلۂ طریقت کے لیے ایک ابدی عہد نامہ ہے۔ یوں اس تذکرے میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ذکر کسی ضمنی

واقعے کے طور پر نہیں، ایک روحانی تسلسل کے مظہر کے طور پر آتا ہے۔۔ گویا کلار یا شریف کی پیش گوئی بریلی شریف میں تعبیر بن کر ظاہر ہوتی ہے اور حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی بشارت امام اہل سنّت اعلیٰ حضرت کے قلمی جہاد، عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور تجدیدی خدمات میں اپنا مصداق پاتی ہے۔

شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے احوال و آثار پہ مشتمل یہ کتاب گجراتی زبان میں تھی جو اپنے مشمولات کے اعتبار سے نہایت وقیع اور بصیرت افروز ہے، جو شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حیات وخدمات کے مختلف گوشوں پر محیط ہے اور اپنی اصل زبان ہی میں شائع بھی ہوتی رہی۔ مگر زبان کی دیوار حائل ہو جانے کے سبب ہند و پاک کے عام علمی وفکری حلقے اور اربابِ تحقیق ونظر، اس اہم دستاویزی سرمائے سے بہت حد تک بے خبر رہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ علمی ورثہ جب کسی محدود لسانی قالب میں مقید رہ جائے تو اس کی معنوی وسعتیں بھی ایک تنگ اور محدود دائرے میں سمٹ کر رہ جاتی ہیں اور افادۂ عامہ کی وہ وسعتیں مجروح ہونے لگتی ہیں جن کے لیے اصل میں ایسے علمی ذخائر وجود میں آتے ہیں۔

ایسے میں ضرورت اس امر کی محسوس ہوتی ہے کہ اس سرمایۂ علمی کو لسانی حدود سے نکال کر وسیع تر حلقۂ قارئین تک پہنچایا جائے تاکہ اس کے فیوض عام ہو سکیں۔ اس روحانی وفکری پس منظر میں اس کتاب کے مترجم، حضرت مولانا مفتی محمد اشرف قادری زید مجدہ بانی وسربراہ جامعہ مدینۃ العلوم، رتن پور کی خدمت بھی خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ انہوں نے محض ایک لسانی ترجمہ نہیں کیا بلکہ ایک ایسی معنوی امانت کو نئی وسعت عطا کی ہے جو اب تک محدود دائرے میں محصور تھی۔ ان کا یہ عمل اسی سلسلۂ نور کی ایک اہم کڑی محسوس ہوتا ہے، جس کے ذریعے ماضی کے فیوض حال کے اذہان تک منتقل ہوتے ہیں۔

دنیا میں کچھ لوگ اپنے عہدوں کے سبب پہچانے جاتے ہیں اور کچھ اپنے باطن کی روشنی سے۔ وہ دوسرے قبیل کے آدمی ہیں۔۔ ان کی شناخت کسی منصب کی محتاج نہیں بلکہ ان کے اخلاص کی خود روشن دلیل ہے۔ ان کا وجود ایک ایسے چراغ کی مانند ہے جو اپنے تعارف کے لیے کسی اعلان کا سہارا نہیں لیتا بلکہ اپنی روشنی سے خود اپنا پتا دیتا ہے۔ اسی باطنی روشنی کا اثر ہے کہ اس دور میں گجرات کی سرزمین اگر اہلِ نسبت و وفا کے ناموں سے مزین کی جائے تو ان کا نام ایک خاص وقار کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ انہوں نے مسلکِ اعلیٰ حضرت کی خدمت کو محض ایک وابستگی نہیں رہنے دیا بلکہ اسے اپنی حیات کے سانچے میں اس طرح ڈھال لیا ہے کہ ان کا ہر عمل، ہر طرزِ ادا اسی نسبت کی گواہی دیتا ہے۔ وہ مسلک کی شرح نہیں لکھتے، اسے اپنے وجود میں رقم کرتے ہیں اور یہی طرزِ زندگی ان کی سب سے بڑی دعوت ہے۔

ان کے اسی اسلوبِ حیات کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ ان کے طریقۂ کار میں ایک دلکش سکوت ہے۔۔ نہ وہاں خود نمائی ہے، نہ نمود کی خواہش۔ وہ خدمت اس طرح انجام دیتے ہیں جیسے کوئی راز اپنے سینے میں رکھتا ہے۔ ان کے ہاتھ دیتے ہیں مگر ان کی انا کبھی اس درمیان نہیں آتی۔ وہ چراغ جلاتے ہیں مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ روشنی تو پھیل جائے مگر شعلہ اپنی نمائش سے بے نیاز رہے۔

یہی سکوت آگے بڑھ کر ان کی شخصیت کے توازن میں ڈھل جاتا ہے، چنانچہ ان کی شخصیت میں ایک عجب توازن ہے۔۔۔ سادگی بھی، وقار بھی، انکسار بھی، تاثیر بھی۔ وہ ان لوگوں میں ہیں جو راستوں کو منزل سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں، اس لیے کہ ان کے نزدیک سفر بھی عبادت ہے۔ ان کے یہاں خدمت کوئی وقتی جوش نہیں بلکہ ایک مستقل سلوک ہے، جو وقت کے ساتھ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ اسی تسلسلِ خدمت کا نتیجہ ہے کہ اکثر دیکھا گیا کہ ضرورت سامنے آئی اور وہ خموشی سے اس کا مداوا کر گئے۔ نہ کوئی اعلان، نہ کوئی حوالہ۔۔۔ بس ایک خفیف سا عمل جو اپنے اندر اخلاص کی پوری کائنات لیے ہوتا ہے۔ ان کی عطا میں ایک خاص طرح کی حیا ہے، جیسے نیکی بھی پردہ چاہتی ہو۔ لینے والا بھی یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی احسان کا بوجھ نہیں بلکہ کسی دعا کی قبولیت کا حصہ بن گیا ہے۔ یوں ان کا پورا اندازِ عمل اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے کہ اصل عظمت دکھانے میں نہیں، نبھانے میں ہے۔ وہ اس قافلے کے مسافر ہیں جن کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دیتی مگر جن کے گذرنے سے راستے ضرور معطر ہو جاتے ہیں۔ ان کی یہی باطنی کیفیت

ان کے ظاہر میں بھی جھلکتی ہے، اس طرح کہ مصروفیات کے ہجوم میں بھی ان کا چہرہ کشادہ رہتا ہے۔ رمضان شریف کے ایام ہوں یا عام دن۔۔مصروفیات ان کے حسنِ اخلاق پر کبھی غالب نہیں آتیں۔ ہر آنے والا ان کے یہاں محض ایک فرد نہیں، ایک امانت ہوتا ہے۔ ان کی گفتگو میں نرمی، ان کے انداز میں شفقت اور ان کی نشست میں ایک غیر محسوس تربیت کا رنگ جھلکتا ہے۔

یہ تمام جہات اگر یکجا کی جائیں تو وہ بیک وقت کئی پہلوؤں کے امین نظر آتے ہیں۔۔خطابت میں اثر، تدریس میں گہرائی، نظم و نسق میں بصیرت، اور عبادات میں خشوع۔ مگر ان تمام اوصاف کے پیچھے جو چیز سب سے نمایاں ہے، وہ دنیا سے بے نیازی کا وہ لطیف احساس ہے جو ان کے اعمال کو خالص رکھتا ہے۔

چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی زندگی ایک خموش تفسیر ہے۔۔اس صداقت کی کہ جب نسبت اخلاص سے ہم رشتہ ہو جائے تو کردار خود دعوت بن جاتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں ہیں جنہیں دیکھ کر یہ یقین تازہ ہوتا ہے کہ روایتیں تحریروں سے نہیں، زندہ دل اور حساس طبع انسانوں سے آگے بڑھتی ہیں۔۔اور کچھ لوگ واقعی چراغ نہیں ہوتے، چراغوں کی حفاظت کا ہنر بھی ساتھ لاتے ہیں۔

چنانچہ اسی اعترافِ کمال کے ساتھ یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان کی یہ خدمات دینیہ اہلِ علم کے لیے ایک گراں قدر عطیہ ہے یہی وہ مقام ہے جہاں تحسین بے ساختہ دل سے لبوں تک آتی ہے اور اعترافِ خدمت ایک فطری تقاضا بن جاتا ہے۔

اسی ہمہ جہت شخصیت کی ایک نمایاں علمی خدمت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس گجراتی کتاب کو اردو زبان کے قالب میں منتقل کر کے اہلِ علم کے لیے قابلِ رسائی بنا دیا۔ یہ خدمت محض ایک ترجمہ نہیں بلکہ ایک علمی احیاء کی صورت رکھتی ہے، جس کے ذریعے ایک گم گشتہ فکری خزانہ دوبارہ علمی افق پر نمودار ہوا۔ یہ امر بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ کسی ایک زبان کے علمی و فکری مواد کو دوسری زبان میں منتقل کرنا بظاہر آسان مگر فی الحقیقت نہایت دقیق، نازک اور صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ اس راہ کے مسافر ہی اس کی باریکیاں، لفظی و معنوی ہم آہنگی کی مشکلات اور اسلوبی تقاضوں کی نزاکتیں بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

مولانا موصوف کے ترجمے کا مطالعہ یہ حقیقت پوری وضاحت کے ساتھ منکشف کرتا ہے کہ وہ دونوں زبانوں۔۔ گجراتی اور اردو۔۔کے اسالیب، مزاج اور فکری سانچوں سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کے ترجمے میں محض لفظی انتقال نہیں بلکہ مفہوم کی روح، اسلوب کی لطافت اور بیان کی تاثیر بھی پوری طرح منتقل ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ترجمہ نگاری ان کے قلم میں ایک پختہ کار مترجم کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ ذوق قلم کار کی شعوری بیداری کا مظہر ہے۔ ہم اردو داں طبقے کی جانب سے حضرت مولانا مفتی محمد اشرف قادری زید مجدہم العالیہ کی اس علمی و ادبی خدمت پر دلی طور پہ شکر گذار ہیں کہ انہوں نے ایک اہم علمی ماخذ کو لسانی حصار سے نکال کر وسیع تر علمی دنیا کے لیے عام کر دیا اور اہلِ نظر کے لیے استفادے کے نئے در کھول دیے۔ اس سفر میں حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صدیقی مدیر اعلیٰ مجلہ پیغامِ رضا ممبئی کو ہم کسی بھی جہت سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس علمی، لسانی اور دعوتی سفر میں وہ حضرت مولانا مفتی محمد اشرف قادری صاحب کے لیے چراغِ سفر بنے رہے۔ اور قدم قدم پر ان کے حوصلوں کو توانائی فراہم کرتے رہے۔ اگر مفتی صاحب چراغ ہیں تو مولانا موصوف اس چراغ میں جلنے والا تیل ہیں۔ دونوں حضرات کے لیے ہماری نیک خواہشات ہیں۔

یہ کتاب صرف مناقب و کرامات کا مرقع نہیں، ایک ایسے نورانی تسلسل کی بازیافت ہے جس میں ولایت، تجدید اور دعوت کے دھارے باہم ملتے ہیں۔ یہاں کرامتیں ہیں مگر محض حیرت کے لیے نہیں، یہاں عجائب ہیں مگر محض حکایت کے لیے نہیں، یہاں ہر واقعہ ایک پیغام رکھتا ہے، ہر باب ایک روحانی درس۔

یہ مقالہ اسی احساس کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے کہ قاری حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حیات کے مختلف گوشوں۔۔تبلیغی معرکوں، علمی عظمت، روحانی تصرفات، خلفاء و مریدین کے احوال، سمرہ حضرات کی کرامات اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے متعلق اس غیر معمولی پیش گوئی و وصیت۔۔سب کو ایک مربوط روحانی بیانیے کے طور پر دیکھے۔

افسانوی نثر کے اس پیرائے میں یہ تذکرہ صرف تاریخ نہیں

سناتا، تاریخ کی روح سے آشنا کرتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بغداد معلیٰ سے کلاریا شریف، کلاریا شریف سے بریلی شریف، اور بریلی شریف سے عصرِ حاضر تک ایک ہی نور سفر کر رہا ہے۔۔کبھی بشارت بن کر، کبھی کرامت بن کر، کبھی تجدید بن کر۔ یہ انھی اوراق کا حاصل ہے۔ جہاں ایک ولی کی نگاہ تقدیر بدلتی ہے، ایک دعا ناممکن کو ممکن بناتی ہے، ایک پیش گوئی صدیوں بعد حقیقت بنتی ہے اور ایک وصیت نامہ نسلوں کے ایمان کی حفاظت کا عہد نامہ بن جاتا ہے۔ یہی اس تذکرے کا مقدمہ بھی ہے اور اس کے مطالعے کی کلید بھی۔

یوں یہ تذکرہ اپنے اختتام پر پہنچ کر بھی محض ایک داستان کا اختتام نہیں بلکہ ایک شعوری بیداری کی ابتدا بن جاتا ہے۔ قاری جب ان اوراق سے گذرتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی ایک بزرگ کی سوانح نہیں پڑھ رہا بلکہ ایک ایسے نورانی تسلسل کا مشاہدہ کر رہا ہے جس کی ایک کڑی شیراز میں، ایک مدینہ منورہ میں، ایک بغداد میں اور ایک ہندستان کی سرزمین پر جلوہ گر ہے۔

حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حیاتِ مبارکہ اسی تسلسل کی ایک درخشاں تعبیر ہے۔۔ایسی تعبیر جس میں علم و عرفان کی گہرائی بھی ہے، دعوت و عزیمت کی قوت بھی اور نسبتِ مصطفوی ﷺ کی وہ لطافت بھی جو دلوں کو بدل دیتی ہے اور زمانوں کا رخ متعین کرتی ہے۔ ان کی زندگی یہ حقیقت واضح کرتی ہے کہ اولیاء اللہ کا وجود محض اپنے عہد تک محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ آنے والے زمانوں کے لیے بھی چراغِ راہ بن جاتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب اسی حقیقت کی ایک معتبر اور بصیرت افروز دستاویز ہے۔ اس میں بیان ہونے والے واقعات، کرامات، اشارات اور بشارات محض حیرت انگیز حکایات نہیں بلکہ ایک منظم روحانی روایت کے اجزاء ہیں۔۔ایسی روایت جس میں کلاریا شریف کی بنیادیں، دعوتِ دین کے معرکے، مریدین و خلفاء کی تربیت اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ظہور سے متعلق وہ غیر معمولی پیش گوئی سب ایک مربوط بیانیے کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ یہی وہ پہلو ہے جو اس کتاب کو محض ایک سوانحی مجموعہ نہیں رہنے دیتا بلکہ اسے ایک زندہ روحانی و فکری ورثہ بنا دیتا ہے۔ قاری جب اس کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ماضی کے واقعات نہیں پڑھ رہا بلکہ ایک ایسے تسلسلِ نور میں داخل ہو رہا ہے جس کی روشنی آج بھی دلوں کو منور کر رہی ہے۔

چنانچہ اس کتاب کا اصل حاصل یہی ہے کہ یہ ہمیں حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حیات کے آئینے میں اس حقیقت سے روشناس کراتی ہے کہ ولایت، تجدید اور عشقِ رسول ﷺ ایک ہی نور کے مختلف جلوے ہیں۔۔اور جب یہ نور کسی ہستی میں جمع ہو جائے تو اس کی زندگی محض ایک فرد کی داستان نہیں رہتی بلکہ ایک عہد کی تشکیل کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اسی احساس کے ساتھ یہ مقالہ اپنے اختتام کو پہنچتا ہے کہ یہ مقالہ صرف پڑھنے کے لیے نہیں، سمجھنے کے لیے ہے، صرف عقیدت کے لیے نہیں، بصیرت کے لیے ہے۔۔اور اس کے اوراق میں وہ چراغ روشن ہیں جو آج بھی اہلِ دل کو راستہ دکھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

یہ وہ چراغ ہیں جو محض نگاہ کو روشن نہیں کرتے بلکہ دل کی تاریکیوں کو بھی منور کر دیتے ہیں، جو صرف راستہ نہیں بتاتے بلکہ چلنے کا حوصلہ بھی عطا کرتے ہیں۔ ان کی روشنی میں قاری محض واقعات نہیں دیکھتا بلکہ معانی کی گہرائیوں تک رسائی پاتا ہے اور یوں محسوس کرتا ہے کہ یہ داستان کسی ایک زمانے کی نہیں بلکہ ہر اس دل کی ہے جو صداقت، للّٰہیت اور نسبتِ مصطفوی ﷺ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہ اوراق ایک خموش رہنما کی طرح ہیں۔۔نہ شور کرتے ہیں، نہ اپنی طرف بلاتے ہیں مگر جو ان میں اتر جائے وہ خود کو ایک ایسے سفر میں پاتا ہے جہاں قدم قدم پر رہنمائی ہے، ہر موڑ پر ایک اشارہ ہے اور ہر مرحلے پر ایک نئی بصیرت۔ یہاں کرامت محض حیرت نہیں رہتی، ایک سبق بن جاتی ہے اور بشارت محض خبر نہیں رہتی، یقین کی ایک مضبوط بنیاد بن جاتی ہے۔ یوں یہ کتاب اپنے قاری کو صرف ماضی کی یادوں تک محدود نہیں رکھتی بلکہ اسے اپنے حال کا محاسبہ اور اپنے مستقبل کی تعمیر کا شعور بھی عطا کرتی ہے۔ اور شاید یہی اس کا اصل کمال ہے کہ یہ دل میں عقیدت کے ساتھ ساتھ ایک زندہ ذمہ داری کا احساس بھی جگا دیتی ہے۔۔کہ ''نسبتوں کے چراغ'' صرف دیکھنے کے لیے نہیں، سنبھالنے کے لیے بھی ہوتے ہیں۔

□□□□

محمد ملک الظفر سہسرامی

اجہات

فقہ سے فلکیات تک: امام احمد رضا کی علمی جہات

برصغیر کا علمی وفکری منظر نامہ ہمیشہ سے متنوع جہات کا حامل رہا ہے۔ یہاں ایک طرف روایت کی مضبوط بنیادیں تھیں تو دوسری طرف نئے فکری سوالات جنم لے رہے تھے۔ ایک سمت قدیم درسگاہوں کی سنجیدہ فضا تھی جہاں متون کی شرح وتوضیح میں صدیوں کا تسلسل زندہ تھا اور دوسری جانب جدید علوم کی نئی کرنیں تھیں جو ذہنوں کو تازہ زاویوں سے سوچنے پہ آمادہ کر رہی تھیں۔ دینی مراکز وعلمی حلقوں میں فقہ و حدیث کی صداقت بھری بازگشت سنائی دیتی تھی، جبکہ دوسری سمت جدید علوم کی تازہ نسیم ذہنی افق کو نئی جہتوں سے آشنا کر رہی تھی۔ یوں روایت کی پختہ دیواریں بھی قائم تھیں اور فکر کے دریچوں پہ تازہ سوالات کی دستک بھی سنائی دے رہی تھی۔ ایک طرف فقہ وحدیث کی گونج تھی تو دوسری طرف ریاضی، فلکیات اور طبیعیات کے ابھرتے مباحث نے فکر کے افق کو وسیع کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب روایت اور تجدید کے درمیان ایک خموش مکالمہ جاری تھا، قدیم اقدار اپنی اصالت کے ساتھ قائم تھیں اور جدید سوالات اپنی جگہ جواب کے متلاشی تھے۔ ایک طرف روایت کی شمع اپنی متانت کے ساتھ فروزاں تھی، تو دوسری طرف فکر کی نئی لہریں ذہنوں میں اضطرابِ جستجو پیدا کر رہی تھیں۔ ماضی کی سنجیدگی اپنے وقار کے ساتھ موجود تھی اور حال کی تازہ بصیرت نئے افق وا کرنے پہ آمادہ تھی۔ یوں علم کی فضا میں ایک دلنشیں توازن پیدا ہو رہا تھا، جہاں تسلسل بھی تھا اور تجدید بھی، ٹھہراؤ بھی تھا اور حرکت بھی اور یہی ہم آہنگی ایک نئے فکری دور کی بنیاد بن رہی تھی۔ یوں علمی فضا میں ایک ایسا توازن پیدا ہو رہا تھا جہاں ماضی کی روشنی مستقبل کے راستوں کو روشن کر رہی تھی اور فکر کا سفر تقلید کے سکون سے نکل کر تحقیق کی تازہ منزلوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

مذہبی ودینی درسگاہوں میں فقہ وحدیث کی صدائیں گونج رہی تھیں اور دوسری جانب جدید علوم کی ہوا بھی فکری افق پہ اثر انداز ہو رہی تھی۔ ایسے دور میں ضرورت تھی کہ کوئی ایسی شخصیت سامنے آئے جو روایت کی پاسداری بھی کرے اور عقل وتحقیق کے نئے دریچے بھی وا کرے۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں اعلی حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ العزیز کی شخصیت ایک جامع علمی پیکر کی صورت میں ابھرتی ہے۔ آپ کا زمانہ وہ تھا جب ایک طرف مغربی سائنسی نظریات برصغیر میں داخل ہو رہے تھے اور دوسری طرف دینی حلقوں میں ان کے بارے میں تشویش بھی پائی جاتی تھی۔ ایک سمت نئی علمی تعبیرات عقل کو دعوتِ فکر دے رہی تھیں، تو دوسری سمت روایت کے محافظ ان نظریات کو پرکھنے اور ان کے اثرات کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ جدیدیت کی چمک ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی اور قدیم علمی ورثہ اپنی وقار آمیز سنجیدگی کے ساتھ اپنی جگہ قائم تھا۔

یوں فکری فضا میں ایک خاموش کشمکش بھی تھی اور مکالمے کی ایک سنجیدہ روایت بھی، سوالات ابھر رہے تھے، جوابات تلاش کیے جا رہے تھے اور علم کا قافلہ روایت کی روشنی میں تجدید کے راستوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہی وہ ماحول تھا جس میں فکر کو توازن، تحقیق کو سمت اور علم کو ایک نئی معنویت حاصل ہو رہی تھی۔ اس فکری کشمکش کے ماحول میں اعلی حضرت امام احمد رضا بریلوی نے نہ صرف دینی علوم کی حفاظت

کی بلکہ عقل و تحقیق کے میدان میں بھی بھر پور حصہ لیا۔ انہوں نے روایت کا چراغ بجھنے نہ دیا اور ساتھ ہی فکر کی نئی راہوں پر بھی اعتماد کے ساتھ قدم رکھا۔ ایک طرف وہ نصوصِ شرعیہ کے محافظ بن کر سامنے آئے، تو دوسری طرف عقل و استدلال کی قوت سے نئے سوالات کا جواب بھی دیا۔ یوں ان کی علمی کاوشوں میں دفاع بھی تھا اور تعمیر بھی، حفاظت بھی تھی اور پیش رفت بھی۔ انہوں نے قدیم علمی سرمائے کو زندہ رکھا اور اسے ایسے تحقیقی اسلوب سے آراستہ کیا کہ دین کی معنویت مزید واضح ہوگئی اور عقل کی پرواز کو بھی نئی جہت مل گئی۔ اس طرح ان کی شخصیت روایت اور تجدید کے درمیان ایک پُل کی صورت اختیار کرگئی، جہاں ایمان کی روشنی اور تحقیق کی جستجو ایک ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

ان کا قلم صرف فقہ فتاوے تک محدود نہیں رہا بلکہ فلکیات، ریاضیات، صوتیات، طبیعیات معاشیات اور اقتصادیات جیسے موضوعات تک پھیل گیا۔ گویا فکر کا ہر میدان ان کی نظر میں ایک نیا باب تھا اور تحقیق کا ہر زاویہ ان کے قلم کے لیے دعوتِ اظہار بن جاتا تھا۔ کبھی وہ اعداد و شمار کی باریکیوں میں ڈوب کر ریاضی کے عقدے سلجھاتے ہیں، کبھی افلاک کی گردش میں حکمت کے اسرار تلاش کرتے ہیں، کبھی صوت وارتعاش کے مباحث میں کائنات کی ہم آہنگی پرکھتے ہیں اور کبھی معاشی اصولوں میں اجتماعی زندگی کی فلاح کا نقشہ مرتب کرتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی علمی پرواز کسی ایک سمت کی پابند نہ تھی بلکہ علم کا ہر افق ان کے لیے قابلِ جستجو تھا۔ ان کے قلم کی یہی وسعت یہ حقیقت نمایاں کرتی ہے کہ وہ صرف مسائل کے جواب دینے والے فقیہ نہیں تھے بلکہ فکر کے نئے دریچے کھولنے والے محقق بھی تھے، جن کے ہاں علم کی دنیا ایک مربوط کائنات کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس ہمہ جہتی نے انہیں اپنے عہد کا منفرد مفکر بنا دیا۔ ان کی شخصیت میں علوم و افکار کی کئی نہریں آکر یکجا ہوگئیں اور فکر کا ایک وسیع دریا وجود میں آگیا۔ وہ محض ایک شعبے کے ماہر نہ رہے بلکہ متعدد علوم کے سنگم پہ کھڑے ایسے دانشور بن کر ابھرے جن کی نظر میں کائنات ایک مربوط نظام کی صورت میں جلوہ گر تھی۔ یوں ان کی علمی وسعت نے انہیں اپنے زمانے کے عام اہلِ علم سے ممتاز کر دیا۔ ان کے یہاں روایت کی گہرائی بھی تھی اور تحقیق کی بلندی بھی، استدلال کی مضبوطی بھی تھی اور بصیرت کی روشنی بھی۔ گویا فکر کے افق پہ علم و حکمت کی چاروں سمتیں ایک ساتھ روشن تھیں۔ وہ ماضی کے علمی سرمائے کو وقار کے ساتھ سنبھالتے بھی تھے اور حال کے سوالات کو تحقیق کی جرأت سے پرکھتے بھی تھے۔ ان کی نگاہ میں نصوص کی معنوی وسعت بھی تھی اور عقل کی باریک بینی بھی، جس سے ان کا استدلال نہ صرف مضبوط ہوتا بلکہ قلب و ذہن دونوں کو مطمئن کرنے والا بن جاتا۔ یوں ان کی شخصیت میں گہرائی اور بلندی کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے، روایت کی سنجیدگی تحقیق کی تازگی سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے اور بصیرت کی روشنی استدلال کا چراغ مزید درخشاں کر دیتی ہے۔ یہی توازن ان کی فکر کو دوام بخشتا ہے اور انہیں علم و حکمت کے افق پہ ایک روشن مینار کی حیثیت عطا کرتا ہے۔ یہی جامعیت انہیں اپنے عہد میں ایک ایسے مفکر کے طور پہ پیش کرتی ہے جس کی فکر میں وسعت بھی ہے، توازن بھی ہے اور رہنمائی کا ایک دیرپا چراغ بھی روشن ہے۔ اعلی حضرت امام احمد رضا کی قلمی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ روایت اور تحقیق کو باہم مربوط کرتے ہیں۔ ان کے ہاں نہ تقلید جمود بن کر رہتی ہے اور نہ ہی تحقیق بے مہار۔ وہ نصوص کی روشنی میں عقل استعمال کرتے ہیں اور عقل کی رہنمائی میں کائنات کے اسرار و رموز سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی توازن ان کے فکری اسلوب کو وقار عطا کرتا ہے۔

برصغیر کی علمی روایت میں بہت سے علما گذرے مگر امام احمد رضا کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے ایک ہی وقت میں فقہ، حدیث، ریاضی، فلکیات اور طبیعیات پہ گفتگو کی۔ ان کی تحریروں میں جہاں عاشقانہ عقیدت کی خوشبو ہے وہیں تحقیقی استدلال کی مضبوطی بھی ہے۔ یوں ان کی شخصیت ایک ایسے چراغ کی مانند ہے جو روایت کی روشنی کو جدید فکری افق تک پہنچاتا ہے۔ اسی پس منظر میں جب ہم اس ہمہ جہت علمی روایت کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اعلی حضرت امام احمد رضا بریلوی کی شخصیت محض ایک عالمِ دین کی نہیں رہتی بلکہ ایک ایسے مفکر کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو روایت کی بنیاد پہ تحقیق کی نئی راہیں ہموار کرتا ہے۔ ان کے یہاں فقہ کی گہرائی، حدیث کی روشنی،

ریاضی کی دقت اور طبیعیات کی وسعت ایک دوسرے سے ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے۔ یہی ہم آہنگی برصغیر کے علمی منظر نامے میں ان کی انفرادیت نمایاں کرتی ہے اور انہیں ایک ایسے صاحب بصیرت عالم کے طور پہ سامنے لاتی ہے جس نے علم وفکر کے متعدد میدانوں میں اپنی گہری چھاپ چھوڑ دی۔ وہ ایک ایسے ہمہ جہت مفکر، محقق اور صاحبِ بصیرت عالم دین تھے، جنھوں نے برصغیر کے علمی منظر نامے کو نئی جہت عطا کی اور علم وفکر کے متعدد میدانوں میں اپنے علوم وافکار سے گہرے نقوش مرتب فرمائے۔

اسی ہمہ جہت علمی ضرورت کے تناظر میں جب ہم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کی شخصیت پہ نظر ڈالتے ہیں تو ان کی غیر معمولی ذہانت اور ابتدائی علمی کارنامے خود اس حقیقت کے شاہد بن جاتے ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ نہایت معنیٰ خیز ہے کہ امام احمد رضا بریلوی کی علمی شخصیت کو محض علومِ دینیہ تک محدود کر دینا ان کے ہمہ جہت کمالات کے ساتھ انصاف نہیں۔ ان کی ذہانت، فکری وسعت اور سائنسی شعور بچپن ہی سے غیر معمولی تھا۔ روایت ہے کہ آپ نے صرف آٹھ برس کی عمر میں بزبانِ عربی شرح ہدایۃ النحو تصنیف فرمائی، جو اس صدی کی بلند ترین ذہنی استعداد اور غیر معمولی آئی کیو کا روشن مظہر قرار دی جاتی ہے۔ یہ کارنامہ اس امر کی دلیل ہے کہ ان کی علمی پرواز محض روایتی حدود میں مقید نہ تھی بلکہ ابتدائی عمر ہی سے تحقیق واستنباط کی بلند فضاؤں میں پرواز کر رہی تھی۔ اسی طرح تیس برس کی عمر میں آپ نے میڈیکل ایمبریالوجی Medical Embryology کے حوالے سے قرآنی آیات کی ایسی توضیح پیش کی جس میں انسانی تخلیق کے مراحل کو سائنسی انداز میں بیان کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ اسی عمر میں میڈیکل فزیولوجی Medical physiology سے متعلق بھی نہایت دلنشین اور جامع تحقیق پیش فرمائی، جو جدید طبی تحقیقات سے حیرت انگیز حد تک مطابقت رکھتی ہے۔ یہ ہم آہنگی اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ ان کی نظر میں قرآن صرف ہدایت کا سرچشمہ ہی نہیں بلکہ کائنات کے سائنسی اسرار کا آئینہ بھی ہے۔ مزید برآں 1896ء میں برصغیر پاک وہند کی علمی فضا میں آپ نے اپنی کتاب ''الصمصام علی مشکک فی آیۃ علوم الارحام (۱۳۱۵ھ)'' میں نظریۂ روشنی (Light Theory) کی بنیاد پہ ایک ایسا فارمولا پیش کیا جسے آج کی سائنسی دنیا الٹراساؤنڈ ٹیکنالوجی Ultrasound Technology کے اصولوں سے قریب تر سمجھتی ہے۔ اس بحث کو عصرِ حاضر میں پائزو الیکٹرک فینومینن Piezoelectric Phenomenon کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یوں یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آپ نے اپنے عہد میں ہی اس میدان میں فکری سبقت حاصل کر لی تھی، جب کہ سائنسی دنیا کو اس کی مکمل وضاحت تک پہنچنے میں مزید وقت درکار رہا۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں امام احمد رضا بریلوی کی شخصیت ایک ایسے ہمہ گیر مفکر کی صورت میں سامنے آتی ہے جس کے یہاں علمِ دین اور سائنسی شعور میں کوئی تضاد نہیں بلکہ ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ یہی وہ جہت ہے جسے نئی نسل کے دانشوروں اور محققین کے لیے از سرِ نو اجاگر کرنا ایک علمی و فکری ذمہ داری بھی ہے اور تہذیبی امانت بھی۔ ان کی یہی ہمہ جہت علمی بصیرت جدید سائنسی علوم کے نہایت دقیق مباحث میں بھی نمایاں طور پہ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ یہ امر اپنی معنویت میں نہایت درخشاں ہے کہ امام احمد رضا بریلوی کی علمی بصیرت صرف روایتی دینی علوم تک محدود نہ تھی بلکہ وہ جدید سائنسی مباحث میں بھی حیرت انگیز پیش قدمی کے حامل تھے۔ آپ وہ پہلے مسلم سائنسدان ہیں جنھوں نے سب سے پہلے 1896ء میں اپنی کتاب ''الصمصام'' میں ٹوپولوجی Topology سے متعلق ایک نظریہ پیش کیا اور بعد ازاں 1905ء میں اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''الدولة المكيه بالمادة الغيبة'' میں اس موضوع پہ مزید گفتگو فرما کر علمی سبقت حاصل کی جب کہ یہی علم برصغیر ہند و پاک میں باقاعدہ طور پہ 1968ء میں متعارف ہوا۔ یہ زمانی فاصلہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ آپ کی فکری نگاہ اپنے عہد سے کہیں آگے کی سمت دیکھ رہی تھی اور آپ کی تحقیق آنے والے زمانوں کے علمی رجحانات کی پیشگی خبر دے رہی تھی۔ اسی طرح آپ کو پہلے مسلم سائنسدان وطبیب کی حیثیت سے یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ آپ نے مرضِ جذام (Leprosy) کے حوالے سے 1908ء میں بتیس صفحات پہ مشتمل اپنی منفرد تصنیف

"الحق المشکلہ" تحریر فرمائی۔ اس کتاب میں آپ نے اسلامی نقطہ نظر سے اس بیماری کے غیر متعدی (Non-Communicable Disease) ہونے کا نظریہ پیش کیا اور اسلام کی برتری، یعنی Supremacy Of Islam کو علمی انداز میں واضح کیا۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ آج کی جدید میڈیکل سائنس نے بھی اس بحث کے متعدد پہلوؤں کی تائید کر دی ہے، جس سے آپ کی تحقیق کی بصیرت اور سائنسی ہم آہنگی مزید نمایاں ہو جاتی ہے۔ مزید برآں طاعون (Plague) جیسی مہلک بیماری کے سلسلے میں بھی آپ کی علمی خدمات نہایت اہم معنی خیز اور قابلِ ذکر ہیں۔ آپ نے اپنی تصنیف ''مقامی الحدید'' میں اس مرض کے متعلق اسلامی تحقیق کی ایسی جامع اور دقیق وضاحت پیش کی جس میں احتیاطی اصول، اسباب اور شرعی رہنمائی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس اسلوب میں مذہبی بصیرت اور طبی شعور ایک دوسرے کے معاون نظر آتے ہیں اور یہی وہ جہت ہے جسے جدید میڈیکل سائنس بھی خراجِ تحسین پیش کرتی نظر آتی ہے۔

ان تمام حقائق کی روشنی میں امام احمد رضا بریلوی کی شخصیت ایک ایسے ہمہ جہت مفکر، سائنسدان اور طبیب کی صورت میں ابھرتی ہے جن کے ہاں علمِ دین اور سائنسی تحقیق کا امتزاج نہایت فطری اور مربوط ہے۔ ان کی تحریروں میں نہ صرف ایمان کی روشنی ہے بلکہ تحقیق کی بصیرت بھی اور یہی وہ جامعیت ہے جو انہیں اپنے عہد سے ممتاز اور آنے والے زمانوں کے لیے رہنما بناتی ہے۔ ان کی یہی ہمہ گیر علمی بصیرت جدید سائنسی علوم کے دیگر دقیق شعبوں میں بھی پوری شان سے جلوہ گر نظر آتی ہے۔ یہ ایک درخشاں حقیقت ہے کہ امام احمد رضا بریلوی کی فکری وسعت نے علمِ صوتیات (Phonetics) جیسے دقیق سائنسی میدان میں بھی حیرت انگیز بصیرت کا اظہار کیا۔ آپ وہ پہلے مسلم سائنسدان ہیں جنہوں نے صوتیات سے متعلق ماڈرن کمیونیکیشن سسٹم Modern communications System کے بنیادی اصول پہ پہلی مرتبہ فکری بحث کو تجربات سے ثابت کیا اور 1909ء میں اپنی تصنیف ''الکشف الشافیہ'' گراموفون پہ تلاوتِ قرآن سننے کے جواب میں تحریر فرمائی۔ اس رسالے میں مفکرِ اسلام نے تحقیق پیش کی کہ آوازیں فضا میں موجود رہتی ہیں اور مناسب ذرائع کے ذریعے دوبارہ سنی جا سکتی ہیں۔ اسی ضمن میں آپ نے فوٹوگرافی اور فونوگرافی کا فرق واضح کیا، نیز ساؤنڈ تھیوری پیش کرتے ہوئے کان کی ساخت، یعنی اناٹومی آف دی مسلز ٹینسر Tess Anatomy of the muscles اور ایئر آؤٹر و مڈل Middle and Duter Ear، کو سماعت کے لیے ضروری قرار دیا، جس کی تائید جدید فزیکل سائنس نے بھی کی۔ یہی بحث آج کل ڈیمپڈ ہارمونک موشن Dapped harmonic motion کے عنوان سے معروف ہے۔ علمِ صوتیات ہی کے باب میں آپ کی ایک اور تصنیف "البیان الشافیہ فی حکم فونو جرافیا" قابل ذکر ہے، جو اس میدان میں آپ کی فکری گہرائی کی شاہد ہے۔

اسی طرح آپ نے وضو اور غسل کے پانی سے متعلق پوچھے گئے ایک مختصر سوال کے جواب میں فزکس کے اہم موضوع فلوئیڈ ڈائنامکس (Fluid Dynamics) پہ ایسی تحقیق پیش کی جو اپنے اندر سائنسی اور فقہی دونوں جہتوں کا حسین امتزاج رکھتی ہے۔ 1915ء میں آپ نے "الدقۃ والطبیان" تصنیف فرما کر جدید سائنسی اور فقہی انداز سے تحقیق کے انمول موتی بکھیرے اور پانی کی تین سو سات اقسام بیان کیں۔ پھر ایک اور کتاب "النور والنورہ" تحریر فرمائی جس میں پانی کی فزیکل پراپرٹیز physical properties کو تینتالیس اقسام میں تقسیم کیا۔ یوں پانی کی کل تین سو پچاس اقسام کا بیان سامنے آیا۔ یہ بیان صرف اعداد تک محدود نہیں بلکہ ہر ایک قسم کا نام، اس کا شرعی حکم اور اس پہ دقیق بحث بھی شامل ہے، جس نے اہلِ علم و تحقیق کو حیرت میں ڈال دیا۔

مزید برآں 1335ھ میں آپ نے منرل فزکس (Mineral Physics) کے تحت تیمم کے مسائل پہ مٹی اور پتھروں کی تحقیق فرما کر ''المطر السعید علی مات جنس السعید'' ۱۳۳۵ھ جیسی جامع تصنیف پیش کی، جو کائنڈز آف منرلز Kinds of mineral پہ تحقیق کرنے والوں کے لیے بہترین رہنمائی کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں امام احمد رضا بریلوی نے زمین کی اجناس یعنی منرلز minerals

کی تین سو گیارہ اقسام گنوا کر نہایت جامع انداز میں تحریر فرمایا کہ یہ تین سو گیارہ چیزوں کا بیان ہے، جن میں سے ایک سو اکیاسی سے تیمم جائز ہے، جن میں چوہتر منصوص اور ایک سو سات زیاداتِ فقیر ہیں، اور ایک سو تیس سے ناجائز ہے، جن میں انٹھاون منصوص اور بہتر زیاداتِ فقیر ہیں۔ پھر آپ نے تصریح فرمائی کہ ایسا جامع بیان اس تحریر کے غیر میں نہ ملے گا بلکہ زیادات در کنار اتنے منصوصات کا استخراج بھی سہل نہ ہو سکے گا۔ یہ تمام علمی خدمات سامنے رکھی جائیں تو امام احمد رضا بریلوی کی شخصیت ایک ایسے ہمہ جہت مفکر، سائنسدان اور فقیہ کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے جس نے دین، سائنس اور عقل کے درمیان ایک حسین ربط قائم کیا۔ ان کے یہاں تحقیق صرف نظری نہیں بلکہ عملی، فقہی اور سائنسی جہات کا ایسا جامع امتزاج ہے جو آج بھی اہلِ علم کے لیے حیرت، رہنمائی اور فکری تحریک کا سرچشمہ ہے۔

ان کی اسی جامع سائنسی و فکری بصیرت کا ایک نمایاں مظہر جدید طبیعیات کے اہم مباحث میں بھی نظر آتا ہے۔ یہ تاریخِ علم کا ایک درخشاں باب ہے کہ امام احمد رضا بریلوی نے جدید طبیعیات کے نہایت اہم موضوع، نظریۂ ایٹم، پہ بھی اپنی فکری بصیرت کا اظہار کیا۔ آپ وہ پہلے مسلم سائنسدان ہیں جنہوں نے 1919ء میں ایٹمی پروگرام کے قرآنی تصور کو آیتِ کریمہ ''وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ'' سے استنباط کرتے ہوئے اپنی کتاب ''الکلمۃ الملہمہ'' میں نظریۂ ایٹم بیان کیا۔ اس تحقیق میں آپ نے عقل و نقل کا ایسا حسین امتزاج پیش کیا کہ پہلے آیاتِ قرآنیہ کو بنیاد بنایا، پھر دلائلِ عقلیہ سے بحث کو مضبوط کیا۔ اسی تسلسل میں آپ نے جے جے تھامسن کے نظریات کی تائید فرمائی، جب کہ البرٹ آئن اسٹائن، جنہیں امریکہ میں جوہری توانائی کے کام کا آغاز کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے، اور آئزک نیوٹن کے خیالات کا پانچ دلائل کے ساتھ رد کیا۔ اس طویل علمی گفتگو میں آپ نے ایٹمی نظریے کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتے ہوئے غلبۂ اسلام کی حقانیت نمایاں کی اور مفکروں و مدبروں کو دعوتِ فکر دی۔

اسی طرح آپ کی سائنسی تحقیق کا ایک اور نمایاں پہلو زمین کے سکون (Stationary Earth) کے مسئلے سے متعلق ہے۔ 1919ء ہی میں آپ نے چار فکر انگیز کتب تحریر فرمائیں اور ایک سو پندرہ دلائل کے ساتھ یہ مؤقف پیش کیا کہ زمین ساکن ہے اور سورج سمیت دیگر سیارے اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ اس بحث میں آپ نے قرآنی نصوص، عقلی استدلال اور مشاہداتی نکات یکجا کرتے ہوئے ایک مربوط علمی نظام قائم کیا۔ آپ کی یہ کاوش اس امر کی مظہر ہے کہ آپ کائنات کے نظام کو محض فلسفیانہ انداز میں نہیں بلکہ نصوصِ شرعیہ اور فکری استنباط کے امتزاج سے دیکھتے تھے اور اسی بنیاد پہ اپنے نتائج مرتب کرتے تھے۔ ان مباحث سے یہ حقیقت مزید واضح ہو جاتی ہے کہ امام احمد رضا بریلوی کی شخصیت محض ایک فقیہ یا مفسر کی نہیں بلکہ ایک ایسے ہمہ جہت مفکر کی تھی جس نے سائنسی موضوعات کو بھی دینی فکر کی روشنی میں پرکھا، قرآن کو سرچشمۂ ہدایت کے ساتھ سرچشمۂ تحقیق سمجھا اور اپنی تحریروں کے ذریعے اہلِ علم کو غور و فکر کی نئی راہیں دکھائیں۔ یہی اسلوب ان کے علمی امتیاز کی علامت بھی ہے اور ان کی فکری میراث کا درخشاں پہلو بھی۔

یہ بھی علمی تاریخ کا ایک اہم اور فکر انگیز پہلو ہے کہ امام احمد رضا بریلوی نے علم البحر اور شیلوگرافی جیسے دقیق موضوعات پہ بھی قلم اٹھایا۔ حرکتِ زمین کی تحقیق کے ضمن میں اپنے رسالہ ''فوزِ مبین در ردِ حرکت زمین'' (۱۳۳۸ھ) میں ایک مستقل باب قائم کیا جس میں علم البحر کی ذیلی شاخ مدّ و جزر (Tides)، جسے جوار بھاٹا بھی کہا جاتا ہے، پہ بحث و تحقیق فرمائی۔ اس گفتگو میں آپ نے سمندری حرکات، کشش اور قدرتی نظم کے باہمی تعلق کو اس انداز میں بیان کیا کہ سائنسی شعور اور قرآنی فکر ایک دوسرے کے معاون نظر آتے ہیں۔ قدرتی مظاہر پہ اس دقیق تحقیق کے ساتھ ساتھ انہوں نے عصر کے سائنسی دعووں کا تنقیدی جائزہ بھی لیا اور غیر مستند پیشگوئیوں کی مدلل تردید فرمائی۔ اس طرح آپ وہ پہلے مسلم سائنسدان ہیں جنہوں نے 17 دسمبر 1919ء کے حوالے سے دنیا بھر کے اخبارات میں ہولناکیوں کی پیشگوئی کرنے والے ایک فرانسیسی نژاد ماہرِ موسمیات پروفیسر البرٹ ایف پورٹا Professor.Albert F.Porta کے دعووں کا اپنی کتاب ''الکلمۃ الملہمہ'' میں زبردست ردِّ بلیغ فرمایا۔ اس بحث میں آپ نے

فلکیاتی اور موسمیاتی اندازِ فکر کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے غیر سائنسی قیاسات رد فرمائے اور علمِ فلکیات کے حوالے سے اپنی بصیرت کا اظہار کیا، جس کے نتیجے میں آپ کا نام ماہرینِ نجوم کی فہرست میں بھی نمایاں ہوا۔ مزید برآں زلزلے (Earthquake) جیسے اہم موضوع پہ بھی آپ نے آج سے تقریباً ایک صدی قبل، 1327ھ میں تحقیق فرمائی۔ اس زمانے میں ایک مشہور نظریہ یہ تھا کہ زمین ایک گائے کی سینگ پر ہے اور وہ مچھلی پر کھڑی ہے اور جب گائے سینگ بدلتی ہے تو زلزلہ پیدا ہوتا ہے۔ بریلی کے مدبر، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے اس تصور کو نہ صرف بے اصل قرار دیا بلکہ زلزلے کے اسباب پہ مفصل بحث کی۔ آپ نے بیان فرمایا کہ اس کا حقیقی باعث انسانی گناہ ہوتے ہیں اور اس کی طبیعی توضیح یوں پیش فرمائی کہ زمین کو محیط ایک پہاڑی ساخت ہے، جس کے ریشے یا جڑیں زمین کے اندر دور تک پھیلی ہوئی ہیں، جیسے کسی بڑے درخت کی جڑیں زمین میں پیوست ہوتی ہیں۔ جب کسی خطے میں زلزلے کا حکم ہوتا ہے تو ان ریشوں میں جنبش پیدا ہوتی ہے اور زمین ہلنے لگتی ہے۔ اسی ضمن میں آپ نے زلزلے کی شدت یعنی Earthquake Intensity یا Magnitude کے تصور پہ بھی گفتگو فرمائی اور اس کے درجاتی پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا۔ ان تمام مباحث سے یہ حقیقت مزید نمایاں ہو جاتی ہے کہ امام احمد رضا بریلوی کی فکر محض مذہبی دائروں تک محدود نہ تھی بلکہ کائنات کے اسرار، طبیعی مظاہر اور سائنسی موضوعات پہ بھی ان کی نگاہ نہایت گہری اور ہمہ گیر تھی۔ ان کی تحریروں میں ایمان کی روشنی، تحقیق کی گہرائی اور فکر کی وسعت ایک ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور یہی امتزاج انہیں اپنے عہد کے ممتاز مفکرین میں منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ ان کی اسی ہمہ گیر فکری بصیرت کا ایک نمایاں پہلوان کی ریاضیاتی مہارت بھی ہے، جو ان کے فتاوے میں واضح طور پہ جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ امام احمد رضا بریلوی نے اپنے فتاوے میں اوزان و پیمائش (Measurements Weights) کے اسلامی نظام کی روشنی میں بے شمار کیلکولیشن کے ذریعے مسائل کے حل تلاش کیے۔ ان کے ریاضیاتی تجزیے اس قدر دقیق اور جامع ہیں کہ بریلی کے اس بوریا نشین کی تحقیقات اور مباحث اہلِ علم کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

انہوں نے فقہی مسائل کو محض نظری بحث تک محدود نہ رکھا بلکہ حسابی استدلال اور مقداری پیمائش کے ذریعے عملی صورتوں میں واضح کیا، جس سے ان کی فکری وسعت اور ریاضیاتی مہارت نمایاں ہوتی ہے۔ اسی طرح آپ وہ پہلے مسلم سائنسدان ہیں جنہوں نے ریاضی (Mathematics)، الجبرا، علمِ ہندسہ (Geometry)، علمِ مثلث (Trigonometry)، علمِ اَرتھمیٹک اور لوگارثم، نیز علمِ ہیئت پہ تقریباً چالیس کتب تحریر فرمائیں۔ یہ تصانیف تخلیقی کاوشوں سے بھرپور ہیں اور نئے فکری زاویے بیان کر کے ماہرین کو دعوتِ تحقیق دیتی ہیں۔ علمِ لوگارثم اور علمِ مثلثِ کروی (Spherical Trigonometry) کے اصول وقواعد اور دلائل کی روشنی میں سمتِ قبلہ کے پیچیدہ مسائل کے حل کے لیے آپ نے ''ہدایت المطالع'' اور ''کشف العلۃ عن سمت القبلۃ'' جیسی کتب تحریر فرمائیں اور تحقیقِ برجندی کی تائید کرتے ہوئے جہتِ قبلہ کے حوالے سے ایک نہایت دقیق علمی گفتگو پیش کی۔ آپ نے لکھا کہ گنتی کے چند نادر مقامات ایسے ہیں، جو شاید آباد بھی نہ ہوں بلکہ غالباً سمندر میں واقع ہوں، جہاں قبلہ نقطۂ اعتدال کی طرف ہوگا۔ بریلی کے ایک چھوٹے سے قصبے میں بیٹھا یہ مفکر دنیا کے ان مخصوص مقامات کی طرف اشارہ کر رہا تھا جو مغربین یا مشرقین جہتِ قبلہ سے خارج ہیں۔ بعد کے محققین نے ان میں سے بعض مقامات کی نشاندہی کی، جیسے روس کا ایک دلدلی علاقہ، گرین لینڈ Green land کی آخری جنوبی سرحد، بحرِ ظلمات کی گہرائی، آسٹریلیا کے جنوبی جزیرے ہوبارٹ Hobart کے قریب برفانی سمندری خطہ اور ارجنٹینا کا وہ سمندری علاقہ جسے ڈارک واٹر وے dark water way کہا جاتا ہے۔ یہ پیش گوئی نما علمی اشارے ان کی جغرافیائی بصیرت کی گہرائی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح علمِ توقیت پہ بھی آپ نے گراں قدر کام چھوڑا۔ اس فن میں آپ کو اس قدر مہارت حاصل تھی کہ اپنے ایجاد کردہ قواعد کے ذریعے آپ یہ معلوم کر لیتے تھے کہ کس وقت آفتاب طلوع ہوگا اور کس وقت غروب۔ فنِ توقیت میں آپ کی تقریباً انیس شاہکار کتابیں ملتی ہیں، جو

اس میدان میں آپ کی غیر معمولی مہارت کا ثبوت ہیں۔ مزید برآں آپ وہ پہلے مسلم سائنسداں ہیں جنہوں نے اپنے دور کے مطابق ایک عظیم اسلامی معاشی منصوبہ پیش کیا اور اقتصادیات پہ "کفل الفقیہ الفاہم فی احکام قرطاس الدراہم (۱۳۳۴ھ)" اور "تدبیر فلاح و نجات" (۱۳۳۱ھ) جیسی اہم تصانیف تحریر فرمائیں۔ ان کے علاوہ بھی متعدد رسائل اور نکات اقتصادی تصورات پہ قلم بند کیے، جو سو برس کا طویل عرصہ گذر جانے کے بعد آج بھی اپنی معنویت برقرار رکھے ہوئے ہیں اور آئندہ صدیوں تک کارآمد رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ان کی اسی ہمہ جہت فکری وسعت کا ایک نمایاں مظہر ان کا پیش کردہ تعلیمی و تحقیقی منصوبہ بھی ہے، جس سے ان کی علمی دور اندیشی مزید واضح ہو جاتی ہے۔ ان تمام پہلوؤں کو یکجا کیا جائے تو امام احمد رضا بریلوی کی شخصیت ایک ایسے ہمہ جہت مفکر، ریاضی داں، فلکیات داں اور اقتصادی مفکر کی صورت میں سامنے آتی ہے جس نے فقہ، سائنس، ریاضی اور معاشیات کو ایک مربوط فکری نظام میں ڈھال دیا۔ ان کی تحقیقات محض ماضی کی علمی یادگار نہیں بلکہ آج بھی اہلِ فکر و نظر کے لیے تحریک اور رہنمائی کا سرچشمہ ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقتِ روشن ہے کہ امام احمد رضا بریلوی نے آج سے کئی دہائیاں قبل ایک جامع اور دور اندیش تعلیمی منصوبہ پیش کیا۔ آپ نے ایسا ایجوکیشن اینڈ ریسرچ سسٹم Research System Education متعارف کروایا جس میں تعلیم، تحقیق اور فکری تربیت کے باہمی ربط کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ تعلیمی نظام پہ آپ کا دست نکاتی ایجنڈا واقعی آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اس منصوبے میں نصاب کی ہمہ گیری، تحقیق کی حوصلہ افزائی، اخلاقی تربیت اور علمی خود کفالت جیسے عناصر اس انداز سے یکجا تھے کہ اگر اس پہ عملی تکمیل ہو جاتی تو علمی دنیا میں ایک نئی روایت قائم ہو سکتی تھی۔ تعلیم و تحقیق کے اس جامع تصور کے ساتھ ساتھ ان کی سائنسی بصیرت بھی عملی مثالوں میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اس تناظر میں اگر آپ کی علوم و افکار کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو آپ وہ پہلے مسلم سائنسداں نظر آتے ہیں جنہوں نے انعطافِ نور (Reflection of Light) کی تھیوری کی وضاحت عملی تجربات کے ذریعے فرمائی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ العزیز کی چوکھٹ پہ حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ آفتاب حقیقتاً طلوع نہیں ہوا مگر ایسا معلوم کیوں ہوتا ہے کہ طلوع ہو چکا ہے؟ محلہ سوداگران کی تنگ گلی میں رہائش پذیر اس امامِ دین نے انعطافِ نور کے تعلق سے پریکٹیکل تجربات کے ذریعے ایسی رہنمائی فرمائی کہ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف اس کی تصدیق کی بلکہ اعتراف کیا کہ یہ سوال نہایت مشکل اور بظاہر ناقابلِ حل تھا اور وہ اس مسئلے کے حل کے لیے جرمنی جانے کا ارادہ رکھتے تھے مگر یہاں فی البدیہہ حل مل گیا۔

یہ واقعہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ امام احمد رضا بریلوی کی علمی بصیرت محض نظری مباحث تک محدود نہ تھی بلکہ عملی تجربات کے ذریعے سائنسی حقائق واضح کرنے کی غیر معمولی صلاحیت بھی رکھتی تھی۔ ان کی شخصیت میں دینی فقاہت، سائنسی شعور اور تحقیقی بصیرت کا ایسا حسین امتزاج نظر آتا ہے جو انہیں اپنے عہد کی منفرد اور ہمہ جہت علمی ہستی بناتا ہے۔ اسی لیے یہ کہنا بجا محسوس ہوتا ہے کہ علمی خدمات کے اس تنوع اور وسعت کے پیش نظر یہ شخصیت واقعی عالمی اعزازات، حتیٰ کہ نوبل انعام، کی مستحق دکھائی دیتی ہے۔ یہ تو محض ایک مثال ہے، ورنہ امام احمد رضا بریلوی کی علمی وسعت کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، جس کا اجمالی نقشہ ان کی مجموعی علمی خدمات کے مطالعے سے سامنے آتا ہے۔

یہ تمام علمی جہات ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت کا نقشہ پیش کرتی ہیں جس کی فکر صرف اپنے زمانے تک محدود نہیں رہی بلکہ آنے والے ادوار کے لیے بھی رہنمائی کا سرچشمہ بن گئی۔ امام احمد رضا قادری بریلوی نے علم کے جن متنوع میدانوں میں قلم اٹھایا، وہ اس حقیقت کا روشن ثبوت ہیں کہ ان کی علمی بصیرت وسیع تحقیقی مزاج، مضبوط اور فکری پرواز غیر معمولی تھی۔ ان کے یہاں دین اور سائنس کا امتزاج محض ایک نظری دعویٰ نہیں بلکہ عملی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے، جس میں عقیدہ بھی ہے، استدلال بھی اور مشاہدہ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ امام احمد رضا کی خدمات کو محض فقہ یا عقیدے کے دائرے میں محدود کرنا ان کی ہمہ جہت علمی

شخصیت کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ انہوں نے علمِ ریاضی، فلکیات، طبیعیات، صوتیات، معاشیات اور تعلیم جیسے متعدد میدانوں میں ایسے افکار پیش کیے جو تحقیق کے نئے دروازے کھولتے ہیں۔ ان کا اندازِ فکر ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ مسلمان عالم کا قلم صرف مذہبی مسائل تک محدود نہیں بلکہ کائنات کے اسرار تک پھیلا ہوا ہونا چاہیے۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ امام احمد رضا کے افکار و نظریات بڑے پیمانے پہ عام کیے جائیں۔ ان کی تصانیف کا تحقیقی مطالعہ، جدید زبانوں میں تراجم، جامعات میں ان پہ تحقیقی منصوبے اور علمی کانفرنسیں اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اگر ان کے علمی سرمائے منظم انداز میں دنیا کے سامنے پیش کیے جائیں تو نہ صرف برصغیر کی علمی روایت کا وقار بلند ہوگا بلکہ نئی نسل کو بھی علم و تحقیق کے میدان میں آگے بڑھنے کا حوصلہ ملے گا۔ امام احمد رضا بریلوی کی بارگاہ میں یہی خراجِ عقیدت ہے کہ ہم ان کی علمی میراث محفوظ کریں، اسے عام کریں اور ان کا تحقیقی اسلوب زندہ رکھیں۔ ان کی شخصیت ایک روشن مینار کی مانند ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ ایمان اور علم جب ایک ساتھ چلیں تو فکری افق وسیع ہو جاتے ہیں اور تحقیق کا سفر نئی منزلوں کی طرف بڑھتا ہے۔

ان تمام علمی گوشوں کا جائزہ لیا جائے تو امام احمد رضا بریلوی کی شخصیت ایک ایسی ہمہ گیر دانش گاہ کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے جس کے دامن میں علوم کی بے شمار شاخیں سمٹ آئی ہیں۔ کہیں فقہ کی گہرائی ہے، کہیں حدیث کی بصیرت، کہیں تفسیر کی لطافت، کہیں ریاضی و ہیئت کی دقت، کہیں طبیعیات کی باریکی، کہیں طب و حیاتیات کی تحقیق، کہیں اقتصادیات کی منصوبہ بندی اور کہیں تعلیم و تربیت کا جامع تصور، یوں محسوس ہوتا ہے کہ علم کا ہر دریا آ کر اسی بحرِ بے کنار میں مل جاتا ہے۔ آپ کی نگاہ صرف روایت کی محافظ نہ تھی بلکہ تحقیق کی معمار بھی تھی، آپ نے نصوصِ شرعیہ کو عقلِ سلیم سے جوڑا اور عقل کو وحی کی روشنی میں معنیٰ کی روشنی عطا کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے علوم و افکار میں وسعت بھی ہے اور توازن بھی، گہرائی بھی ہے اور ہمہ گیری بھی۔ وہ ایک ایسے مفکر ہیں جن کے یہاں دین اور سائنس میں فاصلے نہیں بلکہ ایک حسین ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور یہی ہم آہنگی ان کے فکری امتیاز کی اصل بنیاد ہے۔ درحقیقت امام احمد رضا بریلوی کی علمی زندگی اس حقیقت کا اعلان ہے کہ جب ذہن تحقیق سے روشن ہو اور دل ایمان سے منور، تو علم کی کوئی سرحد باقی نہیں رہتی۔ ان کی تحریریں آج بھی اہلِ فکر کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ ان کے بکھرے ہوئے علمی جواہر یکجا کریں، ان کی تحقیقات کو نئے زاویوں سے پرکھیں اور آنے والی نسلوں کے سامنے ایک ایسے مفکر کی تصویر پیش کریں جس نے علوم و معارف کی تقریباً ہر شاخ میں اپنے نقوش ثبت کیے۔ یہی وہ ہمہ جہت عظمت ہے جو انہیں ایک فرد نہیں بلکہ ایک عہد، ایک مکتب اور ایک جامع علمی روایت بنا دیتی ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں اہلِ علم، خصوصاً نئی نسل کے دانشوروں اور مفکرین کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے۔ امام احمد رضا بریلوی کو صرف ایک ماہرِ علومِ دینیہ کے طور پہ متعارف کرانا ان کی ہمہ جہت علمی شخصیت کے ساتھ انصاف نہیں۔ ان کے فکری افق میں فقہ و حدیث کے ساتھ ساتھ ریاضی، فلکیات، طبیعیات، صوتیات، معاشیات اور دیگر علوم کے روشن نقوش بھی موجود ہیں، جنہیں ابھی تک منظم انداز میں پیش کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ نئی نسل کے اہلِ قلم کا یہ علمی اور منصبی فریضہ ہے کہ وہ اعلیٰ حضرت کے سائنسی و تحقیقی افکار کے بکھرے ہوئے گوشے جمع کریں، ان کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ کریں اور انہیں عصرِ حاضر کی علمی زبان میں دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اگر ان کے رسائل اور تصانیف موضوعاتی ترتیب دے کر مرتب کیے جائیں، ان پہ تحقیقی مقالات لکھے جائیں اور جامعات میں مستقل مطالعاتی شعبے قائم کیے جائیں تو ان کی علمی عظمت کا ایک نیا پہلو سامنے آئے گا۔

یہ کوشش نہ صرف ایک عظیم مفکر کو صحیح معنوں میں متعارف کرانے کا ذریعہ بنے گی بلکہ نوجوان نسل کو یہ پیغام بھی دے گی کہ اسلامی علمی روایت میں تحقیق کی وسعت کس قدر وسیع ہے۔ یوں اعلیٰ حضرت کی علمی میراث محض ماضی کا سرمایہ نہیں رہے گی بلکہ مستقبل کی فکری تعمیر کا ایک فعال سرچشمہ بن جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کے علمی فیوض کو ہمیشہ جاری رکھے اور ہمیں ان کے افکار سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔

□□□□

مولانا محمد ملک الظفر سہسرامی

علم، حکمت اور توازن -- امام احمد رضا کی فکری میراث

علم و فکر کی دنیا میں بعض تحریریں محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتیں بلکہ ایک عہد کی فکری سمت کا تعین کرتی ہیں۔ وہ اپنے اندر ماضی کی بصیرت، حال کی ضرورت اور مستقبل کی رہنمائی ہر ایک کو سمیٹے ہوتی ہیں۔ زیرِ نظر مضمون بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے، جہاں برصغیر کی علمی روایت کے درخشاں نقوش کو عصرِ حاضر کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی ایک سنجیدہ اور بصیرت افروز کوشش کی گئی ہے۔

یہ تحریر محض ایک تاریخی یا تعارفی مطالعہ نہیں بلکہ ایک فکری دعوت ہے، ایسی دعوت جو ہمیں یہ سوچنے پہ آمادہ کرتی ہے کہ علم کی اصل روح کیا ہے، اس کی حدود کہاں ختم ہوتی ہیں اور اس کی وسعت کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں روایت اور تجدید کے اس حسین امتزاج کو نمایاں کیا گیا ہے جس نے ہماری علمی تاریخ کو زندگی بخشی اور اسی کے تناظر میں امام احمد رضا کی ہمہ جہت شخصیت کو ایک روشن مینار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یوں یہ مضمون قاری کو صرف معلومات فراہم نہیں کرتا بلکہ اسے ایک فکری سفر پر لے جاتا ہے، ایسا سفر جس میں سوالات بھی ہیں، تلاش بھی اور ایک متوازن جواب کی جھلک بھی اور یہی اس کی اصل معنویت ہے۔

برصغیر کی علمی روایت جب اپنے درخشاں ادوار کا سراغ دیتی ہے تو ایک حقیقت پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتی ہے کہ یہاں علم کبھی یک رُخا نہیں رہا بلکہ اس کی فضا ہمیشہ رنگا رنگ افکار، متنوع علوم اور متوازن زاویہ ہائے نظر سے معمور رہی ہے۔ یہاں درسگاہوں کے ایوانوں میں جہاں فقہ و حدیث کی سنجیدہ بازگشت سنائی دیتی تھی، وہیں حکمت و فلسفے کی لطیف سرگوشیاں بھی دل و دماغ کو مہمیز دیتی تھیں۔ علم کی یہ بزم محض روایت کی پاسداری تک محدود نہ تھی بلکہ اس میں جستجو کی تازگی اور فکر کی روانی بھی شامل تھی۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس سرزمین پر علم ایک دریا کی مانند بہتا رہا، جس میں کبھی تفسیر و حدیث کے چشمے شامل ہوئے، کبھی ریاضیات و ہیئت کی لہریں اس میں مدغم ہوئیں اور کبھی فلسفہ و حکمت کی گہرائیاں اس کے دامن کو وسعت عطا کرتی رہیں۔ اس علمی روایت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہی رہی کہ یہاں قدیم و جدید کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ تھی بلکہ ایک ایسا لطیف ربط قائم تھا جس میں ماضی کی بصیرت حال کی آگہی سے ہم آہنگ ہو کر مستقبل کے دریچے وا کرتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ برصغیر کا علمی منظر نامہ محض ایک تاریخ نہیں بلکہ ایک زندہ تسلسل ہے، ایک ایسا تسلسل جس میں فکر کی شمع کبھی مدھم نہیں ہوئی بلکہ ہر دور میں نئے چراغوں کے ساتھ فروزاں ہوتی رہی اور علم اپنی ہمہ جہتی کے ساتھ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا۔

مدارس کی سنجیدہ فضا میں جہاں فقہ و حدیث کی صداقت آمیز بازگشت سنائی دیتی تھی، وہیں فکر کے افق پر نئے سوالات بھی ابھرتے رہے۔ ان سوالات کی نوعیت محض تشکیک کی نہ تھی بلکہ وہ جستجو کی ایک مہذب صورت تھے، جن میں حقیقت تک رسائی کی ایک خموش آرزو پنہاں ہوتی تھی۔ درسگاہوں کے حلقوں میں متون کی شرح و توضیح کے ساتھ ساتھ ذہنوں میں یہ احساس بھی بیدار رہتا تھا کہ علم محض محفوظ کرنے کا نام نہیں بلکہ سمجھنے، پرکھنے اور آگے بڑھانے کا عمل بھی ہے۔

یوں ایک طرف روایت اپنی پوری متانت اور وقار کے ساتھ سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہی تھی، تو دوسری طرف فکر کی نئی لہریں انہی بنیادوں پر کھڑے ہو کر مزید وسعت کی متلاشی تھیں۔ سوال اٹھتے، ان پر غور وفکر کے چراغ جلائے جاتے اور پھر انہی مباحث سے تحقیق کے نئے دریچے وا ہوتے۔ اس پورے عمل میں نہ بے ادبی کا شائبہ ہوتا اور نہ انکار کا اضطراب بلکہ ایک سنجیدہ مکالمہ جنم لیتا جس میں عقل اور نقل ایک دوسرے کے معاون بن جاتے۔

یہی وہ علمی فضا تھی جس نے برصغیر کی درسگاہوں کو محض تعلیم کا مرکز نہیں رہنے دیا بلکہ انہیں فکر ونظر کی آبیاری کا ایسا گلستاں بنا دیا جہاں ہر نئی کونپل روایت کی جڑوں سے وابستہ ہو کر ہی نمو پاتی تھی اور علم کا چراغ تحقیق کی ہوا سے مزید روشن ہوتا چلا جاتا تھا۔ یہی وہ ماحول تھا جس میں روایت اور تجدید کے درمیان ایک بامعنیٰ مکالمہ جاری رہا، ایک ایسا مکالمہ جس نے علم کو جمود سے نکال کر حرکت اور وسعت عطا کی۔ اس مکالمے کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں نہ تو روایت کو محض ماضی کی یادگار سمجھ کر ترک کیا گیا اور نہ ہی تجدید کو بے مہار آزادی دے کر اس کی سمت کھو دی گئی بلکہ دونوں ایک دوسرے کے لیے میزان بن گئے۔ روایت نے بنیاد فراہم کی اور تجدید نے اسی بنیاد پر تعمیر کا ہنر دکھایا۔ یوں علم کی دنیا میں ایک ایسی متوازن فضا قائم ہوئی جہاں فکر نہ تو ٹھہراؤ کی شکار ہوئی اور نہ ہی انتشار کی بلکہ ایک سنجیدہ ارتقا کی راہ پر گامزن رہی۔ قدیم اصول نئی تعبیرات کے ساتھ سامنے آئے اور نئے سوالات قدیم حکمت کی روشنی میں اپنے جوابات پاتے رہے۔ اس عمل میں نہ صرف علمی سرمایہ محفوظ رہا بلکہ اس میں ایسی تازگی پیدا ہوئی جو ہر دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی چلی گئی۔ درحقیقت یہی وہ لطیف ہم آہنگی تھی جس نے علم کو محض ایک وراثت نہیں رہنے دیا بلکہ اسے ایک زندہ اور متحرک قوت بنا دیا، ایسی قوت جو ہر عہد میں خود کو نئے سانچے میں ڈھال کر بھی اپنی اصل سے وابستہ رہتی ہے اور یہی وابستگی اس کی بقا اور اثر آفرینی کی اصل بنیاد بنتی ہے۔

آج کے دور میں جبکہ دنیا تیزی سے سائنسی ترقی کی منازل طے کر رہی ہے۔ کائنات کے راز سربستہ یکے بعد دیگرے منکشف ہو رہے ہیں اور تحقیق کی رفتار لمحہ بہ لمحہ نئی سمتیں اختیار کر رہی ہے، انسان کی فکری پرواز بھی پہلے سے کہیں زیادہ بلند ہوتی جا رہی ہے۔ ایجادات کی چمک، تجربات کی وسعت اور دریافتوں کی کثرت نے زندگی کے ہر گوشے کو ایک نئی معنویت عطا کر دی ہے۔ لیکن اس تیز رفتار ترقی کے ساتھ ایک اہم سوال بھی ابھرتا ہے کہ آیا یہ پیش رفت صرف مادی آسائشوں تک محدود رہے گی یا اس کے ساتھ فکری توازن اور روحانی بصیرت بھی ہم آہنگ ہو سکے گی؟ یہی وہ نکتہ ہے جہاں علم کی دو بڑی جہتیں، سائنس اور دین، ایک بار پھر مکالمے کی متقاضی نظر آتی ہیں۔

اگر سائنسی ترقی انسان کو کائنات کے ظاہری نظام سے آشنا کرتی ہے تو دینی فکر اسے اس نظام کے پس پردہ حکمت اور مقصد سے روشناس کراتی ہے۔ جب یہ دونوں دھارے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں تو علم محض معلومات کا ذخیرہ نہیں رہتا بلکہ حکمت کی روشنی میں ڈھل کر انسانیت کے لیے حقیقی رہنمائی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یوں عصرِ حاضر کی یہ برق رفتار دنیا ہمیں اس امر کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ ہم ترقی کی اس دوڑ میں توازن کا دامن نہ چھوڑیں بلکہ علم کو اس کی ہمہ جہت روح کے ساتھ اپنائیں، تاکہ تحقیق کی بلندی اور بصیرت کی گہرائی ایک ساتھ ہمارے فکری سفر روشن کر سکیں۔

یوں عصرِ حاضر کی یہ برق رفتار دنیا ہمیں اس امر کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ ہم ترقی کی اس دوڑ میں توازن کا دامن نہ چھوڑیں بلکہ علم کو اس کی ہمہ جہت روح کے ساتھ اپنائیں، تاکہ تحقیق کی بلندی اور بصیرت کی گہرائی ایک ساتھ ہمارا فکری سفر روشن کر سکیں۔ آج یہ بنیادی سوال ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ کیا مذہبی علوم اور عصری علوم دو متوازی دنیا ہیں یا ایک ہی حقیقت کے دو رخ؟ اس دور میں اس سوال کا سب سے متوازن، جامع اور عملی جواب ہمیں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی زندگی میں ملتا ہے۔

امام احمد رضا کی شخصیت اس حقیقت کا زندہ استعارہ ہے کہ علم اگر اپنی اصل روح کے ساتھ زندہ ہو، تو اس میں تفریق نہیں بلکہ تکمیل

ہوتی ہے۔ ان کے یہاں فقہ کی گہرائی، حدیث کی روشنی، ریاضیات کی دقت، فلکیات کی وسعت، طبیعیات کی باریکی اور صوتیات کی لطافت، ایک مربوط فکری نظام کی صورت میں جلوہ گر نظر آتی ہیں۔

یہ امتزاج محض معلومات کا اجتماع نہیں بلکہ ایک شعوری ہم آہنگی کا مظہر ہے، جہاں ہر علم دوسرے علم کی تائید کرتا ہے اور ہر زاویۂ فکر ایک بڑے معنوی دائرے میں سمٹ آتا ہے۔ ان کے ہاں عقل، نقل کے زیرِ سایہ چلتی ہے اور نقل، عقل کے ذریعے اپنی وسعتیں نمایاں کرتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ علم کے مختلف دھارے ان کی فکر میں آ کر ایک ایسے بحرِ بیکراں میں تبدیل ہو جاتے ہیں جس میں گہرائی بھی ہے اور وسعت بھی۔ ان کی نگاہ محض جزئیات میں الجھ کر نہیں رہتی بلکہ کلیات تک رسائی حاصل کرتی ہے۔ وہ ایک مسئلے کو صرف اس کے محدود دائرے میں نہیں دیکھتے بلکہ اس کے پس منظر، اس کے اثرات اور اس کا فکری ربط بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں استدلال کی پختگی کے ساتھ ایک ایسی معنوی روشنی بھی محسوس ہوتی ہے جو دل و دماغ دونوں کو یکساں طور پر متاثر کرتی ہے۔ درحقیقت ان کی علمی شخصیت ایک ایسے آئینے کی مانند ہے جس میں علم کی مختلف شعاعیں ٹکرا کر بکھرتی نہیں بلکہ ایک نئے نور میں ڈھل کر سامنے آتی ہیں۔ یہی وہ جامعیت ہے جو انہیں محض ایک فقیہ یا محدث نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت مفکر کے طور پر ممتاز کرتی ہے اور یہی وصف ان کی فکر کو ہر دور میں تازگی اور معنویت عطا کرتا ہے۔ وہ اس روایت کے امین تھے جس میں علم کو خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا بلکہ اسے ایک کل کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک علم کی ہر شاخ ایک ہی حقیقت کے مختلف جلوے تھے، کہیں وہ وحی کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اور کہیں کائنات کے مشاہدے میں اپنا اظہار کرتی ہے۔ اس لیے انہوں نے کبھی فقہ کو سائنس سے جدا نہ کیا اور نہ ہی عقل کو نقل سے متصادم سمجھا بلکہ ان سب کو ایک ہی زنجیر کے مربوط حلقوں کی طرح دیکھا۔

یوں ان کی فکر میں علم کی سرحدیں مٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور ایک ایسی جامع بصیرت سامنے آتی ہے جس میں جزئیات کلیات سے ہم رشتہ ہوتی ہیں اور ہر حقیقت اپنی اصل کے ساتھ مربوط ہے۔ ان کے ہاں تخصص اپنی جگہ اہم ہے مگر اس کے ساتھ ایک ہمہ گیر شعور بھی کارفرما ہے، جو مختلف علوم کو ایک دوسرے سے جوڑ کر ایک وسیع تر معنوی نظام تشکیل دیتا ہے۔

درحقیقت یہی وہ زاویۂ نگاہ ہے جو علم کو محض پیشہ وارانہ مہارت سے بلند کر کے حکمت کے مقام تک لے جاتا ہے۔ اور جب علم حکمت میں ڈھل جائے تو وہ نہ صرف مسائل کا حل پیش کرتا ہے بلکہ زندگی کو ایک بامقصد سمت بھی عطا کرتا ہے، ایسی سمت جس میں فہم بھی ہو، توازن بھی اور انسانیت کے لیے خیر کا پیغام بھی۔ اسی حکیمانہ بصیرت کا عملی اظہار ان کے طرزِ استدلال اور منہجِ تحقیق میں نمایاں طور پہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ امر نہایت قابلِ توجہ ہے کہ انہوں نے نصوصِ شرعیہ کی پاسداری کرتے ہوئے عقل و تحقیق کے دروازے بند نہیں کیے بلکہ انہیں کھولا، سنوارا اور سمت عطا کی۔ ان کے ہاں نصوص شرعیہ سے وفاداری کا مطلب جمود نہیں بلکہ فہم کی گہرائی تھا اور تحقیق کا مفہوم بے مہار آزادی نہیں بلکہ اصولوں کی روشنی میں جستجو تھا۔ انہوں نے یہ واضح کر دیا کہ جب عقل، وحی کے زیرِ سایہ چلتی ہے تو وہ بھٹکتی نہیں بلکہ راستہ پاتی ہے اور جب تحقیق اصولوں کی بنیاد پر استوار ہو تو وہ انتشار نہیں بلکہ استحکام پیدا کرتی ہے۔ یوں ان کے اسلوب میں ایک ایسا اعتدال نمایاں ہوتا ہے جس میں نہ عصری رجحانات کی سختی ہے اور نہ جدت پسندی کی بے قراری بلکہ ایک سنجیدہ توازن ہے جو علم کو وقار بھی عطا کرتا ہے اور وسعت بھی۔ وہ نصوص کی تعبیر میں گہرائی پیدا کرتے ہیں اور عقل کی رہنمائی میں تحقیق کے نئے دریچے وا کرتے ہیں، جس سے علم ایک زندہ اور متحرک حقیقت بن کر سامنے آتا ہے۔ درحقیقت یہی وہ اندازِ فکر ہے جو علمی روایت محفوظ بھی رکھتا ہے اور اسے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی کرتا ہے۔ اور جب یہ ہم آہنگی قائم ہو جائے تو علم نہ ماضی کا اسیر رہتا ہے اور نہ حال کا محتاج بلکہ ایک ایسا روشن تسلسل بن جاتا ہے جو ہر دور میں رہنمائی کی نئی جہتیں پیدا کرتا رہتا ہے۔ ان کی تحریریں اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ایک سچا عالم وہی

ہے جو وحی کی روشنی میں کائنات کا مطالعہ کرے اور کائنات کے مشاہدے سے وحی کی معنویت مزید واضح کرے۔

ایسا عالم نہ تو صرف الفاظ کا نگہبان ہوتا ہے اور نہ ہی محض جلوہ ہائے فطرت کا مشاہد بلکہ وہ ان دونوں کے درمیان ایک زندہ ربط قائم کرتا ہے، جہاں آیاتِ کتاب اور آیاتِ کائنات ایک ہی حقیقت کے دو روشن مظاہر بن کر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ یوں اس کی نگاہ میں ستاروں کی گردش بھی ایک پیغام بن جاتی ہے اور آیاتِ قرآنیہ کی تلاوت بھی ایک دعوتِ فکر، وہ زمین کے ذروں میں بھی حکمت کے جلوے دیکھتا ہے اور نصوص کے معانی میں بھی کائنات کی وسعت محسوس کرتا ہے۔ اس کے لیے مشاہدہ اور مطالعہ دو الگ الگ راستے نہیں بلکہ ایک ہی سفر کے دو مرحلے ہوتے ہیں، ایک آنکھ کو بینائی دیتا ہے اور دوسرا دل کو بصیرت، ایک نگاہ کو روشنی دیتا ہے تو دوسرا فکر کو گہرائی، ایک منظر واضح کرتا ہے تو دوسرا معنیٰ منکشف کرتا ہے۔ اس طرح جب نگاہیں حقائق کا مطالعہ کرتی ہیں اور دل اس کی معنویت محسوس کرتا ہے تو علم صرف ادراک تک محدود نہیں رہتا بلکہ عرفان میں ڈھلنے لگتا ہے۔ مشاہدہ خارجی دنیا کے نقوش واضح کرتا ہے اور مطالعہ باطنی شعور کے دریچے وا کرتا ہے، نتیجتاً انسان ظاہر اور باطن کے اس حسین امتزاج میں حقیقت کے قریب تر ہو جاتا ہے۔

درحقیقت یہی وہ مقام ہے جہاں علم اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے، جب نظر فہم میں ڈھل جائے اور فہم ادراکِ حقیقت میں تبدیل ہو جائے تو فکر ایک نئی روشنی سے آشنا ہوتی ہے اور انسان کا فکری سفر محض معلومات سے آگے بڑھ کر معرفت کی منازل طے کرنے لگتا ہے۔ اسی جامعیت کی عملی تصویر اس وقت سامنے آتی ہے جب وحی اور کائنات ایک دوسرے کے مفسر بن کر ابھرتے ہیں۔ وحی رہنمائی دے اور کائنات اس کی تفسیر بن جائے تو فکر میں نہ ابہام باقی رہتا ہے اور نہ ہی جمود بلکہ ایک ایسی روشن ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے جو انسان کو معرفت کے اعلیٰ مدارج تک لے جاتی ہے اور اسے یہ شعور عطا کرتی ہے کہ علم کا ہر دریا بالآخر اسی بحرِ حقیقت میں جا ملتا ہے جہاں سے ہدایت کی روشنی پھوٹتی ہے۔ یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو مذہبی اور سائنسی علوم کے درمیان حقیقی ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ لیکن کم نصیبی سے ہمارا موجودہ تعلیمی نظام اس ہم آہنگی سے محروم دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف دینی مدارس ہیں جہاں جدید سائنسی مباحث کو ثانوی حیثیت حاصل ہے اور دوسری طرف عصری تعلیمی ادارے ہیں جہاں مذہبی فکر کو غیر متعلق سمجھ لیا گیا ہے۔ اس طرح علم کے دو دھارے ایک دوسرے سے کٹ کر بہنے لگے ہیں، ایک میں روایت کی حرارت تو ہے مگر عصر کی آگہی کی کمی محسوس ہوتی ہے اور دوسرے میں تحقیق کی تیزی تو ہے مگر روحانیت کی روشنی مدھم دکھائی دیتی ہے۔ یہ تقسیم محض اداروں کی نہیں بلکہ فکری بھی ہے، جس نے ذہنوں میں ایک غیر محسوس فاصلے کو جنم دیا ہے۔ نتیجتاً ایک ایسا طالبِ علم سامنے آتا ہے جو یا تو دین کی باریکیوں سے آشنا ہوتا ہے مگر کائنات کے جدید اسرار سے بے خبر، یا پھر سائنسی علوم میں مہارت رکھتا ہے مگر اپنی فکری بنیادوں سے کٹا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ علمی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور فکری توازن بھی متاثر ہوتا ہے۔ یوں علم اپنی اس جامع روح سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے جس میں وسعت بھی تھی اور ہم آہنگی بھی۔ ایک طرف ایسا ذہن پروان چڑھتا ہے جو معلومات کے انبار کا حامل تو ہوتا ہے مگر معنویت کی روشنی سے خالی اور دوسری طرف ایسا شعور جنم لیتا ہے جو روایت کی پاسبانی تو کرتا ہے مگر زمانے کی رفتار سے ہم قدم نہیں ہو پاتا۔ یوں فکر کے افق پر یک رخا انداز غالب آنے لگتا ہے، نہ سوالات پوری طرح جنم لے پاتے ہیں اور نہ ہی جوابات اپنی مکمل صورت میں سامنے آتے ہیں۔ علم کا وہ حسن، جو مختلف جہتوں کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے، دھندلا پڑنے لگتا ہے اور انسانی شعور ایک محدود دائرے میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ درحقیقت جب علم کے دھارے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو نہ تحقیق میں گہرائی باقی رہتی ہے اور نہ بصیرت میں وسعت، حالاں کہ ان دونوں کا باہمی ربط ہی وہ قوت ہے جو فکری توازن عطا کرتی ہے۔

اسی پس منظر میں اصلاح کی ضرورت اور بھی شدت کے ساتھ

محسوس ہوتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ علم کی یہ دونوں جہتیں ایک دوسرے کی تکمیل ہیں، نہ کہ نفی۔ جب مدرسہ سائنس سے رشتہ جوڑ لے اور یونیورسٹی مذہبی فکر کی معنویت سمجھنے لگے تو ایک ایسی ہم آہنگ فضا قائم ہو سکتی ہے جس میں علم اپنی اصل وحدت کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ درحقیقت ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ مصنوعی تقسیم ختم کی جائے اور ایک ایسا فکری و تعلیمی نظام تشکیل دیا جائے جہاں تحقیق کی روشنی اور ہدایت کی حرارت ایک ساتھ میسر ہوں، تاکہ علم نہ صرف ذہن کو جلا بخشے بلکہ دل کو بھی منور کرے اور انسان کو محض ماہر نہیں بلکہ صاحبِ بصیرت بنا دے۔ یوں ذہن کی جستجو اور دل کی روشنی ایک ساتھ مل کر ایک متوازن اور بامقصد فکری زندگی کی تشکیل کر سکیں۔ ایسے میں امام احمد رضا کا اسلوب ہمارے لیے ایک روشن راہنما ہے۔ انہوں نے یہ باور کرایا کہ دینی بصیرت اور سائنسی شعور ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ معاون ہیں۔ اگر قرآن کائنات پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے تو سائنسی تحقیق اسی دعوت کی عملی تعبیر ہے۔ اگر سائنس کائنات کے قوانین دریافت کرتی ہے تو دین ان قوانین کے پس منظر میں موجود حکمت اور مقصد واضح کرتا ہے۔

یوں یہ دونوں راستے بظاہر جدا دکھائی دینے کے باوجود درحقیقت ایک ہی منزل کی طرف رواں ہیں، ایک حقیقت کی تلاش، ایک معنویت کی دریافت۔

جب یہ دونوں زاویے ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو علم اپنی مکمل صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ مشاہدہ، تفکر سے مربوط ہوتا ہے اور تفکر، مشاہدے کو معنیٰ عطا کرتا ہے۔ عقل کائنات کے اسرار کھولتی ہے اور وحی ان اسرار کی سمت متعین کرتی ہے۔ اس طرح تحقیق اندھی نہیں رہتی اور عقیدہ جامد نہیں بنتا بلکہ دونوں ایک متوازن شعور کی تشکیل کرتے ہیں۔ درحقیقت یہی وہ ہم آہنگی ہے جو انسان کو محض مادی ترقی تک محدود نہیں رہنے دیتی بلکہ اسے ایک بامقصد وجود میں ڈھال دیتی ہے۔ جب دریافت کے ساتھ ادراک اور علم کے ساتھ حکمت شامل ہو جائے تو انسان نہ صرف کائنات کے حقائق سمجھتا ہے بلکہ اپنی حیثیت اور ذمہ داری بھی پہچان لیتا ہے۔ یہی وہ جامع بصیرت ہے جو علم کو روشنی میں بدل دیتی ہے اور تحقیق کو عبادت کا درجہ عطا کر دیتی ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک ایسا تعلیمی و فکری نظام تشکیل دیں جس میں مدرسہ اور یونیورسٹی کے درمیان خلیج ختم ہو۔ جہاں طالبِ علم قرآن بھی سمجھے اور کائنات بھی، حدیث بھی پڑھے اور سائنس بھی، فقہ کی باریکیوں سے بھی واقف ہو اور ریاضیات و طبیعیات کی گہرائیوں سے بھی آشنا ہو۔ ایسا نظام جہاں علم کی تقسیم نہیں بلکہ اس کی تکمیل مقصود ہو اور جہاں نصاب محض معلومات کا مجموعہ نہیں بلکہ فہم و بصیرت کا سرچشمہ بن جائے۔ یہی وہ تعلیمی فضا ہوگی جہاں ایک طالبِ علم صرف متون کا حافظ نہیں بلکہ صاحبِ شعور و ادراک بن کر ابھرے گا، جو آیاتِ قرآنیہ کی تلاوت بھی کرے اور کائنات کی نشانیاں بھی پڑھ سکے، جو حدیث کے دقائق بھی سمجھے اور تجربہ گاہ میں تحقیق کے مراحل سے بھی گذرے۔ اس کی نگاہ میں مسجد اور تجربہ گاہ دو الگ الگ دنیا نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو مظاہر ہوں گے۔ جب ایسا توازن پیدا ہوگا تو علم نہ صرف ذہنی بالیدگی کا ذریعہ بنے گا بلکہ اخلاقی و روحانی تربیت کا بھی ضامن ہوگا۔ ایک ایسی نسل تیار ہوگی جو تحقیق میں بھی مضبوط ہو اور کردار میں بھی، جو استدلال میں بھی پختہ ہو اور احساسِ ذمہ داری میں بھی گہری۔

درحقیقت یہی وہ جامع تعلیمی تصور ہے جو امت کو فکری انتشار سے نکال کر ایک متحد اور باوقار سمت دے سکتا ہے، ایسی سمت جہاں علم، عمل اور حکمت ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک روشن مستقبل کی بنیاد رکھیں۔ یہی وہ جامعیت ہے جو ایک متوازن، باخبر اور باوقار امت کی تشکیل کر سکتی ہے۔

مجلہ ''الکوثر'' اپنے قارئین، اہلِ قلم اور اربابِ دانش سے یہ اپیل کرتا ہے کہ وہ امام احمد رضا کی علمی میراث کو محض عقیدت کے دائرے تک محدود نہ رکھیں بلکہ اسے ایک زندہ فکری تحریک کے طور پر آگے بڑھائیں۔ ان کے سائنسی و تحقیقی افکار کو نئے اسلوب میں مرتب

کیا جائے، ان پر جامعات میں تحقیق ہو اور نئی نسل کو یہ بتایا جائے کہ اسلامی علمی روایت کس قدر ہمہ گیر اور زرخیز رہی ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس سے ایک عظیم علمی ورثہ ماضی کی یادگار بن کر نہیں رہتا بلکہ حال کی رہنمائی اور مستقبل کی تعمیر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اسی تسلسل میں ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ ان کی تصانیف کو موضوعاتی ترتیب کے ساتھ جدید زبان و اسلوب میں پیش کیا جائے، تحقیقاتی مراکز قائم ہوں، علمی سیمینار اور کانفرنسیں منعقد ہوں اور ان کے افکار کو عالمی علمی حلقوں تک پہنچایا جائے۔ جب ان کی تحقیقات عصرِ حاضر کے علمی معیارات کے مطابق مرتب کی جائیں گی تو ان کی فکری گہرائی اور سائنسی بصیرت مزید نمایاں ہو کر سامنے آئے گی۔

اس کے ساتھ ساتھ نئی نسل کے ذہنوں میں یہ شعور بھی بیدار کرنا ہوگا کہ اسلامی علمی روایت محض مذہبی تعلیمات تک محدود نہیں بلکہ اس میں کائنات کے اسرار، سائنسی حقائق اور انسانی زندگی کے عملی مسائل کا بھی جامع حل موجود ہے۔ امام احمد رضا کی شخصیت اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ ایک سچا عالم زمانے سے کٹا ہوا نہیں بلکہ زمانے کی رہنمائی کرنے والا قائد و رہنما ہوتا ہے۔ درحقیقت اس مضمون کی یہ سطور ایک علمی بیداری کی دعوت ہیں، ایسی دعوت جس میں ماضی کی عظمت حال کی زبان میں زندہ کی جائے اور مستقبل کے افق پر اس کی روشنی پھیلائی جائے۔ یہ مضمون اس امر کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے کہ علم کو دوبارہ ایک وحدت کے طور پر دیکھا جائے، روایت اور تحقیق کے درمیان ایک مضبوط پل تعمیر کیا جائے اور اس فکری ورثے کو از سرِ نو زندہ کیا جائے جس کی نمائندگی امام احمد رضا جیسی عظیم شخصیات کرتی ہیں۔ اگر ہم نے اس سمت میں سنجیدہ پیش رفت کی تو بعید نہیں کہ ہماری علمی روایت ایک بار پھر دنیا کے فکری افق پر اپنی روشنی بکھیرے، اور یہ روشنی محض ماضی کی یاد نہ ہو بلکہ مستقبل کی رہنمائی بھی بنے۔

یہ حقیقت اپنی پوری معنویت کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے کہ ہماری علمی روایت کی اصل قوت اسی ہمہ گیری میں مضمر ہے جس کی روشن مثال ہمیں علمائے متقدمین دورِ حاضر کے علمائے کرام بالخصوص امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کی فکر و نظر میں ملتی ہے۔ انہوں نے جس وقار، توازن اور بصیرت کے ساتھ مذہبیات اور عصریات، دونوں میدانوں میں اپنی نمائندگی کا حق ادا کیا، وہ محض ایک شخصی کمال نہیں بلکہ ایک مکمل علمی منہج کی نشاندہی ہے۔ ان کی علمی زندگی ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ دین اور دنیا کی تقسیم دراصل ایک فکری مغالطہ ہے، حقیقت میں یہ دونوں ایک ہی شعور کے دو پہلو ہیں۔ انہوں نے فقہ و حدیث کی گہرائیوں میں اترتے ہوئے بھی ریاضیات، فلکیات اور دیگر سائنسی علوم سے اپنا رشتہ قائم رکھا اور یوں یہ ثابت کیا کہ ایک سچا عالم وہی ہے جو اپنے عہد کے تقاضوں سے باخبر ہو کر وحی کی روشنی میں ان کی رہنمائی کرے۔ آج کی علمی دنیا، جو ایک طرف تخصص کی فراوانی اور دوسری طرف فکری انتشار کی شکار ہے، اس امر کی شدید محتاج ہے کہ وہ اس متوازن منہج سے رہنمائی حاصل کرے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم امام احمد رضا اور ان جیسے دیگر اکابر علمائے اہل سنّت کی علمی میراث کو محض عقیدت کے دائرے میں محدود نہ رکھیں بلکہ اسے ایک زندہ فکری سرمایہ سمجھ کر اپنے تعلیمی اور تحقیقی نظام کا حصہ بنائیں۔ ان کے افکار کو جدید اسلوب میں پیش کیا جائے ان پر سنجیدہ تحقیق ہو اور نئی نسل کو یہ باور کرایا جائے کہ اسلامی علمی روایت نہ صرف روحانی گہرائی رکھتی ہے بلکہ سائنسی اور عقلی وسعتوں کی بھی حامل ہے۔

یوں جب ہم اس ورثے سے حقیقی استفادہ کریں گے تو نہ صرف مذہبیات اور عصریات کے درمیان موجود خلیج کم ہو گی بلکہ ایک ایسا متوازن علمی شعور پروان چڑھے گا جو انسان کو محض معلومات کا امین نہیں بلکہ حکمت کا حامل بنائے گا۔ یہی وہ راستہ ہے جس سے ہم اپنی علمی شناخت از سرِ نو مستحکم کر سکتے ہیں اور دنیا کے فکری افق پر ایک باوقار اور مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

□□□□

محمد ملک الظفر سہسرامی

اختلاف سے اعتراف تک

اعلیٰ حضرت کی فقہی بصیرت کی ہمہ گیر شہادت

(مخالفین کی شہادتوں کی روشنی میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی فقہی عظمت کا مطالعہ)

علمی دنیا میں بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کا قد ان کے ماننے والوں کے کلمات سے نہیں بلکہ ان کے مخالفین کے اعتراف سے ناپا جاتا ہے۔

کیونکہ محبت میں مبالغے کا احتمال رہتا ہے مگر اختلاف میں صداقت کی جھلک زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ ایسے اعترافات دراصل تاریخ کے وہ روشن اوراق ہوتے ہیں جن پہ تعصب کی گرد نہیں جمتی بلکہ انصاف کی روشنی جھلملاتی ہے۔ جب کوئی مخالف، دل کی دیواریں عبور کر کے علم و فضل کی گواہی دیتا ہے تو وہ محض ایک جملہ نہیں ہوتا بلکہ ایک عہد کی فکری شہادت بن جاتا ہے۔ اس اعتراف میں نہ وابستگی کا دباؤ ہوتا ہے، نہ عقیدت کی شدت بلکہ صرف حقیقت کا وزن بولتا ہے۔ یوں یہ کلمات علمی عظمت کے ایسے سنگِ میل بن جاتے ہیں جنہیں زمانہ مٹانے کی کوشش کرے تو تاریخ انہیں مزید نمایاں کر دیتی ہے۔

ایسی شخصیات دراصل علم کے آفتاب کی مانند ہوتی ہیں ان کی روشنی اپنے ماننے والوں کے گھروں تک محدود نہیں رہتی بلکہ مخالف سمتوں میں بھی پھیلتی ہے۔ اختلاف کے بادل جتنے گہرے ہوں، ان کی علمی کرنیں اتنی ہی واضح دکھائی دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مخالفین کے اعترافات گویا حق کی وہ خموش اذان ہوتے ہیں جو دلوں کو متوجہ کرتی اور حقیقت کو روشن کرتی رہتی ہے۔

اختلاف کی فضا میں بھی جب احترام کی شمعیں فروزاں ہونے لگیں، تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ وہاں علم اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہ چراغ محض الفاظ سے نہیں جلتے بلکہ کردار کی روشنی، فکر کی گہرائی اور اخلاص کی حرارت سے منور ہوتے ہیں۔ جب کسی شخصیت کے گرد احترام کا ہالہ قائم ہوتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہاں فکر و آگہی نے محض ذہنوں کو نہیں بلکہ دلوں کو بھی مسخر کر لیا ہے۔ ایسا احترام وقت کی گرد سے مدھم نہیں پڑتا بلکہ ہر گذرتے لمحے کے ساتھ اور نکھرتا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ رسمی تعظیم نہیں ہوتی بلکہ معرفت کی بنیاد پہ قائم ہونے والی وہ خموش عقیدت ہوتی ہے جو اہلِ محبت کے دلوں میں خود بخود جگہ بنا لیتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ علم کی قندیل روشن ہوتی ہے تو اس کی لو سے ادب کے چراغ خود بخود تابناک ہو جاتے ہیں۔ جہاں علم کی یہ روشنی پھیلتی ہے وہاں گفتگو میں وقار آتا ہے، اختلاف میں بھی شائستگی پیدا ہوتی ہے اور زبان میں نرم لہجہ اتر آتا ہے۔ یہی وہ فضا ہوتی ہے جس میں احترام کا ہر چراغ ایک نئی معنویت کے ساتھ جلتا ہے اور اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہاں علم صرف پڑھایا نہیں گیا بلکہ کردار میں اتارا گیا ہے۔

یہی کیفیت اس وقت سامنے آتی ہے جب ہم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی علمی و فقہی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں۔

آپ کی ذات ایک ایسے عہد میں ابھری جب فکری اختلافات اپنی شدت پہ تھے، مسالک کے درمیان مناظرانہ فضا غالب تھی اور علمی مباحث اکثر تعصب کی دبیز تہوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ اس ماحول میں قلم اکثر تلوار کا کردار ادا کرتا ہے اور دلیل کی جگہ جذبات کی گونج

سنائی دیتی ہے۔ اختلاف رائے کو علمی وسعت کا دروازہ سمجھنے کی بجائے اکثر اسے نزاع کی بنیاد بنالیا جاتا ہے اور یوں حقیقت کی آواز مباحثوں کے شور میں کہیں دب سی جاتی ہے۔ ایسے پرآشوب زمانے میں آپ کی شخصیت ایک معتدل روشنی کی طرح سامنے آئی۔ آپ نے اختلاف کو دشمنی میں بدلنے نہیں دیا بلکہ اسے فہم کی توسیع کا ذریعہ بنایا۔ آپ کی گفتگو میں دلیل کی متانت بھی ہے اور ادب کی نرمی بھی اسی لیے آپ کے کلمات میں شدت کی جگہ توازن کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔

آپ نے یہ ثابت کیا کہ علم کا اصل وقار اس میں نہیں کہ وہ مخالف کو مغلوب کردے بلکہ اس میں ہے کہ وہ حقیقت واضح کردے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کی تحریریں اور تقاریر مناظرانہ فضا میں بھی سکون کی لہر پیدا کرتی تھیں۔ اختلاف باقی رہتا تھا مگر لہجہ نرم ہو جاتا تھا اور بحث جاری رہتی تھی مگر دلوں میں کشادگی پیدا ہو جاتی تھی۔

یوں آپ کی ذات اس عہد میں ایک ایسی علمی پناہ گاہ بن گئی جہاں تعصب کی سختی پگھلتی اور فہم کی نئی راہیں کھلتی تھیں۔ آپ نے اپنے طرزِ بیان سے یہ پیغام دیا کہ علم کی روشنی جب اخلاص کے آئینے میں منعکس ہوتی ہے تو وہ اختلاف کی تاریکیوں کو بھی اجالے میں بدل دیتی ہے۔

اس ماحول میں بھی آپ کی فقہی بصیرت، دقتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ نے ایسا نور پیدا کیا کہ اختلاف کرنے والے بھی اس روشنی سے بے نیاز نہ رہ سکے۔ یہ اعترافات دراصل اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ علم جب خلوص، تحقیق اور استنباط کی قوت سے آراستہ ہو تو وہ دلوں کی دیواریں عبور کر لیتا ہے۔

آپ کے استدلال کی مضبوطی نے بحث کو محض مناظرہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے فہم کی ایک سنجیدہ روایت میں بدل دیا۔ آپ کے دلائل میں حوالہ بھی تھا، گہرائی بھی اور اندازِ بیان میں ایسی شائستگی کہ اختلاف کرنے والا بھی احترام کے دائرے سے باہر نہ نکل پاتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آپ کے الفاظ میں تحقیق کا اجالا اور اخلاص کی حرارت ایک ساتھ جلوہ گر ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ آپ کی علمی کاوشیں صرف اپنے حلقۂ اثر تک محدود نہ رہیں بلکہ مخالف سمتوں میں بھی ان کی بازگشت سنائی دی۔ مخالفین نے جب آپ کی قوتِ استنباط کی گہرائی، فقہی ترتیب کی نفاست اور اصولی توازن کی پختگی دیکھی تو انکار کی گنجائش سمٹتی چلی گئی اور انہیں خود اعترافِ حقیقت کی دہلیز پہ جھکنا پڑا۔ اس طرح آپ کی ذات ایک ایسی علمی حقیقت بن گئی جسے رد کرنا ممکن نہ رہا اور جس کی روشنی سے انکار بھی دراصل انہی اجالوں کا اقرار بن گیا۔

یوں آپ کی فقہی بصیرت نے یہ پیغام دیا کہ علم جب اخلاص کی بنیاد پہ استوار ہو تو وہ صرف ذہنوں کو قائل نہیں کرتا بلکہ دلوں کو بھی مطمئن کر دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اختلاف کی دیواریں کمزور پڑ جاتی ہیں اور حقیقت کا نور ہر سمت پھیلنے لگتا ہے، گویا علم خود اپنی گواہی بن کر زمانے کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔

اس مضمون میں انہی اہلِ اختلاف کے تأثرات کو بنیاد بنا کر اعلیٰ حضرت کی فقہی عظمت کا ایک ایسا نقش ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں صرف محبت کی وابستگی نہیں بلکہ اعتراف کی گواہی بھی شامل ہے۔ یہ سطور اسی احساس کے ساتھ پیش کی جارہی ہیں کہ اختلاف سے اعتراف تک کا یہ سفر دراصل علم کی سربلندی اور شخصیت کی ہمہ گیری کا مظہر ہے۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی فقہی بصیرت اختلاف سے اعتراف تک کا سفر طے کرتی نظر آتی ہے۔

اختلاف سے اعتراف تک

اسی پس منظر میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی علمی شخصیت ایک روشن مثال بن کر سامنے آتی ہے۔

برصغیر کے علمی افق پہ بعض شخصیات اس انداز سے ابھرتی ہیں جن کی موجودگی خود ایک معیار بن جاتی ہے۔ آپ کی ذات بھی انہی روشن میناروں میں شمار ہوتی ہے۔

آپ کی گفتگو میں دلیل کی ایسی متانت تھی کہ مباحثہ کشمکش کی صورت اختیار کرنے کی جگہ فہم کی ایک سنجیدہ مجلس بن جاتا تھا۔ آپ

کے استدلال میں مآخذ کی ثقاہت، فکر کی وسعت اور اندازِ بیان کی شائستگی اس طرح ہم آہنگ نظر آتی ہے کہ اختلاف بھی احترام کے حصار سے باہر نہیں جا پاتا۔ آپ گفتگو کو اس قرینے سے آگے بڑھاتے کہ سننے والا دلیل کی قوت سے قائل ہو یا نہ ہو، طرزِ گفتگو کی نفاست سے ضرور متأثر ہوتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے الفاظ میں تحقیق کی سنجیدگی، اخلاص کی حرارت اور مکالمے کی تہذیبی لطافت بیک وقت جھلملاتی ہے اور مجلسِ بحث علم و وقار کی ایسی فضا میں ڈھل جاتی ہے جہاں اختلاف بھی خیر کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور گفتگو فہم کے نئے دریچے وا کر دیتی ہے۔

آپ جب کسی مسئلے پہ گفتگو کرتے تو الفاظ میں توازن کی ایسی دلکشی ہوتی کہ شدت بھی اعتدال کا روپ دھار لیتی۔ آپ کی تحریروں میں اصولی استقامت کے ساتھ فکری کشادگی بھی نمایاں رہتی، جس سے قاری کو یہ احساس ہوتا کہ یہاں علم کسی خاص فکر کا محافظ نہیں بلکہ حقیقت کا ترجمان ہے۔ اسی لیے آپ کے دلائل صرف قائل نہیں کرتے تھے بلکہ ایک نئی جہت بھی عطا کرتے تھے۔

اختلاف کی فضا میں بھی آپ کا انداز ایسا تھا جیسے شور میں کوئی نرم نغمہ سنائی دے۔ نہ آپ نے دلیل کی قوت کم ہونے دی اور نہ ادب کی نزاکت مجروح ہونے دی۔ یہی توازن آپ کی علمی شخصیت کا امتیاز بن گیا۔ نتیجتاً بحث کا رخ تصادم سے ہٹ کر تفہیم کی طرف مڑ جاتا اور مناظرہ مکالمہ بن کر علمی روایت کو نئی معنویت عطا کرتا۔

یوں آپ کی فکر نے برصغیر کی علمی روایت میں ایک ایسی خوشگوار لہر پیدا کی جس میں دلیل کا وقار بھی محفوظ رہا اور احترام کی خوشبو بھی باقی رہی۔ آپ کی تحریریں آج بھی یہ پیغام دیتی ہیں کہ جب علم اخلاص کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے تو اختلاف بھی روشنی میں ڈھل جاتا ہے اور گفتگو دلوں کو قریب لانے کا وسیلہ بن جاتی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ آپ کی علمی کاوشیں صرف اپنے حلقۂ اثر تک محدود نہ رہیں بلکہ مخالف سمتوں میں بھی ان کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ مخالفین نے جب آپ کی استنباطی قوت، فقہی ترتیب اور اصولی توازن دیکھے تو انہیں اعترافِ حقیقت پہ مجبور ہونا پڑا۔

آپ کی ذات ایک ایسی علمی صداقت بن کر ابھری کہ اسے رد کرنے کی گنجائش باقی نہ رہی اور انکار کی ہر کوشش بھی اسی نور کے اعتراف میں ڈھلتی چلی گئی۔

یہ اعترافات محض رسمی کلمات نہ تھے بلکہ فکر کی گہرائی سے اٹھنے والی وہ شہادتیں تھیں جو دل کی عدالت میں ثبت ہو جاتی ہیں۔ جب اختلاف رکھنے والے بھی آپ کی تحقیق کی وسعت اور استدلال کی پختگی محسوس کرتے تو ان کے لہجے میں خود بخود نرمی آ جاتی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ دلیل کی روشنی نے تعصب کی دیواروں میں دراڑ ڈال دی ہے۔

آپ کی علمی شخصیت کی یہی تاثیر تھی کہ مخالفت بھی احترام کے دائرے میں رہ کر کی جاتی تھی۔ ناقدین نے اختلاف ضرور کیا مگر آپ کی علمی دیانت، اصولی استقامت اور فقہی بصیرت کا اعتراف کیے بغیر وہ بھی نہ رہ سکے۔ اس طرح آپ کا مقام صرف ایک مکتبِ فکر تک محدود نہ رہا بلکہ وسیع علمی منظر نامے پہ ایک مشترکہ حوالہ بن گیا۔

آپ کی ذات اس حقیقت کی روشن مثال بن گئی کہ جب علم اخلاص، تحقیق اور انصاف کے ساتھ جلوہ گر ہو تو وہ دلوں کو قریب لاتا ہے اور ذہنوں کو کشادہ کرتا ہے۔ اختلاف باقی رہتا ہے مگر اس کی حدیں نرم ہو جاتی ہیں اور روشنی ایسی پھیلتی ہے کہ انکار کرنے والا بھی اسی اجالے میں اپنی بات کہنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔

آپ کی فقہی بصیرت نے یہ پیغام دیا کہ علم جب اخلاص کی بنیاد پہ استوار ہو تو وہ صرف ذہنوں کو قائل نہیں کرتا بلکہ دلوں کو بھی مطمئن کر دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اختلاف کی دیواریں کمزور پڑ جاتی ہیں اور حقیقت کا نور ہر سمت پھیلنے لگتا ہے، گویا علم خود اپنی گواہی بن کر زمانے کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور روشنی ایسی پھیلتی ہے کہ انکار کرنے والا بھی اسی اجالے میں اپنی بات کہنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جو ان کی علمی عظمت کو مزید تابناک بنا دیتا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی فقہی ژرف نگاہی کا اندازہ اس وقت اور بھی واضح ہو جاتا ہے جب مختلف مکاتبِ فکر کے علماء ان کے

مقامات علمی تسلیم کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ اعترافات اس بات کی علامت ہوتے ہیں کہ یہاں شخصیت کا وقار محض وابستگی کا نتیجہ نہیں بلکہ علمی حقیقت کا مظہر ہے۔ جب اہلِ علم اپنے اپنے زاویہ نظر کے باوجود کسی ایک مرکز پہ متفق دکھائی دیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہاں تحقیق کی بنیادیں نہایت مضبوط ہیں۔ آپ کے فقہی استنباط میں اصول کی پختگی بھی تھی اور فروع کی باریکی بھی۔ یہی جامعیت تھی جس نے آپ کی آراء کو محدود حلقوں سے نکال کر وسیع علمی منظرنامے میں نمایاں کر دیا۔ مخالف مکاتب فکر کے علماء نے جب آپ کے دلائل کی ترتیب، نصوص پہ گہری نظر اور مسائل کے حل میں اعتدال دیکھا تو انہیں اعترافِ حقیقت سے گریز ممکن نہ رہا۔ یوں آپ کی فقہی بصیرت اختلاف کی سرحدوں سے آگے بڑھ کر مشترکہ علمی سرمایہ بن گئی۔

یہ منظر اس وقت اور بھی دلکش ہو جاتا ہے جب اختلاف رکھنے والے لبوں پہ بھی احترام کے چراغ روشن ہونے لگے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا علم محض معلومات کا ذخیرہ نہ تھا بلکہ فہم دین کی وہ روشن تعبیر تھا جس میں اخلاص کی حرارت اور تحقیق کی روشنی یکجا ہوگئی تھی۔ نتیجتاً آپ کی شخصیت ایک ایسے علمی مینار کی صورت اختیار کرگئی جس کی طرف مختلف سمتوں سے آنے والے قافلے بھی رہنمائی حاصل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

مخالفین کی شہادتیں:

اب ان اعترافات کا جائزہ لیا جائے جنہوں نے اختلاف کو علمی شہادت میں بدل دیا۔

چنانچہ مولوی نظام الدین احمد پوری (وہابی) جیسے عالم، جو فکری طور پہ جداگانہ رجحان رکھتے تھے، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علامہ شامی اور صاحب ''فتح القدیر'' مولانا کے شاگرد ہیں، یہ تو امام اعظم ثانی معلوم ہوتے ہیں'' (حوالہ: سوانح سراج الفقہا از علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری، مطبوعہ لاہور ۱۳۹۲ھ، صفحہ ۳۴)

یہ اعتراف دراصل اس بات کی علامت ہے کہ فقہی بصیرت نے اختلاف کی سرحدیں عبور کر کے خود کو ایک مسلمہ علمی حقیقت کے طور پہ منوالیا تھا۔

یہ جملہ محض تعریفی کلمات نہیں بلکہ فقہی دنیا میں ایک بڑے اعتراف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے پس منظر میں وہ علمی وزن پوشیدہ ہے جو کسی شخصیت کا علمی وفکری مقام محض جذباتی وابستگی سے بلند کر کے تحقیق کی کسوٹی پہ ثابت کر دیتا ہے۔ جب ایسے الفاظ اہلِ علم کی زبان سے ادا ہوتے ہیں تو وہ ایک مستقل شہادت بن جاتے ہیں، جسے تاریخ اپنے محفوظ اوراق میں ثبت کر لیتی ہے۔ یہ اقرار دراصل اس بات کا مظہر ہوتا ہے کہ یہاں علم نے اپنی قوت سے دلائل کی دنیا کو متاثر کیا ہے۔ اس میں نہ مبالغے کی گنجائش رہتی ہے اور نہ رسمی تعریف کا پہلو غالب ہوتا ہے بلکہ حقیقت اپنی سادہ مگر پُراثر صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یوں ایک مختصر جملہ بھی اپنے دامن میں علمی عظمت کی ایسی گہرائی رکھتا ہے جو طویل بیانات پہ بھاری پڑ جاتی ہے۔ اسی لیے ایسے کلمات پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف تعریف نہیں بلکہ ایک فکری دستاویز ہے، جس میں ایک عہد کی علمی رائے محفوظ ہوگئی ہے۔ یہ جملہ گویا علم کے اُس مقام کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں اختلاف کی سرحدیں دھندلا جاتی ہیں اور حقیقت کا نور سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔

فقہی بصیرت کی جامعیت:

''امام اعظم ثانی'' کا لقب اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی فقہی بصیرت میں وہ جامعیت موجود تھی جو بڑے مجتہدین کی پہچان سمجھی جاتی ہے۔ یہ لقب دراصل اس امر کی علامت ہے کہ آپ کی نگاہ صرف جزئی مسائل تک محدود نہ تھی بلکہ اصول وفروع کے باہمی ربط کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ آپ کے استنباط میں روایت کی مضبوطی بھی تھی اور اجتہادی بصیرت کی تازگی بھی، جس نے آپ کے علمی مقام کو غیر معمولی بنا دیا۔ یہ جامعیت اس انداز میں نمایاں ہوتی ہے کہ آپ کسی مسئلے پہ گفتگو کرتے تو نصوص کی روشنی، ائمہ کی آراء، اصولی قواعد اور عملی تقاضے سب کچھ

ایک مربوط ترتیب میں پیش کرتے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ فقہ آپ کے سامنے ایک منتشر ذخیرہ نہیں بلکہ ایک زندہ اور مربوط نظام کی صورت میں موجود ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو بڑے مجتہدین کے اسلوب کی پہچان بنتی ہے اور جس نے آپ کی فقہی فکر کو دوام عطا کیا۔

اس لقب میں ایک اور معنوی لطافت بھی پوشیدہ ہے کہ آپ نے اپنے عہد کے پیچیدہ مسائل اسی اعتماد اور توازن کے ساتھ حل کیے جس طرح اکابر مجتہدین نے اپنے زمانے میں کیے تھے۔ آپ کی فقہی بصیرت نے یہ واضح کر دیا کہ جب علم اصول کی بنیاد پہ استوار ہو اور تحقیق کی روشنی سے منور ہو تو وہ زمانے کے بدلتے تقاضوں میں بھی اپنی رہنمائی برقرار رکھتا ہے۔ یوں "امام اعظم ثانی" کا خطاب صرف ایک اعزاز نہیں بلکہ آپ کی علمی جامعیت اور فقہی ژرف نگاہی کا ایک زندہ اعتراف بن کر سامنے آتا ہے۔ اس اعتراف میں نہ جذبات کی آمیزش ہے اور نہ مسلکی وابستگی کی رنگ آمیزی بلکہ یہ خالص علمی مشاہدہ ہے جو ان کا استنباطی کمال نمایاں کرتا ہے۔ اسی طرح دیوبندی مکتب فکر کے ایک عالم، سید زکریا شاہ صاحب بنوری پیشاوری، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی فقہی خدمات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اگر اللہ تبارک وتعالیٰ ہندوستان میں احمد رضا خاں بریلوی کو نہ پیدا فرماتا تو ہندوستان میں حنفیت ختم ہو جاتی''

(حوالہ: امام احمد رضا کی فقہی بصیرت، مطبوعہ دار القلم دہلی، صفحہ ۳۲)

ان الفاظ میں صرف شخصی مدح نہیں بلکہ ایک عہد کی فقہی ضرورت اور اس کے جواب میں ابھرنے والی علمی قیادت کا اعتراف پوشیدہ ہے۔

یہ جملہ دراصل اس عہد کی فقہی صورتِ حال کا آئینہ دار ہے۔ اس میں اُس زمانے کی علمی کشمکش، سوالات کی کثرت اور مسائل کی پیچیدگیوں کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ گویا یہ الفاظ محض ایک فرد کی تعریف نہیں بلکہ اس پورے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں جس میں فقہی بصیرت کو نئی آزمائشوں کا سامنا تھا۔

اس آئینے میں ہمیں وہ منظر بھی دکھائی دیتا ہے جہاں روایت اپنی اصل شان کے ساتھ موجود تھی مگر زمانے کے تقاضے نئے سوالات اٹھا رہے تھے۔ ایسے میں جس شخصیت کے بارے میں یہ جملہ کہا گیا، اس نے محض جواب نہیں دیے بلکہ فقہ کے اصولی ڈھانچے کو زندہ رکھتے ہوئے مسائل کی نئی جہات سمجھنے کا راستہ بھی دکھایا۔ یہ کلمات اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ اُس عہد میں علمی رہنمائی کی ضرورت کس قدر شدید تھی اور کس انداز سے اسے پورا کیا گیا۔

اسی لیے یہ جملہ پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ یہ تاریخ کے اوراق پہ درج ایک مختصر مگر بامعنیٰ تبصرہ ہے۔ اس میں نہ صرف ایک علمی شخصیت کا مقام روشن ہوتا ہے بلکہ اس دور کی فکری ضرورتیں بھی واضح ہو جاتی ہیں۔ یہ الفاظ گویا ایک ایسا آئینہ بن جاتے ہیں جس میں عہد کی علمی فضا، فقہی مباحث کی نوعیت اور تحقیق کی ضرورت ایک ساتھ جھلکتی نظر آتی ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے جس قوت فکری کے ساتھ فقہِ حنفی کی ترجمانی کی، مسائل کی توضیح پیش فرمائی اور نئے پیش آمدہ سوالات کے جوابات دیے، اس نے فقہی روایت کو نئی توانائی عطا کی۔ آپ کی تحریروں میں یہ احساس نمایاں تھا کہ فقہ محض ماضی کا سرمایہ نہیں بلکہ حال اور مستقبل کی رہنمائی کا زندہ سرچشمہ ہے۔ آپ نے اصول کی پاسداری کے ساتھ مسائل کی تطبیق کا ایسا متوازن انداز اختیار کیا کہ روایت کی بنیادیں بھی مضبوط رہیں اور زمانے کے تقاضے بھی پورے ہوتے گئے۔

آپ کے جوابات میں نصوص کی روشنی بھی جھلکتی تھی اور فقہی قواعد کی ترتیب بھی۔ یہی وجہ تھی کہ پیچیدہ مسائل بھی آپ کے قلم سے وضاحت کی ایسی صورت میں سامنے آتے کہ قاری کو الجھن کی بجائے اطمینان حاصل ہوتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آپ فقہ کے منتشر گوشوں کو یکجا کر کے ایک مربوط اور زندہ نظام کی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ اس علمی خدمت نے فقہی روایت میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ طلبہ کو تحقیق کا نیا ذوق ملا، اہلِ علم کو استنباط کی نئی جہتیں نظر آئیں اور عام لوگوں کو مسائلِ دین میں واضح رہنمائی حاصل ہوئی۔ نتیجتاً فقہِ حنفی کی وہ

درخشاں روایات، جو صدیوں سے علمی حلقوں کی زینت تھیں، آپ کی کاوشوں سے مزید تابناک ہو کر ابھریں اور اس نے ایک بار پھر اپنی ہمہ گیر رہنمائی کا ثبوت پیش کیا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے فتاوے محض جزوی مسائل کا حل نہیں بلکہ ایک مضبوط فقہی نظام کی تجدید کا مظہر ہیں۔ ان میں مسئلہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اصول کی بنیاد بھی واضح کی جاتی ہے، تا کہ حکم وقتی نہ رہے بلکہ آئندہ آنے والے سوالات کے لیے بھی رہنمائی فراہم کرے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے فتاوے میں جزئیات کے اندر کلیات کی جھلک نمایاں طور پہ نظر آتی ہے اور ہر جواب اپنے اندر ایک وسیع فقہی تناظر سموئے ہوتا ہے۔

آپ نے صرف مسائل حل نہیں کیے بلکہ ان کے پس منظر، اصولی بنیاد اور تطبیقی جہات بھی واضح کیں۔ اس سے فقہ ایک جامد ذخیرہ نہیں رہا بلکہ ایک زندہ علمی روایت کی صورت میں سامنے آیا۔ آپ کے فتاوے پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ہر سطر میں تحقیق کی گہرائی، اصول کی پختگی اور استنباط کی مہارت یکجا ہو گئی ہے۔ اسی لیے آپ کے فتاوے کو محض وقتی رہنمائی نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ فقہی فکر کی ایسی تجدید ہیں جس نے روایت کو تازگی بخشی۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے اہلِ علم کو یہ پیغام دیا کہ فقہ کا اصل حسن اسی میں ہے کہ وہ اصول کی روشنی میں نئے حالات کا سامنا کرے اور زمانے کے بدلتے سوالات کے باوجود اپنی بنیادوں پہ قائم رہے۔ یقیناً آپ کے فتاوے ایک علمی سرمایہ بن کر ابھرے جو نہ صرف اپنے عہد کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں بلکہ آنے والے زمانوں کے لیے بھی چراغِ راہ بن جاتے ہیں۔

فکری دنیا کا ایک اور ممتاز نام، جماعت اسلامی کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے علمی مقام کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا احمد رضا خاں صاحب کے علم و فضل کا میرے دل میں بڑا احترام ہے، فی الواقع وہ علوم دینی پر بڑی وسیع نظر رکھتے ہیں۔ اور ان کی اس فضیلت کا اعتراف ان لوگوں کو بھی ہے جو ان سے اختلاف رکھتے ہیں'' (حوالہ: مقالات یوم رضا، حصہ دوم، صفحہ ۳۰)

یہ اظہار اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ علمی وسعت ایسی قوت رکھتی ہے جو اختلاف رکھنے والوں کو بھی احترام کی زبان اختیار کرنے پہ مجبور کر دیتی ہے۔

یہ اظہارِ خیال نہایت معنی خیز ہے۔ یہاں صرف علمی احترام ہی نہیں بلکہ یہ بھی واضح کیا گیا کہ ان کی فضیلت کا اعتراف مخالفین بھی کرتے ہیں۔ گویا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی علمی وسعت ایسی تھی جس نے اختلاف کی دیواریں بھی نرم کر دیں۔ ان کی نظر صرف فقہیات تک محدود نہیں تھی بلکہ علومِ دینیہ کے مختلف شعبوں پہ محیط تھی۔ یہی جامعیت ان کی شخصیت کو منفرد بناتی ہے۔ ان کے یہاں تفسیر کی بصیرت بھی تھی، حدیث کی معرفت بھی، اصولِ فقہ کی گہرائی بھی اور عقائد کی مضبوطی بھی۔ یہ تمام جہات آپس میں اس طرح مربوط تھیں کہ ان کی علمی شخصیت ایک ہمہ گیر نظام کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ جب وہ کسی مسئلے پہ گفتگو کرتے تو محسوس ہوتا کہ مختلف علوم کی روشنیاں ایک ہی نقطے پہ جمع ہو کر رہنمائی فراہم کر رہی ہیں۔ یہی ہم آہنگی ان کے استدلال کو قوت بخشتی اور ان کی آراء کو دوام عطا کرتی تھی۔ اسی جامعیت نے ان کے علم کو وسعت بھی دی اور تاثیر بھی۔ ان کی تحریریں محض معلومات کا ذخیرہ نہیں بلکہ فہمِ دین کی ایک متوازن تعبیر بن کر سامنے آئیں۔ اختلاف رکھنے والے بھی جب اس وسعتِ نظر کا مشاہدہ کرتے تو انہیں یہ تسلیم کرنا پڑتا کہ یہاں علم کسی ایک گوشے میں محدود نہیں بلکہ ایک وسیع افق پہ پھیلا ہوا ہے۔

یقیناً ان کی شخصیت ایک ایسے علمی آفتاب کی مانند بن گئی جس کی کرنیں مختلف علوم کے افق پہ یکساں طور پہ پھیلتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ذکر آتا ہے تو صرف ایک فقیہ کا تصور نہیں ابھرتا بلکہ ایک جامع عالم کی تصویر سامنے آتی ہے، جس کی فکر نے علم کے مختلف دریچے ایک دوسرے سے جوڑ کر ایک روشن اور متوازن روایت کو جنم دیا۔

اسی تسلسل میں ملک غلام علی، جو ابو الاعلیٰ مودودی کے نائب

رہے، اپنے تاثرات میں لکھتے ہیں:

’’حقیقت یہ ہے کہ مولانا احمد رضا خان صاحب کے بارے میں اب تک ہم لوگ سخت غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں۔ ان کی بعض تصانیف اور فتاوے کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جو علمی گہرائی میں نے ان کے یہاں پائی ہے وہ بہت کم علماء میں پائی جاتی ہے اور عشق خدا اور سول تو ان کی سطر سطر سے پھوٹا پڑتا ہے۔‘‘

(حوالہ: ارمغان حرم، مطبوعہ لکھنؤ، صفحہ ۱۴)

یہ اعتراف اس تبدیلی کی نمائندگی کرتا ہے جو براہِ راست مطالعات اور تحقیقات کے نتیجے میں ذہنوں میں پیدا ہوتی ہے۔

یہ اقتباس صرف علمی اعتراف نہیں بلکہ ایک فکری تبدیلی کا اعلان ہے۔ یہاں "غلط فہمی" سے "اعتراف" تک کا سفر بیان ہوا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی تصانیف کا مطالعہ کرنے والا شخص ان کی علمی گہرائی اور روحانی اخلاص دونوں کا قائل ہو جاتا ہے۔ یہ تبدیلی دراصل مطالعات کی وہ تاثیر ہے جو دل و دماغ دونوں پہ یکساں اثر ڈالتی ہے۔ ابتدا میں جو فاصلے شبہات کی بنیاد پہ قائم ہوتے ہیں، وہ تحقیق کی روشنی میں بتدریج کم ہونے لگتے ہیں۔ جب قاری ان کی تحریروں میں دلائل کی ترتیب، حوالوں کی کثرت اور اندازِ بیان کی سنجیدگی دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں قائم شدہ تصورات خود بخود بدلنے لگتے ہیں۔ یوں فکری فاصلے سمٹتے ہیں اور احترام کی ایک نئی فضا جنم لیتی ہے۔

یہاں ایک اور لطیف پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے کہ ان کی تصانیف صرف ذہنی قناعت نہیں دیتیں بلکہ قلبی اطمینان بھی عطا کرتی ہیں۔ علم کی گہرائی کے ساتھ روحانی اخلاص کی جھلک ان تحریروں کو ایک خاص تاثیر بخش دیتی ہے۔ قاری محسوس کرتا ہے کہ یہ الفاظ محض ذہنی مشق کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک سچے دینی درد اور خلوصِ نیت کی ترجمانی ہیں۔ یہی کیفیت غلط فہمی کے پردے ہٹا کر اعتراف کے چراغ روشن کر دیتی ہے۔

یوں یہ اقتباس اس حقیقت کی روشن مثال بن جاتا ہے کہ جب تحقیق دیانت کے ساتھ پیش کی جائے اور علم اخلاص کے ساتھ جلوہ گر ہو تو وہ ذہنوں میں انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ ابتدا میں جو سوالات تھے وہ جوابات میں ڈھل جاتے ہیں اور جو شبہات تھے وہ یقین کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی سفر "غلط فہمی" سے "اعتراف" تک کا وہ معنوی ارتقا ہے جو عظیم علمی شخصیات کے اثر کا سب سے روشن ثبوت ہوتا ہے۔

اجتماعی اعتراف کی معنویت

یہ تمام اقوال یکجا کیے جائیں تو ایک روشن تصویر سامنے آتی ہے۔ یہ تصویر ایک ایسے عالم کی ہے جس کی فقہی بصیرت میں دقت نظری بھی ہے اور وسعت فکری بھی، روایت کی پاسداری بھی ہے اور اجتہادی شعور کی تازگی بھی۔

اس جامعیت نے ان کی علمی شخصیت کو محض ایک مکتب تک محدود نہیں رکھا بلکہ وسیع علمی افق پر نمایاں کر دیا، جہاں مختلف زاویۂ نظر رکھنے والے بھی ان کے علمی مقامات تسلیم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اس تصویر میں ایک ایسی ذہنی ہم آہنگی جھلکتی ہے جس میں اصول کی پختگی اور فروع کی باریکی باہم مربوط نظر آتی ہیں۔ وہ روایات کے امین بھی ہیں اور زمانے کے تقاضوں سے باخبر بھی۔ جب وہ کوئی مسئلہ بیان کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ماضی کی علمی میراث اور حال کی فکری ضرورتیں ایک ہی دھارے میں سمٹ آئی ہیں۔

یہی متوازن امتزاج ان کے استنباط کو قوت دیتا اور ان کی آراء کو استحکام بخشتا ہے۔ یوں یہ تصویر محض ایک فرد کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ ایک زندہ علمی روایت کی ترجمان بن جاتی ہے۔ اس میں فکر کی گہرائی بھی ہے اور اظہار کی شائستگی بھی، تحقیق کی سنجیدگی بھی ہے اور اخلاص کی حرارت بھی۔ یہی ہمہ جہتی ان کی شخصیت کو ایک ایسے علمی مینار کی صورت عطا کرتی ہے جس کی روشنی سے مختلف سمتوں میں سفر کرنے والے بھی رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور جس کی تابانی میں روایت اور تجدید ہم آہنگ ہو کر جلوہ گر دکھائی دیتے ہیں۔

علم اور عشق کا امتزاج

ان کے فتاوے میں نصوص کا احترام بھی ہے اور حالات کی رعایت بھی۔ ان کی تحریروں میں علمی وقار کے ساتھ عشقِ رسول

صلی اللہ علیہ وسلم کی حرارت بھی جھلکتی ہے۔ یہی حسین امتزاج ان کے اسلوب کو ایک خاص انفرادیت عطا کرتا ہے، جہاں فقہ کی سنجیدگی عقیدت کی لطافت سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ حکم بیان ہوتا ہے تو دلیل کی مضبوطی کے ساتھ ساتھ آدابِ بارگاہِ نبوی علیہ التحیۃ والثناء کی خوشبو بھی محسوس ہوتی ہے۔ ان کی عبارتوں میں نہ خشکی ہے اور نہ محض جذباتیت بلکہ ایک متوازن آہنگ ہے جس میں عقل کی روشنی اور محبت کی گرمی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقہ کو صرف قانونی ضابطہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے تعلقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عملی تعبیر کے طور پہ پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فتاوے کا مطالعہ کرنے والا صرف مسئلہ نہیں سمجھتا بلکہ دل میں عقیدت کی ایک نئی کیفیت بھی محسوس کرتا ہے۔

اس توازن نے ان کی تحریروں کو دوام بخشا، نصوص کی پاسداری نے انہیں اصولی استحکام دیا اور حالات کی رعایت نے انہیں زندگی سے جوڑے رکھا۔ نتیجتاً ان کا علمی سرمایہ ایک ایسی روشن روایت بن گیا جس میں تحقیق کی گہرائی بھی ہے اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لطیف حرارت بھی، جو علم کو تاثیر عطا کر کے دلوں کو منور کر دیتی ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی علمی شخصیت کا کمال یہ ہے کہ وہ اختلاف کے ماحول میں بھی اعتراف کی روشنی پیدا کرتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شخصیت مسلکی حدود سے بلند ہو کر علمی تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے۔ ان کے مخالفین کے تأثرات دراصل اس حقیقت کا اعلان ہیں کہ علم کی روشنی جب اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے تو دل خود بخود جھک جاتے ہیں۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ صرف ایک مکتبِ فکر کے نمائندہ نہیں بلکہ فقہِ اسلامی کی تجدیدی روایت کے ایک درخشاں ستون ہیں۔ ان کی فقہی بصیرت نے برصغیر کے علمی منظرنامے کو استحکام بخشا اور مخالفین کے اعترافات نے ان کی عظمت مزید نمایاں کر دی۔

یہی وہ مقام ہے جہاں اختلاف خاموش ہو جاتا ہے اور علم بولنے لگتا ہے۔ جب علم بولتا ہے تو اعتراف خود بخود جنم لیتا ہے۔ اس مرحلے پہ نہ بحث کی حدت باقی رہتی ہے اور نہ تعصب کی سختی، صرف دلیل کی روشنی اور تحقیق کی صداقت باقی رہ جاتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ حقیقت خود اپنے وقار کے ساتھ سامنے آ کھڑی ہوئی ہے اور اختلاف کے تمام پردے از خود ہٹتے جا رہے ہیں۔ علم اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو تو اسے بلند آواز کی ضرورت نہیں رہتی، اس کی خموش تاثیر ہی دلوں کو قائل کر دیتی ہے۔

جب ہم مختلف مکاتبِ فکر کے اہلِ علم کے تأثرات یکجا کرتے ہیں تو ایک ایسی روشن تصویر سامنے آتی ہے جس میں شخصیت نہیں بلکہ ایک عہد بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ تصویر کسی فرد کی مدح سے آگے بڑھ کر ایک علمی روایت کی نمائندگی کرتی ہے، جہاں فکر کی گہرائی، تحقیق کی سنجیدگی اور اخلاص کی روشنی ایک ساتھ جھلکتی ہے۔ اختلاف کے باوجود جب لہجے ہم آہنگ ہو جائیں تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہاں علم نے اپنی صداقت سے سب کو قریب کر دیا ہے۔

یہ اعترافات گویا اس عہد کی اجتماعی علمی رائے بن جاتے ہیں، جن میں تعصب کی جگہ انصاف اور وابستگی کی جگہ تحقیق کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہاں کسی ایک مکتب کی آواز نہیں بلکہ مختلف سمتوں سے آنے والی شہادتیں ہیں جو مل کر ایک ہی حقیقت روشن کرتی ہیں۔ یوں یہ منظر ایک شخصیت کے تعارف سے بڑھ کر ایک پورے علمی عہد کی ترجمانی بن جاتا ہے۔

یہ تصویر ایک ایسے عالم کی ہے جس کی علمی قامت اختلافات کے شور میں بھی وقار کے ساتھ کھڑی نظر آتی ہے، جس کی فقہی بصیرت نے نہ صرف مسائل کا حل پیش کیا بلکہ فکر کو سمت عطا کی اور جس کی تحریروں میں استدلال کی مضبوطی کے ساتھ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حرارت بھی موجزن رہی۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی علمی زندگی گویا ایک ایسا چراغ تھی جو روایت کے ایوان میں بھی روشن تھا اور تحقیق کے افق پر بھی

درخشاں۔ ان کے قلم نے فقہ کو محض جامد اصولوں کا مجموعہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے زندگی کے بدلتے ہوئے سوالات سے ہم آہنگ کیا۔ انہوں نے روایت کی بنیادیں محفوظ رکھتے ہوئے زمانے کی ضروریات سمجھیں اور مسائل کی توضیح ایسے انداز میں پیش کی کہ فقہ ایک زندہ اور متحرک نظام کی صورت میں سامنے آیا۔

ان کے استنباط میں حالات کی نزاکت بھی ملحوظ رہتی اور نصوص کا احترام بھی برقرار رہتا ہے۔ یہی توازن ان کی فقہی بصیرت کا امتیاز بن گیا۔ ان کے فتاوے میں معاشرتی تقاضوں کی جھلک بھی ملتی ہے اور اصولی استحکام کی مضبوطی بھی۔ یوں ان کا قلم ایک ایسے پُل کی مانند بن گیا جس نے صدیوں کی علمی میراث کو موجودہ حالات سے مربوط کر دیا۔

اہلِ اختلاف کے اعترافات اس حقیقت کی شہادت ہیں کہ علم کی اصل قوت دلوں کو مسخر کرنے میں ہے۔ جب ایک عالم کی تحقیق خلوص سے جڑی ہو اور اس کا استنباط دیانت سے عبارت ہو تو اختلاف کی دیواریں نرم پڑ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف فکری دھاروں سے وابستہ اہلِ علم نے بھی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی علمی عظمت کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔

روحانی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کی شخصیت علم اور عشق کا حسین امتزاج تھی۔ ان کے یہاں عقل کی روشنی اور محبت کی حرارت باہم مربوط نظر آتی ہے۔ ان کی تحریروں میں استدلال کی مضبوطی کے ساتھ عقیدت کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ یہی امتزاج ان کے قلم کو محض فقہی تحریر نہیں رہنے دیتا بلکہ اسے روحانی رہنمائی میں بدل دیتا ہے۔

ان کی علمی میراث ایک ایسی خوشبو کی مانند ہے جو وقت کی ہواؤں میں گھل کر بھی اپنی تاثیر برقرار رکھتی ہے۔ ان کی تحریریں گویا گلشنِ علم کے وہ پھول ہیں جن کی مہک دور تک پھیلتی ہے۔ قاری ان کے افکار کا مطالعہ کرتا ہے تو تحقیق کی تازگی اور اخلاص کی لطافت دونوں محسوس کرتا ہے۔

ان کے مخالفین کے اعترافات اس خوشبو کے وہ جھونکے ہیں جو بتاتے ہیں کہ علم جب اخلاص سے وابستہ ہو جائے تو اس کی روشنی ہر سمت پھیلتی ہے۔ یہ اعترافات اس گلشنِ علم کے دور تک پھیلنے والے اثرات ہیں جہاں ایک ہی خوشبو مختلف سمتوں میں محسوس ہوتی ہے۔

یوں یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ یہ اعترافات صرف ایک شخصیت کی عظمت کا بیان نہیں بلکہ اس حقیقت کا اعلان ہیں کہ علمی دنیا میں اصل بلندی وہی ہے جو دلوں کو قریب کر دے، اختلاف کو احترام میں بدل دے اور تحقیق کو روحانیت سے ہم آہنگ کر دے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں علم روشنی بن جاتا ہے، روحانیت حرارت اختیار کر لیتی ہے اور احترام وہ فضا بن جاتا ہے جس میں اختلاف بھی حسن میں ڈھل جاتا ہے۔

یہ تمام شہادتیں اس امر کی وضاحت کرتی ہیں کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی علمی عظمت محض وابستگی کا نتیجہ نہیں بلکہ تحقیق، استنباط اور فقہی بصیرت کی روشن دلیل ہے۔ مختلف مکاتبِ فکر کے اہلِ علم کی متفقہ آراء اس حقیقت کا اعلان ہیں کہ ان کی فکر نے اختلاف کی دیواروں کو عبور کر کے مشترکہ علمی وراثت کی صورت اختیار کر لی۔ ان کی تحریروں میں روایت کی پاسداری، اجتہادی شعور اور عشقِ رسول ﷺ کا حسین امتزاج ایک ایسی روشنی بن کر ابھرتا ہے جو آج بھی رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

یوں ''اختلاف سے اعتراف تک کا یہ سفر'' دراصل علم کی صداقت اور اس کی سربلندی کا سفر ہے۔ یہی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی علمی وراثت ہے، یہی ان کی فقہی بصیرت کا نور ہے اور یہی وہ چراغ ہے جو آج بھی فکر کے افق پہ روشن ہے۔۔۔وہی نور جو اختلاف کے سائے میں بھی اعتراف کی روشنی جگمگا دیتا ہے۔

□□□□

رضویات

مولانا محمد رحمت اللہ صدیقی

دورِ حاضر میں امام احمد رضا کا موقف ہی دین حق ہے

(نورالعارفین)

برصغیر میں فقہ حنفی پہ عمل کرنے والے دو مکتبہ فکر میں تقسیم ہو چکے ہیں، ایک اہلسنّت و جماعت جسے عرفِ عام میں بریلوی کہا جاتا ہے اور دوسرا علمائے دیوبند کے فکری ونظریاتی معتقدین جو دیوبندی کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ ایسی صورت میں حق و باطل کے درمیان امتیاز کے طور پر اہلسنّت و جماعت کے لیے مسلک اعلیٰ حضرت کی تعبیر سب سے بہتر اور مناسب ہے۔ اس سے بہتر اور مناسب کوئی دوسری تعبیر نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی فکر میں پورا دینی اثاثہ آچکا ہے۔ مسلک اعلیٰ حضرت کی اصطلاح وقت کا جبری تقاضا تھا، اسلاف واکابر کے فیصلے میں حکمتیں ہوتی ہیں۔ ان کا فیصلہ وقت کی درست نباضی تھی۔ اس طرح کے فیصلے وقت اور حالات کے تحت ہر دور اور ہر زمانے میں ہوتے رہے ہیں۔ یہ بات کسی خارجی دباؤ یا ذاتی مفاد میں نہیں کہی جارہی ہے بلکہ یہ حقیقت کی بے غبار ترجمانی ہے۔ جس کی ہر آنے والا وقت تائید و توثیق کرے گا۔ کسی شخص کا ذاتی یا خاندانی مفاد میں مسلک اعلیٰ حضرت کی تعبیر سے الجھنا اور اسے مذہب امامِ اعظم کے خلاف غیر مؤثر جدوجہد قرار دینا حقائق سے مذاق ہی سمجھا جائے گا۔

دیوبندیت، وہابیت کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ ہر چند کہ دونوں میں فاصلے روز بروز بڑھتے جارہے ہیں لیکن اعتقادی اعتبار سے دونوں میں بڑی یکسانیت ہے، دونوں محمد ابن عبد الوہاب نجدی، کی فکر سے جڑے ہوئے ہیں۔ چونکہ ہند و پاک کے مسلمان وہابیت کو قبول کرنے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہ تھے بلکہ ابتداً لوگ اسے ایک طرح کی گالی تصور کرتے تھے۔ ملک کے مسلکی حالات اور عوامی ذہنیت کو دیکھتے ہوئے وہابیت دو حصوں میں منقسم ہوگئی، ایک حصہ اپنی پرانی روش پہ قائم رہا اور دوسرا حصہ مذہبِ امامِ اعظم کا خول اپنے اوپر چڑھا لیا۔ تاکہ آسانی کے ساتھ وہابیت کا زہر عوام کے ذہنوں میں منتقل کیا جاسکے۔ اس تقسیم سے وہابیت نے خاطر خواہ فائدہ حاصل کیا اور عوام کے ایک بڑے طبقے کو اپنی فکری آوارگی کے سانچے میں ڈھال لیا۔ وہابیت کی تقسیم کے تعلق سے مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے ملاحظہ کریں۔

کچھ دنوں کے بعد غیر مقلدیت (وہابیت) میں بھی دو فرقے ہوگئے، ایک اسماعیلیہ اور دوسرا اسحاقیہ۔ اسماعیلیہ سے مراد وہ فرقہ ہے جو بدعات ورسوم کی مخالفت کے ساتھ تقلید شخصی کا بھی تارک ہو، جیسا کہ مولوی اسماعیل دہلوی نے ''تقویۃ الایمان'' اور جلاء العینین وغیرہ میں لکھا ہے۔ اسحاقیہ سے مقصود وہ فرقہ ہے جو حنفیت اور تقلید سے انکار نہیں کرتا لیکن بدعات ورسوم کا مخالف ہے۔ لیکن ایک دور ایسا بھی آیا جب اسماعیلیہ غیر مقبول ہوگئے تو مقلدیت حنفیت کی راہ اختیار کر کے اپنے عقائد کی اشاعت کرنے لگے۔ (آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی، ص:۱۶۵)

ڈاکٹر سیّد جمال الدین اسلم صاحب لکھتے ہیں:

''چودھویں صدی ہجری میں بھی ان مسائل کو لے کر جو شاہ اسماعیل دہلوی نے چھیڑ دیئے تھے مباحث جاری رہے، علمائے دیوبند نے شاہ اسماعیل کے عقائد کی تبلیغ واشاعت کا سلسلہ شروع کیا اور اپنی تحریروں میں بعض ایسی عبارتیں شامل کردیں جو عقائد اہلسنّت کے خلاف تھیں حالانکہ دارالعلوم دیوبند کی اساس میں حنفی مذہب کے ساتھ شعارِ وفاداری کی روایت شامل تھی۔ لیکن بالخصوص تصورِ رسالت کو لے

کر فاضل بریلوی نے دیوبند کے ان علماء کا تعاقب کیا جن پر ان کا الزام تھا کہ وہ اہانت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتکب ہیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ علماء دیوبند توبہ ورجوع کریں۔ جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو انہوں نے تکفیر کی۔ دیوبندی علماء امت رسول اللہ سے خارج قرار دیئے گئے اور وہ اور ان کے پیرو وہابی نجدی کہلائے جانے لگے۔ کیونکہ ان کے عقائد وافکار کا ماخذ شاہ اسماعیل دہلوی کے توسط سے دراصل محمد بن عبدالوہاب نجدی تھے۔ نجدیوں، وہابیوں کو جہنم کا مستحق قرار دیا گیا۔'' (برطانوی راج میں مذہب اور سیاست، ص: ۱۵، ۱۶)

خواجہ حسن نظامی دہلوی لکھتے ہیں:

''نجدی وہابیوں اور ہندوستانی وہابیوں میں ایک فرق ہے۔ نجدی وہابی اپنے آپ کو حضرت امام احمد بن حنبل کا مقلد کہتے ہیں، مگر ہندوستانی وہابی کسی امام کو نہیں مانتے اور پوری غیر مقلدی کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اہلِ حدیث کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان کے اہلِ حدیث تو وہابیت کے کوٹھے پر چڑھے ہوئے ہیں مگر کچھ وہابی ایسے بھی ہیں جو ابھی وہابیت کے زینے تک پہنچے ہیں اور تقلید کے قائل ہیں اور ان میں سے بعض چشتیہ خاندان میں پیری مریدی بھی کرتے ہیں ان کو عرفِ عام میں دیوبندی کہا جاتا ہے۔ ایک قسم وہابیوں کی نئی نمودار ہوئی ہے ان کو نیچری وہابی کہنا چاہیے، ان کے بانی مولانا شبلی تھے۔'' (نادان وہابی، ص: ۱۰۵، محبوب المطالع، دہلی)

وہابیت اور دیوبندیت میں فکری ونظریاتی اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک تقلید کی قائل ہے اور دوسری عدم تقلید پہ یقین رکھتی ہے۔ رسول دشمنی اور اسلاف بیزاری دونوں کے خمیر میں شامل ہے۔ یہ بات کسی ذاتی عناد میں نہیں کہی جارہی ہے بلکہ اس کے شواہد سے کتابوں کے دفاتر بھرے ہوئے ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان کی فضا مسلکی اختلافات سے پاک تھی۔ ملک کے مسلمان دو گروہ میں منقسم تھے، ایک اہلسنّت و جماعت اور دوسرا اہلِ تشیع۔ اول الذکر کی آبادی کثیر تھی اور پوری آبادی حنفیت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ دوسرے مذاہب حقہ مثلاً شافعی، مالکی اور حنبلی سے بھی قریب قریب ملک کی زمین خالی تھی۔ ہر سمت اہلسنّت و جماعت کے نعرے گونجتے تھے۔ عشق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے نگاہیں روشن تھیں۔ اولیائے عظام کی عظمتوں کے خطبے پڑھے جاتے تھے۔ عقیدے اور مذہب میں ہم آہنگی دنیا کے دوسرے خطوں کے لیے بھی قابلِ تقلید اور لائق تکریم تھی۔ مسند درس پہ بیٹھے ہوئے علمائے کرام سے لے کر خانقاہوں میں معتکف صوفیائے ذوالاحترام تک سب کے سب دینی، مذہبی اور مسلکی اعتبار سے ہم فکر وہم خیال تھے۔ سلاطین ہند کی تاریخ بھی مسلکی اتحاد کی شہادت پیش کرتی ہے۔ بدعقیدگی کے لیے ہندوستان میں کوئی جگہ نہ تھی۔ ایوانِ شاہی، مدارس، مساجد اور خانقاہوں کی دیواریں رنگ حنفیت سے درخشندہ تھیں۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

اماں ازاں کہ اسلام درآں جا ظاہر شدہ است، وسلاطین اسلام استیلا یافتہ اند ومشائخ عظام واولیاء کرام از اطراف وجوانب تشریف آوردہ اند ومعالم دین واعلام اسلام زماں درتزاید وترقی است، وبرسائر ممالک نہ بہ یک وجہ بلکہ بہ وجوہ مزیت وفضیلت دارد کہ تمام سکان آں از اھل اسلام برعقیدہ حقی اھلسنّت و جماعت اند ونشانے از اھل بدعت وضلالت درآں دیار پیدا نیست، وطریقہ مرضیہ حنفیہ دارند۔

حتی که اگر بالفرض شخصے را مذهب شافعی یا حنبلی داشته باشد، طلبند نه یابند

جس وقت سے یہاں اسلام کا ظہور ہوا، اور سلاطین اسلام کو فتحیابی ہوئی اور مشائخ عظام اور اولیائے کرام کی تشریف آوری ہوئی دینی آثار اور ناموران اسلام میں مسلسل اضافہ ہوا ہے اور دیگر ممالک پر کئی اعتبار سے امتیاز وفوقیت رکھتا ہے کیونکہ ہندوستانی مسلمان اہلسنّت و جماعت کے عقیدہ حقہ پر مضبوطی سے کاربند ہیں اور بددینی اور گمراہی کی کوئی علامت یہاں ظاہر نہیں ہوئی اور تمام لوگ مسلک حنفی کے پیروکار رہیں اور حال یہ ہے کہ کسی شافعی یا حنبلی مسلک والے کو تلاش بھی کیا جائے تو نہ پاسکیں گے۔

(رسالہ ردِّ روافض، ص: ۹ مطبوعہ ادارہ معارفِ نعمانیہ، لاہور)

حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ نے ہندوستان کے مذہبی ماحول کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے:

خوشا ہندوستان و رونق دیں
شریعت را کمال عزو و تمکیں
زبر دستان ہندو گشتہ پامال
فرو دستان ہمہ دردادن مال
بدیں عزت شدہ اسلام منصور
بداں خواری سران کفر مقہور
بہ ذمت گر نہ بودے رخصت شرع
نہ ماندے نام ہندو ز اصل تا فرع
زغزنین تالب دریا دریں باب
ہمہ اسلام بینی برنیکے آب
نہ ترسائے کہ از نا ترسگاری
نہد بربندہ داغ کردگاری
نہ از جنس جہوداں جنگ و جوریت
کہ از قرآں کند دعویٰ بہ توریت
نہ مغ کز طاعت آتش شودشاد
وزو باصد زباں آتش بہ فریاد
مسلمانان نعمانی روش خاص
زدل ہر چار ایں رابہ اخلاص
نہ کیں باشافعی نے مہر بازید
جماعت را و سنت رابہ جاں صید
نہ اہل اعتزالے کز فن شوم
زدیدار خدا گردند محروم
نہ رفض تارسد زاں مذہب بد
جفائے بر وفاداران احمد
نہ زاں سگ خارجی کز کینہ سازی
کند باشیر حق روباہ بازی
زہے ملک مسلمان خیز و دیں جوئے
کہ ماہی نیز سنی خیزد از جوئے (۳۴)

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمہ، حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کے اشعار نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

’’ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد قریب پانچ سو برس تک اہلسنّت و جماعت کی بہاریں رہیں اور کوئی فرقہ بندی نہیں ہوئی لیکن جب خاقانِ اعظم عبداللہ خاں ازبک نے اقلیم خراسان پر حملہ کیا اور اس کی حکومت سنبھالی تو اس نے اہلِ خراسان کے کچھ شیعوں کو قتل کیا اور کچھ کو جلاوطن کیا تو ان میں سے کچھ اہلِ تشیع ہندوستان میں داخل ہوگئے اور بڑی چابک دستی سے اربابِ اقتدار اور سلاطین ہند سے وابستہ ہوگئے اور ہندوستانی عوام کو اپنے باطل نظریات سے گمراہ کرنے لگے، اس طرح ملک خراسان میں تو فتنہ سرد پڑ گیا لیکن ہندوستان میں یہ قیامت خیز فتنہ برپا ہوگیا۔ (ردِّ روافض، ص: ۹، ۱۰)

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمہ کی کتاب رسالہ ’’ردِّ روافض‘‘ کا عربی ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے ’’مقدمۃ السنیۃ شقار الفرقۃ السنیۃ‘‘ کے نام سے کیا ہے جو لوگ شاہ صاحب کا رشتہ وہابیت سے جوڑتے ہیں اس کتاب سے ان کا جھوٹ واضح ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحب ترجمہ کے ذیل میں افادہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

ثم عاش کذالک ذریتھم من بعدھم قرناً بعد قرنٍ لیس فیھم اختلاف ولا تنازع ولا تصیبھم مصیبۃ فی دینھم ولا یختلط بھم من دونھم، کانھم لا یعرفون ان فی الارض عقیدۃٌ غیر عقیدۃ الماتریدیۃ او فقھاً غیر فقہ الحنفیۃ۔ (۲۳)

پھر مسلمانانِ ہند اسی طرح فکر و عمل کی یگانگت کے ساتھ صدیوں تک زندگی گزارتے رہے، نہ ان میں کوئی اختلاف و تنازع تھا نہ ان کے دین میں کوئی مشکل درپیش تھی اور نہ دوسرے عقیدے کے لوگوں کا ان سے کوئی اختلاط تھا گویا کہ وہ یہ جانتے ہی نہ تھے کہ روئے زمین پر عقیدہ ماتریدیہ (اہلِ سنّت و جماعت) کے علاوہ بھی کوئی عقیدہ ہے یا فقہ حنفی کے علاوہ بھی کوئی فقہی مسلک ہے۔

(شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مقدمۃ السنیۃ، ص: ۴۸، ادارہ معارف نعمانیہ، لاہور)

غیر منقسم ہندوستان کی فضا پُرسکون تھی۔ مسلمانوں کے درمیان مذہبی، مسلکی اور مشربی کسی قسم کا کوئی اختلاف نہ تھا۔ شیعوں کی تھوڑی

بہت تعداد تھی لیکن انتہائی اقلیت میں ہونے کے سبب وہ کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ ہر چند کہ وہ اہلسنّت ہی سے افرادی قوت لے رہے تھے اس کے باوجود معمولاتِ اہلسنّت میں ان کی طرف سے کوئی مداخلت نہ ہوتی تھی۔ وہ زمین دوز تبلیغ میں اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ انھیں براہِ راست حکومت وقت کا بھی کوئی تعاون حاصل نہ تھا۔ پھر بھی علمائے اہلسنّت نے ان کا تعاقب جاری رکھا اور ان کے ردّ میں زبان وقلم کا بھی بڑے پیمانے پر استعمال کیا۔ خود اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے اس ضمن میں کئی رسائل موجود ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان فرقہ بندی تھی نہ گروہ بندی۔ وہ یہ جانتے تھے کہ مسالک کے چار امام ہیں ان میں سے کسی ایک امام کی پیروی کرنی ہے۔ ائمہ کے درمیان مسائل میں اختلاف سے بھی مسلمان واقف تھے لیکن ان کی حقانیت سے کسی کو انکار نہ تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے درمیان مسلکی اختلاف کی بنیاد مولوی اسماعیل دہلوی نے ڈالی۔ محمد بن عبد الوہاب نجدی کی فکر کو ہندوستان میں متعارف کرانے والے وہ پہلے ہندوستانی ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''تقویت الایمان'' کے ذریعے وہابیت کی اشاعت کا آغاز کیا۔ مولوی اسماعیل دہلوی کا تعلق شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندان سے تھا اور انھیں انگریزی حکومت کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی، بلکہ انگریزوں نے مسلم اتحاد کو تہہ و بالا کرنے ہی کے لیے انھیں میدان میں اتارا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسماعیل دہلوی کی فکر ان کے حجرے سے باہر نہ جاتی اور ان کا قصہ ابتدا ہی میں تمام کر دیا جاتا۔ ''تقویت الایمان'' کی اشاعت میں انگریزوں نے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ آج کے روشن خیال حضرات اس پہلو پر سوچنے کی زحمت نہیں کرتے۔ انگریزوں کی ہمیشہ کوشش رہی کہ مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا جائے۔ وہابیت کے پہلو بہ پہلو انگریزی فکر سائے کی طرح لگی رہی ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو ''ہمسفر ے کے اعترافات'' پڑھیے۔ آپ پر سارے حقائق واضح ہو جائیں گے۔ مولوی اسماعیل دہلوی کے تعلق سے حضرت مولانا ابوالحسن زید فاروقی دہلوی لکھتے ہیں:

حضرت مجدد (الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی) کے زمانے سے ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۵ء تک ہندوستان کے مسلمان دو فرقوں میں بٹے رہے اہلسنّت و جماعت دوسرا شیعہ۔ اب اسماعیل دہلوی نے ''تقویت الایمان'' لکھی اس کتاب سے مذہبی آزاد خیالی کا دور شروع ہوا کوئی غیر مقلد ہوا، کوئی وہابی بنا، کوئی اہلِ حدیث کہلایا، کسی نے اپنے کو سلفی کہا، ائمۂ مجتہدین کی جو منزلت اور احترام دل میں تھا وہ ختم ہوا۔ معمولی نوشت وخواند کے افراد امام بننے لگے اور افسوس اس بات کا ہے کہ توحید کی حفاظت کے نام پر بارگاہِ نبوت کی تعظیم واحترام میں تقصیرات (بے ادبی وگستاخی) کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ یہ ساری قباحتیں ماہ ربیع الآخر ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۵ء کے بعد سے ظاہر ہونی شروع ہوئی ہیں۔

(مولوی اسماعیل دہلوی اور تقویت الایمان، ص:۹)

وہابی تحریک اسلام دشمن تحریک ہے۔ اس کی ولادت نجد میں ہوئی۔ اس کا بانی محمد بن عبدالوہاب نجدی ہے جس کا تعلق عرب کے اس علاقے سے تھا جسے ''نجد'' کہا جاتا ہے۔ حدیث پاک میں نجد کو فتنے کی زمین کہا گیا ہے۔ آج مسلمانوں میں جو نظریاتی اختلافات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہے اس کی ساری ذمہ داری وہابیت کے سر جاتی ہے۔ بہت سارے ایسے معمولات جن کا ثبوت قرآن واحادیث سے ملتا ہے وہابی تحریک اس کی شدید مخالفت کرتی ہے۔ توسل بالانبیاء واولیا وہابی تحریک کے نزدیک شرک ہے۔ ائمۂ اربعہ کی تقلید وہابی تحریک کی نگاہ میں حرام ہے۔ محبوبانِ خدا اور رسول کا ادب واحترام وہابی تحریک کی نگاہ میں درست نہیں۔ اسی طرح کے اور بھی بہت سارے مسائل ہیں جن کے خلاف وہابی میڈیا زہرافشانی کرتی رہتی ہے۔ اس تعلق سے صرف ایک مثال ملاحظہ کریں۔ نواب امداد امام اثر جو اثنا عشری جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، لکھتے ہیں:

میں اب شیخ نجدی کے اس خیال کا ہرگز شریک نہیں ہوں جس کو اس نے اپنی غایت شامت سے قبر رسالت مآب پر ظاہر کیا تھا۔ اہلِ اطلاع سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جب یہ تنگ حوصلہ، ظاہر بیں، خود پرست قبر شہنشاہِ کونین پر گیا تو اس نے نہایت بے ادبانہ انداز سے قبر پاک کی طرف رخ کر کے یہ کہا کہ ''اے وہ شخص! جو اس میں مدفون ہے اس

وقت تجھ سے میرا عصا بہتر ہے۔'' اس راندۂ درگاہ کو نہیں معلوم ہو سکا کہ انبیاء و اولیا بعد وفات بھی احیاء کا حکم رکھتے ہیں۔

(کاشف الحقائق، حصہ دوم، ۱۹۵۶ء ص: ۴۷۹)

وہابیت کے بطن سے بہت ساری اسلام مخالف تحریکیں پیدا ہوئیں۔ علمائے اہلسنّت نے اپنے اپنے دور میں ان تحریکوں کا شدت کے ساتھ تعاقب کیا اور ان کے خلاف قلمی و لسانی جہاد کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ان تحریکوں کا مقصد مسلمانوں میں خانہ جنگی جیسے حالات پیدا کرنا تھا۔ ان تحریکوں کو دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ پھر بھی علمائے کرام کی سعئ پیہم اپنے اثرات دکھاتی رہی۔ جن لوگوں کو شریعت عزیز تھی وہ علمائے کرام کے دامن سے وابستہ رہ کر اپنے ایمان وعقیدے کے تحفظ کا سامان کرتے رہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی ولادت ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء میں ہوئی، یہ دور مسلمانوں کے لیے بڑا نازک دور تھا۔ مسلمان مذہبی اور سیاسی دونوں اعتبار سے پسپائی کے شکار تھے۔ ان کے پاس کوئی مضبوط پلیٹ فارم تھا نہ کوئی مستحکم قیادت۔ باطل تحریکیں ان کے ایمان وعقیدے پہ شدت سے حملہ آور تھیں۔ ان کے یقین کے تالاب میں روز ہی ایک نیا پتھر گرتا تھا۔ کام حکومت کی پلاننگ کے تحت ہو رہے تھے۔ مسلمانوں کا مذہبی تشخص اور سیاسی وقار خطرات کی زد میں تھا۔ انھیں دہریت اور سامراجی فکر وخیال میں رنگنے کی پُرزور کوششیں ہو رہی تھیں۔ ان کی مسلکی شفافیت کے خلاف زہر افشانیاں کی جا رہی تھیں۔ اسلامی امتیازات کو مٹانے کے لیے زبان و قلم کو پوری آزادی مل چکی تھی۔ ہر وہ کوشش قبولیت کی نگاہ سے دیکھی جا رہی تھی جس سے مسلم شیرازہ بندی پر کاری ضرب پڑتی ہو۔ حالات کی سنگینی پہ دردمند دل خون کے آنسو بہا رہے تھے۔ ان کی نگاہیں کسی ناخدائے ملّت کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قاری برکاتی قدس سرہٗ قدرت کی عظیم نشانی بن کر مسند ارشاد پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی دینی، ملّی اور سیاسی زبوں حالی کو دیکھ کر آپ کی آنکھیں چھلک پڑتی ہیں۔ فتنوں کے ہجوم میں آپ کا آوازۂ حق بلند ہوتا ہے اور ہواؤں کے دوش پہ پھیلنے لگتا ہے۔ آپ کا پیغام بوئے اسد الٰہی بن کر ذہنوں کو معطر کرنے لگتا ہے۔ آپ کے عزم و ہمت کے سامنے کسی مخالف کو ٹھہرنے کی تب و تاب نہ تھی۔ آپ نے اسلام مخالف قوتوں کے خلاف قلمی و لسانی جہاد کا اعلان فرما دیا۔ مسلمانوں کی ڈوبتی اور ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کو سہارا مل گیا۔ آپ نے تاریکیوں میں بھٹکنے والوں کے سامنے عشق رسالت ﷺ کا چراغ رکھ دیا۔ اس چراغ کی روشنی میں بدنما چہروں کی شناخت آسان سے آسان تر ہوگئی۔ آپ نے وقت کے ابھرتے ہوئے ہر فتنہ کا تعاقب کیا اور اس کی شناعت سے مسلمانوں کو دور رہنے کی تاکید کی۔ آپ کی ہر بات دلائل سے مزین ہوتی تھی۔ آپ نے جماعتی شیرازہ بندی کے لیے جو قربانیاں پیش کی ہیں اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے اہلسنّت کے متوارث عقائد و معمولات کے تحفظ میں جو کردار ادا کیا ہے اسے نسلیں فراموش نہیں کر سکتیں۔ ڈاکٹر سیّد جمال الدین اسلم صاحب لکھتے ہیں:

فاضل بریلوی کو دینی اور تہذیبی ورثے کی تائید ملی۔ سوادِ اعظم کی بدولت انہوں نے اس سوادِ اعظم کو قلب سے لگایا، اپنے ذہن کو اس سے ہم آہنگ کیا اور اس کی خدمت کے لیے اپنے قلم کو رواں کر دیا۔ ان کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ دین مبین اور سوادِ اعظم جس پر نسلاً بعد نسلٍ مسلمانانِ عالم بالعموم اور مسلمانانِ ہند بالخصوص قائم تھے اس پر جارحانہ حملہ کرنے والوں کے خلاف علمی اور قلمی جہاد فرمایا۔ اس میں منطقی طرز نہیں تھا وہ دلائل و معقولات کے ذریعے اپنی بات رکھتے تھے۔ کوئی پھر بھی ہٹ دھرمی کرے تب ان کا قلم شمشیر بن جاتا۔

(برطانوی راج میں مذہب اور سیاست، ص: ۷)

رئیس القلم علامہ ارشد القادری لکھتے ہیں:

ہندوستان کی مذہبی تاریخ کا یہی وہ خطرناک موڑ ہے جہاں اعلیٰ حضرت ہمیں ایک پُرسوز چارہ گر، ایک دردمند مصلح، ایک غمگسار مسیحا، ایک بے باک رہنما اور ایک فرض شناس محافظ دین وملّت کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ اہلسنّت پر ان کا یہ احسان ہم کبھی نہیں بھول سکیں گے کہ انہوں نے قلم کی تلوار اٹھا کر مذہب اہلسنّت کے خلاف ایک منصوبہ بند سازش کو ناکام بنا دیا۔ ناموسِ رسول کے تحفظ کے لیے اعلیٰ

حضرت نے جس حوصلہ مندی کے ساتھ اپنی پوری زندگی کو داؤ پہ لگا دیا یہ انھیں کا حصہ تھا۔ خدانخواستہ انہوں نے فتنۂ وہابیت والحاد کے سیلاب پہ بند نہ باندھا ہوتا تو آج اہلِ سنّت کا شیرازہ بالکل بکھر گیا ہوتا۔

(تجلّیاتِ رضا،ص:۱۷۹،دارالکتاب دہلی)

آگے لکھتے ہیں:

اس طرح کے پیچیدہ اور سنگین ماحول میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے اصلاح وارشاد کا کام شروع کیا۔ آندھیوں کی زد پر چراغ جلانے کا محاورہ ہم نے سنا تھا لیکن اعلیٰ حضرت کی علمی و دینی تاریخ میں یہ محاورہ حقیقت کا ایک پیکر محسوس بن گیا تھا۔ بلاشبہ انہوں نے آندھیوں کی زد پر چراغ جلایا، قلم کی تلوار ہاتھ میں لے کر تنہا اٹھے اور عرب سے عجم تک مذہب اہلسنّت کی حقانیت وصداقت کا سکہ بٹھا دیا۔ مومنین کے قلوب میں سیّد کائنات ﷺ کی عظمت وتوقیر، سلف صالحین کی محبت وعقیدت اور شریعت طیبہ وطاہرہ کے احترام کا جذبہ کچھ اس طرح جگایا کہ اہلِ ایمان کی زندگی کا نقشہ بدل گیا۔ (تجلّیاتِ رضا، ص: ۱۹۴، دارالکتاب دہلی)

رئیس القلم مزید آگے لکھتے ہیں:

ویسے کہنے کے لیے ساری دنیا رسولِ مجتبیٰ کے پروانوں سے بھری ہوئی تھی لیکن ''نجد'' کے گستاخوں کے منہ میں لگام دینے کے لیے تمہارے سوا کون کھڑا ہوا۔ کس نے اپنی ہستی کی ساری صلاحیتوں کو حمایت حق کے مورچے پر لگا کر اسلام کی فصیل کو کفر والحاد کے طوفان سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ مزارات کے وارث اور خانقاہوں کے سجادہ نشین کہاں نہیں تھے۔ لیکن کسے ہمت ہوئی کہ ابلیس کے رقص کرتے ہوئے لشکر کو شکست فاش دینے کے لیے خون کا آخری قطرہ تک نثار کر دے۔ ہر محفل کا چراغ بننا اور ہر طبقے میں نیک نام کہلانا کون نہیں پسند کرتا لیکن پیارے یہ تمہارا ہی جگر تھا کہ حق کی خوشنودی کے آگے تم نے کسی کے روٹھنے کی پرواہ نہ کی، نہ کسی کے طعن وتشنیع سے آزردہ ہوئے۔ ایک اپنے محبوب کو راضی کر کے تم سارے جہان سے مستغنی ہو گئے۔

اہلِ حق کی دنیا آج بھی اعتراف کرتی ہے کہ تم نے غیرتِ عشق کی یہ بھٹی نہ سلگائی ہوتی تو اس عہد نفاق آشوب میں یقین وعرفان کا یہ نکھرا ہوا سونا کسے میسر آتا۔ (تجلّیاتِ رضا، ص: ۲۱۱، دار الکتاب دہلی)

تاریخ میں ایسی شخصیتیں بہت کم ملتی ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی کی ہو۔ اگر ایسے لوگوں کی تاریخ ترتیب دی جائے گی تو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کو بہت سارے امتیازات حاصل ہوں گے۔ جدید تحقیق کی روشنی میں آپ کو پانچ سو سے زائد علوم وفنون پر درک حاصل تھا۔ اور ہر فن سے آپ نے عظمت رسالت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ یہ باتیں کسی عقیدت کے پس منظر میں نہیں کہی جارہی ہیں، بلکہ اس کے بکثرت شواہد موجود ہیں۔ ان کی تصنیفات ہی کی تعداد دیکھ کر اچھے اچھوں کو پسینہ چھوٹ جاتا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ نے جہاں معمولات اہلسنّت کے تحفظ کے لیے کافی مستحکم فصیلیں کھڑی کر دی ہیں وہیں آپ نے فقہ حنفی کی آرائش وزیبائش میں بھی اپنی مجددانہ شان کا مظاہرہ کیا ہے۔ آپ کی کتاب ''فتاویٰ رضویہ'' کو فقہ حنفی کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے جو بارہ ضخیم مجلدات پر مشتمل ہے۔

فقہ حنفی کی ترویج میں آپ کی غیر معمولی جدوجہد کو دیکھتے ہوئے علمائے اہلسنّت نے مذہب امام اعظم کو مسلکِ اعلیٰ حضرت سے منسوب کر دیا، اس طرح مسلک اعلیٰ حضرت کی اصطلاح وجود میں آئی، اور یہی اصطلاح جماعت اہلسنّت کی شناخت قرار پائی۔ مسلک اعلیٰ حضرت کی مخالفت اپنے اسلاف واکابر کی مخالفت کے مترادف ہے۔ مسلک اعلیٰ حضرت کی تائید وحمایت میں بے شمار کتب ورسائل لکھے جاچکے ہیں ''امتیازِ اہلسنّت یعنی مسلک اعلیٰ حضرت'' مسلک اعلیٰ حضرت کے حوالے سے ایک دستاویزی کتاب ہے جس میں ایک ہزار سے زائد علماء، مشائخ اور مفتیانِ کرام کی تائیدات شامل ہیں۔ حضور محدثِ کبیر نے اس کتاب کو ہر گھر کی ضرورت قرار دیا ہے۔ اس کے اب تک پانچ ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔

یہ انتساب وقت اور حالات کے تقاضے کے عین مطابق ہے،

اس لیے کہ ہمارا حریف بھی حنفی المذہب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ جو لوگ مسلک اعلیٰ حضرت کی تعبیر سے الجھتے ہیں انھیں اپنے ذہنی وفکری بخار پہ نظر ثانی کی سخت ضرورت ہے۔ دین و مذہب اور مسلک ومشرب کے تعلق سے تعصب اور تنگ نظری خودکشی کے مترادف ہے۔ مسلک اعلیٰ حضرت سے جدا ہوکر جماعتی اجتماعیت کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

فتاویٰ رضویہ شریف، اسرارِ الٰہی کا گنجینہ ہے۔ اس کے اسرار سب پہ منکشف نہیں ہوتے، جو لوگ علومِ ظاہر و باطن کے عارف و عامل ہوتے ہیں اسرار کے دروازے انھیں پہ کھلتے ہیں۔ اہلِ حال و قال کا فرمان ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے فتاوے کو اگر حضرت امامِ اعظم ابوحنیفہ قدس سرہٗ ملاحظہ فرماتے تو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اور آپ انھیں اپنے تلامذہ میں شامل فرما لیتے۔ اعلیٰ حضرت کو قدرت نے بے شمار علوم وفنون سے بہرہ ور فرمایا تھا۔ اور وہ سارے علوم فتاویٰ رضویہ شریف اور آپ کی دوسری کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ علوم وعرفان کا کوئی ایسا باب نہیں تھا جس پہ آپ کی گہری نظر نہ ہو۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ جن علوم وفنون کو آپ نے اپنے اساتذہ سے حاصل کیا ہے خود آپ نے ان کی تعداد ۱۹؍ بتائی ہے جبکہ حضرت مولانا شیخ عمر بن حمدان المحرسی قدس سرہ کو آپ نے جو سند خلافت عطا کی ہے اس سند میں آپ نے اپنے علوم کی تعداد ۵۹؍ بتائی ہے۔ یعنی ۴۰؍ علوم وفنون ایسے ہیں جو مطالعہ، مشاہدہ، مکاشفہ اور خاص فضل ربانی سے آپ کو حاصل ہوئے ہیں۔ حضرت شیخ عمر بن حمدان المحرسی مدنی قدس سرہٗ کو سند خلافت دیتے وقت آپ کا دریائے کرم جوش پہ تھا۔ اس لیے آپ نے اپنے علوم وفنون کی تعداد ۵۹؍ بتادی، اگر دریائے کرم مزید جوش پہ ہوتا تو اس تعداد میں اضافہ بھی ہوسکتا تھا۔ آپ کی کتب و رسائل کا نصف حصہ بھی ابھی تک زیورِ اشاعت سے آراستہ نہیں ہوا ہے۔ آپ کی تصنیفات و تالیفات کی روشنی میں اہلِ تحقیق نے آپ کے علوم وفنون کی تعداد پانچ سو سے زائد بتائی ہے۔ اگر آپ کی ساری تصنیفات وتحقیقات زیورِ اشاعت سے مزین ہوجاتیں تو یہ تعداد کہاں تک پہنچتی، یہ ہم جیسے مبتدی کے لیے بتانا بہت مشکل ہے۔ آپ کی کتب و رسائل کے مسودات ضائع نہیں ہوئے ہیں بلکہ لوگوں کی تحویل میں ہیں، وہ کسی بڑی پیشکش کے منتظر ہیں۔ آج سے چند سال قبل کچھ مسودات حاصل ہوئے تھے جن کی اشاعت بھی ہوچکی ہے۔ چونکہ آپ کے پاس جو دینی غیرت تھی اس کی نظیر سے صدیاں خالی ہیں اس لیے آپ کی کوئی محنت ضائع نہیں ہوسکتی۔ دھیرے دھیرے سارے مسودات کتابی شکل میں منظر عام پہ آجائیں۔ ''حدائق بخشش'' کی بھی تین جلدیں گم ہوئی ہیں، اس کا تذکرہ خود آپ نے اپنی ایک فارسی کتاب ''اکسیر معظم'' میں کیا ہے۔ یہ کتاب غوثیت مآب کے فضائل پہ مشتمل ہے۔ اس کا اردو ترجمہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پہ پہلی کتاب ہے۔ اس میں غوثیت مآب کے جو فضائل ومناقب بیان کیے گئے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہیں۔

عرض یہ ہے کہ آپ کی ذات ہر زاویے سے آقائے کریم ﷺ کا معجزہ ہے۔ یہ بات بھی ہم اپنے قارئین کے ذہن میں ڈال دینا چاہتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی ذات بارگاہِ الٰہی و دربارِ رسالت پناہی میں محبوب ومقبول ہے۔ اور محبت خدا اور سول ﷺ کا تقاضا یہی ہے کہ ان سے جنونِ محبت کا رشتہ کبھی کمزور نہ ہونے پائے۔ چونکہ انہوں نے شریعت وطریقت کی ہر راہ کو اپنے لہو سے گل بداماں کردیا ہے اسی جذبے سے مسلک اعلیٰ حضرت کی تعبیر نمود پاتی ہے۔ محققین کا بیان ہے کہ اگر آپ کی ذات نہ ہوتی تو ہندوستان میں حنفیت ختم ہوجاتی۔ اس خدمت کا تقاضا یہ ہے کہ جو لوگ خود کو حنفی سمجھتے ہیں ان کے دلوں میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے لیے مخصوص جگہ ہونی چاہیے۔

فتاویٰ رضویہ شریف کی تفہیم میں اہلِ ذوق کو مشکلات سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔ علمائے پاکستان نے اس ضرورت کو شدت سے محسوس کیا، اور اس کے ترجمہ اور تخریج میں مصروف ہوگئے۔ یہ کام فرد کا نہیں تھا اس کے لیے جماعت کی ضرورت تھی۔ ماہرین علم وفن کی ایک ٹیم تشکیل دی گئی۔ حضرت مولانا مفتی عبدالقیوم ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کی زیر نگرانی کام کا آغاز ہوا اور بہت کم مدت میں تکمیل سے ہمکنار ہوا۔ جیسے جیسے کام

ہوتا رہا اس کی اشاعت بھی ہوتی رہی، اس طرح فتاویٰ رضویہ شریف کی بارہ جلدیں تیس جلدوں میں پھیل گئیں۔ اس تاریخی پیشرفت پہ علمائے پاکستان کی جتنی ستائش کی جائے کم ہے۔ ہندوستان میں بھی اس کی اشاعت ہو رہی ہے اور بہت کم قیمت میں دستیاب ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں تاحیات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے دربار کی جاروب کشی کی توفیق عطا فرمائے اور ان کے افکار و نظریات کی روشنی میں زندگی گذارنے کا حوصلہ عطا فرمائے آمین۔

برصغیر ہندو پاک کے مشاہیر علمائے اہلسنّت، مدارس، مساجد اور خانقاہیں قریب قریب اسّی سال سے مسلکِ اعلیٰ حضرت کی ترویج و اشاعت میں کوشاں ہیں اور اب تو عام مذہبی محافل و مجالس میں بھی مسلکِ اعلیٰ حضرت کے نعرے گونجتے ہیں۔ اس نعرے کو کسی بیجا عقیدت کی پیداوار کہنا حواس باختگی کی علامت ہے۔ ہم ذیل میں مسلکِ اعلیٰ حضرت کے تعلق سے علماء، مشائخ، مدارس، مدرسین، مساجد کے ائمہ اور خانقاہوں سے وابستہ افراد کے خیالات پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر تفصیل سے کام لیا جائے تو ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ یہاں نمائندہ شخصیات اور نمائندہ اداروں ہی کی رائے پیش کی جائے گی۔ ویسے یہ عنوان بہرحال تفصیل کا متقاضی ہے۔ کام جاری رکھنے کی کوشش کی جائے گی ممکن ہے یہ مقالہ جلد ہی کتابی صورت میں قارئین کے سامنے آجائے۔

خانقاہِ برکاتیہ مارہرہ شریف اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کا پیر خانہ ہے۔ پیر اور مرید کے فرق کو ایک عام آدمی بھی سمجھتا ہے۔ پیر، پیر ہے اور مرید، مرید ہے، ایک مرید اپنی عظمت و رفعت میں عرش نشین ہو جائے پھر بھی وہ اپنے مرشد سے بلند نہیں ہو سکتا۔ اعلیٰ حضرت اپنے مرشدانِ کرام کو جن نگاہوں سے دیکھتے تھے، وہ نگاہیں اب صرف کتابوں میں ملتی ہیں۔ ظاہر میں اب ان نگاہوں کا عکس بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ اب فریب فکر و خیال کا ایک طویل سلسلہ ہے، ہر سمت صحرا کی تیز دھوپ ہے، کوئی سائبان دور دور تک نظر نہیں آتا۔ اصل پردے میں ہے اور نقل نے دکان سجا رکھی ہے۔ کوٹھیاں بن رہی ہیں لیکن دلوں کی ویرانیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ عقیدت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ تجارت شباب پہ ہے۔ پیری مریدی کے پردے میں رگوں سے لہو نچوڑا جا رہا ہے۔ جن کے دلوں میں للّٰہیت کا چراغ روشن ہے انھیں گوشۂ تنہائی محبوب ہے۔ وہ بازاروں میں نہیں آتے، درباروں میں نہیں دکھتے اور جلسہ گاہوں کی شرکت انھیں منظور نہیں اس لیے سادہ دل بندوں کی آنکھیں یاس کا مزار بنی ہوئی ہیں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ اپنے مرشد کے کیسے مرید تھے۔ روایات ملتی ہیں کہ ایک ہی نشست میں انھیں ان کے مرشد نے وہ سب کچھ دے دیا جو کسی کو برسوں کی ریاضت کے بعد بھی نہیں ملتا۔ اپنے حلقۂ ارادت میں لینے کے بعد ان کے مرشد نے اپنا ایک اعلامیہ جاری فرمایا کہ کل میدانِ محشر میں، میں مولانا احمد رضا کو خدا کے حضور پیش کروں گا۔ ان کے مرشد کا یہ فرمان بھی مسلکِ اعلیٰ حضرت کی روشن تعبیر ہے۔ اعلیٰ حضرت کے مرشدانِ کرام کے دلوں میں اعلیٰ حضرت کی محبت کا جو چراغ روشن تھا اسے اس بات سے سمجھا جا سکتا ہے کہ انھیں ان کے مرشدانِ کرام نے ''چشم و چراغ خاندانِ برکات'' کے لقب سے ملقب فرمایا۔ ان کے مرشد زادوں کا فرمان ہے کہ خان زادہ سیدوں کا اعلیٰ حضرت ہو گیا۔ اعلیٰ حضرت کے مرشدانِ کرام انھیں کس نگاہ سے دیکھتے تھے اس حوالے سے نور العارفین حضرت سیّد شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہٗ کی ایک تحریر ذیل میں ملاحظہ کریں اور مسلک اعلیٰ حضرت کی روشن تعبیر سے اپنی آنکھوں کو روشن کریں۔ حضرت نور العارفین فرماتے ہیں:

مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب قادری برکاتی بریلوی اس زمانے کے مجدد برحق اور سلسلۂ برکات کے روحانی فرزند ہیں، ان پر مرشد گرامی کی خاص نظر توجہ ہے، اللہ و رسول کی خاص عنایتوں سے وافر حصّہ ان کو عطا ہوا ہے۔ دورِ حاضر میں مولانا احمد رضا خاں صاحب کا موقف ہی دینِ حق ہے اور اہلسنّت کے تمام علم برداروں کو اس جانب متوجہ ہونا چاہیے۔ ان کے مشن و موقف سے دامن بچانے والوں میں خواص ہوں کہ عوام ان پر خاندانِ برکات کا اعتبار نہیں حضور خاتم الاکابر سیّدنا شاہ آلِ رسول احمدی پیر و مرشد مولانا احمد رضا خان صاحب نے علم و عمل میں ان کی تقلید و اتباع کا فرمان جاری فرمایا ہے بلکہ حضور نے

یہ بھی وصیت کی ہے کہ مولوی شاہ احمد رضا خاں بریلوی کے موقف سے ہمیشہ اتفاق رکھا جائے۔ نیز مرشد گرامی قبلہ نے ان کی مریدی پر فخر فرمایا ہے۔ اور دنیا سے لے کر محشر تک خوشی کا اظہار فرمایا ہے یہی وجہ ہے کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کی ہر تقریر و تحریر لائق تقلید و عمل ہے، بلکہ ان کا وجود نسل در نسل خاندانِ برکات کے لیے لائق صد فخر و مباہات ہے۔ ہم بھی اپنے مریدین، معتقدین اور ابناء و خلفاء کو مولانا احمد رضا خان صاحب سے دلی محبت اور سچی عقیدت و احترام کی وصیت کرتے ہیں اور یہ تاکید کرتے ہیں کہ مرتے دم تک ان کے موقف کی تائید کرے اور ان کے ہر شرعی فیصلے سے اتفاق رکھے۔ ہمارے خاندان کا ایک بچہ بھی مولانا احمد رضا خاں صاحب کا نام بے ادبی سے نہ لے، مذہب و مسلکِ اعلیٰ حضرت سے نااتفاقی ظاہر کرنے والا میرے سلسلے کا مرید نہیں ہوسکتا، ہو بھی تو خارج از سلسلہ تصور کرنا چاہیے۔(ماہنامہ پاسبان الٰہ آباد، اکتوبر ۱۹۷۹ء)

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہماری ساری توجہ نمائش پہ ہوتی ہے۔ ہماری محافل و مجالس مسلکِ اعلیٰ حضرت کے نعروں سے گونجتی رہتی ہیں۔ نعرہ لگا کر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی محبت کا ہم نے حق ادا کر دیا۔ اعلیٰ حضرت کا مطالبہ ہم سے نعروں کا کبھی نہیں تھا۔ نعرہ تو محبت کا ایک نمائشی پہلو ہے۔ یہ نعرہ بھی بعض لوگوں کی آنکھوں میں خار بن کر چبھتا ہے۔ یہ تعصب، تنگ نظری اور احسان فراموشی کی علامت ہے۔ اعلیٰ حضرت کی محبت تقاضا کرتی ہے کہ انہوں نے عشق و عرفان کے جو چراغ روشن کیے ہیں ان چراغوں سے اپنے سینوں کو منور کیا جائے۔ مسلکِ اعلیٰ حضرت اِک آگ کا دریا ہے۔ اس دریا سے سلامتی کے ساتھ گذرنا ہر کہہ و مہہ کے بس کا روگ نہیں۔ اس کے لیے عقیدہ و عمل میں شفافیت لازمی ہے۔ ان لوگوں سے بھی ہمارے روابط ہیں رسول دشمنی جن کی فطرت ہے۔ اب تو ہم ساری حدوں کو توڑ چکے ہیں۔ جن کے دامن پہ عظمت رسالت کے خون کے دھبے نمایاں ہیں ان سے ہم نے ہر طرح کی رسم و راہ بنا رکھی ہے۔ ان کی مساجد، مدارس اور عبادت گاہیں سب الگ ہو چکی ہیں۔ پھر بھی ہمارے دسترخوان پہ وہ کیوں نظر آتے ہیں۔ اس باب میں کسی کا عمل ہمارے لیے حجت نہیں ہے۔ ہمارے لیے حجت شریعت ہے۔ شریعت اعلان کرتی ہے کہ ان کے دشمن سے دوستی مت کیجیے۔ دوستی کی یہ راہ سیدھے جہنم کی طرف جاتی ہے۔ حساب و کتاب کا دن زیادہ دور نہیں ہے۔ اس دن کوئی آپ کو بچانے والا نہ ہوگا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی ذات ہمارے لیے ایک دینی امانت ہے۔ انہوں نے جو اسلامی زندگی کی ڈگر پیش کی ہے اسی ڈگر میں ہماری نجات کا راز پنہاں ہے۔ اس سلسلے میں ایک آل مصطفیٰ، عالم ربانی مفسر قرآن حکیم حضرت مولانا حافظ سیّد غلام حسین مصطفیٰ رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ اپنی شہرت یافتہ تفسیر قرآن میں رقم طراز ہیں:

اردو تراجم قرآن میں پہلا ترجمہ لاجواب، بے نظیر عالم بے بدل اعلیٰ حضرت امام اہلسنّت الشاہ احمد رضا خاں رضی اللہ عنہ نے لکھا۔ اعلیٰ حضرت کے بارے میں فقیر کچھ نہیں کہتا، اتنا ضرور ہے کہ آپ ہر فن میں ماہر تھے، آپ بحر العلوم تھے، دشمنوں نے بھی یہ اعتراف کیا ہے۔ آپ نے محبت مصطفیٰ ﷺ کو بہترین ادبی انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ یہ گمراہ فرقوں کا دور تھا، مگر آپ نے نہایت مختصر عرصہ میں گمراہ فرقوں کو تتر بتر کر دیا۔ امام اہلسنّت اپنے وقت کے غوث زماں تھے، تقویٰ اور طہارت میں بے مثل تھے، آپ کی ہر ادا سنّت مصطفیٰ ﷺ کے مطابق تھی۔ حضور ﷺ کے نام پر آپ کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، آپ نے ایک ہزار سے زائد کتابیں لکھیں۔ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ امت محمدیہ ﷺ کے لیے قیمتی تھا۔ آپ نے شرح بخاری لکھی جو لاجواب ہے۔

آپ کے سامنے مخالف علماء بول نہ سکتے تھے۔ آپ کی شہرت تمام عالم اسلام میں پھیل گئی۔ علمائے مصر اور علمائے مدینہ نے آپ کو اپنا امام تسلیم کیا۔ آپ کا قلم اتنا شہ زور تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں امت کو علم کا بیش بہا خزانہ عطا کیا۔ آپ کی تحریر کا سکہ پوری دنیا میں ہے۔

سیّد صاحب ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

فقیر یہ کہتا ہے کہ بے شک کامل راستہ نبیین، شہدا، صدیقین اور صالحین کا ہے، اسی راستے پر نجات ہے۔ اولیائے کاملین کی محبت،

صحابہ کی محبت، اہلِ بیت کی محبت یہی اصل نجات کا راستہ ہے، جس نے اس کو چھوڑا وہ اس دنیا میں اور آخرت میں ذلیل وخوار ہوگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ چودھویں صدی میں صحیح معنوں میں اولیاء اللہ، صحابہ اور اہلِ بیت انھیں کے راستے کو صحیح معنوں میں ہمیں دکھلایا تو وہ ہمارے مجدد مائۃ حاضرہ امام اہلسنّت مولانا شاہ احمد رضا خاں علیہ الرحمہ ہیں۔

انہوں نے صالحین، صحابہ اور حضور ﷺ کی محبت کو عین ایمان فرمایا، وگرنہ آپ کو کسی سے کیا مخالفت ہے۔ لوگ آپ کے خلاف کچھ کہتے ہیں۔ آپ کو بدعتی کہا جاتا ہے تو صرف اسی وجہ سے کہ آپ سرکارِ دوعالم ﷺ سے محبت کرتے ہیں اور کاملین کا راستہ دکھلاتے ہیں۔

خدا کی قسم! فقیر ناقص گنہگار ہے، واللہ واللہ! مجھے دو مرتبہ زیارتِ رسولِ مقبول ﷺ ہوئی، سرکارِ دوعالم ﷺ نے فرمایا ہے، اور میرے ناقص کانوں نے آپ ﷺ کے یہ ارشادات سنے ہیں۔ فرمایا موجودہ وقت میں میری امت کو اگر صحیح راستہ اختیار کرنا ہو تو میرے احمد رضا کا راستہ اختیار کرے، یہی میرا راستہ ہے۔ (تفسیر سراجِ منیر، پارہ اول، سورۂ بقرہ مطبوعہ لاہور، ص: ۳۹، بحوالہ امام احمد رضا کاملین کی نظر میں)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی نصیحت کیا ہے اور ان کی وصیت کیا ہے؟ ذیل میں نصیحت ووصیت کی تابانی ملاحظہ کریں، اور اعلیٰ حضرت کے ارشادات وفرمودات کی روشنی میں انھیں بغور دیکھیں جو اپنے چہروں پہ مسلک اعلیٰ حضرت کا نمائشی خول سجائے بازاروں اور درباروں میں شور مچا رہے ہیں۔ اعلیٰ حضرت رقمطراز ہیں:

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ نے فتنوں کے ہجوم میں جینے کے اصول دیئے ہیں۔ ان کا ہر اصول قرآن واحادیث، اجماع، قیاس اور سلف وخلف کے ارشادات وفرمودات کے نور کا تراشا ہے۔ انہوں نے شریعت کو وقت، حالات کے زاویے سے نہیں دیکھا بلکہ وقت، حالات اور زمانے کو شریعت کے زاویے سے دیکھا، انہوں نے سائنسی انکشافات کو بھی شریعت کی دہلیز کی جاروب کشی پہ مجبور کیا۔ وہ کثیر علوم وفنون کے حامل وعارف تھے۔ اور ہر علم سے انہوں نے شریعت کی آفاقیت کو ثابت کیا۔ ان کی ولادت نفاذِ شریعت کے لیے ہوئی تھی۔ اپنے مقصد ولادت سے وہ کبھی لمحہ بھر کے لیے غافل نہیں ہوئے۔ ان کی ہر سانس عشق مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ سے عبارت تھی۔ عشق مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کے تقاضے اور مطالبات کو انہوں نے نعروں کے شور میں کبھی گم ہونے نہیں دیا۔ عشق انسان کو اپنے ماسوا سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ عشق ایک ایسی تپش ہے جو شرکت کو قبول نہیں کرتی۔ وہ اپنے دردِ جگر کے لیے کبھی کسی سے دواؤں کا مطالبہ نہیں کیا، وہ اپنے عشق کو روزفزوں سے فزوں تر دیکھنے کے قائل تھے۔ وہ اپنے دردِ عشق ہی کو اپنی حیات کا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ مدینے کے ذرات کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس لیے آسمان پہ چمکنے والے چاند وسورج سے کہہ دو کہ وہ ہمارے سامنے اپنی برتری کا بھول کر بھی دعویٰ نہ کرے۔ اگر ان کی ولادت نہ ہوتی تو عشق حبیب خدا ﷺ کی حرارت سے انسانی قلوب صحیح طور پر آشنا نہیں ہو پاتے۔ اس لیے کہ ان کے عہد میں عشق مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کے تقدس سے الجھنے کا مزاج تیزی سے عام ہو رہا تھا۔ ان کی ذات تقدیس رسالت مآب ﷺ سے الجھنے والی ہر طاقت کے لیے ضرب یداللہی تھی۔ ان کے عہد میں ان کی ذات باطل کے لیے دہشت کی حیثیت رکھتی تھی، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ طوفانوں سے کھیلنے کا نام مسلک اعلیٰ حضرت ہے، پتھر کی چٹانوں سے ٹکرانے کا نام مسلک اعلیٰ حضرت ہے اور دہکتے انگاروں کو ہاتھوں میں لینے کا نام مسلک اعلیٰ حضرت ہے۔

انھیں جانا، انھیں مانا نہ رکھا غیر سے کام
للہ الحمد میں دنیا سے مسلمان گیا
اور تم پر میرے آقا کی عنایت نہ سہی
نجدیو کلمہ پڑھانے کا بھی احسان گیا

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی خلوت میں جو چراغ جلتا تھا وہی چراغ ان کی جلوت میں بھی جلتا تھا۔ ان کی ہر بات عمل کے نور میں ڈھلی ہوتی تھی۔ اگر ان کے قول وعمل میں شدت نہ ہوتی اور صدق وصداقت کی چاندنی سے ان کی خلوت وجلوت نور بار نہ ہوتی تو آج نام نہاد رہبرانِ شریعت وطریقت دین اسلام کو بازیچۂ

اطفال بنا دیتے۔ ان کی دینی غیرت وشدت ہمیں شریعت کی دہلیز پہ کھڑا کیے ہوئی ہے۔ ان کی نصیحتیں اور ان کی وصیتیں ان کی کتب و رسائل میں بکھری ہوئی ہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہوگیا ہے جو ان کی نصیحتوں کو دیکھتا ہے نہ ان کی وصیتوں کو دیکھتا ہے۔ وہ انگلی کٹا کر بلند مرتبت شہیدوں کی صف میں شامل ہونا چاہتا ہے، وہ عمل کے نور سے نہیں بلکہ نعروں کے شور سے اپنی صداقت کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔ دین و دیانت اور صدق وصداقت سے ایک واجبی رشتہ ہے پھر بھی خود کو مسلک اعلیٰ حضرت کے وفاداروں میں ممتاز سمجھتا ہے۔ مسلک اعلیٰ حضرت دینی اصولوں پہ شدت سے عمل کرنے کا نام ہے۔ یہ بازار میں بکنے والا مٹی کا گلاس نہیں ہے کہ جب چاہا بازار سے اٹھالائے اور جب چاہا اسے توڑ دیا۔ مسلک اعلیٰ حضرت شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ لوگ آسان سمجھتے ہیں رضویات کا ناشر ہونا۔ مسلک اعلیٰ حضرت کے پس منظر میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی نصیحتوں اور وصیتوں کا ایک نوری تسلسل دیکھیے اور اپنا محاسبہ کیجیے۔ اعلیٰ حضرت ارشاد فرماتے ہیں:

بدمذہب جتنے ہیں سب گمراہ ہیں، فتنہ پرداز ہیں، ظالم ہیں، ہالک ہیں۔ ان کی اہانت واجب، ان کی توقیر حرام۔ ان سے بغض رکھیے، انھیں اپنے سے دور ہانکنے کا حکم ہے۔ وہ مفسد ہیں، انہوں نے دین کو پارہ پارہ کردیا، ان سے میل جول حرام ہے، ان سے دوری واجب ہے۔ اہلسنّت کے سوا سب کلمہ گو اہل قبلہ گمراہ، فاسق، بدعتی، ناری ہیں۔ صحابۂ کرام سے آج تک تمام امت مرحومہ کا اس پر اجماع ہے۔ مسلمانوں پر ان کا ضرر کافروں سے زائد ہے، ان کی بات لاعلاج مرض ہے۔ ان کے مکر سے پہاڑ ٹل جاتے ہیں، وہ گمراہ وگمراہ گر ہیں، شیطان نے جھوٹی ملمع کاری کی دلیلیں انھیں سکھادی ہیں، ان کے پاس بیٹھنا جائز نہیں۔ (فتاوی الحرمین برجف ندوۃ المین، ص: ۴، رضا اکیڈمی ممبئی)

نیچری زندیق ہیں، دشمنانِ دین ہیں، فاسق ہیں، انھیں اسلام سے اصلاً لگاؤ نہیں۔ وہ سخت خبیث کافر ومرتد ہیں۔ ان کی کلمہ گوئی اور نماز بہ قبلہ محض بے سود اور ان کی تاویلیں سراسر مردود، جو ان کے کفر میں شک کرے خود کافر ہے، وہ دین سے نکل گئے، نرے ملحد ہیں، دین و ملّت سے خارج۔

رافضی زیاں کار ہیں، دین وسنّت کے رافض وتارک ہیں۔ تبرّائی کفر میں اختلاف ہے اور ان میں جو بعض ضروریاتِ دین کا منکر ہے جیسے ہمارے بلاد کے رافضی اور ان کا مجتہد وہ قطعاً کافر مرتد ہیں، رافضی دین سے خارج ہیں، نرے ملحد، اسلام وملّت سے باہر ہیں، عرش کے گرد ملائکہ کے جہان کے جہان آباد ہیں جو ان پر لعنت کررہے ہیں، جو ان میں تبرّا پر ثواب جانے یا اسے مباح ہی مانے وہ بالاجماع کافر ہے۔

وہابی فاجر ہیں، دین وسنّت کے دشمن ہیں۔ یہ گمراہ فرقہ ہے۔ ان پر شیطان غالب آیا کہ ان کو ذکر خدا بھلایا۔ یہ شیطان کے گروہ ہیں۔ سن لو شیطان ہی کے گروہ زیاں کار ہیں۔ جو ان میں امکانِ کذب مانتے ہیں، اللہ عزوجل کو عیب لگاتے ہیں، جو ختم نبوت کا معنی آخر النبیین کے سوا گھڑتے ہیں کافر ومرتد ہیں۔ وہابیہ دین سے باہر ہوئے، ملحد ہیں۔ اسلام ودین سے خارج ہیں۔

تفضیلیہ گمراہ ہیں۔ غیر مقلدین گمراہ ہیں، بدعتی ہیں، جہنمی ہیں۔ مخالفان اجماع ہیں، خدا کے مخذول ہیں، غضب الٰہی میں گرفتار ہیں، انھیں سنّی بتانا سخت گمراہی ہے، ان کے پیچھے نماز پڑھنا بشدت منع ہے۔ ائمہ کی تقلید اور ان کی اطاعت بحکم قرآن وحدیث واجب ہے۔ جو اماموں پر طعن کرے حدیث فرماتی ہے کہ وہ منافق ہے اگرچہ نماز، روزہ، حج، جہاد کرتا ہو۔ (فتاوی الحرمین برجف ندوۃ المین، ص: ۷، رضا اکیڈمی ممبئی)

اسی ضمن میں وصایا شریف کی ایک روشن عبارت بھی ذیل میں ملاحظہ کریں:

پیارے بھائیو! لَا اَدْرِیْ مَا بَقَائِیْ فِیْکُمْ۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنے دن تمہارے اندر ٹھہروں۔ تین ہی وقت ہوتے ہیں، بچپن، جوانی، بڑھاپا۔ بچپن گیا، جوانی آئی، جوانی گئی، بڑھاپا آیا۔ اب کون سا چوتھا وقت آنے والا ہے، جس کا انتظار کیا جائے۔ ایک موت ہی ہے، اللہ قادر ہے کہ ایسی ہزار مجلسیں عطا فرمائے، اور آپ سب لوگ ہوں، میں ہوں، اور میں آپ سب لوگوں کو سناتا ہوں، مگر بظاہر اب امید نہیں۔ اس وقت میں دو وصیتیں آپ لوگوں کو کرنا چاہتا ہوں۔ ایک

تو اللہ ورسول (جل جلالہٗ وصلی اللہ علیہ وسلم) کی اور دوسری خود میری۔تم مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھولی بھیڑیں ہو۔بھیڑیے تمہارے چاروں طرف ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ تمھیں بہکائیں، تمھیں فتنے میں ڈال دیں، تمھیں اپنے ساتھ جہنم میں لے جائیں۔ ان سے بچو، اور دور بھاگو۔ دیوبندی ہوئے، رافضی ہوئے، نیچری ہوئے، قادیانی ہوئے، چکڑالوی ہوئے غرض کتنے ہی فرقے ہوئے، اور اب سب سے نئے گاندھوی ہوئے جنھوں نے ان سب کو اپنے اندر لے لیا، یہ سب بھیڑیے ہیں، تمہارے ایمان کی تاک میں ہیں، ان کے حملوں سے ایمان کو بچاؤ۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم رب العزت جل جلالہٗ کے نور ہیں، حضور سے صحابہ روشن ہوئے۔ ان سے تابعین روشن ہوئے، ان سے ائمہ مجتہدین روشن ہوئے، ان سے ہم روشن ہوئے۔ اب ہم تم سے کہتے ہیں یہ نور ہم سے لے لو، ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ تم ہم سے روشن ہو۔ وہ نور یہ ہے کہ اللہ ورسول سے سچی محبت، ان کی تعظیم اور ان کے دوستوں کی خدمت اور ان کی تکریم اور ان کے دشمنوں سے سچی عداوت جس سے اللہ ورسول کی شان میں ادنیٰ توہین پاؤ، پھر وہ تمہارا کیسا ہی پیارا کیوں نہ ہو فوراً اس سے جدا ہو جاؤ۔ جس کو بارگاہِ رسالت میں ذرا بھی گستاخ دیکھو پھر وہ تمہارا کیسا ہی بزرگ معظم کیوں نہ ہو اپنے اندر سے اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دو۔

میں پونے چودہ برس کی عمر سے یہی بتا تا رہا اور اس وقت پھر یہی عرض کرتا ہوں اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حمایت کے لیے کسی بندے کو کھڑا کر دے گا مگر معلوم نہیں میرے بعد جو آئے کیسا ہو، اور تمھیں کیا بتائے۔ اس لیے ان باتوں کو خوب سن لو، حجۃ اللہ قائم ہو چکی، اب میں قبر سے اٹھ کر تمہارے پاس بتانے نہ آؤں گا جس نے اسے سنا اور مانا قیامت کے دن اس کے لیے نور ونجات ہے اور جس نے نہ مانا اس کے لیے ظلمت وہلاکت، یہ تو خدا اور رسول کی وصیت ہے، جو یہاں موجود ہیں سنیں اور مانیں، اور جو یہاں موجود نہیں تو حاضرین پر فرض ہے کہ غائبین کو اس سے آگاہ کریں۔ (وصایا شریف، ص: ۷، ۸، ۹)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے مذکورہ بالا ارشادات وفرمودات سے مسلک اعلیٰ حضرت کی تصویر خوب اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ جو لوگ خود کو اعلیٰ حضرت کا وفادار سمجھتے ہیں، مسلک اعلیٰ حضرت کے دعوے دار ہیں اور محافل ومجالس میں مسلک اعلیٰ حضرت کا خوب نعرہ لگاتے ہیں وہ خود کو اعلیٰ حضرت کے ارشادات وفرمودات کی روشنی میں اپنا محاسبہ کریں، اور دیکھیں کہ ہمارے دعوے اور نعرے میں کتنی صداقت ہے۔ فی زمانناجو لوگ خیر وشر کے درمیان تمیز کا عرفان نہیں رکھتے وہ بھی مسلک اعلیٰ حضرت کا نعرہ لگاتے ہیں۔ جو لوگ وہابیہ، دیابنہ کی مجالس میں شرکت کرتے ہیں، ان کے جنازے میں شریک ہوتے ہیں، انھیں اپنی بیٹیاں دیتے ہیں اور ان کی بیٹیاں لاتے ہیں وہ بھی مسلک اعلیٰ حضرت کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ جن کی وہابیہ ودیابنہ سے اچھی دوستی ہے، ان کی ہر طرح کی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں وہ بھی مسلک اعلیٰ حضرت کے دعوے دار ہیں۔ جن کے ہاں تصویر کشی، ویڈیوگرافی خوب عام وتام ہے وہ بھی خود کو مسلک اعلیٰ حضرت کا پابند بتاتے ہیں اور اعلیٰ حضرت کی وفاداری کا خطبہ بھی پڑھتے ہیں۔ ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ اصلی ونقلی مجنوؤں میں تمیز مشکل ہو گئی ہے۔ مریم اپنے لال کو کہاں تلاش کرے یہاں تو ہر شخص اپنے گلے میں صلیب آویزاں کیے ہوئے ہے۔

دشمن احمد پہ شدت کیجیے، یہ مسلک اعلیٰ حضرت ہے۔ ملحدوں کے لیے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ مسلک اعلیٰ حضرت ہے۔ شرک ٹھہرے جس میں تعظیم حبیب، اس بُرے مذہب پہ صبح وشام لعنت کرنا یہ مسلک اعلیٰ حضرت ہے۔ شرعی اصولوں کی زندگی کے ہر موڑ پہ رعایت کرنا، یہ مسلک اعلیٰ حضرت ہے۔ نماز وروزہ، حج وزکوٰۃ کی اپنے اپنے وقتوں پہ ادائیگی، مسلک اعلیٰ حضرت ہے۔ پڑوسیوں کے حقوق کا ہر حال میں احترام، مسلک اعلیٰ حضرت ہے۔ اللہ اور اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی وفاداری، مسلک اعلیٰ حضرت ہے۔

مسلک اعلیٰ حضرت پورے دین اسلام کے مجموعے کا نام ہے۔ شیخ الاسلام حضرت سیّد مدنی میاں صاحب اپنی کتاب "تفسیر اشرفی" میں ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ حضور محدثِ اعظم ہند تاحیات دین اسلام یعنی مسلک اعلیٰ حضرت کی خدمت کرتے رہے۔ دوسری بہت ساری اکابر شخصیات کے بھی اسی طرح کے فرامین ہیں۔ مسلک اعلیٰ

حضرت تیز تلوار پہ چلنے کے مترادف ہے۔ یہ شعلوں اور انگاروں بھری راہ ہے۔ یہاں قدم قدم فریب زمانہ سے اپنے دامن کو بچانا ہوتا ہے۔ اس لیے مسلک اعلیٰ حضرت کا نعرہ لگانے سے پہلے مسلک اعلیٰ حضرت کے تقاضے اور مطالبات کو صحیح انداز میں سمجھنے اور برتنے کی ضرورت ہے۔ جو لوگ ایرے غیرے ہر شخص کی پیشانی پر مسلک اعلیٰ حضرت کا لیبل لگانے کی جد و جہد میں مصروف ہیں انھیں اپنے اس مکروہ عمل پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ آپ مسلک اعلیٰ حضرت کا نعرہ ضرور لگائیں لیکن مسلک اعلیٰ حضرت کو تماشا نہ بنائیں، ورنہ دنیا و آخرت دونوں آپ کی تباہ ہو جائے گی۔ دیکھیے اور غور کیجیے۔

اعلیٰ حضرت کیا فرماتے ہیں:

اللہ کی سرتا بہ قدم شان ہیں یہ
ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ
قرآن تو ایمان بتاتا ہیں انھیں
ایمان یہ کہتا ہے میری جان ہیں یہ

دشمن احمد پہ شدت کیجیے
ملحدوں کی کیا مروت کیجیے
شرک ٹھہرے جس میں تعظیم حبیب
اس بُرے مذہب پہ لعنت کیجیے
کیجیے چرچا انھیں کا صبح و شام
جانِ کافر پہ قیامت کیجیے
غیظ میں جل جائیں بے دینوں کے دل
یارسول اللہ کی کثرت کیجیے
مثلِ فارس زلزلے ہوں نجد میں
ذکرِ آیات ولادت کیجیے
غوثِ اعظم آپ سے فریاد ہے
زندہ پھر یہ پاک ملّت کیجیے

حال ماضی سے نور کشید کرتا ہے۔ اگر حال کا رشتہ ماضی سے ٹوٹ جائے تو حال اس طرح اندھیروں میں ڈوب جائے گا کہ چہروں کی شناخت مشکل ہو جائے گی۔ نسلِ نو کا رشتہ ماضی سے ٹوٹتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد خیالی کا زہر ان میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ وہ حال ہی کی روشنی میں اپنا مذہبی اور مسلکی حاشیہ ترتیب دینے کی فکر میں مصروف ہے۔ یہ قلّت مطالعہ، قلّت علم اور ناقص تربیت کی کارستانی ہے۔ جب تک ماضی کے اُجالے سے ہماری خواب گاہیں روشن نہیں ہوں گی دین و شریعت کے اسرار سے ہمارے سینے کبھی منور نہیں ہوں گے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے بیٹے کے لیے باپ کے علم کا عارف ہونا ضروری ورنہ بیٹا باپ کی وراثت کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ آج بہت ساری بڑی شخصیات کی اولادیں راہِ اعتدال سے دور ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے اپنے آبا کے علوم اور ان کے زندگی گذارنے کے مذہبی اصولوں کو نظر انداز کر دیا اور وہ جدید و قدیم کے فلسفے میں الجھ کر رہ گئے۔ جن گھروں اور خاندانوں میں روز "حسام الحرمین" کی قرأت ہوتی تھی آج وہاں حسام الحرمین پہ نظر ثانی کا شور بلند ہو رہا ہے۔ نور العارفین حضرت سیّد شاہ ابوالحسین احمد نور قدس سرہٗ کی شخصیت جماعت اہلسنّت کے لیے قیمتی اور نا قابلِ فراموش اثاثے کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ خانقاہِ برکاتیہ کے چھٹے قطب الاقطاب ہیں۔ آپ کی ذات بے شمار خوبی اور کمالات کی جامع تھی۔ آپ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے استاذ بھی ہیں اور مرشد اجازت بھی۔ جس طرح آپ کی نگاہوں میں حال روشن تھا اسی طرح ماضی اور مستقبل بھی روشن تھا۔ آپ مستقبل میں پھیلنے والی تاریکیوں کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے تھے۔ آپ کے فرمان کے حرف حرف سے صدق و صداقت کی روشنی پھیلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری کے حوالے سے آپ کا فرمان ہر دردمند زندگی کے لیے نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو دل یادِ الٰہی و محبت رسالت پناہ ﷺ سے روشن و منور ہوگا اعلیٰ حضرت کے لیے یہی زبان و بیان استعمال کرے گا۔ چونکہ اعلیٰ حضرت کی ذات سے پورا دینی نظام وابستہ ہے، تھوڑی سی لغزش بھی انسان کو تاریکیوں کے گڈھے میں ڈال دے گی۔

نور العارفین حضرت سیّد شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہٗ کا عہد بہت ہی زندہ ضمیر اور حساس عہد تھا۔ آپ کے عہد میں جو شخصیات عشق

وعرفان کی بلند ترین منزل پہ مسند نشین تھیں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے حوالے سے جن خیالات وتصورات کا اظہار نور العرفین نے کیا ہے وہی خیالات سب کے تھے۔ تاریخ کے اوراق الٹیے اوراپنے سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کیجیے۔

آستانۂ عالیہ شمسیہ رائچور کرناٹک کے تیرہویں سجادہ نشین حضرت مولانا سیّد شاہ شمس عالم حسینی قدس سرہٗ اپنے وقت کے عالم ربانی، صاحبِ رُشد وہدایت اور عارف وعامل تھے۔ آپ نے دکن میں تحریک وہابیت کے خلاف بڑا تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ آپ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے ہم عصر تھے اور نور العارفین کے بھی ہم عصر تھے۔ دونوں شخصیات میں بڑے گہرے مراسم تھے۔ آپ کو اعلیٰ حضرت سے بے پنا عقیدت ومحبت تھی۔ دکن میں اعلیٰ حضرت کی تحریک، تحریک عشق رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو فروغ دینے والے آپ پہلے عالم دین تھے۔ آپ کو اعلیٰ حضرت اور مسلک اعلیٰ حضرت سے گہری وابستگی تھی۔ آپ تاحیات مسلک اعلیٰ حضرت کی ترویج وتشہیر میں ہمہ تن مصروف رہے۔ مسلک اعلیٰ حضرت سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۳۰۵ھ میں آپ نے اپنی اولاد کے لیے فارسی زبان میں ایک وصیت نامہ جاری فرمایا۔ جس میں اعلیٰ حضرت اوران کی کتب کو تاحیات چراغِ راہ بنائے رکھنے کی تلقین کی۔ ذیل میں وصیت نامہ کا ایک روشن پیراگراف ملاحظہ کریں، وہ فرماتے ہیں:

موجودہ زمانے میں عقائد اسلامیہ کی حفاظت ایک بہت بڑا مسئلہ بن گئی ہے، اس لیے کہ وہابی دیوبندی تحریک نے پورے ملک کو گھیر لیا ہے اوراس کے علاوہ دین اسلام اورعقائد اسلامیہ کے خلاف نئی نئی تحریکیں اُٹھ رہی ہیں اس لیے میری اولاد (اور میرے مریدین و اہلِ عقیدت) کے لیے ضروری ہے کہ وہ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کو اپنا پیشوا و رہنما تسلیم کرے۔ اس لیے کہ آپ اس صدی کے مجدد ہیں اور آپ کی کتب پہ عمل اور یقین ضروری ہے۔ موجودہ دور میں صحیح عقائد اسلامیہ کا علم مولانا احمد رضا خاں صاحب کی کتب کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے میری اولاد حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کو مذہبی رہنما جانے ورنہ گمراہیت کی دلدل میں پھنس کر دین وایمان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔

(شمس التواریخ، ص: ۱۲، سن اشاعت: ۱۹۸۹ء)

خانقاہِ شمسیہ رائچور کے دوسرے بزرگ اور خانقاہ کے چودھویں سجادہ نشین حضرت مولانا سیّد شاہ چندا حسینی قدس سرہٗ اپنے وقت کے عالم کبیرہ، شیخ طریقت اور صاحبِ حال وقال تھے۔ قدرت نے انھیں نگاہوں سے پینے اور پلانے کی صلاحیت عطا کی تھی۔ دینی غیرت اور مسلکی تصلب کا یہ حال تھا کہ بڑے بڑے علم وفضل کی حامل شخصیات ان کے معیار ومنہاج پہ کھری نہیں اُتر پاتی تھیں۔ ثقہ راویان بتاتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی محبت سے ان کا خمیر تیار ہوا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے اعلیٰ حضرت کی عظمت شان کا خطبہ پڑھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اعلیٰ حضرت کا جنونِ عشق انھیں وراثت میں ملا تھا۔ ان کے گھر میں اُجالوں کی کمی نہیں تھی۔ آقائے کریم مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کا تقدس بھی انھیں حاصل تھا۔ حضرت مخدوم سمناں کے روحانی وعرفانی فیضان سے بھی ان کا کشکولِ حیات بھرا تھا۔ وہ شب وروز روشنی تقسیم کرتے تھے۔ ان سارے فضائل و کمالات کے باوجود اعلیٰ حضرت کی فکر کا چراغ ان کے حریم دل میں پورے شباب پہ روشن تھا۔ وہ اسی چراغ کی روشنی میں چہروں کو دیکھتے تھے۔ اعلیٰ حضرت کی ذات ان کے لیے کسوٹی تھی، معیار تھا اور پیمانہ تھا سونے چاندی کو جانچنے کے لیے۔ جب انھیں مسند سجادگی ملی تو ان کے تیور میں اور بھی شدت آگئی۔ مسلک اعلیٰ حضرت کی ترویج، تشہیر اور تبلیغ ان کی حیات کا ترجیحی عنوان بن گیا۔ ان کی دینی، مذہبی اور مسلکی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کو صرف اس لیے پسند نہیں کرتے تھے کہ انہوں نے اپنی کتاب ''زلزلہ'' اور ''زیر وزبر'' میں اساطین وہابیہ و دیابنہ کے نام کے ساتھ مولانا کا استعمال کیا ہے۔ علمائے راسخین کا بیان ہے کہ انہوں نے اعلیٰ حضرت کی کتب ورسائل کو اپنے سینے میں محفوظ کرلیا تھا، اوران کتب ورسائل کے عامل بھی تھے۔ مسلک اعلیٰ حضرت سے سرموانحراف واختلاف کرنے والوں سے وہ کسی طرح کی

رسم و راہ قطعی پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اعلیٰ حضرت کی ذات ہی معیارِ حق وصداقت تھی۔ جو لوگ مسلک اعلیٰ حضرت کو وہابیہ، دیابنہ کا دیا ہوا نعرہ کہتے ہیں وہ اہلسنّت و جماعت کی ایک تقدس مآب تاریخ کو لاشعوری طور پہ مشکوک بنانا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو حضور حافظ ملّت کی دہلیز پہ بیٹھ کر معافی مانگنے کی ضرورت ہے اور وہ معاف کر دیتے ہیں تو ان کی دنیا وآخرت دونوں روشن ہو جائے گی۔ حضور حافظ ملّت نے ادارے کا جو دستور بنایا تھا وہ مستقبل کو دیکھ کر بنایا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہمارے خوانِ علم کے بعض تربیت یافتہ ادارے کے دستور کی اس دفعہ کو مشکوک بنانے کی غیر محمود کوشش کریں گے۔ حضرت سیّد شاہ چندا حسینی بھی مستقبل شناس تھے اس لیے آپ نے خانقاہ کے دستور میں مسلک اعلیٰ حضرت کو شامل کیا اور اپنی اولاد امجاد اور اخلاف کو مسلک اعلیٰ حضرت سے رشتہ مضبوط سے مضبوط تر رکھنے کی ہدایت کی۔ ان کے وصیت نامے کا کچھ حصہ ذیل میں ملاحظہ کریں۔

میری اولاد تا قیامت اخلاقِ حسنہ کی حامل رہے، اور فساق وفجار، کفار ومشرکین و مرتدین اور بدمذہبوں سے نفرت رکھے، اور ان کی صحبت سے بچے۔ بالخصوص میرے بعد آستانہ عالیہ شمسیہ رائچور کا سجادہ نشین وہی ہوگا جو عالم دین ہوگا، اور مجددِ اسلام سیّدنا اعلیٰ حضرت بریلوی قدس سرہٗ کو اپنا مذہبی پیشوا تسلیم کرے گا، اور آپ کی تصنیفات کو حق جانے گا۔ بالخصوص تمہید ایمان، حسام الحرمین، خالص الاعتقاد، الدولۃ المکیہ اور الکوکبۃ الشہابیہ کو حق اور صحیح تسلیم کرنا اس کے لیے ضروری ہوگا۔ اسی کے ساتھ اکثر خانقاہوں میں رفض وشیعیت عام ہو چکی ہے اس لیے سیّدنا اعلیٰ حضرت کی کتاب ردّ الرفضہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی کتاب ''تحفۂ اثنا عشریہ'' کو حق جانے گا۔ اور ان کے ساتھ میری کتاب ''مرأۃ اباحیت'' اشرف الاخلاق، شمس العقائد اور الاخلاق المرجیہ پر اس کا عمل ہوگا۔ عالم نہ ہو تو کم از کم فارسی اور اردو کا اچھی طرح جاننے والا ہوگا۔ اور ''بہارِ شریعت'' چھ حصوں کے ساتھ اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ''تحفۂ اثنا عشریہ'' اور میری کتاب کو حق مان کر ان پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔ ورنہ اس کی بیعت (خارج) اور عاق سمجھا جائے گا۔ (شمس التواریخ، ص: ۱۵، ۱۹۸۹ء بحوالہ پیغامِ رضا فکر وتدبیر نمبر ۲۰۰۹ء)

خانقاہِ عالیہ شمسیہ رائچور، کرناٹک کا شمار ملک کی ممتاز اور نمائندہ خانقاہوں میں ہوتا ہے۔ حضرت سیّد شاہ شمس عالم حسینی قدس سرہٗ اور حضرت سیّد شاہ چندا حسینی قدس سرہٗ نے اپنے اخلاف واولاد کو جو نشانِ منزل دیا ہے خانقاہ کے ذمہ دار اسی نشانِ منزل کو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ خانقاہ کے پندرہویں سجادہ نشین حضرت سیّد شاہ حسینی اشرفی مصباحی قدس سرہٗ نے اپنے خاندانی اور خانقاہی اسلاف و اکابر کی نصیحتوں اور وصیتوں کی حفاظت کی اور اسے ہر طرح کے داغ دھبوں سے بچائے رکھا۔ حضرت سیّد شاہ حسینی میاں اشرفی مصباحی قدس سرہٗ کا حال ہی میں وصالِ پُر ملال ہوا ہے۔ آپ کی ذات تاریکی میں منارِ ہدایت تھی، طوفانوں سے کھیلنے کا جذبہ آپ کو وراثت میں ملا تھا۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی محبت آپ کی رگوں میں خون کے ساتھ گردش کرتی تھی۔ آپ نے اعلیٰ حضرت کے مخالفین سے سر اٹھا کر جینے کا حق چھین لیا تھا۔ فتنے اور فتنہ گر آپ سے سراسیمہ رہا کرتے تھے۔ خوف وخشیت آپ کو اپنے آبا سے وراثت میں ملی تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ کسی سے خوف زدہ نہیں ہوتے تھے۔ ناگپور کی سنیت کی تزئین میں اپنے عہد میں دو شخصیات نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ ایک آپ کی شخصیت ہے اور دوسری شخصیت مفتی غلام محمد خان صاحب کی ہے۔ ناگپور یا ملک میں فکر رضا کے خلاف جب بھی کوئی فتنہ نمودار ہوتا، اس فتنے کو کچلنے میں یہ دونوں حضرات کفن بدوش ہو جاتے۔ مفتی غلام محمد خان صاحب کی دینی، ملی، مذہبی اور مسلکی خدمات کا طویل سلسلہ ہے۔ اس کے تذکرے کے لیے دفاتر چاہیے۔ مفتی غلام محمد صاحب، حضور مفتیٔ اعظم ہند قدس سرہٗ کے مرید بھی تھے، مراد بھی تھے، خلیفہ بھی تھے اور اعتماد بھی تھے۔ اتنی عظیم شخصیت حالات کے جبر کا شکار ہو گئی، اور ان کی حیات وخدمات کا سارا تانا بانا بکھر کر رہ گیا۔ آج ہم چاہتے ہوئے بھی تکریم کے ساتھ ان کا نام نہیں لے سکتے۔ مسلک اعلیٰ حضرت کے ایک پُر جوش نمائندے کی قبر پہ جبر کا اتنا شدید پہرا ہے، ہم چاہتے ہوئے بھی فاتحہ خوانی کے لیے حاضر نہیں ہو سکتے ہیں۔ ایسا تصور بھی نہیں تھا کہ اہلسنّت کا ماہِ کامل اس طرح گہن

آلود ہو جائے گا۔ ان کے حالات پہ حضور مفتیٔ اعظم ہند قدس سرہٗ کی روح پاک اپنی قبر میں یقیناً مضطرب ہوگی

حضرت مولانا مفتی سیّد شاہ حسینی اشرفی مصباحی قدس سرہٗ تاحیات مفتی غلام محمد صاحب کے دست راست بنے رہے۔ ناگپور کی سرزمین پر فلاحِ ملّت کا کوئی منصوبہ ان دونوں شخصیات کو نظر انداز کر کے ترتیب نہیں دیا جاسکتا تھا۔ شیخ الاسلام سیّد محمد مدنی میاں اور ان کے چھوٹے بھائی سیّد محمد ہاشمی میاں نے جب اعلیٰ حضرت اور مسلک اعلیٰ حضرت پہ بے جا سوالات قائم کیے تو ان دونوں شخصیات نے ان کے سوالات کے غبارے کی ہوا نکال دی۔ اعلیٰ حضرت اور مسلک اعلیٰ حضرت کے خلاف تاریخ کی یہ پہلی آواز تھی۔ ذاتی مفادات کی خاطر مذہبی اور مسلکی صداقتوں کو تاویلات سے بوجھل کرنے کی روایتیں تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔ حضرت سیّد شاہ احمد اشرف قدس سرہٗ اور حضور محدثِ اعظم ہند قدس سرہٗ یہ دونوں پاکانِ امّت درس گاہِ رضویہ کے خاص تربیت یافتہ تھے۔ یہ دونوں بزرگوار اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ سے اپنی وفاداری کو تاحیات داغدار ہونے نہیں دیا۔ حضور محدثِ اعظم ہند قدس سرہٗ نے جس انداز میں اعلیٰ حضرت کی بے پناہ عظمتوں کا خطبہ پڑھا ہے یہ انھیں کو زیب دیتا ہے۔ اپنے آبا کی روشن روایات کو اتنا جلد فراموش کردینے کی مثال بھی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ سیّد شاہ محمد مدنی میاں اور سیّد ہاشمی میاں کو اپنی تقصیرات کا اس وقت احساس ہوا جب پانی سر سے اوپر ہو چکا تھا۔ اختلاف کسی نہ کسی صورت میں آج بھی زندہ ہے اور یہ اختلاف جماعت اہلسنّت کے لیے ناسور بن چکا ہے۔ اس بے لذت اختلاف کو جلد از جلد ختم ہو جانا چاہیے۔ جماعت اہلسنّت کو اس کی بہت بڑی قیمت چکانی پڑ رہی ہے، لیکن کچھ لوگ بضد ہیں کہ ہم اس اختلاف کو کسی بھی صورت میں ختم ہونے نہیں دیں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور جب اس کا کوئی بندہ خلوصِ نیت کے ساتھ معافی کا طالب ہوتا ہے تو رب کی رحمت مائل بہ کرم ہوتی ہے اور اس کی معافی قبول کرلی جاتی ہے لیکن ہماری جماعت میں بعض شخصیات ایسی ہیں جو کسی کی معافی قبول نہیں کرتیں، حضور تاج الشریعہ نے اس اختلاف کو کبھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا، اور اس اختلاف میں ان کا کبھی کوئی رول بھی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس حوالے سے جب بھی ان سے گفتگو کی جاتی وہ امن کے حامی نظر آتے۔ ہمیں اس وقت شدید افسوس ہوا جب مرکزی دار الافتاء میں علما کی ایک جماعت کے سامنے حضرت مولانا خواجہ مظفر حسین رضوی نے فرمایا کہ میں اہلِ کچھوچھہ کو جماعت اہلسنّت سے خارج کر دوں گا۔ اس پر خیر الاذکیا حضرت مولانا محمد احمد مصباحی صاحب ناظمِ تعلیمات جامعہ اشرفیہ نے اپنی شدید برہمی کا اظہار فرمایا اور خواجہ صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ انھیں جماعت سے کیسے خارج کر دیں گے، جبکہ وہ آپ سے زیادہ ردِّ وہابیہ کرتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ مذہبی بھول بھی ہوگی اور سیاسی بھول بھی ہوگی۔ مولانا محمد احمد مصباحی صاحب ابھی بقید حیات ہیں کوئی بھی ان سے معلوم کرسکتا ہے۔ ممکن ہے یہ باتیں ان کے ذہن سے نکل گئی ہوں۔ ان کے ساتھ مولانا عبد المبین نعمانی صاحب بھی تھے۔ اس اختلاف کے بہت سارے اوراق راقم الحروف کے ذہن میں محفوظ ہیں، اگر سارے اوراق کھول دیے جائیں تو راقم کے قتل کا فتویٰ جاری ہوسکتا ہے۔ اس اختلاف کی بہت ساری گرم محافل ومجالس میں ہماری شرکت رہی ہے۔ ہم نے بہت سارے فتنوں کو محسوس پیکر میں دیکھا ہے۔

''اختری مذہب'' یہ کتاب حضور تاج الشریعہ اور حضور محدثِ کبیر کے خلاف ترتیب دی گئی ہے۔ اس کتاب میں زبان وبیان کو جو تیور اپنایا گیا ہے اسے ایک سنجیدہ معاشرہ قبول نہیں کرسکتا۔ مرتب کا نام بھی فرضی ہے، مقامِ اشاعت بھی فرضی ہے اور سن اشاعت بھی نہیں ہے۔ جب صداقت کا اظہار مقصود ہے تو صحیح نام ونسب سے خوف کیا؟ ویسے اس اختلافی ماحول میں عموماً کتب ورسائل فرضی ناموں سے شائع ہوتے تھے۔ فسادی عناصر کتابیں لکھتے تھے۔ اشاعت کے لیے بریلی شریف یا اس کے پاس پڑوس شہروں کے نام کا استعمال کرتے تھے۔ جبکہ ان کتابوں سے مشائخ بریلی شریف کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ اہلِ کچھوچھہ کے خلاف جو کتابیں منظر عام پر آتی تھیں ان کا بھی حال کچھ ایسا ہی تھا۔ مشائخ بریلی شریف اور مشائخ کچھوچھہ مقدسہ کے درمیان جو باہمی روابط تھے اس کے روشن شواہد تاریخ کے سینے میں محفوظ ہیں۔ اعلیٰ

حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی شخصیت سب کے لیے نشانِ منزل تھی، اور مشائخ کچھوچھہ مقدسہ اس نشانِ منزل کے پُرجوش نمائندے تھے۔ فتنوں کی کاشت کرنے والوں نے احترام وعقیدت کی ساری تختیوں کو نذر آتش کردیا۔ دونوں خانوادوں کے درمیان عقیدت و احترام کی لہلہاتی فصلوں کو دیکھنے کے لیے آج ہماری آنکھیں ترستی ہیں۔ دعا ہے کہ کوئی مسیحائے وقت آئے اور عقیدت واحترام کی بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم مربوط کردے۔ متن کی عبارتیں ٹھیک ہیں، آتش زنی کے فرائض حاشیہ انجام دے رہا ہے۔ جب بھی فاصلوں کو مٹانے کی کوششیں ہوتی ہیں عین وقت پر حاشیہ اپنی چال چل جاتا ہے۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی ذات وشخصیت کو کسی بھی جہت سے نظر انداز کرنا دینی، ملی اور مسلکی خودکشی کے مترادف ہے۔ انہوں نے عشق وعرفان کا جو چراغ روشن کیا ہے، اس میں ان کے آنسوؤں کی خوشبو کو پھیلتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اہلسنّت و جماعت کی سرحدوں کو ہر طرح کے خطرات سے محفوظ کردیا ہے۔ انہوں نے دینی قدروں کی حفاظت و صیانت کے لیے جو دائرے بنائے ہیں وہ قرآن واحادیث کے نور سے مزین ومنور ہیں اس لیے اگر کوئی شخص ان کے بنائے ہوئے دائروں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے تو بے نام ونشان ہوجاتا ہے۔ ان کی ذات سب کے لیے دربارِالٰہی و بارگاہِ رسالت پناہ ﷺ تک پہنچنے کے لیے صراطِ مستقیم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے اپنے ہر طرح کے ذاتی اختلافات سے بالاتر ہوکر ان کے قدموں میں جگہ بنانے کی کوشش کی جائے، اسی میں دارین کی سرفرازیوں کے راز پنہاں ہیں۔ انہوں نے اپنی خدمات کا صلہ غلامیِ مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کو متعین کیا ہے۔

لا و رب العرش جس کو جو ملا ان سے ملا
بٹتی ہے کونین میں نعمت رسول اللہ کی
وہ جہنم میں گیا جو ان سے مستغنی ہوا
ہے خلیل اللہ کو حاجت رسول اللہ کی
اہلسنّت کا ہے بیڑا پار اصحابِ حضور
نجم ہے اور ناؤ ہے عترت رسول اللہ کی
ہے گلِ باغ قدس رخسار زیبائے حضور
سروِ گلزار قدم قامت رسول اللہ کی
اے رضاؔ خود صاحبِ قرآں ہے مداحِ حضور
تجھ سے کب ممکن ہے پھر مدحت رسول اللہ کی

جس زمانے میں ''اختری مذہب'' کتاب کی اشاعت ہوئی، اسی زمانے میں ایک ملاقات میں حضرت مولانا مفتی مطیع الرحمٰن مضطرؔ صاحب نے راقم سے فرمایا کہ تم اس کتاب کا جواب لکھو۔ راقم نے عرض کیا کہ حقیر اس اختلاف کی ابتدا جانتا ہے نہ انتہا، پھر جواب کیسے لکھ سکتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ تم ٹیپ ریکارڈ لے کر آجانا۔ میں تقریر کردوں گا تم اسے اپنے قلم سے ترتیب دے دینا، لیکن اس کام کے لیے میں خود کو تیار نہیں کرسکا، اس حوالے سے اب سوچتا ہوں تو افسوس ہوتا ہے۔

حضرت مولانا خواجہ مظفر حسین صاحب اور حضرت مولانا مفتی مطیع الرحمٰن مضطر صاحب دونوں کا خمیر ایک ہی مٹی سے تیار ہوا تھا، اور دونوں بریلی شریف کے کبھی وفادار نہیں رہے۔ مائک کے اقتدا کے جواز میں دونوں دھاکہ کرنے والے تھے لیکن جب انھیں خبر ہوئی کہ مفتی نظام الدین صاحب نے مائک کے جواز پہ اپنا مقالہ تیار کرلیا ہے اور فقہی سمینار مبارک پور میں وہ مقالہ پڑھا جائے گا تو دونوں نے اپنے مقالات کو ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا اور عدم جواز پہ تال ٹھونک کر میدان میں آگئے۔ نتیجہ کے طور پر ''قولِ فیصل'' سامنے آئی۔ اپنے پیر خانہ بریلی شریف کے یہ دونوں کتنے وفادار تھے اس حوالے سے ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ بدایوں شریف میں سالم میاں کے زیر سرپرستی جب یہ دونوں حضرات درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے تو طلبہ کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے فرمایا کہ مجھے جو روحانی سکون بدایوں میں ملتا ہے وہ بریلی شریف میں نہیں ملتا۔ طلبہ کے احتجاج پہ انہوں نے اپنے بیان سے رجوع کیا۔ مضطرؔ صاحب کا حال بھی اپنے استاذ سے مختلف نہیں ہے۔ جب یہ الہ آباد میں ابو میاں کے زیر قدم تھے تو سیّد سراواں کی فضیلت بیانی کے ضمن میں بیان دیا کہ مجھے اپنے پیر کی گلیوں میں جو خوشبو ملتی تھی وہی

خوشبو یہاں محسوس ہوتی ہے۔ یہی مضطرؔ صاحب جب مبارک پور حاضر ہوئے تو مبارک پور کی محبت ان پہ اس طرح حاوی ہوئی کہ انہوں نے بریلی شریف کی مرکزیت ہی سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ بے شک بریلی شریف اہلِ سنّت کا مرکز ہے لیکن مرکز سے مراد اعلیٰ حضرت سے حضور مفتیٔ اعظم ہند تک۔ وہ جذبات میں ہے اور تھا کے فرق کو بھی بھول گئے۔ جب دیابنہ وہابیہ کی محبت کا ان پہ بخار چڑھا تو فرمایا کہ دیابنہ وہابیہ جماعت اہلسنّت سے خارج ہیں لیکن دین اسلام میں داخل ہیں۔ جبکہ علمائے عرب وعجم کا اس بات پہ اتفاق ہے جو دیابنہ وہابیہ کے عقائد سے باخبر ہونے کے بعد دیابنہ وہابیہ کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔ مضطرؔ صاحب ایک زمانے تک ٹی وی، ویڈیو کے خلاف محاذ آرا رہے لیکن جب موٹی رقم کی پیشکش ہوئی تو جواز ہی کا فتویٰ نہیں دیا بلکہ اسے مستحسن قرار دے دیا۔ ابھی حال ہی میں مضطرؔ صاحب نے اہلِ کچھوچھہ کے ایک اجتماع میں شرکت کے دوران قوالی بالمزامیر کے جواز کا قول کیا ہے۔ صدیوں کی تاریخ میں ہمیں ایسا متنازع شخص نظر نہیں آیا۔ ڈاکٹر طاہر القادری کو پوری دنیا بالاتفاق کافر ومرتد مانتی ہے لیکن مضطرؔ صاحب کے نزدیک اس کی سنیت میں کسی طرح کا کلام نہیں کیا جاسکتا۔ سنت وشریعت کے حوالے سے ان کے اس طرح کے درجنوں بیانات ہیں۔ ابھی ان کے جسم کی ہڈیوں میں توانائی ہے دیکھیے اپنی بچی ہوئی اس مختصر زندگی میں وہ اور کیا کیا گل افشانیاں کرتے ہیں۔ یہ دونوں استاذ اور شاگرد حضور مفتیٔ اعظم ہند قدس سرہٗ کے مرید ہیں نہ خلیفہ ہیں۔ اگر مرید وخلیفہ ہوتے تو مرید وخلیفہ کے اصول اور تقاضے کا بہر حال پاس ولحاظ کرتے۔ ایک غیرت مند انسان مرنا قبول کر لیتا ہے لیکن اپنے مرشد کی عظمتوں کا سودا نہیں کرتا۔

حضرت مولانا خواجہ مظفر حسین صاحب تو اپنی قبر شریف میں محوِ استراحت ہیں۔ مضطر صاحب ابھی بقید حیات ہیں، اگر انہیں توبہ ورجوع کی توفیق مل جاتی ہے تو کسی قدر آبرو بچ سکتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ انھیں اخلاص نیت کے ساتھ توبہ ورجوع کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

حضرت مولانا مفتی سیّد شاہ حسینی میاں اشرفی مصباحی قدس سرہ اور مولانا مفتی غلام محمد صاحب رضوی تا حیات طوفانوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ اعلیٰ حضرت، مسلک اعلیٰ حضرت اور بریلی شریف کی مرکزیت کے حوالے سے ان دونوں نے کسی کی رعایت نہیں کی۔ فتنہ پرور عناصر ان دونوں کے سائے سے خوف زدہ رہا کرتے تھے۔ جب مائک کی اقتدا کے جواز کا فتنہ اٹھا تو یہ دونوں حضرات میدان میں آئے، اور اپنے زبان وقلم سے اس فتنے کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اس حوالے سے حضرت حسینی میاں قدس سرہٗ کی کتاب ''لاؤڈ اسپیکر'' کا شرعی حکم نامی کتاب پر شرعی محاسبہ'' میں تفصیلات دیکھی جاسکتی ہیں۔

لاؤڈ اسپیکر کے عدم جواز پہ علمائے اہلسنّت میں کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا۔ اس حوالے سے جب حضور مفتیٔ اعظم ہند قدس سرہٗ کی تحقیقات منظر عام پہ آئیں تو دو چند افراد نے تحقیقات سے اختلاف کیا اور جواز کا قول بھی کیا لیکن ان کے دلائل اطمینان بخش نہیں تھے۔ پھر بعد میں جب انھیں اپنی خطا کا احساس ہوا تو انہوں نے انشراحِ صدر کے ساتھ رجوع بھی کر لیا۔ جواز کا قول کرنے والوں میں دو نام بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ بحر العلوم حضرت مولانا مفتی سیّد افضل حسین مونگیری علیہ الرحمہ اور حضرت مولانا مفتی جہانگیر خان صاحب رضوی علیہ الرحمہ اتفاق سے یہ دونوں حضرات حضور مفتیٔ اعظم ہند قدس سرہٗ کے مریدین اور خلفا میں شامل ہیں۔ جواز کا قول کرنے کے باوجود حضور مفتیٔ اعظم ہند نے ان دونوں سے کبھی کسی طرح کا تعرض نہیں کیا۔ ان دونوں پہ جب حضور مفتیٔ اعظم ہند کی تحقیقات کے اسرار واضح ہوئے تو دونوں نے اپنا رجوع نامہ شائع کر دیا۔ دونوں شخصیات کے رجوع کے حوالے سے حضرت مولانا محمد حسن علی میلسی قدس سرہ لکھتے ہیں:

علامہ مفتی افضل حسین صاحب مونگیری اور علامہ مفتی جہانگیر خاں صاحب کا رجوع نامہ۔

بحر العلوم مفتی سیّد افضل حسین صاحب مونگیری نے ایک عرصۂ دراز تک بریلی شریف میں مسند تدریس وافتا کو زینت بخشی۔ اور پھر آخری ایام میں ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے اور وہاں فیصل آباد میں مستقل سکونت اختیار فرمائی۔ آپ نے لاؤڈ اسپیکر کے مسئلہ میں حضور مفتیٔ اعظم ہند کے فتویٰ سے اختلاف کیا اور جواز کا فتویٰ صادر کر دیا، مگر ہندوستان کے دورے پر جب تشریف لائے تو انہوں نے

مفتی مطیع الرحمٰن مضطرؔ پورنوی کو گواہ بنا کر علی الاعلان اپنے فتویٰ سے رجوع کا اعلان کیا اور حضور مفتیٔ اعظم ہند کے فتویٰ کی تائید وتصدیق کی۔ آپ کے قابلِ فخر شاگرد علامہ مفتی جہانگیر خان صاحب رضوی نے بھی لاؤڈ اسپیکر کے استعمال پر جواز کا فتویٰ دیا تھا مگر حال ہی میں انہوں نے اپنے فتویٰ سے رجوع کیا اور اپنا اعلان شائع فرمایا، جس کو ناظرین کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔

لاؤڈ اسپیکر پر نماز کے عدم جواز کے سلسلے میں مشاہیر مفتیانِ کرام و مشائخ اہلسنّت کا اتفاق ہے، صرف مفتی سیّد افضل حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اختلاف کیا تھا۔ میں بھی مفتیٔ اعظم ہند قدس سرہٗ وغیرہ مشاہیر مفتیانِ اہلسنّت کے فتویٰ سے اتفاق کرتا ہوں اور اب تک جو میرا جواز کا فتویٰ تھا اس سے رجوع کرتا ہوں اور میں اعلان کرتا ہوں کہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے۔ امر بکتبہ محمد احمد المعروف جہاں گیر خاں غفرلہ۔ یہ تحریر میرے سامنے لکھی گئی اور اس پر حضرت علامہ مفتی محمد احمد جہاں گیر خان صاحب نے میرے روبرو دستخط فرمائے۔ (فقیر محمد اختر رضا خاں ازہری غفرلہ)

میں بھی اس تحریر و دستخط کا چشم دید گواہ ہوں: صغیر احمد جوکھن پوری، ۲۰ صفر المظفر ۱۴۱۶ء ماخوذ از قرآنی نماز بمقابلہ مائیکروفونی نماز مطبوعہ ممبئی۔ لاؤڈ اسپیکر پہ کسی بھی صورت میں نماز نہیں ہوتی۔ اس پہ ماضی حال کے تمام فقہا و مفتیانِ کرام کا اتفاق ہے۔ مائک کے جواز پہ حضور مفتیٔ اعظم ہند قدس سرہٗ کا فتویٰ ذیل میں ملاحظہ کریں۔

وقت نماز لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ہرگز ہرگز نہ ہو، اگر چہ وہ ایسا ہو کہ خود آواز لے لیتا ہو، اس میں آواز نہ ڈالی جاتی ہو، اگر چہ تحقیق سے یہی ثابت ہو کہ اس سے جو آواز مسموع ہوتی ہے وہ متکلم ہی کی آواز ہے۔ ایک مذہب اس میں یہ بھی ہے کہ وہ آواز غیر ہے، اس کو مرجوح رکھا جائے۔ اعتبار متکلم کی اس آواز کا ہے جو اس کے دہن سے نکلی ہو اور فضا کی ہوا متحرک کرتی ہوئی بے کسی اور قوت کے کان تک پہنچی۔ وہ آواز جو کسی قاسر سے ٹکرا کر سکون پا گئی اور اس قاسر کی ٹکر کی قوت سے جو متحر ہو کر پلٹی اس کا نہیں۔ جیسے گنبد سے ٹکرا کر جو آواز پلٹتی ہے یا کنوئیں سے پلٹتی ہوئی آواز یا صحرا کی صدائے بازگشت نامعتبر ہے۔ آیت سجدہ پلٹی ہوئی آواز سے جیسے مسموع ہو اس پر سجدہ اس لیے واجب نہیں ہوتا کہ اب جو پلٹی ہوئی آواز ہے یہ اگر چہ وہی دہن قاری سے نکلی ہوئی ہے مگر قاسر سے ٹکرانے کی وجہ سے اس حیثیت کی نہ رہی۔ اب اس قاسر کی ٹکر کی قوت سے کان تک پہنچی ہے (لاؤڈ اسپیکر میں) یہ نہیں کہ بجلی کی قوت سے فضا کی ہوائے قاسر جہاں تک دفع ہوگئی ہے۔ بے کسی اور قاسر سے ٹکرائے ہوئے بے اس قاسر کی قوت دفع کے شامل ہوئے محض بجلی کے اس فعل سے کان تک پہنچی ہے۔ ھذا ما عندی والعلم بالحق عند الباری وتعالی عالم۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی کوئی عبارت ایسی نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے نزدیک محض لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر انتقالات کرنے والے کی نماز درست ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم فقیر مصطفیٰ رضا قادری دار الافتاء بریلی شریف ۶/ربیع الآخر ۱۳۸۰ھ

لاؤڈ اسپیکر پر نماز کے ناجائز وحرام ہونے کے حوالے سے حضرت مولانا مفتی غلام محمد خاں رضوی جامعہ امجدیہ ناگپور لکھتے ہیں:

ائمہ دین، فقہا وعلمائے معتمدین کا کسی مسئلہ کی حلّت وحرمت پر اتفاق ہو جائے تو وہ مسئلہ اجماعِ امت کہلاتا ہے۔ اجماعِ امّت پر عمل واجب ہے۔ اس کے خلاف عمل کرنا گمراہی اور امّت مسلمہ میں فتنہ و فساد برپا کرنا ہے جو سخت حرام ہے۔ حجج شرطیہ میں اجماعِ امّت ایک شرعی حجت ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر نماز کے ناجائز وحرام ہونے پر اجماعِ امّت ہو چکا ہے۔ مجددِ اسلام سیّدنا امام احمد رضا خاں صاحب بریلوی قدس سرہٗ کے زمانۂ حیات میں کسی نے اس بدعت سیئہ کو نماز میں رائج کرنے کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا، اور نہ کسی نے آپ کی بارگاہ میں اس کے بارے میں سوال پیش کیا۔ اس لیے اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے مستقل طور پر لاؤڈ اسپیکر کے ناجائز وحرام ہونے پر کوئی رسالہ تصنیف نہیں فرمایا لیکن سیّدنا امام احمد رضا خان فاضل بریلوی قدس سرہٗ کے بعد وہ علمائے کرام جو مذہب اہلسنّت کی اتھارٹی تسلیم کیے جاتے تھے، انہوں نے اس مسئلہ پر اپنی کامل علمی بصیرت سے خوب تحقیق فرمائی، اور ان علمائے کرام نے اس کے ناجائز وحرام ہونے پر اتفاق کر کے اس مسئلہ کو اجماعِ امّت کی شکل دے دی۔ سیکڑوں علمائے اہلسنّت نے لاؤڈ اسپیکر پر نماز کے ناجائز ہونے پر اتفاق کرلیا۔ ان

میں سے چند اکابر علمائے کرام کے اسمائے مبارکہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں، جن کی بارگاہوں میں صاحبانِ علم و دانش کی بلند پیشانیاں خمیدہ نظر آتی ہیں۔

(۱) حضرت صدرالافاضل مولانا سیّد نعیم الدین صاحب مراد آبادی
(۲) صدرالشریعہ حضرت مولانا حکیم امجد علی اعظمی
(۳) شہزادۂ اعلیٰ حضرت مفتیٔ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد مصطفیٰ رضا خاں بریلوی
(۴) رئیس المفکرین حضور محدثِ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد میاں کچھوچھوی
(۵) شیر بیشۂ اہلسنّت حضرت مولانا مفتی حشمت علی خاں پیلی بھیت
(۶) تاج العلما حضرت مولانا مفتی سیّد شاہ اولادِ رسول قادری برکاتی مارہرہ شریف
(۷) حضور برہانِ ملّت حضرت مولانا مفتی برہان الحق جبل پوری
(۸) مفتیٔ اعظم کانپور حضرت مولانا مفتی رفاقت حسین قادری اشرفی کانپور
(۹) اجمل العلما حضرت مولانا مفتی اجمل حسین سنبھل
(۱۰) مفتیٔ اعظم دہلی حضرت مولانا مفتی محمد مظہر اللہ دہلی
(۱۱) محبوبِ ملّت حضرت مولانا مفتی محبوب علی خاں سنی بڑی مسجد ممبئی
(۱۲) حضور حافظ ملّت حضرت مولانا مفتی عبد العزیز امجدی اشرفی جامعہ اشرفیہ مبارک پور
(۱۳) محدثِ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی سردار احمد قادری رضوی
(۱۴) استاذ العلما حضرت مولانا مفتی ابو البرکات سیّد احمد قادری رضوی پاکستان
(۱۵) خلیل العلما حضرت مولانا مفتی محمد خلیل کاظمی محدث امروہوی
(۱۶) حضرت مولانا مفتی عبدالحامد بدایونی
(۱۷) مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد صاحب داد خاں
(۱۸) استاذ العلما حضرت مولانا مفتی محمد عمر نعیمی مراد آبادی
(۱۹) مفسر قرآن واحادیث حضرت مولانا مفتی احمد یار خاں نعیمی
(۲۰) حضرت مولانا مفتی اعجاز ولی خاں رضوی بریلی
(۲۱) حضور مجاہد ملّت حضرت مولانا مفتی محمد حبیب الرحمٰن قادری رضوی اڑیسہ
(۲۲) رئیس المحققین حضرت مولانا مفتی غلام جیلانی میرٹھی
(۲۳) قطب مدینہ حضرت مولانا ضیاءالدین مدنی رضوی مدینہ منورہ
(۲۴) سیّد العلما حضرت مولانا مفتی سیّد شاہ آلِ مصطفیٰ قادری برکاتی مارہرہ شریف
(۲۵) حضرت مولانا مفتی طیب دانا پوری
(۲۶) شمس العلما حضرت مولانا قاضی شمس الدین قادری رضوی جونپوری
(۲۷) حضرت مولانا مفتی محمد رضوان الرحمٰن فاروقی اندور
(۲۸) مفتیٔ اعظم کراچی حضرت مولانا مفتی محمد وقار الدین قادری پاکستان
(۲۹) سرکار کلاں حضرت مولانا سیّد شاہ مختار اشرف اشرفی الجیلانی کچھوچھہ شریف
(۳۰) ملک العلما حضرت مولانا مفتی محمد ظفر الدین قادری رضوی عظیم آباد پٹنہ
(۳۱) سراجِ ملّت حضرت مولانا مفتی صاحبزادہ محمد حسین علی پوری
(۳۲) شارح بخاری حضرت مولانا مفتی شریف الحق امجد جامعہ اشرفیہ مبارک پور
(۳۳) حضرت مولانا مفتی پیر جماعت علی صاحب علی پور شریف
(۳۴) بحر العلوم حضرت مولانا مفتی عبدالمنان اعظمی مبارک پور

(لاؤڈ اسپیکر پر نماز، مع تحقیقات اکابر اہلسنّت، ص: ۸۴، ۸۵، رضا اکیڈمی، ممبئی)

لاؤڈ اسپیکر پر نماز کے ناجائز وحرام ہونے پر فقہا و مفتیانِ کرام کا اجماع ہے۔ اجماعِ امّت کے خلاف کسی طرح کی پیشرفت امّت محمدیہ ﷺ میں فساد و بگاڑ پیدا کرنا ہے۔ تاریخ میں مولانا مفتی نظام الدین صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اجماعِ امّت کے خلاف اپنی تحقیق پیش کی اور لاؤڈ اسپیکر پر نماز کے جواز کا قول کیا۔ ان کا یہ عمل امّت میں ایک فتنۂ عظیم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے مبارک پور نے ان کی کتاب کی اشاعت کے فوراً بعد کتاب سے اپنی براءت کا اعلان کیا۔ ملک اور بیرونِ ملک بھی ان کی کتاب بیزاری کی مار جھیل رہی

ہے، لیکن مفتی نظام الدین صاحب اپنے فیصلے اور اپنی تحقیقات پہ اٹل ہیں بلکہ اب تو وہ باضابطہ لاؤڈ اسپیکر پہ نماز کے جواز کی تبلیغ بھی کر رہے ہیں، اور ان کی تبلیغ سے حضور مفتیٔ اعظم ہند کے بعض نام نہاد مریدین بھی متاثر ہو رہے ہیں اور اپنے زیر اختیار مدارس و مساجد میں مائک کو رواج بھی دے رہے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی سیّد شاہ حسینی میاں اشرفی مصباحی قدس سرہٗ کی ذات کثیر الصفات اسلاف و اکابر کا آئینہ تھی۔ ان کو غیرتِ دینی و شریعت وافر مقدار میں ملی تھی۔ دین و شریعت کے آئینے پہ کسی طرح کا غبار دیکھنا وہ اپنی خاندانی شرافت و نجابت کی توہین سمجھتے تھے۔ ان کے عزمِ دینی، جذبِ یقینی اور غیرتِ خاندانی کو دیکھ کر وقت کا بڑے سے بڑا طوفان بھی پسینے میں ڈوب جاتا تھا۔ ان کی ذات کبھی مصلحت کی شکار نہ ہوئی۔ وہ اپنے حریفوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کے قائل تھے۔ ان کی حیات میں جب بھی کوئی دین و شریعت مخالف آواز بلند ہو تو وہ تیر و تفنگ سے لیس ہو کر میدان میں اُتر جاتے تھے۔ ان کی سانسوں سے فکر رضا کی خوشبو پھوٹتی تھی۔ ان کو اپنے آبا سے جو چیزیں وراثت میں ملی تھیں ان میں فکر رضا کی حیثیت پیشِ لفظ کی ہے۔ وہ عالم ربانی تھے، وقت کے عظیم فقیہ تھے۔ درسگاہ کے رمز شناس مدرس تھے اور اہلسنّت کے زندہ ضمیر صحافی تھے۔ وہ تاحیات ''سنی آواز'' کے پلیٹ فارم سے ضمیروں کو بیدار کرتے رہے۔ ان کی ہر پالیسی بہت واضح ہوتی تھی۔ انہوں نے خوف کا چہرہ کبھی دیکھا نہیں تھا بلکہ خوف ان کا چہرہ دیکھ کر اپنی راہ بدل دیتا تھا۔ بڑے بڑے حاملانِ شریعت و کاملانِ راہِ طریقت ان کے حضور زبان کھولنے سے گھبراتے تھے۔ ان کی ذات شریعت و طریقت کی برہنہ تلوار تھی۔

وہ بابِ شریعت میں کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ماہنامہ ''سنی آواز'' کے وسیلے سے اہلسنّت کی جس انداز میں ترجمانی کی ہے وہ تاریخ کا روشن باب ہے۔ ان کا مذہبی اور مسلکی جنون ہر عہد کے لیے چراغِ رہگذر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے مذہبی اصولوں پہ عمل کی راہ میں انہوں نے کبھی کسی کے روٹھنے کی فکر نہیں کی۔ وہ باضابطہ خطیب نہیں تھے لیکن ان کا مختصر خطاب بھی دوسرے خطبا کے گھنٹوں کے خطاب پہ بھاری ہوتا تھا۔ وہ تاحیات حدودِ شریعت کی پاسبانی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ غفلت کا کوئی جھونکا کبھی ان کے قریب نہیں ہو سکا۔ مسلک اعلیٰ حضرت کے خلاف جب بھی کوئی آواز بلند ہوتی تھی تو وہ مخالف کی زبان اس کے حلق سے نکال لیتے تھے۔ وہ لاؤڈ اسپیکر کے جواز پہ مفتی نظام الدین صاحب کی کتاب کو مسلک اعلیٰ حضرت کے خلاف ایک فتنۂ عظیم تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس فتنے کے جراثیم سے جسدِ ملّت کو بچانے کے لیے وہ بروقت میدان میں آئے اور اپنے جذبوں کی تپش سے اس کے پھیلتے ہوئے اثرات کو روک دیا۔ مفتی نظام الدین صاحب کو کئی ایک خط میں آپ نے اس طرح مخاطب کیا ہے۔ حسینی صاحب لکھتے ہیں:

یہ مسئلہ عموم بلویٰ کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ بھلے مانس! پہلے یہ تو بتاؤ کہ عوام میں اور اپنے حلقۂ اثر میں اور مریدوں میں جا جا کر ورغلایا کس نے؟ جب راہ ہموار ہوگئی پھر زبردستی اس بلا کو ان پر کس نے مسلط کیا؟

اسی لیے میں نے آپ کی کتاب کو فتنہ کہا تھا، جس پر آپ نے کتاب و سنّت، اقوالِ ائمہ سے مجھ سے دلیل طلب کیا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ مجھے دلائل کی طرف لا کر کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔ آپ کی کتاب نے جو فتنہ برپا کیا ہے، میں نے اس کی طرف چند اشارے کیے ہیں۔ جہاں جہاں آپ کی کتاب کے ذریعہ یہ بلا پھیلائی جا رہی ہے وہاں یہ اطلاع آنے پر آپ کی کتاب کے اثر کو زائل کرنے کے لیے اپنے مجموعہ کی فوٹو کاپیاں بھجوانی پڑ رہی ہیں۔

ان شاء اللہ العزیز بہت جلد مجموعہ خطوط کو کتابی شکل دے کر پورے ملک میں عام کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس کا مقصد آپ کی دل آزاری نہیں بلکہ عوام کو اکابر علما کے موقف سے واقف کرانا اور اس بدعت سیئہ سے بچانا مقصود ہے۔ مہربانی آپ کی کہ میرے ایک چھوٹے سے جملے پر بھڑک کر اعتراض کا خط روانہ نہ فرماتے تو عوام کو سادہ زبان میں اچھا خاصا مواد نہ ملتا۔ اس پر میں آپ کا مشکور ہوں۔

عوام کے اندر آپ کی کتاب کے ذریعہ اس طرح خلفشار و ہنگامہ اور معرکہ آرائی کا قائم ہونا، اختلاف پیدا ہونا اور آپس میں لڑنا

بھڑنا، ایک دوسرے کو تکلیف پہنچانا فتنہ نہیں ہے؟ اور وہ بھی اشرفیہ مبارک پور کے نام سے، حالانکہ اشرفیہ مبارک پور کا دامن اس ناپا کی سے قطعی پاک ہے۔

میں اربابِ دار العلوم اشرفیہ مبارک پور کی توجہ بھی اس جانب مبذول کروانا چاہوں گا کہ اشرفیہ مبارک پور کے نام سے بُرائی کو پھیلانے کی جو کوشش کی جارہی ہے اس کا سد باب کیسے ہوگا؟ بالفرضِ محال یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ مسئلہ اجماعی نہیں اختلافی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ مسئلہ حادثہ (نو پید) ہے۔ فقہی مسئلہ ہے کہ جب کسی نو پید مسئلہ میں علما اختلاف کریں تو ان میں جو زیادہ پرہیزگار ہونے کے ساتھ فقاہت کے اعلیٰ منصب پہ فائز ہیں ان کے قول پر عمل کیا جائے گا۔ اور اگر تفقہ میں سب متقارب اور ورع میں یکساں ہیں تو کثرتِ رائے کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

نو پید مسائل میں یہاں تک احتیاط رکھی گئی ہے کہ اس سے تو آپ اتفاق کرہی لیں گے کہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال انھیں نو پید مسائل میں سے ہے۔ اب لاؤڈ اسپیکر کے جواز و عدم جواز وغیرہ مفسد و مفسد ہونے پر توجہ کیجیے تو یہ بات صاف واضح ہے کہ اکابر علمائے اہلسنّت کا وہ طبقہ جو علم و عمل، تفقہ و ورع میں اعلیٰ مقام رکھتا تھا، اس نے بالاتفاق اسے ناجائز و مفسد مانا ہے۔ کیا جمہور علما کی رائے کے خلاف عمل کروانے پر زور دینا اور اسی کو رواج دینا فتنہ نہیں تو اور کیا ہے۔ اور ایک بدعت قبیحہ کو رواج دینے کے لیے ایک سنت متواترہ کو کاٹنا اور اس کو بند کروانا ہی سب سے بڑا فتنہ ہے۔ (لاؤڈ اسپیکر کا شرعی حکم نامی کتاب پر، شرعی محاسبہ، ص: ۶۵، ۶۶، ۱۹۹۴ء)

لاؤڈ اسپیکر مفسد صلاۃ ہے، اس باب میں ماضی حال دونوں کا اتفاق ہے۔ اس اتفاق کے خلاف اگر کوئی شخص اپنی تحقیق پیش کرتا ہے تو اسے فتنہ ہی قرار دیا جائے گا۔ نماز میں مکبرین کا ہونا سنت متواترہ ہے، لاؤڈ اسپیکر سے یہ سنت متواترہ مٹ جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مردہ سنت کو زندہ کرتا ہے تو اسے شہیدوں کا ثواب ملتا ہے اور اگر کوئی شخص کسی سنت کے مٹانے کا ذریعہ بنتا ہے تو اسے کس قدر وبال و عتاب دیا جائے گا اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی سیّد شاہ حسینی میاں اشرفی مصباحی قدس سرہٗ زندہ دل، زندہ فکر اور زندہ ضمیر عالم دین تھے۔ انھیں علمی، فکری اور نسبی وجاہت حاصل تھی۔ کسی کربلا میں اُترنے کے لیے حسینی جگر اور جذبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو دل جذبِ حسینی سے سرشار ہوتا ہے وہ ہر مخالف شریعت طوفان کے سامنے آہنی دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ ہمارے پیچھے کتنے لگو ہیں۔ اس کی زبان پہ ہر وقت یہ نغمات مچلتے رہتے ہیں کہ۔

صلیب و دار سہی دشت کوہسار سہی
جہاں بھی تم نے پکارا ہے جاںثار چلے
سنی جو بانگِ جرس تو بمقتل گاہِ جفا
کفن بدوش اسیرانِ زلفِ یار چلے

حضرت مولانا مفتی سیّد شاہ حسینی میاں اشرفی مصباحی قدس سرہٗ کی شخصیت جماعت اہلسنّت کے لیے قیمتی اثاثہ تھی۔ ان کی کتاب حیات کے ہر ورق میں جلوے برستے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی ذات ایک ایسا چراغ تھی جس میں دھواں نہیں تھا۔ ان میں مذہبی، فکری اور مسلکی شدت تھی جسے علما، فقہا اور صوفیا نے محمود کہا ہے۔ دین و دیانت کے باب میں ان کا پیمانہ بھی بہت سخت تھا۔ اچھے اچھے لوگ ان کے پیمانے کے روبرو کھڑا ہونے سے خوف محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے سونے اور چاندی کو باہم کبھی ملنے نہیں دیا۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی کتابِ حیات ان کے لیے چراغِ منزل تھی۔ وہ تا حیات فریبِ نظر کے کبھی شکار نہیں ہوئے۔ وہ انتہائی سادہ دل، سادہ طبیعت اور سادگی پسند انسان تھے۔ لوگ ان کی سادگی سے فائدہ اُٹھا لیتے تھے۔ جو لوگ دین و شریعت کے باب میں مخلص ہوتے، ان کے لیے ان کا بابِ کرم ہر وقت کھلا رہتا۔ اور جن کے کردار و عمل سے دین و شریعت کی پیشانی شکن آلود ہوتی، ان کے لیے ان کی ذات شمشیر بے نیام اور تیغ برہنہ ہوتی۔ میراثِ اسلاف کا تحفظ ہی ان کا مقصد حیات تھا۔ جن کے طرزِ عمل سے میراثِ اسلاف پہ ضرب پڑتی، ان کے تعاقب کا کوئی موقع وہ اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ لاؤڈ اسپیکر کے جواز کے حوالے سے مفتی نظام الدین صاحب کی کتاب

میراثِ اسلاف پہ ایک ضربِ کاری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے انہوں نے مجاہدانہ کردار ادا کیا۔ اس باب میں انہوں نے مفتی نظام الدین صاحب کے بونے قد کو نہیں دیکھا، بلکہ انہوں نے یہ دیکھا کہ اس کتاب سے میراثِ اسلاف کے آئینے پہ دھول پڑتی ہے۔ انہوں نے امّت کی نماز جیسی عبادت کو بچانے کے لیے ایک مخلص داعی کا کردار ادا کیا۔ ان کے اس داعیانہ کردار کی ہر زمانے میں ستائش کی جائے گی۔

حضرت مولانا مفتی سیّد شاہ حسینی میاں اشرفی مصباحی قدس سرہٗ کی شخصیت غیرتِ دینی سے عبارت تھی۔ وہ ہر وقت جلووٴں کے ہجوم میں رہتے تھے۔ ان کی ایک طویل خاندانی تاریخ ہے۔ ان کے پاس جو اشرفیت تھی وہ سونے چاندی سے زیادہ نکھری ہوئی اشرفیت تھی۔ ان کی اشرفیت پہ حضرت مخدوم سمناں قدس سرہ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ جس اشرفیت پہ حضرت مخدوم سمناں کی مہر ہوتی ہے وہ ہواوٴں کا رُخ دیکھ کر بدلتی نہیں ہے، بلکہ وہ ہواوٴں کے رُخ کو بدل دیتی ہے۔ جب بعض اہلِ کچھوچھہ کی طرف سے اعلیٰ حضرت اور مسلک اعلیٰ حضرت کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی تو ان کی اشرفی غیرت بے چین ہوگئی۔ پھر انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ اس اختلاف کی سربراہی کون کر رہا ہے؟ مسلک اعلیٰ حضرت پورے دین اسلام کے مجموعہ کا نام ہے اگر اس کے خلاف پھیلتے ہوئے طوفان کو روکا نہیں گیا تو پورا اسلامی نظام خطرے میں آجائے گا، اور امّت درست مذہبی شعور سے محروم ہوجائے گی۔ وہ اس بات سے بہت زیادہ پریشان تھے کہ کیا ذاتی مفاد کے لیے مسلکی صداقت کا خون کیا جاسکتا ہے؟ جو لوگ ایسا کر رہے ہیں وہ یقیناً رموزِ دین و شریعت سے ناآشنا ہیں۔ اعلیٰ حضرت اور مسلک اعلیٰ حضرت کے خلاف بعض اہلِ کچھوچھہ کی طرف سے جو آواز بلند ہوئی وہ انتہائی بھیانک تھی۔ اور یہ آواز ان لوگوں نے بلند کی تھی جن کے خاندانی دستور میں اعلیٰ حضرت اور مسلک اعلیٰ حضرت سے غیر مشروط وفاداری شامل تھی۔ ایک باشعور اشرفی عالم دین نے راقم سے بیان کیا کہ جن لوگوں نے اعلیٰ حضرت اور مسلک اعلیٰ حضرت کے خلاف بغاوت کا صور پھونکا تھا، اگر ان کے پاس سیادت نہ ہوتی تو روئے زمین سے ان کا نام و نشان مٹا دیا جاتا۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی بارگاہِ الٰہی و دربارِ رسالت پناہی میں مقبولیت کا اندازہ ہم جیسے کم فہم لوگ نہیں لگا سکتے۔ وہ آج بھی دربارِ رسالت مآب ﷺ میں روز حاضری دیتے ہیں۔ ان کی ذات سے الجھنا عتابِ الٰہی وغضب رسالت پناہی کو دعوت دینا ہے۔ اعلیٰ حضرت اور مسلک اعلیٰ حضرت کے خلاف بعض اہلِ کچھوچھہ کی طرف سے جو آوازیں بلند ہوئیں، ذیل میں اس کے چند نمونے ملاحظہ کریں۔ سیّد محمد ہاشمی میاں کا تقریری بیان ہے:

کیا اعلیٰ حضرت امام بریلوی کا مسلک خواجۂ اجمیر کے مسلک سے الگ ہے، مخدوم اشرف کے مسلک سے الگ ہے، الگ ہے تو بدعت ہے۔ احیاءِ سنّت، ردِّ بدعت امام احمد رضا کا پہلا کام نہیں، احمد رضا سے پہلے بھی احیاءِ سنّت کا کام ہورہا تھا۔ اگر امام احمد رضا یہ کام کر رہے ہیں تو امام ربانی اور دوسرے علما کی نقل کر رہے ہیں، ان کی باتوں کو دوہرا رہے ہیں۔ جب امام ربانی وغیرہ علما کا مسلک نہیں کہا جاتا تو مسلک اعلیٰ حضرت کیسے کہا جاسکتا ہے؟ میں بھی بیس سال سے ان ہی باتوں کو (تقریر کے ذریعہ) دوہرا رہا ہوں تو کیا مسلک ہاشمی کہا جائے۔ شیخ الاسلام، مثنیٰ میاں بھی دوہرا رہے ہیں تو کیا مسلک شیخ الاسلام سنّی مشن کہا جائے؟ جب مسلک ہاشمی، مسلک شیخ الاسلام اور مسلک مثنیٰ نہیں کہا جاسکتا تو مسلک اعلیٰ حضرت کیسے کہا جاسکتا ہے؟

اعلیٰ حضرت امام کا مسلک صرف دو باتیں ہیں ایک احترامِ سادات، دوسرے اسماعیل دہلوی کو کافر کہنے سے زبان روکنا، اگر کفِ لسان یعنی اعلیٰ حضرت کا مسلک چھوڑ دیا جائے جب بھی مسلک اہلسنّت باقی رہتا ہے، اس لیے کہ معتبر علمائے اہلسنّت، علمائے ربانیین نے مولوی اسماعیل کو کافر کہا ہے۔ (کچھوچھہ شریف کی تازہ تقریر کے ہاشمی کیسٹ پر حسینی معروضات، ص:۵،۶)

سیّد محمد ہاشمی میاں صاحب کے مذکورہ تقریری بیان پر حضرت مولانا مفتی سیّد شاہ حسینی میاں اشرفی مصباحی قدس سرہٗ کے معروضات کی ایک مختصر جھلک ذیل میں ملاحظہ کریں تاکہ صداقت کی خوشبو سے دل و دماغ معطر ہوجائے۔ یہاں سیّد محمد ہاشمی میاں کے تقریری بیان کو نقل کرنے اور حسینی معروضات کو پیش کرنے کا مقصد دبی ہوئی چنگاری

کو کریدنا اور سیّد محمد ہاشمی میاں صاحب کی کردار کشی نہیں ہے، بلکہ حضرت مولانا مفتی سیّد شاہ حسینی میاں اشرفی مصباحی قدس سرہٗ کی خدمات کو اُجاگر کرنا ہے۔ جب بھی کوئی مورخ اہلسنّت کے اس عہد نفاق کی تاریخ رقم کرے گا تو سیّد حسینی میاں صاحب کی حیات کے اس گوشے کو ضرور اُجاگر کرے گا۔ اگر وہ مورخ ایسا نہیں کرتا تو اس عہد کی تاریخ نامکمل نہیں سمجھی جائے گی۔ مسلک اعلیٰ حضرت کے خلاف یہ آواز اس خاندان کے ایک ذمہ دار فرد کی ہے جس کے خاندانی دستور میں رضا دوستی شامل رہی ہے۔ اس حوالے سے حضور سیّد شاہ علی حسین اشرفی میاں، حضور سیّد شاہ احمد اشرف اور حضور محدثِ اعظم ہند کے بیانات تاریخ کے اوراق میں بکھرے ہوئے ہیں۔ سیّد محمد ہاشمی میاں صاحب کا بیان اپنی خاندانی روایات اور صداقت کی پُرنور پیشانی کو لہولہان کرنے جیسا ہے۔ ہمارے دل میں کل بھی ان کی نسبی اور خاندانی وجاہت کا چراغ روشن تھا، آج بھی روشن ہے اور ان شاء اللہ تاحیات روشن رہے گا۔ اس حقیقت سے کوئی بھی ذی شعور انکار نہیں کرسکتا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ حسینی معروضات دیکھیے۔

گویا مولوی ہاشمی صاحب کے نزدیک تو دو جُز میں سے ایک جُز، مسلک اعلیٰ حضرت کا تو یوں ختم ہوگیا، رہا دوسرا احترامِ سادات، تو میاں مولوی ہاشمی صاحب اور ان کا حلقہ خود سیّد ہے لہٰذا احترامِ سادات کا جُز یوں غائب۔ نتیجہ یہ ہے کہ مولوی ہاشمی میاں صاحب اور ان کے حلقہ کے نزدیک مسلک اعلیٰ حضرت کا سرے سے کوئی وجود نہیں۔ سب خیریت ہی خیریت ہے۔

جب کچھوچھہ مقدسہ کے نئے اُبھرتے ہوئے نومذہب، صاحبِ مسلک پیروں اور مولویوں کا یہ حال ہے تو ان کے مریدین و معتقدین کی اگر نیّا ڈوب نہ جائے تو پار کیا لگے گی۔

گر چنیں مکتب و چنیں ملا کارِ طفلاں تمام خواہد شد

مسلک پر دعوتِ فکر

اے میں مولوی ہاشمی صاحب! سُنیے اور سمجھیے، حضور سیّدنا علی بن موسیٰ رضا ۲۰۳ھ، سیّدنا اماموسیٰ بن جعفر کاظم ۱۸۲ھ، حضور سیّدنا امام جعفر صادق ۱۴۸ھ، حضور سیّدنا امام محمد بن علی باقر ۱۱۴ھ، حضور سیّدنا زین العابدین ۹۴ھ، حضور سیّدنا سیّد الشہداء امام حسین ۶۱ھ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے بڑھ کر حضور خواجہ غریب نواز اجمیر اور حضور سیّدنا مخدوم سمنانی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا مرتبہ نہیں ہے۔

آج سیّدنا امام ابوحنیفہ، سیّدنا امام مالک، سیّدنا امام شافعی، سیّدنا امام احمد بن حنبل، سیّدنا امام ماتریدی، سیّدنا امام اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے مسلکوں اور مذہبوں پر بڑے بڑے اولیاء کرام، اغواث، اقطاب، نجباء، بدلاء اور عام فقہاء مشائخ علماء اور عامۃ المسلمین قائم ہیں اور ان مذہبوں اور مسلکوں پر فخر کرتے ہیں۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان حنفیوں، مالکیوں، شافعیوں، حنبلیوں، ماتریدیوں، اشعریوں کے مسلک، سیّدنا امام حسین، سیّدنا امام زین العابدین، سیّدنا امام باقر، سیّدنا امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مسلک سے الگ ہے۔ اگر آپ الگ بتائیں تو آپ ہی کے حکم پر بدعت ہے، گمرہی ہے اور اگر ایک ہی ہے تو کیوں حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، ماتریدی، اشعری مذہب و مسلک کہا جاتا ہے۔ حسینی مسلک، عابدی مسلک، باقری مسلک، جعفری مسلک اہلسنّت کیوں نہیں کہتے۔

میاں مولوی ہاشمی صاحب!

سیّدنا امام حسین سے لے کر ائمہ اہلِ بیت اطہار تک کے نام لے لے کر ان کی آڑ میں بدترین گمراہ بلکہ مرتد فرقے پیدا ہوئے تھے۔ آپ مسلکِ جعفریہ، فقۂ جعفریہ سے کیسے انکار کریں گے۔ یہ ہمارے ائمۂ اربعہ وائمۂ عقائد کا احسان ہے کہ انہوں نے اصل حسینی، صادقی، جعفری مسلک کو جھوٹے نام لیواؤں کے مسلکوں سے ممتاز کردیا اور اولیاء کرام سے لے کر علماء عظام تک سب ان مسالک پر چلنے ہی کو نجات کا سبب جانتے ہیں۔ ان ہی سنّی مسلکوں کے حوالے دیتے ہیں، کوئی حسینی مسلک، عابدی مسلک، باقری مسلک، جعفری مسلک نہیں کہتا ہے۔ ان ائمۂ اربعہ وائمۂ عقائد کے مسلکوں کا نام لے کر ان کو اختیار کرنا ہی دینی و دنیاوی عافیت کا باعث اور جھوٹے دعوے کرنے والوں سے ممتاز رہنے کا سبب ہے۔

میاں مولوی ہاشمی صاحب! یہاں یہ بھی سمجھیے کہ ائمۂ اربعہ وائمۂ عقائد نے وہی فرمایا ہے، جو ان کے عظیم المرتبت اساتذہ، تابعین اور

صحابۂ کرام نے فرمایا ہے۔ مگر کسی عاقل نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ یہ ائمہ وہی دو ہرا گئے ہیں جو تابعین اور صحابۂ کرام فرما گئے ہیں، لہٰذا حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، ماتریدی، اشعری مذہب و مسلک کیسے کہا جا سکتا ہے۔ ان ائمہ کے بعد ان کے مقلدین میں بڑے بڑے خطیب، علماء، فقہا، غوث، ابدال، قطب سب ہی گزرے ہیں مگر انہوں نے ہرگز یہ نہیں کہا ہم دین کی خدمات میں پوری عمر گزار کر امامِ اعظم، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل جیسے صاحبِ مذہب بن گئے ہیں۔

مسلکِ اعلیٰ حضرت

میاں مولوی ہاشمی صاحب! مسلک میں آپ نے صرف احترامِ سادات اور مولوی اسماعیل دہلوی کی تکفیر اور کفِ لسان کا سبق یاد کیا ہے اور اپنی سنّیت کے لیے ان دونوں کو بھی ختم کر دیا ہے، بقیہ میں اعلیٰ حضرت امام بریلوی قدس سرہٗ کی مسلک کے اعتبار سے ہمسری کر کے صاحبِ مسلک بن بیٹھے ہیں اور اپنے ماننے والوں کو گمرہی میں ڈالنے کے لیے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے۔ آپ بیس سال تک تقریریں کرتے کرتے بھی سمجھ نہ سکے یا تقریر سننے والوں اور معتقدین کی واہ واہ نے یہ سمجھنے کی فرصت ہی نہ دی کہ مسلکِ اعلیٰ حضرت کیا ہے؟

پچھلی دو صدیوں میں کیسے کیسے مرتد گمراہ فرقے پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی بن کر بلکہ اصحابِ طریقت ہونے کا دعویٰ کر کے دین میں فتنے اور ملّت میں افتراق و انتشار پیدا کیا ہے۔ بعض نے تقلید ہی کا انکار کر کے گمراہوں کی پوری پوری تقلید کی اور عقیدتاً و عملاً گمرہی پھیلائی اور اتنی ترقی کی کہ مرتدین کے ہمنوا و ہم مذہب بن گئے۔

ان ہی امامِ ربانی مجدد الف ثانی، محقق علی الاطلاق حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بلکہ فقہاء محدثین کے حوالے دے دے کر اور ان کے اقوال پیش کر کے دین و سنّیت کو ڈائنامائٹ کر کے اُڑا دینے کی کیسی کیسی حرکتیں کی ہیں۔

ملحدوں اور صلح کلّیوں نے اسلام دشمنوں کے سہارے رنگین نمائشوں سے اسلام کو مٹا دینے کے کیسے کیسے سامان مہیا کیے۔ ان کے علاوہ نئے نئے عقائد فاسدہ و باطلہ، نئی نئی گستاخیاں ایجاد کر کے ملّت میں کتنے بڑے بڑے فتنے پیدا کیے گئے۔

یہ اعلیٰ حضرت امام بریلوی قدس سرہٗ کی خداداد صلاحیت قدرت ہی تھی کہ ہر ہر بدعقیدگی، ایک ایک گستاخی، گمرہی اور غلط مسئلہ کا دلائل کثیرہ، وافرہ، قاہرہ سے ردّ کر کے ان مرتدوں، گستاخوں، گمراہوں، ملحدوں، صلح کلیوں کو اُلٹ کر رکھ دیا، تحت الثریٰ تک پہنچا دیا، سوائے ان کے جنھیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت نصیب فرمائی۔

آپ کے زمانہ کا کوئی فتنہ ساز، مخالفِ دین، دارالعلوم، عالمِ شہیر ایسا نہیں بچا ہوگا جس کو اعلیٰ حضرت نے اپنی تصنیفات یا اپنی خط و کتابت سے تنبیہ کر کے راہِ حق نہ دکھائی ہو۔ قدیم سنّی اداروں کے جدید کارگزاروں کی بے راہ روی پر گرفت کر کے انھیں راہِ راست پر لگانے کی انتھک کوشش نہ کی ہو۔ علمائے اہلسنّت کو بیدار و مستعد رکھنے کے لیے تنبیہات کے انبار نہ لگا دیے ہوں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر انتہائی کرم و احسان تھا کہ اس نے اعلیٰ حضرت امام بریلوی کو حیرت انگیز طاقتیں عطا فرما کر دین و ملّت کے چند مسائل کی نہیں بلکہ لاکھوں امور کی خدمات لی ہیں۔

(کچھوچھہ شریف کی تازہ تقریر کے ہاشمی کیسٹ پر حسینی معروضات، ص: ۷، ۸، ۹، ۱۰)

مشائخ کچھوچھہ شریف کے خلاف بریلی شریف میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، اور نہ اختلافی کسی کتاب کی مشائخ بریلی شریف نے کبھی حمایت کی ہے۔ سادات کا احترام مشائخ بریلی شریف کے خاندانی دستور کا روشن باب رہا ہے۔ اس حوالے سے ان کے خاندانی مزاج میں آج بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ حضور تاج الشریعہ کا بھی مشائخ کچھوچھہ شریف کے خلاف کوئی بیان نہیں ملتا۔ اختلاف کی آگ بجھانے کے لیے جب بھی کوئی تحریک اٹھی تو حضور تاج الشریعہ نے اس کی بھرپور حمایت کی اور اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ اس حوالے سے ہمارے پاس شواہد ہیں۔ ہم جلد انھیں پیش کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس باب میں حاشیہ بڑا پُرجوش تھا، اور ان کے مقاصد دینی نہیں تھے۔ ان کا جوش انتقامی تھا۔ اس میں ایک فریق مرکز کے جوش میں ہر حد سے گذر جانا چاہتا تھا، حالانکہ یہ ان کا ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ

تعبیر نہیں ہوگا۔ وہ اس فلسفے کو عملی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے کہ جب دو فریق باہم الجھتے ہیں تو تیسرے کا فائدہ یقینی ہو جاتا ہے۔ وہ اس فلسفے سے جاہل تھے کہ برآمد کی گئی شخصیات سے کوئی شہر کبھی مرکز نہیں ہوتا، مرکز کے لیے حضرت شاہ فضل رسول بدایونی اور حضرت فضل حق خیر آبادی جیسی شخصیات درکار ہوتی ہیں۔ مرکز بدلتا بھی ہے لیکن اب تبدیلئ مرکز کے لیے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ سے بڑی شخصیت کی ضرورت ہے۔ اعلیٰ حضرت کی تحقیقات وتصنیفات اسلام کی ساری آئینی تصویریں سمٹ آئی ہیں۔ اب جو بھی مرکزی، ملکی اور عالمی شخصیات پیدا ہوں گی انھیں اعلیٰ حضرت کی فکر ہی کے دائرے میں رہنا ہوگا۔

حضور تاج الشریعہ اپنے اسلاف واکابر کا آئینہ تھے۔ پوری دنیا میں وہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کا علم، ان کا مطالعہ، ان کا مکاشفہ اور ان کی شخصیت کا ہر آئینہ تقلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک مجدد وقت کے سارے کروفر ان کی شخصیت میں موجود ہیں۔ جس فکر سے دین وشریعت کا آئینہ گرد آلود ہو جائے اس فکر کی انہوں نے کبھی حمایت نہیں کی۔ ایسی شخصیت کو وہی شخص نشانہ بنائے گا جو پیش داور جواب دہی کے احساس سے محروم ہو۔ حضور تاج الشریعہ کا قصور صرف اتنا ہے کہ انہوں نے ٹی وی، ویڈیو، کے جواز کے خلاف قلم اُٹھایا اور ایک علمی، تحقیقی اور سنجیدہ جواب علمی دنیا کی عدالت میں پیش کیا۔ ان کے جواب میں جو معقولیت ہے اس کے خلاف دنیا کا بڑے سے بڑا صاحب وفضل قلم نہیں اٹھا سکتا۔ حضور تاج الشریعہ کے جواب میں غوثیت مآب کی رضا دور سے دکھائی دیتی ہے۔ اس کا اظہار انہوں نے خود غوثیت مآب کے دربار میں کیا ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ بعض اہلِ کچھوچھہ کی طرف سے بعض کتابیں ایسی آئی ہیں جن میں صرف حضور تاج الشریعہ کی کردار کشی کی گئی ہے اور کردار کشی بھی اس انداز میں کی گئی ہے کہ کوئی بھی سنجیدہ معاشرہ اس انداز کی حمایت نہیں کرسکتا۔ اس ضمن میں اس وقت ہمارے سامنے تین کتابیں ہیں۔ لفظ کملی پہ مولانا اختر کے شبہات کا ازالہ، اختری مذہب اور تحفۂ نور۔ ان میں اختری مذہب کا جواب ہماری نگاہوں سے اب تک نہیں گذرا ہے۔ لفظ کملی، کا جواب کسی نے دیا ہے اور تحفۂ نور، کا ایک انتہائی سنجیدہ جواب حضرت مولانا مفتی سیّد شاہ حسینی میاں اشرفی مصباحی قدس سرہٗ نے دیا ہے۔ انہوں نے اپنے جواب میں اپنے نسبی، خاندانی اور علمی وقار واعتبار کو کہیں بھی مجروح ہونے نہیں دیا ہے۔ ہم ان کے جواب کا ابتدائی حصہ قارئین کے فیصلے کے لیے ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

شہزادۂ کچھوچھہ سے ابتدائی خطاب

علومِ اسلامیہ کے فاضل جلیل مولانا سیّد احمد اشرف احسن نبیرۂ سجادہ نشین سرکار کلاں کچھوچھہ شریف، سے ہم یہ خطاب ان کی افسوسناک طرزِ تحریر کی وجہ سے کر رہے ہیں۔

اے شاہزادہ! آپ نے جو یہ ''تحفۂ نور برائے بریلی وناگپور'' لکھا ہے اور آپ ہی اس تصنیف کے ذمہ دار ہیں تو عرض ہے کہ آپ کے نو خیز علمی افکار میں وہ گالیاں کیسے داخل ہو گئیں جو ایک سیّد ذی وقار کے لائق ہرگز نہیں۔

دنیاوی لحاظ سے تہذیب واخلاق سے گری ہوئی بازاری آوارہ گردوں کی پیروی سے بھری ہوئی ہیں، قانوناً تعزیراتِ ہند میں داخل ہیں۔ اور دین کے اعتبار سے شریعتِ مطہرہ کے خلاف قابلِ تعزیر ہیں۔ آپ تو ماشاء اللہ سیّد ہونے کی وجہ سے شریعت کے محافظ ونگہبان ہیں۔ آپ نے سیّد ہونے کے باوجود دینِ مصطفےٰ ﷺ کے اپنے ہی ہاتھوں پر نچے اُڑانے پر کیسے کمر باندھ لی۔

شاہزادے صاحب! افسوس ہے کہ آپ کے علومِ اسلامیہ کی فضیلت وکمال کی رسائی ان عیوب وبرہنگی کو پہچاننے تک نہیں ہوسکی جو عام لوگوں کے لیے بھی سخت ننگ وعار ہے۔

شاہزادے صاحب! ابھی آپ شاید کچھ نہ سمجھے ہوں گے، نہ آپ کا اپنے آپ کو عالم وفاضل سمجھنا اور دوسروں کو بغیر سمجھے جاہل قرار دینے کی عادت کچھ سمجھنے دے گی۔ آیئے اور دیکھیے کہ آپ نے ایک سیّد زادے ہی نہیں بلکہ ایک مسلمان کی ذمہ داری کو پسِ پشت ڈال کر تہذیب واخلاق کا کیسے خون کیا ہے اور احکامِ شرع کی خلاف ورزی کیسی کی ہے اور باوجود علومِ اسلامیہ کے عالم وفاضل ہونے کے آپ

نے دنیا والوں کو اسلامی کیریکٹر، دینی اخلاق وتہذیب کا کیسا درس دیا ہے اور سرکارکلاں کے خانقاہی تقدس کو کیسے فراموش کیا ہے۔

تہذیب واخلاق سے گری ہوئی بدترین گالی

شاہزادے صاحب! آپ نے اپنے تحفۂ نور ص: ۲۰ پر تحریر فرمایا ہے: ’’اب یہاں بہت ضروری ہوگیا ہے کہ مولانا اختر رضا خاں صاحب کے بارے میں حقائق کو قدرے تفصیل سے بیان کیا جائے۔‘‘

یہاں یہ خیال رکھیے کہ آپ نے بیان کرنے کو بہت ضروری قرار دیا ہے۔ دوسرے آپ نے جو کچھ بیان کیا ہے انہیں حقائق بتایا ہے۔

آپ سے عرض ہے شاہزادے صاحب کہ یہ بیان کرنا کس حکمِ شرع سے فرض و واجب ہوگیا تھا، دین کی کون سی ضرویات میں آپ نے سمجھ لیا، آپ علومِ اسلامیہ کے فاضل ہیں، آپ اس کی کچھ تفصیل تو بیان فرماتے۔ یا تقویٰ و طہارت کی وہ کون سی ضرورت تھی کہ ان گالیوں کے بغیر آپ سرکارکلاں کی بارگاہ میں بیٹھ کر سلوک وطریقت کی منزلیں طے نہیں کر سکتے تھے۔

دوسرے حقائق جو آپ نے فرمایا ہے وہ آپ نے اپنے اسلامی علوم کی گہرائی کی بنیاد پر حقیقتیں قرار دیا ہے۔ یا سلوک میں آگے بڑھ کر آپ حقیقت تک ایسے پہنچے کہ حجابات اٹھتے ہی فحش گالیوں کے ذریعہ حقائق ولایت آپ پر روشن ہوتے چلے گئے۔ شاہزادے صاحب! آپ نے اپنے شرعی یا خانقاہی مذہب پر جو اہم حقیقت کو اپنی نوری تصنیف ’’تحفۂ نور‘‘ کے ص: ۳۰ پر آپ نے اپنے مناظرِ اعظم مولوی انتخاب قدیری سے نقل کیا ہے، اسے اچھی طرح دیکھیے: ’’مفعول یہ ہے کہ لڑکوں سے بُرا کام کراتا ہے۔ (تحفۂ نور، ص: ۳۰)

کیوں شاہزادے صاحب! مفعول لڑکوں سے بُرا کام کرانے والا جو آپ نے انتہائی فخر سے نقل کیا ہے، کیا آپ نے نقل و بیان سے پہلے اس کی ایسی شرعی تحقیق وتصدیق کرالی تھی جس سے آپ کو عام طور پر ملک بھر میں اس کو مشتہر کرنے کی شرعی اجازت مل گئی۔

آپ جواب دیں گے کہ ہم نے مولوی انتخاب قدیری سے یہ جملہ نقل کیا ہے، اس کی ذمہ داری مولوی انتخاب قدیری پر ہے۔

تو عرض ہے کہ جب بھی آپ نے فاضل اسلامیات اور شہزادۂ سرکارکلاں کچھوچھہ ہوکر اسلامیات کا خون ہی کیا ہے اور خانقاہی تقدس وطہارت کو اپنے ہاتھوں برباد کردیا جس سے خانقاہِ کچھوچھہ تو پاک ہے البتہ آپ کی ذات اور آپ کے حمایتی اور مولوی انتخاب قدیری بھی شرعی تعزیر اور دنیا کی قانونی سزا دفعہ ۵۰۰ میں گرفتار ہیں۔

(نئے کچھوچھوی مذہب سے انوکھے نور کی برسات، ص: ۳، ۴، ۵)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی ذات و شخصیت کا عرفان بھی نعمت الٰہی ہے، اور یہ نعمت سب کے حصے میں نہیں آتی۔ اعلیٰ حضرت کی ذات وشخصیت کا عرفان دنیا کی جن شخصیات کو ہوا، ان میں حضور محدثِ اعظم ہند قدس سرہٗ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ اسی لیے شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد محمد مدنی میاں اشرفی الجیلانی نے ’’اشرف التفاسیر‘‘ کی اس عبارت کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے کہ حضور محدثِ اعظم ہند تاحیات دین اسلام یعنی مسلک اعلیٰ حضرت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ شیخ الاسلام خود بھی اعلیٰ حضرت کی عظمت شان کے عارف ہیں، اسی لیے وہ مسلک اعلیٰ حضرت کو جماعت اہلسنّت کے لیے نشانِ امتیاز سمجھتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے ارشاد کا ایک ورق ذیل میں ملاحظہ کریں۔

وہ مقدس ہدایت یافتہ ونجات پابندہ جماعت آیۂ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ما انا علیہ واصحابی سے جس کی پہچان کرائی اور ید اللہ الجماعۃ فرما کر جن کا تعارف کرایا اسی جماعت کو ہندو پاک کے ایک بڑے حصے میں بریلوی کہا جاتا ہے۔ مجدد مائۃ حاضرہ امام احمد رضا قادری رضی اللہ عنہ کی فضیلت وعظمت اور ان کی رفعت شان کے اس گوشے کو نمایاں کرتا ہے جو مجددِ دین سابقین کی صف میں آپ کی ذات کو منفرد وممتاز کردیتا ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ لفظ ’’بریلویت‘‘ کو ’’غیر شعوری طور پر سہی‘‘ سنیّت کے ہم معنی ایک وسیع مفہوم میں استعمال کے آغاز کا سہرا خود انھیں منکرین عظمت نبوت کے سر ہے جنھوں نے تقدیس رسالت کی نفی ہی کو توحید الٰہی سمجھ رکھا ہے۔ اب کوئی اشاعرہ سے ہو یا ماتریدیہ سے، حنفی ہو یا شافعی، مالکی ہو یا حنبلی اگر وہ صحیح طور پر مسلک اہلسنّت و جماعت پر ہے تو مذکورۃ الصدر مروجہ اصطلاح کی روشنی میں ’’بریلوی‘‘ ہے۔ اب بریلوی ہونے کے لیے ’’فاضل بریلوی‘‘ کی ذاتِ گرامی

تک کسی کا سلسلۂ علمی یا سلسلۂ نسبی یا سلسلۂ بیعت وارادت کا پہنچنا یا شہر بریلی شریف میں مقیم رہنا ضروری نہیں رہ گیا۔ اسی لیے تو ایسوں کو بھی ''بریلوی'' کہا جاتا ہے جس نے عمر بھر بریلی شریف کو خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ نیز جس کا علمی یا نسبی یا کسی دوسری طرح کا کوئی سلسلہ فاضل بریلوی تک نہیں پہنچتا، بلکہ جہاں فاضل بریلوی کی آواز تک نہیں پہنچتی، اس اصطلاح نے ''بریلویت'' کو وہاں تک پہنچا دیا۔ اب اس دنیا کا ہر وہ فرد ''بریلوی'' ہے جو مسلک اہلسنّت پر واقعی طور پر گامزن ہے۔ غور فرمایئے کہ فاضل بریلوی کسی نئے مذہب کے بانی نہ تھے۔ از اوّل تا آخر مقلد رہے۔ ان کی ہر تحریر کتاب وسنّت اور اجماع وقیاس کی صحیح ترجمان رہی۔ نیز سلف صالحین وائمۂ مجتہدین کے ارشادات اور مسلک اسلاف کو واضح طور پر پیش کرتی رہی، وہ زندگی کے کسی گوشے میں ایک پل کے لیے بھی ''سبیل مومنین صالحین سے نہیں ہٹے۔''

اب اگر ایسے ارشاداتِ حقانیہ اور توضیحات وتشریحات پر اعتماد کرنے والوں، انھیں حق سمجھنے والوں اور دلائل و براہین کی روشن میں انھیں سلف صالحین کی روش کے مطابق یقین کرنے والوں کو ''بریلوی'' کہہ دیا گیا تو کیا بریلویت وسنّیت کو بالکل مترادف المعنی نہیں قرار دے دیا گیا، اور بریلویت کے وجود کا آغاز فاضل بریلوی کے وجود سے پہلے ہی نہیں تسلیم کر لیا گیا؟

المختصر ہمارے امام احمد رضا قادری بریلوی کی عظمت وشان اور بارگاہِ خدا اور رسول میں ان کی مقبولیت کو سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ان کی ذاتِ گرامی تو بڑی چیز، ان کے شہر کی طرف نسبت منسوب کر کے اہلِ ایمان اور اس کے عاشق رسول ہونے کی دلیل بن گئی ہے۔

اب میں الحمدللہ مسلکاً حنفی، نسبتاً جیلانی، مشرباً اشرفی اور وطناً کچھوچھوی ہونے کے باوجود اپنے کو ''بریلوی'' کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں۔ (بریلوی دورِ حاضر میں اہلسنّت کا علامتی نشان، بحوالہ پیغامِ رضا خصوصی شمارہ، ص:۲۹۹، ۳۰۰، ۲۰۰۷ء)

فکر رضا کے فروغ میں مشائخ کچھوچھہ شریف کی جو قربانیاں ہیں اسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ حضور محدثِ اعظم ہند کی کتابِ حیات کے ہر ورق سے فکر رضا کی خوشبو پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی عظمت شان ورفعت مکان کے حوالے سے ان کے جو اظہارات ہیں وہ انھیں کا حصہ ہیں۔ انہوں نے مطالعہ نہیں بلکہ مشاہدہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے ایک مدت تک اعلیٰ حضرت کے خوانِ علم سے خوشہ چینی کی ہے۔ انھیں پورے طور پر سمندر میں اُترنے کا موقع تو نہیں ملا لیکن ساحل پہ کھڑے ہو کر سمندر میں علوم وفنون کی اٹھتی ہوئی موجوں کا گہری نگاہ سے مشاہدہ کیا ہے۔ تاریخ میں اب تک اعلیٰ حضرت کا کوئی ثانی پیدا نہیں ہوا ہے۔ ان کے حاشیے پہ جو شخصیات نظر آتی ہیں ان کی حیثیت بدرِ کامل کے ارد گرد چمکنے والے ستاروں کی ہے۔ انہوں نے اعلیٰ حضرت سے استفادہ کیا، خوب استفادہ کیا۔ اتنا استفادہ کی کہ ان میں سے جو جہاں تھا وہیں آفتاب وماہتاب تھا۔ تاریخ میں ایسے باشعور خلفاء، تلامذہ اور مستفدین بہت کم شخصیات کے حصے میں آئے ہیں۔ تاریخ کا یہ بھی عجوبہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کے خلفا، تلامذہ اور مستفدین میں کوئی غیر عالم نہیں ملتا۔ ان کے خلفا، تلامذہ اور مستفدین پورے عرب وعجم میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا پیغام پوری دنیا کی سماعتوں سے ٹکرایا اور پوری دنیا پہ ان کے پیغام کے اثرات مرتب ہوئے۔ وہ اپنے عہد میں پوری دنیا کی سب سے موثر اور مقید آواز تھے۔ ان کے پھیلتے ہوئے اثرات کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکی۔ چونکہ رحمت الٰہی وکرمِ رسالت پناہی ہر وقت ان پہ سایہ فگن رہا کرتا تھا، اس لیے ان کے علوم وفنون کو وہبی قرار دیا گیا ہے۔ ان کے سرِ اقدس پر علوم وفنون کی جو دستار چمکتی دکھائی دیتی ہے تاریخ میں دور دور تک اس کی نظیریں نہیں ملتیں۔ یہ اہلسنّت کی کم نصیبی ہے کہ اہلسنّت کو اب تک اس عظیم ذات کا صحیح عرفان نہیں ہو سکا ہے۔ انھیں ہر وقت اپنی قوم ہی کا درد بے چین کیے رہتا تھا۔ وہ پوری دنیا سے ظلمات کے ہر ٹھکانے کو ڈائنامیٹ سے اڑا دینا چاہتے تھے۔ ان کی ہر کتاب آج بھی باطل کے خلاف ڈائنامیٹ کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم آج بھی ان کی تالیفات وتصنیفات کے حوالے سے شدید غفلت کے شکار ہیں۔ نور العارفین حضرت سیّد ابوالحسین احمد نوری قدس سرہٗ نے انھیں یونہی نہیں چشم وچراغِ خاندانِ برکات کہہ دیا تھا۔ حضرت نور العارفین کی

تحریر میں منہیات بھی ہیں کہ خبر دار اس چشم و چراغِ خاندانِ برکات سے الجھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ خاندانِ برکات کے رجسٹر سے نام نکال دیا جائے گا اور جو لوگ ان کی ذات سے الجھیں گے جماعت اہلسنّت کے رجسٹر سے ان کا نام خارج کر دیا جائے گا۔ اس کی مثالیں تاریخ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کا اپنے عہد کی جامع ترین شخصیات میں شمار ہوتا تھا۔ آپ نے اپنے قلم سے اپنے علوم وفنون کی تعداد ۵۹ ؍ بتائی ہے۔ ان علوم کے آپ ماہر بھی، امام بھی تھے اور استاذ بھی تھے۔ آپ کا عہد علوم وفنون کا عہد تھا۔ نامور دہر شخصیات دنیا کے ہر گوشے میں موجود تھیں لیکن ان شخصیات میں کوئی شخصیت آپ کی ہمسر و ہم پلہ نہیں تھی۔ اس عہد کی امامت اور بزرگی کی دستار صرف اور صرف آپ کے فرقِ اقدس پر دمکتی تھی۔ اس کے باوجود آپ نے کبھی خود کو بڑا نہیں سمجھا۔ خود فرماتے ہیں۔

محصور جہاندانی و عالی میں ہے
کیا شبہ رضاؔ کی بے مثالی میں ہے
ہر شخص کو اک وصف میں ہوتا ہے کمال
بندے کو کمال بے کمالی میں ہے
کس منہ سے کہوں رشک عنادل ہوں میں
شاعر ہوں فصیح، بے مماثل ہوں میں
حقا کوئی صنعت نہیں آتی مجھ کو
ہاں یہ ہے کہ نقصان میں کامل ہو میں

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ تا حیات لباسِ انکسار میں رہے، اور یہ شعور انھیں کاملانِ علوم وفنون کی بھیڑ میں بڑا بناتی ہے۔ ان کا مقام و مرتبہ یہ تھا کہ وہ ہر وقت آقائے دو عالم مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کرمِ خاص کی بارش میں نہاتے تھے۔ وہ چودھویں صدی کے مجدد تھے اور ان کی خدمات، تحقیقات اور غیر معمولی تصرفات کو دیکھتے ہوئے ان کے عہد نے انھیں مجددِ اعظم کے شرف و منزلت سے سرفراز کیا۔ صفِ مجددین میں بھی ان کے امتیازات ہیں اس لیے ان کے عہد کو ان کے مستفدین میں شمار کیا جائے تو کسی بھی اعتبار سے غلط نہ ہوگا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر پروفیسر مسعود احمد مظہری علیہ الرحمہ رقمطراز ہیں: آپ (اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ) کے وجودِ مسعود نے بریلی کو اہلِ علم وفکر کا مرکز بنا دیا تھا۔ برصغیر کے گوشہ گوشہ سے اہلِ علم آپ کی ملاقات کو آتے، خط و کتابت سے استفسارات کرتے، دینی معاملات میں راہنمائی حاصل کرتے، فقہی مشکلات میں آپ کی تحریروں سے استفادہ کرتے اور مزید وضاحت کے لیے حاضر خدمت ہوتے۔ اعلیٰ حضرت ایسے اہلِ علم کے لیے دیدۂ دل فرشِ راہ کرتے، علمائے کرام کے لیے اعزاز و اکرام کے تمام لوازمات مہیا کرتے اور اہلِ علم کی عزت افزائی کرتے۔ آپ کے پسندیدہ اور محبوب علمائے اہلسنّت میں سے مفتی ارشاد حسین رام پوری (م ۱۳۱۱ھ)، مولانا محمد عمر حیدر آبادی (م ۱۳۳۰ھ) اور علامہ احمد حسن کانپوری (م ۱۳۲۲ھ) کے اسمائے گرامی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ یہ حضرات آپ کے ممدوح بھی تھے اور مداح بھی۔

پروفیسر صاحب مزید آگے لکھتے ہیں: ’’اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بریلی کے مکتبۂ علمیہ میں بیٹھ کر برصغیر کے ہزاروں علماء کرام کی اعتقادی اور فقہی تربیت کی اور اپنی تحریروں سے ایک جہانِ علم کو متاثر کیا۔ آپ کے معاصرین میں سے سیکڑوں جلیل القدر علماء اہلسنّت نے ہمیشہ آپ ہی کو مرجع جانا۔ اگر چہ ایسے علماء کرام کی ایک طویل فہرست ریکارڈ میں موجود ہے، جنھوں نے آپ سے اکتسابِ علم کیا، مگر ہم چند کے اسمائے گرامی ہدیۂ قارئین کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مولانا عبد القادر بدایونی، مولانا عبد المقتدر بدایونی، مولانا عبد القدیر بدایونی، مولانا عزیز الحسن پھپھوندی، مولانا مصباح الحسن پھپھوندی، مولانا عبد الصمد پھپھوندی، مولانا ہدایت اللہ، مولانا سلامت اللہ، مولانا عنایت اللہ رام پوری، مولانا محمد عادل کانپوری، مولانا عبید اللہ کانپوری، مولانا مشتاق احمد کانپوری، مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی، مولانا عبد الکافی الہ آبادی، مولانا محمد فاخر الہ آبادی، مولانا نثار احمد کانپوری، مولانا ریاست علی شاہ جہاں پوری، مولانا ظہور الحسن رام پوری، مولانا احمد حسن امروہوی، مفتی کرامت اللہ دہلوی اور مولانا سیّد شاہ عبد الغنی سہسرامی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ قدرت کی عظیم نشانی تھے۔ ان کے اساتذہ کی تعداد نصف درجن سے بھی کم ہے، لیکن علوم وفنون کی تعداد سو، دوسو نہیں بلکہ عصرِ حاضر کی تحقیقات پانچ سو سے زائد بتاتی ہیں۔ علوم وفنون کے درجنوں سمندر ان کی ذات میں پنہاں تھے۔ وہ کرمِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دریا میں ہر وقت غوطہ زنی کرتے تھے اور فیضانِ غوثیت مآب کی بارش میں ہر وقت نہاتے تھے۔ قطرہ جب دریا سے ملتا ہے تو دریا ہو جاتا ہے۔ پھر اس دریا میں نہانے کے لیے تشنگانِ زمانہ جوق در جوق اس کے حضور حاضر ہوتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت سے علمی، فکری اور نظریاتی طور پر مستفیض ہونے والوں کی فہرست بڑی طویل ہے، ذیل میں چند ایسی شخصیات کے اسماء ملاحظہ کریں جو اپنے اپنے عہد میں پورے علمی معاشرے پہ حاوی رہے۔

حضرت مولانا وصی احمد محدث سورتی (م ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء)، حجۃ الاسلام حضرت مولانا حامد رضا بریلوی (م ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء)، حضرت مولانا شاہ ابو البرکات سیّد احمد قادری لاہور (م ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء)، صدر الافاضل حضرت مولانا سیّد نعیم الدین مرادآبادی (م ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء)، صدر الشریعہ حضرت مولانا حکیم امجد علی اعظمی (م ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء)، محدثِ اعظم ہند حضرت مولانا سیّد محمد اشرف اشرفی (م ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء)، پروفیسر سیّد سلیمان اشرف (م ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء)، حضرت مولانا محمد شریف سیالکوٹی (م ۱۳۰۷ھ/ ۱۹۶۱ء)، حضرت مولانا سراج احمد خانپوری (م ۱۳۴۲ھ)، حضرت مولانا سیّد دیدار علی الوری (م ۱۳۵۴ھ)، حضرت مولانا عبد السلام جبل پوری (م ۱۳۷۲ھ)، حضرت مولانا سیّد احمد اشرف اشرفی الجیلانی (م ۱۳۴۳ھ)، حضرت مولانا عبد العلیم صدیقی میرٹھی مبلغ اسلام (م ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء)، حضرت مولانا احمد مختار صدیقی میرٹھی (م ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء)، حضرت مولانا فتح علی قادری (م ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء)، ملک العلماء حضرت مولانا ظفر الدین بہاری (م ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء)، حضرت مولانا عمر الدین ہزاروی (م ۱۳۷۹ھ/ ۱۹۵۹ء)، حضرت مولانا محمد شفیع رضوی بیسل پوری (م ۱۳۳۸ھ)، حضرت مولانا رحیم بخش آروی (م ۱۳۴۴ھ)، حضرت مولانا رحم الٰہی منگلوری (م ۱۳۶۲ھ)، حضرت مولانا غلام جان ہزاروی (م ۱۳۷۹ھ)، حضرت مولانا ابو الحسنات سیّد محمد احمد قادری (م ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۰ء)، حضرت مولانا یار محمد بندیالوی (م ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۷ء)، حضرت مولانا مفتی اعجاز ولی خاں رضوی (م ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۱ء)، حضرت مولانا سیّد ہدایت رسول رام پوری (م ۱۹۱۵ھ)، حضرت مولانا حشمت علی خاں پیلی بھیتی (م ۱۳۸۰ھ ء ۱۹۶۰ء)، حضرت مولانا محبوب علی خاں (م ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء)، حضرت مولانا حسن رضا خاں بریلوی (م ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء)، حضرت مولانا سیّد ایوب علی رضوی (م ۱۳۹۰ھ/ ۱۹۷۰ء)، حضرت مولانا امام الدین قادری (۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء)، حضرت مولانا عبد الاحد پیلی بھیتی (م ۱۳۵۲ھ)، حضرت مولانا سیّد عبد الرشید عظیم آبادی، حضرت مولانا حکیم عزیز غوث بریلوی، حضرت مولانا حبیب اللہ قادری (م ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء)، حضرت مولانا ابراہیم رضا جیلانی (م ۱۳۶۹ھ/ ۱۹۶۵ء)، حضرت مولانا حسنین رضا خاں بریلوی (م ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء)، حضرت مولانا قاضی عبد الوحید فردوسی عظیم آبادی (م ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء)، حضرت مولانا حاجی محمد لعل مدراسی (م ۱۳۴۲ھ/ ۱۹۲۱ء)، حضرت مولانا سیّد محمد حسین میرٹھی، شیخ الاسلام حضرت مولانا ضیاء الدین قادری مدنی (م ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء)، حضور مفتئ اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمد مصطفیٰ رضا قادری بریلوی (۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء)

(مکتوباتِ امام احمد رضا خاں بریلوی، ص: ۱۱، ۱۲، ۱۳)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی ذات اپنے عہد میں علماء، مشائخ، اولیاء اور صاحبانِ فقہ وفتاویٰ کے ہجوم میں مثل آفتاب و ماہتاب کے تھی۔ جس طرح ایک شجر سایہ دار کے سائے میں دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے چلتا ہوا مسافر ٹھہر جاتا ہے، اسی طرح اعلیٰ حضرت کے عہد کا ہر چھوٹا بڑا آپ سے مستفیض و مستنیر تھا۔ یہی نظامِ قدرت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے کسی ایک بندے میں اتنے سارے کمالات جمع فرما دیتا ہے، کہ اس عہد کا بڑے سے بڑا فرد بھی اس سے بے نیاز نہیں ہوتا، بلکہ وہ حق وصداقت کی باوزن آواز، انداز اور علامت ہوتا ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر محمد مسعود احمد مظہری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: ”اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کے علمی کمالات کی شہرت کے آفتاب کی شعاعیں ابھی عالمِ اسلام کے افق پر طلوع ہی ہوئی تھیں کہ آپ دنیا کے گوشے گوشے سے اہلِ علم کی توجہ کا مرکز بن

گئے۔آپ کی مشہور تصنیف ''الدولۃ المکیہ'' پ داد و تحسین پیش کرتے ہوئے حضرت علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی (م ۱۳۵۰ھ)، مولانا عبدالحق الہ آبادی مہاجر مدنی (م ۱۳۳۳ھ) اور شیخ الائمۂ حرم ابوالخیر بن عبداللہ میر داد (م ۱۳۳۵ھ) قدس سرہم نے شاندار تقاریظ لکھیں۔ قیامِ حرمین شریفین کے دوران آپ کی ذہانت و ذکاوت کے اعتراف کے طور پر شیخ الخطبا عبداللہ بن عباس بن صدیق قاضئ مکہ (م ۱۳۴۳ھ)، شیخ سیّد اسماعیل خلیل محافظ کتب حرم (م ۱۳۳۸ھ) اور شیخ العلماء صالح کمال مفتئ مکہ و قاضئ جدہ (م ۱۳۳۲ھ) رحمۃ اللہ علیہم نے اعلیٰ حضرت کے اعزاز میں دی جانے والی ایک دعوت استقبالیہ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اہلِ مکہ کو آپ کے کمالاتِ علمیہ سے آگاہ کیا۔آپ کی روحانی اور علمی قابلیت کا یہ اثر تھا کہ حرمین شریفین کے اکثر اہلِ علم آپ سے بیعت ہوئے اور محدثِ جلیل سیّد عبدالحی بن عبد الکبیر الکتانی، شیخ عابد بن حسین مفتی مالکیہ اور شیخ محمد مرزوقی امین الفتویٰ مکہ مکرمہ جیسے اکابر علماء نے تو آپ سے سلسلۂ قادریہ میں خرقۂ خلافت حاصل کیا۔آپ کے تجدیدی کارناموں اور فقہ میں اہم فیصلوں کے پیشِ نظر سیّد حسین بن عبدالقادر طرابلسی، شیخ موسیٰ علی شامی ازہری اور الحاج محمد کریم اللہ مہاجر مدنی (خلیفہ حاجی امداداللہ مہاجر مکی) نے آپ کو مجدد کے لقب سے سرفراز فرمایا۔''

(مکتوباتِ امام احمد رضا خاں بریلوی،ص:۱۱)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی شخصیت اپنے عہد میں سند اعتبار کی حیثیت رکھتی تھی اور آج بھی ان کی یہ حیثیت مسلّم ہے۔جس نے اس سند کو اعتبار کی نگاہ سے دیکھا وہ زمانے میں معتبر ہو گیا اور جس نے قبول کرنے میں قیل و قال سے کام لیا وہ ہجوم میں گم ہوتا چلا گیا،اور تاریخ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔جو اعلیٰ حضرت سے اختلاف کرتا ہے وہ رحمت الٰہی کے دائرے سے نکل جاتا ہے اور وقت کی تپش سے اس کے جسم کا لہو خشک ہو جاتا ہے۔ایسے حادثات تاریخ کے سینے میں محفوظ ہیں۔آج بھی لوگ لاشعوری طور پر اعلیٰ حضرت کے خلاف محاذ آرائی کے جذبے کو ابھارنے کی فکر میں کوشاں ہیں۔ان کی عوامی مقبولیت کی روشنی دن بدن مدھم ہوتی جارہی ہے اور ان سے یہ احساس بھی چھین لیا گیا ہے۔ان کے قدموں کے نیچے سے زمینیں کھسکتی جارہی ہیں اور وہ خوش فہمی کی دف بجانے میں مصروف ہیں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کا اپنے عہد کی محبوب ترین شخصیات میں شمار ہوتا تھا۔ان کی محبوبیت صرف اپنے ملک ہی میں نہیں تھی بلکہ ان کی محبوبیت کی خوشبو سرحدوں سے بے نیاز تھی۔عرب و عجم، حل و حرم، شرق و غرب اور شمال و جنوب ہر جگہ ان کی مقبولیت کے نور سے آنکھیں منور تھیں۔مبلغ اسلام حضرت مولانا عبد العلیم صدیقی میرٹھی قدس سرہٗ رقمطراز ہیں:

حرم والوں نے مانا تم کو اپنا قبلہ و کعبہ
جو قبلہ اہلِ قبلہ کا ہے وہ قبلہ نما تم ہو
مزین جس سے ہے تاج فضیلت تاج والوں کا
وہ لعلِ پُرضیاء تم ہو وہ دُرِّ بے بہا تم ہو
عرب میں جا کے ان آنکھوں نے دیکھا جس کی صولت کو
عجم کے واسطے لاریب وہ قبلہ نما تم ہو
ہیں سیارہ صفت گردش کناں اہلِ طریقت یاں
وہ قطبِ وقت اے سرخیلِ جمعِ اولیا تم ہو
تمہیں پھیلا رہے ہو علمِ حق اکنافِ عالم میں
امامِ اہلسنّت نائب غوث الوریٰ تم ہو
بھکاری تیرے در کا بھیک کی جھولی ہے پھیلائے
بھکاری کی بھرو جھولی گدا کا آسریٰ تم و
وفی اموالھم حقٌ ہر اک سائل کا حق ٹھہرا
نہیں پھرتا کوئی محروم ایسے باسخا تم ہو
علیمؔ خستہ اک ادنیٰ گدا ہے آستانے کا
کرم فرمانے والے حال پر اس کے شہا تم ہو

(مبلغ اسلام نمبر،حیات وخدمات،ص:۸۸۴)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ عہدِ زوال میں عروج کی کرن بن کر چارہ گر ہوئے۔انھیں قدرت نے بے پناہ صلاحیتوں سے بہرہ ور فرمایا تھا۔ڈاکٹر سیّد غلام سمنانی دہلوی یونیورسٹی نے اپنے ایک تاثر میں اظہارِ خیال فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ سوال یہ

نہیں ہے کہ امام احمد رضا کیا تھے؟ سوال یہ ہے کہ وہ کیا نہیں تھے۔ اعلیٰ حضرت کی تالیفات، تصنیفات اور تحقیقات دیکھنے کے بعد بلند سے بلند تر گردنیں خم ہو جاتی ہیں۔ ان کے مخالفین ان پہ تبرا کرتے ہیں لیکن مخالفین اپنے تبرا کو ان کی کتابوں سے کبھی ثابت نہ کر سکے۔ تبرائیوں کو ان کی کتابوں نے ہمیشہ مایوس کیا۔ ان کی کتابوں کا حرف حرف سنّت و شریعت کے نور سے منور ہے۔ آج تک دنیا کے بڑے سے بڑے دانشور نے بھی ان کی کتابوں میں کسی شرعی لغزش کی نشاندہی نہیں کی ہے۔ تاریخ میں ایسے فقہا بہت کم ملتے ہیں جنھیں اپنی زندگی میں اپنے کسی قول سے رجوع کرنے کی ضرورت نہ پڑی ہو۔ اعلیٰ حضرت کا شمار انہیں فقہا میں ہوتا ہے۔ وہ بہت ہی غور وفکر کے بعد اپنی رائے کا اظہار فرماتے تھے۔ اعلیٰ حضرت کے اس وصف کا اظہار ان کے عہد نے بھی کیا ہے۔ ان کی ذات قدرت کی عظیم نشانی اور آقائے دوعالم ﷺ کے معجزات سے تھی۔ ان کی خلوت وجلوت ہر وقت غوثیت مآب کے کرم سے نور بار رہا کرتی تھی۔ ان کی کتابِ حیات کے ہر ورق سے اس کا اعتراف ہوتا ہے۔ ان کا عہد فتنوں کا عہد تھا، مسلم قوم بے چارگی کا شکار تھی۔ ڈاکٹر اسحاق قریشی نے ان کے عہد کی تصویر کشی کی ہے، وہ لکھتے ہیں: ’’دورِ زوال میں علم کی شمع روشن رکھنے والے لوگ بڑی توانائیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت قوموں کی بقا کی ضمانت ہوتے ہیں۔ غلامی، محکومی، نکبت، ادبار جب گھریں تو ایسے ہی علما و محققین کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا ایک حکیم فرزانہ بھی شامِ حیات میں نوید صبح کا پیغامبر ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے ایسے فرزانے اسی امت کو دستیاب رہے۔ بعض تو ایک وجود میں انجمن بنے رہے، تاریخ کے صفحات پر دمکتے رہے اور روشنیاں بکھیرتے رہے۔ یہ تسلسل اس لیے قائم رہا کہ ترسیخ عقیدہ کے ساتھ ہی اس کی ترتیب دے دی گئی تھی، مدینہ منورہ کی نورانی فضا اور مکہ مکرمہ کا معاندت کی گھٹن سے اٹا ماحول۔ دو تربیت گاہیں تھیں جو آنے والے ادبار میں ہر حال میں جینے کا سلیقہ عطا کر رہے تھے۔‘‘

دورِ زوال میں بہت سی قدآور شخصیات پیدا ہوئی، جنھوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی شمع یقین کو روشن رکھا۔ تاریخ نگار اور صداقت پسند طالب علم کی جبینِ عقیدت ان سب کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔ ان میں ایک نہایت بلند بام شخصیت جس کے بارے میں عربی ادب کے نامور استاذ، ادبیانِ عربی کے شہرت یافتہ محقق اور ایک مشہور مستشرق آرا ے نکلس، نے یہ کہہ کر اعتراف کیا تھا۔ نکلس نے لکھا کہ: زوالِ بغداد کے بعد مسلمان علما میں سے اسے کسی ایک کا انتخاب کرنے کو کہا جائے تو وہ بغیر کسی توقف کے امام سیوطی علیہ الرحمہ کا نام لے گا۔

امام سیوطی علیہ الرحمہ کی علمی کاوشوں کو کسی محدود دائرے میں اسیر نہیں کیا جا سکتا۔ تفسیر سے ادب تک، لغت سے نحو تک، تاریخ سے سوانح تک اور سیرت سے خصائص تک جس حوالے سے بھی نظر اٹھائیں، امام سیوطی کی ذات فیض بار نظر آتی ہے۔ اس قدر متنوع اصناف پر اس اعتماد سے بے تکان لکھتے جانا کسی کرمِ خاص کا مظہر محسوس ہوتا ہے۔ میں بلا خوف وتردید اسی قسم کا دعویٰ فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کے بارے میں کرنے میں راحت پاتا ہوں۔ وہی ماحول، ویسی ہی زوال آشنا قوم، ویسے ہی چوبائی حملے، چہار جانب دندناتے فتنوں کے سامنے سینہ سپر ہو جانا کسی توفیق پائے ہوئے مردِ مجاہد ہی کا حوصلہ ہے۔ یہ بات امام سیوطی علیہ الرحمہ نے بھی دنیا کو سمجھا دی کہ تسلیم ورضا میں استقامت کا وہی شخص حق ادا کر سکے گا جو اپنے مرکزِ یقین کے خصائص، خصائل اور شمائل سے باخبر ہوگا، اور وجود کی عظمتوں سے بھی آگاہ ہوگا، بلکہ یہ آگاہی اس کا وجدانی اعتراف بن چکی ہو۔ حملے ان پر بھی ہوئے کہ اس اعتراف میں دین کا استحکام تھا اور فاضل بریلوی علیہ الرحمہ پر بھی ہوئے کہ اس اعتراف کا حوصلہ نہ رہا تھا۔ اس حوالے سے فاضل بریلوی علیہ الرحمہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لکھا جا رہا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ حقائق شماری ہی حقائق آشنائی کی تمہید ہوتی ہے۔ نظر بالغ ہو، منزل پیشِ نظر ہو اور پیشرفت کی ہمت ہو تو منزلیں قریب آ جایا کرتی ہیں اور بند دروازے کھل جایا کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اصحابِ علم اس جانب پیش قدمی کرتے رہیں گے۔‘‘

(ماہنامہ نورِ مصطفیٰ پٹنہ کا امام اہلسنّت نمبر، ص: ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۰۱۹ء)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی شخصیت اپنے عہد ہی میں پیش لفظ نہیں تھی بلکہ صدیوں کے علمی مناظر پہ ان کا

علمی کمال حاوی نظر آتا ہے۔ اہلِ حال وقال اور صاحبانِ زبان وادب نے بڑی کشادہ نظری کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ہے۔ تعصب، تنگ نظری اور گروہی عصبیت کا کوئی حوالہ اہلِ علم وخبر کے نزدیک قابلِ توجہ کبھی نہیں رہا۔ شخصیت اپنے علمی کمال سے سمجھی جاتی ہے، معاندت بھرے ماحول سے نہیں۔ ان کی بے پناہ علمی عظمت وشوکت کا اعتراف عرب وعجم نے کھلے دل سے کیا ہے، بلکہ عرب علما نے جس انداز میں ان کا احترام واستقبال کیا ہے تاریخ میں اس کی دوسری کوئی نظیر نہیں ملتی، اس کے شواہد تاریخ میں موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ اسے کوئی بھی کبھی بھی دیکھ سکتا ہے۔ ان کی حیات کا کوئی ورق چھپا نہیں ہے۔ ان کی تحقیقات کا بہت بڑا ذخیرہ کتابی صورت میں موجود ہے۔ ان کی تحقیقات کی تفہیم دقّت طلب ہے۔ روایتی علم تھوڑی دیر میں تھک جاتا ہے لیکن ان تحقیقات سے استفادہ کرنے والی اہلِ علم کی جماعت سے ابھی دنیا خالی نہیں ہوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان پہ کام کی رفتار ابھی تھمی نہیں ہے، اور یہ سلسلہ ابھی بہت دنوں تک یونہی جاری رہے گا۔ اپنے منتخب مضامین پہ جب کوئی دانشور اپنا کام ختم کر لیتا ہے تو آخر میں اسے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ ان کی ذات اپنے ہر فن میں سمندر نواز تھی۔ ملکِ سخن کی شاہی تم کو رضاؔ مسلّم ع۔ ان کے اس دعوے میں بڑی صداقت ہے۔ حالانکہ وہ اس طرزِ تخاطب کے قائل نہ تھے، لیکن کبھی کبھی منزل بدل جانے سے سوچ کا محور بدل جاتا ہے۔ کاملین کے ہاں اس طرح کے مقامات ملتے ہیں۔ وہ اپنے عہد میں کاملین کے بھی امام تھے۔ وہ اپنی خاکساری میں بھی امامِ زمانہ تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کو کسی نہ کسی وصف میں کمال حاصل ہوتا ہے۔ بندے کو کمال بے کمالی میں ہے۔ ان کے قلم کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔ جو کام دوسرا قلم گھنٹوں میں کرتا تھا، وہ کام ان کا قلم منٹوں میں کرتا تھا۔ ایامِ حج میں مخالفین کی طرف سے علمِ غیبِ مصطفیٰ ﷺ کے باب میں آپ سے سوالات ہوئے۔ مخالفین کا گمان تھا کہ یہ حج کے ارادے سے آئے ہوئے ہیں، اپنے وطن سے دور ہیں، ان کا حاشیہ بھی ان کے ساتھ نہیں ہے، ان کی لائبریری بھی ان کے ساتھ نہیں ہے اور انھیں ذہنی یکسوئی بھی حاصل نہیں ہے، ایسے حالات میں جوابات اطمینان بخش نہیں دے پائیں گے، اس لیے انھیں ندامت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ علوم وفنون کی ساری لائبریریاں تو ان کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ مخالفین اس فلسفے سے جاہل تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے کتاب دیکھ کر کبھی کوئی فتویٰ نہیں دیا۔ ان کے حاشیے پہ بیٹھے ہوئے مفتیانِ کرام جب کسی مقام پہ الجھتے تھے تو انھیں کتاب کا نام، جلد نمبر اور سطر نمبر سب بتا دیتے تھے۔ جب مجیب کتاب کھول کر دیکھتا تو حیرت میں ڈوب جاتا، کہ ان کی نشاندہی حرف بحرف صحیح ہوتی۔ لیکن خود فتویٰ لکھتے وقت کسی کتاب سے رجوع نہیں ہوتے۔ علمائے مکہ نے مخالفین کے دیئے گئے سوالات آپ کے حضور پیش کیے اور جلد جواب دینے کی گذارش کی۔ آپ نے صرف ساڑھے آٹھ گھنٹے میں ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل کتاب ''الدرالمکیۃ'' عربی زبان میں لکھ کر علمائے مکہ کے حوالے کر دیا۔ کتاب میں حوالوں کی کثرت دیکھ کر علمائے مکہ سرتاپا حیرت بن گئے۔ ساڑھے چار سو صفحات کو ساڑھے آٹھ گھنٹے میں آج کا کمپیوٹر بھی قبول نہیں کرے گا۔ پورے عربی ذخیرۂ کتب میں اس کتاب کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ تاثر جناب مولانا کوثر نیازی کے ہیں۔ ان کے عہد میں پورے عالمِ اسلام میں کسی بھی زاویے سے کوئی ان کا ہم رتبہ نہیں تھا۔ مختلف علوم وفنون پہ ان کی ایک ہزار سے زائد کتب و رسائل اٹھا کر دیکھ لیجیے، خود صداقت آئینہ ہو جائے گی۔ ایسی نابغۂ عصر و نادرِ دہر شخصیت کے بارے میں یہ کہنا کہ جس طرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مجدد الف ثانی اور دوسرے بزرگوں نے دینی، ملّی اور علمی خدمات انجام دی ہیں اسی طرح امام احمد رضا نے بھی خدمات دیں اور وہی کام بیس پچیس سال سے ہم بھی کر رہے ہیں تو جب مسلک شیخ عبد الحق محدث دہلوی، مسلک مجدد الف ثانی نہیں کہا جا سکتا تو مسلک امام احمد رضا کیسے کہا جا سکتا ہے۔ ایسی بے وزن باتیں وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کی دونوں آنکھوں پر تعصب کی عینک ہو۔ شیخ الاسلام سیّد محمد مدنی میاں اور سیّد محمد ہاشمی میاں اعلیٰ حضرت کے حوالے سے اگر اپنے والد ماجد حضور محدثِ اعظم ہند ہی سے پوچھ لیتے تو ان کی آنکھوں سے

سارے حجابات اٹھ جاتے ، اور آج انھیں صفائی دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

حضرت مولانا مفتی سیّد شاہ حسینی اشرفی مصباحی قدس سرہٗ نے حجابات اٹھانے کی سنجیدہ کوشش کی ہے۔ وہ ہر سوال کا دوسرے مختلف زاویے سے بھی جواب دے سکتے تھے، لیکن انہوں نے اپنی شانِ سیادت اور عالمانہ مرتبت کو کسی مقام پہ مجروح ہونے نہیں دیا۔ بدزبانی سے بھلی باتیں بھی بے اثر ہو جاتی ہیں، جس کے پاس صداقت ہوتی ہے اسے بدزبانی کے سہارے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی۔ بدزبانی بتا دیتی ہے کہ سامنے والے کے پاس صداقت نہیں ہے۔ دیابنہ، وہابیہ نے منہ بھر بھر کے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کو گالیاں دی ہیں۔ گالیوں سے بھرے ہوئے خطوط بھی لکھے ہیں اور کتابیں بھی چھاپی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے، لیکن اعلیٰ حضرت نے ان کو اسی انداز میں جواب نہیں دیا ہے۔ چونکہ آپ کے پاس دین و دیانت، صدق وصداقت اور شرافت ونجابت کی بہت بڑی دولت تھی۔ آپ نے ان کی انھیں باتوں کو کوڈ کیا ہے جن سے شریعت کا دامن داغدار ہوتا تھا۔ اعلیٰ حضرت کی پوری زندگی کھلی کتاب کی طرح ہے، کوئی بھی، کبھی بھی اٹھا کر دیکھ سکتا ہے۔ ان کی پوری زندگی حدودِ شریعت کے تحفظ سے عبارت ہے۔ تحفظ تقدیس الوہیت اور جمالِ نبوت کے دید سے کبھی ان کو فرصت نہیں ملی۔ ان کا حال تو یہ تھا کہ ؎

رخصتِ قافلہ کا شور غش سے ہمیں اٹھائے کیوں
سوتے ہیں ان کے سایہ میں کوئی ہمیں جگائے کیوں
یادِ حضور کی قسم غفلت عیش ہے --ستم
خوب ہیں قید غم میں ہم کوئی ہمیں چھڑائے کیوں
جان ہے عشق مصطفیٰ روز فزوں کرے خدا
جس کو ہو درد کا مزہ نازِ دوا اٹھائے کیوں
سنگِ درِ حضور سے ہم کو خدا نہ صبر دے
جانا ہے سر کو جاچکے دل کو قرار آئے کیوں

حضرت مولانا مفتی سیّد شاہ حسینی اشرفی مصباحی قدس سرہٗ سرسے پا تک اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی فکر کے داعی، مبلغ اور ترجمان تھے۔ انھیں اس بات کی خبر تھی کہ عشق وعرفان کی سرحدوں کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا کیا ہے؟ خلق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر زاویہ ان کی آنکھوں میں محفوظ تھا۔ گالیاں سن کے دعائیں دینے کا مزاج انھیں وراثت میں ملا تھا۔ جذبات میں آکر بھی انہوں نے اپنی شرافت ونجابت اور خاندانی تقدس کی چادر کو کسی بھی مقام پہ داغدار ہونے نہیں دیا۔ سیادت اور نسبی وجاہت قربانی مانگتی ہے۔ کربلا کی سرزمین پر لکھی گئی کتاب کا ہر ورق انھیں ازبر تھا۔ چاند وسورج سیادت سے روشنی کشید کرتے ہیں۔ احترامِ سیادت ایمانیات میں داخل ہے۔ دین وشریعت سے جب الجھنے کا مزاج پیدا ہوتا ہے تو سیادت اس وقت نیام سے تلوار نکالتی ہے۔ جو لوگ راہوں میں کانٹے بچھاتے ہیں، سیادت انھیں دعائیں دیتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ سیادت اپنے بدترین دشمن سے بھی انتقام نہیں لیت۔ سیادت زخموں پر نمک نہیں چھڑکتی بلکہ وہ زخموں کی مرہم پٹی کرتی ہے۔ سیادت آنکھوں کو اشک آلود نہیں کرتی بلکہ آنکھوں سے بہتے ہوئے اشکوں کو اپنے دامن سے صاف کرتی ہے۔ سیادت آبادی کو ویران نہیں کرتی بلکہ ویرانے میں محبت کے ہزاروں چراغ جلا دیتی ہے۔ حضرت حسینی میاں علیہ الرحمہ نے اپنے طرزِ تخاطب اور اندازِ تحریر وتقریر سے بعض اہلِ کچھوچھہ کو یہی مزاج دینے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اعلیٰ حضرت اور مسلک اعلیٰ حضرت کا پُرزور انداز میں دفاع کیا ہے۔ دفاع کے پردے میں انہوں نے کسی کے درونِ خانہ جھانکنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ جبکہ بعض اہلِ کچھوچھہ نے وہ سب کچھ کیا جس کی ایک سنجیدہ معاشرہ اجازت نہیں دیتا۔ اہلِ کچھوچھہ کے باب میں کل بھی بے قصور تھا اور آج بھی بے قصور ہے۔ اختلاف کی آگ میں گھی وہ لوگ ڈال رہے تھے جو برسوں سے اپنی آنکھوں میں مرکز کا خواب سجائے بیٹھے تھے۔

□□□□

مولانا محمد رحمت اللہ صدیقی

امام احمد رضا اور ان کی خصوصیات

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کا عرب وعجم کی مشاہیر شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے علم، عمل اور عشق سے پوری دنیا کو متاثر کیا ہے۔ ان کے عہد میں ان کا کوئی مثل تھا نہ کوئی نظیر بلکہ اہلِ علم وتحقیق بتاتے ہیں ان کی نظیر سے صدیاں خالی ہیں۔ مصلحین ومحققین کی ایک جماعت بتاتی ہے کہ حضرت امام بخاری علیہ الرحمۃ الباری کے بعد ان سے ذہین وفطین انسان اب تک پیدا نہیں ہوا ہے۔ حضرت امام بخاری علیہ الرحمۃ الباری کا خود اپنا بیان ہے کہ ''جس کتاب کو میں ایک بار دیکھ لیتا ہوں وہ مجھے حفظ ہو جاتی ہے۔'' اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص مجھے کوئی کتاب ایک بار پڑھ کر سنا دے اور دوبارہ مجھ سے من وعن سن لے۔ ان کے قول کی صداقت اس واقعہ سے سمجھی جاسکتی ہے کہ انہوں نے کتابِ الٰہی قرآنِ حکیم صرف سات یا آٹھ گھنٹے میں حفظ کرلیا۔ حضور صدر الشریعہ روزانہ ایک پارہ پڑھ کر سناتے تھے اور آپ سن کر حفظ کرلیتے تھے۔ اور پھر رات میں محراب سناتے تھے۔ اسی طرح حفظ کی ابتدا ۲۹/ شعبان المعظم سے ہوئی اور ۲۹/ رمضان المبارک کو اختتام ہوا۔ تاریخ میں شاید اس کی کوئی دوسری مثال نہ مل سکے۔ دورانِ حج علمِ غیب مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے آپ سے سوالات ہوئے۔ بخار کی حالت میں، بغیر کسی کتاب کی مدد کے آپ نے آٹھ سے دس گھنٹے میں، عربی زبان میں، ۴۵۰ / صفحات پر مشتمل کتاب ''الدولة المكية بالمادة الغيبية'' لکھ کر علمائے حرمین شریفین کی خدمت میں پیش کردی۔ اس کتاب کو آقائے کریم ﷺ کے معجزہ ہی کا نام دیا جاسکتا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی شخصیت کثیر العلم، کثیر الفن اور کثیر الجہات ہے۔ ان کی حیات کی ہر جہت آقائے دوعالم ﷺ کا معجزہ نظر آتی ہے۔ انھیں ہر وقت بارگاہِ مصطفیٰ ﷺ کی حضور حاصل تھی۔ سنگِ در حضور سے انھیں کبھی صبر نہیں ہوا۔ ان کا سارا اثاثہ، جان ودل، ہوش وخرد سب کچھ بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں ہر وقت حالت اعتکاف میں رہا کرتے تھے۔ ان کا جسم ہندوستان میں تھا لیکن ان کی روح در مصطفیٰ جان رحمت کے طواف میں تھا۔ چونکہ برصغیر فتنوں کی آماجگاہ تھا۔ ہر اٹھتے ہوئے فتنے کی سرکوبی کی ذمہ داری ان کے سپرد تھی۔ ان کی ذات فتنوں سے گھبراتی نہیں تھی۔ وہ بریلی شریف میں ہوتے اور ان کی نظر پوری دنیا پہ ہوتی۔ فتنے جہاں سے بھی اٹھتے ان کی سرکوبی کے لیے سب سے پہلے وہ میدانِ عمل میں آتے۔ دنیا کی کوئی طاقت انھیں کبھی خوف زدہ نہ کرسکی۔ ان کا یقین تھا کہ کثرت اعدا، صفر اعدا اور جماعت اعدا میں بگڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب ان کی دہلیز، ان کا سنگِ در اور ان کی ذات سلامت ہے۔ ان کی زبان وقلم کا یہ حال تھا کہ فتنے ان کا نام سن کر سہم جاتے تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ کلکِ رضا خنجر خونخوار برقبار ہے، اعداء اپنی خیر منائیں اور شر سے باز آئیں۔

سن لیں اعداء میں بگڑنے کا نہیں
وہ سلامت ہیں بنانے والے
یہ رضا کے نیزے کی مار ہے کہ عدو کے سینے میں غار ہے
کسے چارہ جوئی کا وار ہے کہ یہ وار وار سے پار ہے
کلکِ رضا ہے خنجرِ خونخوار برق بار
اعداء سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی ہر روشن تاریخ کا ایک نا قابلِ فراموش باب ہے۔ ان کی حیات کی ہر سانس محفوظ کیے جانے کے قابل ہے۔ اس حوالے سے ہم اب بھی غفلت کے شکار ہیں۔ ہم نے ان کو سمجھنے کی کبھی پائیدار کوشش نہیں کی۔ عوام تو اب بھی ان سے جذباتی عقیدت رکھتی ہے۔ ان کے ہر فیصلے کے سامنے جبینِ نیاز خم کر دیتی ہے۔ عقیدت کی یہ لہر دن بدن تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے اور بریلی شریف کے دارالافتاء سے نکلنے والا ہر فیصلہ ان کے لیے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس وقت علماء میں ان سے غفلت کا رجحان تیزی سے پھیل رہا ہے۔ ان کی تالیفات وتصنیفات ذہنی، فکری اور لسانی ریاضت چاہتی ہے اور علماء اس ریاضت کے لیے قطعی آمادہ نہیں ہیں۔ ان کی دہلیز پہ بڑے سے بڑے دانشوری کی دانشوری پسینے میں ڈوب جاتی ہے۔ ان کی ذات وشخصیت کی تفہیم کے لیے باضابطہ بزم آرائی نہیں ہوتی۔ اور اتفاق سے۔۔۔ اگر کہیں کوئی بزم سجتی ہے تو اس سے عوام وخواص کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی شخصیت پہ گفتگو کے لیے وافر شعورِ علم کی ضرورت ہوتی ہے، آج کا ذہن دو قدم بھی ان کے ساتھ چلنے کی اہلیت نہیں رکھتا، ان کے ساتھ چلنے کے لیے افراد سازی کی ضرورت ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ نے گنبدِ خضریٰ کی تعمیر وتزئین کے لیے جو عملی فارمولہ ترتیب دیا تھا، اعلیٰ حضرت کی شخصیت کی تفہیم کے لیے اسی طرح کے فارمولے کو ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن جن لوگوں کے پاس ان کے مطالعہ کا وقت نہیں ہے ان سے اس طرح کے فارمولے کی ترتیب کی امید بچھڑے سے دودھ نکالنے جیسا عمل ہے۔ ہم محدود دنیا میں جینے پر مجبور تھے، ہماری سانسوں پہ پہرے لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں محدود دنیا سے نکال کر سوچنے، سمجھنے اور جینے کی وسیع دنیا عطا کی۔ ہم گہری نیند میں تھے انہوں نے ہمیں بیدار کیا۔ ہم سے ہماری زمینیں چھین لی گئی تھیں انہوں نے ہمیں چھینی ہوئی زمینوں کو واپس لینے کا حوصلہ دیا۔ ہمیں اپنے محور ومرکز سے الگ کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں انہوں نے ہمیں بیدار بھی کیا، خبر دار بھی کیا اور مرکز سے جڑے رہنے کی راہیں بھی بتائیں۔ ہم اپنا فلسفۂ زندگی بھول گئے تھے انہوں نے ہمیں فلسفۂ زندگی سے آگاہ کیا۔ گود سے گور تک کے لیے وہ ہمارے لیے چراغِ ہدایت بنے ہوئے ہیں۔ فتنوں سے بیدار کرنے کا ان کا شعور دیکھئے وہ فرماتے ہیں۔ ؎

سونا جنگل رات اندھیری چھائی بدلی کالی ہے
سونے والو! جاگتے رہیو چوروں کی رکھوالی ہے
سونا پاس ہے سونا بن ہے سونا زہر ہے اٹھ پیارے
تو کہتا ہے نیند ہے میٹھی تیری مت ہی نرالی ہے
شہد دکھائے، زہر پلائے قاتل ڈائن شوہر کش
اس مردار پہ کیا للچایا دنیا دیکھی بھالی ہے
وہ تو نہایت سستا سودا بیچ رہے ہیں جنت کا
ہم مفلس کیا مول چکائیں اپنا ہاتھ تو خالی ہے

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ محبوب بھی ہیں، مقبول بھی ہیں اور مشہور بھی ہیں۔ اسلامی تاریخ میں جو شہرت، عزت اور عظمت انھیں ملی ہندوستان میں اس کی نظیر بمشکل پیش کی جاسکتی ہے۔ انہوں نے اپنے علمی، فکری، لسانی اور سیاسی کارناموں سے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ وہ صرف علوم سے بنے ہوئے انسان تھے، بلکہ علوم وفنون کی ہر کان ان کے شعور میں تھی۔ جبکہ انہوں نے حصولِ علم کے لیے اپنے گھر سے باہر کسی درسگاہ کا راستہ کبھی نہیں دیکھا۔ انہوں نے خود اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ انھیں کتنے علوم وفنون میں امامت وسیادت حاصل تھی اس کے ذکر سے کتب تاریخ کے سینے منور ہیں۔ علوم وفنون کی ایک تعداد تو وہ ہے جو محققین نے اپنی تحقیقات میں پیش کی ہیں۔ اور ایک تعداد وہ ہے جو خود انہوں نے ضرورت کے تحت مختلف مقامات پہ بیان کی ہے۔ دوسرے حج کے دوران بکثرت علمائے عرب آپ سے سند خلافت واجازت کے طالب ہوئے۔ اس حوالے سے آپ نے ان کی عزت افزائی کی۔ دوسرے حج میں آپ کو جو فتوحات حاصل ہوئیں وہ تاریخ کا ایک روشن اعلامیہ ہے۔ اس باب میں بھی آپ بے نظیر ہیں۔ جس طرح شمع کے گرد پروانوں کا ہجوم ہوتا ہے اسی طرح علمائے عرب کا آپ کے گرد ہجوم ہوتا۔ عوام کا تو کوئی ذکر ہی نہیں وہ علماء جن کی عظمت اور سطوتِ علمی پر پورے عرب کو ناز تھا۔ بڑے بڑے صاحبانِ کروفر جن کے ناز ونیاز کو ہر وقت فرشِ راہ ہوتے۔ اعلیٰ حضرت کے حضور ایسی شخصیات کی صفیں بندھی ہوتیں اور ان میں کی ہر شخصیت اعلیٰ حضرت کے قرب کی لذت سے اپنے پیمانۂ عقیدت کو شاد کام کرنا چاہتی۔ یہ تاریخی آئینہ ہے جسے کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔

عرب دنیا میں کسی ہندی عالم کی اس طرح کی پذیرائی سے تاریخ کے اوراق خالی ہیں۔ خود اعلیٰ حضرت بھی ان کے ہر ناز اٹھانے کو اپنی سعادت تصور کرتے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ امتیازات، خصوصیات اور کرامات کے جامع تھے۔ کسی صاحبِ نظر کی اب تک اس گوشے پہ نظر نہیں گئی ہے۔ آپ کی خصوصیات پہ بھی جامع کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ اعلیٰ حضرت کی خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے کسی غیر عالم کو کبھی اپنی خلافت سے مشرف نہیں کیا۔ آپ کے خلفاء کی تعداد دو سو سے زائد ہے، ان میں سب کے سب علوم وفنون کے جامع ہیں۔ ''تذکرۂ خلفائے اعلیٰ حضرت'' مرتبین حضرت مولانا ابو داؤد صادق قصوری مرحوم اور پروفیسر مجید اللہ قادری یہ کتاب ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان کے پلیٹ فارم سے منظرِ عام پر آچکی ہے۔ اس میں اعلیٰ حضرت کے ۸۰؍ خلفاء کا تذکرہ ملتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے خلفاء کے حوالے سے ڈاکٹر پروفیسر مسعود احمد مظہری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: ''ظاہر ہے کہ ان خلفاء نے مجموعی طور پر حضرت فاضل بریلوی کے پیغام کو کہاں کہاں پہنچایا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ پاک و ہند میں کوئی ایسا شہر نہیں جہاں آپ کے معتقد اور جانثار موجود نہ ہوں۔ آپ کے خلفاء میں حضرت مولانا عبد العلیم صدیقی میرٹھی علیہ الرحمہ (مزارِ مبارک مدینہ منورہ) اور حضرت علامہ مفتی ضیاء الدین احمد مدنی علیہ الرحمہ (مزارِ مبارک مدینہ منورہ) کے مریدین ومعتقدین تو تقریباً تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ خصوصاً ان ممالک میں بکثرت ہیں ترکی، شام، مصر، عراق، یمن، لیبیا، الجزائر، سوڈان، افریقہ اور انگلستان۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت فاضل بریلوی کی شہرت ومقبولیت میں ان محیر العقول علم وفضل اور روحانیت کے علاوہ ان کے خلفاء کی مساعی کا پورا پورا دخل ہے۔ ایک بات اور قابلِ توجہ ہے اکثر بزرگوں کے خلفاء میں چند ہی چمکتے ہیں سب کے سب نہیں چمکتے لیکن فاضل بریلوی کے بیشتر خلفاء علم وعمل کے درخشاں آفتاب نظر آتے ہیں۔ اس سے خود فاضل بریلوی کی عظیم شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عظیم انسان ہی عظیم تاثیر رکھتے ہیں۔

(تذکرۂ خلفائے اعلیٰ حضرت ص: ۲۳؍ ادارہ تحقیقات امام احمد رضا پاکستان ۱۹۹۲ء)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے خلفاء کے قابلِ رشک جمال وکمال، وسعت فکر وفن اور علم وعرفان کے حوالے سے ایک اور صاحب قلم کا بے غبار اظہار یہ ذیل میں ملاحظہ کریں۔

آپ کے خلفاء، تلامذہ اور اصحابِ عقیدت وارادت کا ہر فرد اپنی جگہ میر مجلس اور قافلہ سالار ہے۔ اور ہر ایک کی تاریخ حیاتِ زریں اور روشن خدمات سے منور و تابناک ہے۔ انھوں نے اپنے روحانی فیوض و برکات سے سرزمین ہند کو بہرہ ور اور مالا مال کیا۔ مذہب وملت کی پُرزور حمایت اور اس کی محافظت کی، اس کے وقار وآبرو کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی اور مدارس ومساجد نیز مقدس خانقاہوں کی فضا سے ایسے لاہوتی نغمے بلند کیے جن سے روحِ انسانی کو وجد آ گیا اور عشق ومحبت رسول ﷺ کے سوز و ساز سے بے شمار اسلامیانِ ہند کا دل سیماب پارے کی طرح چمکنے لگا۔ یہ سبھی حضرات اپنے اپنے میدان میں منفرد اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ مگر ہر فن میں جامعیت اور علمی تبحر ایسا ہے کہ جدھر نگاہ اٹھائی اور جس میدان میں قدم رکھا اس کے شہسوار اور صدر نشین بزمِ فضل وکمال نظر آئے۔

امام احمد رضا اور ردِّ بدعات ومنکرات ص: ۸۲؍ رضا اکیڈمی، ممبئی ۲۰۰۸ء ذیل میں چند خلفاء کے اسمائے گرامی بھی ملاحظہ کرلیں۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا حامد رضا خاں قادری بریلوی (متوفی ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) مفتیٔ اعظم ہند حضرت مولانا محمد مصطفیٰ رضا خاں قادری بریلوی (متوفی ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۱ء) صدر الافاضل حضرت مولانا سیّد نعیم الدین مرادآبادی (متوفی ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) محدثِ اعظم ہند حضرت مولانا سیّد محمد اشرفی الجیلانی کچھوچھوی (متوفی ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۱ء) ملک العلماء حضرت مولانا سیّد ظفر الدین فاضل بہار (۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء) صدر الشریعہ حضرت مولانا امجد علی اعظمی (متوفی ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۸ء) مبلغ الاسلام حضرت مولانا عبد العلیم صدیقی میرٹھی (متوفی ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء) ابوالحسنات حضرت مولانا سیّد محمد احمد قادری (متوفی ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۰ء) حضرت مولانا قاضی عبد الوحید فردوسی عظیم آبادی (متوفی ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء) شیر بیشۂ اہلِ سنّت حضرت مولانا ہدایت رسول برکاتی رام پوری (متوفی ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۵ء) حضرت مولانا سیّد دیدار علی شاہ الوری (متوفی ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۰ء)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ سے جن عرب اکابر واعاظم شخصیات نے سند خلافت واجازت طلب کیں آپ نے انھیں شادکام کیا۔ ان میں بعض شخصیات تحریری سند خلافت و

اجازت سے محروم رہیں۔ ان سے آپ نے وعدہ فرمایا کہ وطن پہنچتے ہی تحریری سند خلافت بھیج دی جائے گی۔ جن حضرات سے آپ نے وعدہ فرمایا تھا ان میں ایک نام حضرت مولانا شیخ عمر بن حمدان المحرسی علیہ الرحمہ کا بھی ہے۔ ان کے ساتھ آپ نے جو رعایت کی ہے خلفاء میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ان کو دی گئی سند خلافت کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سند خلافت لکھتے وقت آپ کا دریائے کرم پورے جوش پہ تھا۔ ذیل میں وہ تفصیلی سند خلافت ملاحظہ کریں۔

آپ حرم نبوی میں مدرس تھے۔ اور مالکی فقہ کے مطابق فتویٰ صادر فرماتے تھے۔ صفر/ربیع الاوّل ۱۳۲۴ھ میں اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ سے دورانِ قیام مدینہ منورہ متعدد علمائے ذی وقار نے اجازتیں طلب کیں۔ آپ نے اکثر کو زبانی اجازتیں دیں۔ کیونکہ عبد المصطفیٰ امام احمد رضا خاں ''بارگاہِ مصطفیٰ'' میں ایسا بےخود تھا کہ ماسوائے مصطفیٰ (علیہ التحیۃ والثنا) کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا تھا۔

اسی بنا پر بعض علماء سے وعدہ فرمایا کہ وطن جا کر سندِ اجازت روانہ کی جائے گی۔ جن فضلاء کاملین سے وعدہ فرمایا گیا، ان میں صاحب فضیلت مولانا عمر بن حمدان محرسی بھی تھے۔ ''الاجازات المتینہ'' میں سند کا دوسرا نسخہ انہیں مرحمت ہوا۔ یہی نسخۂ سند ''سیّد صالح کمال''، ''سیّد اسماعیل خلیل''، ''سیّد مامون البری'' اور دیگر معظمین کو دیا گیا۔ سند کے اس نسخے میں (جس کا تاریخی نام ''الاجازۃ الرضویہ لمبجل مکۃ البہیہ'' ہے۔) امام احمد رضا خاں رضی اللہ عنہ وارضاہ عنا نے علوم مکتسبہ اور علوم لدنیہ کی مکمل تفصیل نقل فرمائی، جو آپ کو حاصل تھے۔ نہیں نہیں، جن میں آپ کامل ماہر تھے۔ نہیں نہیں بلکہ بعض علوم کے مُوجد تھے اور ان میں کوئی ہمعصر ہمسری کا دعویٰ بھی نہیں کرسکتا۔

آپ ہی کے الفاظ میں علوم وفنون کے وہ دریا جن سے اعاظم علماء سیراب ہوئے کا حال سُنیے: ''میں آپ کو اللہ ورسول (جل جلالہٗ و صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی برکت سے اجازت دیتا ہوں۔ اوّلاً ان تمام علوم کی جنہیں میں نے اساتذہ کرام سے پڑھا۔ اور کتب حدیث کی ان تمام قسموں کی بھی جنہیں صحاح، سُنن، مسانید، جوامع، معاجیم اور اجزاء کہا جاتا ہے۔ نیز مسلکِ محدثین کے مطابق اور ہمارے جلیل القدر اماموں کے روشن طریق کے موافق جتنی اصولِ حدیث کی کتابیں ہیں۔ اور فقہ حنفی کی روایت بھی۔

علم قرآن، علم حدیث، اصولِ حدیث، فقہ حنفی۔ کتب فقہ جملہ مذاہب، اصول فقہ، جدل مہذّب، علم تفسیر، علم عقائد والکلام، علم نحو، علم صرف، علم معانی، علم بیاں، علم بدیع، علم منطق، علم مناظرہ، علم فلسفہ مدلسہ، علم تکسیر، علم ہیئت، علم حساب، علم ہندسہ۔ یہ اکیس علوم ہیں جنہیں میں نے اپنے والد قدس سرہ الماجد سے حاصل کیا اور باقی مشائخ نے بھی اجازت بخشی۔

ثانیاً ان تمام علوم کی اجازت بھی دیتا ہوں جنہیں میں نے اساتذہ سے بالکل نہیں پڑھا۔ لیکن نقّاد علمائے کرام سے مجھے ان کی اجازت حاصل ہے۔ اور وہ پورے دس علوم ہیں: قرأت، تجوید، تصوّف، سلوک، اخلاق، اسماء الرجال، سیَر، تواریخ، لُغت، ادب مع جملہ فنون۔ ان (اکتیس) علوم میں جتنے متن، جتنی شرحیں، جتنے حواشی اور جتنے رسائل علماء متقدمین اور متاخرین نے تصنیف کیے ہیں، ان سب کی اجازت دیتا ہوں۔

ثالثاً اُن علوم کی بھی اجازت دیتا ہوں جنہیں میں نے کسی افادہ بخش استاذ سے حاصل کیا۔ نہ پڑھ کر، نہ سُن کر، نہ باہمی گفتگو سے۔ اور مجھ جیسے ہمزمان ایسے علموں کو تعلیم وتعلّم کے بغیر حاصل کرنے کے عادی بھی نہیں مگر اس عاجز فقیر پر ربِّ قدیر نے ایسا فضل فرمایا کہ میں نے انہیں محض کتب بینی سے اور نظر وفکر کے استعمال سے حل کرلیا۔ کسی پر اعتماد کر کے اس کے حضور زانوئے تلمذ تہ کرنے کی ضرورت نہ پڑی، گویا اپنے اقران میں ان علوم کا مُوجد ہوں اور ان کی گود میں مجھ ہی کو بیٹھنا نصیب ہوا۔ یہ علوم تعداد میں چودہ ہیں۔

ارثماطیقی، جبر ومقابلہ، حساب سینی، لوغارثمات، علم التوقیت، مناظر ومرایا، علم الاکر، زیجات، مثلّث کروی، مثلّث مسطح، ہیئات جدیدہ، مربعات، حصہ جفر، حصہ زائرجہ۔ تو یہاں تک پینتالیس علوم ہوئے۔ اور میں نے ان جملہ علوم کی بڑی بڑی کتابوں پر حواشی بھی لکھے۔ حاشیہ نویسی کا سلسلہ زمانہ طالب علمی سے اب تک جاری ہے۔ مگر جب میں نے پڑھنے سے فراغت پائی۔ اور یہ واقعہ نصف شعبان

۱۲۸۶ھ کا ہے، اس وقت میں تیرہ سال، دس ماہ پانچ دن کا تھا۔ وہ چودہ علوم جو فقیر کو محض نظر و فکر سے حاصل ہوئے ان کے ساتھ یہ پانچ علوم اور بھی شامل ہیں: فرائض، حساب، ہیئت، ہندسہ، تکسیر۔ تو گویا یہ اُنیس علوم ایسے ہیں جن کی تعلیم صرف آسمانی فیض سے مجھے حاصل ہوئی۔

یوں ہی نظمِ عربی، نظمِ فارسی، نظمِ ہندی، نثر عربی، نثر فارسی، نثر ہندی، کا انشاء، خطِ نسخ، خطِ نستعلیق اور مولیٰ تعالیٰ کے آسان فرمانے سے قرآنِ مجید کی تلاوت مع التجوید کی تعلیم بھی کسی اُستاذ سے حاصل نہ کی۔ پہلے اُنیس اور یہ نو کل اٹھائیس فنون وہ ہیں جنہیں محض میں نے رب تعالیٰ کے الہامی فیض سے حاصل کیا ہے۔ (امام احمد رضا خاں قدس سرہٗ کے اکتیس علوم مکتسبہ اور اٹھائیس علومِ لدنیہ غیر مکتسبہ مل کر اُنسٹھ (۵۹) علوم بنتے ہیں جن میں انہیں مہارتِ تامہ بلکہ ملکہ اجتہاد حاصل تھا۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ وَاللہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْم۔ عام طور پر اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے علوم پچاس کے قریب بتائے جاتے ہیں لیکن اُنسٹھ علوم آپ ہی کے علم سے متحقق ہوئے۔ الحمدللہ رب العالمین)

رابعاً اپنی تمام مؤلفات کی بھی اجازت دیتا ہوں۔ اور یوں ہی ان چاروں کی اجازت آپ کے بیٹوں، بھائیوں، پوتوں اور نواسوں کو بھی دیتا ہوں۔

خامساً طریقت کے ان تمام دل پسند سلسلوں کی بھی اجازت دیتا ہوں جن کی مجھے اجازت حاصل ہے۔ وہ سلاسلِ طریقت یہ ہیں:

طریقہ عالیہ قادریہ جدیدہ، قادریہ آبائیہ قدیمہ، قادریہ اہدیہ، قادریہ رزاقیہ، قادریہ رضویہ، چشتیہ نظامیہ عتیقیہ، چشتیہ محبوبیہ جدیدہ، سُہروردیہ واحدیہ، سُہروردیہ فضلیہ، نقشبندیہ علائیہ صدیقیہ، نقشبندیہ علائی علویہ، سلسلہ ہدیعیہ، علویہ منامیہ۔ یہ آخری سلسلۂ بیعت میرے تمام سلسلوں میں نبی کریم ﷺ سے زیادہ قریب ہے۔ بحمدہٖ تعالیٰ صحیح بخاری کی اعلیٰ سند کی طرح یہ سند بھی ثلاثی ہے۔ تو اے میرے پیارے مُستجز آپ حضرات کے لیے یہ سند بواسطہ فقیر رُباعی ہوگی۔

سادساً درج ذیل ادعیہ وغیرہا کی اجازت بھی دیتا ہوں۔

قرآنِ عظیم کے خواص، اسماء الٰہیہ، دلائل الخیرات، حصن حصین، قصر متین، اسماء اربعینہ، حزب البحر، حزب البر، حزب النصر، سلسلہ شاذلیہ کے تمام احزاب، ایک لاکھ چار ولیوں کا حرز، حرز الامیرین، حرزِ یمانی، دعاء مغنی، دعاء حیدری، دعاء عزرائیلی، دعاء سریانی، قصیدہ خمریہ، (جس کا مشہور نام قصیدہ غوثیہ ہے) صلوٰۃ غوثیہ (جسے صلوٰۃ الاسرار کہا جاتا ہے جو بخشنے والے رب کے اذن سے حاجت برآری کے لیے مجرّب ہے)، قصیدہ بُردہ، دعاء بشمخ، تکبیر عاشقاں، نیم تکبیر، ارسال الہواتف، ان کے علاوہ اس قسم کی اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جو احاطۂ وصف میں شاید نہ آسکیں۔

سابعاً ان تمام اذکار، اشغال، ادقاق اور اعمال کی بھی اجازت دیتا ہوں جو مجھ تک میرے اُستادوں آقاؤں کی جانب سے پہنچے ہیں یا جنہیں میں نے اپنی فکر اور کوشش سے استخراج کیا ہے۔ اور بحمدہٖ تعالیٰ اپنی مُراد کے موافق بلکہ اس سے بڑھ کر پایا ہے۔

اب آپ کو چاروں مُصافحوں کے شرف سے بھی نوازتا ہوں۔

مُصافحہ خضریہ، مُصافحہ جنیہ، مصافحہ معمریہ، مصافحہ منامیہ۔

(رسائل رضویہ جلد دوم، ص: ۲۹۸/۳۲۶۔)

سند کے اسی نُسخہ میں مولانا عمر المحرسی المدنی کو جن پیارے خطابات سے نوازا ملاحظہ فرمائیے: ''اے فاضل کامل، اچھی خصلتوں والے، شجرہ فضیلت کی شاخ، پاک، صاف، دانا، تیز فہم، مولانا شیخ عُمر بن حمدان المحرسی المالکی۔'' (ایضاً ص: ۲۹۸۔)

مولانا موصوف نے اپنے شیخ امام احمد رضا خاں کی بعض کتابوں پر تقریظ بھی لکھی۔ چنانچہ حسام الحرمین پر تقریظ ان الفاظ میں لکھی:

فانی قد اطلعت علی العالم العلامة الدراکة الفهامة ذوالتحقیق الباهر جناب الشیخ احمد رضا خاں فی الخلاصة الماخوذة من کتابه المسمی المعتمد المستند فوجدته الله فی غایة التحریر فلله در مؤلفه۔

جناب شیخ احمد رضا خاں نے جو اپنے خلاصے میں تحریر فرمایا ہے۔ میں نے اس کا مطالعہ کیا، یہ خلاصہ ان کی کتاب موسومہ ''المعتمد المستند'' سے ماخوذ ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ مصنف نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ مصنف کی تعریف و توصیف اللہ کے لیے ہے۔ وہ مصنف خوب ہی جاننے والا، خوب ہی سمجھنے والا، خوب ہی سوچنے والا

اور ایسی روشن تحقیق کرنے والا ہے جس سے تمام پہلو منور ہو جائیں۔

(تذکرہ خلفائے اعلیٰ حضرت ص ۶۹ / ادارہ تحقیقات امام احمد رضا (رجسٹرڈ) کراچی)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ علوم وعرفان، عشق واحسان اور فضائل وکمالات کے جامع تھے، ان کی شخصیت کا ہر رخ ہیرے کی طرح ہے۔ ہیرے کو جس رخ سے دیکھیے جلوؤں کا ہجوم نظر آئے گا۔ اہلِ علم وکمال جب ان کی شخصیت کو دیکھتے ہیں تو وہ حیرتوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ قدرت نے انھیں بہت بڑا بنایا تھا اور ان کی شخصیت کے اس رخ کو ان کے حریفوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ ان کے عہد میں پوری دنیا میں کوئی ایسی شخصیت نہ تھی جو ان کی ہم نشینی کا دعویٰ کرے۔ ان کی ذات علوم ومعارف کا سمندر تھی۔ ایک ایسا سمندر جس کا کوئی محسوس کنارہ نہیں تھا۔ اور اس سمندر میں اب تک کسی کو اترنے کا بھی حوصلہ نہیں ہوا۔ اپنے بعض علوم کا تذکرہ کرتے ہوئے خود فرماتے ہیں: گویا اپنے اقران میں ان علوم کا موجد ہوں اور ان کی گود میں مجھ ہی کو بیٹھنا نصیب ہوا۔ یہ علوم تعداد میں چودہ ہیں۔ علوم وفنون کی تاریخ میں آج تک کسی عالم وعارف نے اس طرح کے دعاوی نہیں کیے۔ ہماری کوتاہ نظری نے انھیں مناظراتی ذہن وفکر رکھنے والے علما کی صف میں کھڑا کر دیا ہے، جبکہ ان کی حیثیت یہ ہے کہ علوم وفنون کا کوئی شعبہ ان کی نگاہ سے کبھی اوجھل نہیں رہا۔ ان کی ذات انسانی عقل وشعور کے لیے حیرت کدہ تھی۔ آج کا دماغ تو ان کے حضور اور بھی مفلوج ومجبور نظر آتا ہے۔

آج کی نام نہاد علمی دنیا ان کا تعارف اس انداز میں کراتی ہے، جس سے ایک روایتی عالم کا تصور ابھرتا ہے۔ ان کے تعارف میں اسٹیج کی دنیا تو اور بھی یتیم ومسکین نظر آتی ہے۔ جن کا دامن علم وخرد سے خالی ہیں اور جن پہ علمی مفلسی کا گہرا سایہ ہے انھیں کو تعارف کا موقع بھی دیا جاتا ہے۔ نذر ونیاز کے سارے لفافے انھیں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں، جو درباری اصولوں کی رعایت کرتا ہے اسی کو کرسیِ خطاب بھی دی جاتی ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے لیے ہمیں تعصب، تنگ نظری اور گروہی عصبیت کے دائرے سے نکلنا ہوگا، ورنہ دنیا ہمیں ایسی جگہ لے جا کر پھینک دے گی جہاں چیل، کوے بھی ہماری لاشوں کو منہ نہیں لگائیں گے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی ذات ہمارے لیے ایک ایسی پناہ گاہ ہے، جہاں خطرات کا گذر بہت مشکل ہے۔ ان کا ہر حصار فولادی ہے۔ ان کے کھینچے ہوئے حصار کو ہمیں سنجیدگی سے سمجھنے کی ضرورت ہے، اور اس حصار کو عالم آشکار بھی کرنا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے علوم وافکار کی تفہیم، تقسیم اور ترسیل کے لیے ہمیں ایسے ذہین وفطین افراد کی ایک مضبوط ٹیم تیار کرنی ہوگی جو غمِ روزگار سے آزاد ہو کر رضویات کی زلفِ برہم کی تزئین میں خود کو مصروف رکھے۔ یہ کام دقت طلب ہے لیکن مشکل نہیں ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے حوالے سے حالات دن بدن بھیانک ہوتے جارہے ہیں، اپنوں کی وفاداری پہ شبہات کے سائے گہرے ہوتے جارہے ہیں۔ باطل قوتوں کی حرکت وتوانائی اور ان کے دائرہ اثر کے پیشِ نظر ان کی سرکوبی کے لیے قدرت ان سے کہیں زیادہ توانا شخصیت کو مبعوث فرماتی ہے، اس تعلق سے تاریخی شہادتیں بکثرت موجود ہیں۔ بابِ نبوت ورسالت کے بند ہو جانے کے بعد نزولِ وارثانِ نبوت ورسالت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس مبارک ومسعود سلسلے کی اوّلین کڑی اصحابِ مصطفیٰ ﷺ ہیں، یہی جماعت نجومِ ہدایت ہے۔ قیامت تک آنے والے مصلحین امّت و وارثانِ نبوت ورسالت اسی جماعت سے علم وعشق، ادب وتعظیم اور جرأتِ اظہار کشید کرتے رہیں گے۔ اصحابِ مصطفیٰ ﷺ سے جدا ہو کر خودی اور خدا تک رسائی ناممکن ہے۔ اصحابِ مصطفیٰ ﷺ نے خدا پرستی ورسول دوستی کا دنیا کو جو شعور دیا ہے اس کی کوئی دوسری نظیر پیش نہیں کی جاسکتی ہے۔ اعلیٰ حضرت قادری برکاتی قدس سرہ اسی شعور کا ہر طرح تحفظ چاہتے تھے۔ اور ہر دل کو اسی شعور سے منور کر دینا چاہتے تھے۔ آپ کی کتابِ حیات کا ہر ورق اسی شعور سے عبارت ہے۔ آپ اپنے وصایا شریف میں فرماتے ہیں:

''حضورِ اقدس ﷺ رب العزت جل جلالہ کے نور ہیں۔ حضور سے صحابۂ کرام روشن ہوئے، ان سے تابعین روشن ہوئے۔ ان سے ائمۂ مجتہدین روشن ہوئے۔ ان سے ہم روشن ہوئے۔ اب ہم تم سے یہ کہتے ہیں، یہ نور ہم سے لے لو۔ ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ تم ہم سے روشن رہو۔ وہ نور یہ ہے اللہ ورسول کی سچی محبت، ان کی تعظیم اور ان

کے دوستوں کی خدمت وتکریم، اور ان کے دشمنوں سے اجتناب و عدات۔جس سے اللہ ورسول کی ادنیٰ توہین پاؤ پھر وہ تمہارا چاہے کتنا ہی پیارا کیوں نہ ہو اس سے فوراً جدا ہوجاؤ۔جس کو بارگاہِ رسالت میں ذرا بھی گستاخ دیکھو پھر وہ تمہارا کیسا ہی بزرگ معظم کیوں نہ ہو اپنے اندر سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دو۔''

وصایا شریف مطبوعہ بریلی

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ اپنے عہد میں صداقت کی سب سے روشن کتاب تھے، حق کے طرفدار تو بہت تھے، ان میں باطل سے محاذ آرائی کا حوصلہ نہیں تھا۔ درس گاہیں بھی تھیں، خانقاہیں بھی تھیں، علماء بھی تھے اور بڑے بڑے مشائخ بھی تھے پھر بھی ہر سمت گہری خاموشی تھی، خوف ناک سناٹا تھا، لرزتا ہوا سکوت تھا اور چیختی ہوئی تاریکی تھی۔اس سچائی کا اعتراف ہر عقلِ سلیم نے کیا ہے۔اس حوالے سے ذیل میں ایک اعترافیہ ملاحظہ کریں۔

رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

کیوں رضا آج گلی سونی ہے
اٹھ مرے دھوم مچانے والے

جانے کس عالم میں اعلیٰ حضرت نے یہ شعر کہا تھا۔گھنٹوں سوچتا رہا۔ یہ اسی عاشق پاکباز کا مرقد ہے جو شہرِ خموشاں کے ارجمندوں کی حرمت وتوقیر کے لیے زندگی بھر بے چین رہا۔اس کے نوکِ قلم سے روشنائی نہیں ٹپکتی تھی، عشق وعرفان کا آبشار پھوٹتا تھا۔اس کی تحریر میں عجب سحر تھا کہ بریلی کی سرزمین پر بیٹھے بیٹھے اس نے ساری دنیا کو اپنے گرد سمیٹ لیا۔

عالمِ تحیر میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بے ساختہ زبان دل سے دعا نکلی اور در دیوار نے آمین کہا۔ احمد رضا! تمہاری تربت پر شام وسحر رحمت ونور کا ساون برسے۔تمہارے قلم کی روشنائی نے شہیدوں کے لہو کی طرح دشمنانِ اسلام کو لالہ زار بنا دیا۔تم نے آندھیوں کی زد پر عشق کا چراغ جلایا اور خون کے ایک ایک قطرے سے محبت کا خراج وصول کیا۔

دنیائے اسلام کے محسن! تم نے حق و باطل کے درمیان اتنی واضح لکیر نہ کھینچ دی ہوتی تو آج امنڈتے ہوئے ان سیاہ فتنوں کے ہجوم میں امتّ مسلمہ کا کیا حال ہوتا۔کیا معلوم کہ ہم سرگشتگانِ بادۂ غفلت عقل غلط اندیش کی رہنمائی میں کہاں بھٹکتے ہوتے۔

اہلِ سنّت کے امام! خدائے غافر وقدیر تمہاری خواب گاہ کو رحمتوں کے پھول سے بھر دے۔تمہارا یہ احسان ہم کبھی نہیں بھول سکتے کہ تم نے نہایت نازک وقت میں ایمان کے ساتھ ہماری روحوں کا سررشتہ ٹوٹنے سے بچا لیا۔ویسے کہنے کے لیے ساری دنیا رسولِ مجتبیٰ کے پروانوں سے بھری ہوئی تھی، لیکن نجد کے گستاخوں کے منہ میں لگام دینے کے لیے تمہارے سوا کون کھڑا ہوا۔کس نے اپنی ہستی کی ساری صلاحیتوں کو حمایت حق کے مورچے پر لگا کر اسلام کی فصیل کو کفر والحاد کے طوفان سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ مزارات کے وارث اور خانقاہوں کے سجادہ نشین کہاں نہیں تھے۔لیکن کسے ہمت ہوئی کہ ابلیس کے امنڈتے ہوئے لشکر کو شکست فاش دینے کے لیے خون کا آخری قطرہ تک نثار کر دے۔

ہر محفل کا چراغ بننا اور ہر طبقے میں نیک نام کہلانا کون پسند نہیں کرتا، لیکن پیارے! یہ تمہارا ہی جگر تھا کہ حق کی خوشنودی کے آگے تم نے کسی کے روٹھنے کی پرواہ کی، نہ کسی کے طعن وتشنیع سے آزردہ ہوئے۔ ایک اپنے محبوب کو راضی کر کے تم سارے جہاں سے مستغنی ہو گئے۔

اہلِ حق کی دنیا آج بھی اعتراف کرتی ہے کہ تم نے غیرتِ عشق کی یہ بھٹی نہ سلگائی ہوتی تو اس عہد نفاق آشوب میں یقین وعرفان کا یہ نکھرا ہوا سونا کیسے میسر آتا۔پس اے امیر کشور اخلاص! دشمنانِ حق نے اپنے مذہبی غیظ میں سلگ سلگ کر تجھے جتنے طعنے دیئے ہیں کونین کا پروردگار ان ساری آزاریوں کا تجھے بے پایاں اجر عطا کرے۔

(تجلیاتِ رضاص:۲۱۰، دارالکتاب دہلی۔۲۰۰۵ء)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ اپنے عہد میں نشانِ راہ بھی تھے، نشانِ منزل بھی تھے اور نشانِ حق وصداقت بھی تھے۔ علماء، محققین، مدبرین اور مفکرین سب کے لیے جائے پناہ تھے۔مشکلات میں، معاملات میں اور ملّی ضروریات میں سب انھیں سے رجوع ہوتے تھے۔اپنوں کی بات تو چھوڑیئے وہ غیروں کے لیے

بھی ضرورت کا سامان تھے۔غیر بھی جب تھک جاتے تھے تو ان سے رابطہ بحال کرتے تھے۔تاریخ میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ مولانا نظام الدین فقیہ احمد پوری علمائے دیوبند میں بڑا نام تصور کیا جاتا ہے۔ان کے سامنے جب رسائل رضویہ سے چند مسائل فقہیہ سنائے گئے تو انہوں نے برملا کہا کہ ''علامہ شامی اور صاحب فتح القدیر'' مولانا (احمد رضا) کے شاگرد ہیں، یہ تو امام اعظم ثانی معلوم ہوتے ہیں۔

فنِ میراث کے عظیم ماہر سراج الفقہاء مولانا سراج احمد خانپوری عام دیوبندی علماء کی طرح علمائے اہلِ سنّت سے متنفر تھے بلکہ انھیں جاہل سمجھتے تھے۔وہ علمِ میراث میں ایک رسالہ تصنیف فرما رہے تھے کہ ان کو ذوی الارحام کی صنف رابع میں کچھ الجھن پیش آئی۔اس کی تحقیق کے لیے آپ نے دیوبند، سہارنپور اور دہلی تینوں جگہوں پر استفتاء کیا، کہیں سے خاطر خواہ جواب نہ آیا۔پھر آپ نے اعلیٰ حضرت کو وہ استفتاء بھیجا۔اعلیٰ حضرت نے جو جواب عطا فرمایا خود سراج الفقہاء کی زبانی سنیے۔

حضرت کے وسعت علم فہم پر قربان جایئے کہ مسئلہ کا ایسا حل پیش فرمایا کہ تمام اختلافاتِ کتب اور میرے شکوک وشبہات رفع ہوگئے اور دیگر فوائد علمیہ کثیرہ پر مشتمل پایا جس سے علمائے متقدمین کی یاد تازہ ہوگئی اور اتنا ہی نہیں ''فتویٰ میراث میں مجھے سائل فاضل ہداہ اللہ'' کا خطاب دے کر دعا فرمائی جو میری ہدایت کا سبب بنی کہ وہابیت جو وہابی استادوں کی شاگردی سے ملی تھی اسی وقت سے جاتی رہی۔ (امام احمد رضا خدمات واثرات، ص:۱۹، ۲۰)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے مذہبی مخالفین کی ہمیشہ کثرت رہی ہے۔آپ نے دین وشریعت کے معاملے میں کبھی کسی طرح کی نرمی کا مظاہرہ نہیں کیا۔کلمہ دین میں داخل ہونے کا اوّلین زینہ ہے، لیکن آپ نے کلمہ کی بنیاد پر اتحاد کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ بہت ساری جماعتیں کلمہ پڑھتی ہیں مگر دین اسلام سے خارج ہیں۔ ایسی تمام جماعتوں سے آپ تاحیات محاذ آرا رہے۔اس حوالے سے آپ کی بکثرت تالیفات وتصنیفات ہیں۔عشق رسالت مآب ﷺ ہی حق وباطل کے درمیان نشانِ امتیاز ہے۔عشق رسالت مآب ﷺ کا چراغ اگر دل کے آنگن میں روشن نہیں ہے تو کوئی لاکھ کلمہ پڑھے مومن نہیں ہوسکتا۔منافقین کلمہ کا وِرد کرتے تھے بلکہ آقائے کریم ﷺ کی اقتدا میں نمازیں بھی پڑھتے تھے پھر بھی قرآنِ حکیم نے انھیں مومن تسلیم نہیں کیا۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ۔ ترجمہ: اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور وہ ایمان والے نہیں۔(کنز الایمان، پ:۱، سورۂ بقرہ:۱) بندگی خدا کی اور اطاعت مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کی۔عبادت کا یہی منہاج بارگاہِ الٰہی تک رسا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے: قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی الخ۔اے محبوب! آپ فرما دیں کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔خدا کی محبت کا دعویٰ اطاعتِ مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔جس کی رسائی محبوب دوعالم ﷺ کے سنگِ در تک نہ ہو، بارگاہِ الٰہی سے اس کا کوئی عمل سند قبولیت حاصل نہیں کرسکتا۔

مصطفیٰ برسا خویش را کہ دیں ہمہ او است
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبست
جان ہے عشقِ مصطفیٰ روز فزوں کرے خدا
جس کو ہو درد کا مزہ نازِ دوا اٹھائے کیوں
ہمارے دردِ جگر کی کوئی دوا نہ کرے
کمی ہو عشقِ نبی میں کبھی خدا نہ کرے

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ سفیر عشق مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ تھے بلکہ تحریک عشق مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ تھے۔علمی دنیا اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ ان کا خمیر عشق مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ سے تیار ہوا تھا۔ان کا وجود، ان کا پیکر عشق مصطفیٰ جانِ رحمت ہی میں ڈھلا ہوا تھا۔ان کے خون میں عشق رسالت مآب ﷺ کی حدت وحرارت تھی، ان کی نبضوں میں ارتعاش بھی اسی عشق سے تھا، ان کے جذبات واحساسات کا ارتکاز بھی اسی پہ تھا، ان کے تن من کا گداز بھی یہی عشق تھا۔یہی عشق ان کی پیاس تھا اور سیرابی بھی۔یہی عشق ان کا درد بھی تھا اور شفا بھی۔ان کے عشق کے جلوے دیکھیے، ان کے عشق کا

انداز دیکھیے اور ان کے پکار کی لے دیکھیے۔ فرماتے ہیں: ہر ہر لفظ نہیں بلکہ ہر ہر حرف پہ عقیدت کے سجدے لٹانے کو جی چاہتا ہے۔

دہن میں زباں تمہارے لیے
بدن میں ہے جاں تمہارے لیے
ہم آئے یہاں تمہارے لیے
اٹھیں بھی وہاں تمہارے لیے
صبا وہ چلے کہ باغ پھلے
وہ پھول کھلے کہ دن ہوں بھلے
لوا کے تلے ثنا میں کھلے
رضؔا کی زباں تمہارے لیے

اس طرح کے عشق بدوش نغموں سے ان کی کتابِ حیات کا ہر ورق روشن و منور ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں ظلمت تھی، اندھیرا تھا، تاریکی تھی اور ہر سمت دولت عشق مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہ شب خون مارنے والوں کا بسیرا تھا۔ حکومت وقت بھی اس شیطانی سماج کی پشت پناہ تھی۔ ہر سمت خاموشی تھی، خوف تھا اور ڈر کا ایک ماحول تھا۔ اہلِ حق کی کثرت تھی لیکن ان کی آواز میں دم نہ تھا۔ وہ محکوم بھی تھے اور مظلوم بھی تھے۔ حریفانِ عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دشمنانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عشق و عرفاں کے ہر شجر کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دینا چاہتے تھے۔ وہ عشق کی ہر علامت کو مٹا دینا چاہتے تھے، انھیں عشق کا سنگ در پسند تھا نہ سنگ میل۔ نورِ خدا کفر کی حرکت پہ خندہ زن تھا، عشق و عرفان کے شبستانوں سے یہ صدا بلند ہو رہی تھی کہ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔ قدرت ہر زمانے میں عشق و عرفان کی محافظ و پاسبان رہی ہے۔ جب نمرود نے عشق کے داعی و پیامی کے چراغِ حیات کو بجھانے کے لیے آتش فشاں تیار کیا۔ ایسا آتش فشاں جس کی تپش آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ نمرود مضطرب تھا، پریشان تھا اس چراغِ عشق کو بجھانے کے لیے۔ اِدھر عشق بے تاب تھا، بے قرار تھا اس آتش فشاں میں جانے کے لیے۔ عشق کی سرد آہوں نے نمرود کے آتش فشاں کو پانی پانی کر دیا۔ عشق کامیاب ہو گیا اور نمرود، اس کا غرور، اس کی حکومت اور اس کی خدائی اس آتش فشاں میں جل کر خاک ہو گئی۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

اے عشق ترے صدقے جلنے سے چھٹے سستے
جو آگ بجھا دے گی وہ آگ لگائی ہے

عشق کو دنیا کی کوئی طاقت کبھی زیر نہیں کر سکی ہے۔ عشق کبھی خوف زدہ نہیں ہوتا اور عشق کبھی مرعوب بھی نہیں ہوتا۔ عشق کبھی شرکت کا بھی قائل نہیں ہوتا، عشق اپنے محبوب پہ کسی بھی جہت سے کوئی حملہ برداشت نہیں کرتا۔ قرآن واحادیث میں اس کی بکثرت نظیریں موجود ہیں۔ ولید بن مغیرہ نے حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مجنون کہا، رب کعبہ کو جلال آ گیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں اس کے دس عیوب کی نشاندہی کی۔ ان میں ایک عیب اس کا حرامی النسل ہونا بھی ہے۔ اعدائے محبوب ربِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہ شدت، ان کا تعاقب، ان کی توہین وتضحیک سنّت الٰہیہ ہے۔

دشمنِ احمد پہ شدت کیجیے
ملحدوں کی کیا مروت کیجیے
غیظ میں جل جائیں بے دینوں کے دل
یارسول اللہ کی کثرت کیجیے
شرک ٹھہرے جس میں تعظیم حبیب
اس بُرے مذہب پہ لعنت کیجیے

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کا نثری سرمایہ ہو یا شعری سرمایہ ہر جگہ سنّت الٰہیہ کی قدر دانی کے جلوے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ نے نام ونسبت کے تقدس کو کبھی گرد آلود ہونے نہیں دیا۔ خدا سے بندوں کا رشتہ کیسا ہونا چاہیے۔ نبی سے امّت کا رشتہ کیسا ہونا چاہیے اور اولیائے کرام سے مومنین کا رابطہ و تعلق کیسا ہونا چاہیے۔ آپ نے ہر ایک کے فلسفے کی بھرپور انداز میں وضاحت کی ہے۔ صراطِ مستقیم کو پُرخطر بنانے کی کوششیں پوری دنیا میں عموماً اور برصغیر ہند و پاک میں خصوصاً پورے شد و مد سے ہو رہی تھیں۔ مدینے کی محبت جو امّت کی رگوں میں خون کی طرح گردش کر رہی تھی، اس محبت کے خلاف فتوے دیئے جا رہے تھے۔ جبکہ مدینے کی محبت

دین حق کی شرطِ اوّل ہے یہی مطلوبِ قرآنی ہے۔اور مومن کے لیے یہی مقصودِ زندگانی ہے۔جس دل کے آنگن میں مدینے کی محبت کا چراغ نہیں جلتا، رحمت الٰہی کا کوئی جھونکا اس آنگن سے نہیں گذرتا بلکہ ایمان کی حلاوت سے وہ دل کبھی آشنا نہیں ہوتا۔

ایمان ہے قالِ مصطفائی
قرآن ہے حالِ مصطفائی
خواہانِ وصالِ کبریا ہیں
جویانِ جمالِ مصطفائی
محبوب و محب کی ملک سے ایک
کونین ہیں مالِ مصطفائی
اللہ نہ چھوٹے دست دل سے
دامانِ خیال مصطفائی
ہیں تیرے سپرد سب امیدیں
اے جود و نوال مصطفائی
اندھیرہے بے ترے میرا گھر
اے شمع جمال مصطفائی
تقدیر چمک اٹھے رضا کی
اے شمع جمال مصطفائی

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی ہر ادا انوارِ مصطفائی سے مستنیر تھی۔ان کی زبان وقلم کا ہر تیور مدینے سے مربوط تھا۔ جہاں چراغ عشق رسالت مآب ﷺ کا اجالا نظر آتا وہاں ان کی جبین عقیدت سراپا ناز و نیاز بن جاتی۔اور جس جگہ تکریم رسالت مآب ﷺ سے دل کا آبگینہ خالی نظر آتا وہاں عظمت رسالت مآب ﷺ کی ہزاروں شمع روشن فرما دیتے تاکہ دلوں کی بستیاں نورِ محبت سے معمور ہو جائیں۔انہوں نے محبت کے جو نغمات اجالے ہیں ان کی لے اور نے دونوں کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ان کی محبت کا ہر انداز آفاق گیر ہے۔اظہارِ عقیدت و محبت میں انہوں نے کبھی اور کہیں کسی کا خیال عاریتاً نہیں لیا ہے۔ان کے منہ میں محبت کی جو زبان تھی وہ کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی تھی۔ان کے ہاں اہلِ محبت اور مریضانِ عداوت کا فرق قدم قدم پہ دکھائی دیتا ہے۔اہلِ محبت اور اہلِ عداوت دونوں کے لیے ان کے پاس الگ الگ زبانیں تھیں۔

یہاں اگر ان کی نثریات سے نظیریں پیش کریں تو مضمون کافی سے وافی طویل ہو سکتا ہے۔یہاں چند شعری نظیریں ذیل میں پیش ہیں۔

لطف ان کا عام ہو ہی جائے گا
شاد ہو ناکام ہو ہی جائے گا
جان دے دو وعدۂ دیدار پر
نقد اپنا دام ہو ہی جائے گا
بے نشانوں کا نشاں مٹتا نہیں
مٹتے مٹتے نام ہو ہی جائے گا
سائلو! دامن سخی کا تھام لو!
کچھ نہ کچھ انعام ہو ہی جائے گا
اے رضؔا ہر کام کا اک وقت ہے
دل کو بھی آرام ہو ہی جائے گا

(انتخاب حدائق بخشش، ص:۷۳)

لحد میں عشقِ رخ شہ کا چراغ لے کے چلے
اندھیری رات سنی تھی چراغ لے کے چلے
ترے غلاموں کا نقشِ قدم ہے راہِ خدا
وہ کیا بہک سکے جو یہ سراغ لے کے چلے
جناں بنے گی محبانِ چار یار کی قبر
جو اپنے سینے میں یہ چار باغ لے کے چلے
رضؔا کسی سگِ طیبہ کے پاؤں بھی چومے
تم اور آہ! کہ اتنا دماغ لے کے چلے
عرشِ حق ہے مسندِ رفعت رسول اللہ کی
دیکھنی ہے حشر میں عزت رسول اللہ کی
سورج الٹے پاؤں پلٹے چاند اشارے سے ہو چاک
اندھے نجدی دیکھ لے قدرت رسول اللہ کی
تجھ سے اور جنت سے کیا مطلب وہابی دور ہو
ہم رسول اللہ کے جنت رسول اللہ کی
ذکر روکے، فضل کاٹے، عیب کا جویاں رہے
پھر کہے مردک کہ ہوں امّت رسول اللہ کی
نجدی اس نے تجھ کو مہلت دی کہ اس عالم میں ہے
کافر و مرتد پہ بھی رحمت رسول اللہ کی

(انتخاب حدائق بخشش، ص:۱۷۷)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ سفیر عشق رسالت مآب ﷺ تھے۔ قدرت نے انھیں خصوصی توجہات سے نوازا تھا۔ ان کی ذات فضائل وکمالات کی جامع تھی۔ وہ بکثرت علوم و فنون کے عارف بھی تھے اور حامل بھی تھے۔ آج ان علوم وفنون کا شمار اوران کا تعین اہلِ علم و دانش کے لیے دشوار ثابت ہورہا ہے۔ ان کی ولادت دین وشریعت کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لیے ہوئی تھی۔ ان کا عہد فتنوں کا عہد تھا۔ فتنے حشرات الارض کی طرح زمین پر رینگتے تھے۔ حق پرستوں پہ خوف طاری تھا، فتنے اور فتنہ گر بے خوف تھے۔ کیونکہ فتنوں کی پشت پناہی بڑی طاقتیں کر رہی تھیں۔ کلیسائی تہذیب کے نمائندے اہلِ ایمان ویقین کے لیے الگ دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ اہلِ حق کے لیے بکثرت پابندیاں تھی اور باطل کو ہر طرح کی سہولتیں میسر تھیں۔ بے بنیاد سوالات تراشے جاتے تھے اور علماء و صوفیاء سے ان کے جوابات طلب کیے جاتے تھے۔ ناکافی جوابات کی صورت میں ان کی ذات کو نشانہ بنایا جاتا تھا۔ باطل کو اہلِ حق ہی سے افرادی قوت مل رہی تھی۔ چونکہ ان کے ہاں ہر طرح کی آزادی بھی تھی اور سہولتیں بھی، اسی لیے لوگ جلد ان کے فریب کا شکار ہو جاتے تھے۔ انھیں خوش حالی کا سبز باغ بھی دکھایا جاتا تھا۔ غربت اعتبار چھین لیتی ہے، دولت کے آگے غربت گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ اہلِ حق کو منزل کا شعور تھا، نشانِ منزل نگاہوں سے اوجھل تھا۔ حرم کا عرفان تھا سوئے حرم لے جانے والی کوئی ذات دور دور تک نظر نہیں آرہی تھی۔ ہر سمت ظلمت کے ڈیرے اور بسیرے تھے۔ ایسے حالات میں روح کو جھنجھوڑنے والی ایک آواز فضا میں گونجتی ہے۔ ؎

سونا جنگل رات اندھیری چھائی بدلی کالی ہے
سونے والو، جاگتے رہیو چوروں کی رکھوالی ہے
سونا پاس ہے، سونا بن ہے، سونا زہر ہے اٹھ پیارے
تو کہتا ہے نیند ہے میٹھی تیری مت ہی نرالی ہے
آنکھ سے کاجل صاف چرا لیں یاں وہ چور بلا کے ہیں
تیری گٹھری تاکی ہے، اور تو نے نیند نکالی ہے

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ دین وشریعت کی معتبر آواز تھے، ایک ایسی آواز جس میں ماضی کا تیقن، حال کا تفکر اور مستقبل کا تدبر سب اپنی جمالیات کے ساتھ اکٹھا تھے۔ ان کے ہاں فکر امروز اور فکر فردا دونوں کی تابشیں یکساں نظر آتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں میں حال اور مستقبل دونوں کی تعمیر، تزئین اور توقیر کا خواب لے کر پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے زندگی اور بندگی کے ہر شعبے کو باشعور بنانے کے لیے جو جدوجہد کی ہے تاریخ عالم میں اس کی بہت کم نظیریں ملتی ہیں۔ ان کی ہر فکر اور ہر تیور میں عرش کی ہم نشینی کے جلوے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا ہر تصور آفاقیت لیے ہوئے ہے۔ انہوں نے اپنے عہد میں ہر اس فکر، ہر اس نظریے اور ہر اس تصور کا تعاقب کیا ہے جس سے اسلامی اصولوں کے آئینے کے گرد آلود ہونے کا خطرہ محسوس کیا ہے۔ ان کی نگاہ ہر وقت نبضِ ملت پہ ہوتی تھی۔ وہ اپنے دل میں جسد ملت سے تمام فاسد مادے کو جڑ سے نکال دینے کا جنون رکھتے تھے۔ انھیں قدرت نے ہر طرح کی صلاحیتوں سے مزین فرمایا تھا۔ انہوں نے اپنے عہد کی ہر باطل قوت کا پورے حوصلے اور عزم صمیم کے ساتھ تعاقب کیا ہے۔ انھیں دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا مفکر، مدبر اور فلسفی کبھی مرعوب نہ کرسکا۔ وہ اپنے علمی کمالات کے باعث اپنے پورے عہد پہ حاوی رہے۔ علوم وفنون کی دنیا میں بڑی بڑی باشعور شخصیات اپنے بے شمار کمالات کے ساتھ چاند وسورج کی طرح دمکتی نظر آتی ہیں اور سب کے احترام کے لیے ہماری اور ہر علم دین کے طالب علم کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں لیکن مجدد دین علما میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے مخصوص امتیازات ہیں۔ ان کی تجدیدی خدمات مجددِ دین علما کی صف میں اپنا جداگانہ مقام رکھتی ہیں۔ یہ تاریخ عالم کی ایک ایسی بے غبار صداقت ہے جس کا کوئی بھی ذی شعور دانشور انکار نہیں کر سکتا۔ دنیا ماہرین علوم وفنون سے کبھی خالی نہیں رہی لیکن جدید وقدیم علوم وفنون کی جو کثرت ہمیں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے ہاں نظر آتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسی لیے ان کے بعض فتاوے کو دیکھ کر ان کے مخالفین کو بھی کہنا پڑا کہ اگر مولانا احمد رضا بریلوی پیدا نہ ہوتے تو برصغیر ہند و پاک سے حنفیت ختم ہو جاتی۔ ان کی بعض تحقیقات کو دیکھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ اپنے عہد کے امامِ اعظم ابو حنیفہ ثانی ہیں۔ حضرت جلال الدین سیوطی جیسے دانائے روزگار ان کے تلامذہ کی صف میں نظر آتے ہیں۔

□□□□

محمد ملک الظفر سہسرامی

ایک دردمند مفکر

امام احمد رضا کی تعلیمی، سماجی اور اصلاحی فکر کا تحقیقی مطالعہ

ادارتی نوٹ:

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کی علمی، فقہی اور اعتقادی خدمات پہ بے شمار کتابیں، مقالات اور تذکرے منظرِ عام پہ آ چکے ہیں۔آپ کے فتاوے، فقہی بصیرت، عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، دفاعِ اہلِ سنّت، تصنیفی عظمت اور علمی مقام پہ اہلِ علم نے مختلف زاویوں سے گفتگو کی ہے مگر یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آپ کی اجتماعی فکر، اصلاحی بصیرت اور ملت کی تعمیرِ نو کے لیے پیش کیے گئے اس بے مثال دس نکاتی اصلاحی منشور پہ اس انداز سے نہ تو سنجیدہ توجہ دی گئی اور نہ ہی اس کے مقاصد اور دوررس نتائج کا تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ عوام وخواص کے سامنے پیش کیا جا سکا۔

حیرت ہوتی ہے کہ ایک صدی سے زائد کا طویل عرصہ گذر جانے کے باوصف ہمارے علمی ذخیرے میں محفوظ یہ گراں قدر دستاویز اب تک اہلِ علم کی توجہ کا مرکز نہ بن سکی اور نہ ہی اس کے افکار وبصیرت کو وہ مقام مل سکا جس کی وہ حقیقی معنوں میں مستحق تھے۔حالانکہ اگر اس کے ہر نکتے پہ تدبر، بصیرت اور غیر جانب دارانہ نگاہ سے غور کیا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اس میں محض چند اصلاحی تجاویز پیش نہیں کی گئیں، بلکہ ملتِ اسلامیہ کی فکری، تعلیمی، معاشی، اخلاقی، تنظیمی اور دعوتی تعمیر کا ایک جامع اور ہمہ گیر منشور پیش کیا گیا ہے، جس میں ایک عظیم مفکر کی دور اندیش نگاہ، ایک دردمند مصلح کا تڑپتا ہوا دل اور ایک مدبر قائد کی حکیمانہ منصوبہ بندی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

اس دستاویز کا ہر نکتہ اپنے اندر ایک مستقل جہانِ معنیٰ سموئے ہوئے ہے۔اس کے پس منظر میں صرف وقتی مسائل کا ادراک نہیں بلکہ مستقبل کے امکانات، آنے والے فکری چیلنجز اور ملت کی دیرپا بقا واستحکام کا گہرا شعور بھی کارفرما نظر آتا ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ امام احمد رضا اپنے عہد سے مکالمہ کرتے ہوئے بھی آنے والی نسلوں سے مخاطب ہیں، انہیں بیدار کر رہے ہیں، ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلا رہے ہیں اور ان کے لیے ایک ایسا فکری نقشۂ راہ (Road map) مرتب کر رہے ہیں جو زمانے کی تبدیلی کے باوجود اپنی معنویت اور افادیت برقرار رکھتا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ ہم نے اس عظیم سرمایۂ فکر کو زیادہ تر تاریخی ورثہ سمجھ کر محفوظ تو رکھا مگر اسے ایک زندہ فکری دستاویز کی حیثیت سے پڑھنے، سمجھنے اور اپنے اجتماعی نظام کا حصہ بنانے کی سنجیدہ کوشش نہ کر سکے۔اگر اس منشور کو محض عقیدت کی نگاہ سے نہیں بلکہ تحقیق، تجزیے اور عملی تطبیق کے زاویے سے دیکھا جائے تو اس کے اندر تعلیم کی تعمیر بھی ہے، قیادت کی تربیت بھی، تنظیم کا شعور بھی ہے، ابلاغ کی حکمت بھی، اہلِ علم کی سرپرستی بھی ہے، اہلِ قلم کی ذمہ داری بھی اور سب سے بڑھ کر ایک ایسی بیدار، خوددار اور باوقار ملت کا خواب بھی ہے جو علم، کردار، اتحاد اور عمل کی بنیاد پہ اپنی تاریخ خود رقم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

شاید اب وقت آ گیا ہے کہ اس گراں قدر دستاویز کو صرف ماضی کی یادگار کے طور پہ نہیں بلکہ حال کی ضرورت اور مستقبل کی رہنمائی کے طور پہ ازسرِ نو پڑھا جائے، اس کے ہر نکتے پہ علمی وتحقیقی گفتگو کی جائے، اس کے مضمرات کو عصرِ حاضر کے تناظر میں سمجھا جائے اور اسے ملت کی تعلیمی، دعوتی، تنظیمی اور فکری منصوبہ بندی کا بنیادی ماخذ بنایا جائے۔یہی اس عظیم فکری امانت کا حق ہے اور یہی امام احمد رضا کی دور اندیشی کو حقیقی خراجِ تحسین بھی۔

زیرِ نظر سلسلۂ مضامین اسی احساس کا حاصل ہے۔اس کا مقصد محض ان دس نکات کی تشریح کرنا نہیں بلکہ ان کے تاریخی پس منظر، فکری جہات، سماجی حکمت، تعلیمی افادیت اور عصرِ حاضر سے ان کی گہری مناسبت اجاگر کرنا ہے، تاکہ نئی نسل امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کی شخصیت کے اس درخشاں پہلو

سے بھی آشنا ہو، جو کم نصیبی سے نسبتاً پس منظر میں رہ گیا ہے۔

اس تحقیقی مطالعے کے دوران بار بار یہ احساس شدت اختیار کرتا ہے کہ امام احمد رضا کو صرف ایک عظیم فقیہ، جلیل القدر مفتی یا بے مثال محدث و متکلم کی حیثیت سے دیکھنا ان کی ہمہ گیر شخصیت کے ساتھ انصاف نہیں۔ ان کا یہ اصلاحی منشور اس حقیقت کا روشن ثبوت ہے کہ وہ اپنے عہد کے غیر معمولی دانش ور، بلند پایہ مفکر، ماہرِ تعلیم، سماجی مصلح، باصلاحیت تنظیم ساز، انسانی وسائل کے بہترین منصوبہ ساز اور آنے والے زمانوں کی ضرورتوں کا گہرا شعور رکھنے والے مستقبل شناس قائد و رہنما بھی تھے۔ ان کی نگاہ محض اپنے زمانے کے مسائل تک محدود نہ تھی بلکہ وہ ان بنیادوں کی نشاندہی کر رہے تھے جن پر کسی بھی قوم کی علمی، فکری اور تہذیبی بقا کا انحصار ہوتا ہے۔

جس دقتِ نظر کے ساتھ انھوں نے تعلیم، تحقیق، دعوت، تنظیم، قیادت، صحافت، ابلاغ، اہلِ علم کی سرپرستی، اہلِ قلم کی حوصلہ افزائی اور اجتماعی وسائل کے صحیح مصرف کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ ان کی فکر محض ردِّ باطل تک محدود نہ تھی بلکہ وہ ایک مثبت، تعمیری اور ہمہ جہت ملی منصوبہ رکھتے تھے۔ ان کے پیشِ نظر صرف علمی مباحث کی وسعت نہ تھی بلکہ ایک ایسی باوقار امت کی تشکیل بھی تھی جو اپنے عقیدے میں پختہ، اپنے علم میں عمیق، اپنی تہذیب میں خود آگاہ، اپنی تنظیم میں مضبوط اور اپنے کردار میں مثالی ہو۔

ان کے اس اصلاحی منشور کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ حقیقت بھی نمایاں ہوتی ہے کہ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز مسائل کے تعاقب کرنے والے مفکر نہیں تھے بلکہ مسائل پیدا ہونے سے پہلے ان کی جڑیں پہچان لینے والی بصیرت رکھتے تھے۔ وہ وقتی علاج کی بجائے دائمی بنیادیں استوار کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے ان کی توجہ افراد سے بڑھ کر اداروں پر، واقعات سے بڑھ کر اصولوں پر، جذبات سے بڑھ کر تربیت پر اور وقتی کامیابیوں سے بڑھ کر نسلوں کی فکری و اخلاقی تعمیر پر مرکوز نظر آتی ہے۔

اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو امام احمد رضا کی شخصیت صرف علومِ دینیہ کی ایک درخشاں تعبیر نہیں، بلکہ ملت کی اجتماعی زندگی کے ایک عظیم معمار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ صرف فتاوے لکھنے والے فقیہ نہیں بلکہ افکار کی سمت متعین کرنے والے مفکر، صرف مناظرانہ قوت کے مالک متکلم نہیں بلکہ تہذیب کی حفاظت کرنے والے نگہبان، صرف اپنے عہد کے عالم نہیں بلکہ ہر دور کے لیے رہنمائی کا سرمایہ چھوڑ جانے والے قائد تھے۔ یہی وہ پہلو ہے جسے جتنا زیادہ سمجھا جائے، اتنا ہی امام احمد رضا کی عظمت کا ایک نیا افق ہمارے سامنے روشن ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ احساس گہرا ہوتا ہے کہ ان کی فکر کا دائرہ ایک فرد، ایک طبقے یا ایک زمانے تک محدود نہیں بلکہ پوری ملت کی فکری تشکیل، علمی استحکام اور تہذیبی بقا کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

اگر آج ملتِ اسلامیہ کو علمی انحطاط، فکری انتشار، تعلیمی کمزوری، معاشی بے سمتی اور تنظیمی انتشار جیسے مسائل کا سامنا ہے تو امام احمد رضا کا یہ دس نکاتی اصلاحی منشور ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم اپنے اس عظیم علمی ورثے کی طرف دوبارہ رجوع کریں، اس کا غیر جانب دارانہ اور تحقیقی مطالعہ کریں، اس کی روح کو سمجھیں اور اسے اپنے اجتماعی شعور اور عملی زندگی کا حصہ بنائیں۔ یقین ہے کہ یہ مطالعہ نہ صرف امام احمد رضا کی فکری عظمت کے ایک نیا باب وا کرے گا بلکہ ملت کی فکری بیداری اور اصلاحِ احوال کے لیے بھی نئی راہیں متعین کرے گا۔

تاریخِ اسلام کے بعض رجال ایسے ہوتے ہیں جن کی شخصیت صرف اپنے عہد تک محدود نہیں رہتی بلکہ زمانوں کے فاصلے طے کر کے آنے والی نسلوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ ان کی فکر اپنے دور کے مسائل کا جواب ہونے کے ساتھ ساتھ مستقبل کی ضرورتوں کا بھی ادراک رکھتی ہے۔ ان کی زندگی محض واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ ایک زندہ پیغام، ایک روشن فکر اور ایک ایسی عملی تفسیر بن جاتی ہے جو ہر دور کے اہلِ حق کو عزم، بصیرت اور استقامت کا درس دیتی ہے۔ وقت کے تغیرات ان کی عظمت ماند نہیں کرتے بلکہ ہر نئے فکری و سماجی چیلنج کے ساتھ ان کی شخصیت کے نئے پہلو مزید نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وہ ہستیاں ہیں جن کے افکار تاریخ کے اوراق میں قید نہیں رہتے بلکہ زندہ ضمیر رکھنے والوں کے دل و دماغ میں چراغِ راہ بن کر ہمیشہ فروزاں رہتے ہیں۔

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز انھی نابغۂ روزگار شخصیات میں سے ایک ہیں جنھوں نے علم و دانش، فقہ و فتاویٰ، تصنیف و تحقیق اور دعوت و اصلاح کے میدان میں ایسے نقوش چھوڑے جو آج بھی اہلِ علم کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔

امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کو صرف ایک فقیہ، محدث یا متکلم کی حیثیت سے دیکھنا ان کی ہمہ گیر شخصیت کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔ آپ ایک ایسے عہد ساز مفکر تھے جنہوں نے علم و تحقیق، فقہ و فتویٰ، عشقِ رسول ﷺ، تصوف وسلوک، دعوت واصلاح، تصنیف و تالیف، مناظرہ و دفاعِ اہلِ سنّت اور ملتِ اسلامیہ کی فکری رہنمائی جیسے بے شمار میدانوں میں ایسے نقوش چھوڑے جو آج بھی اہلِ علم کے لیے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی ذات ایک جامع علمی دبستان، ایک متحرک اصلاحی تحریک اور ایک زندہ فکری روایت کا عنوان تھی، جس نے اپنے عہد کو بھی متأثر کیا اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی رہنمائی کا یادگاری سرمایہ فراہم کیا۔

ان کی تصانیف کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ایک ایسے عالی دماغ روشن ضمیر عالم دین تھے جنہوں نے دینی علوم کے ساتھ عصری مسائل اور سماجی تغیرات کا بھی گہرا شعور حاصل کیا تھا۔ وہ ملتِ اسلامیہ کی دینی کمزوریوں پر بھی نگاہ رکھتے تھے اور اس کے معاشی، تعلیمی اور تمدنی زوال پر بھی ان کا دل تڑپتا تھا۔

ان کے سینے میں ایک ایسا حساس اور دردمند دل دھڑکتا تھا جو امت کی بے راہ روی پر بے چین رہتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ بھٹکے ہوئے قافلے دوبارہ شاہراہِ حق پر گامزن ہوں، بکھری ہوئی صفیں متحد ہوں، علمی زوال کی جگہ فکری بیداری پیدا ہو اور مسلمانوں کے دلوں میں اپنے دین اور اپنی تہذیبی شناخت کے لیے اعتماد ووقار پیدا ہو۔

امام احمد رضا کی فکر کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ محض نظری مباحث کے عالم نہ تھے بلکہ عملی اصلاح کے داعی بھی تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ امت کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ دور ہو جائے، خواہ وہ داخلی کمزوریاں ہوں یا خارجی سازشیں، خواہ وہ جہالت کے اندھیرے ہوں یا فتنۂ الحاد ونیچریت کی یلغار، خواہ وہ اپنوں کی بے اعتدالیاں ہوں یا مخالفین کی فکری یورشیں۔

اسی پس منظر میں ان کا وہ مشہور دس نکاتی اصلاحی پروگرام غیر معمولی اہمیت اختیار کر جاتا ہے جسے ان کی اجتماعی فکر اور ملی شعور کا عطر کہا جا سکتا ہے۔ یہ دس نکات دراصل کسی وقتی مصلحت کا نتیجہ نہیں بلکہ امتِ مسلمہ کے مسائل کے عمیق مطالعے اور ان کے حل کی ایک منظم اور جامع کوشش تھے۔

اگر اس منشور کا تنقیدی اور تحقیقی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بنیادی ستون علم، عمل، اصلاح عقائد ونظریات، اتحاد امت، معاشی خود کفالت، دینی شعور، اخلاقی اصلاح اور اجتماعی نظم پر قائم ہیں۔ امام احمد رضا بخوبی جانتے تھے کہ محض جذباتی نعروں سے قوموں کی تقدیر نہیں بدلتی بلکہ اس کے لیے فکری استحکام، عملی جدوجہد اور اجتماعی نظم وضبط ضروری ہے۔

ان کے نزدیک تعلیمی پسماندگی مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب تھی۔ اس لیے وہ ایسی تعلیم کے حامی تھے جو دین اور دنیا دونوں ضروریات پوری کرے۔ وہ مذہبی علوم کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ان علوم سے بھی بے اعتنائی کے قائل نہ تھے جو قوم کی معاشی اور تمدنی ترقی میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح معاشی کمزوری کو بھی وہ ملت کے لیے ایک بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک اقتصادی خود مختاری کے بغیر کوئی قوم اپنے وقار اور آزادی برقرار نہیں رکھ سکتی۔ چنانچہ ان کی اصلاحی فکر میں معاشی استحکام کا پہلو بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

دس نکاتی پروگرام کا ایک اہم پہلو اتحادِ ملت بھی ہے۔ امام احمد رضا اختلافات کے باوجود دینی تشخص اور اجتماعی مفاد کے تحفظ کو ناگزیر سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ منتشر قوتیں کبھی بڑی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتیں، اس لیے انہوں نے ملت کے افراد کو نظم، اتحاد اور باہمی تعاون کی تلقین کی۔ ان کی فکر کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اصلاح کو صرف ظاہری تبدیلی کا نام نہیں دیتے بلکہ اسے دلوں کی تطہیر اور کردار سازی سے جوڑتے ہیں۔ ان کے نزدیک حقیقی اور پائیدار تبدیلی اسی وقت ممکن ہے جب عقائد کی بنیادیں درست ہوں، اعمال صالحہ سے زندگی آراستہ ہو، اخلاقِ حسنہ کردار کا زیور بن جائیں، حیات کے ہر گوشے میں شریعتِ مطہرہ کی رہنمائی موجود ہو اور دل عشقِ رسولِ اکرم ﷺ کی روشن شمع سے منور ہو۔ اسی نورِ محبت میں دین کی صحیح روح کو سمجھا جائے، دینی اقدار اپنائے جائیں اور زندگی محبت رسول اللہ ﷺ کے خوبصورت سائبان میں رضائے الٰہی کے سانچے میں

ڈھالی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا کا یہ دس نکاتی منشور ایک صدی سے زائد قبل مرتب ہونے کے باوجود آج بھی اپنی معنویت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ آج بھی ملت انہی مسائل سے دوچار ہے جن کی نشاندہی انہوں نے اپنے زمانے میں کی تھی۔ علمی انحطاط، فکری انتشار، معاشی کمزوری، اخلاقی بحران اور اجتماعی بے سمتی آج بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ایسے میں ان کی اصلاحی فکر نئی روشنی اور نئی توانائی فراہم کرتی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز صرف ایک عظیم فقیہ یا بلند پایہ محدث ہی نہیں تھے بلکہ ایک ایسے مفکرِ ملت تھے جنہوں نے اپنے دور کے مسائل گہرائی سے سمجھے، ان کا تجزیہ کیا اور ان کے حل کے لیے ایک واضح لائحۂ عمل بھی پیش کیا۔ ان کا دس نکاتی فارمولہ دراصل قوم وملت کے لیے ایک ایسا فکری منشور ہے جس میں اصلاحِ عقیدہ، تعمیرِ کردار، استحکامِ معیشت، فروغِ تعلیم اور اتحادِ ملت کا جامع پیغام موجود ہے۔

آج جب ہم ان کی فکر کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد سے بہت آگے دیکھنے والی شخصیت تھے۔ ان کی نگاہ صرف اپنے زمانے کے مسائل تک محدود نہ تھی بلکہ آنے والے حالات، فکری تغیرات اور ملت کو درپیش چیلنجوں کا بھی گہرا ادراک رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں اور افکار آج بھی اسی طرح تازہ، زندہ اور رہنمائی فراہم کرنے والے محسوس ہوتے ہیں جیسے وہ آج کے حالات ہی سامنے رکھ کر قلم بند کیے گئے ہوں۔ زمانے بدل گئے، حالات نے کروٹیں لیں مگر ان کی بصیرت کی روشنی آج بھی اہلِ علم و دانش کے لیے مشعلِ راہ ہے اور ان کی دور اندیشی ہر دور میں اپنی صداقت کا احساس دلاتی ہے۔ ان کے دل میں امت کا درد تھا، نگاہ میں مستقبل کی بصیرت تھی اور قلم میں اصلاح وتعمیر کی وہ قوت تھی جس نے انہیں تاریخِ اسلام کے عظیم مصلحین کی صف میں نمایاں مقام عطا کیا۔

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ آپ نے محض دینی مسائل کی توضیح اور فقہی تحقیقات پہ اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی مستقبل، فکری استحکام اور معاشرتی تعمیر کے لیے بھی واضح رہنمائی فراہم کی۔ آپ کا دس نکاتی اصلاحی پروگرام دراصل ایک ایسے دردمند مفکر کا منشور ہے جو اپنی قوم کو زوال کے اسباب سے نکال کر عروج کی شاہراہ پر گامزن دیکھنا چاہتا تھا۔

یہ محض چند ہدایات یا رسمی تجاویز کا مجموعہ نہیں بلکہ امت کی فکری، دینی، تعلیمی، اخلاقی اور سماجی تعمیرِ نو کا ایک جامع خاکہ ہے۔ اس کے ہر نکتے کے پس منظر میں ملت کا درد، مستقبل کی فکر اور اصلاحِ احوال کی بے چین تڑپ کارفرما نظر آتی ہے۔ آپ چاہتے تھے کہ مسلمان محض ماضی کے کارناموں پہ فخر کرنے والی قوم بن کر نہ رہیں بلکہ علم، عمل، کردار، اتحاد، تنظیم اور دعوت کے میدان میں پھر سے اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کریں۔ آج جب ہم اس اصلاحی منشور کا مطالعہ کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ یہ صرف اپنے عہد کی ضرورت نہیں تھا، بلکہ موجودہ دور کے انتشار، فکری بے راہ روی اور عملی کمزوریوں کا بھی مؤثر علاج اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اگر اس پروگرام کو اخلاص، بصیرت اور عملی عزم کے ساتھ اختیار کر لیا جائے تو یقیناً یہ ملت کی فکری بیداری، دینی استحکام اور اجتماعی سربلندی کی ایک نئی صبح کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔

یہ امر بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کا یہ دس نکاتی اصلاحی منشور کسی علمی خلوت میں مرتب کیا گیا نظری خاکہ نہیں تھا بلکہ اپنے عہد کے نہایت نازک دینی، فکری اور سماجی حالات کا ایک دردمند اور حقیقت پسندانہ جواب تھا۔ اس زمانے میں برصغیر کے مسلمان سیاسی اقتدار سے محرومی، تعلیمی پسماندگی، معاشی کمزوری، دینی انتشار، باطل افکار کی یلغار، نوآبادیاتی اثرات، داخلی افتراق اور تنظیمی بے سمتی جیسے متعدد بحرانوں سے دوچار تھے۔ ایک طرف مغربی تہذیب اور جدید فکری رجحانات مسلمانوں کے عقائد و افکار پہ اثر انداز ہو رہے تھے، تو دوسری جانب مذہبی میدان میں مختلف فتنوں اور گمراہ کن تحریکوں نے عوام کے اذہان کو اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ایسے پُرآشوب ماحول میں امام احمد رضا نے محض تنقید پہ اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ملت کی تعمیر و تنظیم، علمی بیداری، دعوت و تبلیغ، معاشی استحکام، اصلاحِ عقائد، اجتماعی نظم اور افرادی قوت

کے صحیح استعمال پہ مشتمل ایک جامع عملی پروگرام پیش کیا، جو بعد میں ان کے دس نکاتی اصلاحی منشور کی صورت میں معروف ہوا۔ یہی تاریخی پس منظر اس دستاویز کی غیر معمولی اہمیت واضح کرتا ہے کہ یہ محض چند نصیحتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ اپنے دور کے حالات کا عمیق ادراک رکھنے والے ایک بالغ نظر مفکر کی اصلاحی حکمتِ عملی اور ملت کے لیے ایک جامع لائحۂ عمل تھا۔

صحیح دینی تعلیم کا فروغ۔۔پس منظر، ضرورت اور معنویت:

امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کا یہ نکتہ کو سمجھنے کے لیے اس عہد کے حالات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ آپ کا زمانہ برصغیر کی تاریخ کا نہایت نازک اور فیصلہ کن دور تھا۔ 1857ء کے بعد مسلمانوں کی سیاسی قوت منتشر ہو چکی تھی، علمی مراکز کمزور پڑ رہے تھے، معاشی زوال میں اضافہ ہو رہا تھا اور مغربی افکار و نظریات نئی نسل کے اذہان پر تیزی سے اثر انداز ہو رہے تھے۔ ایک طرف انگریزی نظامِ تعلیم اپنی پوری قوت کے ساتھ فروغ پا رہا تھا تو دوسری طرف مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد دینی تعلیم سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

خصوصاً انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ محض سیاسی غلامی کا دور نہ تھا بلکہ فکری، اعتقادی اور تہذیبی یلغار کا بھی عہد تھا۔ اس زمانے میں ایسے متعدد فتنے پیدا ہوئے جنہوں نے اسلامی عقائد، دینی اقدار اور اہلِ سنّت کے مسلمات کو براہِ راست نشانہ بنایا۔ مغربی استعمار نے صرف مسلمانوں کی زمینوں پہ قبضہ نہیں کیا بلکہ ان کے اذہان کو بھی اپنی فکری غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی منظم کوشش کی۔ اسی پس منظر میں مختلف نظریات اور تحریکیں وجود میں لائی گئیں جنہوں نے اسلام کے مسلمہ عقائد کو نئے انداز سے چیلنج کیا۔

فکری و اعتقادی محاذ پر ابھرنے والے فتنے:

(۱) نیچریت (Naturalism) اور سرسید کی خانہ ساز فکر

اس نظریے کے تحت معجزات، کرامات، فرشتوں، جنات اور دیگر غیبی امور کی ایسی عقلی توجیہات پیش کی گئیں جن سے ان کی حقیقی حیثیت ہی بدلنے لگی۔ وحی کو محض ایک باطنی کیفیت، معجزات کو فطری قوانین کے تابع واقعات اور دعا و تقدیر کو نفسیاتی اثرات قرار دینے کی کوشش کی گئی۔ یوں قرآن و حدیث کی صریح نصوص کو عقلِ محض کے تابع کرنے کا رجحان فروغ پانے لگا۔

(۲) انکارِ معجزات اور غیبیات

انبیائے کرام علیہم السلام کے معجزات، واقعۂ معراج، شق القمر، نزولِ ملائکہ، عذابِ قبر، حشر و نشر، جنت و دوزخ جیسے بنیادی عقائد جدید سائنس اور مغربی فلسفے کے پیمانوں پہ پرکھے جانے لگے۔ بہت سارے نام نہاد روشن خیال افراد ان کی تاویل یا انکار کی راہ پر چل پڑے، جس سے عوام کے ایمان میں تشکیک پیدا ہوئی۔

(۳) عقلیت پسندی (Rationalism)

عقل کو وحی پر حاکم بنا دیا گیا۔ ہر وہ حقیقت جسے محدود انسانی عقل فوری طور پر نہ سمجھ سکے، اسے قابلِ اعتراض یا ناقابلِ قبول قرار دینے کا رجحان عام ہوا۔ نتیجتاً دینی نصوص کی من مانی تشریحات ہونے لگیں اور صدیوں سے چلے آنے والے اجماعی عقائد بھی سوالات کی زد میں آ گئے۔

(۴) انکارِ حدیث اور حجیتِ سنّت پر حملے

بعض حلقوں نے قرآنِ کریم کو ہدایت کے باب میں کافی قرار دے کر احادیثِ نبویہ کی شرعی حیثیت کمزور کرنے کی کوشش کی۔ اس فکر نے سنّتِ رسول ﷺ کے عملی نظام اور اسلامی فقہ کی بنیادوں پر کاری ضرب لگائی، کیونکہ شریعتِ اسلامی کا ایک بڑا حصہ احادیثِ مبارکہ ہی سے ثابت ہے۔

(۵) عقیدۂ ختمِ نبوت پر حملے

اس دور میں عقیدۂ ختمِ نبوت کو مختلف پہلوؤں سے نشانہ بنایا گیا۔ اس کی انتہا مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوائے نبوت کی صورت میں سامنے آئی، جس نے امت کے اس اجماعی اور قطعی عقیدے کو کھلا چیلنج دیا۔ استعمار کی سرپرستی میں اس فتنے نے مسلمانوں کے اندر مذہبی انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی، جس کا اکابرِ امت نے علمی، فقہی اور اعتقادی سطح پر بھرپور تعاقب کیا۔

(۶) حضورِ اکرم ﷺ کے علمِ غیب اور خصائصِ نبوت کا انکار

اسی زمانے میں رسولِ اکرم ﷺ کے علمِ غیب، آپ کی عطائی و وہبی خصوصیات اور دیگر خصائصِ نبوت کو ہدف بنا کر ایسی تعبیرات پیش کی گئیں جن سے مقامِ رسالت کے تقدس کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان مباحث نے عوام کے اذہان میں شکوک پیدا کیے اور محبتِ رسول ﷺ کی بنیادیں کمزور کرنے کی سعی کی گئی۔

(۷) اہانتِ رسول ﷺ اور تنقیصِ رسالت پر مبنی تحریریں

اس دور میں بعض ایسی کتابیں اور تحریریں منظرِ عام پر آئیں جن میں بارگاہِ رسالت مآب ﷺ کی شان میں گستاخانہ اور تنقیص آمیز عبارات پائی جاتی تھیں۔ بعض نے انہیں علمی تنقید کا نام دیا اور بعض نے اصلاحِ عقائد کا عنوان اختیار کیا مگر ان کے نتیجے میں عوام کے دلوں میں عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے۔ ان حملوں کا مقصد صرف چند علمی مسائل پہ اختلاف پیدا کرنا نہ تھا بلکہ امت کے اس رشتۂ محبت، تعظیم اور ادب کو کمزور کرنا تھا جو ایمان کی روح ہے۔

(۸) عیسائی مشنری سرگرمیاں

برطانوی حکومت کی پشت پناہی میں عیسائی مشنریاں بڑے پیمانے پر اسلام کے خلاف اعتراضات، مناظرے، کتابیں اور تعلیمی ادارے قائم کر رہی تھیں۔ قرآنِ کریم، رسولِ اکرم ﷺ اور اسلامی تعلیمات پر مسلسل اعتراضات کیے جا رہے تھے تاکہ مسلمانوں کے ایمان کو متزلزل کیا جا سکے۔

(۹) ملحدانہ اور مادیت پسند فلسفے

یورپ سے آنے والے الحاد، مادیت (Materialism)، ڈارونیت اور سیکولر فکر نے مذہب کو محض ایک نجی معاملہ قرار دے کر زندگی کے اجتماعی نظام سے خارج کرنے کی کوشش کی۔ ان نظریات نے خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوانوں کو متاثر کیا اور دین و عقل کے درمیان مصنوعی تصادم کا تصور عام کیا۔

(۱۰) باطل فرقوں اور گمراہ افکار کا فروغ

اسی دور میں مختلف باطل فرقے اور گمراہ نظریات بھی سرگرم ہوئے۔ کہیں اہلِ سنّت کے معمولات کو بدعت قرار دے کر عوام کو اپنے اسلاف سے کاٹنے کی کوشش کی گئی، تو کہیں اولیائے کرام کی محبت، شفاعت، توسل، استمداد اور تعظیم رسول ﷺ جیسے مسلمہ عقائد پر اعتراضات کیے گئے۔ اس کے نتیجے میں مذہبی انتشار میں اضافہ ہوا اور عوام میں فکری اضطراب پیدا ہونے لگا۔

ان تمام فتنوں کا مشترکہ مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنے عقائد، اپنی علمی روایات اور اپنے دینی تشخص سے دور ہو جائیں۔ یہ محض چند فقہی یا نظری اختلافات نہ تھے بلکہ اسلام کے بنیادی اعتقادی ڈھانچے، ناموسِ رسالت ﷺ، عقیدۂ ختمِ نبوت اور اہلِ سنّت کے مسلمات پر منظم حملے تھے۔

یہی وہ نازک دور تھا جب اکابرِ اہلِ سنت، خصوصاً امام احمد رضا فاضلِ بریلوی قدس سرہٗ العزیز اور ان کے رفقائے علم و قلم نے فتویٰ، تصنیف، تدریس، مناظرہ اور علمی تحقیق کے ذریعے ان فکری و اعتقادی یلغاروں کا نہایت مؤثر جواب دیا۔ انہوں نے اہلِ سنّت کے عقائد کا مضبوط علمی دفاع کیا، باطل نظریات کا مدلل رد فرمایا اور امت کے ایمان و عقیدے کے تحفظ میں ایسا تاریخی کردار ادا کیا جس کی مثال برصغیر کی دینی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی دینی و علمی جد وجہد کو محض فقہی اختلافات کی تاریخ نہیں بلکہ اسلام کے اعتقادی تشخص، ناموسِ رسالت ﷺ اور عقیدۂ ختمِ نبوت کے تحفظ کی ایک عظیم، ہمہ گیر اور تجدیدی تحریک قرار دیا جاتا ہے۔

اس عظیم دینی و فکری جدوجہد کی ضرورت اس لیے بھی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی علمی و دینی حالت نہایت ابتر ہو چکی تھی، جہالت کا یہ عالم تھا کہ بہت سے مسلمان اپنے بنیادی عقائد، ضروریاتِ دین اور شرعی احکام سے بھی پوری طرح واقف نہ تھے۔

امام احمد رضا نے اس صورتِ حال کا نہایت گہرا مشاہدہ کیا۔ آپ نے محسوس کیا کہ اگر امت کی علمی بنیادیں کمزور ہو گئیں تو اس کی دینی شناخت بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اسی لیے آپ نے اصلاحِ ملت کا آغاز تعلیم سے کیا۔ لیکن ان کے نزدیک تعلیم سے مراد محض کتابی معلومات یا رسمی درس نہیں تھا بلکہ ایسا علم تھا جو ایمان کو استحکام بخشے،

عقیدہ مضبوط کرے، کردار و عمل سنوارے اور انسان کو اپنے رب، اپنے دین اور اپنی تہذیبی ذمہ داریوں سے آگاہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ امام احمد رضا نے دینی تعلیم کے فروغ کو تمام اصلاحی کوششوں کی بنیاد قرار دیا۔ ان کے نزدیک جہالت ہر فتنے کی ماں ہے اور علم ہر اصلاح کا سرچشمہ۔ جب علم ہوگا تو عقیدہ محفوظ ہوگا، عبادت درست ہوگی، اخلاق سنوریں گے اور ملت اپنی فکری آزادی برقرار رکھ سکے گی۔

درحقیقت یہ نکتہ صرف تعلیم کی دعوت نہیں بلکہ ایک ایسے فکری انقلاب کا اعلان تھا جس کے ذریعے امام احمد رضا امت کو اس کے اصل علمی اور روحانی سرچشموں سے دوبارہ جوڑنا چاہتے تھے۔ ان کی نگاہ میں ملت کی بقا کا راز تلوار کی طاقت میں نہیں بلکہ قلم کی قوت، علم کی روشنی اور صحیح دینی شعور میں پوشیدہ تھا۔

مدارس و مکاتب کا قیام اور استحکام -- ایک تاریخی ضرورت اور فکری حکمت

امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کے اس نکتے کی معنویت سمجھنے کے لیے ان تاریخی حالات پہ نظر ڈالنا ضروری ہے جن میں یہ فکر سامنے آئی۔ برصغیر میں مسلم اقتدار کے زوال کے بعد صرف سیاسی اقتدار ہی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نہیں نکلا تھا بلکہ ان کے علمی، تہذیبی اور تعلیمی مراکز بھی شدید متاثر ہوئے تھے۔ وہ مدارس جو صدیوں سے علومِ اسلامیہ کی اشاعت، دینی قیادت کی تیاری اور اسلامی تہذیب کی حفاظت کا فریضہ انجام دے رہے تھے، ان کی سرپرستی کے وسائل کمزور پڑ چکے تھے۔ اوقاف کی آمدنی محدود ہوگئی، علمی مراکز ویرانی کے شکار ہونے لگے اور نئی نسل تیزی سے ایسے تعلیمی نظام کی طرف مائل ہونے لگی جس میں دین کے لیے بہت کم گنجائش باقی رہ گئی تھی۔

یہ وہ دور تھا جب مغربی تعلیم اپنے ساتھ ایک نئے طرزِ فکر، نئی تہذیبی اقدار اور نئے سماجی تصورات بھی لا رہی تھی۔ بہت سے لوگ اس تبدیلی کو محض تعلیمی تبدیلی سمجھ رہے تھے مگر امام احمد رضا کی دوررس نگاہ اس کے تہذیبی اور اعتقادی اثرات بھی دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اگر مسلمانوں کے اپنے علمی مراکز محفوظ نہ رہے تو آنے والی نسلیں صرف اپنی علمی میراث ہی سے محروم نہیں ہوں گی بلکہ اپنی مذہبی شناخت اور تہذیبی انفرادیت بھی کھو بیٹھیں گی۔

اسی احساس نے انہیں مدارس و مکاتب کے قیام اور استحکام کی طرف متوجہ کیا۔ ان کے نزدیک مسجد اور مدرسہ اسلامی معاشرے کے دو ایسے ستون ہیں جن پر ملت کی فکری اور روحانی عمارت قائم رہتی ہے۔ مسجد ایمان کی حرارت زندہ رکھتی ہے اور مدرسہ اس ایمان کو علم، فہم اور شعور کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ امام احمد رضا نے مدرسے کو محض چند کتابیں پڑھانے والی درس گاہ کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ اسے ملت کی فکری خودمختاری کا مرکز تصور کیا۔ ان کے نزدیک مدرسہ وہ جگہ ہے جہاں قرآن کی صدائیں گونجتی ہیں، حدیث کے چشمے جاری ہوتے ہیں، فقہ و عقائد کی بنیادیں مضبوط کی جاتی ہیں، محبت رسول اللہ ﷺ کا جذبہ دلوں میں بیدار کیا جاتا ہے، تعلق باللہ کے مدارج طے کرائے جاتے ہیں اور جہاں نسلِ نو کو اپنے دین، اپنی تہذیب اور اپنے اسلاف کی علمی روایت سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں مدارس کا قیام صرف ایک تعلیمی اقدام نہیں تھا بلکہ تہذیبی بقا کی ایک جدوجہد تھی۔ یہ دراصل اس بات کا اعلان تھا کہ مسلمان اپنے عقیدے، اپنی ثقافت اور اپنی علمی روایات حالات کے طوفان میں بہنے نہیں دیں گے۔ مدارس نے اس دور میں وہ کردار ادا کیا جو کسی قوم کے لیے قلعے ادا کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ قلعے پتھروں اور اینٹوں سے نہیں بلکہ علم، ایمان اور کردار سے تعمیر کیے گئے تھے۔

امام احمد رضا کی نظر میں مکتب کی اہمیت بھی کم نہ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ بڑے علمی مراکز تک پہنچنے سے پہلے بچے کی ابتدائی تربیت ضروری ہے۔ چنانچہ انہوں نے مکاتب کے قیام کو بھی ملت کے مستقبل سے جوڑا۔ ان کے نزدیک اگر بچپن ہی میں قرآن، عقائد اور بنیادی اسلامی تعلیمات کی آبیاری ہو جائے تو زندگی بھر ایمان کا چراغ روشن رہتا ہے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو مدارس و مکاتب کے قیام کا یہ نکتہ محض تعلیمی اداروں کی تعداد بڑھانے کا منصوبہ نہیں تھا بلکہ ایک مکمل تہذیبی، فکری اور دینی حکمتِ عملی تھی۔ امام احمد رضا گویا یہ پیغام دے رہے تھے کہ قوموں کی زندگی صرف سیاسی قوت سے قائم نہیں رہتی بلکہ

ان کے علمی مراکز، تعلیمی ادارے اور فکری سرچشمے ہی ان کی اصل زندگی ہوتے ہیں۔ جب تک یہ مراکز زندہ رہتے ہیں، قومیں بھی زندہ رہتی ہیں اور جب یہ کمزور پڑ جاتے ہیں تو قومیں اپنی شناخت کھونے لگتی ہیں۔

آج برصغیر میں پھیلے ہوئے ہزاروں مدارس و مکاتب کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کی یہ فکر محض ایک وقتی تدبیر نہ تھی بلکہ آنے والی صدیوں کی ضرورتوں کا ادراک رکھنے والے ایک عظیم مفکر کی دور اندیش آواز تھی، جو ملت کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ علم کے چراغ بجھ جائیں تو تہذیبوں پر اندھیرا چھا جاتا ہے اور اگر مدارس آباد رہیں تو قوم کی روح بھی زندہ رہتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز نے صحیح دینی تعلیم کے فروغ کو اصلاحِ ملت کا پہلا زینہ اس لیے قرار دیا کہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ قوموں کی تقدیر میدانِ جنگ سے پہلے درس گاہوں میں لکھی جاتی ہے، تہذیبوں کی بقا کا فیصلہ ایوانوں سے زیادہ تعلیمی مراکز میں ہوتا ہے اور ایمان کی حفاظت صرف جذبات سے نہیں بلکہ صحیح علم، مستحکم عقیدے اور مضبوط فکری تربیت سے ممکن ہوتی ہے۔ اسی لیے انہوں نے مدارس و مکاتب کے قیام، دینی تعلیم کی اشاعت اور صحیح عقائد کی ترویج کو اپنی اصلاحی فکر کا نقطۂ آغاز بنایا۔

ایک صدی سے زائد عرصہ گذر جانے کے باوجود آج کا منظرنامہ ہمیں یہی احساس دلاتا ہے کہ حالات بدل گئے ہیں مگر چیلنجز کی نوعیت بہت حد تک وہی ہے۔ ذرائع بدل گئے، فکری یلغار کے اسلوب تبدیل ہو گئے لیکن ایمان، تہذیب، شناخت اور دینی شعور کو درپیش خطرات آج بھی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ ایسے ماحول میں امام احمد رضا کی یہ آواز پہلے سے کہیں زیادہ توجہ کی مستحق ہے کہ ملت کی حقیقی قوت نہ دولت میں ہے، نہ اقتدار میں بلکہ صحیح علم، مستند دینی تعلیم، مضبوط عقیدے اور اپنے اسلاف کی علمی و روحانی روایت سے وابستگی میں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کے دس نکاتی اصلاحی منشور کا پہلا نکتہ محض تعلیمی پروگرام نہیں بلکہ پوری اصلاحی تحریک کی بنیاد ہے۔ جب علم صحیح ہوگا تو فکر بھی صحیح ہوگی، عقیدہ محفوظ ہوگا، کردار سنورے گا، دعوت میں اثر پیدا ہوگا، معاشرہ استحکام حاصل کرے گا اور ملت اپنی دینی و تہذیبی شناخت اعتماد کے ساتھ برقرار رکھ سکے گی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے امام احمد رضا نے ایک صدی قبل اپنی دور اندیش نگاہ سے دیکھ لیا تھا اور یہی وہ پیغام ہے جو آج بھی ہر صاحبِ فکر کو دعوت دیتا ہے کہ اگر امت کی تعمیرِ نو مطلوب ہے تو اس کا آغاز صحیح دینی تعلیم، مضبوط علمی بنیادوں اور ایمان افروز تربیت ہی سے کرنا ہوگا، کیونکہ یہی وہ چراغ ہے جس کی روشنی میں ملتیں اپنا راستہ بھی پہچانتی ہیں اور اپنی منزل بھی۔

طلبہ کو وظائف دیے جائیں تاکہ وہ معاشی مجبوریوں سے آزاد ہو کر علمِ دین حاصل کرسکیں

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کے دس نکاتی اصلاحی پروگرام کا یہ نکتہ ان کی غیر معمولی سماجی بصیرت، تعلیمی حکمت اور نفسیاتِ تعلیم سے گہری واقفیت کا مظہر ہے۔ بظاہر یہ ایک مختصر تجویز معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے پس منظر میں ملت کی تعلیمی بقا، علمی قیادت کی تیاری اور معاشی انصاف کا ایک وسیع تصور کارفرما ہے۔

امام احمد رضا کا زمانہ ایسا تھا جب برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی شکست نے ان کی معاشی بنیادیں بھی متزلزل کر دی تھیں۔ ہزاروں خاندان غربت، بے روزگاری اور مالی تنگی کے شکار تھے۔ ایسے حالات میں بے شمار ذہین اور باصلاحیت نوجوان محض اس لیے اعلیٰ دینی تعلیم سے محروم رہ جاتے تھے کہ ان کے گھروں میں دو وقت کی روٹی کا انتظام بھی مشکل تھا۔ علم حاصل کرنے کی خواہش موجود تھی مگر غربت ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن چکی تھی۔

امام احمد رضا نے اس دردناک حقیقت کو صرف ایک معاشی مسئلہ نہیں سمجھا بلکہ اسے ملت کے علمی مستقبل کا مسئلہ قرار دیا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر غربت کی وجہ سے اہلِ استعداد نوجوان تعلیم سے محروم ہو جائیں گے تو آنے والے زمانے میں ملت علمی قیادت سے بھی محروم ہو جائے گی۔ اسی احساس نے انہیں اس نکتے کی طرف متوجہ کیا کہ مستحق طلبہ کے لیے وظائف کا مستقل انتظام کیا جائے تاکہ معاشی مجبوری ان کی علمی پرواز محدود نہ کر سکے۔

اس نکتے میں استعمال ہونے والا جملہ ”طلبہ کو وظائف ملیں کہ

خواہی نہ خواہی گرویدہ ہوں' اپنے اندر ایک گہرا تعلیمی فلسفہ رکھتا ہے۔ اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ کسی کو محض مالی فائدے کے لیے علمِ دین کی طرف مائل کیا جائے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسا مضبوط اور باوقار نظامِ کفالت قائم ہو جائے کہ جو نوجوان صلاحیت رکھتا ہو، وہ معاشی مجبوری کی وجہ سے تعلیم چھوڑنے پر مجبور نہ ہو۔ جب معاشی رکاوٹیں دور ہوں گی تو اہلِ استعداد نوجوان فطری طور پہ علمی میدان کی طرف راغب ہوں گے اور ملت کو بہترین علماء، محققین، مفتیان، مدرسین اور داعیانِ دین میسر آئیں گے۔

امام احمد رضا اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ تعلیم صرف ذہانت سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے یکسوئی، ذہنی سکون اور معاشی اطمینان بھی ضروری ہے۔ جو طالبِ علم ہر وقت اپنی خوراک، رہائش اور بنیادی ضروریات کی فکر میں مبتلا رہے، اس سے اعلیٰ درجے کی علمی تحقیق اور گہرے مطالعے کی توقعات کرنا مشکل ہے۔ اس لیے انہوں نے وظائف کو محض مالی امداد نہیں بلکہ علمی سرمایہ کاری (Investment in Knowledge) کی حیثیت دی۔

اس تصور کی بنیاد اسلامی تاریخ میں بھی موجود ہے۔ اسلامی تہذیب کے سنہری ادوار میں حکمرانوں، اہلِ ثروت اور اوقاف کے ذریعے طلبہ کی کفالت کا ایسا مضبوط نظام قائم تھا کہ ایک طالبِ علم اپنی تمام تر توجہ علم کے حصول پہ مرکوز رکھ سکتا تھا۔ مدارس میں رہائش، خوراک، کتب اور دیگر ضروریات کا انتظام اجتماعی طور پہ کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسی ماحول سے امام اعظم ابوحنیفہ، امام بخاری، امام مسلم، امام غزالی، امام نووی رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور بے شمار عظیم علماء پیدا ہوئے جنہوں نے صدیوں تک امت کی فکری رہنمائی کی۔

امام احمد رضا یہی علمی روایت اپنے دور میں دوبارہ زندہ دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک اگر ملت اپنے قابل نوجوانوں پہ خرچ کرنے سے دریغ کرے گی تو وہ درحقیقت اپنا مستقبل کمزور کرے گی۔ ایک عالم کی تعلیم پر خرچ ہونے والی رقم دراصل پوری قوم کے فکری مستقبل پہ خرچ ہوتی ہے، کیونکہ ایک عالم صرف اپنی ذات نہیں سنوارتا بلکہ ہزاروں انسانوں کی رہنمائی کا ذریعہ بنتا ہے۔

یہ نکتہ ہمیں ایک اور اہم حقیقت کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے کہ اسلام میں تعلیم کبھی تجارتی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھی گئی بلکہ اسے خدمتِ دین کا ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ اس لیے جو معاشرہ اپنے طلبہ کی کفالت کرتا ہے، وہ دراصل علم کی حفاظت کرتا ہے اور جو علم کی حفاظت کرتا ہے، وہ اپنے دین، اپنی تہذیب اور اپنی آنے والی نسلوں کی حفاظت کرتا ہے۔

آج کے حالات میں اس نکتے کی معنویت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ حد درجہ گرانی، تعلیمی اخراجات میں اضافہ اور معاشی عدم استحکام کے اس دور میں نہ جانے کتنے ذہین طلبہ صرف وسائل کی کمی کے باعث اپنی علمی صلاحیتیں پروان نہیں چڑھا پاتے۔ اگر ملت منظم انداز میں تعلیمی وظائف، اسکالرشپس، اوقاف اور کفالتِ طلبہ کا نظام قائم کرلے تو یقیناً ایک نئی علمی بیداری پیدا ہوسکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا کا یہ نکتہ محض وظائف تقسیم کرنے کی تجویز نہیں بلکہ ایک عظیم علمی انقلاب کی بنیاد ہے۔ وہ امت کو یہ پیغام دے رہے تھے کہ اگر تم اپنا مستقبل روشن دیکھنا چاہتے ہو تو اپنے نوجوانوں کے ہاتھ میں قلم دو، ان کے دل سے معاشی خوف نکالو، ان کی علمی استعداد پروان چڑھاؤ اور انہیں ایسا ماحول فراہم کرو جہاں وہ یکسوئی کے ساتھ علم حاصل کرسکیں۔

کیونکہ قوموں کی قسمت میدانِ جنگ میں نہیں بلکہ درس گاہوں میں لکھی جاتی ہے اور وہ قوم کبھی علمی قیادت سے محروم نہیں ہوتی جو اپنے اہلِ علم کی پرورش کو اپنی اجتماعی ذمہ داری سمجھتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کا یہ نکتہ محض مستحق طلبہ کی مالی اعانت کی ایک تجویز نہیں بلکہ ملت کی علمی تقدیر سنوارنے کا ایک دوراندیش منصوبہ ہے۔ آپ نے بہت پہلے یہ حقیقت ملاحظہ فرمالی تھی کہ جن قوموں کے باصلاحیت نوجوان معاشی مجبوریوں کی نذر ہوجائیں، وہاں علم کی شمعیں مدھم پڑنے لگتی ہیں، تحقیق کے دروازے بند ہونے لگتے ہیں اور فکری قیادت کا سرچشمہ خشک ہونے لگتا ہے۔ اس لیے آپ نے ملت کو متوجہ کیا کہ اگر وہ اپنا علمی مستقبل محفوظ دیکھنا چاہتی ہے تو اسے اپنے اہلِ استعداد نوجوانوں کی کفالت کو صدقۂ جاریہ اور اجتماعی ذمہ داری دونوں سمجھنا ہوگا۔

آج جبکہ تعلیم کے اخراجات مسلسل بڑھ رہے ہیں، معاشی مشکلات نے بے شمار ذہین طلبہ کے خواب محدود کر دیے ہیں اور بہت سی صلاحیتیں وسائل کی کمی کے باعث پروان نہیں چڑھ پا رہیں، ایسے وقت میں امام احمد رضا کی یہ صدا پہلے سے کہیں زیادہ مؤثر اور بامعنیٰ محسوس ہوتی ہے۔ یہ دراصل امت کو اس حقیقت کا احساس دلانے کی دعوت ہے کہ علم پہ خرچ کیا جانے والا ہر سرمایہ قوم کے فکری، دینی اور تہذیبی مستقبل میں کی جانے والی سرمایہ کاری ہے، جس کے ثمرات نسلوں تک پہنچتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کے دس نکاتی اصلاحی منشور کا یہ نکتہ صرف وظائف کے اجرا کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ ایک ایسی علمی تہذیب کی بنیاد رکھتا ہے جس میں کوئی باصلاحیت طالبِ علم غربت کی وجہ سے علم سے محروم نہ رہے، کوئی ذہن وسائل کی کمی کے باعث خموش نہ ہو جائے اور کوئی صالح استعداد معاشی تنگی کی نذر نہ ہو۔ جب ملت اپنے نوجوانوں کے ہاتھ میں قلم، دل میں حوصلہ اور زندگی میں اطمینان دے گی تو یہی نوجوان کل اس کے علمی امین، دینی رہنما، فکری معمار اور تہذیبی پاسبان بنیں گے۔ حقیقت یہی ہے کہ قوموں کا مستقبل خزانے بھرنے سے نہیں بلکہ اہلِ علم پیدا کرنے سے روشن ہوتا ہے اور جو قوم اپنے طالبِ علم کی کفالت کرتی ہے، دراصل وہ اپنے آنے والے کل کی حفاظت کرتی ہے۔

مدارس کے مدرسین کی معقول تنخواہیں اور کارگزاری کے مطابق مالی سرپرستی

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کے دس نکاتی اصلاحی پروگرام کا یہ نکتہ ان کی تعلیمی بصیرت، ادارہ سازی کے شعور اور اہلِ علم کی قدرشناسی کا ایک نہایت اہم مظہر ہے۔ عام طور پہ لوگ مدارس کی عمارتوں، نصاب اور طلبہ کی تعداد کو ترقی کا معیار سمجھتے ہیں لیکن امام احمد رضا کی نگاہ اس بنیادی حقیقت تک پہنچ چکی تھی کہ کسی بھی تعلیمی ادارے کی اصل روح اس کے اساتذہ ہوتے ہیں۔ اگر معلم مطمئن، باوقار اور یکسو ہوں گے تو ادارہ بھی علمی اعتبار سے مضبوط ہوگا اور اگر اساتذہ معاشی اضطراب کے شکار ہوں گے تو علمی معیار بھی بتدریج متاثر ہونے لگے گا۔

اس نکتے کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے اس دور کے معاشی حالات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ برصغیر میں مسلم اقتدار کے خاتمے کے بعد مدارس کی سرکاری سرپرستی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اوقاف کی آمدنی محدود ہو گئی، اہلِ خیر کے وسائل بھی پہلے جیسے نہ رہے اور بہت سے مدارس نہایت تنگ دستی میں اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے تھے۔ ان مدارس کے مدرسین معمولی وظائف یا انتہائی قلیل تنخواہوں پہ تدریسی خدمات انجام دیتے تھے۔ کئی اساتذہ کو اپنے اہلِ خانہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تدریس کے ساتھ دیگر ذرائعِ معاش بھی اختیار کرنے پڑتے تھے۔

امام احمد رضا نے یہ صورتِ حال نہایت گہرائی سے محسوس کی۔ وہ جانتے تھے کہ جو استاذ ہر وقت معاشی پریشانیوں میں گھرا رہے، اس کے لیے پوری یکسوئی کے ساتھ تدریس، تحقیق اور طلبہ کی تربیت میں انہماک پیدا کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس لیے انہوں نے مدارس کے مالی استحکام اور اساتذہ کی مناسب کفالت کو ملت کی علمی ترقی کا لازمی تقاضا قرار دیا۔ ان کے نزدیک مدرس صرف تنخواہ لینے والا ملازم نہیں بلکہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مشن کا امین، ملت کے فکری مستقبل کا معمار اور آنے والی نسلوں کے ایمان وعقیدے کا محافظ ہے۔ ایسی عظیم ذمہ داری انجام دینے والے افراد کو معاشی بے یقینی کے حوالے کر دینا دراصل علم کی بے توقیری کے مترادف ہے۔

اس کے ساتھ ایک اور اہم حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کے نزدیک مدرس کی کفالت کا مقصد محض اس کی معاشی ضرورت پوری کرنا نہ تھا بلکہ اس کے علمی وقار اور عزتِ نفس کا تحفظ بھی تھا۔ جس معاشرے میں معلم محتاجِ احسان بن جائے، وہاں علم کی آزادی بھی متاثر ہونے لگتی ہے اور فکری خودمختاری کمزور پڑ جاتی ہے۔ امام احمد رضا چاہتے تھے کہ مدرس پوری خودداری، استقلال اور یکسوئی کے ساتھ اپنے علمی و دینی فرائض انجام دے، کیونکہ معاشی وقار درحقیقت علمی وقار کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ جب معلم باوقار ہوگا تو اس کی تدریس میں اعتماد، اس کی تحقیق میں گہرائی اور اس کی تربیت میں

اخلاص واثر آفرینی بھی نمایاں ہوگی۔

اسی کے ساتھ امام احمد رضا نے کارگذاری کو بھی معیار بنایا۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ اداروں میں محض رسمی نظام نہ ہو بلکہ علمی معیار، تدریسی محنت، انتظامی دیانت اور تعلیمی نتائج کو بھی اہمیت دی جائے۔ جو مدرسہ واقعی دین کی خدمت، طلبہ کی تربیت اور علمی معیار بلند رکھنے میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہو، اس کی سرپرستی بھی اسی کے شایانِ شان ہونی چاہیے۔ گویا وہ احتساب، معیار اور حوصلہ افزائی ---تینوں کو ایک ساتھ دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ فکر اپنے اندر جدید تعلیمی انتظام (Educational Administration) کے کئی اصول سموئے ہوئے ہے۔ آج دنیا کے کامیاب جامعات اور تعلیمی ادارے بھی اساتذہ کی معاشی آسودگی، تحقیقی ماحول اور ادارہ جاتی کارکردگی کو ترقی کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ امام احمد رضا نے ایک صدی سے زائد قبل اسی حقیقت کی طرف ملت کو متوجہ کر دیا تھا۔ اگر یہ نکتہ وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد رضا دراصل مدارس کو محض بقا کے مرحلے سے نکال کر معیار اور استحکام کے مرحلے تک پہنچانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک ایسے مدارس مطلوب تھے جہاں استاذ معاشی اضطراب سے آزاد ہو، طالب علم یکسوئی کے ساتھ علم حاصل کرے اور ادارہ علمی عظمت کا مرکز بن کر ابھرے۔

آج بھی یہ نکتہ پوری معنویت کے ساتھ ہماری توجہ کا طالب ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مدارس علمی اعتبار سے مضبوط ہوں، تحقیق کا ذوق پروان چڑھے اور وہاں سے ایسے علماء پیدا ہوں جو عصرِ حاضر کے چیلنجز کا علمی جواب دے سکیں، تو ہمیں مدارس کے مالی استحکام، اساتذہ کی معقول کفالت اور اداروں کی شفاف و معیاری کارکردگی کو اپنی ترجیحات میں شامل کرنا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا کا یہ نکتہ محض تنخواہوں میں اضافے کی تجویز نہیں بلکہ علم کی توقیر، معلم کے احترام اور تعلیمی اداروں کے استحکام کا ایک جامع تصور پیش کرتا ہے۔ کیونکہ جس معاشرے میں معلم باوقار ہوگا، وہاں علم بھی باوقار ہوگا اور جہاں علم باوقار ہوگا، وہاں قوم کا مستقبل بھی روشن ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کا یہ نکتہ محض مدارس کے مدرسین کی تنخواہوں میں اضافے کی تجویز نہیں بلکہ علم، معلم اور تعلیمی اداروں کی عزت و وقار کا ایک ہمہ گیر منشور ہے۔ آپ بخوبی جانتے تھے کہ جس قوم کے اساتذہ معاشی بے یقینی، ذہنی اضطراب اور معاشرتی بے اعتنائی کے شکار ہوں، وہاں علم کی شمعیں تو روشن رہ سکتی ہیں مگر ان کی روشنی دھیرے دھیرے مدھم ہونے لگتی ہے۔ اس لیے آپ نے ملت کو متوجہ کیا کہ اگر وہ اپنے دینی سرمایے، اپنی علمی روایت اور اپنے فکری تشخص کی حفاظت چاہتی ہے تو اسے سب سے پہلے ان ہاتھوں کو مضبوط کرنا ہوگا جو نسلوں کی فکری تعمیر کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ آج جب معیاری تعلیم، تحقیقی ماحول، باصلاحیت اساتذہ اور مؤثر ادارہ سازی کو ترقی یافتہ معاشروں کی بنیادی ضرورت تسلیم کیا جا چکا ہے، تو امام احمد رضا کی یہ فکر اپنی معنویت کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ گویا آپ یہ پیغام دے رہے تھے کہ مدارس کی حقیقی ترقی صرف بلند و بالا عمارتوں، جدید سہولتوں یا بڑھتی ہوئی تعداد سے وابستہ نہیں بلکہ ایسے باوقار، مطمئن اور یکسو معلمین سے وابستہ ہے جو پوری علمی دیانت، روحانی اخلاص اور فکری استقلال کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے دس نکاتی اصلاحی منشور کا یہ نکتہ دراصل معلم کی تکریم، علم کی تعظیم اور ملت کے مستقبل کی تعمیر کا ایک جامع نظریہ پیش کرتا ہے۔ جب معلم کو عزت، اعتماد اور اطمینان میسر ہوگا تو علم میں گہرائی پیدا ہوگی، تحقیق کو فروغ ملے گا، کردار سازی کی روایت مضبوط ہوگی اور ایسے رجالِ علم تیار ہوں گے جو ہر دور کے فکری اور تہذیبی چیلنجز کا بصیرت کے ساتھ سامنا کر سکیں۔ حقیقت یہی ہے کہ قوموں کی عظمت صرف ان کے وسائل سے نہیں ناپی جاتی بلکہ اس بات سے بھی پہچانی جاتی ہے کہ وہ اپنے معلم کو کتنا احترام، اعتماد اور وقار عطا کرتی ہیں، کیونکہ جس معاشرے میں معلم کا مقام بلند ہوتا ہے، وہاں علم سربلند ہوتا ہے اور جہاں علم سربلند ہو، وہاں تہذیبیں زوال نہیں، عروج کی داستان لکھتی ہیں۔

طبائعِ طلبہ کی جانچ ہو، جو جس کام کے زیادہ مناسب دیکھا جائے، معقول وظیفہ دے کر اسی میں لگایا جائے:

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کے دس نکاتی

اصلاحی پروگرام کا یہ نکتہ ان کی تعلیمی حکمت، نفسیاتی بصیرت اور انسانی صلاحیتوں کے بارے میں ان کے غیر معمولی شعور کا آئینہ دار ہے۔ بظاہر یہ ایک مختصر تجویز معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے اندر تعلیم وتربیت، شخصیت سازی، قومی منصوبہ بندی اور افرادی قوت کی درست رہنمائی کا ایک ایسا جامع فلسفہ پوشیدہ ہے جسے عصرِ حاضر کی اصطلاح میں صلاحیتوں کی شناخت (Talent Identification) اور درست میدان کا انتخاب (Career Guidance) کہا جاتا ہے۔

امام احمد رضا کا زمانہ ایسا تھا جب مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشرتی زندگی مختلف بحرانوں سے گزر رہی تھی۔ ایک طرف وسائل کی کمی تھی، دوسری طرف افرادی قوت کی صحیح منصوبہ بندی کا فقدان بھی نمایاں تھا۔ بہت سے ذہین نوجوان محض روایت یا معاشرتی دباؤ کی وجہ سے ایسے میدان اختیار کر لیتے تھے جو ان کی فطری صلاحیتوں کے مطابق نہ ہوتے، نتیجتاً نہ وہ خود اپنی پوری استعداد کا اظہار کر پاتے اور نہ ملت ان کی قابلیت سے مکمل فائدہ اٹھا سکتی تھی۔

امام احمد رضا نے یہ مسئلہ نہایت گہری نگاہ سے دیکھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ایک جیسی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا نہیں کیا۔ کسی میں فقاہت کی استعداد ہے، کسی میں تدریس کی، کسی میں تحقیق کا ذوق ہے، کسی میں تصنیف وتالیف کی قوت ہے، کوئی دعوت وتبلیغ میں زیادہ مؤثر ہے، کوئی انتظامی امور میں مہارت رکھتا ہے اور کوئی معاشی یا سماجی خدمت کے میدان میں نمایاں کردار ادا کر سکتا ہے۔ حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ ہر شخص کو اس کی فطری استعداد کے مطابق میدان فراہم کیا جائے۔

اسی لیے انہوں نے فرمایا کہ ''طبائعِ طلبہ کی جانچ ہو'' یہ چند الفاظ دراصل ایک مکمل تعلیمی انقلاب کا اعلان ہیں۔ امام احمد رضا کی اس ہدایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد افراد کی تعداد بڑھانا نہیں بلکہ صلاحیتوں کو صحیح سمت دینا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ہر شخص کو اس کی فطری استعداد کے مطابق ذمہ داری سونپی جائے تو نہ صرف اس کی اپنی صلاحیتیں نکھرتی ہیں بلکہ پورا معاشرہ اس کے ثمرات سے مستفید ہوتا ہے۔ اس طرح فرد کی کامیابی اور ملت کی ترقی ایک دوسرے کی تکمیل بن جاتی ہے۔

وہ چاہتے تھے کہ تعلیم محض یکساں نصاب پڑھانے کا نام نہ رہے بلکہ ہر طالب علم کی ذہنی ساخت، علمی رجحان، فکری استعداد اور عملی صلاحیت کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے۔ اس کے بعد جس میدان میں اس کی قابلیت زیادہ نمایاں ہو، اسی سمت اس کی رہنمائی کی جائے۔

امام احمد رضا کی اس فکر میں صرف رہنمائی ہی نہیں بلکہ معاشی معاونت کا تصور بھی شامل ہے۔ اسی لیے انہوں نے فرمایا کہ ایسے طالب علم کو ''معقول وظیفہ دے کر'' اس میدان میں لگایا جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف صلاحیت کی شناخت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس صلاحیت کی آبیاری اور اس کے لیے مناسب وسائل فراہم کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر باصلاحیت نوجوان کو مناسب سرپرستی نہ ملے تو اس کی صلاحیتیں مرجھا سکتی ہیں اور اگر اس کی کفالت کی جائے تو وہ ملت کا عظیم سرمایہ بن سکتا ہے۔

اس نکتے کی ایک اہم جہت یہ بھی ہے کہ امام احمد رضا تعلیم کو محض اسناد حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ خدمتِ دین وملت کی تیاری کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ہر طالب علم کا مقصد ایک جیسا نہیں ہو سکتا، اس لیے ہر ایک سے یکساں توقع رکھنا بھی درست نہیں۔ کامیاب تعلیمی نظام وہی ہے جو افراد کو ایک ہی سانچے میں ڈھالنے کی بجائے ان کی انفرادی خصوصیات پہچانے اور انہیں پروان چڑھائے۔

اگر اس تصور کا تقابل عصرِ حاضر سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی بڑی جامعات اور جدید تعلیمی ادارے آج Aptitude Testing، Career Counseling، Talent Development اور Specialization کو تعلیم کے بنیادی اصولوں میں شمار کرتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ امام احمد رضا ایک صدی قبل اس حقیقت کی طرف ملت کی رہنمائی کر رہے تھے کہ ہر طالب علم کی فطرت اور استعداد کو سمجھے بغیر تعلیمی کامیابی کا خواب پورا نہیں ہو سکتا۔

اس نکتے میں ملت کے مستقبل کے لیے ایک بڑا پیغام بھی پوشیدہ ہے۔ قومیں اس وقت ترقی کرتی ہیں جب وہ اپنے باصلاحیت افراد کو پہچانتی ہیں، ان کی تربیت کرتی ہیں اور انہیں ان کے شایانِ شان ذمہ

داریاں سونپتی ہیں۔لیکن جب صلاحیتیں نظرانداز کی جائیں، سفارش کو معیار بنالیا جائے یا افراد کو ان کی استعداد کے برخلاف میدانوں میں ڈھکیل دیا جائے تو نہ صرف افراد ناکام ہوتے ہیں بلکہ پوری قوم اس کا نقصان اٹھاتی ہے۔

امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز دراصل ایک ایسی نسل تیار کرنا چاہتے تھے جو اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق دین وملت کی خدمت انجام دے۔ وہ جانتے تھے کہ ایک بہترین مفتی، ایک کامیاب مفسر، ایک بلند پایہ محدث، ایک مؤثر داعی، ایک عظیم مصنف اور ایک باصلاحیت منتظم سب کی ضرورت ہےلیکن ان میں سے ہر شخصیت اپنی الگ استعداد اور مناسب تربیت کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا کا یہ نکتہ محض طلبہ کے جائزے کا پروگرام نہیں بلکہ ملت کی افرادی قوت کی صحیح منصوبہ بندی کا ایک جامع تصور ہے۔ وہ امت کو یہ باور کرارہے تھے کہ انسانی صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں، انہیں پہچاننا، سنوارنا اور صحیح مقام پہ استعمال کرنا ہی ایک زندہ قوم کی علامت ہے۔جس معاشرے میں صلاحیتوں کی قدر ہوتی ہے، وہاں علم بھی پھلتا پھولتا ہے، ادارے بھی مضبوط ہوتے ہیں اور قوم بھی ترقی کی نئی منزلیں طے کرتی ہے۔ یہی وہ دوراندیش فکر ہے جس نے امام احمد رضا کو صرف ایک عظیم فقیہ ہی نہیں بلکہ ایک مدبرِ ملت اور ماہرِ تعلیم کے طور پہ بھی ممتاز کردیا۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کا یہ نکتہ محض طلبہ کی صلاحیتوں کا جائزہ لینے یا انہیں مختلف شعبوں میں تقسیم کرنے کی تجویز نہیں بلکہ ایک ایسی حکیمانہ تعلیمی فکر کا مظہر ہے جس میں فرد کی فطری استعداد، ملت کی اجتماعی ضرورت اور دین کی خدمت کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیا گیا ہے۔ آپ بخوبی جانتے تھے کہ ہر انسان ایک منفرد صلاحیت، ایک جداگانہ ذوق اور ایک مخصوص ذمہ داری کے ساتھ دنیا میں آتا ہے۔ اگر اس کی انفرادی استعداد پہچان کر صحیح سمت عطا کر دی جائے تو وہ صرف اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ پوری ملت کے لیے خیر وبرکت کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔

آج جب دنیا صلاحیت شناسی، تخصص، پیشہ ورانہ رہنمائی اور انسانی وسائل کی مؤثر منصوبہ بندی کو ترقی کی بنیاد قرار دے رہی ہے، تو امام احمد رضا کی یہ فکر اپنی تازگی اور معنویت کے ساتھ ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ گویا وہ ایک صدی قبل ہی یہ پیغام دے رہے تھے کہ کامیاب قومیں وہ نہیں ہوتیں جو اپنے تمام افراد کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیں بلکہ وہ ہوتی ہیں جو ہر فرد کی منفرد صلاحیت پہچانیں، اس کی آبیاری کریں اور اسے وہ میدان عطا کریں جہاں اس کی قابلیت پوری طرح نکھر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کے دس نکاتی اصلاحی منشور کا یہ نکتہ دراصل افراد سازی کے ذریعے ملت سازی کا ایک جامع تصور پیش کرتا ہے۔ جب صلاحیتوں کی قدر ہوگی، قابلیت کو معیار بنایا جائے گا، دیانت اور اہلیت کے مطابق ذمہ داریاں سونپی جائیں گی اور ہر فرد کو اس کی فطری استعداد کے مطابق خدمت کا موقع ملے گا، تو علمی مراکز مضبوط ہوں گے، ادارے مستحکم ہوں گے، قیادت صالح ہاتھوں میں آئے گی اور ملت کا اجتماعی سفر استحکام اور عروج کی سمت گامزن ہوگا۔ حقیقت یہی ہے کہ زندہ قومیں اپنے افراد کو شمار نہیں کرتیں بلکہ ان کی صلاحیتوں کو سنوارتی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہر صلاحیت ایک امانت ہے، اور اس امانت کو پہچان کر صحیح مقام پہ بروئے کار لانا ہی قوموں کی حقیقی دانش، ان کی پائیدار ترقی اور ان کی روشن تقدیر کی بنیاد بنتا ہے۔

ان میں جو تیار ہوتے جائیں، تنخواہیں دے کر ملک میں پھیلائے جائیں کہ تحریراً، تقریراً اور مناظرۃً اشاعتِ دین ومذہب کریں

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کے دس نکاتی اصلاحی پروگرام کا یہ نکتہ ان کی دعوتی بصیرت، تنظیمی شعور اور ملت کی فکری قیادت کے بارے میں ان کی غیر معمولی دوراندیشی کا شاہکار ہے۔ اس مختصر سی عبارت میں ایک ایسی جامع حکمتِ عملی پوشیدہ ہے جس کا تعلق صرف علماء کی تیاری سے نہیں بلکہ ان کی منصوبہ بند تعیناتی، معاشی کفالت اور منظم دعوتِ دین سے ہے۔ اگر اس نکتے کا گہرائی سے

مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ امام احمد رضا صرف علماء پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ ایک ایسی فعال، منظم اور باصلاحیت علمی جماعت وجود میں لانا چاہتے تھے جو ملک کے گوشے گوشے میں اسلام کی صحیح تعلیمات کی اشاعت کا فریضہ انجام دے۔

اس نکتے کا پس منظر سمجھنے کے لیے امام احمد رضا کے عہد کے دینی اور فکری حالات کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ برصغیر میں مختلف فکری تحریکیں سرگرم تھیں، مذہبی اختلافات شدت اختیار کر رہے تھے، استعماری نظام کے اثرات سے فکر ونظر کی نئی جہتیں ابھر رہی تھیں اور معاشرے میں فکری تغیر کی ایک خموش مگر گہری لہر محسوس کی جا رہی تھی اور عوام کے عقائد ونظریات مختلف سمتوں سے متأثر ہو رہے تھے۔ ایسے وقت میں صرف مدارس قائم کر دینا کافی نہیں تھا بلکہ ان مدارس سے فارغ ہونے والے علماء کو منظم انداز میں میدانِ عمل میں بھی اتارنا ضروری تھا تاکہ وہ معاشرے کی صحیح رہنمائی کر سکیں۔

امام احمد رضا نے یہی ضرورت محسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ان میں جو تیار ہوتے جائیں، تنخواہیں دے کر ملک میں پھیلائے جائیں۔'' یہ الفاظ یہ حقیقت آشکار کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک ایک عالم کی ذمہ داری صرف سند حاصل کرنے پہ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کی اصل زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ معاشرے میں اتر کر دین کی خدمت انجام دیتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر ایسے علماء کو معاشی تحفظ حاصل نہ ہو تو ان کی تمام تر توانائیاں روزگار کی فکر میں صرف ہو جائیں گی اور دعوت و اصلاح کا عظیم فریضہ متأثر ہوگا۔ اس لیے انہوں نے علماء کی کفالت کو بھی دعوتِ دین کے استحکام کا لازمی حصہ قرار دیا۔

یہاں امام احمد رضا کی تنظیمی فکر اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اہلِ علم کو اتفاقی طور پہ نہیں بلکہ منصوبہ بندی کے ساتھ مختلف علاقوں میں بھیجا جائے۔ جہاں دینی رہنمائی کی ضرورت ہو، وہاں ایک صاحبِ علم، صاحبِ کردار اور صاحبِ بصیرت عالم موجود ہو جو لوگوں کی دینی، اخلاقی اور فکری رہنمائی کر سکے۔ گویا وہ ایک ایسی منظم دعوتی تحریک کی بنیاد رکھ رہے تھے جس میں تربیت بھی ہو، تعیناتی بھی اور کفالت بھی۔

اس نکتے کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ امام احمد رضا نے اشاعتِ دین کے تین بنیادی ذرائع متعین کیے: تحریر، تقریر اور مناظرہ۔ تحریر کو مقدم رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قلم کی طاقت سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایک مضبوط علمی تحریر وقت اور جگہ کی حدود سے آزاد ہو کر نسلوں تک اپنا اثر قائم رکھتی ہے۔ کتابیں، رسائل، فتاوے اور مضامین صرف اپنے عہد کی نہیں بلکہ آنے والے زمانوں کی بھی رہنمائی کرتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خود امام احمد رضا نے اپنے پیچھے ایسا عظیم علمی سرمایہ چھوڑا جو آج بھی اہلِ علم کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ تقریر کو انہوں نے عوامی اصلاح کا مؤثر ذریعہ قرار دیا۔ ہر شخص کتاب نہیں پڑھ سکتا لیکن ایک مؤثر خطیب ہزاروں افراد کے دلوں میں ایمان کی حرارت، عمل کا جذبہ اور دین کی محبت پیدا کر سکتا ہے۔ مسجد، منبر، جلسہ اور درسگاہ معاشرے کی فکری تعمیر کے ایسے مراکز ہیں جنہیں امام احمد رضا انتہائی اہمیت دیتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے مناظرے کا ذکر کیا مگر قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اسے تحریر اور تقریر کے بعد رکھا۔ اس ترتیب میں بھی ایک گہرا پیغام پوشیدہ ہے۔ ان کے نزدیک مناظرہ محض مخالف کو شکست دینے کا نام نہیں تھا بلکہ حق کی توضیح، شبہات کے ازالے اور باطل نظریات کے علمی تعاقب کا ایک مہذب اور مدلل ذریعہ تھا۔ وہ ایسے مناظرے کے قائل تھے جس کی بنیاد علم، تحقیق، حسنِ استدلال اور اخلاق پر ہو، نہ کہ اشتعال، تحقیر یا ذاتی عداوت پر۔

امام احمد رضا کی نگاہ میں دعوت کا ایک خموش مگر نہایت مؤثر ذریعہ داعی کا اپنا کردار بھی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر عالم کی زندگی اس کی دعوت کی عملی تفسیر بن جائے تو اس کی خموشی بھی لوگوں کے لیے پیغام بن جاتی ہے۔ اس لیے ان کے مطلوب داعی کی پہچان صرف اس کا علم نہ تھا بلکہ اس کا اخلاص، تقویٰ، حسنِ اخلاق، وسعتِ ظرف اور عملی نمونہ بھی تھا۔ تحریر ذہنوں کو متاثر کرتی ہے، تقریر دلوں کو گرما دیتی ہے، مناظرہ شبہات دور کرتا ہے لیکن کردار وہ روشنی ہے جو خموشی کے باوجود نسلوں کی رہنمائی کرتی رہتی ہے۔

اگر وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو امام احمد رضا کا یہ نکتہ دراصل ایک جامع دعوتی نظام (Missionary Framework) پیش

کرتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ملت کے اندر ایسے علماء کی ایک جماعت تیار ہو جو صرف درسِ نظامی کی اسناد کے حامل نہ ہوں بلکہ قلم کے ذریعے لکھ سکیں، زبان کے ذریعے دلوں کو متأثر کر سکیں اور ضرورت پڑنے پر علمی میدان میں اسلام کا دفاع بھی کر سکیں۔ یہی وہ ہمہ جہت شخصیت تھی جسے امام احمد رضا اپنے اصلاحی منصوبے کا مطلوب انسان بنانا چاہتے تھے۔

عصرِ حاضر میں اس نکتے کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ آج اشاعتِ افکار کے ذرائع بے شمار ہو چکے ہیں۔ کتابوں کے ساتھ ساتھ اخبارات، رسائل، الیکٹرانک میڈیا، ڈیجیٹل پلیٹ فارمز اور سوشل میڈیا نے ابلاغ کے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔ ایسے دور میں امام احمد رضا کی یہ فکر ہمیں یاد دلاتی ہے کہ اگر اہلِ حق اپنے قلم، اپنی زبان اور اپنی علمی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لائیں گے تو فکری خلا لازماً دوسروں کے نظریات سے پُر ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا کا یہ پانچواں نکتہ محض علماء کو روزگار فراہم کرنے کی تجویز نہیں بلکہ ایک زندہ، متحرک اور منظم دعوتی تحریک کی بنیاد ہے۔ وہ ایک ایسی جماعت تیار کرنا چاہتے تھے جو علم میں راسخ ہو، کردار میں مثالی ہو، فکر میں متوازن ہو اور دعوت میں سرگرم ہو جو اپنی تحریر سے ذہنوں کو روشن کرے، اپنی تقریر سے دلوں کو بیدار کرے اور اپنے علمی استدلال سے حق کی روشنی عام کرے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز ایک صدی قبل ہی اس حقیقت کا اعلان کر رہے تھے کہ دین کی بقا صرف علماء پیدا کرنے میں نہیں بلکہ ایسے علماء تیار کرنے میں ہے جو میدانِ عمل میں اتر کر ملت کی فکری، روحانی اور اخلاقی قیادت کا فریضہ انجام دیں۔ یہی ان کے اصلاحی پروگرام کا وہ پہلو ہے جو آج بھی پوری تازگی، معنویت اور افادیت کے ساتھ اہلِ علم اور اہلِ دعوت کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کا یہ نکتہ محض علماء کی تقرری یا ان کے معاشی استحکام کی تجویز نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر دعوتی نظام کی تشکیل کا جامع خاکہ ہے۔ آپ چاہتے تھے کہ مدارس صرف اسناد تقسیم کرنے والے ادارے نہ رہیں بلکہ ایسے رجالِ کار تیار کریں جو علم و عمل، فکر و کردار اور اخلاص و بصیرت کے پیکر بن کر معاشرے میں اتریں۔ ان کی تحریر ذہنوں کو روشنی عطا کرے، ان کی تقریر دلوں میں ایمان کی حرارت پیدا کرے، ان کا علمی استدلال شبہات کا ازالہ کرے اور ان کی عملی زندگی دینِ اسلام کی زندہ تفسیر بن جائے۔

آج جب افکار کی جنگ سرحدوں پہ نہیں بلکہ اذہان کے اندر لڑی جا رہی ہے، جب ایک تحریر، ایک تقریر اور ایک پیغام لمحوں میں لاکھوں انسانوں تک پہنچ جاتا ہے، ایسے دور میں امام احمد رضا کی یہ فکر پہلے سے کہیں زیادہ زندہ اور زیادہ مؤثر محسوس ہوتی ہے۔ گویا وہ ایک صدی قبل ہی ملت کو یہ حقیقت سمجھا رہے تھے کہ اگر اہلِ حق میدانِ ابلاغ، میدانِ فکر اور میدانِ دعوت کو خالی چھوڑ دیں گے تو باطل افکار یہ خلا ضرور پُر کر دیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ علم کے چراغ صرف مدارس کی چہار دیواری تک محدود نہ رہیں بلکہ ملک کے ہر شہر، ہر قصبے اور ہر بستی تک اپنی روشنی پہنچائیں۔

درحقیقت امام احمد رضا کا یہ نکتہ افراد کی تعیناتی کا نہیں بلکہ پیغام کی امانت کو نسل در نسل منتقل کرنے کا منشور ہے۔ وہ ایسی جماعت تیار کرنا چاہتے تھے جو علم میں راسخ، کردار میں پاکیزہ، فکر میں متوازن، دعوت میں حکیم اور خدمتِ دین میں ہر لمحہ سرگرم ہو۔ یہی وہ جماعت ہے جو امت کے ایمان کی محافظ، اس کی فکری رہنما اور اس کی روحانی قوت بن سکتی ہے۔

قوموں کی تقدیر صرف درس گاہوں میں نہیں بنتی، بلکہ اس وقت سنورتی ہے جب انہی درس گاہوں سے اٹھنے والے اہلِ علم میدانِ زندگی میں اتر کر اپنے علم کو عمل، اپنی فکر کو دعوت اور اپنے کردار کو امت کی رہنمائی کا روشن چراغ بنا دیتے ہیں۔ یہی امام احمد رضا کے اس اصلاحی منشور کا وہ زندہ پیغام ہے جو ہر دور کے اہلِ علم اور اہلِ دعوت کو پکار کر کہتا ہے کہ علم کی حقیقی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب وہ انسانوں تک پہنچ کر ان کی زندگی بدلنے کا ذریعہ بن جائے۔

حمایتِ مذہب اور ردِّ بدمذہباں میں مفید کتب ورسائل، مصنفوں کو نذرانے دے کر تصنیف کرائے جائیں:

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کے دس نکاتی اصلاحی پروگرام کا یہ نکتہ ان کی فکری بصیرت، علمی حکمتِ عملی اور ابلاغی شعور کا نہایت درخشاں مظہر ہے۔ اگر ان کے پورے اصلاحی منصوبے پہ غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف علماء کی تیاری، مدارس کے قیام یا دعوت وتبلیغ پہ اکتفانہیں کرتے بلکہ اس کے بعد ایک ایسے مضبوط علمی سرمایے کی تشکیل بھی ضروری سمجھتے ہیں جو زمانے کے فکری چیلنجز کا سامنا کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اہلِ قلم کی سرپرستی، مفید دینی لٹریچرز کی تصنیف اور مصنفین کی مالی اعانت کو باقاعدہ ایک مستقل اصلاحی نکتے کے طور پہ پیش کیا۔

اس نکتے کا پس منظر سمجھنے کے لیے اس دور کی فکری فضا پہ نظر ڈالنا ناگزیر ہے۔ انیسویں صدی کے آخری عشرے اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں برصغیر میں طباعت کا انقلاب آ چکا تھا۔ چھاپہ خانوں نے افکار کی اشاعت کو غیر معمولی وسعت عطا کر دی تھی۔ مختلف مذہبی، فکری اور سیاسی جماعتیں اپنے اپنے نظریات کی ترویج کے لیے کتابیں، رسائل، پمفلٹ اور اخبارات شائع کر رہی تھیں۔ باطل افکار کے حامل حلقے بھی اسی کے ذریعے سے عوام کے اذہان کو متاثر کرنے میں مصروف تھے۔ امام احمد رضا نے بدلتی ہوئی یہ صورتِ حال بہت جلد محسوس کر لی اور یہ حقیقت جان لی کہ اب معرکہ صرف منبروں پہ نہیں رہے گا بلکہ کتابوں کے صفحات پہ بھی برپا ہوگا۔

اسی احساس کے تحت انہوں نے فرمایا کہ ’’حمایتِ مذہب اور ردِّ بدمذہباں میں مفید کتب ورسائل، مصنفوں کو نذرانے دے کر تصنیف کرائے جائیں۔‘‘ یہ مختصر سا جملہ اپنے اندر ایک عظیم فکری منصوبہ سموئے ہوئے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد رضا تصنیف و تالیف کو محض انفرادی ذوق کا نتیجہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے امت کی اجتماعی ذمہ داری قرار دیتے تھے۔

ان کی نگاہ میں ایک صاحبِ قلم صرف ایک فرد نہیں بلکہ پوری ملت کا فکری محافظ، عقیدے کا پاسبان، تہذیبی شعور کا امین اور آنے والی نسلوں کی ذہنی و روحانی تربیت کا معمار ہوتا ہے اسے مزید اس کی تحریریں محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتیں بلکہ وہ دلوں میں یقین کی شمع روشن کرتیں، ذہنوں سے شکوک وشبہات کے بادل چھانٹتیں، باطل افکار کی یلغار کا مقابلہ کرتیں اور حق وصداقت کی روشنی زمانے کے گوشے گوشے تک پہنچاتی ہیں۔ ایک صاحبِ قلم اپنے قلم کی روشنائی سے وہ خدمات انجام دیتا ہے جو بسا اوقات تلوار کی دھار بھی انجام نہیں دے سکتی۔ اسی لیے امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز چاہتے تھے کہ ایسے اہلِ قلم کی علمی سرپرستی کی جائے، انہیں معاشی آسودگی فراہم کی جائے اور ان کی صلاحیتیں ملت کے اجتماعی مفاد کے لیے بروئے کار لائی جائیں، کیونکہ جب قلم محفوظ ہوتا ہے تو فکر محفوظ رہتی ہے اور جب فکر محفوظ رہتی ہے تو عقیدہ، تہذیب اور ملت کی شناخت بھی محفوظ رہتی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ علمی تحقیق، کتب نویسی اور دینی لٹریچرز کی تیاری ایک نہایت صبر آزما، وقت طلب اور مسلسل ریاضت کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ وہ میدان نہیں جہاں چند لمحوں کی محنت سے شاہکار وجود میں آ جائیں بلکہ یہاں برسوں کے مطالعے، شب بیداریوں، فکری انہماک، علمی دیانت اور مسلسل جستجو کے بعد کوئی ایسی تصنیف سامنے آتی ہے جو نسلوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکے۔ اگر اہلِ قلم کو معاشی آسودگی، ذہنی یکسوئی اور علمی سرپرستی میسر نہ ہو تو ان کی بے شمار تخلیقی صلاحیتیں روزگار کی الجھنوں، معاشی پریشانیوں اور وسائل کی تنگی کی نذر ہو جاتی ہیں۔ کتنے ہی ایسے صاحبِ علم ہوتے ہیں جن کے سینوں میں تحقیقات کے خزانے، ذہنوں میں عظیم تصنیفات کے نقوش، دلوں میں ملت کا درد اور قلموں میں امت کی رہنمائی کا بے بہا سرمایہ پوشیدہ ہوتا ہے مگر حالات کی سختیاں، معاشی مجبوریوں کی زنجیریں اور روزگار کی مسلسل الجھنیں انہیں اس عظیم خدمت کے لیے مطلوبہ فرصت ہی نہیں دے پاتیں۔ بسا اوقات ایک نابغۂ روزگار محقق اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتیں معاشی مسائل کے حل میں صرف کر دیتا ہے، ایک بلند پایہ مصنف کی غیر معمولی فکری استعداد زمانے کی بے رحم ضروریات کی نذر ہو جاتی ہے اور ایک صاحبِ نظر عالم کے دل میں مچلنے والے بے شمار

علمی منصوبے صفحۂ قرطاس تک پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ یوں صرف ایک فرد کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ پوری ملت ایک ایسے علمی سرمائے سے محروم ہو جاتی ہے جو اس کی فکری رہنمائی، اعتقادی استحکام اور تہذیبی بقا کا ذریعہ بن سکتا تھا۔

اسی لیے امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کی نگاہ صرف افراد پہ نہیں بلکہ ان کے اندر چھپی ہوئی علمی صلاحیتوں، تحقیقی امکانات اور فکری اثاثوں پہ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اہلِ علم اگر معاشی اطمینان، علمی سرپرستی اور یکسوئی کا ماحول فراہم کر دیا جائے تو انہی قلموں سے وہ شاہکار وجود میں آ سکتے ہیں جو صدیوں تک امت کی فکری رہنمائی کرتے رہیں، گمراہیوں کے اندھیروں میں چراغ بن کر جلتے رہیں گے اور آنے والی نسلوں کو ایمان، علم اور بصیرت کی شاہراہ پر گامزن رکھنے کا ذریعہ بن جائیں گے۔

امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز یہی تلخ حقیقت محسوس کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اہلِ قلم کو اس قدر معاشی اطمینان اور علمی اعتماد حاصل ہو کہ ان کی تمام تر ذہنی توانائیاں علم کی تخلیق، دین کی خدمت، ملت کی رہنمائی اور باطل افکار کے علمی تعاقب پہ صرف ہوں، نہ کہ روزمرہ معاشی مشکلات کے حل میں مصروف ہو جائیں۔ ان کے نزدیک ایک مصنف کی کفالت کسی ایک فرد کی مدد نہیں بلکہ امت کے علمی مستقبل میں سرمایہ کاری تھی، کیونکہ ایک معیاری کتاب صرف اپنے عہد کی ضرورت پوری نہیں کرتی بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی ہدایت، بصیرت اور فکری استحکام کا ایک لازوال سرمایہ بن جاتی ہے۔ اس کے صفحات پہ ثبت ہونے والے افکار و خیالات وقت کی گرد سے ماند نہیں پڑتے بلکہ ہر آنے والے دور میں نئی معنویت کے ساتھ اہلِ علم کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ایک سچی اور محققانہ تصنیف اپنے مصنف کی زندگی سے کہیں زیادہ طویل عمر پاتی ہے، مصنف اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے مگر اس کا قلم نسلوں سے ہم کلام رہتا ہے، اس کے دلائل ذہنوں کو منور کرتے رہتے ہیں، اس کی تحقیقات علمی افق کو وسعت دیتی رہتی ہیں اور اس کی فکر حق کے متلاشیوں کے لیے مشعلِ راہ بنی رہتی ہے اور بسا اوقات ایک ایسی کتاب وجود میں آتی ہے جو صرف ایک مسئلے کا حل پیش نہیں کرتی بلکہ ایک پورے عہد کی فکری سمت متعین کر دیتی ہے، عقائد کی حفاظت کا حصار بن جاتی ہے، تہذیبی شناخت کی پاسبان ثابت ہوتی ہے اور امت کے علمی سرمائے میں ایسا گراں قدر اضافہ کر جاتی ہے جس سے صدیوں تک اہلِ علم فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی علمی تاریخ میں بعض کتابیں صرف تصنیفات نہیں بلکہ زندہ تحریکوں، فکری دبستانوں اور علمی روایتوں کی بنیاد بن گئی ہیں۔

امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر آج ایک صاحبِ قلم کو یکسوئی، وسائل اور سرپرستی فراہم کر دی جائے تو ممکن ہے اس کے قلم سے نکلنے والی ایک کتاب کل پوری امت کے ایمان کی حفاظت، فکری رہنمائی اور علمی بیداری کا ذریعہ بن جائے۔ اسی لیے ان کے نزدیک ایک معیاری تصنیف پہ خرچ ہونے والا ہر سرمایہ درحقیقت امت کے علمی مستقبل، فکری خودمختاری اور دینی استحکام پہ کی جانے والی ایسی سرمایہ کاری تھی جس کے ثمرات صرف ایک نسل نہیں بلکہ آنے والی کئی نسلیں سمیٹتی رہتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اہلِ قلم کی سرپرستی کو محض ایک رفاہی اقدام نہیں بلکہ ملت کی علمی بقا، فکری خودمختاری اور دینی استحکام کی بنیادی ضرورت قرار دیا۔

وہ جانتے تھے کہ علمی تحقیق، کتب نویسی اور دینی لٹریچرز کی تیاری ایک نہایت صبر آزما، وقت طلب اور مسلسل محنت کا کام ہے۔ اگر اہلِ قلم کو معاشی آسودگی اور علمی سرپرستی حاصل نہ ہو اگر باصلاحیت اہل علم وقلم معاشی پریشانیوں میں الجھے رہے اور علمی سرپرستی سے محروم ہوں تو بہت سی قیمتی صلاحیتیں وسائل کی کمی کے باعث ضائع ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ایسے مصنفین کی حوصلہ افزائی کی جائے، انہیں نذرانے اور مالی تعاون دیا جائے تاکہ وہ یکسوئی کے ساتھ ملت کی ضرورت کے مطابق مفید علمی سرمایہ تیار کر سکیں۔

یہاں ایک نہایت لطیف پہلو بھی قابلِ توجہ ہے۔ امام احمد رضا نے صرف کتابیں لکھنے کی بات نہیں کی بلکہ "مفید کتب و رسائل" کی تصنیف پہ زور دیا۔ گویا ان کے نزدیک ہر تحریر قابلِ قدر نہیں بلکہ وہی تحریر امت کے لیے سرمایہ ہے جو دین کی خدمت کرے، شکوک و

شبہات کا ازالہ کرے، صحیح عقائد کی وضاحت کرے، اخلاق و کردار کی اصلاح کرے اور ملت کی فکری رہنمائی کا ذریعہ بنے۔ وہ تصنیف کو مقصدیت (Purposefulness) کے ساتھ دیکھتے تھے، محض تصنیفی کثرت کے ساتھ نہیں۔

اس نکتے میں ''حمایتِ مذہب'' اور ''ردِّ بدمذہباں'' کا باہمی ذکر بھی نہایت معنیٰ خیز ہے۔

امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کی نظر میں دین کی خدمت صرف دفاعی انداز میں نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام کی صحیح تعلیمات، عقائدِ اہلِ سنت، محبت رسول ﷺ، اسلامی تہذیب اور دینی حقائق مثبت، مؤثر اور دل نشیں انداز میں عام کیے جائیں، تاکہ لوگوں کے دلوں میں حق کی محبت خود بخود جاگزیں ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ جب باطل افکار، گمراہ کن نظریات، شکوک وشبہات یا دین کی غلط تعبیرات اسلامی عقائد اور امت کی فکری بنیادوں کو متزلزل کرنے لگیں تو ان کا علمی، تحقیقی، مدلل اور مہذب انداز میں جواب دیا جائے۔ گویا ان کے نزدیک تعمیر اور دفاع ایک ہی علمی مشن کے دو لازم وملزوم پہلو تھے، جن میں سے کسی ایک کو نظر انداز کر دینا دعوتِ دین کو ادھورا کر دیتا ہے۔

وہ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ صرف رد و تردید سے کوئی فکر دیرپا نہیں بنتی، اور صرف مثبت دعوت بھی اس وقت تک کافی نہیں ہوتی جب تک باطل نظریات کے پیدا کیے ہوئے شبہات کا ازالہ نہ کیا جائے۔ ایک طرف دلوں میں حق کا چراغ روشن کرنا ضروری ہے، تو دوسری طرف ان آندھیوں کا رخ موڑنا بھی ناگزیر ہے جو یہ چراغ بجھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیفات میں جہاں عشقِ رسول ﷺ، تعظیم شریعت، عقائدِ اہلِ سنت اور اسلامی تعلیمات کی مثبت، مدلل اور دلنشیں تعبیر ملتی ہے، وہیں ضرورت کے وقت باطل افکار کا نہایت مضبوط علمی محاسبہ بھی نظر آتا ہے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ امام احمد رضا کا اسلوبِ رد کبھی محض جذباتی یا خطیبانہ نہیں تھا بلکہ اس کی بنیاد گہری تحقیق، وسیع مطالعہ، مضبوط استدلال اور علمی دیانت پہ قائم تھی۔ وہ مخالف فکر کو پہلے پوری طرح سمجھتے، اس کے دلائل کا باریک بینی سے جائزہ لیتے، پھر قرآن وسنّت، اقوالِ ائمہ اور عقلی استدلال کی روشنی میں اس کا جواب دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں وقتی مناظروں کا حصہ بن کر محدود نہیں رہیں بلکہ آج بھی علمی دنیا میں استناد، تحقیق اور استدلال کا درجہ رکھتی ہیں۔

اگر اس فکر کو عصرِ حاضر کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس کی معنویت اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ آج فکری حملے صرف مناظروں تک محدود نہیں رہے بلکہ کتابوں، جامعات، ذرائع ابلاغ، سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے ذریعے ہر لمحہ نئی نئی تعبیرات اور نظریات پیش کیے جا رہے ہیں۔ ایسے ماحول میں امام احمد رضا کی یہ فکر ہمارے لیے ایک واضح رہنمائی فراہم کرتی ہے کہ دین کی خدمت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں تعمیرِ فکر کا چراغ ہو اور دوسرے ہاتھ میں تحفظِ عقائد و نظریات کی ڈھال۔ جب یہ دونوں پہلو ساتھ چلتے ہیں تو امت کا ایمان بھی محفوظ رہتا ہے، اس کی فکری شناخت بھی برقرار رہتی ہے اور اس کا علمی وقار بھی قائم رہتا ہے۔

یہ نکتہ امام احمد رضا کی اس دور اندیشی کا بھی مظہر ہے کہ انہوں نے اہلِ قلم کی سرپرستی کو امت کی ذمہ داری قرار دیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی تہذیب کے سنہری ادوار میں عظیم مصنفین، محدثین، مفسرین اور فقہاء کو حکمرانوں، اوقاف اور اہلِ خیر کی سرپرستی حاصل تھی۔ اسی سرپرستی کے نتیجے میں وہ علمی شاہکار وجود میں آئے جو آج بھی امت کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ وہ کتابیں صرف اپنے زمانے کے علمی مسائل کا جواب نہیں بنیں بلکہ صدیوں تک علم وتحقیق کے چراغ روشن کرتی رہیں، مدارس وجامعات کی بنیادیں مضبوط کرتی رہیں اور ہر آنے والے دور کے علماء، محققین اور اہلِ دانش کے لیے رہنمائی کا سرچشمہ بنتی رہیں۔

یہی وہ علمی فضا تھی جس میں اہلِ علم معاشی اضطراب سے نسبتاً بے نیاز ہو کر اپنی تمام تر صلاحیتیں تحقیق، تدریس، تصنیف اور افتاء کے لیے وقف کر دیتے تھے۔ ان کے شب و روز علم کی خدمت میں گزرتے، ان کی زندگی کتابوں کی صحبت میں ڈھلتی اور ان کے قلموں سے وہ علمی خزانے وجود میں آتے جنہوں نے اسلامی تہذیب کو دنیا کی عظیم ترین علمی روایتوں میں شامل کر دیا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن

نہیں کہ اگر اس دور میں اہلِ علم کی سرپرستی نہ کی جاتی تو شاید امت اس عظیم علمی ورثے سے محروم رہ جاتی جس پہ آج بھی پوری اسلامی دنیا فخر کرتی ہے۔

امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز یہی درخشاں روایت اپنے عہد میں ازسرِنو زندہ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ملت ایک بار پھر اپنے اہلِ علم کو بوجھ نہیں بلکہ سرمایۂ افتخار سمجھے، اپنے مصنفین کو تنہا نہ چھوڑے، اپنے محققین کی حوصلہ افزائی کرے اور اپنے اہلِ قلم کی علمی و معاشی کفالت کو ایک اجتماعی دینی ذمہ داری سمجھے۔ ان کے نزدیک یہ محض افراد کی اعانت نہیں تھی بلکہ امت کی علمی خودمختاری، فکری استحکام اور تہذیبی تسلسل کی حفاظت کا ایک مؤثر ذریعہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جب اہلِ علم کو اعتماد، وسائل اور سرپرستی میسر آتی ہے تو ان کے قلم سے صرف کتابیں نہیں بلکہ تاریخ ساز افکار جنم لیتے ہیں اور انہی افکار کی بنیاد پہ قوموں کی فکر، ان کی سمت، تہذیبی شناخت اور علمی عظمت کا تعین ہوتا ہے۔ ایسے ہی افکار آنے والی نسلوں کے لیے چراغِ راہ بنتے ہیں، علمی روایت کو دوام بخشتے ہیں، فکری انتشار کو اعتدال میں بدلتے ہیں اور ملت کے اجتماعی شعور کو نئی توانائی عطا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اہلِ علم کی سرپرستی کو کسی فرد کی اعانت نہیں بلکہ ایک زندہ تہذیب، ایک مضبوط فکری روایت اور ایک باوقار مستقبل کی آبیاری تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک علم پہ صرف ہونے والا ہر سرمایہ درحقیقت قوم کے فکری استحکام، دینی وقار اور تہذیبی بقا میں سرمایہ کاری تھا، کیونکہ تاریخ نے ہمیشہ ثابت کیا ہے کہ قومیں تلوار کی قوت سے زیادہ قلم کی بصیرت، فکر کی بالیدگی اور علم کی روشنی سے اپنے عروج کی منزلیں طے کرتی ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ جب اہلِ علم کو اعتماد، وسائل اور سرپرستی میسر آتی ہے تو ان کے قلم سے صرف کتابیں نہیں بلکہ تاریخ ساز افکار جنم لیتے ہیں اور انہی افکار کی بنیاد پہ قوموں کی فکری سمت، تہذیبی شناخت اور علمی عظمت کا تعین ہوتا ہے۔

اگر عصرِ حاضر کے تناظر میں اس نکتے کا جائزہ لیا جائے تو اس کی معنویت اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ آج فکری جنگیں پہلے سے کہیں زیادہ وسیع ہو چکی ہیں۔ کتابوں کے ساتھ ساتھ ڈیجیٹل ذرائع، آن لائن جرائد، تحقیقی پلیٹ فارمز اور سوشل میڈیا نے ابلاغ کی نئی دنیا آباد کر دی ہے۔ ایسے ماحول میں اگر اہلِ حق مضبوط علمی لٹریچرز تیار نہ کریں، محققین اور مصنفین کی سرپرستی نہ کریں اور معیاری دینی سرمایہ وجود میں نہ لائیں تو فکری خلا لازماً ایسے نظریات سے بھر جائے گا جو امت کی اعتقادی اور تہذیبی بنیادیں کمزور کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا کا یہ نکتہ محض مصنفین کی مالی معاونت کی تجویز نہیں بلکہ فکری خود کفالت اور علمی خودمختاری کا اعلان ہے۔ وہ امت کو یہ پیغام دے رہے تھے کہ جس قوم کے قلم خموش ہو جائیں، اس کے دلائل بھی کمزور پڑ جاتے ہیں اور جس قوم کے اہلِ قلم کی قدر کی جائے، ان کی سرپرستی کی جائے اور انہیں علمی یکسوئی فراہم کی جائے، وہ قوم اپنے افکار، اپنے عقائد اور اپنی تہذیبی شناخت کی حفاظت کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہتی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز ایک صدی پہلے ہی اس حقیقت سے آگاہ کر رہے تھے کہ ملت کی بقا صرف مدارس کے قیام سے نہیں بلکہ ایسے مضبوط علمی لٹریچرز کی تیاری سے بھی وابستہ ہے جو ہر دور کے فکری فتنوں کا مدلل جواب دے سکے، نئی نسل کے اذہان ایمان کی روشنی سے منور کر سکے اور اسلام کی ابدی تعلیمات ہر زمانے کی زبان میں دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ یہی ان کی دور اندیشی تھی، یہی ان کا علمی مشن تھا اور یہی ان کے اصلاحی پروگرام کا وہ پہلو ہے جس کی ضرورت آج پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کا یہ چھٹا اصلاحی نکتہ محض مصنفین کی مالی معاونت کی ایک تجویز نہیں بلکہ علم، قلم اور فکر کی سرپرستی کا ایک دائمی منشور ہے۔ آپ نے ایک صدی قبل ہی یہ حقیقت آشکار کر دی تھی کہ ملت کی فکری خودمختاری صرف مدارس، خطابت اور مناظروں سے قائم نہیں رہتی بلکہ ایسے باوقار اہلِ قلم سے بھی وابستہ ہوتی ہے جن کے قلم حق کی ترجمانی کریں، شبہات کا ازالہ کریں، عقائد کی حفاظت کریں اور آنے والی نسلوں کے لیے علم و بصیرت کا ایسا سرمایہ چھوڑ جائیں جو وقت گزرنے کے ساتھ مزید قیمتی ہوتا چلا جائے۔

یہی امام احمد رضا کی دور اندیشی کا وہ روشن پہلو ہے جو آج بھی ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ قوموں کی تقدیر صرف تلواروں سے نہیں بلکہ قلموں سے بھی لکھی جاتی ہے اور وہ ملت کبھی فکری طور پر مغلوب نہیں ہو سکتی جو اپنے اہلِ علم کی قدر کرے، اپنے اہلِ قلم کی سرپرستی کرے اور اپنا علمی سرمایہ آنے والی نسلوں کی امانت سمجھ کر محفوظ رکھے اور اسے فروغ دے۔ جب قلم کو اعتماد، علم کو مقصدیت اور فکر کو اخلاص نصیب ہو جائے تو ایک کتاب صرف ایک تصنیف نہیں رہتی بلکہ ایک عہد کی رہنما، ایک تہذیب کی محافظ اور نسلوں تک جاری رہنے والا صدقۂ جاریہ بن جاتی ہے۔ یہی امام احمد رضا کے اصلاحی منشور کا وہ زندہ پیغام ہے جو ہر دور میں اہلِ علم اور ملت کے ذمہ داران کو اپنے علمی مستقبل کی تعمیر کی دعوت دیتا رہے گا۔

تصنیف شدہ اور نو تصنیف رسائل عمدہ اور خوش خط چھاپ کر ملک میں مفت تقسیم کیے جائیں:

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کے دس نکاتی اصلاحی پروگرام کا یہ نکتہ ان کی غیر معمولی ابلاغی بصیرت، اشاعتی حکمتِ عملی اور فکری دعوت کے عملی شعور کا آئینہ دار ہے۔ اگر یہ نکتہ گذشتہ دو نکات کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو ایک نہایت مربوط اور منظم منصوبہ سامنے آتا ہے۔ پہلے علماء تیار کیے جائیں، پھر اہلِ قلم کی سرپرستی کی جائے، ان سے معیاری علمی سرمایہ تصنیف کرایا جائے اور اس کے بعد وہ کتابیں اور رسائل خوبصورت انداز میں شائع کر کے بلا معاوضہ عوام تک پہنچائے جائیں۔ گویا امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کے نزدیک صرف علم حاصل کر لینا یا علمی ذخیرہ تیار کر دینا کافی نہیں بلکہ اس علم کو معاشرے کے ہر فرد تک پہنچانا، اسے عام کرنا اور اس کی روشنی سے ذہنوں اور دلوں کو منور کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ ان کے نزدیک وہ علم جو صرف کتب خانوں کی الماریوں میں مقید رہے، یا چند اہلِ علم کے محدود حلقوں تک سمٹ کر رہ جائے، وہ اپنا حقیقی مقصد پوری طرح حاصل نہیں کر سکتا۔ علم کی اصل عظمت اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب وہ عوام کی زندگی میں اترے، ان کے عقائد کی اصلاح کرے، ان کا کردار و عمل سنوارے، ان کی فکری جلا بخشی کرے اور انہیں دینِ حق کی صحیح تعبیر سے آشنا کرے۔

اسی لیے امام احمد رضا علم کو ایک امانت سمجھتے تھے اور امانت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے اہل تک پہنچایا جائے۔ ان کے نزدیک قلم کا حق صرف لکھ دینا نہیں بلکہ لکھے ہوئے صحیفے لوگوں تک پہنچائے بھی جائیں، مصنف کی ذمہ داری صرف تصنیف پہ ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کی فکر کی اشاعت بھی اسی قدر اہم ہوتی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ علم خواص کی مجلسوں سے نکل کر عوام کے گھروں تک پہنچے، مدارس کی چہار دیواری سے آگے بڑھ کر بازاروں، بستیوں اور شہروں میں اپنی روشنی پھیلائے، تاکہ ہر طبقۂ فکر، ہر عمر کا انسان اور ہر درجے کا مسلمان اس سے فیض یاب ہو سکے۔

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تصنیف کے ساتھ اشاعت، اشاعت کے ساتھ تقسیم، اور تقسیم کے ساتھ عام رسائی (Accessibility) پہ بھی غیر معمولی زور دیا۔ ان کی نگاہ میں ایک ایسی کتاب جو لاکھوں انسانوں کے ہاتھوں تک پہنچ جائے، وہ صرف مطبوعہ صفحات کا مجموعہ نہیں رہتی بلکہ ایک خموش داعی، ایک بے زبان معلم اور ایک دائمی مبلغ بن جاتی ہے، جو اپنے مصنف کے بعد بھی نسل در نسل دین کی خدمت، افکار کی اصلاح اور امت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی رہتی ہے۔ گویا امام احمد رضا کے نزدیک صرف علم حاصل کرنا کافی نہیں بلکہ اسے معاشرے کے ہر فرد تک پہنچانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔

اس نکتے کا پس منظر سمجھنے کے لیے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی اشاعتی دنیا کا تصور سامنے رکھنا ہوگا۔ اس دور میں چھاپہ خانوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور کتابوں کی اشاعت ایک نئی فکری قوت بن کر ابھر رہی تھی مختلف مذہبی، سیاسی اور سماجی تحریکیں اپنے نظریات کتابوں، رسائل اور پمفلٹوں کے ذریعے عوام تک پہنچا رہی تھیں۔ جس کے پاس بہتر، معیاری اور مؤثر لٹریچر تھا، وہی عوامی افکار، ذہنوں اور رجحانات پہ زیادہ گہرا اثر ڈال رہا تھا۔ اس دور میں قلم صرف اظہارِ خیال کا وسیلہ نہیں رہا تھا بلکہ افکار کی تشکیل، نظریات کی ترویج، عقائد کی حفاظت اور ذہنی قیادت کا سب سے طاقتور اور موثر

ذریعہ بن چکا تھا۔ منبر کی آواز محدود حلقوں تک پہنچتی تھی مگر ایک کتاب، ایک رسالہ یا ایک اخبار سیکڑوں میل کا سفر طے کر کے ہزاروں انسانوں کے دل و دماغ تک رسائی حاصل کر لیتا تھا۔ یوں قلم کی خموش زبان بسا اوقات خطیب کی بلند آواز سے کہیں زیادہ دیرپا اور ہمہ گیر اثرات مرتب کرتی تھی۔

امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز نے بدلتا ہوا یہ فکری منظرنامہ نہایت گہری بصیرت کے ساتھ دیکھا۔ وہ جانتے تھے کہ زمانے کی جنگیں صرف میدانِ کارزار میں نہیں لڑی جاتیں بلکہ کتابوں کے صفحات، اخبارات کے کالموں، رسائل کے مضامین اور اہلِ قلم کی تحقیقات میں بھی ان کا فیصلہ ہوتا ہے۔ جو قوم قلم کا محاذ چھوڑ دیتی ہے، وہ رفتہ رفتہ فکر کا محاذ بھی ہار جاتی ہے اور جس ملت کے پاس مضبوط علمی لٹریچر نہ ہوں، وہ دوسروں کے افکار کی یلغار کا آسانی سے شکار بن جاتی ہے۔ اسی لیے انہوں نے معیاری دینی لٹریچر کی تیاری، اس کی خوبصورت اشاعت اور اس کی وسیع پیمانے پہ ترسیل کو محض ایک اشاعتی سرگرمی نہیں بلکہ ملت کے فکری دفاع، اعتقادی استحکام اور تہذیبی بقا کا بنیادی وسیلہ قرار دیا۔ انہوں نے یہ منظرنامہ نہایت باریک بینی سے دیکھا اور محسوس کیا کہ اگر اہلِ حق اس میدان میں غفلت برتیں گے تو فکری قیادت دوسروں کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر انہوں نے فرمایا کہ ''تصنیف شدہ اور نو تصنیف رسائل عمدہ اور خوش خط چھاپ کر ملک میں مفت تقسیم کیے جائیں۔'' اس مختصر جملے میں دعوت و تبلیغ، اشاعت و ابلاغ اور فکری بیداری کا ایک مکمل منصوبہ پوشیدہ ہے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ امام احمد رضا نے صرف ''چھاپنے'' کی بات نہیں کی بلکہ ''عمدہ اور خوش خط'' چھاپنے کی تاکید فرمائی۔ یہ الفاظ ان کے جمالیاتی ذوق اور نفسیاتِ ابلاغ سے گہری واقفیت کی دلیل ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ خوبصورت طباعت، واضح کتابت، عمدہ کاغذ اور دلکش پیشکش قاری کو کتاب کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ایک معیاری کتاب اپنے ظاہری حسن کے ذریعے بھی قاری کے دل میں احترام پیدا کرتی ہے، جبکہ ناقص اشاعت بسا اوقات بہترین علمی مواد کی اہمیت بھی کم کر دیتی ہے۔ گویا وہ یہ پیغام دے رہے تھے کہ دین کی خدمت صرف مضبوط دلائل سے نہیں بلکہ بہترین پیشکش سے بھی ہونی چاہیے۔

امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کا یہ نکتہ اگر عصرِ حاضر کے بدلتے ہوئے رجحانات اور ابلاغی تقاضوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان کی یہ فکر اپنی معنویت میں پہلے سے کہیں زیادہ روشن اور حیرت انگیز محسوس ہوتی ہے۔ آج کا انسان صرف پڑھتا نہیں بلکہ دیکھتا، محسوس کرتا اور پیشکش (Presentation) سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ جدید ابلاغی علوم بھی ہم حقیقت تسلیم کرتے ہیں کہ کسی بھی پیغام کی قبولیت میں صرف اس کا مضمون ہی نہیں بلکہ اس کی پیشکش، طباعت، ڈیزائن، ترتیب، زبان، معیار اور بصری حسن بھی بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

اسی لیے آج دنیا کی بڑی اشاعتی کمپنیاں، تحقیقی ادارے اور جامعات صرف معیاری مواد پہ ہی توجہ نہیں دیتیں بلکہ کتاب کے سرورق، صفحہ آرائی، خط، کاغذ، طباعت، رنگوں کے انتخاب اور مجموعی معیار پہ بھی بے پناہ سرمایہ صرف کرتی ہیں، کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ پہلی ملاقات قاری کی کتاب کے افکار سے نہیں بلکہ اس کی پیشکش سے ہوتی ہے۔ اگر پیشکش دلکش ہو تو قاری کا دل مطالعے کی طرف مائل ہوتا ہے اور اگر ظاہری معیار کمزور ہو تو بسا اوقات بہترین علمی سرمایہ بھی وہ توجہ حاصل نہیں کر پاتا جس کا وہ مستحق ہوتا ہے۔

یہی حقیقت امام احمد رضا نے ایک صدی قبل اپنے مختصر مگر حکیمانہ جملے میں سمو دی تھی۔ وہ گویا اہلِ قلم، ناشرین اور دینی اداروں کو یہ پیغام دے رہے تھے کہ حق صرف صحیح انداز میں بیان کرنا ہی کافی نہیں بلکہ اسے بہترین انداز میں پیش کرنا بھی دعوتِ حق کا حصہ ہے۔ حسنِ پیشکش، درحقیقت حسنِ دعوت کا ایک لازمی جز ہے۔

اگر اس فکر کو موجودہ ڈیجیٹل دور تک وسعت دی جائے تو اس کی معنویت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ آج کتاب کے ساتھ ویب سائٹ کا معیار، رسالے کے ساتھ اس کی ڈیجیٹل ترتیب، مضمون کے ساتھ اس کی بصری کشش اور علمی مواد کے ساتھ اس کی فنی پیشکش بھی غیر معمولی اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ ایک خوبصورت کتاب، ایک معیاری رسالہ، ایک منظم ویب سائٹ، ایک باوقار آن لائن جریدہ اور ایک سلیقے سے

تیار کردہ علمی تحریر، یہ سب دراصل اسی فکر کی جدید تعبیر ہیں جس کی بنیاد امام احمد رضا نے ایک صدی قبل رکھ دی تھی۔

کیا یہ امر باعث حیرت نہیں کہ ایک صدی قبل، جب ذرائعِ ابلاغ نہایت محدود تھے، طباعت اپنی ابتدائی منازل میں تھی، نہ الیکٹرانک میڈیا کا وجود تھا، نہ انٹرنیٹ، نہ سوشل میڈیا اور نہ ہی ڈیجیٹل اشاعت کا کوئی تصور، اس وقت ایک عظیم اسلامی مفکر ایک چھوٹے سے شہر کی تنگ گلی میں بیٹھ کر اپنی ملت کو صرف کتابیں لکھنے کی تلقین نہیں کر رہا تھا بلکہ ان کی معیاری طباعت، خوبصورت پیشکش، وسیع پیمانے پہ اشاعت اور عوام تک مسلسل رسائی کی حکمتِ عملی بھی سمجھا رہا تھا۔ یہ ان کی غیر معمولی دوراندیشی اور ابلاغی بصیرت کا زندہ ثبوت ہے۔

یہ بات بجا طور پہ حیرت انگیز محسوس ہوتی ہے کہ جس زمانے میں بہت سے اہلِ علم کی توجہ صرف تصنیف تک محدود تھی، امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز تصنیف کے ساتھ اشاعت، اشاعت کے ساتھ ترسیل، ترسیل کے ساتھ ابلاغ، اور ابلاغ کے ساتھ عوامی اثر پذیری کے پورے نظام پہ غور کر رہے تھے۔ گویا ان کی نگاہ صرف کتاب لکھے جانے پہ نہیں بلکہ اس کے قاری تک پہنچنے، اس کے پڑھے جانے اور اس کے ذریعے معاشرے میں فکری تبدیلی پیدا ہونے پہ بھی مرکوز تھی۔

آج جب ابلاغی علوم (Communication Studies) یہ بتاتے ہیں کہ کسی بھی فکر کی کامیابی صرف اس کی صداقت پہ موقوف نہیں ہوتی بلکہ اس کے مؤثر ابلاغ، معیاری پیشکش اور وسیع تر رسائی پر بھی منحصر ہوتی ہے، تو محسوس ہوتا ہے کہ امام احمد رضا نے اپنی غیر معمولی بصیرت سے یہ حقیقت بہت پہلے ملاحظہ فرمالی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا یہ اصلاحی پروگرام محض اپنے عہد کی ضرورت نہیں تھا بلکہ آنے والے زمانوں کے لیے بھی ایک ایسا فکری منشور تھا جس کی معنویت وقت گذرنے کے ساتھ کم ہونے کی بجائے مزید نمایاں ہوتی چلی گئی۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم نے یہ حکیمانہ اصول یکسر نظر انداز کر دیا۔ ہمارے ہاں بسا اوقات نہ کتاب کی طباعت معیار کے مطابق ہوتی ہے، نہ سرورق میں کشش، نہ صفحہ آرائی میں نفاست، نہ پروف ریڈنگ میں احتیاط اور نہ ہی علمی پیشکش میں وہ وقار دکھائی دیتا ہے جو دین کے علمی سرمائے کا حق ہے۔ نتیجتاً ایسا ہوتا ہے کہ ایک نہایت قیمتی علمی خزانہ بھی ظاہری کمزوریوں کی وجہ سے اپنے مطلوبہ اثرات پیدا نہیں کر پاتا۔

امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز دراصل ہمیں یہ سبق دے رہے تھے کہ دینِ اسلام حسن، وقار، نفاست اور معیار کا مذہب ہے، اس لیے اس کی نمائندگی کرنے والی ہر چیز میں بھی انہی اوصاف کی جھلک نمایاں ہونی چاہیے۔ معیاری طباعت، نفیس پیشکش اور خوبصورت اشاعت کوئی ثانوی یا محض فنی مسئلہ نہیں بلکہ دعوتِ دین کی حکمت، علمی وقار اور فکری اثر آفرینی کا ایک اہم تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے دور میں امام احمد رضا کی یہ فکر صرف ایک اشاعتی ہدایت نہیں بلکہ اسلامی ابلاغ، دینی میڈیا اور علمی پیشکش کا ایک آفاقی اصول بن کر ہمارے سامنے آتی ہے، جسے جتنا جلد سمجھ لیا جائے، اتنا ہی ہماری علمی و دعوتی جدوجہد کے لیے بہتر ہوگا۔

اس سے بھی زیادہ اہم ان کی یہ ہدایت ہے کہ یہ رسائل ”مفت تقسیم کیے جائیں۔“ یہ صرف ایک انتظامی تجویز نہیں بلکہ ایک عظیم دعوتی فلسفہ ہے۔ امام احمد رضا جانتے تھے کہ علم اس وقت تک اپنی حقیقی تاثیر پیدا نہیں کرتا جب تک وہ عام لوگوں کی دسترس میں نہ آ جائے۔

اگر معیاری دینی لٹریچر ز صرف اہلِ استطاعت تک محدود رہے تو معاشرے کا بڑا طبقہ صحیح رہنمائی سے محروم رہ جائے گا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ علم کو قیمت کی دیواروں میں قید نہ کیا جائے بلکہ اسے ہر شہر، ہر قصبے اور ہر گاؤں تک پہنچایا جائے تاکہ ہر شخص صحیح اسلامی تعلیمات سے مستفید ہو سکے۔

یہ فکر دراصل اسلام کی اس بنیادی روح کی ترجمان ہے جس میں علم کو صدقۂ جاریہ اور امت کی مشترکہ میراث سمجھا گیا ہے۔ اسلامی تاریخ میں بھی یہی روایت نظر آتی ہے کہ علماء نے کتابیں لکھیں، اہلِ خیر نے ان کی اشاعت کا انتظام کیا اور پھر وہ علمی سرمایہ پوری امت کے لیے سرمایۂ ہدایت بن گیا۔ امام احمد رضا اسی مبارک روایت کو اپنے عہد میں ایک منظم تحریک کی صورت دینا چاہتے تھے۔

اگر اس نکتے کو دعوت و تبلیغ کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم

ہوتا ہے کہ امام احمد رضا دعوت وتبلیغ کو صرف منبر اور محراب تک محدود نہیں رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک کتاب بھی داعی ہے، ایک رسالہ بھی مبلغ ہے اور ایک معیاری تحریر بھی خموش مبلغ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک خطیب کی آواز چند لمحوں کے لیے کانوں تک پہنچتی ہے لیکن ایک کتاب نسلوں تک دلوں اور ذہنوں میں زندہ رہتی ہے۔ اسی لیے انہوں نے اشاعتِ کتب کو اشاعتِ دین کا بنیادی ذریعہ قرار دیا۔

یہ نکتہ مذہبی صحافت اور دینی لٹریچر کی اہمیت بھی مزید واضح کرتا ہے۔ جب معیاری رسائل، کتابچے اور تحقیقی مضامین عام لوگوں تک پہنچتے ہیں تو نہ صرف ان کے شبہات دور ہوتے ہیں بلکہ ان کے اندر دینی شعور، فکری اعتماد اور مذہبی وابستگی بھی مضبوط ہوتی ہے۔ یوں اشاعت کا یہ عمل صرف معلومات کی ترسیل نہیں رہتا بلکہ ایک خموش مگر نہایت مؤثر اصلاحی تحریک کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

آج کے دور میں اس نکتے کی معنویت کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ اگرچہ طباعت کے ساتھ ساتھ ڈیجیٹل اشاعت، ای بکس، ویب سائٹس، موبائل ایپلی کیشنز اور سوشل میڈیا نے علم کی ترسیل کے نئے ذرائع پیدا کر دیے ہیں لیکن امام احمد رضا کا بنیادی اصول آج بھی وہی ہے کہ معیاری دینی مواد زیادہ سے زیادہ لوگوں تک آسانی کے ساتھ پہنچنا چاہیے۔ آج ''مفت تقسیم'' کا مفہوم صرف مطبوعہ کتابیں نہیں بلکہ ڈیجیٹل لائبریریاں، آن لائن رسائل، مفت علمی کورسز اور عوامی سطح پہ قابلِ رسائی دینی مواد بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا کا یہ ساتواں نکتہ محض اشاعتِ کتب کا منصوبہ نہیں بلکہ فکر کی عوامی رسائی (Democratization of Knowledge) کا ایک عظیم اسلامی تصور ہے۔ وہ امت کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ جب تک صحیح علم عوام کے گھروں، ہاتھوں اور ذہنوں تک نہیں پہنچے گا، اس وقت تک فکری اصلاح کا خواب مکمل نہیں ہوسکتا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز ایک صدی قبل ہی یہ حقیقت سمجھ چکے تھے کہ علم کی اصل کامیابی اس کے لکھے جانے میں نہیں بلکہ اس کے پڑھے جانے میں ہے اور کتاب کی حقیقی عظمت الماری میں محفوظ رہنے میں نہیں بلکہ لوگوں کے دلوں اور اذہان منور کرنے میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تصنیف، طباعت اور مفت اشاعت---ان تینوں کو ایک ہی اصلاحی زنجیر کی مضبوط کڑیاں قرار دیا، تاکہ علم کا نور محدود حلقوں سے نکل کر پوری ملت کی مشترکہ میراث بن جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کا یہ ساتواں اصلاحی نکتہ محض کتابوں کی طباعت کی ہدایت نہیں بلکہ علم کی اشاعت، فکر کی حفاظت اور دعوتِ دین کے مؤثر ابلاغ کا ایک ہمہ گیر منشور ہے۔ آپ نے ایک صدی قبل ہی یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ علم کی اصل عظمت اس کے لکھے جانے میں نہیں بلکہ اس کے پڑھے جانے، سمجھے جانے اور معاشرے کی فکری وعملی زندگی میں اثر انداز ہونے میں ہے۔ اسی لیے آپ نے تصنیف، معیاری اشاعت اور عوامی رسائی کو ایک ہی دعوتی زنجیر کی ناگزیر کڑیاں قرار دیا۔

یہی امام احمد رضا کی ابلاغی بصیرت کا وہ روشن پہلو ہے جو آج بھی ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ اگر حق کا پیغام دلوں تک پہنچانا ہے تو علم کو معیار کے ساتھ، حکمت کے ساتھ اور فراخ دلی کے ساتھ عام کرنا ہوگا۔ جب قلم اخلاص سے وابستہ ہو، اشاعت وقار سے آراستہ ہو اور علم ہر فرد کی دسترس میں ہو تو کتاب صرف اوراق کا مجموعہ نہیں رہتی بلکہ ایک خموش داعی، ایک زندہ معلم اور نسلوں تک روشنی بانٹنے والا صدقۂ جاریہ بن جاتی ہے۔ یہی وہ دائمی پیغام ہے جو امام احمد رضا کی اصلاحی فکر کو ہر دور میں زندہ، مؤثر اور رہنمائے امت بنائے رکھتا ہے۔

شہروں شہروں آپ کے سفیر اور نگراں رہیں، جہاں جس قسم کے واعظ، مناظر یا تصنیف کی حاجت ہو آپ کو اطلاع دیں، آپ وہاں اپنی کتب، رسائل اور جرائد بھیجتے رہیں

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کے دس نکاتی اصلاحی پروگرام کا یہ نکتہ ان کی غیر معمولی تنظیمی صلاحیت، دعوتی حکمت، فکری دور اندیشی اور ابلاغی شعور کا ایک ایسا شاہکار ہے جسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ محض ایک عظیم فقیہ اور محدث ہی نہیں بلکہ ایک

کامیاب منتظم، مدبرِ ملت اور بے مثال منصوبہ ساز بھی تھے۔

یہ محض ایک انتظامی ہدایت نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر دعوتی نیٹ ورک کا نقشۂ کار ہے، جس میں پورے ملک کو ایک فکری وحدت میں پرو دینے کی حکمت پوشیدہ ہے۔ آپ چاہتے تھے کہ ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر خطہ ایسے با اعتماد، صاحبِ بصیرت اور دردِ ملت رکھنے والے افراد سے وابستہ ہو جو اپنے علاقے کی دینی، فکری اور سماجی ضروریات سے مرکز کو مسلسل آگاہ کرتے رہیں تاکہ جہاں جس نوعیت کی ضرورت ہو، وہاں اسی مناسبت سے واعظ بھی پہنچے، مناظر بھی بھیجا جائے اور علمی و تحقیقی لٹریچر بھی فراہم کیا جائے۔

یہ دراصل حالات کے مطابق دعوتی وسائل کی منصوبہ بند تقسیم کا ایک ایسا جامع تصور تھا جو اپنے زمانے سے بہت آگے کی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ صرف کتابیں تصنیف کر دینا یا خطبات دے دینا کافی نہیں بلکہ ان علمی سرمایہ جات کو صحیح مقام، صحیح وقت اور صحیح افراد تک پہنچانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ اسی لیے انہوں نے مقامی نمائندوں اور نگراں افراد کے ذریعے ایک ایسا مربوط نظام قائم کرنے کی تلقین فرمائی جو ملت کی فکری حفاظت، دینی رہنمائی اور علمی اشاعت کا مضبوط ذریعہ بن سکے۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس زمانے میں نہ ذرائع ابلاغ کی وسعت تھی، نہ مواصلات کی آسانیاں، نہ ڈیجیٹل پلیٹ فارم موجود تھے، اس کے باوجود امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز نے ایک ایسا دعوتی اور ابلاغی نظام تجویز فرمایا جس کی روح آج بھی ہر مؤثر دینی، تعلیمی اور سماجی تحریک کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔ یہ فکر اس حقیقت کا اعلان کرتی ہے کہ دعوت و اصلاح کا کام محض انفرادی جوش سے نہیں بلکہ منظم رابطے، مضبوط تنظیم، بروقت اطلاعات اور مسلسل فکری رہنمائی سے ہی مؤثر اور دیرپا نتائج پیدا کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ آٹھواں نکتہ امام احمد رضا کی اس غیر معمولی بصیرت کا آئینہ دار ہے کہ وہ افراد نہیں، ادارے بنانا چاہتے تھے، وقتی سرگرمیاں نہیں، مستقل نظام قائم کرنا چاہتے تھے اور منتشر کوششوں کی بجائے ایسی مربوط دعوتی تحریک کے خواہاں تھے جو ہر شہر میں اہلِ سنّت کی صحیح فکر کی نمائندہ، ملت کی رہنما اور دینِ متین کی مؤثر ترجمان بن کر اپنا کردار ادا کرے۔

اگر ان کے پورے اصلاحی منصوبے پہ نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ وہ انفرادی کوششوں کی بجائے ایک منظم، مربوط اور فعال دینی نیٹ ورک (Network) قائم کرنا چاہتے تھے، جو ملک کے ہر گوشے میں ملت کی ضروریات سے باخبر بھی رہے اور ان کے بروقت حل کا ذریعہ بھی بنے۔ اس نکتے کا پس منظر سمجھنے کے لیے اس عہد کے مذہبی، سماجی اور ابلاغی حالات پہ غور کرنا ضروری ہے۔ برصغیر ایک وسیع خطہ تھا، جہاں مختلف شہروں، قصبوں اور دیہات میں دینی حالات ایک جیسے نہ تھے۔ کہیں عقائد کے حوالے سے شبہات پیدا کیے جا رہے تھے، کہیں مناظرانہ فضا گرم تھی، کہیں عوام کو مؤثر خطیب کی ضرورت تھی، کہیں دینی لٹریچر ناپید تھا، اور کہیں اہلِ سنّت کے موقف کی وضاحت کرنے والا کوئی موجود نہ تھا۔ اس زمانے میں نہ آج کی طرح ذرائعِ مواصلات تھے، نہ فوری اطلاعات کی سہولت، نہ الیکٹرانک میڈیا اور نہ ہی ڈیجیٹل رابطے۔ ایسے ماحول میں کسی مرکزی دینی قیادت کے لیے ہر علاقے کی صحیح صورتِ حال سے باخبر رہنا آسان نہ تھا۔

امام احمد رضا نے اس مشکل کا نہایت حکیمانہ حل پیش کیا۔ انہوں نے تجویز دی کہ ہر شہر میں ایسے با اعتماد سفیر اور نگراں موجود ہوں جو اپنے علاقے کے دینی، فکری اور سماجی حالات پہ مسلسل گہری نظر رکھیں۔ جب بھی کسی مقام پہ کسی عالم، واعظ، مناظر یا مخصوص علمی لٹریچر کی ضرورت محسوس ہو تو وہ فوراً مرکز کو اطلاع دیں تاکہ بروقت مناسب اقدام کیا جا سکے۔ یہ تجویز دراصل ایک منظم اطلاعاتی نظام (Information Network) اور دعوتی رابطہ (Communication System) کی بنیاد تھی، جس کی مثال اس دور میں بہت کم ملتی ہے۔

امام احمد رضا کے نزدیک دعوتِ دین محض وقتی ردِ عمل کا نام نہیں تھی بلکہ ایک مسلسل، منظم اور مربوط جدوجہد تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اہلِ سنّت کی علمی اور دعوتی سرگرمیاں حالات سے بے خبر نہ رہیں بلکہ ہر شہر

کی ضرورت کے مطابق حکمتِ عملی اختیار کی جائے۔ اگر کسی مقام پہ خطابت کی ضرورت ہوتو ایک مؤثر خطیب بھیجا جائے، اگر کہیں علمی اعتراضات کا سیلاب ہوتو ایک صاحبِ تحقیق مناظر یا محقق پہنچے اور اگر عوام کو بنیادی دینی تعلیم درکار ہوتو مناسب کتابیں اور رسائل وہاں پہنچائے جائیں۔

اس نکتے کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی ضرورت کے مطابق منصوبہ بندی (Need-based Planning) ہے۔ امام احمد رضا ہر علاقے کے لیے یکساں طریقۂ کار کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ حالات کے مطابق وسائل کے استعمال پہ زور دیتے تھے۔ یہ ایک ایسی انتظامی بصیرت ہے جسے آج جدید ادارہ جاتی منصوبہ بندی کا بنیادی اصول سمجھا جاتا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے صرف افراد بھیجنے کی بات نہیں کی بلکہ کتب، رسائل اور جرائد بھی بھیجنے کی ہدایت فرمائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں دعوت کے دو مضبوط بازو تھے: ایک زندہ انسان اور دوسرا زندہ قلم۔ ایک واعظ وقتی طور پہ دلوں کو متأثر کرتا ہے لیکن ایک کتاب طویل عرصے تک ذہنوں کی رہنمائی کرتی رہتی ہے۔ اسی لیے وہ دونوں ذرائع کو ایک دوسرے کا معاون بنانا چاہتے تھے۔

اگر یہ نکتہ وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد رضا دراصل ایک ایسی مرکزی دعوتی و فکری تنظیم کا تصور پیش کر رہے تھے جس کے مختلف علاقوں میں نمائندے ہوں، جو مسلسل حالات کا جائزہ لیں، مرکز سے رابطے میں رہیں اور ضرورت کے مطابق علمی و دعوتی وسائل عوام تک پہنچائیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آج کی زبان میں جسے Regional، Field Coordination، Intelligence Gathering، Monitoring اور Communication Network، Resource Management کہا جاتا ہے، اس کی بنیادی جھلک ایک صدی پہلے امام احمد رضا کے اس مختصر سے نکتے میں موجود ہے۔

البتہ اس نکتے میں ایک تعبیر پہ خصوصی توجہ ضروری ہے۔ عبارت میں ''دشمنوں کی سرکوبی'' سے مراد ہرگز افراد کی تحقیر، نفرت انگیزی یا ذاتی عداوت نہیں بلکہ باطل افکار، گمراہ کن نظریات، غلط تعبیراتِ دین اور فکری فتنوں کا علمی، تحقیقی اور مدلل رد ہے۔ امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کی پوری علمی زندگی اس حقیقت کی روشن شاہد ہے کہ آپ نے ہمیشہ اشخاص کی بجائے نظریات کو موضوعِ بحث بنایا اور قلم و قرطاس کے ذریعے دلائل کی قوت سے حق کو نمایاں اور باطل کو بے نقاب کیا۔

آپ کے نزدیک اختلاف کا معیار جذبات نہیں بلکہ دلیل تھی اور مناظرے کا مقصد کسی فرد کو زیر کرنا نہیں بلکہ حق کو آشکار کرنا اور امت کو فکری انتشار سے محفوظ رکھنا تھا۔ اسی لیے آپ کی تصانیف میں جہاں استدلال کی مضبوطی نظر آتی ہے، وہیں علمی دیانت، تحقیقی احتیاط اور اخلاقی وقار بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ آپ نے کبھی تہذیبِ گفتگو قربان نہیں کی اور نہ ہی علمی اختلاف کو ذاتی دشمنی کا عنوان بنایا۔

درحقیقت ''سرکوبی'' سے مراد باطل کی فکری بالادستی کا خاتمہ، گمراہی کے اثرات کا ازالہ اور حقانیتِ اسلام و عقائدِ اہلِ سنّت کو روشن دلائل کے ساتھ نمایاں کرنا ہے۔ یہی وہ علمی جہاد ہے جس کی بنیاد حکمت، بصیرت، تحقیق اور حسنِ استدلال پہ قائم ہوتی ہے۔ اس تعبیر کو اسی تناظر میں سمجھنا امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کے منہجِ فکر کے صحیح ادراک کے لیے ناگزیر ہے کیونکہ آپ کی جد و جہد کا محور افراد سے انتقام نہیں بلکہ افکار کی اصلاح، عقائد کی حفاظت اور امت کی فکری رہنمائی تھا۔ یہی وہ متوازن اور مہذب طرزِ عمل ہے جو آج کے علمی و فکری ماحول میں بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

امام احمد رضا کی پوری علمی زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ انہوں نے قلم، دلیل، تحقیق اور علمی استدلال کو اپنا اصل ہتھیار بنایا۔ ان کی سرکوبی، فکری سرکوبی تھی ان کا جہاد، علمی جہاد تھا اور ان کا میدان، علم و تحقیق کا میدان تھا۔ آج کے دور میں اس نکتے کی معنویت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اگرچہ آج ذرائع ابلاغ، انٹرنیٹ، سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل رابطوں نے فاصلے ختم کر دیے ہیں لیکن امت کو اب بھی ایسے منظم علمی و دعوتی نیٹ ورک کی ضرورت ہے جو مختلف علاقوں کی دینی و مذہبی ضروریات سے واقف ہو، بروقت رہنمائی فراہم کرے، معیاری دینی

موادمہیا کرے اور حالات کے مطابق مناسب حکمتِ عملی اختیار کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا کا یہ آٹھواں نکتہ محض چند نمائندے مقرر کرنے کی تجویز نہیں بلکہ دعوتِ دین کی تنظیم، رابطے، نگرانی اور بروقت رہنمائی کا ایک مکمل نظام پیش کرتا ہے۔ وہ امت کو یہ پیغام دے رہے تھے کہ فکری معرکے صرف علم سے نہیں جیتے جاتے بلکہ علم کے ساتھ نظم، رابطہ، منصوبہ بندی اور بروقت اقدام بھی ضروری ہوتا ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز ایک صدی قبل ہی ملت کو اس حقیقت سے آگاہ کر رہے تھے کہ منتشر کوششیں وقتی نتائج تو پیدا کر سکتی ہیں، لیکن مستقل اور ہمہ گیر دینی بیداری اسی وقت ممکن ہے جب علم، تنظیم، ابلاغ اور باہمی رابطے کو ایک مضبوط، فعال اور منظم نظام کی صورت دے دی جائے۔

آپ کی نگاہ صرف اپنے عہد کے مسائل تک محدود نہ تھی بلکہ آنے والے زمانوں کے تقاضے بھی آپ کی فکری افق پہ نمایاں تھے۔ آپ جانتے تھے کہ اگر علمی سرمایہ منتشر ہو جائے، دعوتی قوتیں ایک دوسرے سے بے ربط ہو جائیں اور مختلف علاقوں کی ضروریات سے مرکز بے خبر رہے تو حق کی آواز اپنی مطلوبہ تاثیر کھو دیتی ہے۔ اسی لیے آپ نے ایک ایسے مربوط دعوتی و تنظیمی ڈھانچے کا تصور پیش فرمایا جس میں ہر فرد اپنی ذمہ داری سے واقف ہو، ہر شہر مرکز سے وابستہ رہے، ہر ضرورت بروقت محسوس کی جائے اور ہر چیلنج کا جواب علم، حکمت اور بصیرت کے ساتھ دیا جائے۔

حیرت ہوتی ہے کہ آج جسے ادارہ جاتی منصوبہ بندی، اطلاعاتی نظام (Information Network)، مؤثر ابلاغ (Communication Strategy) اور زمینی رابطے (Field Coordination) کی بنیادی ضرورت قرار دیا جاتا ہے، امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک صدی قبل اس کی طرف نہایت واضح انداز میں رہنمائی فرما دی تھی۔ یہ ان کی غیر معمولی دور اندیشی، تنظیمی شعور اور ملت کے مستقبل پہ گہری نظر کا بین ثبوت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ نکتہ محض ایک انتظامی ہدایت نہیں بلکہ ہر دور کی دینی تحریکوں کے لیے ایک دائمی منشور ہے، جو یہ پیغام دیتا ہے کہ علم کی اشاعت، فکر کی حفاظت، عقیدے کی صیانت اور ملت کی اصلاح کے لیے اخلاص کے ساتھ ساتھ نظم، ربط، منصوبہ بندی اور مسلسل باہمی تعاون بھی ناگزیر ہیں۔ جب یہ تمام عناصر یکجا ہو جاتے ہیں تو ایک تحریک محض چند افراد کی کوشش نہیں رہتی بلکہ ایک زندہ، مؤثر اور دیرپا فکری و دعوتی نظام کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

یہی ان کی اصلاحی فکر کا وہ درخشاں پہلو ہے جو آج بھی دعوت، تنظیم اور دینی قیادت کے میدان میں رہنمائی کا ایک تابندہ مینار بن کر ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ وقت کی گردش، حالات کی تبدیلی اور ذرائع و وسائل کی ترقی کے باوجود اس فکر کی تازگی ماند نہیں پڑی بلکہ ہر نئے دور کے ساتھ اس کی معنویت مزید نمایاں ہوتی چلی گئی ہے۔ اس میں ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ دینی تحریکوں کی حقیقی قوت محض جذباتی وابستگی میں نہیں بلکہ علمی استحکام، منظم منصوبہ بندی، مضبوط باہمی ربط، ذمہ دار قیادت اور مسلسل دعوتی جدوجہد میں مضمر ہے۔

امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز نے اپنی بصیرت افروز رہنمائی کے ذریعے یہ واضح کر دیا کہ جو قوم اپنے علمی سرمائے کی حفاظت کرتی ہے، اپنے افراد کو منظم کرتی ہے، اپنے مراکز کو فعال رکھتی ہے اور اپنے دعوتی وسائل کو حکمت کے ساتھ بروئے کار لاتی ہے، وہی زمانے کے فکری طوفانوں کا استقامت کے ساتھ مقابلہ کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی اصلاحی فکر کسی مخصوص عہد تک محدود نہیں بلکہ ہر زمانے کے اہلِ علم، داعیانِ حق، ائمہ، خطباء، مصنفین اور ملت کے ذمہ داران کے لیے یکساں طور پہ مشعلِ راہ ہے۔

بلاشبہ اگر آج بھی دینی قیادت امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کی اس منظم، حکیمانہ اور دور اندیش اصلاحی فکر کو تعمیر قوم و ملت کے عملی طریقہ کار کا حصہ بنا لے تو دعوت میں وسعت، تنظیم میں استحکام، فکر میں پختگی اور ملت میں اتحاد و اعتماد کی ایک نئی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی اس عظیم مفکر کی دائمی بصیرت اور اس کا زندہ پیغام ہے، جو ہر دور کے اہلِ حق کو یہ دعوت دیتا ہے کہ اخلاص کے ساتھ نظم، علم کے ساتھ حکمت اور دعوت کے ساتھ مؤثر تنظیم کو بھی اپنا شعار بنایا جائے۔ یہی ان کے اصلاحی منشور کا وہ عصر شناس پیغام ہے جس کی روشنی آج بھی ہماری راہیں منور

کر رہی ہے اور آئندہ بھی کرتی رہے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کے اس آٹھویں اصلاحی نکتے میں محض چند نمائندوں کے تقرر کی ہدایت نہیں بلکہ ایک ایسی زندہ، متحرک اور منظم دعوتی فکر پوشیدہ ہے جو ہر دور کی دینی تحریکوں کے لیے رہنما اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں یہ واضح پیغام مضمر ہے کہ ملت کی فکری حفاظت، دعوتِ حق کی مؤثر اشاعت اور دینی قیادت کی کامیابی اس وقت ممکن ہوتی ہے جب علم کے ساتھ نظم، اخلاص کے ساتھ منصوبہ بندی، اور دعوت کے ساتھ مضبوط باہمی رابطہ بھی موجود ہو۔

یہی امام احمد رضا کی اصلاحی بصیرت کا وہ تابندہ پہلو ہے جس نے ایک صدی قبل ہی امت کو یہ شعور عطا کر دیا تھا کہ منتشر کوششیں تاریخ نہیں بناتیں بلکہ وہی تحریکیں دیرپا اثرات چھوڑتی ہیں جو اپنے افراد، وسائل اور افکار کو ایک مضبوط، مربوط اور مقصد آفریں نظام میں پرو دیتی ہیں۔ یہی وہ زندہ پیغام ہے جو آج بھی اہلِ علم، داعیانِ حق اور ملت کے تمام ذمہ داران کو دعوت دیتا ہے کہ وہ علم کو عمل سے، فکر کو تنظیم سے اور اخلاص کو حکمتِ عملی سے جوڑ کر ایک ایسی دعوتی روایت قائم کریں جو وقت کی ہر آزمائش میں حق کی آواز مضبوطی، وقار اور استقامت کے ساتھ زندہ رکھ سکے۔

جو ہم میں قابلِ کار موجود اور اپنی معاش میں مشغول ہیں، وظائف مقرر کر کے فارغ البال بنائے جائیں اور جس کام میں انہیں مہارت ہو، اسی میں لگائے جائیں:

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کے دس نکاتی اصلاحی پروگرام کا یہ نکتہ ان کی غیر معمولی انتظامی بصیرت، انسانی وسائل کے درست استعمال، علمی قیادت کی قدر شناسی اور ملت کی اجتماعی منصوبہ بندی کا نہایت روشن مظہر ہے۔ اگر اس ایک مختصر جملے پہ گہرائی سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد رضا صرف نئی نسل کی تربیت ہی کی فکر نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ اپنی قوم میں پہلے سے موجود علمی، فکری اور دعوتی صلاحیتیں بھی ضائع ہونے سے بچانا چاہتے تھے۔ ان کی نگاہ میں ملت کا ہر صاحبِ صلاحیت فرد ایک قیمتی سرمایہ تھا اور اس سرمائے کو معاشی مجبوریوں کی نذر کر دینا ملت کے ساتھ ناانصافی کے مترادف تھا۔ اس نکتے کا پس منظر سمجھنے کے لیے اس دور کے علمی اور معاشی حالات پہ نظر ڈالنا ضروری ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت کمزور ہو چکی تھی، معاشی وسائل محدود تھے اور دینی اداروں کے پاس اتنے امکانات موجود نہ تھے کہ وہ ہر باصلاحیت عالم، محقق، مصنف، خطیب یا داعی کی کفالت کر سکیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ بہت سے ایسے افراد جو علمی و فکری اعتبار سے ملت کی اہم خدمت کر سکتے تھے، اپنی روزی روٹی کی فکر میں تجارت، ملازمت یا دیگر معاشی مصروفیات میں الجھ جاتے تھے۔ ان کی علمی صلاحیتیں موجود تھیں، جذبۂ خدمت بھی زندہ تھا مگر معاشی تقاضے انہیں دین و ملت کے لیے مکمل وقت دینے سے روک دیتے تھے۔

امام احمد رضا نے اس المیے کا نہایت باریک بینی سے احساس کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک طرف ملت اہلِ علم کی کمی کا شکوہ کرتی ہے اور دوسری طرف جو اہلِ علم موجود ہیں، ان کے لیے ایسا کوئی نظام قائم نہیں کرتی جو انہیں فکری یکسوئی اور معاشی اطمینان فراہم کر سکے۔ اسی احساس نے انہیں یہ تجویز پیش کرنے پہ آمادہ کیا کہ ایسے باصلاحیت افراد کے لیے وظائف مقرر کیے جائیں، انہیں معاشی فکر سے آزاد کیا جائے اور ان کی مہارت کے مطابق ان سے خدمت لی جائے۔

یہ نکتہ اپنے اندر انسانی وسائل کے بہترین استعمال کا ایک مکمل فلسفہ رکھتا ہے۔ امام احمد رضا کے نزدیک ہر صاحبِ علم ہر میدان کے لیے موزوں نہیں ہوتا۔ کوئی تحقیق میں مہارت رکھتا ہے، کوئی فتویٰ نویسی میں، کوئی تدریس میں، کوئی تصنیف و تالیف میں، کوئی خطابت میں، کوئی دعوت و تبلیغ میں اور کوئی تنظیم و انتظام میں غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہے۔ حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ ہر شخص کو اس کے مزاج، قابلیت اور مہارت کے مطابق ذمہ داری دی جائے تاکہ اس کی صلاحیت پوری طرح بروئے کار آ سکے۔

اس سے بھی زیادہ اہم ان کی یہ تجویز ہے کہ ایسے افراد فارغ

البال بنائے جائیں۔ یہ صرف معاشی امداد کی بات نہیں بلکہ ایک گہرا علمی فلسفہ ہے۔ امام احمد رضا جانتے تھے کہ جس ذہن پہ معاشی اضطراب چھایا ہو، وہ نہ پوری توجہ کے ساتھ تحقیق کرسکتا ہے، نہ اعلیٰ درجے کی تصنیف، نہ مسلسل تدریس اور نہ ہی منظم دعوتی خدمات انجام دے سکتا ہے۔ علمی کام سکونِ قلب، ذہنی یکسوئی اور مسلسل محنت کا تقاضا کرتا ہے اور یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب اہلِ علم کو بنیادی معاشی فکر سے نجات حاصل ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ کے سنہری ادوار میں خلفاء، سلاطین، اوقاف اور اہلِ خیر ہمیشہ علماء، محدثین، مفسرین اور مصنفین کی سرپرستی کرتے رہے۔ اسی سرپرستی کے نتیجے میں وہ عظیم علمی ذخیرہ وجود میں آیا جو آج بھی امت کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ امام احمد رضا دراصل وہی مبارک روایت اپنے دور میں دوبارہ زندہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کی نگاہ میں یہ کوئی احسان نہیں بلکہ امت کی اپنی علمی بقا کا تقاضا تھا۔

اگر یہ نکتہ عصرِ حاضر کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کی بڑی جامعات، تحقیقی مراکز اور علمی ادارے بھی اپنے ممتاز محققین، اساتذہ اور مفکرین کو Research Fellowships، Academic Grants، Endowed Chairs اور دیگر مالی سہولیات فراہم کرتے ہیں تاکہ وہ معاشی الجھنوں سے آزاد ہوکر علم و تحقیق کے میدان میں مکمل یکسوئی کے ساتھ کام کرسکیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ امام احمد رضا ایک صدی قبل ملت کو اسی حقیقت کی طرف متوجہ کررہے تھے کہ اگر علمی قیادت محفوظ رکھنا ہے تو اہلِ علم کی کفالت ناگزیر ہے۔

اس نکتے کا ایک اور پہلو بھی نہایت قابلِ غور ہے۔ امام احمد رضا کسی شخصیت پرستی کے قائل نہیں تھے بلکہ صلاحیت پہ مبنی ذمہ داری کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک منصب کا معیار تعلق، شہرت یا جذبات نہیں بلکہ قابلیت، مہارت اور خدمت کی استعداد ہونی چاہیے۔ یہی اصول کسی بھی زندہ اور ترقی یافتہ معاشرے کی بنیاد ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا کا یہ نواں نکتہ محض وظائف مقرر کرنے کی تجویز نہیں بلکہ علمی قیادت کے تحفظ، انسانی صلاحیتوں کی صحیح منصوبہ بندی اور ملت کے فکری سرمائے کی حفاظت کا ایک جامع منشور ہے۔ وہ امت کو یہ باور کرارہے تھے کہ اگر تم اپنے اہلِ علم، اپنے اہلِ قلم، اپنے محققین اور اپنے داعیوں کی قدر نہیں کروگے، انہیں معاشی آسودگی فراہم نہیں کروگے اور ان کی صلاحیتوں کو صحیح میدان میں استعمال نہیں کروگے تو تمہارا سب سے قیمتی سرمایہ آہستہ آہستہ ضائع ہو جائے گا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز ایک صدی قبل ہی امت کو یہ سبق دے رہے تھے کہ قوموں کی ترقی صرف نئے افراد پیدا کرنے سے نہیں ہوتی بلکہ اپنے موجودہ باصلاحیت افراد کی شناخت، ان کی سرپرستی اور ان کی درست رہنمائی سے بھی ہوتی ہے۔ یہی وہ حکیمانہ فکر ہے جس نے انہیں صرف ایک عظیم فقیہ اور محدث ہی نہیں بلکہ ملت کی اجتماعی تعمیر کا ایک بے مثال معمار بھی بنادیا۔

اگر اس نکتے کو عصرِ حاضر کے علمی و انتظامی تصورات کی روشنی میں دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ آج جسے Talent Identification، Capacity Building، Leadership Development اور Human Resource Planning کے نام سے ادارہ جاتی کامیابی کا بنیادی اصول قرار دیا جاتا ہے، امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز ایک صدی قبل ہی اپنی ملت کو اس کی طرف متوجہ فرمارہے تھے۔ آپ نے یہ حقیقت واضح کردی تھی کہ قوموں کی ترقی صرف افراد کی کثرت سے نہیں بلکہ باصلاحیت افراد کی صحیح شناخت، ان کی علمی و معاشی سرپرستی، ان کی صلاحیتوں کے درست استعمال اور ان کی استعداد کے مطابق ذمہ داریوں کی تقسیم سے وابستہ ہوتی ہے۔ یہی وہ حکیمانہ اصول ہے جو کسی بھی ملت کے علمی استحکام، فکری خودمختاری اور تنظیمی قوت کی بنیاد بنتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کا یہ نواں اصلاحی نکتہ محض وظائف مقرر کرنے یا اہلِ علم کی کفالت کی ایک انتظامی تجویز نہیں بلکہ انسانی صلاحیتوں کی قدر شناسی، علمی قیادت کی حفاظت اور ملت کے فکری سرمائے کے مؤثر استعمال کا ایک دائمی منشور ہے۔ آپ نے ایک صدی قبل ہی یہ حقیقت آشکار کردی تھی کہ قوموں کی تعمیر

صرف ادارے قائم کرنے سے نہیں ہوتی بلکہ ان اداروں کو زندگی بخشنے والے باصلاحیت افراد کی شناخت، سرپرستی اور صحیح مقام پر تقرری سے ہوتی ہے۔

یہی امام احمد رضا کی دوراندیش قیادت کا وہ درخشاں پہلو ہے جو آج بھی ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ جس ملت کو اپنے اہلِ علم پر اعتماد ہو، جو اپنے محققین، مصنفین، اساتذہ، داعیوں اور مفکرین کو معاشی یکسوئی، علمی وقار اور خدمت کے مواقع فراہم کرے، وہی ملت فکری طور پر زندہ، علمی اعتبار سے خودکفیل اور تہذیبی لحاظ سے باوقار رہتی ہے۔ جب صلاحیت کو اس کا مقام، علم کو اس کا احترام اور خدمت کو اس کا میدان مل جائے تو افراد محض کارکن نہیں رہتے بلکہ تاریخ ساز معمار بن جاتے ہیں، اور یہی وہ زندہ پیغام ہے جو امام احمد رضا کے اصلاحی منشور کو ہر دور کے لیے مشعلِ راہ بناتا ہے۔

جب صلاحیت کو اس کا مقام، علم کو اس کا احترام، اخلاص کو اس کی قدر اور خدمت کو اس کا میدان مل جائے تو افراد محض کارکن نہیں رہتے بلکہ تاریخ کے معمار، تہذیب کے محافظ اور ملت کے مستقبل کے امین بن جاتے ہیں۔ یہی وہ زندہ پیغام ہے جو امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کے اس اصلاحی منشور کو ہر زمانے میں تازگی، معنویت اور رہنمائی عطا کرتا ہے۔

آپ کے مذہبی اخبار شائع ہوں، وقتاً فوقتاً حمایتِ مذہب میں ہر قسم کے مضامین تمام ملک میں بقیمت و بلا قیمت، روزانہ یا کم از کم ہفتہ وار پہنچاتے رہیں:

امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کے دس نکاتی اصلاحی پروگرام کا یہ آخری نکتہ درحقیقت ان کے پورے فکری منصوبے کا نقطۂ عروج ہے۔ بظاہر یہ اس منشور کا آخری عنوان ہے مگر حقیقت میں یہ ایک نئی فکر، ایک نئے عزم اور ایک ہمہ گیر تعمیرِ ملت کے سفر کا نقطۂ آغاز ہے۔ اسی ایک نکتے میں ان کی تعلیمی بصیرت، دعوتی حکمت، تنظیمی شعور اور ملت کے روشن مستقبل کا خواب مکمل آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔

یہ محض ایک انتظامی تجویز یا وقتی ہدایت نہیں بلکہ ایک ایسا عہد آفریں تصور ہے جو اہلِ علم، اہلِ قلم اور ملت کے ذمہ دار طبقات کو ان کی حقیقی ذمہ داریوں کا احساس دلاتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام احمد رضا کے نزدیک کسی بھی اصلاحی تحریک کی کامیابی صرف نظریات کی درستی سے وابستہ نہیں بلکہ ایسے علمی و فکری ماحول کی تشکیل سے بھی وابستہ ہے جہاں صلاحیتوں کی قدر ہو، اہلِ علم کی سرپرستی کی جائے، اہلِ قلم کی حوصلہ افزائی ہو اور اجتماعی وسائل کو ملت کی فکری تعمیر کے لیے بروئے کار لایا جائے۔

گویا یہ نکتہ صرف ایک باب کا اختتام نہیں بلکہ ایک دائمی دعوت ہے، ایسی دعوت جو ہر دور کے اہلِ فکر کو یہ پیغام دیتی ہے کہ اگر علم کی شمعیں فروزاں رکھنا ہے، فکر کی آبیاری کرنی ہے اور تہذیبی شناخت محفوظ بنانی ہے تو اہلِ علم اور اہلِ قلم کی عزت، سرپرستی اور دل جمعی کو اپنی اجتماعی ترجیحات میں شامل کرنا ہوگا۔ یہی وہ فکر ہے جو کسی بھی زندہ ملت کو زوال سے عروج، انتشار سے استحکام اور بے سمتی سے مقصدیت کی طرف لے جاتی ہے۔

اگر پہلے نو نکات میں انہوں نے علماء کی تیاری، مدارس کی مضبوطی، اہلِ قلم کی سرپرستی، تصنیف و اشاعت، دعوت و تبلیغ اور تنظیمِ ملت کی بنیادیں استوار کی تھیں، تو اس آخری نکتے میں انہوں نے ان تمام کوششوں کو ایک مستقل، منظم اور ہمہ گیر ابلاغی نظام سے جوڑ دیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں امام احمد رضا کی شخصیت صرف ایک عظیم فقیہ اور محدث کے طور پہ نہیں بلکہ ایک غیر معمولی مفکرِ ابلاغ، مدبرِ ملت اور مذہبی صحافت کے دوراندیش معمار کے طور پہ سامنے آتی ہے۔

اس نکتے کا پس منظر سمجھنے کے لیے اس دور کے فکری حالات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ انیسویں صدی کے آخری عشروں میں برصغیر میں صحافت ایک طاقتور سماجی اور فکری قوت بن چکی تھی۔ اخبارات محض خبروں کے ذرائع نہیں رہے تھے بلکہ وہ نظریات کی تشکیل، افکار کی اشاعت اور عوامی ذہن سازی کے سب سے مؤثر وسائل بن چکے تھے۔ مختلف مذہبی جماعتیں، سیاسی تحریکیں اور فکری حلقے اپنے اپنے

اخبارات و رسائل کے ذریعے اپنے نظریات عام کر رہے تھے۔ جو طبقہ صحافت پہ اثر انداز تھا، وہ عوامی فکر پہ بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔

امام احمد رضا نے یہ حقیقت بہت پہلے سمجھ لی تھی کہ اگر اہلِ حق نے قلم اور صحافت کا یہ میدان خالی چھوڑ دیا تو فکری قیادت دوسروں کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ اسی لیے انہوں نے صرف کتابوں اور رسائل کی اشاعت پہ اکتفا نہیں کیا بلکہ مستقل مذہبی اخبار کا اجراء بھی ملت کی ناگزیر ضرورت قرار دیا۔

ان کا یہ فرمان کہ ''آپ کے مذہبی اخبار شائع ہوں'' دراصل ایک مسلسل فکری تحریک کے قیام کی دعوت ہے۔ کتابیں اگرچہ علمی سرمایہ ہوتی ہیں لیکن ان کی اشاعت وقفے وقفے سے ہوتی ہے، جبکہ اخبار ایک زندہ اور متحرک ذریعۂ ابلاغ ہوتا ہے جو روزمرہ پیش آنے والے مسائل، فکری حملوں، مذہبی اعتراضات اور سماجی تبدیلیوں کا فوری جواب دے سکتا ہے۔ امام احمد رضا چاہتے تھے کہ اہلِ سنّت کے پاس بھی ایسا مؤثر ترجمان ہو جو ہر وقت ملت کی رہنمائی کرتا رہے۔

اس نکتے میں ''وقتاً فوقتاً حمایتِ مذہب میں ہر قسم کے مضامین'' کی جو ہدایت دی گئی ہے، وہ امام احمد رضا کی وسعتِ نظر کی غماز ہے۔ وہ صحافت کو صرف مناظرانہ مضامین تک محدود نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کے نزدیک دینی اخبار میں عقائد، فقہ، اخلاق، سیرتِ نبوی، تاریخِ اسلام، معاشرت، تعلیم، اصلاحِ امت، عصری مسائل، فکری رہنمائی اور ملت کے اجتماعی مفادات سے متعلق ہر موضوع پہ معیاری اور تحقیقی مضامین شائع ہونے چاہییں۔ گویا ان کے نزدیک مذہبی صحافت ایک جامع فکری درسگاہ تھی، جو ہر ہفتے یا ہر روز عوام کی ذہنی اور روحانی تربیت کا فریضہ انجام دے۔

اس نکتے کا ایک نہایت اہم پہلو یہ بھی ہے کہ امام احمد رضا نے فرمایا کہ یہ اخبارات ''بقیمت و بلا قیمت'' دونوں طریقوں سے عوام تک پہنچائے جائیں۔ اس سے ان کی دعوتی حکمتِ عملی پوری طرح واضح ہوتی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر کوئی شخص خرید کر مطالعہ کر سکتا ہے تو ضرور کرے لیکن جو لوگ مالی استطاعت نہیں رکھتے، انہیں بھی صحیح دینی رہنمائی سے محروم نہ رہنے دیا جائے۔ ان کے نزدیک علم اور صحیح فکر پہ کسی مخصوص طبقے کی اجارہ داری نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کی روشنی ہر گھر، ہر شہر اور ہر طبقے تک پہنچنی چاہیے۔

اسی طرح ''روزانہ یا کم از کم ہفتہ وار'' کی قید بھی نہایت معنیٰ خیز ہے۔ امام احمد رضا بخوبی جانتے تھے کہ فکری معرکے وقفوں سے نہیں لڑے جاتے۔ اگر باطل نظریات ہر روز عوام تک پہنچ رہے ہوں تو حق کی آواز بھی مسلسل سنائی دینی چاہیے۔ خموشی فکری میدان میں ہمیشہ نقصان کا باعث بنتی ہے، اس لیے مذہبی صحافت کو بھی متحرک، مسلسل اور حالات کے مطابق فعال رہنا چاہیے۔

اگر اس نکتے کا تجزیہ جدید ابلاغی علوم کی روشنی میں کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ امام احمد رضا ایک صدی قبل Continuous، Communication، Public Opinion Building، Narrative Formation اور Media Strategy جیسے اصولوں کی طرف ملت کی رہنمائی کر رہے تھے۔ آج دنیا کی ہر مؤثر تحریک اپنی بقا اور اثر پذیری کے لیے مضبوط میڈیا نیٹ ورک قائم کرتی ہے، کیونکہ وہ جانتی ہے کہ جو قوم اپنا نقطۂ نظر خود پیش نہیں کرتی، اس کا فکری شعور دوسرے لوگ لکھ دیتے ہیں۔ امام احمد رضا نے یہی حقیقت بہت پہلے محسوس کر لی تھی۔

یہ نکتہ مذہبی صحافت کی عظمت اور افادیت بھی واضح کرتا ہے۔ مذہبی اخبار صرف خبروں کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ وہ امت کی فکری نبض، دینی شعور کا ترجمان، مذہبی اقدار کا محافظ، علمی مباحث کا مرکز اور اجتماعی اصلاح کا ایک مؤثر ذریعہ ہوتا ہے۔ ایک اچھا مذہبی اخبار خموش معلم بھی ہوتا ہے، بیدار نگہبان بھی، بے باک ترجمان بھی اور فکری سپاہی بھی۔ وہ شبہات کا ازالہ کرتا ہے، نئی نسل کو صحیح سمت دیتا ہے، امت کے مسائل اجاگر کرتا ہے اور اسلام کی حقیقی تعلیمات عام کرتا ہے۔

آج جب پرنٹ میڈیا کے ساتھ ساتھ ڈیجیٹل صحافت، ویب سائٹس، آن لائن جرائد، سوشل میڈیا پلیٹ فارمز، ہر روز پوڈکاسٹس اور ویڈیو چینلز نے ابلاغ کی دنیا کو نئی وسعت عطا کر دی ہے تو امام احمد رضا کا یہ نکتہ پہلے سے کہیں زیادہ زندہ محسوس ہوتا ہے۔ اگر ان کے زمانے میں مذہبی اخبار کی ضرورت تھی تو آج ہر وہ ذریعہ جو صحیح دینی فکر مسلسل،

ذمہ دارانہ اور مؤثر انداز میں عوام تک پہنچائے، اسی فکر کی توسیع اور اسی مشن کا تسلسل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا کا یہ آخری نکتہ محض ایک اخبار جاری کرنے کی تجویز نہیں بلکہ مستقل فکری بیداری، منظم مذہبی صحافت اور مسلسل دعوت و تبلیغ کا ایک جامع منشور ہے۔ وہ امت کو یہ پیغام دے رہے تھے کہ مسجد کا منبر، مدرسے کا درس، مصنف کا قلم اور اخبار کے صفحات -- یہ سب ایک ہی مشن کے مختلف مظاہر ہیں اور جب یہ سب ایک مقصد کے لیے متحد ہو جائیں تو کوئی فکری طوفان حق کی روشنی بجھا نہیں سکتا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز نے ایک صدی پہلے ہی مذہبی صحافت کو ملت کی فکری زندگی کی شہ رگ قرار دے دیا تھا۔ ان کی نگاہ میں اخبار محض خبروں کا ذریعہ نہیں بلکہ ایمان کی حفاظت، افکار کی تطہیر، ملت کی رہنمائی اور اسلامی تشخص کے استحکام کا ایک زندہ اور متحرک وسیلہ تھا۔ یہی ان کی دور اندیشی تھی، یہی ان کا ابلاغی شعور تھا اور یہی ان کے دس نکاتی اصلاحی پروگرام کا وہ آخری مگر نہایت فیصلہ کن سنگِ میل ہے جو آج بھی اہلِ قلم، اہلِ صحافت اور اہلِ دعوت کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

وہ بخوبی جانتے تھے کہ جس قوم کے ذرائعِ ابلاغ اس کی تہذیبی اقدار، دینی شناخت اور فکری خودمختاری کے محافظ نہ رہیں، اس قوم کے اذہان رفتہ رفتہ دوسروں کے افکار کے زیرِ اثر آ جاتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے مذہبی صحافت کو محض اطلاعات کی ترسیل کا ذریعہ نہیں سمجھا بلکہ اسے دعوت، تعلیم، تربیت، اصلاح اور ملت کے اجتماعی شعور کی تشکیل کا ایک مؤثر اور ناگزیر وسیلہ قرار دیا۔ ان کے نزدیک اخبار روزانہ تحریر کیے جانے والا تاریخ کا پہلا مسودہ بھی تھا اور ملت کی فکری سمت متعین کرنے والا ایک خموش مگر نہایت طاقتور معلم بھی۔

آج جب ذرائعِ ابلاغ رائے عامہ کی تشکیل، افکار کی سمت متعین کرنے اور تہذیبی ترجیحات بدلنے میں غیر معمولی کردار ادا کر رہے ہیں، تو امام احمد رضا کی یہ فکر پہلے سے کہیں زیادہ زندہ، بامعنیٰ اور قابلِ توجہ محسوس ہوتی ہے۔ ان کا یہ تصور ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اگر اہلِ حق اپنا مؤثر، باوقار، علمی اور ذمہ دار ابلاغی نظام قائم نہ کریں تو فکری خلا ہمیشہ دوسروں کے بیانیے پُر کر دیتے ہیں اور پھر قومیں صرف میدانِ سیاست میں نہیں بلکہ میدانِ فکر، تہذیب اور شناخت میں بھی اپنی برتری کھو بیٹھتی ہیں۔

اس لیے امام احمد رضا کا یہ آخری نکتہ دراصل مذہبی صحافت کے لیے ایک دائمی منشور ہے۔ یہ اہلِ قلم کو یاد دلاتا ہے کہ قلم ایک امانت ہے، صحافت ایک ذمہ داری ہے اور ابلاغ محض پیشہ نہیں بلکہ ایک دینی، ملی اور تہذیبی فریضہ ہے۔ جب قلم اخلاص سے وابستہ ہو، صحافت دیانت سے آراستہ ہو اور ابلاغ حق، حکمت اور بصیرت کا ترجمان بن جائے تو وہ صرف خبریں نہیں لکھتا بلکہ نسلوں کی فکر تشکیل دیتا ہے، اقدار کی حفاظت کرتا ہے، تاریخ کا رخ موڑتا ہے اور ملت کے مستقبل کو نئی روشنی عطا کرتا ہے۔ یہی امام احمد رضا کی ابلاغی بصیرت کا حقیقی پیغام ہے اور یہی وہ ابدی سبق ہے جس کی معنویت وقت گذرنے کے ساتھ کم نہیں ہوئی بلکہ ہر نئے دور نے اس کی ضرورت پہلے سے زیادہ نمایاں کر دی ہے۔

دینی صحافت اور ہماری ذمہ داری

...اور آخر میں، اس پورے دس نکاتی پروگرام کا شاید سب سے زیادہ مظلوم باب وہ ہے جسے امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز نے غیر معمولی اہمیت کے ساتھ اپنی اصلاحی فکر میں شامل فرمایا۔ آپ نے صاف الفاظ میں فرمایا: ''آپ کے مذہبی اخبار شائع ہوں، وقتاً فوقتاً حمایتِ مذہب میں ہر قسم کے مضامین تمام ملک میں بقیمت و بلا قیمت، روزانہ یا کم از کم ہفتہ وار پہنچاتے رہیں۔''

ذرا اس ایک جملے پہ توقف کیجیے۔ ایک صدی سے بھی پہلے ایک مردِ درویش، ایک فقیہِ وقت اور ایک مفکرِ ملت یہ اعلان کر رہا ہے کہ اگر ملت کی فکری شناخت زندہ رکھنا ہے تو اس کے لیے مذہبی صحافت کا ایک مضبوط، متحرک اور مسلسل نظام قائم کرنا ہوگا۔ گویا امام احمد رضا نے آنے والے زمانے کی فکری جنگوں کو بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ قلم کی طاقت، ذرائعِ ابلاغ کی قوت اور افکار کی اشاعت ہی مستقبل کے معرکوں کا فیصلہ کرے گی۔

لیکن صد افسوس! ایک صدی سے زیادہ کا زمانہ گذر گیا مگر ہم اس باب میں اپنے امام کی فکر کے امین ثابت نہ ہو سکے۔ آج روزنامہ مذہبی اخبار، معیاری ہفتہ وار اخبارات تو درکنار باقاعدگی سے شائع ہونے والے علمی جرائد بھی انگلیوں پہ گنے جاسکتے ہیں۔ جس شعبے کو امام احمد رضا نے ملت کی فکری بقا کی شہ رگ قرار دیا تھا، وہی شعبہ ہماری اجتماعی بے توجہی کا سب سے بڑا شکار بن گیا ہے۔

آج باطل نظریات ہر لمحہ اخبارات، ٹیلی ویژن، ویب سائٹس، سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے ذریعے ذہنوں کو متاثر کر رہے ہیں مگر ہم اب بھی صرف جلسوں، نعروں اور وقتی جذبات پہ مطمئن دکھائی دیتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل امام احمد رضا کی فکر سے وفاداری نہیں بلکہ ان کی دوراندیشی سے غفلت ہے۔

اگر ہم واقعی ''مسلکِ اعلیٰ حضرت'' کے وفادار ہیں تو اب وقت آ گیا ہے کہ نعروں سے آگے بڑھیں، منصوبے بنائیں جائیں، ادارے قائم کریں، اہلِ قلم کی سرپرستی کریں، مذہبی صحافت کو زندہ کریں، علمی جرائد کو فروغ دیں اور جدید ذرائعِ ابلاغ کو شرعی حدود میں دینِ حق کی اشاعت کا مؤثر وسیلہ بنائیں۔ یہی امام احمد رضا کے مشن سے حقیقی وفاداری ہے، یہی ان کی فکر کا عملی احترام ہے اور یہی وہ راستہ ہے جو ملت کو فکری استحکام، علمی خوداعتمادی اور اجتماعی سربلندی کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔

ورنہ تاریخ یہ ضرور لکھے گی کہ ہم نے امام احمد رضا کا نام تو بہت بلند کیا مگر ان کا مشن بلند کرنے کی فرصت نہ نکال سکے۔ امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ العزیز کے اس دس نکاتی اصلاحی پروگرام کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ محض چند نصیحتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر منصوبۂ تعمیرِ ملت ہے۔ اس میں تعلیم بھی ہے، تربیت بھی، تنظیم بھی ہے، دعوت بھی، قلم بھی ہے، صحافت بھی، مدارس بھی ہیں، مساجد بھی، اہلِ علم کی کفالت بھی ہے، اہلِ قلم کی سرپرستی بھی، عقیدے کا تحفظ بھی ہے، معاشرے کی اصلاح بھی۔ گویا امام احمد رضا نے ایک صدی قبل ملت کے زوال کے اسباب بھی متعین کر دیے تھے اور ان کے علاج کا مکمل نسخۂ کیمیا بھی عطا کر دیا تھا۔

لیکن اس حقیقت کا دوسرا رخ نہایت دردناک ہے۔ ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے۔ اس دوران یہ دس نکاتی پروگرام بارہا شائع کیے گئے، جلسوں میں پڑھے گئے، مضامین میں نقل کیے گئے، خطبات میں اس کا ذکر ہوا، سیمیناروں اور کانفرنسوں میں اس پہ گفتگو بھی ہوتی رہی مگر یہ سوال آج بھی پوری شدت کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا ہے کہ کیا ہم نے اسے اپنی اجتماعی زندگی کا عملی منشور بھی بنایا؟

یہ ایک ایسا سوال ہے جس سے نظریں چرانا آسان ہے مگر اس کا جواب دینا آسان نہیں۔

ہم نے امام احمد رضا کے نام پہ ادارے قائم کیے، کانفرنسیں منعقد کیں، سالانہ تقریبات سجائیں، نعتیہ محافل منعقد کیں، جلوس نکالے اور ان کی علمی عظمت کے تذکرے سے فضائیں مشک بار کر دیں، لیکن کیا ہم نے ان کا یہ اصلاحی پروگرام بھی اسی سنجیدگی کے ساتھ اختیار کیا؟ کیا ہم نے اہلِ علم کی کفالت کو اپنا فرض سمجھا؟ کیا ہم نے باصلاحیت نوجوانوں کی سرپرستی کی؟ کیا ہم نے معیاری دینی لٹریچر کی تیاری اور اس کی مفت اشاعت کو اپنی ترجیح بنایا؟ کیا ہم نے مذہبی صحافت کو وہ مقام دیا جس کی طرف امام احمد رضا نے توجہ دلائی تھی؟ کیا ہم نے ہر شہر میں علمی و دعوتی مراکز اور فکری رابطے کا وہ نظام قائم کیا جس کا خواب انہوں نے دیکھا تھا؟

اگر ان سوالات کا جواب نفی میں اور یقیناً نفی میں ہے تو ہمیں اپنے طرزِ عمل پہ سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔

آج کی یہ ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ ''مسلکِ اعلیٰ حضرت زندہ باد'' کا نعرہ تو پوری شدت کے ساتھ بلند کیا جاتا ہے مگر جب اسی مسلک کو امام احمد رضا کی فکر، ان کے مشن اور ان کے عملی منصوبے کی روشنی میں زندہ کرنے کی بات آتی ہے تو قدم سست پڑ جاتے ہیں، عزم ماند پڑ جاتا ہے اور ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ زبانوں پہ عقیدت کا جوش ہوتا ہے مگر ہاتھوں میں عمل کی حرارت کم دکھائی دیتی ہے۔ محبت کے دعوے بہت ہیں مگر مشن کی ذمہ داریاں اٹھانے والے کم ہیں۔

یاد رکھیے! امام احمد رضا کو صرف اس بات کی ضرورت نہیں تھی کہ

ان کے نام کے نعرے لگائے جائیں، وہ تو ایسی نسل تیار کرنا چاہتے تھے جو علم میں پختہ ہو، کردار میں بلند ہو، فکر میں بیدار ہو، قلم میں مؤثر ہو، دعوت میں سرگرم ہو اور ملت کے درد کو اپنا درد سمجھے۔ ان کی خواہش یہ نہ تھی کہ ان کے نام پہ صرف محفلیں سجیں، بلکہ یہ تھی کہ ان کی فکر سے معاشرہ سنورے، ان کے اصولوں سے ادارے مضبوط ہوں اور ان کے مشن سے امت کو نئی زندگی ملے۔

تاریخ کا ایک اٹل اصول ہے کہ عظیم شخصیات کی عظمت صرف ان کے نام کے ورد سے محفوظ نہیں رہتی بلکہ ان کے افکار کو زندگی کا حصہ بنانے سے باقی رہتی ہے۔ جو قومیں اپنے اکابر کا مشن اپناتی ہیں، وہ تاریخ میں زندہ رہتی ہیں اور جو صرف ان کے ناموں کو شعار بنا لیتی ہیں، وہ رفتہ رفتہ اپنے اصل سرمائے سے محروم ہو جاتی ہیں۔

آج ضرورت اس بات کی نہیں کہ ہم امام احمد رضا کے فضائل میں چند اور تقریریں کرلیں بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ان کے اس دس نکاتی پروگرام کو اپنے مدارس، اپنی مساجد، اپنی خانقاہوں، اپنی تنظیموں، اپنی صحافت، اپنے تعلیمی اداروں اور اپنی اجتماعی زندگی کا عملی دستور بنا دیں۔ یہی ان سے حقیقی محبت ہے، یہی ان کے علم کا حق ہے، یہی ان کے مشن کی وفاداری ہے اور یہی مسلکِ اعلیٰ حضرت کی سچی ترجمانی بھی۔

آیئے! ہم اپنے گریبان میں جھانکیں، اپنے نعروں کا محاسبہ کریں، اپنی ترجیحات کا ازسرِنو جائزہ لیں اور یہ عہد کریں کہ آئندہ ہماری شناخت صرف یہ نہیں ہوگی کہ ہم مسلکِ اعلیٰ حضرت کے ماننے والے ہیں بلکہ ہماری عملی زندگی گواہی دے گی کہ ہم امام احمد رضا کے فکر و مشن کے امین بھی ہیں۔

کیونکہ آنے والی نسلیں ہم سے یہ نہیں پوچھیں گی کہ تم نے کتنے نعرے لگائے تھے، وہ یہ ضرور پوچھیں گی کہ تم نے امام احمد رضا کی صدیوں پہ محیط یہ فکر اپنی زندگی، اپنے اداروں اور اپنی ملت میں کتنا نافذ کیا تھا۔ یہی سوال ہمارا احتساب بھی ہے اور یہی ہمارے مستقبل کی کامیابی کا واحد راستہ بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز نے ملت کو صرف ایک نظریہ نہیں دیا بلکہ عمل کا ایک مکمل نقشۂ راہ (road map) عطا فرمایا۔ اب فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ ہم ان کے نام کے محافظ بنتے ہیں یا ان کے مشن کے امین۔ تاریخ ہمیشہ انہی لوگوں کو یاد رکھتی ہے جو اپنے اکابر کی عظمت کا چرچا ہی نہیں کرتے بلکہ ان کی فکر کو زمانے کی نبض، ان کے اصولوں کو زندگی کا دستور اور ان کے مشن کو اپنی اجتماعی جدوجہد کا محور بنا دیتے ہیں۔

امام احمد رضا کا یہ دس نکاتی اصلاحی پروگرام درحقیقت ایک ایسی فکری دستاویز ہے جس میں تعلیم و تربیت، دعوت و اصلاح، علم و تحقیق، تنظیم و قیادت، قلم و صحافت، ابلاغ و اشاعت اور ملت کی اجتماعی تعمیر کے وہ تمام بنیادی اصول جمع کر دیے گئے ہیں جن پہ کسی بھی زندہ، باوقار اور خوددار دینی معاشرے کی بنیاد استوار ہو سکتی ہے۔

یہ محض چند تجاویز یا وقتی ہدایات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر فکری منشور ہے، جس میں فرد کی اصلاح سے لے کر ملت کی اجتماعی تشکیل تک اور علم کی آبیاری سے لے کر تہذیب کے تحفظ تک، ہر مرحلے کے لیے واضح رہنمائی موجود ہے۔

اس پروگرام کا ہر نکتہ اپنے اندر ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتا ہے اور مجموعی طور پہ یہ ایک ایسا مربوط نظامِ فکر پیش کرتا ہے جس میں دین کی روح، زمانے کی ضرورت اور ملت کی مصلحت ایک حسین امتزاج کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ امام احمد رضا کی دور اندیش نگاہ نے جن اصولوں کی نشان دہی ایک صدی قبل کی تھی، وہ آج بھی اسی تازگی اور معنویت کے ساتھ اہلِ علم، اہلِ دعوت اور ملت کی قیادت کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس پروگرام کو صرف ایک تاریخی دستاویز کے طور پہ نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ اسے تعمیرِ ملت کا ایک زندہ منشور، فکری استحکام کا معتبر سرچشمہ اور دینی قیادت کے لیے ایک دائمی دستورِ عمل کی حیثیت حاصل ہے۔ جب تک علم کو عزت، اہلِ علم کو اعتماد، اہلِ قلم کو سرپرستی، تنظیم کو استحکام اور دعوت کو حکمت کے ساتھ فروغ دینے کی ضرورت باقی ہے، اس وقت تک یہ دس نکاتی پروگرام اپنی افادیت، تازگی اور رہنمائی کے اعتبار سے زندہ رہے گا اور ہر دور کے مخلص اہلِ فکر کے لیے

مشعلِ راہ بنتا رہے گا۔

وقت کی گرد اس کی معنویت ماند نہیں کر سکی بلکہ ہر نئے دور نے اس کی بصیرت مزید نمایاں اور اس کی افادیت مزید روشن کر دی ہے۔

زمانے بدلتے رہے، حالات نے نئے رخ اختیار کیے، فکری چیلنجز کی نوعیت تبدیل ہوتی رہی اور معاشرتی ترجیحات میں بھی تغیر آتا رہا مگر اس منشور کے اصول اپنی حکمت، جامعیت اور دوراندیشی کے باعث ہر عہد میں یکساں طور پہ قابلِ عمل اور رہنما ثابت ہوئے۔ یہی کسی عظیم فکر کی شناخت ہے کہ وہ اپنے زمانے کی قید میں محصور نہیں رہتی بلکہ آنے والے ادوار کے تقاضوں سے بھی ہم آہنگ رہتی ہے۔

آج جب امت علمی انتشار، فکری بے سمتی، تہذیبی یلغار اور تنظیمی کمزوری جیسے متعدد مسائل سے دوچار ہے تو اس پروگرام کا مطالعہ یہ احساس تازہ کر دیتا ہے کہ امام احمد رضا نے جن بنیادوں کی نشان دہی ایک صدی قبل کی تھی، وہ دراصل ہر دور کی تعمیر واصلاح کا ناگزیر سرمایہ ہیں۔ ان کی فکر کا چراغ وقت کے طوفانوں سے بجھنے کی بجائے مزید فروزاں ہوا ہے اور ہر گذرتا زمانہ اس حقیقت پر ایک نئی شہادت ثبت کرتا ہے کہ بصیرتِ ایمانی سے جنم لینے والے افکار نہ زمانے کی گردش سے فرسودہ ہوتے ہیں اور نہ حالات کی تبدیلی سے اپنی تاثیر کھوتے ہیں بلکہ وہ ہر نئے عہد میں نئی معنویت، نئی تازگی اور نئی رہنمائی کے ساتھ اہلِ فکر و دانش کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں۔

اگر ہم واقعی اپنے اکابر سے وفاداری کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان کے افکار کو کتابوں کے صفحات سے نکال کر اپنی زندگیوں، اپنے اداروں، اپنے مدارس، اپنی مساجد، اپنی خانقاہوں، اپنی صحافت، اپنی دعوتی سرگرمیوں اور اپنی اجتماعی منصوبہ بندی کا حصہ بنانا ہوگا۔ یہی وہ راستہ ہے جو محبت کو عمل میں، عقیدت کو خدمت میں اور نسبت کو ذمہ داری میں تبدیل کرتا ہے۔

کیونکہ اکابر سے حقیقی وابستگی کا معیار صرف ان کے تذکرے کرنا، ان کے ایام منانا یا ان کے نام پہ محفلیں آراستہ کرنا نہیں بلکہ ان کے افکار کو اپنے کردار، اپنے فیصلوں اور اپنی اجتماعی ترجیحات میں زندہ رکھنا ہے۔

جب تک ہمارے تعلیمی ادارے ان کی تعلیمی بصیرت سے، ہماری دعوتی تحریکیں ان کی حکمت سے، ہماری دینی قیادت ان کی دور اندیشی سے، ہمارے اہلِ قلم ان کے اخلاص سے اور ہماری اجتماعی منصوبہ بندیاں ان کے اصلاحی منہج سے فیض یاب نہیں ہوں گی، اس وقت تک ہماری عقیدت اپنی حقیقی روح سے محروم رہے گی۔ زندہ قومیں اپنے اکابر کو صرف یاد نہیں کرتیں بلکہ ان کے افکار کو اپنے عہد کی زبان عطا کرتی ہیں، ان کے اصولوں کو اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق نافذ کرتی ہیں اور ان کی امانت کو آئندہ نسلوں تک پوری دیانت کے ساتھ منتقل کرتی ہیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم شخصیتوں کے تذکرے سے آگے بڑھ کر ان کا مشن اپنائیں، نعروں سے آگے بڑھ کر کردار کی تعمیر کریں اور جذباتی وابستگی سے آگے بڑھ کر علمی، فکری اور عملی میدان میں ان کی میراث کے امین بنیں۔ یہی اکابر کے ساتھ سچی وفاداری ہے، یہی ان کے فیضان کا حق ہے اور یہی وہ طرزِ عمل ہے جو ملت کو فکری استحکام، دینی وقار، تنظیمی قوت اور تہذیبی اعتماد عطا کر سکتا ہے۔ جب محبت عمل کا روپ اختیار کر لیتی ہے تو تاریخ بنتی ہے اور جب نسبت ذمہ داری میں ڈھل جاتی ہے تو قوموں کے مقدر سنورنے لگتے ہیں۔

یہی امام احمد رضا قدس سرہٗ العزیز کے دس نکاتی اصلاحی پروگرام کا ابدی پیغام ہے، یہی ان کی دوراندیشی کا زندہ ثبوت ہے اور یہی ملت کی علمی بیداری، فکری استحکام، دعوتی قوت، تنظیمی وحدت اور اجتماعی سربلندی کی حقیقی ضمانت بھی۔ جب تک یہ فکر ہمارے کردار، ہماری ترجیحات اور ہمارے اجتماعی نظام میں جلوہ گر نہیں ہوتی، اس وقت تک ہماری عقیدت اپنی تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ اور جس دن یہ فکر ہماری عملی زندگی کا حصہ بن جائے گی، اسی دن امام احمد رضا کا اصلاحی مشن اپنی حقیقی معنویت کے ساتھ ہمارے معاشرے میں دوبارہ زندہ ہوتا ہوا نظر آئے گا۔

□□□□

محمد ملک الظفر سہسرامی

بشارتِ مجددیت: ایک روحانی وصیت نامے کا تجزیاتی مطالعہ

روحانی پیش گوئیاں اور تاریخ

تاریخِ اسلام کے بعض صفحات ایسے بھی ہیں جو صرف گذرے ہوئے واقعات کا بیان نہیں بلکہ روحانی شعور، ایمانی بصیرت اور مردانِ حق کی دوررس نگاہ کا آئینہ ہوتے ہیں۔ ان میں وقت کی گرد سے زیادہ نور کی چمک محسوس ہوتی ہے اور لفظوں کے پس منظر میں ایک ایسی خموش معرفت بولتی سنائی دیتی ہے جو آنے والے زمانوں کے نقوش پہلے ہی پڑھ لیتی ہے۔

بعض تحریریں اپنے عہد کے حدود میں مقید نہیں رہتیں، وہ صدیوں آگے کھڑے زمانوں سے مکالمہ کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کے جملوں میں محض تاریخ کی بازگشت نہیں ہوتی بلکہ مستقبل کے دھندلکوں میں چھپی ہوئی حقیقتوں کے روشن اشارے بھی ہوتے ہیں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وقت ابھی جس راستے پر پہنچا نہیں، یہ تحریریں وہاں کی چاپ پہلے ہی سن چکی ہوں۔

وہ محض الفاظ نہیں ہوتیں بلکہ وجدان کی وہ روشن لہریں ہوتی ہیں جو صدیوں کے فاصلے طے کر کے آنے والے ادوار کے فکری اتار چڑھاؤ کو پہلے ہی محسوس کر لیتی ہیں۔

بعض اوقات کسی درویش کی خموشی، کسی ولی کی گہری سانس، یا کسی صاحب دل کے لبوں سے نکلنے والا مختصر سا جملہ بعد کے زمانوں میں ایک مکمل تاریخ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس وقت سامعین شاید ان الفاظ کی گہرائی پوری طرح نہ سمجھ پاتے ہوں، مگر وقت جب اپنے پردے ہٹاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جملے محض گفتگو نہ تھے بلکہ تقدیر کے اوراق پر ثبت ہونے والی ایک روحانی شہادت تھے۔

یہی وہ مقامات ہوتے ہیں جہاں تاریخ اور روحانیت ایک دوسرے سے ہم آغوش دکھائی دیتی ہیں۔ عقل حیران رہ جاتی ہے کہ ایک محدود انسانی نگاہ آنے والے صدیوں کے فتنوں، شخصیات اور فکری معرکوں کو کس طرح دیکھ لیتی ہے۔ مگر اہلِ دل کے نزدیک یہ حیرت کی بات نہیں کیونکہ قربِ الٰہی انسان کے باطن کو وہ نور عطا کر دیتا ہے جس سے وقت کی دھندلی راہیں بھی بہت حد تک روشن ہو جاتی ہیں۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مشیتِ الٰہی بعض عظیم شخصیات کی آمد سے پہلے ہی ان کے ذکر کے چراغ جلا دیتی ہے، تاکہ آنے والے زمانے جان لیں کہ یہ ہستیاں محض اتفاقِ زمانہ نہیں بلکہ تقدیرِ امت کے عظیم سلسلے کی منتخب کڑیاں ہیں۔

کبھی کسی خانقاہ کے سکوت میں ان کا تذکرہ ہوتا ہے، کبھی کسی درسگاہ کے گوشے میں ان کی بشارت دی جاتی ہے اور کبھی کسی مردِ خدا کی زبان سے ان کے اوصاف اس طرح بیان ہوتے ہیں کہ آنے والی صدیوں کے لوگ انہیں پڑھ کر حیرت اور عقیدت کے درمیان کھڑے رہ جاتے ہیں۔

شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شیرازی شاہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۱۰۰۰ھ ۱۱۷۰ھ) کا یہ وصیت نامہ اور پیش گوئی بھی اسی نوعیت کی ایک غیر معمولی روحانی دستاویز ہے۔

یہ محض کسی بزرگ کی عقیدت مندانہ رائے نہیں بلکہ ایک صاحبِ کشف و ولایت ہستی کا وہ وجدانی اعلان ہے جس میں آنے والے فتنوں کی نشاندہی بھی ہے، ان کے مقابلے میں اٹھنے والی ایک عظیم علمی

وروحانی شخصیت کی خبر بھی اور اپنے متعلقین کے لیے ایک واضح فکری و اعتقادی سمت بھی۔

اس وصیت نامے کے الفاظ میں صرف نصیحت کی سادگی نہیں بلکہ باطن کی وہ حرارت محسوس ہوتی ہے جو صدیاں گذر جانے کے باوجود اپنی تاثیر قائم رکھتی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک درویشِ کامل اپنی خلوتِ روحانیت سے آنے والے زمانوں کے ہنگامے دیکھ رہا ہو، امت کے فکری انتشار کو محسوس کر رہا ہو اور پھر اپنی روحانی بصیرت کی روشنی میں اہلِ حق کے لیے ایک چراغ راہ چھوڑ رہا ہو۔

یہ تحریر محض ایک تاریخی نوشتہ نہیں بلکہ ایک ایسا روحانی اشارہ ہے جس میں عقیدت بھی ہے، بصیرت بھی، پیش گوئی بھی ہے، فکری رہنمائی بھی اور سب سے بڑھ کر حق کے اس سلسلۂ نور کی جھلک بھی، جو ہر دور میں امت کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کے ذریعے جاری رکھتا ہے۔

اس واقعے کا سب سے پہلا قابلِ غور پہلو اس کی فضا اور کیفیت ہے۔ حضرت درس دے رہے ہیں، اچانک خموش ہو جاتے ہیں، تین مرتبہ گہری سانس لیتے ہیں، سکوت طاری ہو جاتا ہے، پھر زبان پر "سبحان اللہ، الحمدللہ، اللہ اکبر" جاری ہو جاتا ہے۔

یہ کیفیت محض جذباتی واردات نہیں بلکہ صوفیانہ روایت میں اس نوع کے سکوت کو "توجہِ غیبی" اور "القائے ربانی" کی تمہید سمجھا جاتا ہے۔

اہلِ تصوف کے نزدیک بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں جب ظاہر کی دنیا اچانک مدھم پڑنے لگتی ہے اور باطن کے دریچے کسی نامعلوم نور کی طرف کھل جاتے ہیں۔ اس وقت زبان خموش ہو جاتی ہے مگر دل بولنے لگتا ہے، نگاہ ساکت دکھائی دیتی ہے مگر روح ایک اور جہان کی طرف متوجہ ہو چکی ہوتی ہے۔

صوفیاء نے ان کیفیات کو محض وجدانی ہیجان نہیں کہا بلکہ انہیں "وارداتِ قلبیہ" اور "تجلیاتِ غیبیہ" کے ابتدائی آثار میں شمار کیا ہے۔ بسا اوقات ایک مردِ خدا درس و تدریس یا گفتگو کے درمیان اچانک خموش ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے باطن پر کسی اور عالم کی دستک اتر رہی ہوتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب محسوسات کی دنیا پیچھے رہ جاتی ہے اور روح ایک ایسی لطیف حقیقت کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے جسے عام نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں۔

شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی یہ کیفیت بھی اسی روحانی سکوت کی آئینہ دار محسوس ہوتی ہے۔ تین مرتبہ گہری سانس لینا، خموش بیٹھ جانا، پھر تسبیح و تہلیل کے کلمات زبان پر جاری ہونا -- یہ سب اس بات کی علامت ہے کہ دل پر کوئی غیر معمولی واردات اتر رہی ہے۔ گویا ایک صاحب دل ہستی کے باطن میں مستقبل کے پردے ہل رہے ہیں اور آنے والے زمانوں کی کوئی جھلک ان کے سامنے روشن ہو رہی ہے۔

اسی لیے صوفیانہ روایت میں خموشی کو ہمیشہ خالی پن نہیں سمجھا گیا۔ بعض خموشیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے اندر پورے زمانوں کی صدائیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ بعض سکوت ایسے ہوتے ہیں جن میں الفاظ سے زیادہ معانی بولتے ہیں۔ اور کبھی ایک مختصر توقف صدیوں پر محیط ایک روحانی اعلان کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔

گویا ایک روحانی مکاشفہ نزول پذیر ہے اور ایک صاحبِ دل ہستی مستقبل کے پردوں میں جھانک رہی ہے۔

پھر جو الفاظ ادا ہوتے ہیں وہ صرف ایک شخصیت کی تعریف نہیں کرتے بلکہ پورے ایک عہد کی تصویر اجاگر کرتے ہیں۔

ان جملوں میں محض کسی فرد کے اوصاف بیان نہیں کیے گئے بلکہ آنے والے زمانے کے فکری انتشار، اعتقادی کشمکش اور روحانی معرکوں کی ایک مکمل جھلک سمو دی گئی ہے۔ گویا ایک صاحبِ بصیرت ہستی وقت کے افق پر ابھرتے ہوئے اندھیروں کو بھی دیکھ رہی ہے اور انہی اندھیروں کے درمیان روشن ہونے والے ایک چراغ کی خبر بھی دے رہی ہے۔

ان الفاظ کے پس منظر میں محض عقیدت کی گرمی نہیں بلکہ فراستِ مومن کی وہ گہرائی کارفرما ہے جو زمانے کے بدلتے تیور، افکار کے بہکتے

راستے اور امت کے منتشر ہوتے شعور کو پہلے ہی محسوس کر لیتی ہے۔

اسی لیے یہ عبارتیں صرف تعریفی کلمات نہیں بلکہ ایک روحانی تنبیہ بھی ہیں، ایک فکری اشارہ بھی اور اہلِ حق کے لیے ایک خموش پیغام بھی کہ جب باطل کے شور بلند ہوں گے، جب عقائد کی بنیادیں متزلزل کرنے کی کوشش کی جائے گی اور جب دین کو محض ظاہری مباحث تک محدود کر دیا جائے گا، تب اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے ذریعے حق کی شمع پھر روشن فرمائے گا۔ گویا یہ تحریر صرف ایک فرد کی عظمت کا بیان نہیں بلکہ اس نورانی سلسلے کی نشاندہی ہے جو ہر دور کے اندھیروں میں امت کے لیے مینارۂ نور بن کر ابھرتا رہا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان الفاظ میں آج بھی ایک عجیب تازگی، ایک روحانی حرارت اور ایک غیر معمولی تاثیر محسوس ہوتی ہے، جیسے وقت بدل گیا ہو مگر ان کے اشارے ابھی تک زمانے کے سینے میں زندہ ہوں۔

یہ الفاظ اپنے اندر پیش گوئی کی سنجیدگی بھی رکھتے ہیں اور روحانی شہادت کی حرارت بھی۔ ان میں عقیدت کا جذبہ ضرور ہے مگر اس سے کہیں زیادہ ایک ایسی یقین آفریں کیفیت ہے جو کسی باطنی مشاہدے کے بغیر ممکن محسوس نہیں ہوتی۔ ایسا لگتا ہے جیسے تاریخ ابھی اپنے پردوں میں تھی مگر ولایت کی نگاہ نے اس کے دھندلے نقوش پہلے ہی پڑھ لیے تھے۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کلمات میں صرف ایک مردِ حق کی آمد کی خبر نہیں دی گئی بلکہ اس کے مشن، اس کی جدوجہد، اس کے فکری معرکوں اور اس کے روحانی مزاج تک کی نشان دہی کر دی گئی۔ ان اشاروں میں ایک ایسے مردِ درویش کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو علم کو محض ذہنی برتری کا وسیلہ نہیں بلکہ دین کی حفاظت کی امانت سمجھتا ہوگا، جو عشقِ رسول ﷺ کو صرف جذباتی وابستگی نہیں بلکہ ایمان کی روح قرار دے گا، جو قلم بھی اٹھائے گا تو دفاعِ حق کے لیے اور زبان بھی کھولے گا تو امت کے عقائد کی پاسبانی کے لیے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ الفاظ کسی ایک فرد کے ظاہری کمالات بیان نہیں کر رہے بلکہ اس باطنی قوت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو ایک ہنگامہ خیز دور میں امت کے منتشر اذہان کو پھر مرکزِ حق کی طرف لوٹانے والی تھی۔

اس میں ایک ایسے مجاہدِ علم و عشق کی تصویر ابھرتی ہے جو بیک وقت فقاہت کا وقار بھی رکھتا ہو، تصوف کی لطافت بھی، عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی حرارت بھی اور ردِّ باطل کی شمشیر بھی اور شاید یہی اس وصیت نامے کا سب سے حیرت انگیز پہلو ہے کہ اس میں محض ایک شخصیت کی ولادت یا عظمت کا ذکر نہیں بلکہ اس کے ذریعے برپا ہونے والی علمی بیداری، فکری تجدید اور روحانی احیا کی پوری فضا پہلے ہی محسوس کی جا سکتی ہے۔ گویا ایک صاحبِ کشف کی نگاہ صدیوں پہلے ہی دیکھ رہی تھی کہ جب زمانہ فتنوں کے غبار میں الجھ جائے گا تب اسی چراغ سے روشنی پھوٹے گی اور اسی آواز سے اہلِ حق کو پھر اپنی پہچان ملے گی۔ فتنوں کا ذکر ہے تو ان کے مقابل سینہ سپر ہو جانے والی استقامت کی خوشبو بھی ساتھ چلتی محسوس ہوتی ہے، ایسی استقامت جو نہ زمانے کے دباؤ سے جھکتی ہے، نہ مخالفتوں کی گرد میں اپنی سمت کھوتی ہے بلکہ ہر آزمائش کے درمیان اور زیادہ روشن ہو کر سامنے آتی ہے۔ اندھیروں کی بات کی گئی ہے تو ساتھ ہی اس نور کی بشارت بھی دے دی گئی ہے جو انہی تاریکیوں کو چیر کر اہلِ حق کے لیے راستہ بنائے گا۔ گویا مایوسی کے ہر منظر کے ساتھ امید کا ایک چراغ بھی روشن کر دیا گیا ہو۔ قلمی جہاد کا ذکر آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہاں صرف الفاظ کی جنگ مراد نہیں بلکہ اس کے پیچھے صدیوں پر محیط ایک روحانی و اعتقادی تاریخ سانس لے رہی ہے۔

اس کے پس منظر میں عشقِ رسول ﷺ کی وہ بے قرار حرارت موجود ہے جس نے اہلِ ایمان کے دلوں کو ہمیشہ زندہ رکھا، تعظیمِ اہلِ بیت اطہار رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی وہ نورانی روایت جھلکتی ہے جس نے امت کے وجدان کو ادب و محبت سے معمور کیا، اور دفاعِ عقیدہ کی وہ مسلسل جدوجہد بھی نمایاں دکھائی دیتی ہے جس میں اہلِ حق نے ہر دور کے فتنوں کے مقابل اپنے قلم، اپنی زبان اور اپنے کردار کو سپر بنایا۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ تحریر محض کسی ایک شخصیت کی تعریف نہیں بلکہ حق کے ایک پورے کارواں کی داستان ہو۔ ایسا

کارواں جس کے چراغ علم سے روشن ہیں، جس کی راہوں میں عشق کی حرارت ہے، جس کی بنیاد عقیدے کی حفاظت پر قائم ہے اور جس کی منزل رضائے مصطفیٰ ﷺ ہے۔ ان الفاظ میں عجیب طرح کی روحانی گونج سنائی دیتی ہے۔ وہ قاری کو صرف ماضی کے واقعات نہیں سناتے بلکہ اسے یہ احساس بھی دلاتے ہیں کہ جب کبھی امت فکری انتشار، اعتقادی اضطراب اور روحانی کمزوری کی شکار ہوئی، تب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے مخصوص بندوں کے ذریعے پھر حق کی شمع روشن فرمائی۔ گویا یہ وصیت نامہ محض ایک تاریخی دستاویز نہیں بلکہ صدیوں کے فاصلے سے آنے والی ایک زندہ آواز ہے، جو آج بھی اہلِ دل کو یقین، محبت، استقامت اور دفاعِ حق کا درس دے رہی ہے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض الفاظ نہیں بلکہ ایک روحانی نقشہ ہے---ایسا نقشہ جس میں آنے والی صدیوں کے فکری اتار چڑھاؤ، دینی معرکے اور ایک مجدد کی عظمت پہلے ہی ثبت کر دی گئی ہو۔ پھر جب تاریخ آگے بڑھتی ہے اور وہ شخصیت اپنے آثار کے ساتھ سامنے آتی ہے تو انسان حیرت سے محسوس کرتا ہے کہ بعض اہلِ دل صرف اپنے زمانے کی شخصیت نہیں ہوتے، وہ آنے والے وقتوں کی دھڑکن بھی سن لیتے ہیں۔

حضرت فرماتے ہیں کہ "چودہویں صدی ہجری میں ایک ایسا فتنہ اٹھے گا جو رسالت و نبوت کے انکار کا سبب بنے گا اور ماحول میں اندھیرا پھیلا دے گا۔"

یہ جملہ محض ایک عمومی پیش گوئی نہیں۔ اس میں "فتنہ"، "اندھیرا"، "گمراہی" اور "رسالت کے انکار" جیسے الفاظ اس آنے والے فکری طوفان کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس نے برصغیر میں عقائدِ اہلِ سنّت کو شدید آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب صرف سیاسی نقشے نہیں بدل رہے تھے بلکہ ذہنوں کی ساخت بھی تبدیل ہو رہی تھی۔ استعمار کی یلغار نے جہاں زمینوں کو غلام بنایا وہیں افکار کے قدموں میں بھی بیڑیاں ڈالیں، پاکیزہ تصورات کے اوراق منتشر کر دیے۔

قدیم علمی روایتیں کمزور ہونے لگیں، خانقاہوں کی روحانی فضا پر سوال اٹھنے لگے اور مذہب کو عقلِ محض یا سیاسی مصلحتوں کے ترازو میں تولنے کا رجحان بڑھنے لگا۔ اسی فکری انتشار کی تصویر کشی کرتے ہوئے پاکستان کے معروف محقق اور قدر شناس دانشور ڈاکٹر اسحاق قریشی لکھتے ہیں کہ:

"دور زوال میں بہت سی قد آور شخصیات پیدا ہوئیں جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی شمع یقین کو روشن رکھا۔ تاریخ نگار اور صداقت پسند طالب علم کی جبین عقیدت ان سب کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔ ان میں ایک نہایت بلند بام شخصیت بھی ہے جس کے بارے میں عربی ادب کے نامور استاد، ادبیات عربی کے شہرت یافتہ محقق اور ایک مشہور مستشرق آرائے نکلس نے یہ کہہ کر اعتراف کیا تھا۔ نکلس نے لکھا کہ:

"زوال بغداد کے بعد مسلمان علماء میں سے اُسے کسی ایک کا انتخاب کرنے کو کہا جائے تو وہ بغیر کسی توقف کے امام سیوطی علیہ الرحمہ کا نام لے گا۔

R.A.Nicholson A Literary History of the Arabs

صفحہ 455

اس گراں قدر تبصرے پہ موصوف اپنے تأثرات پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''امام السیوطی علیہ الرحمہ کی علمی کاوشوں کو کسی محدود دائرے میں اسیر نہیں کیا جا سکتا، تفسیر سے ادب تک، لغت سے نحو تک، تاریخ سے سوانح تک، سیرت سے خصائص تک جس حوالے سے بھی نظر اُٹھائیں امام السیوطی کی ذات فیض بار نظر آتی ہے۔ اس قدر متنوع اصناف پر اس اعتماد سے بے تکان لکھتے جانا کسی کرم خاص کا مظہر محسوس ہوتا ہے۔

میں بلا خوف تردید اسی قسم کا دعویٰ فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کے بارے میں کرنے میں راحت پاتا ہوں۔ وہی ماحول، ایسی ہی زوال آشنا قوم، ویسے ہی چوپائی حملے، چہار جانب دندناتے فتنوں کے سامنے سینہ سپر ہو جانا کسی توفیق پائے ہوئے مرد مجاہد ہی کا حوصلہ ہے۔

یہ بات امام السیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دنیا کو سمجھا دی کہ تسلیم و رضا میں استقامت کا وہی شخص حق ادا کر سکے گا جو اپنے مرکزِ یقین کے خصائص، خصائل، شمائل سے باخبر ہوگا اور وجود کی عظمتوں سے بھی آگاہ ہوگا بلکہ یہ آگاہی اُس کا وجدانی اعتراف بن چکی ہو، حملے اُن پر بھی ہوئے کہ اس اعتراف میں دین کا استحکام تھا اور فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ پر بھی ہوئے کہ اس اعتراف کا حوصلہ نہ رہا تھا۔"

(ماہنامہ نورِ مصطفیٰ پٹنہ کا امام اہلِ سنّت نمبر صفحہ 287,288)

ایسے ماحول میں کئی فکری اور نظریاتی فتنے مختلف ناموں اور نعروں کے ساتھ سامنے آئے مگر ان سب کا ہدف کسی نہ کسی درجے میں عظمتِ رسالت، مرکزیتِ مصطفیٰ ﷺ اور امت کے روحانی تسلسل کو کمزور کرنا تھا۔

سب سے ہولناک فتنہ وہ تھا جس نے ختمِ نبوت کے مقدس عقیدے کو نشانہ بنایا۔

مرزا غلام احمد قادیانی (1835ء/1908ء) کی تحریک نے ابتدا میں اصلاح اور روحانیت کے نام پر قدم رکھا، مگر رفتہ رفتہ دعویٰ مسیحیت، مہدویت اور پھر نبوت تک جا پہنچی۔ یہ محض ایک شخص کا دعویٰ نہ تھا بلکہ عقیدۂ ختمِ نبوت پر براہِ راست حملہ تھا، جو اسلام کی اساسات میں سے ایک ہے۔ اس فتنے نے امت کے عقیدے، اس کے فکری اتحاد اور ناموسِ رسالت ﷺ کے تصور کو شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ نبوت کا آخری اور کامل دروازہ دوبارہ کھولنے کی یہ جسارت دراصل اُس روحانی مرکز کو متزلزل کرنے کی کوشش تھی جس پر پوری امت کی وحدت قائم تھی۔

محمد بن عبد الوہاب نجدی (1703ء/1792ء) کے زیرِ اثر چلائی جانے والی تحریک وہابیت نے اپنے مخصوص مزاج کے ساتھ جب برصغیر میں قدم رکھے تو اس نے صدیوں سے قائم روحانی روایتوں، اولیاء اللہ کی تعظیم، مزارات کے اداب اور توسلات و معمولاتِ اہلِ سنّت پر شدید تنقید کی۔ اس تحریک کا اصل زور ایک خشک ظاہریت پر تھا، جس میں عشق کی لطافت کم اور ردو انکار کی شدت زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ امت کے روحانی ذوق میں ایک سختی پیدا ہونے لگی اور وہ فضا، جس میں محبتِ رسول ﷺ اور تعظیمِ اولیاء ایمان کی حلاوت سمجھی جاتی تھی، اس پر اعتراضات کے بادل چھانے لگے۔

دیوبندیت اور ندویت اپنے آغاز میں ایک تعلیمی و اصلاحی تحریک کے طور پر سامنے آئیں، مگر بعد کے ادوار میں ان کے بعض اکابر کی توہین آمیز عبارات نے شدید علمی و اعتقادی نزاعات کو جنم دیا۔ خصوصاً انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علم، حضور ﷺ کی شانِ علمیہ اور بعض مقامات پر تقابلی اسلوب نے اہلِ سنّت کے حلقوں میں سخت اضطراب پیدا کیا۔ یہی وہ ماحول تھا جس میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۱۸۵۶ء/۱۹۲۱ء) نے اپنے قلم کو سپر بنایا اور "حسام الحرمین" جیسی تصنیفات کے ذریعے ان عبارات کا محاسبہ کیا۔ ان کی جدوجہد محض شخصی اختلاف نہ تھی بلکہ وہ اسے عظمتِ رسالت ﷺ کے دفاع کا مسئلہ سمجھتے تھے۔

اسی دور میں رافضیت نے بھی نئے انداز میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اہلِ بیتِ اطہار کی محبت ہمیشہ اہلِ سنّت کے ایمان کا حصہ رہی مگر بعض انتہا پسند رجحانات نے اس محبت کو صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی تنقیص کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی۔ یوں امت کے اس توازن کو نقصان پہنچنے لگا جس میں محبتِ اہلِ بیت اطہار اور تعظیمِ صحابۂ کرام دونوں ایک ہی ایمان کے دو روشن پہلو سمجھے جاتے تھے۔

نیچریت اور سرسید (1817ء/1898ء) کی عقلیت پسندی نے ایک اور رخ سے دین کو متاثر کیا۔ معجزات کی عقلی تاویلات، فرشتوں اور غیبی حقائق کی جدید تعبیرات اور مذہب کو مغربی فلسفے کے مطابق ڈھالنے کی کوشش نے ایمان کی سادہ اور روحانی فضا کمزور کی۔ عقل کو وحی پر فوقیت دینے کا رجحان بڑھا تو مذہب رفتہ رفتہ ایک خشک فکری نظام بنتا چلا گیا۔

ان تمام فتنوں میں اگر کوئی مشترک پہلو تھا تو وہ یہی تھا کہ کسی نہ

کسی صورت میں امت کے روحانی مرکز--- یعنی ذاتِ مصطفیٰ ﷺ--- کے گرد قائم محبت، ادب، تعظیم اور عقیدت کا مضبوط حصار کمزور کیا جائے۔ کہیں ختمِ نبوت کو چیلنج کیا گیا، کہیں عظمتِ رسالت کے تصورات محدود کیے گئے، کہیں اختیاراتِ مصطفیٰ کے پاکیزہ اسلامی تصور پہ تیشہ کاری کی گئی، کہیں اولیاء و اہلِ بیت کے تعلق کو مشتبہ بنایا گیا اور کہیں عقلِ محض کے نام پر روحانی حقائق فراموش کرنے کی کوشش ہوئی۔ ایسے ہی تاریک ماحول میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک محافظِ عقیدۂ اہلِ سنّت، عاشقِ رسول ﷺ اور مجددانہ بصیرت رکھنے والے عالم کی حیثیت سے سامنے آئے۔ ان کا قلم محض مناظرے کا ہتھیار نہیں تھا بلکہ عشقِ رسول ﷺ کے قلعے کی حفاظت کرنے والی تلوار تھا۔ انہوں نے فتاوے، رسائل، مناظروں اور نعتیہ ادب کے ذریعے نہ صرف اہلِ سنّت کے عقائد حقہ صحیحہ کی وضاحت کی بلکہ امت کے روحانی ذوق، ادبِ رسالت اور محبتِ اہلِ بیت کو بھی ایک نئے وقار کے ساتھ زندہ کیا۔

یوں شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پیش گوئی میں مذکور ''اندھیرا'' محض ایک استعارہ نہ تھا۔ وہ دراصل اسی فکری انتشار، اعتقادی اضطراب اور روحانی زوال کی طرف اشارہ تھا جس نے برصغیر کے دینی منظرنامے کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اور اسی اندھیرے کے مقابل ایک ''احمد'' کو کھڑا ہونا تھا، جو اپنے قلم، اپنے عشق اور اپنی بے خوفی کے ساتھ اس دور کے فتنوں کا جواب بن جائے۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے سنگم پر جب مختلف فکری تحریکیں، انکاری رجحانات اور نبوت و رسالت کے باب میں بے احتیاطیاں سامنے آئیں تو یہی وہ ماحول تھا جسے اس پیش گوئی میں ''اندھیرا'' کہا گیا تھا۔ اس کے بعد حضرت کا یہ فرمان کہ ''اس وقت احمد نام کا ایک شخص اس کا مقابلہ کرے گا۔''

ایک عجیب روحانی رمز رکھتا ہے۔ یہاں صرف نام نہیں بتایا گیا بلکہ اس شخصیت کا پورا کردار متعین کر دیا گیا۔ وہ ''قلمی جہاد'' کرے گا، ''فتنہ دبائے گا''، ''اللہ اور رسول ﷺ کی مدد اس کے ساتھ ہوگی''، ''وہ اہلِ بیت کا ادب کرنے والا ہوگا''، ''بے خوف ہوگا''، ''پاسبانِ شریعت ہوگا'' اور ''اسلام کی آخری سانس تک خدمت کرے گا''۔ اگر ان تمام اوصاف، اشاروں اور بشارتوں کو تاریخ کے آئینے میں رکھ کر دیکھا جائے تو حیرت انگیز طور پر امامِ اہلِ سنت، اعلیٰ حضرت، امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حیاتِ مبارکہ، علمی خدمات اور روحانی کردار ہی کا عکس و نقش محسوس ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے صدیوں پہلے ادا ہونے والے یہ الفاظ وقت کے پردوں سے گذر کر آخر کار اسی ایک عظیم ہستی پر آ کر مکمل ہوتے ہوں۔

عشقِ رسول ﷺ کی وہی بے مثال حرارت، تعظیم اہلِ بیت و صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی وہی روشن روایت، عقائدِ اہلِ سنّت کے دفاع کا وہی غیر متزلزل عزم، قلم کی وہی ہیبت، فکر کی وہی گہرائی اور باطل کے مقابل حق کی وہی بے خوف ترجمانی--- ہر وصف گویا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ذات میں ایک زندہ تفسیر بن کر سامنے آتا ہے۔ جب زمانہ فکری انتشار، اعتقادی کشمکش اور مغربی و باطنی فتنوں کی یلغار سے مضطرب تھا، تب یہی مردِ درویش اپنے قلم کو سپر اور اپنے علم کو چراغ بنا کر اٹھا۔ انہوں نے صرف علمی مناظرے نہیں کیے بلکہ امت کے مجروح ایمان کی حفاظت کی، عشقِ مصطفیٰ ﷺ کے چراغوں کو بجھنے نہ دیا اور اہلِ سنّت کے اعتقادی تشخص کو ایک نئی قوت عطا کی۔ ان کی تحریروں میں فقاہت کا وقار بھی ہے، تصوف کی لطافت بھی، محبت کی کیف آفریں تپش بھی اور مجددانہ جلال بھی۔ وہ بیک وقت ایک فقیہ بھی دکھائی دیتے ہیں، ایک عاشقِ رسول ﷺ بھی، ایک متکلم بھی، ایک صوفی بھی اور عقائد و نظریات کے ایک ایسے پاسبان بھی جن کے قلم کی ضرب سے باطل نظریات کی بنیادیں لرز اٹھتی تھیں۔

اسی لیے جب اس وصیت نامے کے الفاظ اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حیاتِ طیبہ کو ایک ساتھ دیکھا جاتا ہے تو دل بے اختیار یہ محسوس کرتا ہے کہ گویا یہ تمام اشارے

اسی آفتابِ علم وعشق کی طرف تھے، جس نے ایک تاریک دور میں اہلِ سنّت کے افق کو نور سے دوبارہ بھر دیا۔اور شاید یہی اس روحانی دستاویز کا سب سے حیرت انگیز پہلو ہے کہ اس میں بیان ہونے والی صفات تاریخ کے طویل سفر کے بعد ایک ایسی شخصیت میں مجسم ہو کر سامنے آتی ہیں جسے دنیا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نام سے جانتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے صدیوں پہلے ایک صاحبِ کشف ہستی نے وقت کے پردوں کے اُس پار کھڑے ہوئے ایک مردِ مومن کو دیکھ لیا تھا-- وہ مردِ حق جو آنے والے فکری طوفانوں کے درمیان تنہا ایک قلعے کی مانند کھڑا ہوگا۔اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پوری زندگی دراصل اسی "قلمی جہاد" کی تفسیر تھی جس کا ذکر اس پیش گوئی میں کیا گیا۔

انہوں نے تلوار نہیں اٹھائی مگر ان کا قلم اپنے عہد کے فتنوں کے مقابل ایک ایسی علمی شمشیر بن گیا جس کی ضرب آج تک محسوس کی جاتی ہے۔ فقہ، حدیث، تفسیر، عقائد، تصوف، فلسفہ، ریاضیات، ہیئت اور ادب-- علم وفکر کا شاید ہی کوئی میدان ایسا ہو جہاں ان کے علم نے اپنی گہرے نقوش نہ چھوڑے ہوں۔ مگر ان تمام علوم کا مرکز ایک ہی تھا: عشقِ رسول ﷺ اور تحفظِ عقیدۂ اہلِ سنّت۔

یہ بھی غیر معمولی بات ہے کہ شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے صرف علمی عظمت کا ذکر نہیں کیا بلکہ "بے خوفی" کو بھی اس شخصیت کا نمایاں وصف قرار دیا۔ واقعی امام اہلِ سنت، اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے عہد کے شدید فکری دباؤ، علمی حلقوں کی سخت مخالفت، سیاسی فضا کی مصلحتوں اور زمانے کے بدلتے رجحانات کے باوجود کبھی مداہنت، خموش مصلحت یا حق پوشی کا راستہ اختیار نہیں کیا۔

انہوں نے حالات کے طوفانوں کے سامنے جھکنے کی بجائے اپنے قلم، اپنے علم اور اپنے یقین کو حق کے دفاع کے لیے وقف رکھا۔

وہ ایسا دور تھا جب بہت سے اہلِ علم مصلحتوں کے دباؤ میں خاموش ہو رہے تھے، بعض حلقے فکری انتشار کو "رواداری" کا نام دے رہے تھے اور کچھ ذہن مغربی اثرات یا داخلی فتنوں کے سامنے دفاعی کیفیت اختیار کر چکے تھے مگر انہی پرآشوب حالات میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ استقامت کے ایک بلند مینار کی طرح کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔انہوں نے زمانے کی مقبولیت کو معیار بنایا، نہ مخالفتوں کے خوف کو اپنے موقف پر غالب آنے دیا بلکہ جسے حق سمجھا پوری جرأت، دیانت اور علمی وقار کے ساتھ بیان فرمایا۔ان کا قلم محض رد و مناظرے کا آلہ نہیں تھا بلکہ عشقِ رسول ﷺ کا محافظ، عقائدِ اہلِ سنّت کا پاسبان اور امت کے ایمانی شعور کا نگہبان تھا۔

اسی لیے ان کی تحریروں میں ایک عجیب جلال بھی محسوس ہوتا ہے اور ایک غیر معمولی سوز بھی۔ وہ جہاں باطل نظریات پر گرفت کرتے ہیں وہاں دلوں میں محبتِ مصطفیٰ ﷺ کے چراغ بھی روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی سب سے بڑی عظمت شاید یہی ہے کہ انہوں نے حق کو حالات کے تابع نہیں کیا بلکہ حالات کو حق کے تابع دیکھنے کی دعوت دی۔انہوں نے یہ سبق دیا کہ اگر اہلِ حق وقتی دباؤ، سیاسی مصلحت یا عوامی مقبولیت کے خوف سے اپنے موقف میں نرمی پیدا کر دیں تو پھر آنے والی نسلوں کے عقائد، شناخت اور روحانی سمت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔اسی لیے ان کی پوری زندگی استقامت، غیرتِ ایمانی اور عشقِ رسول ﷺ کی ایک زندہ تفسیر محسوس ہوتی ہے۔وہ صرف ایک عالم یا فقیہ نہیں تھے بلکہ ایسے نگہبانِ عقیدہ تھے جنہوں نے اپنے عہد کے فتنوں کے سامنے تنہا کھڑے ہو کر بھی حق کا چراغ بجھنے نہیں دیا۔ جہاں انہیں عظمتِ رسالت ﷺ، ختمِ نبوت یا عقائدِ اہلِ سنّت پر کوئی آنچ محسوس ہوئی، وہاں انہوں نے پوری جرأت کے ساتھ قلم اٹھایا۔ ان کے فتاوے میں صرف علمی استدلال نہیں بلکہ ایک عاشقِ رسول ﷺ کے زخمی دل کی حرارت بھی محسوس ہوتی ہے۔پیش گوئی میں "اہلِ بیت کے ادب" کا ذکر بھی نہایت معنی خیز ہے۔اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پوری حیات محبتِ اہلِ بیت کے نور سے جگمگاتی نظر آتی ہے۔ان

کی نعتیہ شاعری ہو یا مناقب، ان کے فتاوے ہوں یا روحانی معمولات -- ہر جگہ اہلِ بیت اطہار سے والہانہ عقیدت نمایاں ہے۔ مگر اس محبت میں کبھی غلو نہیں، بلکہ وہی متوازن سنی مزاج جلوہ گر ہے جس میں صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی تعظیم اور اہلِ بیت کی محبت ایک ہی چراغ کی دو روشن کرنیں محسوس ہوتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شخصیت محض ایک فقیہ، محدث یا مناظر کی حیثیت سے سامنے نہیں آتی بلکہ ایک ایسے عاشقِ اہلِ بیت کے طور پر بھی جلوہ گر ہوتی ہے جس کے دل میں خانوادۂ رسول ﷺ کی محبت ایمان کی حرارت بن کر دھڑکتی تھی۔ ان کے کلام میں جب ذکرِ اہلِ بیت آتا ہے تو الفاظ میں عقیدت کی نمی، محبت کی وارفتگی اور ادب کی وہ لطافت محسوس ہوتی ہے جو اہلِ سنّت کی صدیوں پرانی روحانی روایت کا امتیاز رہی ہے۔ ان کے نزدیک اہلِ بیتِ اطہار کی محبت کوئی جزوی یا ثانوی مسئلہ نہ تھا بلکہ خود محبتِ رسول ﷺ کا ایک لازمی تقاضا تھی۔ کیونکہ جس دل میں آقائے کریم ﷺ کی سچی محبت ہو، وہ ان نسبتوں سے کیسے بے نیاز رہ سکتا ہے جو براہِ راست دربارِ نبوت سے وابستہ ہیں؟ اسی لیے ان کے نعتیہ اشعار میں بارہا آلِ رسول ﷺ کے ذکر سے ایک نورانی کیفیت پیدا ہوتی ہے، گویا محبتِ مصطفیٰ ﷺ اپنی کامل صورت میں محبتِ اہلِ بیت کے دریچوں سے جھانک رہی ہو۔ مگر ان کی عظمت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس والہانہ عقیدت کے باوجود ان کے مزاج میں کبھی افراط یا غلو پیدا نہیں ہوا۔ انہوں نے اہلِ بیت کی محبت کو صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی عظمت کے مقابل نہیں رکھا بلکہ دونوں کو ایک ہی سرچشمۂ نبوت کے دو مقدس مظاہر سمجھا۔ ان کے نزدیک حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی المرتضیٰ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سب اسی آفتابِ رسالت ﷺ کے روشن ستارے ہیں اور اہلِ بیتِ اطہار اس نورانی خانوادے کی وہ پاکیزہ شاخ ہیں جن سے ایمان کو محبت کی خوشبو ملتی ہے۔

اسی متوازن سنی مزاج نے ان کی فکر کو اعتدال، جامعیت اور روحانی وقار عطا کیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ اہلِ بیت کی محبت اگر صحابۂ کرام کی تنقیص تک جا پہنچے تو وہ اہلِ سنّت کا راستہ نہیں رہتا اور اگر صحابہ کی تعظیم کے نام پر اہلِ بیت کی شان کم کی جائے تو یہ بھی محبتِ رسول ﷺ کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ حق وہی ہے جس میں دونوں نسبتوں کا ادب جمع ہو، کیونکہ یہ دونوں دراصل تاجدارِ کائنات ﷺ ہی کے فیضان کی دو متبرک شعاعیں ہیں۔ ان کی تحریروں، فتاوے اور روحانی معمولات میں یہی توازن مسلسل جھلکتا ہے۔ درود و سلام کی محفلیں ہوں، میلادِ مصطفیٰ ﷺ کا بیان ہو، یا مناقبِ اہلِ بیت -- ہر جگہ ایک ایسی روحانی فضا محسوس ہوتی ہے جس میں محبت بھی ہے، ادب بھی، عقیدہ بھی اور اعتدال بھی۔ یہی وہ حسن ہے جس نے ان کی فکر کو محض ایک مسلکی تعبیر نہیں رہنے دیا بلکہ اسے اہلِ سنّت کے روحانی ذوق کا نمائندہ بنا دیا۔ یوں امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کی پوری حیات اس حقیقت کی روشن مثال بن کر سامنے آتی ہے کہ سچا سنی مزاج وہی ہے جس میں اہلِ بیتِ اطہار کی محبت دل کی زینت ہو، صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی عظمت ایمان کا حصہ ہو اور ان دونوں کے درمیان محبت و ادب کا وہ حسین توازن قائم رہے جو امت کی صدیوں پرانی روحانی شناخت رہا ہے۔ اسی طرح "پاسبانِ شریعت" ہونے کی جو صفت بیان کی گئی، وہ بھی اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی زندگی میں پوری شان کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ وہ محض جذباتی خطیب یا مناظرانہ شخصیت کے مالک نہ تھے بلکہ شریعت کے دقیق مسائل پر غیر معمولی دسترس رکھنے والے فقیہ تھے۔ "فتاویٰ رضویہ" جیسا عظیم فقہی انسائیکلوپیڈیا اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی مجددانہ جدوجہد صرف عقیدے کے دفاع تک محدود نہ تھی بلکہ عملی زندگی کے ہر گوشے میں شریعت کی رہنمائی فراہم کرنا بھی ان کے مشن کا حصہ تھا۔

پھر یہ جملہ کہ ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مدد اس کے ساتھ ہوگی'' ایک خاص روحانی معنیٰ رکھتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ

اللہ تعالیٰ علیہ نے بظاہر محدود وسائل، سادہ ظاہری اسباب اور خموش علمی ماحول کے باوجود ایسا ہمہ گیر اثر چھوڑا جو محض انسانی تدبیر یا دنیاوی قوت کا نتیجہ محسوس نہیں ہوتا۔

نہ ان کے پاس سیاسی اقتدار تھا، نہ حکومتوں کی سرپرستی، نہ ذرائع ابلاغ کی چکاچوند اور نہ ہی زمانے کی مصلحت پسند قوتوں کی پشت پناہی مگر اس کے باوجود ان کے قلم کی آواز برصغیر کے گوشے گوشے سے نکل کر عالمِ اسلام کے مختلف حلقوں تک پہنچ گئی۔ یہ اثر دراصل اس اخلاص، استقامت اور روحانی صداقت کا اثر تھا جو اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے کلام اور کردار میں ودیعت فرما دیتا ہے۔ اسی لیے ان کی تحریریں صرف علمی مباحث نہیں رہیں بلکہ اہلِ ایمان کے دلوں کے لیے یقین و محبت کا سرچشمہ بن گئیں۔ ان کے فتاوے میں فقاہت کی گہرائی تھی تو نعتیہ کلام میں عشقِ رسول ﷺ کی ایسی سوزنا کی کہ صدی گذر جانے کے بعد بھی دلوں کو گرماتی محسوس ہوتی ہے۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جس دور میں حق کی آواز بلند کی وہ انتشار، فکری اضطراب اور اعتقادی آزمائشوں کا دور تھا۔ مگر حیرت یہ ہے کہ ایک تنہا مردِ درویش نے اپنے قلم سے وہ کام لیا جو بڑے بڑے ادارے، تحریکیں اور سیاسی قوتیں بھی نہ کر سکیں۔ بعض تنگ نظر، محدود فکر اور سطحی مطالعے کے حامل افراد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نے فتویٰ نویسی کے علاوہ کچھ نہیں کیا ان کی تمام خدمات کا دائرہ صرف فتاویٰ نویسی تک محدود تھا۔ حالاں کہ یہ دعویٰ دراصل اُس عظیم ہمہ جہت شخصیت کو محض چند اوراق کے دائرے میں قید کر دینے کی ایک ناکام کوشش محسوس ہوتا ہے۔

یہ درست ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فتاوے تحریر کیے مگر وہ فتاوے محض خشک فقہی جوابات نہ تھے، وہ اپنے اندر ایک پورے عہد کا فکری شعور، ایمانی غیرت، عشقِ رسول ﷺ کی حرارت اور امت کے اعتقادی تحفظ کی تڑپ سموئے ہوئے تھے۔ ان کے قلم سے نکلنے والے الفاظ صرف مسائل کا حل نہیں پیش کرتے تھے بلکہ دلوں میں یقین کی روشنی بھی پیدا کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو صرف "مفتی" کے عنوان سے دیکھتا ہے تو گویا وہ سمندر کو محض ایک لہر میں محدود کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔

وہ فقیہ بھی تھے، محدث بھی، متکلم بھی، مفسر بھی، عاشقِ رسول ﷺ بھی اور اپنے عہد کے فکری و روحانی پاسبان بھی۔

ان کی نعتیہ شاعری میں عشق کا سمندر موجزن ہے، ان کی تحقیقی تحریروں کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے اور ان کے روحانی مزاج میں اولیائے امت کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے صرف فتاوے نہیں لکھے بلکہ ایک ایسے دور میں اہلِ سنّت کے اعتقادی تشخص کی حفاظت کی جب فکری یلغار ہر طرف سے حملہ آور تھیں۔ انہوں نے عشقِ مصطفیٰ ﷺ کو علمی استدلال کے ساتھ جوڑا، عقیدے کو روحانیت کے ساتھ مربوط کیا اور دین کو محض رسمی مباحث سے نکال کر دل کی دھڑکن بنا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شخصیت کو صرف ''فتاوے'' کے دائرے میں محدود کرنا ایسا ہی ہے جیسے سورج کی عظمت کو صرف اس کی ایک کرن سے پہچاننے کی کوشش کی جائے۔ ان کی علمی، فکری، سائنسی، ادبی اور روحانی خدمات ایک پورے عہد پر پھیلی ہوئی ہیں اور تاریخ آج بھی اس حقیقت کی گواہی دے رہی ہے کہ وہ صرف ایک مفتی نہیں بلکہ ایک مجددانہ بصیرت رکھنے والے عظیم مردِ حق تھے۔ انہوں نے صرف مسائل کے جوابات نہیں دیے بلکہ ایک پورے مکتبِ فکر کی علمی بنیادوں کو ایسی مضبوطی عطا کی کہ زمانے کے شدید فکری طوفان بھی انہیں متزلزل نہ کر سکے۔

انہوں نے اہلِ سنّت کے تشخص کو محض ایک فقہی شناخت کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ اسے عشق، ادب، روحانیت اور اعتدال کے ایک مکمل ایمانی مزاج کی صورت میں واضح فرمایا۔ ان کے نزدیک دین صرف ظاہری احکام کا مجموعہ نہیں تھا بلکہ دل کی کیفیت، روح کی وابستگی اور بارگاہِ مصطفیٰ ﷺ سے تعلق کی ایک زندہ حقیقت تھا۔ اسی لیے انہوں نے عشقِ مصطفیٰ ﷺ کو محض جذباتی نعرہ نہیں بننے دیا بلکہ

اسے امت کے ایمانی شعور، روحانی بقا اور اعتقادی سلامتی کا مرکز قرار دیا۔ وہ جانتے تھے کہ جس دل سے محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرارت کم ہو جائے، وہاں ایمان کی روشنی بھی مدھم پڑنے لگتی ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے قلم سے صرف فقہی ابواب نہیں کھولے بلکہ امت کے دلوں میں ادبِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چراغ روشن کیے۔ انہوں نے یہ باور کرایا کہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی وہ محور ہے جس کے گرد اہلِ ایمان کی فکری، روحانی اور اخلاقی زندگی گردش کرتی ہے۔ اسی عشق سے عقیدے میں حرارت پیدا ہوتی ہے، عبادت میں روح آتی ہے اور کردار میں اخلاص کی خوشبو جنم لیتی ہے۔ انہوں نے ایک ایسے دور میں جب دین کو محض خشک منطق، سیاسی مصلحت یا سطحی بحثوں تک محدود کیا جا رہا تھا، محبتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پھر امت کے دل کی دھڑکن بنا دیا۔ ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ علم ان کے ہاں صرف ذہن کی روشنی نہیں بلکہ دل کی کیفیت بھی ہے، اسی لیے ان کے استدلال میں عقل کی قوت بھی دکھائی دیتی ہے اور عشق کی نمی بھی۔ یوں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پوری جدوجہد ایک ایسے مجددانہ کارنامے کی صورت میں سامنے آتی ہے جس میں فقاہت کا وقار بھی ہے، تصوف کی لطافت بھی، دفاعِ عقیدہ کی صلابت بھی، اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ سوزنا کی بھی جو صدیوں بعد آج تک اہلِ دل کے قلوب کو گرما رہی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت محض ایک فرد کی شخصیت نہیں تھی بلکہ ایک روحانی قوت کا مظہر تھی، ایسی قوت جو خموش رہ کر بھی اثر انداز ہوتی ہے، محدود وسائل میں رہ کر بھی صدیوں پر محیط نقوش چھوڑ جاتی ہے اور بظاہر تنہا ہو کر بھی ایک پورے عہد کی سمت متعین کر دیتی ہے۔ اسی لیے تاریخ جب اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے کارناموں پر نظر ڈالتی ہے تو یہ حقیقت اور زیادہ روشن ہو جاتی ہے کہ بعض ہستیاں اپنے زمانے میں صرف انسانوں کے درمیان نہیں جیتیں بلکہ وہ وقت کے دھارے میں ایک مستقل روحانی و فکری تاثیر چھوڑ جاتی ہیں اور شاید یہی وہ تاثیر ہے جس نے اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نام، فکر اور عشق کو ایک صدی گذر جانے کے بعد بھی دلوں میں زندہ رکھا ہے۔ ان کی تصانیف صرف برصغیر کے مدارس، خانقاہوں اور علمی حلقوں تک محدود نہ رہیں بلکہ حرمین شریفین کے علمی ایوانوں میں بھی قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھی گئیں۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے جلیل القدر علما نے ان کے علم، فقاہت اور عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گواہی دی۔ ان کے فتاوے نے نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں کی دینی رہنمائی کی بلکہ عالمِ اسلام کے فکری مباحث پر بھی اپنے گہرے نقوش ثبت کیے۔

ان کی تحریروں میں صرف فقہی باریکیاں نہیں تھیں بلکہ ایمان کی حرارت، محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چمک اور عقیدۂ اہلِ سنّت کی روحانی عظمت بھی موجزن تھی۔ انہوں نے ایسے دور میں جب فکری انتشار اور اعتقادی اضطراب بڑھ رہا تھا، عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو امت کے قلبی و روحانی شعور کا مرکز بنا کر پیش کیا۔

ان کی آواز محض ایک خطیب یا مفتی کی آواز نہ تھی بلکہ یہ اُس عاشقِ صادق کی صدا تھی جس کے دل میں مدینہ طیبہ کی محبت دھڑکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نعتیہ اشعار، مناقب، فتاوے اور علمی خدمات نے ایک ایسے دبستانِ عشق کو زندہ کیا جو آج بھی کروڑوں دلوں کی دھڑکن بنا ہوا ہے۔ وقت کے طوفان آئے، افکار بدلتے رہے، تحریکیں اٹھیں اور ماند پڑ گئیں مگر محبتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جس چراغ کو انہوں نے اپنے قلم، فکر اور روحانیت سے روشن کیا تھا، وہ آج بھی اہلِ سنّت کے قلوب میں پوری آب و تاب کے ساتھ فروزاں ہے۔ ان کی تحریروں کا ایک حیرت انگیز پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے صرف فقہ، حدیث، تفسیر اور عقائد ہی کے میدان میں اپنی علمی عظمت کا اظہار نہیں کیا بلکہ سائنسی علوم اور کائناتی حقائق کے باب میں بھی اپنی غیر معمولی بصیرت کے نقوش چھوڑے۔ اس حوالے سے ان کی سائنسی نگارشات دیکھی جا سکتی ہے۔

یہ وہ دور تھا جب برصغیر میں جدید سائنسی افکار ابھی پوری طرح عام نہ ہوئے تھے، مگر ان کے قلم نے فلکیات، ریاضیات، ہیئت، اوقات، زمین و آسمان کی ساخت اور کائناتی نظم کے مباحث کو اس

انداز میں چھیڑا کہ اسے پڑھ کر ایک قاری حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں عقل اور عشق، سائنس اور روحانیت، تحقیق اور عقیدت ایک دوسرے سے متصادم نہیں بلکہ ہم آہنگ دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے یہ واضح کیا کہ اسلام علم کا دشمن نہیں بلکہ حقیقی علم کا سب سے بڑا محافظ ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں سائنسی مباحث خشک اور بے روح نہیں بنتے بلکہ ان میں بھی معرفتِ الٰہی کی روشنی جھلکتی نظر آتی ہے۔ جب وہ افلاک کی گردش کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے پس منظر میں قدرتِ خداوندی کی عظمت نمایاں ہو جاتی ہے اور جب کائنات کے نظم پر گفتگو کرتے ہیں تو قاری کے دل میں خالقِ کائنات کی ہیبت اور محبت بیدار ہونے لگتی ہے۔ ان کے علمی اسلوب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جدید علوم کو محض ظاہری ترقی کا وسیلہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ انہیں ایمان کی گہرائی تک پہنچنے کا ایک دروازہ قرار دیتے تھے۔ گویا ان کے نزدیک سائنس اگر وحی کی روشنی سے ہم آہنگ ہو جائے تو وہ انسان کو مادّیات کے اندھیروں سے نکال کر معرفت کے نور تک پہنچا سکتی ہے۔

اسی لیے ان کی تحریریں اور بعض تحقیقات آج بھی یہ احساس دلاتی ہیں کہ وہ اپنے عہد سے بہت آگے کھڑے تھے۔ انہوں نے مذہب اور سائنس کے درمیان مصنوعی کشمکش کی بجائے ایک ایسا فکری توازن پیش کیا جس میں عقل بھی مطمئن ہوتی ہے اور روح بھی منور۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی علمی جلوہ افروزی صرف مذہبی حلقوں تک محدود نہ رہی بلکہ فکر و تحقیق کی دنیا میں بھی ایک منفرد وقار کے ساتھ دیکھی جاتی ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ان کی علمی و فکری عظمت محض ایک عالمِ دین کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مجددانہ شعور کے طور پر سامنے آتی ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخصیت علمِ ظاہری کی وسعت، عشقِ رسول ﷺ کی حرارت، فکری بصیرت اور روحانی فراست کو ایک ساتھ اپنے وجود میں سمولے تو پھر اس کی آمد صرف ایک فرد کا ظہور نہیں رہتی بلکہ ایک نئے فکری و روحانی عہد کی تمہید بن جاتی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ ان کی علمی، روحانی اور فکری جلوہ افروزی دراصل اسی عظیم پیش گوئی کی عملی تفسیر تھی۔ گویا علم و عشق، عقل و روحانیت، تحقیق و عرفان -- سب مل کر ایک ایسے عہد کی تشکیل کر رہے تھے جس کی خبر صدیوں پہلے دے دی گئی تھی۔ پیش گوئی کے ایک ایک لفظ میں خموش بشارتوں کا جہان آباد نظر آتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف ایک فرد کی آمد کی خبر نہ تھی بلکہ ایک پورے روحانی و فکری عہد کے ظہور کا اعلان تھی۔ ایک ایسا عہد جس میں ایک "احمد" اپنے قلم، اپنے عشق، اپنی بے خوفی اور اپنے علم کے ساتھ کھڑا ہو کر یہ باور کرائے گا کہ جب فتنوں کی تاریکیاں بڑھتی ہیں تو اللہ تعالیٰ امت کی حفاظت کے لیے اپنے مخصوص بندوں کو کھڑا کر دیتا ہے۔ اور پھر تاریخ انہیں صرف عالم یا فقیہ کے طور پر نہیں بلکہ "مجدد" کے عنوان سے یاد رکھتی ہے۔

یوں لگتا ہے جیسے صدیوں پر محیط ایک طویل فاصلے کے باوجود ولایت کی نگاہ نے وقت کے پردوں میں کھڑی ہوئی اس عظیم شخصیت کو پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ اس وصیت نامے کا سب سے زیادہ اہم اور فکری طور پر گہرا حصہ وہ ہے جہاں حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی اولاد، مریدوں اور متعلقین کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اس کے راستے (مسلک) پر چلنا، اس کے بتائے ہوئے راستے کو اختیار کرنا، کیونکہ وہی اللہ اور رسول ﷺ کا راستہ ہوگا، صحابہ، تابعین، تبع تابعین، اولیاء اور مجددین کا راستہ ہوگا۔''

یہ جملہ محض عقیدت کا اظہار نہیں بلکہ ایک روحانی "تصدیق نامہ" ہے۔ جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بعض شخصیات اپنی علمی عظمت سے پہلے اپنے باطنی نور، اخلاص اور ربانی نسبتوں کے سبب پہچانی جاتی ہیں۔ ان کے بارے میں ادا ہونے والے یہ کلمات صرف محبت کی جذباتی بازگشت نہیں بلکہ اُس روحانی اثر کا اعتراف ہیں جو ان کی ذات نے اپنے عہد کے اہلِ علم، اہلِ دل اور اہلِ نظر پر قائم کیا۔ ایسے الفاظ تاریخ میں ہر کسی کے حصے میں نہیں آتے۔ یہ وہ اعزاز ہوتا ہے جو وقت نہیں دیتا بلکہ کردار، خدمت، اخلاص اور عشقِ رسول ﷺ کی مسلسل آبیاری انسان کو اس مقام تک پہنچاتی ہے۔ اسی لیے جب اہلِ بصیرت کسی شخصیت کے بارے میں اس نوعیت کے تاثرات

قلم بند کرتے ہیں تو وہ محض ایک فرد کی تعریف نہیں کرتے بلکہ درحقیقت اُس نورانی تسلسل کی نشاندہی کرتے ہیں جو امت کی روحانی حفاظت کے لیے ہر دور میں باقی رکھا جاتا ہے۔ گویا یہ الفاظ ایک ایسے باطنی اعتماد کی گواہی ہیں جس میں علم کی پختگی بھی شامل ہے، روحانیت کی تاثیر بھی اور زمانے کے فتنوں کے مقابل حق پر ثابت قدم رہنے کی وہ کیفیت بھی جو صرف مخصوص بندگانِ خدا کا نصیب بنتی ہے۔

ایک ولیِ کامل اپنے بعد آنے والے مجدد کے فکری منہج کی توثیق کر رہا ہے۔

یہاں "مسلک" سے مراد کوئی محدود جماعتی شناخت، وقتی نعرہ یا فکری تعصب نہیں بلکہ وہ پورا اعتقادی، علمی اور روحانی تسلسل ہے جو عہدِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے تابعین، ائمۂ مجتہدین، اولیائے کاملین اور مجددینِ امت تک نور کی ایک زنجیر کی صورت میں جاری و ساری رہا۔ یہ وہی راستہ ہے جس کی بنیاد عشقِ مصطفیٰ ﷺ، تعظیمِ شریعت، ادبِ اہلِ بیت و صحابہ، اور ظاہر و باطن کے حسین امتزاج پر قائم ہے۔ اسی لیے جب ایک صاحبِ ولایت ہستی کسی آنے والے مجدد کے منہج و مسلک کی طرف اشارہ کرتی ہے تو دراصل وہ یہ اعلان کر رہی ہوتی ہے کہ یہ آواز کوئی اجنبی صدا نہیں بلکہ اسی قافلۂ اہلِ حق کی ایک نئی صدی میں سنائی دینے والی بازگشت ہے۔ گویا زمانہ بدل جاتا ہے، اسلوب بدل جاتے ہیں، فتنوں کی صورتیں تبدیل ہو جاتی ہیں مگر حق کا وہ چراغ جسے انبیاء کے وارث اپنے خونِ جگر سے روشن رکھتے ہیں، ہر دور میں نئی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے مجددین کی دعوت محض علمی مباحث تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ دلوں کی دنیا میں بھی ایک نئی بیداری پیدا کرتی ہے۔ ان کے قلم میں استدلال کی قوت بھی ہوتی ہے اور روحانیت کی تاثیر بھی، ان کی فکر میں تحقیق کی گہرائی بھی ہوتی ہے اور عشق کی حرارت بھی۔ اور شاید یہی وہ مقام ہے جہاں "مسلک" ایک نظری بحث نہیں رہتا بلکہ ایمان، محبت، وفاداری اور روحانی شناخت کا زندہ استعارہ بن جاتا ہے۔

یہ دراصل اُس زندہ روایت کا نام ہے جس میں علم اور عشق، شریعت اور طریقت، عقل اور ادب، فقاہت اور روحانیت -- ایک ہی نور کے مختلف جلوے بن کر سامنے آتے ہیں۔ اہلِ عقیدت اور وابستگانِ مسلکِ اعلیٰ حضرت کے نزدیک شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی یہ پیش خبری یقیناً ایک غیر معمولی روحانی شہادت کی حیثیت رکھتی ہے۔ خصوصاً اس پہلو سے کہ ایک ولیِ کامل نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ولادت سے تقریباً دو صدی قبل نہ صرف ان کے ظہور کی خبر دی بلکہ ان کے منہج و مسلک کو "اللہ و رسول ﷺ کا راستہ"، "صحابہ، تابعین، تبع تابعین، اولیاء و مجددین کا راستہ" قرار دیا۔

یہ محض کسی شخصیت کی مدح نہیں بلکہ ایک فکری و روحانی عہد کی توثیق محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ صوفیانہ روایت میں جب کوئی صاحبِ ولایت کسی آنے والے مردِ حق کے بارے میں اس درجہ اعتماد اور تاکید کے ساتھ گفتگو کرے تو اسے صرف ایک تاریخی واقعہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ "فراستِ ایمانی" اور "روحانی بصیرت" کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔

اسی لیے اہلِ سنّت و جماعت کے بہت سارے علماء اس وصیت نامے کو مسلکِ اعلیٰ حضرت کی صداقت، اس کے روحانی تسلسل اور اس کی اعتدال پسند سنی شناخت کے ایک مؤید اشارے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا پورا منہج و مسلک واقعی انہی بنیادوں پر قائم دکھائی دیتا ہے جن کا ذکر اس پیش گوئی میں کیا گیا ہے: عشقِ رسول ﷺ، تعظیمِ اہلِ بیت، ادبِ صحابہ، وابستگیِ اولیاء، تحفظِ ختمِ نبوت، پاسبانیِ شریعت اور دفاعِ عقائدِ اہلِ سنّت۔ تاہم علمی و اصولی اعتبار سے یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ کسی مسلک یا فکر کی اصل صداقت کا معیار بالآخر قرآن، سنّت، اجماعِ امت اور اکابرِ اہلِ سنّت کے متوارث فہم کو ہی مانا جاتا ہے۔ روحانی پیش گوئیاں، کشف، بشارتیں اور اولیاء کے اقوال اس صداقت کے "مؤیدات" اور "روحانی اشارات" تو ہو سکتے ہیں مگر اصل بنیاد شریعت اور دلائلِ دینیہ ہی ہوتے ہیں۔ اگر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے فتاوے، نعتیہ کلام، علمی تصنیفات،

خطابات اور مجموعی فکری منہج کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان کا مسلک کوئی خودساختہ یا جداگانہ راستہ نہیں تھا بلکہ قرآن و سنّت، فہمِ صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمۂ مجتہدین، اولیاء کاملین اور مجددینِ امت کے متوارث ذوق و منہج ہی کی تعبیر و تشریح تھا۔

انہوں نے کوئی نیا چراغ روشن نہیں کیا بلکہ صدیوں سے جلتے ہوئے اسی چراغِ اہلِ سنّت کی لو کو فتنوں کی تیز ہواؤں میں مزید مستحکم اور روشن کر دی۔ وہ کسی نئے قافلے کے داعی بن کر نہیں آئے تھے بلکہ بھٹکتے ہوئے قافلوں کو دوبارہ اسی شاہراہِ قدیم کی طرف لوٹانے والے راہبر تھے جس پر صدیوں سے صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین، ائمۂ مجتہدین اور اولیاء کاملین کے نقوش ثبت تھے۔ ان کی دعوت میں جدت کا شور نہیں بلکہ اصالت کی خوشبو تھی۔ وہ دین کی نئی تعبیر لے کر نہیں اٹھے بلکہ اس تعبیرِ حق کو گردِ زمانہ سے پاک کرنے آئے تھے جس پر امت کا روحانی اور اعتقادی وجود قائم تھا۔ گویا انہوں نے کوئی نیا آسمان تعمیر نہیں کیا بلکہ اسی آسمانِ اہلِ سنّت سے چھائے ہوئے بادلوں کو ہٹا کر اس کے قدیم ستاروں کو دوبارہ نمایاں کر دیا۔ ان کے قلم کی اصل قوت یہی تھی کہ وہ امت کو اس کی اساس و بنیاد سے جوڑتا تھا۔ وہ جب عشقِ رسول ﷺ کی بات کرتے تو اس کے پیچھے قرآن و سنّت کی روشنی موجود ہوتی، جب تعظیمِ اہلِ بیت کا ذکر کرتے تو اس کے ساتھ ادبِ صحابہ کی خوشبو بھی شامل ہوتی اور جب شریعت کی پاسبانی کرتے تو اس کے اندر روحانیت کی حرارت بھی موجزن رہتی۔ اسی جامعیت نے ان کے منہج و مسلک کو محض ایک فقہی یا مناظرانہ دانشگاہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے ایک زندہ روحانی روایت کا استعارہ بنا دیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے امت کے بکھرے ہوئے روحانی شعور کو پھر سے ایک مرکز عطا کیا۔ فتنوں کی گرد میں دھندلاتے ہوئے عقیدے کو دوبارہ جلا بخشی، محبت کے چراغوں کو نئی آب و تاب دی اور ادبِ رسالت ﷺ کا وہ ذوق زندہ کیا جو اہلِ سنّت کی اصل پہچان تھا۔

اسی لیے ان کی تجدید محض علمی نہ تھی بلکہ ایک ایسی روحانی بیداری تھی جس نے دلوں کو پھر سے مرکزِ مصطفیٰ ﷺ کے گرد جمع کر دیا۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے صدیوں پہلے ادا ہونے والے وہ روحانی کلمات بعد کے زمانوں میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حیات و خدمات کی صورت میں مجسم ہو گئے ہوں۔

اسی لیے اہلِ عقیدت کے نزدیک شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی یہ پیش گوئی دراصل اسی حقیقت کی ایک روحانی گواہی ہے کہ آنے والے دور میں ایک "احمد" اٹھے گا جو

فتنوں کے ہجوم میں اہلِ سنّت کا چراغ
بجھنے نہیں دے گا۔

اس وصیت میں "اس کے راستے (یعنی مسلک) پر چلنا" محض کسی شخصیت سے وابستگی کی دعوت نہیں بلکہ اُس مسلک اعتدال کو اختیار کرنے کی تلقین ہے جس کی بنیاد قرآن و سنّت، فہمِ صحابہ، اکابرِ امت اور اولیاء کاملین کے اجماعی ذوق پر قائم ہے۔

یہ وہی مسلک ہے جس میں محبت، ادب سے جدا نہیں ہوتی، عقیدہ، اخلاق سے الگ نہیں ہوتا اور شریعت، روحانیت سے متصادم نہیں سمجھی جاتی۔

اسی لیے شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس آنے والے مجدد کے مسلک کو صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین، اولیاء اور مجددین کے راستے سے تعبیر کیا۔ گویا وہ یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ یہ کوئی نیا مسلک نہیں ہوگا بلکہ اسی قدیم شاہراہِ اہلِ سنّت کی تجدید ہوگی جس پر امت کے صالحین صدیوں سے گامزن رہے ہیں۔

□□□□

رضویات

مولانا محمد رحمت اللہ صدیقی

تجدید دین اور عصرِ حاضر کا مذہبی بحران

تاریخ امت کے بعض ابواب ایسے ہوتے ہیں جنہیں محض پڑھا نہیں جاتا بلکہ محسوس کیا جاتا ہے۔

وہ صرف واقعات کا سلسلہ نہیں ہوتے بلکہ صدیوں کے شعور، ایمان، اضطراب اور روحانی کشمکش کی دھڑکن بن کر سامنے آتے ہیں۔

ان میں وقت کی گرد بھی ہوتی ہے اور سجدوں کی نمی بھی، فتنوں کی دھند بھی اور چراغِ ہدایت کی وہ لو بھی جو ہر تاریکی کے باوجود بجھنے نہیں پاتی۔

امت مصطفیٰ جان رحمت ﷺ کی تاریخ کا مطالعہ یہ حقیقت آشکار کرتا ہے کہ جب بھی زمانے کے شور نے دین کی اصل صدا دبانے کی کوشش کی، جب بھی خواہشات نے شریعت کے چہرے پر اپنی ملمع سازی کی کاوش کی، جب بھی روحانیت نمائش میں، علم مناظرے میں اور دعوتِ دین شہرت کے ہنگاموں میں گم ہونے لگی، تب قدرتِ خداوندی نے ایسے رجالِ حق کو مبعوث فرمایا جنہوں نے وقت کے دھندلکوں میں کھڑے ہو کر پھر سے چراغِ نبوت کی لو تازہ کر دی۔

وہ نئے راستے بنانے نہیں آئے تھے بلکہ بھولی ہوئی شاہراہوں سے گرد ہٹانے آئے تھے۔

انہوں نے دین میں اضافہ نہیں کیا بلکہ امت کو اس دین کی اصل روح یاد دلائی جو حضورِ اکرم ﷺ کے مقدس در سے عالمِ انسانیت کو عطا ہوئی تھی۔

یہ تحریر بھی اسی عظیم حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ ’’تجدید‘‘ کا مفہوم کیا ہے، ’’مجددیت‘‘ کی اصل روح کیا ہے اور تاریخ کن لوگوں کو واقعی اس منصبِ عظیم کا اہل قرار دیتی ہے۔

یہ مقالہ محض چند شخصیات یا معاصر رویّوں پر تبصرہ نہیں بلکہ دراصل ایک فکری و روحانی آئینہ ہے جس میں ہم اپنے عہد کے مذہبی مزاج، روحانی ترجیحات اور دعوتِ دین کے بدلتے ہوئے اسالیب کو دیکھ سکتے ہیں۔

اس تحریر میں جہاں حقیقی مجددینِ امت کی خدمات، ان کی قربانیاں، ان کا اخلاص، ان کی حق گوئی اور فتنوں کے مقابل ان کی استقامت کا ذکر ہے، وہیں عصرِ حاضر کے بعض ایسے رویّوں پر بھی سوال اٹھایا گیا ہے جہاں ’’تجدید‘‘ کبھی شخصیت پرستی میں، کبھی نمائشی روحانیت میں، کبھی خطابت و تشہیر کے شور میں اور کبھی جدید ذرائع کی چکاچوند میں گم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

یہ مقالہ دراصل ایک دردمندانہ صدا ہے۔

ایک ایسی صدا جو امت کو یہ یاد دلانا چاہتی ہے کہ دین کی اصل قوت ہمیشہ اخلاص، سوزِ یقین، اتباعِ سنّت اور خوفِ خدا میں رہی ہے، نہ کہ نعروں کے ہجوم میں، نہ تصویروں کی نمائش میں اور نہ اسکرینوں کی چمک میں کیونکہ تاریخ کا آسمان ہمیشہ انہی چراغوں کو محفوظ رکھتا ہے جنہیں اخلاص روشن کرتا ہے اور وہ صدائیں کبھی نہیں مرتیں جو زمین سے زیادہ عرش پر سنی گئی ہوں۔

مجدد کا کام دینِ جدید لانا نہیں ہوتا بلکہ دین کے اصل چہرے سے زمانے کی گرد صاف کرنا ہوتا ہے۔ وہ امت کو کسی نئے قبلے کی طرف نہیں بلاتا بلکہ بھٹکے ہوئے قافلے کو دوبارہ اسی مرکزِ نور کی طرف لوٹاتا ہے جہاں سے ہدایت کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔

گویا اولیاءِ حق اور مجددینِ امت کے نزدیک ’’تجدید‘‘ کبھی بھی

دین کے نام پر نئی راہیں تراشنے کا عنوان نہیں رہی بلکہ یہ ہمیشہ اسی چراغِ نبوت کی لو تازہ کرنے کا عمل رہی ہے جس کی روشنی میں صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین اور صالحین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے صدیوں تک انسانیت کی رہنمائی کی۔

چنانچہ تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حقیقی مجدد ہر دور میں اسی امانتِ نبوی کے محافظ بن کر سامنے آئے۔

فکر و نظر کے انقلاب کا یہ عجیب انجام دیکھیے کہ کبھی مجدد وہ ہوتا تھا جو امت کے دلوں سے زنگ اتارتا تھا، بجھتی ہوئی سنّت کی شمع دوبارہ روشن کرتا تھا، خواہشات کے شور میں خوفِ خدا کی صدا سناتا تھا، بدعات کے اندھیروں میں اتباعِ مصطفی ﷺ کا چراغ لے کر کھڑا ہو جاتا تھا، عقیدت کو شریعت کے تابع رکھتا تھا، خانقاہوں کو سجدوں اور آہوں سے آباد کرتا تھا، لوگوں کو اپنے نام سے نہیں بلکہ حضور ﷺ کے در سے وابستہ کرتا تھا، زمانے کی گرد میں چھپے حقائق نمایاں کرتا تھا اور امت کے بکھرے ہوئے فکر و عمل کو اسلافِ کرام کی دہلیز پر جمع کر دیتا تھا۔ اسی حقیقت کی طرف رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے اس فرمان مبارک میں اشارہ فرمایا:

''إِنَّ اللهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَّنْ يُّجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا''

یعنی: ''بے شک اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر صدی کے آغاز پر ایسے شخص یا جماعت کو مبعوث فرمائے گا جو اس کے لیے اس کے دین کی تجدید کرے گا۔''

اس حدیثِ پاک کا مفہوم یہ نہیں کہ ہر صدی میں کوئی نیا دین پیش کیا جائے گا، یا شریعت کے مسلمہ اصولوں کو زمانے کے ذوق کے مطابق بدل دیا جائے گا۔ بلکہ ''تجدید'' سے مراد یہ ہے کہ دین پر جمی ہوئی غفلت کی گرد ہٹا دی جائے۔ سنّت کی مدھم ہوتی روشنی پھر سے نمایاں کی جائے اور امت کو اسلافِ کرام کے پاکیزہ منہج کی طرف واپس لایا جائے۔

مجدد شریعت کا شارح ہوتا ہے، شارع نہیں۔ وہ دین کا خادم ہوتا ہے، مخترع نہیں اور جب امت اس اصلِ عظیم سے دور ہونے لگتی ہے تو تاریخ کے افق پر وہ دور نمودار ہوتا ہے جہاں تجدید و احیائے دین کی ضرورت ایک فکری بحث نہیں بلکہ ایک ناگزیر الٰہی تقاضا بن جاتی ہے۔ تاریخ اسلام کے بعض ابواب ایسے ہیں جہاں وقت محض گذرتا نہیں بلکہ اپنا احتساب بھی کرتا ہے۔ جب امت پر جمود کے سائے گہرے ہونے لگتے ہیں، جب عبادت رسم میں، علم مناظرے میں اور روحانیت کاروبار میں بدلنے لگتی ہے۔ جب دین کی اصل روح گرد آلود ہو کر مصلحتوں کے دبیز پردوں میں چھپنے لگتی ہے، تب قدرتِ خداوندی اپنی سنّتِ جاریہ کے مطابق ایسے رجالِ حق کو مبعوث فرماتی ہے جو ملت کی مردہ رگوں میں دوبارہ زندگی کی حرارت دوڑا دیتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حدیثِ نبوی ﷺ کی یہ عظیم بشارت ایک زندہ آسمانی قانون کی حیثیت سے سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر اس امت کے لیے ایک ایسا شخص یا جماعت مبعوث فرماتا ہے جو دین کی تجدید کرے۔ یہاں غور طلب لفظ ''یبعث'' ہے۔

حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ کوئی شخص خود کھڑا ہو جائے گا، اپنی تشہیر کرے گا، اپنے پیروکاروں سے نعرے لگوائے گا، یا خوابوں، ملفوظات اور سوشل میڈیا کی مہمات کے ذریعے اپنی عظمت کا تاج پہن لے گا۔ نہیں ---- فرمایا: ''ان اللہ یبعث''

یعنی مجدد بنتا نہیں، مبعوث کیا جاتا ہے۔

وہ انتخابِ خلق نہیں بلکہ فیصلہ خداوندی کی ایک زندہ تعبیر ہوتا ہے۔

وہ اشتہاروں سے نہیں ابھرتا بلکہ وقت کے اندھیروں میں اپنی ضرورت خود منواتا ہے۔ اس کے گرد ابتدا میں ہجوم نہیں ہوتا بلکہ اکثر وہ تنہائی، مخالفت، طعن و تشنیع اور آزمائشوں کے صحرا سے گذرتا ہے مگر چونکہ اس کی پشت پر آسمان کی تائید ہوتی ہے، اس لیے اس کی ایک آواز صدیوں کے شور پر غالب آجاتی ہے۔ اسی لیے حقیقی تجدید کا معنیٰ نیا دین لانا نہیں بلکہ دین کی اصل حقیقت کو گردِ زمانہ سے پاک کرنا ہے۔

مجدد شریعت میں اضافہ نہیں کرتا بلکہ امت کو شریعت کی طرف واپس لاتا ہے۔

وہ کوئی نیا آسمان تعمیر نہیں کرتا بلکہ بجھتے چراغوں میں پھر سے نبوی نور بھر دیتا ہے۔

اس کی جدوجہد کا محور ''انا'' نہیں بلکہ ''قال اللہ و قال الرسول'' ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حقیقی مجدد ین نے ہمیشہ امت کو انتشار سے نکال کر مرکزِ حق کی طرف لوٹایا۔ کسی نے عقائد کی حفاظت کی، کسی نے فقہ و شریعت کی بنیادوں کو استحکام بخشا، کسی نے تصوف کو بدعات کی آلائشوں سے پاک کیا، کسی نے باطل فلسفوں کے طوفان کے سامنے بند باندھا اور کسی نے سیاسی و تہذیبی یلغار کے مقابل ایمان کی قندیلیں روشن رکھیں۔

ان کی زندگیاں دعووں سے نہیں، خدمات سے پہچانی گئیں۔

ان کے ہاتھ میں اپنی ذات کا جھنڈا نہیں تھا بلکہ دینِ مصطفیٰ ﷺ کا علم تھا۔

اسی لیے تاریخ نے انہیں قبول کیا اور امت کے اجتماعی شعور نے ان کی عظمت پر مہر ثبت کی۔ مگر ہر دور میں ایک المیہ بھی جنم لیتا رہا ہے۔

جب حقیقی تجدید کی روح کمزور پڑتی ہے تو شخصیت پرستی کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔

لوگ خدمتِ دین سے زیادہ القاب کے اسیر ہو جاتے ہیں۔

پھر کہیں ''مجددِ وقت'' کے نعرے لگتے ہیں، کہیں ''مجددِ اعظم'' کے خواب سنائے جاتے ہیں اور کہیں عقیدت کی شدت دلیل و دیانت دونوں کو نگل لیتی ہے۔

حالاں کہ تاریخ کا معیار ہمیشہ اس سے مختلف رہا ہے۔ اس نے کبھی نعروں، خوابوں اور عقیدتوں کے ہجوم کو مجددیت کی دلیل نہیں مانا بلکہ یہ دیکھا کہ کس نے اپنے عہد کے فتنوں کے مقابل حق کا علم بلند کیا اور دین کی سرحدوں کی حفاظت میں خود کو کھپا دیا۔

تاریخِ اسلام کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہر دور کے مجدد نے اپنے عہد کے سب سے بڑے فتنوں کے خلاف علمِ حق بلند کیا۔ اس نے صرف درس نہیں دیا، معرکہ آرائی میں حصہ بھی لیا۔ صرف خانقاہ نہیں بسائی، باطل کے ایوانوں سے ٹکر بھی لی۔ صرف محبت کی بات نہیں کی، عقیدے کی سرحدوں کی حفاظت بھی کی۔ کبھی معتزلہ کے طوفان اٹھے تو کوئی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بن کر کھڑا ہو گیا، کبھی باطنیت نے حملہ کیا تو کوئی سیدنا امام غزالی قدس سرہٗ العزیز کی صورت میں میدانِ فکر و عمل میں کود پڑا، کبھی وحدتِ ادیان اور الحاد نے سر اٹھایا تو کوئی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ''امتیازِ حق و باطل'' کا مینار بن گیا اور کبھی نیچریت، انکارِ سنت اور گمراہیوں نے یلغار کی تو عاشقِ رسول اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی زندگی سپر بنا دی، کیونکہ مجددیت صرف عمامہ باندھ لینے کا نام نہیں، فتنوں کے مقابل سینہ سپر ہو جانے کا نام ہے مگر عصرِ حاضر کا منظر بڑا عجیب ہے۔ ادھر صلح کلیت عقیدے کی سرحدیں مٹا رہی ہے، منافقت ایمان کی غیرت چاٹ رہی ہے، رافضیت صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی عظمت پر حملہ آور ہے، نیچریت معجزات، روحانیت اور غیب کی دنیا کا مذاق اڑا رہی ہے اور الحادی نسل کے اذہان میں تشکیک کے اندھیرے پھیلا رہا ہے۔ وقت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ امت کا ایک بڑا طبقہ فکری بے حسی کے اس عالم میں مبتلا ہو چکا ہے جہاں زخموں کی شدت بھی احساس کو بیدار نہیں کر پا رہی ہے۔ حیرت یہ ہے کہ بعض حلقوں میں ''مجددیت'' کا چرچا تو بہت ہے لیکن فتنوں کے رد کی وہ تڑپ کہیں دکھائی نہیں دیتی جو مجدد دین کی پہچان ہوتی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے --- جیسے اب تجدیدِ دین کا مطلب یہ رہ گیا ہو کہ چند عقیدت مند جمع ہوں، دو چار خواب سنائے جائیں، کچھ جذباتی مضامین لکھ دیے جائیں، چند نعرے بلند ہو جائیں اور پھر ایک شخصیت کو ''مجددِ وقت'' کے تخت پر بٹھا دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ کیا کبھی ان حضرات نے اپنے عہد کے فتنوں سے آنکھیں ملا کر بات کی؟ کیا کبھی صلح کلیت کے سیلاب کے سامنے بند باندھا؟ کیا کبھی رافضیت کے فتنوں کا علمی رد کیا؟ کیا کبھی نیچریت کے اندھیروں میں ایمان کی شمع جلائی؟ کیا کبھی منافقت کے خوشنما چہروں سے نقاب نوچی؟ یا ساری توانائیاں صرف اس کام میں صرف ہو رہی ہیں کہ ''حضرت مجدد ہیں'' یہ ثابت کیا جائے --- خواہ دین کی دیواریں پیچھے سے گرتی رہیں! آج بعض حلقوں میں عجیب معیار قائم ہو گیا ہے اگر کوئی شخص ہر ایک سے مسکرا کر مل لے، اختلاف کو مصلحت کے پردوں کے پیچھے چھپا دے، حق و باطل کے درمیان حدِ فاصل کھینچنے سے

گریز کرے اور ہر فتنے کے ساتھ "بقائے باہمی" کی تصویر بن کر کھڑا رہے، تو فوراً اس کے گرد تقدس کا ہالہ کھینچ دیا جاتا ہے۔ گویا اب مجدد وہ نہیں جو باطل سے ٹکرائے بلکہ وہ ہے جو مصلحتوں کے تحت باطل کو گلے لگا لے! شاید وقت کی بدلتی ہوئی قدروں نے "تجدید" کا مفہوم بھی بدل دیا ہے۔ پہلے مجدد دین امت کو زمانے کے فتنوں سے بچاتا تھا، اب بعض لوگ زمانے کے ہر فتنے کو دین کے اندر جگہ دلوانے کو 'وسعتِ فکر' کہنے لگے ہیں۔ پہلے مجدد حق اور باطل کے درمیان لکیر کھینچتا تھا، اب بعض دانشور یہ لکیر مٹا دینے کا نام ''حکمت'' رکھتے ہیں۔

پہلے مجدد سنّت کے چراغ روشن کرتا تھا، اب کچھ لوگ ہر نئے فکری دھندلکے کو ''اجتہاد'' کا آفتاب ثابت کرنے میں مصروف ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جتنا بڑا فتنہ ہو، اتنی ہی بڑی خموشی اختیار کر لی جاتی ہے---مگر جہاں اپنی عظمت کے قصیدے پڑھوانے ہوں وہاں خطابت بھی جوش میں آجاتی ہے اور عقیدت بھی۔

حالاں کہ تاریخ کا فیصلہ بڑا بے رحم ہوتا ہے۔ وہ القابات نہیں دیکھتی، خدمات دیکھتی ہے۔ وہ نعروں سے متأثر نہیں ہوتی، معرکوں کا حساب لیتی ہے۔ وہ یہ نہیں پوچھتی کہ کس کے مرید کتنے تھے، وہ یہ دیکھتی ہے کہ اس نے اپنے دور کے فتنوں کے مقابل حق و صداقت کے کتنے چراغ روشن کیے۔ کیونکہ مجددیت خواب دیکھنے سے نہیں ملتی، امت کے رستے ہوئے زخموں پر مرہم رکھنے سے ملتی ہے۔ یہ منصب چاپلوسی کے نعروں سے نہیں، باطل کے مقابل تنہا کھڑے ہونے کی قیمت پر عطا ہوتا ہے۔ اور تاریخ کا یہ اصول آج بھی زندہ ہے کہ جو لوگ خود اپنے لیے منبر تعمیر کرتے ہیں، وقت انہیں فراموش کر دیتا ہے مگر جو دین کے لیے سینہ سپر ہو جاتے ہیں، زمانہ ان کے نام کے چراغ خود روشن رکھتا ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ ہر دور میں کچھ لوگ تاریخ کا یہ بے رحم اصول فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ وہ خدمتِ دین کی بجائے اپنی شخصیت کے گرد تقدس کا حصار تعمیر کرنے لگتے ہیں اور پھر مجددیت ایک الٰہی امانت کم، عقیدت کے جذباتی نعروں کا عنوان زیادہ بن جاتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ بعض لوگ مجددیت کو روحانی منصب کم اور نفسیاتی برتری کا سرٹیفکیٹ زیادہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ حالاں کہ مجددیت نہ خوابوں سے ثابت ہوتی ہے، نہ خوشامدی حلقوں کی تائید سے، نہ سوشل میڈیا کے نعروں سے اور نہ عقیدت مندوں کے جذباتی ہجوم سے۔ یہ منصب اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب ایک شخصیت اپنے عہد کے فتنوں کے مقابل کھڑی ہو کر امت کی فکری، روحانی اور عملی رہنمائی کرے اور اس کی خدمات وقت کی دھول اڑ جانے کے بعد بھی باقی رہیں۔

حقیقی مجدد اپنی ذات کے گرد حصار تعمیر نہیں کرتا بلکہ امت کو رسول اللہ ﷺ کے در پر لے جاتا ہے۔ وہ اپنی عظمت منوانے میں عمر صرف نہیں کرتا بلکہ دین کی عظمت بچانے میں اپنا خونِ جگر جلاتا ہے۔ اس کی راتیں شہرت کے خوابوں میں نہیں بلکہ امت کے درد میں بھیگی ہوئی سجدہ گاہوں میں گزرتی ہیں۔ آج کے شورزدہ ماحول میں یہ حقیقت پھر سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہر بلند آہنگ دعویٰ آسمانی انتخاب نہیں ہوتا، ہر مقبول مقرر مجدد نہیں ہوتا، ہر صاحبِ کشف صاحبِ منصب نہیں ہوتا اور ہر عقیدت مند جماعت حق کی میزان نہیں ہوتی۔ وقت کا سب سے بڑا فتنہ شاید یہی ہے کہ لوگ "خدمت" سے زیادہ "خطاب" کے اسیر ہو گئے ہیں۔ حالاں کہ تاریخ کے آسمان پر وہی ستارے باقی رہتے ہیں جنہیں خدا روشن کرتا ہے۔ جو چراغ خود جلائے جاتے ہیں، وہ ہوا کے ایک جھونکے سے بجھ جاتے ہیں۔ مجددیت ایک روحانی امانت ہے۔ اس کا تعلق اشتہار سے نہیں، اخلاص سے ہے۔ یہ منصب مریدوں کے نعروں سے نہیں، آسمان کے فیصلوں سے عطا ہوتا ہے۔ اور جب خدا کسی بندے کو اس مقصد کے لیے چن لیتا ہے تو پھر اس کی خموشی بھی زمانوں کے شور سے زیادہ اثر رکھتی ہے۔ شاید اسی لیے تاریخ کے حقیقی مجددین نے کبھی خود اپنے لیے تاج نہیں مانگا۔ وہ اپنے نام کے گرد تقدس کا ہالہ بنانے نہیں آئے تھے۔ وہ تو اس چراغِ نبوت کی حفاظت کے لیے آئے تھے جس کی روشنی میں امت کو قیامت تک اپنا راستہ تلاش کرنا ہے۔ آج منظر نامہ یا تو بدل چکا ہے یا بدل دیا گیا ہے۔ خطرہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب روحانیت کا باطنی سفر بھی محض نمائشی مناظر اور تصویری تاثرات تک محدود ہو کر رہ جائے۔

جدید ذرائع اصل پیغام پر غالب آنے لگیں تو روحانیت کی سادگی اور باطنی تاثیر متأثر ہونے لگتی ہے۔ وہ دور بھی تھا جب مجدد اپنے وقت کے فتنوں سے ٹکراتا تھا اور یہ دور بھی ہے کہ اگر فتنہ HD کو الٹی

میں ہو، خوبصورت ایڈیٹنگ کے ساتھ ہو اور پس منظر میں نعت کی دھن بج رہی ہو تو اسے ''دعوتِ اسلامی کا جدید اسلوب'' کہہ دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات جدید پیشکش اور خوبصورت انداز ابلاغ اس قدر غالب آ جاتا ہے کہ علمی و روحانی پیغام پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ گویا اب میزانِ حق بدل چکی ہے۔ اب نہ زہد معیار ہے، نہ تقویٰ، نہ اتباعِ سنت، نہ اسلاف کی امانت...... بلکہ جس کے یوٹیوب سبسکرائبر زیادہ، وہی ''مجددِ وقت'' کے لقب کا زیادہ مستحق! حالاں کہ مجدد وہ نہیں جو دین میں نئی راہیں نکالے بلکہ مجدد تو وہ ہے جو بھولی ہوئی شاہراہِ اسلاف سے جمی ہوئی دھول کی تہوں کو ہٹا دے، جو صدیوں سے روشن میناروں پر جمی ہوئی گرد صاف کر دے، جو امت کو حیرتوں کے صحرا سے نکال کر سنت کے سیدھے راستے پر واپس لے آئے وہ دین میں رنگ آمیزی نہیں کرتا بلکہ اصل رنگ نمایاں کرتا ہے۔ وہ امت کو ''جدت'' کے نام پر تماشہ گاہ میں نہیں لے جاتا بلکہ سنّت کے دروازے تک واپس لاتا ہے۔ وہ شریعت کے چہرے پر زمانے کی ملمع سازی نہیں کرتا بلکہ خواہشات کے دبیز پردے ہٹا کر اس کی پہلی روشنی دکھاتا ہے۔ مجدد وہ نہیں جو ہر نئی چیز کو ''تقاضۂ عصر'' کہہ کر قبول کر لے بلکہ وہ ہے جو ہر چیز کو قرآن وسنت اور فہمِ اسلاف کی میزان پر پرکھے۔ وہ امت کو فتنوں سے مانوس نہیں کرتا بلکہ ان سے باخبر اور محتاط بناتا ہے۔ وہ دلوں میں دنیا کی چمک نہیں، آخرت کی فکر پیدا کرتا ہے۔ وہ خانقاہ کو اسٹیج، منبر کو اشتہار اور نسبتِ روحانی کو تصویروں، پوسٹروں اور نعروں کی زینت نہیں بناتا۔ اس کی نگاہ مریدوں کے ہجوم پر نہیں بلکہ ان کے ایمان کی سلامتی پر ہوتی ہے۔ اس کی نگاہیں عقیدت مندوں کی جیبوں اور بینک اکاؤنٹس پر نہیں ہوتیں بلکہ اُن کے دلوں میں بجھتے ہوئے ایمان کے چراغوں پر ہوتی ہیں۔ وہ مال کی گردش نہیں دیکھتا، روح کی کیفیت دیکھتا ہے۔ اس کے لیے مرید کی حیثیت اس کے نذرانوں سے نہیں بلکہ اُس آہ سے متعین ہوتی ہے جو رات کی تنہائی میں خوفِ خدا سے اس کے سینے سے اٹھتی ہے۔ وہ ہاتھوں کی پیشکش سے زیادہ دلوں کی دھڑکن سنتا ہے اور ظاہری عقیدت سے زیادہ باطن کی سچائی کو اہمیت دیتا ہے۔ مجدد وہ نہیں جو اپنے گرد عقیدت کا حصار کھڑا کرے بلکہ وہ ہے جو ہر حصار توڑ کر لوگوں کو براہِ راست حضور ﷺ کی غلامی میں دے دے۔ وہ اپنی ذات کو مرکز نہیں بناتا بلکہ سنّت کو محور بنا دیتا ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی تصویر کا اسیر نہیں بلکہ سیرتِ مصطفی ﷺ کی راہ کا فقیر بناتا ہے۔ اس کی مجلس میں شور کم اور فکر زیادہ ہوتی ہے، دعویٰ کم اور درد زیادہ، نمائش کم اور اخلاص زیادہ۔ وہ اپنے دور کے فتنوں سے سمجھوتہ نہیں کرتا بلکہ خموشی، حکمت اور استقامت کے ساتھ ان کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ حقیقی مجدد کو زمانہ پہلے پہچانتا نہیں، اکثر اس کی مخالفت کرتا ہے، اس پر طعن کرتا ہے، اس کی راہ میں کانٹے بچھاتا ہے مگر وقت گذرنے کے بعد یہی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ اس نے کوئی نیا دین پیش نہیں کیا تھا بلکہ پرانے چراغوں میں بجھتی ہوئی روشنی پھر سے زندہ کر دی تھی۔ مگر اب معاملہ یہ ہے کہ بعض طبقہ فوٹوگرافی کو ''اسلامی تہذیب'' کا حصہ ثابت کرنے میں مصروف ہے، کوئی ویڈیو سازی کو ''ابلاغِ دین کی ناگزیر ضرورت'' کہہ کر مطمئن ہے اور کوئی اس پر ایسا مسرور ہے جیسے اس نے بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔ اور اس کے معتقدین متوسلین اسی بنیاد پہ اسے مجدد نہیں بلکہ مجدد اعظم کہہ کر پھولے نہیں سماتے۔

عجب تماشا ہے! جن تصویروں سے کبھی گھروں کی دیواریں خالی رکھی جاتی تھیں تا کہ ملائکۂ رحمت کی آمد میں رکاوٹ نہ ہو، آج انہی دیواروں پر ''روحانی پوسٹر'' آویزاں ہیں۔ مرشد کی تصویر اس اہتمام سے سجائی جاتی ہے کہ دیکھنے والا حیران رہ جائے کہ یہ خانقاہ ہے یا کسی فلمی ستارے کی یادگار گیلری! بعض مقامات پر نسبت روحانی کی ظاہری نمائش اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اصل باطنی تعلق پس منظر میں جاتا محسوس ہوتا ہے۔ کہیں تصویر پر پھولوں کے ہار ڈالے جا رہے ہیں، کہیں عقیدت کے نام پر فریموں کو بوسے دیے جا رہے ہیں اور کہیں مرید اس شان سے تصویر کے سامنے کھڑا ہے جیسے بیعت نہیں، فوٹو سیشن ہو رہا ہو۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب ''تصوف'' کا معیار نسبتِ باطن نہیں بلکہ ''پروفائل پکچر'' رہ گیا ہے۔ خدشہ یہ ہے کہ کہیں نسبت باطن کی ظاہری وابستگیوں اور نمائشی علامتوں کے شور میں دب نہ جائے۔ مرشد سے تعلق کی گہرائی کا اندازہ اب ذکر وفکر سے نہیں بلکہ

وال پیپر کی ریزولوشن سے کیا جاتا ہے اور لطف یہ کہ اس سب کے باوجود دعویٰ یہی: ''ہماری تمام تحقیقات مسلکِ اسلاف کے عین مطابق ہیں!'' اسلاف کرام آج اگر واپس آجائیں تو شاید پہلے اپنے مسلک کو پہچاننے کے لیے انہیں کسی شارح کی ضرورت محسوس ہوگی۔

وہ حیرت سے پوچھیں کہ: ''احیائے دین'' کی یہ کون سی نئی شکل ہے جس میں خانقاہ اسٹوڈیو بن گئی، محراب اسکرین اور مریدین ناظرین؟

تجدید کا منصب اشتہار سے نہیں ملتا، نہ کتابوں کے دیباچوں میں ''مجدد العصر'' لکھ دینے سے کوئی مجدد ہو جاتا ہے۔ یہ وہ خلعت ہے جو زمین نہیں، آسمان عطا کرتا ہے۔ یہ کسی انجمن کے ووٹوں سے نہیں ملتی، نہ تعریفی خطابات کے شور سے، نہ مریدوں کے نعروں سے، نہ عقیدت کے ہجوم سے۔

یہ منصب نہ اشتہار کا محتاج ہوتا ہے، نہ تصویروں کا، نہ تعارف ناموں کا۔ یہ وہ تاج ہے جو سر پر رکھنے سے پہلے دل کو آزمائشوں کی آگ میں گذارا جاتا ہے۔ یہ وہ امانت ہے جس کے لیے راتوں کی تنہائی، سجدوں کی نمی، آنکھوں کے آنسو اور کردار کی پاکیزگی درکار ہوتی ہے۔ اس مقام تک خواہش نہیں پہنچاتی، انتخابِ الٰہی پہنچاتا ہے۔ مجددیت وراثت میں نہیں ملتی کہ باپ کے بعد بیٹا خود بخود ''وارثِ تجدید'' بن جائے، نہ یہ قلمی شورشوں کا انعام ہے کہ چند کتابیں لکھ کر انسان اپنے نام کے ساتھ ''مجدد العصر'' یا ''مجدد اعظم'' کا سابقہ لگا لے۔ یہ تو وہ راز ہے جسے زمین سے زیادہ آسمان پہچانتا ہے۔ اس کی گواہی انسانوں کی زبانیں کم اور فرشتوں کی دعائیں زیادہ دیتی ہیں۔ یہ وہ نور ہے جو اشتہاروں کی روشنی سے نہیں بلکہ تہجد کے اندھیروں سے پھوٹتا ہے۔ اس کی بنیاد نعروں پر نہیں، سجدوں پر رکھی جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شہرت دروازے پر کھڑی رہتی ہے مگر اخلاص اندر سجدہ ریز ہوتا ہے۔ یہ وہ مرتبہ ہے جہاں انسان خود کو مٹاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے دلوں میں زندہ کر دیتا ہے۔ یہ وہ سعادت ہے جسے حاصل کرنے کے لیے زبان سے زیادہ کردار بولتا ہے اور دعووں سے زیادہ آنسو شہادت پیش کرتے ہیں۔ یہ وہ امانت ہے جسے کتابوں کے دیباچے نہیں اٹھاتے بلکہ ٹوٹے ہوئے دل اٹھاتے ہیں۔ یہ وہ نسبت ہے جو فریموں میں قید نہیں ہوتی بلکہ سینوں میں اترتی ہے۔ یہ وہ عظمت ہے جس کے لیے زمین پر شور نہیں مچتا مگر عرش پر اس کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ وہ چراغ ہے جسے زمانہ بجھانے کی کوشش کرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ ہوا کے رخ بدل دیتا ہے۔ یہ وہ خوشبو ہے جو اپنے تعارف کی محتاج نہیں ہوتی، زمانہ خود اس کی سمت کھنچا چلا آتا ہے۔ یہ وہ اثر ہے جو لفظوں سے پہلے نگاہوں میں اور نگاہوں سے پہلے کردار میں اترتا ہے۔ یہ وہ صداقت ہے جو وقتی ہجوم سے نہیں ناپی جاتی بلکہ صدیوں کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان اپنے لیے کچھ نہیں چاہتا مگر خدا اسے امت کے لیے سایۂ رحمت بنا دیتا ہے۔ حقیقی مجدد اکثر اپنی ذات کے اعلان سے دور بھاگتا ہے۔ وہ اپنے نام کے ذکر و تذکرے سے زیادہ دین کے چراغ کی فکر کرتا ہے۔ اسے اپنے تعارف کی نہیں، امت کی اصلاح عزیز ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بجائے خدا کی طرف جھکا دیتا ہے۔ اس کے قدموں میں شہرت خود آکر گرتی ہے مگر وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکتا نہیں۔ وہ مقبولیت کا طلب گار نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ اس کے اخلاص کو دلوں کی دھڑکن بنا دیتا ہے۔ اس کی عظمت کا اعلان پوسٹر نہیں کرتے، اس کے آثار کرتے ہیں۔ اس کی سچائی کا ثبوت کیمرے نہیں دیتے، زمانہ دیتا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ خود اپنے مجدد ہونے کے اعلان میں سب سے آگے ہوتے ہیں، تاریخ اکثر انہیں حاشیوں میں چھوڑ دیتی ہے مگر جو خموشی سے دین کی خدمات انجام دیتے ہیں، اپنا نام مٹا کر سنت کے چراغ جلاتے ہیں، وقت انہی کے قدموں کے نشان محفوظ کر لیتا ہے کیونکہ یہ منصب تقریروں سے نہیں ملتا، آہوں سے ملتا ہے۔ یہ دعووں سے نہیں ملتا، فنا سے ملتا ہے۔ یہ زمین کے سرٹیفکیٹ سے نہیں، آسمان کی گواہی سے ملتا ہے مگر عہدِ حاضر کی ترجیحات نے شاید یہ حقیقت پسِ پشت ڈال دی ہے، اسی لیے اب میزانِ قبولیت بدلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور شاید یہی ہمارے عہد کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ اب دین کا وقار کم اور ''پریزنٹیشن'' زیادہ دیکھی جاتی ہے، اخلاص کم اور 'کوریج' زیادہ۔ اب وعظ کی تاثیر سے پہلے مائیک کا سسٹم دیکھا جاتا

ہے، بیان کے درد سے پہلے کیمرے کا اینگل اور دعوت دین کی حقانیت سے پہلے اس کی ''ریچ'' ناپی جاتی ہے۔ حالانکہ ذرائع اپنی ذات میں نہ خیر مطلق ہیں نہ شر مطلق، اصل سوال یہ ہے کہ مرکز توجہ پیغام ہے یا اس کی نمائش۔ بعض حلقوں کا انداز دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے روحانیت بھی رفتہ رفتہ ''پروڈکشن'' کا حصہ بنتی جا رہی ہو۔ خانقاہوں کی خموش فضا، ذکر کی مدھم صدائیں، سجدوں کی نمی، تہجد کی آہیں---سب کچھ اس شور میں کہیں دب سا گیا ہے جسے ''ابلاغ'' کا نام دیا جا رہا ہے۔ پہلے بزرگ اس خوف سے چھپتے تھے کہ کہیں شہرت ان کا اخلاص نہ کھا جائے، آج بعض لوگ اس خوف میں مبتلا ہیں کہ کہیں ان کی شہرت کم نہ ہو جائے۔ پہلے اعمال چھپائے جاتے تھے تاکہ رب راضی ہو، اب ان کی نمائش کی جاتی ہے تاکہ لوگ متأثر ہوں۔ اب بعض جگہوں پر علم کی گہرائی سے زیادہ آواز کی گونج اہم ہو گئی ہے، تقوے کی روشنی سے زیادہ اسٹیج کی لائٹنگ اور باطن کی پاکیزگی سے زیادہ چہرے کی ''پبلک امیج''۔ یوں لگتا ہے جیسے اب دلوں کی اصلاح نہیں بلکہ ''فالورز'' کی تعداد مقصود ہو۔ جس مجلس میں کبھی ''اللہ---اللہ'' کی کیفیت طاری ہوتی تھی وہاں اب ویڈیو کلپس کی پلاننگ ہو رہی ہے۔ جہاں کبھی آنکھیں خوفِ خدا سے نم ہوتی تھیں وہاں اب یہ فکر ہے کہ کون سا منظر زیادہ ''وائرل'' ہوگا۔ حالاں کہ دین کی اصل قوت ہمیشہ اخلاص رہی ہے، نمائش نہیں۔ اول اول اسلام کی صدائیں ریگستانوں میں بلند ہوئیں مگر ان میں ایسا سوز تھا کہ قیصر و کسریٰ کے ایوان ہل گئے۔ وہ صدا نہ کسی نشریاتی ادارے کی محتاج تھی، نہ کسی کیمرے کی روشنی کی، نہ کسی ''وائرل مہم'' کی۔

وہ چند مخلص دلوں سے نکلی تھی مگر اس میں وہ حرارت تھی جس نے صدیوں کے منجمد نظام پگھلا دیے، مردہ دلوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی اور ظلمت کے عادی زمانوں کو نور کی طرف پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ایسی صدا تھی جس نے سنگ دلوں کو موم کیا، غلاموں کو حریت کا شعور دیا اور خاک نشینوں کو ایوانِ سلطنت سے زیادہ باوقار بنا دیا۔ اس میں نہ لفظوں کی بناوٹ تھی، نہ خطابت کی مصنوعی چمک مگر یقین کا ایسا سوز تھا کہ سننے والے کے دل میں اتر جاتا تھا۔ وہ آواز کانوں سے زیادہ روحوں میں سنی جاتی تھی۔ وہ دلیل سے پہلے کیفیت پیدا کرتی تھی اور کیفیت سے پہلے خدا کا خوف۔ اسی حرارت کا اثر تھا کہ ریگستانوں کے مسافر دنیا کے رہبر بن گئے، اونٹوں کی نکیلیں تھامنے والے قوموں کی تقدیر تھامنے لگے اور مٹی پر سجدہ کرنے والوں کے سامنے تاجداروں کے سر جھکنے لگے۔ وہ لوگ جن کے گھروں میں چراغ کم جلتے تھے مگر دل نورِ یقین سے روشن تھے، انہوں نے ایسی تہذیب کی بنیاد رکھی جس کے سامنے صدیوں کی سلطنتیں بھی ہیچ محسوس ہونے لگیں۔ ان کے پاس زر و جواہر کے خزانے نہیں تھے مگر کردار کی ایسی دولت تھی جس نے دنیا کے ایوانوں کو مرعوب کر دیا۔ ان کے قدم ریگستان کی خاک پر اٹھتے تھے مگر ان کی نگاہیں آسمان سے وابستہ تھیں۔ ان کی زبانوں پر تلاوتِ قرآن تھی، پیشانیوں پر سجدوں کا نور اور دلوں میں خوفِ خدا کی وہ کیفیت جس نے انہیں دنیا کی ہر طاقت سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ جب میدان میں اترتے تو تلوار سے پہلے ان کے یقین کی ہیبت دشمن کے قلعے ہلا دیتی تھی۔ وہ جب بولتے تو لفظ کم ہوتے مگر تاثیر ایسی کہ مردہ دلوں میں ایمان کی دھڑکن دوبارہ جاگ اٹھتی۔ انہی لوگوں نے دنیا کو بتایا کہ اصل قوت اسبابِ دنیا میں نہیں بلکہ تعلق الٰہی میں ہوتی ہے۔

سلطنتیں فوجوں سے فتح کی جا سکتی ہیں مگر دل صرف اخلاص سے فتح ہوتے ہیں اور یہی وہ راز تھا جس نے خاک نشینوں کو زمانے کا امام بنا دیا۔ ان کی فتوحات صرف زمینوں کی فتوحات نہ تھیں بلکہ قلوب، افکار و شعور اور انسانیت کی فتوحات تھیں۔ انہوں نے شہروں سے پہلے انسانوں کو آباد کیا، قلعوں سے پہلے دلوں کو فتح کیا اور حکومت سے پہلے اخلاق کی سلطنت قائم کی اسی لیے ان کا ذکر تاریخ کے اوراق میں نہیں بلکہ امت کے اجتماعی شعور میں زندہ ہے در حقیقت ان کی اسی غیر معمولی تاثیر اور عالمگیر قبولیت کا سرچشمہ نہ ظاہری وسائل تھے، نہ خطابت کی مصنوعی چمک بلکہ وہ باطنی سوز تھا جو ایمان کی گہرائیوں سے پھوٹتا ہے۔ وہ حرارت کتابوں کے حوالوں سے نہیں آئی تھی بلکہ ایمان کی گہرائی سے آئی تھی۔ وہ لہجہ علمی بحثوں سے نہیں بلکہ تہجد کی آہوں سے پیدا ہوا تھا۔ وہ تاثیر کیمروں کی آنکھ نے نہیں دیکھی تھی بلکہ آسمان نے قبول کی تھی۔ اسی لیے ان کی ایک صدا لشکروں پر بھاری تھی، ان کی

ایک آہ دلوں کے قفل کھول دیتی تھی اور ان کا ایک سجدہ زمانے کے باطل غرور کو ہلا دیتا تھا۔ آج بھی اگر امت کو کھویا ہوا وقار واپس مل سکتا ہے تو محض نعروں، نمائشوں اور اسکرینوں سے نہیں بلکہ اسی سوزِ یقین، اسی اخلاص اور اسی حرارتِ ایمانی سے مل سکتا ہے جس نے کبھی تاریک دنیا کو اجالوں سے بھر دیا تھا۔

مکہ مکرمہ کی تپتی ہوئی ریت پر اٹھنے والی حضرت سیدنا بلال حبشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وہ درد بھری ''اَحد...... اَحد'' کی صدا آج بھی تاریخ کے سینے میں زندہ ہے، کیونکہ وہ ہونٹوں سے کم اور یقین کے لہو سے زیادہ لکھی گئی تھی۔ مدینہ کی گلیوں میں سنائی دینے والی اذانوں کے پیچھے نہ ساز تھا، نہ مصنوعی ترنم مگر ان میں ایسی روح تھی کہ سوئی ہوئی انسانیت جاگ اٹھی۔ وہ لوگ تعداد میں کم تھے مگر تعلق الٰہی میں بے مثال، وسائل میں محدود تھے مگر یقین میں پہاڑوں سے زیادہ مضبوط۔ ان کے پاس نہ میڈیا سیل تھا، نہ تشہیری ٹیمیں مگر ان کے سجدوں کی گرمی نے آدھی دنیا کے تخت ہلا دیے۔ ان کی دعوت تصویروں سے نہیں، کردار سے پھیلتی تھی۔ ان کے چہرے اشتہار نہیں تھے مگر نورِ ایمان سے روشن تھے۔ ان کی راتیں اسکرینوں کی چکا چوند میں نہیں بلکہ تہجد کے اندھیروں میں گذرتی تھیں اور انہی اندھیروں سے وہ روشنی پھوٹی جس نے زمانوں کو منور کر دیا۔ پھر وہ وقت آیا کہ ایک طرف کسریٰ کے محلات تھے اور دوسری طرف فقرائے مدینہ کی جھونپڑیاں مگر فیصلہ تلواروں سے پہلے کردار نے کیا۔ دنیا نے پہلی بار دیکھا کہ بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس لوگ، جن کے سروں پر تاج نہ تھے، دلوں کے بادشاہ بن گئے۔ ان کے الفاظ میں خطابت کی بناوٹ کم تھی مگر یقین کی آگ زیادہ تھی۔ ان کے بیانات میں مصنوعی جوش نہیں تھا بلکہ وہ سوز تھا جو دلوں کو جلا کر انہیں خدا کے سامنے جھکا دیتا تھا۔ آج اگر ہم غور کریں تو محسوس ہوگا کہ اسلام کی اصل قوت کبھی ''نمائش'' نہیں رہی بلکہ وہ خموش اخلاص رہا ہے جو تنہائی کے سجدوں میں پروان چڑھتا ہے۔ وہ قوت جو حضرت سیدنا ابوبکر صدیق کی آہوں میں تھی، حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم کی ہیبت میں تھی، حضرت سیدنا عثمان غنی کی حیاء میں تھی اور حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے علم و زہد میں تھی۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس کیمرے نہیں تھے مگر تاریخ ان کی تصویر بن گئی، ان کے پاس میڈیا نہیں تھا مگر صدیاں ان کی ترجمان بن گئیں، ان کے پاس ''فالورز'' کی گنتی نہیں تھی مگر دل نسلوں تک ان کے پیچھے چلتے رہے اور آج...... ہم نے شاید وسائل تو بڑھا لیے ہیں مگر وہ سوز کھو دیا ہے۔ آوازیں زیادہ ہوگئی ہیں مگر تاثیر کم، اسکرینیں روشن ہوگئی ہیں مگر دل بجھتے جا رہے ہیں۔ حالاں کہ دین کی فتح ہمیشہ آلات سے نہیں، اخلاص سے ہوتی ہے۔ آج مسئلہ یہ نہیں کہ ذرائع بدل گئے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ کہیں ذرائع ہی مقصد نہ بن بیٹھیں۔ کیمرہ اگر خادم رہے تو ممکن ہے بعض اوقات فائدہ بھی دے مگر جب وہ روحانیت پر حاکم بن جائے تو پھر اخلاص کی سانس گھٹنے لگتی ہے۔ اسی لیے اب بعض مجالس میں سوز کم اور "سیٹ اپ" زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

الفاظ میں وزن کم اور "ایفیکٹس" زیادہ، دلوں کی گرمی کم اور اسکرینوں کی چمک زیادہ۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ تقریریں بڑھ رہی ہیں مگر دل نہیں بدل رہے، ویڈیوز پھیل رہی ہیں مگر خشیت کم ہو رہی ہے، چہرے مشہور ہو رہے ہیں مگر کردار اجنبی ہوتے جا رہے ہیں۔

کثرت خطاب اور وسعت ابلاغ کے باوجود وہ باطنی تبدیلی کم دکھائی دیتی ہے جو کبھی اخلاص سے پیدا ہوتی تھی۔

کیونکہ دین جب نمائش کا لباس پہن لیتا ہے تو اس کی روح آہستہ آہستہ پردۂ خفا میں چلی جاتی ہے اور جب اخلاص رخصت ہونے لگے تو پھر آوازیں بہت رہ جاتی ہیں، اثر کم ہو جاتا ہے۔

کیونکہ دین کی اصل قوت صرف آواز، منظر اور شہرت میں نہیں بلکہ اس روحانی شعور میں ہوتی ہے جو دلوں کو حضور اکرم ﷺ کے در سے وابستہ رکھتا ہے۔

آخر میں شاید سب سے اہم سوال یہی ہے کہ
ہم دین بچانا چاہتے ہیں یا صرف اپنی وابستگیوں کو؟
ہمیں چراغِ نبوت کی روشنی مطلوب ہے یا اپنے اپنے حلقوں کی چکا چوند؟

ہم واقعی تجدیدِ دین کے طلبگار ہیں یا صرف ایسے ناموں اور نعروں کے اسیر ہو چکے ہیں جو دلوں کو وقتی جوش تو دیتے ہیں مگر روح کو بیدار نہیں کرتے؟

تاریخ کا مزاج بڑا عجیب ہے۔

وہ وقتی ہجوموں، بلند نعروں، مصنوعی تقدس اور اشتہاری شہرتوں سے زیادہ دیر متأثر نہیں رہتی۔

وقت کی گرد جب بیٹھ جاتی ہے تو پھر صرف وہی نام باقی رہتے ہیں جنھوں نے اپنے عہد کے اندھیروں میں حق کا چراغ جلایا ہو، جنھوں نے دین کی سرحدوں کی حفاظت میں اپنی راحتیں قربان کی ہوں، جنھوں نے امت کو اپنی ذات سے نہیں بلکہ حضورِ اکرم ﷺ کے درِ اقدس سے وابستہ کیا ہو۔

حقیقی مجدد وہ نہیں جو زمانے کے ہر دباؤ کے ساتھ اپنے لہجے بدلتا رہے بلکہ وہ ہے جو طوفانوں کے درمیان بھی چراغِ سنّت کو ہاتھ سے گرنے نہ دے۔

وہ لوگوں کے ذوق کے مطابق دین کی صورت نہیں بدلتا بلکہ دین کی اصل صورت سامنے رکھ کر لوگوں کے ذوق بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔

وہ فتنوں کے ساتھ مفاہمت نہیں کرتا بلکہ حکمت، صبر، علم اور استقامت کے ساتھ ان کے سامنے دیوار بن جاتا ہے۔

اور شاید یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے اکثر اپنی زندگی میں پوری طرح پہچانے نہیں جاتے۔

ان پر اعتراض بھی ہوتے ہیں، ان کی مخالفت بھی کی جاتی ہے، ان کی آواز دبانے کی کوشش بھی ہوتی ہے مگر وقت گذرنے کے بعد تاریخ خود اعتراف کرتی ہے کہ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے بجھتے چراغوں کو پھر سے روشن کیا تھا۔

آج امت کو پھر اسی اخلاص، اسی سوز، اسی جرأتِ حق اور اسی روحانی حرارت کی ضرورت ہے جس نے کبھی ریگستانوں سے اٹھ کر دنیا کے اندھیروں کو شکست دی تھی۔

وہی حرارت جس نے مٹھی بھر بے سروسامان انسانوں کو زمانے کے جابر نظاموں کے سامنے کوہِ استقامت بنا دیا تھا۔

وہی سوز جس نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو ایمانی حریت کا شعور عطا کیا تھا۔

وہ ایسی آگ نہ تھی جو شہرت کے ایندھن سے بھڑکتی ہو بلکہ وہ نور تھا جو یقین، اخلاص اور تعلقِ الٰہی سے پھوٹتا تھا۔

اس نے ریگستانوں کی خموش ریت کو تاریخ کے سب سے عظیم انقلاب کا گواہ بنا دیا۔

اس نے فقر کے عریشوں سے ایسے مردانِ حق اٹھائے جن کے سامنے قیصر و کسریٰ کے ایوان لرزنے لگے۔

انہی دلوں کی حرارت تھی کہ راتوں کے سجدے دن کے معرکوں میں فتح بن کر ابھرتے تھے۔

تہجد کی آہیں میدانِ کارزار میں جرأت بن جاتی تھیں اور خوفِ خدا کی کیفیت انسان کو دنیا کی ہر طاقت سے بے نیاز کر دیتی تھی۔

ان کے پاس دنیاوی وسائل کم تھے مگر آسمانی اعتماد بے پناہ تھا۔

اسی لیے ان کی ایک صدا لشکروں پر بھاری پڑتی تھی اور ان کا ایک سجدہ زمانوں کے غرور کو ہلا دیتا تھا۔

آج بھی اگر امت اپنے زخموں سے اٹھ سکتی ہے، اپنی کھوئی ہوئی روحانی عظمت واپس پا سکتی ہے اور فتنوں کے اس ہجوم میں اپنی شناخت محفوظ رکھ سکتی ہے تو اسے اسی سوزِ دروں، اسی اخلاص اور اسی تعلقِ مصطفوی ﷺ کی طرف لوٹنا ہوگا۔

کیونکہ قومیں صرف ہتھیاروں سے نہیں اٹھتیں، دلوں کے زندہ ہونے سے اٹھتی ہیں۔

اور دل اُس وقت زندہ ہوتے ہیں جب ان میں دنیا کی محبت سے زیادہ خدا کا خوف اور رسولِ اکرم ﷺ کی محبت جاگنے لگے۔

اور جب دلوں کی یہ کیفیت ماند پڑنے لگے تو پھر امت ظاہری ذرائع کی کثرت کے باوجود وہ باطنی تاثیر کھونے لگتی ہے جو کبھی اخلاص اور تعلقِ الٰہی سے پیدا ہوتی تھی۔

کیونکہ دین کی اصل طاقت نہ کیمروں میں ہے، نہ اسٹیج کی روشنیوں میں، نہ نعروں کے شور میں اور نہ سوشل میڈیا کی مقبولیت

میں۔

اس کی اصل قوت آج بھی وہی ہے جو کل تھی: ایک سچا سجدہ، ایک لرزتی ہوئی آہ، ایک بے ریا آنسو، ایک باعمل عالم، ایک مخلص داعی اور ایک ایسا دل جو دنیا سے زیادہ خدا کے حضور جواب دہی سے ڈرتا ہو۔

شاید اسی لیے تاریخ کے حقیقی مجدد دین نے اپنے ناموں کے مینار تعمیر نہیں کیے بلکہ سنّتِ مصطفی ﷺ کے چراغ روشن کیے۔

انہوں نے اپنی عظمت ثابت کرنے میں عمر صرف نہیں کی بلکہ دین کی عظمت بچانے میں خود کو مٹا دیا۔

ان کی حیات کے پاکیزہ اوراق یہ سبق دیتے ہیں کہ

جو لوگ اپنے لیے جیتے ہیں وہ وقت کے ساتھ مٹ جاتے ہیں

مگر جو چراغ دینِ خدا کے لیے جلتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں صدیوں تک روشنی بنا کر زندہ رکھتا ہے۔

اور یہی تجدیدِ دین کی اصل روح ہے......

کہ انسان اپنی ذات کو پس منظر میں رکھ دے اور چراغِ مصطفی ﷺ کو زمانے کے ہر طوفان میں روشن رکھنے کی کوشش کرتا رہے۔

انبیائے کرام و رسولانِ عظام کے ہاں ایک دوسرے کی مخالفت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ہر نبی و رسول نے ایک دوسرے کی تصدیق کی ہے اور انبیائے کرام کی یہی سنّت کریمہ مجدد دین اسلام کے ہاں بھی ملتی ہے۔ ایک مجدد دوسرے مجدد کی قطعی مخالفت نہیں کرتا، لیکن برصغیر ہند و پاک میں جو لوگ خود کو مجدد دین اسلام کی صف میں شمار کرتے ہیں، ان کے ہاں یہ سنّت نہیں ملتی۔ جب دلی سے شائع ہونے والے ایک رسالے نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی شدید مخالفت کا صور پھونکا تو خود کو مجدد سمجھنے والے سارے مجدد دین نے اس رضا مخالف تحریک میں شرکت ہی نہیں کی بلکہ بڑی فراخ دلی سے اس کا مالی تعاون بھی کیا۔

تمام مجددِ دین کی تاریخ اسی طرح کے حصار میں نظر آئے گی۔ انہوں نے دین و شریعت کی سرحدوں کی نگہبانی کی تو خدائے پاک نے ان کی عظمت، شہرت اور مقبولیت کے چراغ کی لو کو کبھی مدھم نہیں ہونے دی۔

حضرت عمر بن عبد العزیز قدس سرہ سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ تک مجددِ دین اسلام کا ایک طویل سلسلہ ہے اور ہر جگہ دینی غیرت پورے شباب پر نظر آتی ہے۔

مجدد ہر وقت حدودِ شریعت میں ہوتا ہے اور شریعت کی جو نسیں غبارِ وقت میں دب جاتی ہیں انھیں غبارِ وقت سے نکال کر پھر سے تر و تازہ کر دیتا ہے۔

مجدد ہر وقت مشیت کی پناہ میں ہوتا ہے، اسی لیے وقت کا بڑے سے بڑا طوفان خوف زدہ نہیں کر پاتا۔ وہ ہر طاغوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتا ہے۔ وہ نہ جماعت دیکھتا ہے اور نہ جمعیت دیکھتا ہے۔ وہ تیر و تلوار کی بارش میں بھی حمایت حق، نیابت حق اور اشاعت حق میں خود کو مصروفِ کار رکھتا ہے۔ حکومت وقت کا جبر اس کے عزم کی شدت کو کسی بھی جہت سے کم نہیں کر پاتا، زنداں کی آہنی اور فولادی دیواریں اس کے حوصلوں کو پست نہیں کر پاتیں۔ یہ اٹل حقیقت ہے کہ جو خدائے پاک سے ڈرتا ہے وہ زمانے کی کسی طاقت سے نہیں ڈرتا۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ تن تنہا تھے، ان کے عہد کے علما بھی کھل کر ان کی حمایت میں نہیں تھے۔ علما کی نگاہ حکومت کے جبر پہ تھی لیکن مجدد الف ثانی کی نگاہ رضائے رحمٰن میں تھی۔ وہ اس فلسفے کے عارف تھے، وہ جانتے تھے کہ صداقت مٹتی نہیں ہے۔ جو صداقت کے مقابل آتا ہے، صداقت اسے مٹا دیتی ہے۔ اکبری دین الٰہی اس کے ساتھ قبر میں دفن ہو گیا، لیکن مجدد الف ثانی کی یادوں کا چراغ آج بھی دلوں کی کائنات میں پورے شباب پہ روشن ہے اور ان شاء اللہ تا قیامت یونہی روشن رہے گا۔

خدمات سے کوئی مجدد نہیں ہوتا، انسان چھوٹا ہو یا بڑا، اس کے ساتھ اس کی خدمات ہوتی ہیں۔ اگر مجدد کے لیے خدمات کو پیمانہ بنایا جائے تو کھیت کے ہر ڈھیلے کے نیچے سے ایک مجدد نکل آئے گا۔ علما پیدا ہوتے ہیں لیکن مجدد مبعوث ہوتا ہے۔ حضور مجاہد ملّت اور حضور حافظ ملّت بہت بڑے آدمی تھے، ان کی خدمات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ ان کی عظمتیں آسمان میں روشن ہیں، پھر بھی انہیں کوئی مجدد نہیں

کہتا۔ حضور صدر الشریعہ ان دونوں کے استاذ اور مربی کی صف میں آتے ہیں۔ برصغیر ہند و پاک کی کوئی درس گاہ ایسی نہیں ہے جس میں حضور صدر الشریعہ کا علمی فیضان کام نہ کر رہا ہے۔ اس کے باوجود آج تک ان کے کسی شاگرد نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ حضور صدر الشریعہ کو ان کے دینی، ملّی، علمی اور تصنیفی خدمات کی بنیاد پر مجدد کے لقب سے ملقب کیا جانا چاہیے۔ مجدد کے لیے اصول متعین ہیں، وقت متعین ہے اور خدمات کے دائرے متعین ہیں۔ مجدد شاہوں کے دربار میں حاضری نہیں دیتا، مجدد دنیا میں کبھی دلچسپی نہیں لیتا، مجدد لمحہ بھر کے لیے شریعت سے غافل نہیں ہوتا۔ مجدد بدعات کو مٹاتا ہے، وہ بدعات کا شکار نہیں ہوتا۔ آج تک کسی مجدد کی تصویر نہیں دیکھی گئی۔ اگر کسی نے قلم سے بنا لیا ہو تو یہ الگ بات ہے۔ تصویر کی حرمت اٹل ہے، اسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ مجدد تعصّبات کا بھی شکار نہیں ہوتا۔ ایک مجدد دوسرے مجدد کی مخالفت بھی نہیں کرتا بلکہ اس وقت جو لوگ مجددیت کے دعوے دار ہیں، ان کی صبح و شام اعلیٰ حضرت کی مخالفت سے رنگین ہے۔ مجدد ضد کے حصار میں بھی نہیں آتا اور مجدد انا پسند بھی نہیں ہوتا۔ مجدد خدائی آواز ہوتا ہے۔ اس کا ہر فیصلہ حدودِ شریعت میں ہوتا ہے۔ وہ مردہ سنتوں کو زندہ کرتا ہے، بدعات و خرافات کو مٹاتا ہے اور باطل کے خلاف تاحیات مصروفِ جہاد ہوتا ہے۔ شریعت کے باب میں اسے کسی کے روٹھنے اور بچھڑنے کی بھی فکر نہیں ہوتی۔ وہ براہِ راست بارگاہِ محبوبِ خدا ﷺ سے رابطے میں ہوتا ہے، فتنے اس کی تلاش میں نہیں ہوتے بلکہ وہ خود فتنوں کی تلاش میں ہوتا ہے۔ وہ رحمتوں کی آغوش میں سوتا ہے اور کرم کے سائبان میں زندگی گذارتا ہے۔ وہ اپنی زبان، اپنے بیان اور اپنے قلم سے ہر اس طاقت کی شہ رگ کاٹ دیتا ہے جو شریعت سے متصادم ہو، تمام مجددِ دین اسلام کی یہی تاریخ رہی ہے۔

مجدد وقت، حالات، تقاضے اور خدمات سے پہچانا جاتا ہے۔ مجدد دوسروں سے کتابیں لکھوا کر اپنے نام سے شائع نہیں کرتا، نہ دوسروں کی خدمات پہ اپنی مہر لگاتا ہے۔ وہ زبان و قلم کے باب میں بھی اپنے عہد پہ حاوی ہوتا ہے۔ حضرت امام جلال الدین سیوطی کی مصنفات چھ سو سے زائد ہیں اور ان کی ہر کتاب حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔ تالیف و تصنیف کی غرض سے آپ دریائے نیل کے کنارے روضۃ المعیاس میں برسوں معتکف رہے۔ اسلامی مفادات کے خلاف اٹھنے والے ہر سوال کا آپ نے دلائل کی روشنی میں جواب فراہم کیا۔ ایسا نہیں کہ سوال ہوا کہ وہابیہ کا ذبیحہ حلال ہے کہ حرام، تو جواب یہ مل رہا ہے کہ ابھی تو یہ فیصلہ ہی نہیں ہوا ہے کہ کون سنّی ہے، کون وہابی ہے؟ یہ جواب درشاتا ہے کہ مجدد حق و باطل کے باب میں خود شدید شبہات کا شکار ہے۔ مجدد کی ذات حق و باطل کے درمیان واضح امتیاز کی حیثیت رکھتی ہے۔ مجدد زمین پہ ہوتا ہے اور اس کی نگاہ عرش کی بلندیوں سے ہمکلام ہوتی ہے۔ مجدد کا جسم ہندوستان میں ہوتا ہے اور اس کی روح گنبد خضریٰ کے طواف میں مصروف ہوتی ہے۔ مجدد کی زبان بولتی ہے، اس کے دل کی گہرائیوں سے یہ صدا ہر وقت بلند ہوتی رہتی ہے کہ ہمارے دردِ جگر کی کوئی دوا نہ کرے، اور ہمارے حریمِ دل میں جو عشق و عرفان کی شمع جل رہی ہے اس کی روشنی کبھی مدھم ہو ایسا کبھی خدا نہ کرے۔ مجدد روحانی اعتبار سے ہر وقت بارگاہِ رسالت میں باریاب ہوتا ہے، وہ باطل کی سرکوبی کے لیے جرأتِ اظہار وہیں سے کشید کرتا ہے۔ مجدد خدا و حبیب خدا کا انتخاب ہوتا ہے۔ مجدد تاریکی میں گم نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی زبان و قلم سے تاریکی کا جگر چھلنی کر دیتا ہے۔ مجدد کو عشق کا وہ کمال حاصل ہوتا ہے کہ اس کی زبان بولتی ہے کہ۔

پیشِ نظر وہ نو بہار سجدے کو دل ہے بے قرار
روکیے سر کو روکیے ہاں یہی امتحان ہے

مجدد رفتارِ زمانہ کا شکار نہیں ہوتا، اس کی ہر سانس حدودِ شریعت میں ہوتی ہے، وہ پاسبانِ شریعت و طریقت ہوتا ہے۔ وہ زمانے کی ٹھوکر میں نہیں ہوتا بلکہ زمانہ اس کی ٹھوکر میں ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بہت دور تک دیکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ مجدد رازدارِ شریعت ہوتا ہے۔ وہ شرعی اصولوں کو غبار آلود نہیں کرتا بلکہ شرعی اصولوں کے چہرے پہ پڑی ہوئی دھول انتہائی خوش اسلوبی سے صاف کرتا ہے۔ وہ بچھڑی ہوئی روحوں کو اس کے مرکز سے جوڑتا ہے۔ خالق اور مخلوق کے درمیان اس کی حیثیت رابطے کی ہوتی ہے۔ وہ حالات کی تیز دھوپ میں بھی حوصلہ نہیں ہارتا، بلکہ حالات کی شدت دیکھ کر اس کا حوصلہ مزید فولادی ہو جاتا ہے۔ اس کی ہر سانس غمِ ملّت سے عبارت ہوتی ہے،

اس کے پاس نفس ہوتا ہے نہ نفسانیت ہوتی ہے۔ وہ عارفِ شریعت بھی ہوتا ہے اور عامل شریعت بھی ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت خوف وخشیت کے حصار میں ہوتا ہے، وہ علوم ومعارف کا جامع ہوتا ہے۔ جہاں خواص کے سوچ کی سرحدیں ختم ہوتی ہیں وہاں سے اس کے سوچ کی سرحدوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ مجدد حق وحقانیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ مجدد کی زبان وہی کہتی ہے جو شریعت کا منشا ہوتا ہے اور اس کا قلم وہی لکھتا ہے جو شریعت کا فرمان ہوتا ہے۔ گدائے میکدہ ہوں ہر طرح کی مئے ہے پیالی میں۔ ایسی طبیعت کا وہ سخت مخالف ہو، لیکن آج جو لوگ خود کو مجددین کی صف میں شمار کرتے ہیں ان کی کتابِ حیات الٹ کر دیکھیے جگہ جگہ بدعات ومنکرات کے سیاہ دھبے بہت نمایاں نظر آئیں گے۔ تصویر کشی، فوٹو سازی اور ویڈیو گرافی یہ بدعات کے قبیل سے ہیں۔ انھیں چیزوں کو وہ اپنی تجدیدی کارنامہ تصور کرتے ہیں، جبکہ یہ چیزیں ملّی تخریب کی نمایاں لکیریں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح آئینے میں تصویر چھپتی ہے اسی طرح کیمرے میں بھی تصویر چھپتی ہے۔ وہ تصویر کو عکس سمجھتے ہیں جبکہ تصویر اور عکس میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ حضرت مولانا مفتی اقتدار احمد نعیمی علیہ الرحمہ تفسیر نعیمی میں لکھتے ہیں:

تصویر اور عکس میں پانچ فرق ہیں۔ پہلا فرق یہ ہے کہ تصویر بنائی جاتی ہے، عکس خود بخود بن جاتا ہے۔ دوم یہ کہ تصویر کو بقا ہے، عکس کو بقا نہیں۔ سوم یہ کہ تصویر کی پوجا اور تعظیم ہوسکتی ہے، عکس کی نہیں۔ چوتھا یہ کہ تصویروں کو گھر میں لگا سجا کر مندر بنایا جاسکتا ہے، عکس کو نہیں، کیونکہ عکس کو بقا نہیں ہے۔ جب وہ شئے آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تو عکس ختم ہوگیا، مگر تصویر میں یہ بات نہیں۔ تصویر والا ہٹ بھی جائے بلکہ مر بھی جائے تب بھی تصویر باقی رہتی ہے۔ پنجم یہ کہ تصویر جیب یا بٹوے میں رکھی جاسکتی ہے، عکس نہیں رکھا جاسکتا۔ جاندار کی تصویر کو تمثال اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ مثیل وشبیہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذی روح مخلوق کی شریعت اسلامیہ میں تمثال اور مورتی تصویر بنانا حرام ہے۔ اس کی تعظیم گناہِ کبیرہ ہے۔ تصویروں کو لگانا سجانا ان کی تعظیم ہی ہے، اس لیے یہ بھی منع۔ تمثال ومورتی تصویر میں ایک شرعی فرق یہ بھی ہے کہ عکس کے سامنے نماز پڑھنا بالکل ہر طرح جائز ہے، مگر کپڑے کاغذ کی تصویر تمثال اور مورتی کے سامنے نماز پڑھنا قطعاً حرام ہے۔ (تفسیر نعیمی، پارہ:۱۷، ص:۲۴۸)

تصویر کشی، فوٹو سازی اور ویڈیو گرافی کی وبا عام سے عام تر ہوتی جارہی ہے۔ جو لوگ عدم جواز کے قائل ہیں ان کی دہلیزوں پر بھی یہ وبا ہر وقت رقص کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ چشم چراغ خاندانِ برکات اعلیٰ حضرت کا پیر خانہ بھی اس وبا سے محفوظ نہیں رہا۔ تھوڑے فرق کے ساتھ پیر خانہ ومرید خانہ دونوں ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہ بڑی قیامت کی دستک ہے۔ جب سربراہانِ مملکت بدعات میں گھر جائیں تو عوام کی جرأت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی زمانے کا مزاج رہا ہے۔

لطیف باتیں بھی احباب کو کھٹکتی ہیں
نہ جانے کون سا کانٹا میری زباں میں ہے

□□□□

رسائل وجرائد کا مطالعہ کیجیے، یہ زمانے کی نبض کو سمجھنے، فکر کو تازہ رکھنے اور اپنے شعور کو وسعت دینے کا مؤثر ذریعہ ہیں۔ جو قوم اپنے رسائل پڑھتی ہے، وہ اپنے عہد سے باخبر رہتی ہے اور جو قوم اپنے رسائل لکھتی ہے، وہ اپنے عہد کی فکری تشکیل میں حصہ لیتی ہے۔

محمد ملک الظفر سہسرامی

وہ بشارت جوصدیوں بعد حقیقت بن گئی

کبھی کبھی تاریخ خود بولتی نہیں بلکہ خموش اشاروں میں اپنی معنویت محفوظ رکھتی ہے۔ بعض حقیقتیں وہ فوراً آشکار نہیں کرتی بلکہ انہیں وقت کی تہوں میں اس طرح چھپا دیتی ہے کہ جب وہ ظاہر ہوں تو محض ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک مکمل معنوی انکشاف بن جائیں۔ ایسی ہی کچھ حقیقتیں ہیں جو ابتدا میں محض ایک جملہ، ایک وصیت یا ایک بشارت کی شکل میں سامنے آتی ہیں مگر زمانہ گذرنے کے ساتھ وہی الفاظ ایک زندہ حقیقت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی اتفاق نہیں تھا بلکہ ایک طے شدہ روحانی نقشہ تھا جس کی لکیریں پہلے ہی کھینچ دی گئی تھیں۔ وہ مشیت کے قلم سے لکھی ہوئی ایسی روشن تحریریں ہوتی ہیں جن میں آنے والے زمانوں کی دھندلی تصویریں پہلے ہی نمایاں کر دی جاتی ہیں۔

زیرِ نظر سطور بھی اسی نوع کی ایک بشارت کی سرگذشت ہیں--
ایک ایسی بشارت، جو اپنے ظہور کے لمحے میں شاید پوری طرح سمجھی نہ جا سکی مگر صدیوں کے فاصلے نے اس کا مفہوم نہ صرف واضح کر دیا بلکہ اسے ایک ناقابلِ انکار حقیقت میں بدل دیا۔ شاید یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب وقت کے سینے میں محفوظ یہ امانت اپنی تعبیر کا در کھولنے لگتی ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مستقبل کے چراغوں کی لو ماضی کے آستانوں میں پہلے ہی رکھ دی گئی ہو اور آنے والی روشنی کی بشارت فضا میں مدتوں سے ٹھہری ہوئی ہو۔ بعض بشارتیں لفظوں میں نہیں، کیفیتوں میں اترتی ہیں، بعض پیش گوئیاں اعلان سے زیادہ وجدان کا رنگ رکھتی ہیں۔ وہ وقت کے پردے پر لکھی ہوئی ایسی خموش تحریریں ہوتی ہیں جنہیں اہلِ دل پڑھتے ہیں اور اہلِ نظر ان کے اندر صدیوں کی آہٹ سن لیتے ہیں۔

یوں لگتا ہے کہ تاریخ بعض واقعات کی روداد نہیں سناتی بلکہ مکاشفۂ زمانہ پیش کرتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اولیاء کی نگاہ مورخ کے قلم سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ وہاں تاریخ روایت نہیں رہتی، روایت نور بن جاتی ہے اور نور جب نسلوں کے فاصلے طے کرتا ہے تو ایک چراغ سے دوسرے چراغ تک نسبتوں کا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔

بعض ہستیاں پیدا نہیں ہوتیں، مقدر کے افق پر طلوع ہوتی ہیں اور بعض پیش گوئیاں پوری نہیں ہوتیں، زمانے میں مجسم ہو کر چلتی پھرتی حقیقت بن جاتی ہیں۔ یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ تاریخ کے یہ اوراق صرف پڑھے نہیں جاتے، ان پر تدبر کیا جاتا ہے اور غور و فکر کے چراغ جلائے جاتے ہیں-- کیونکہ ان میں واقعات کم اور ربانی اشارے زیادہ پوشیدہ ہوتے ہیں۔

بعض پیش گوئیاں فوراً واقعہ نہیں بنتیں، پہلے صدیوں کے سکوت میں پرورش پاتی ہیں، صدیوں کے فاصلے طے کرتی ہیں مگر جب جلوہ گر ہوتی ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک چراغ سے اٹھنے والی لو نے دوسرے چراغ میں طویل عرصے کے بعد روشنی منتقل کی ہو۔ یہی روحانی نسبتوں کا راز ہے، یہی اولیاء کی نگاہِ بصیرت کا اعجاز اور یہی اس داستان کا مرکزی استعارہ ہے۔

شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۱۰۰۰ھ/۱۱۸۰ھ) کی وہ تاریخی بشارت بھی اسی روحانی تسلسل کا ایک درخشاں باب ہے، جس میں ایک سو ستر سال پہلے ایک ایسے مجدد کے ظہور کی خبر دی گئی، جس نے بعد میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی صورت میں عہدِ نو کو اپنے علوم و افکار کے

انوار سے روشن و تابناک کیا۔ یہ محض پیش گوئی نہ تھی، تقدیر کے صحیفے پر ثبت ایک روحانی اعلان تھا-- ایک چراغ سے دوسرے چراغ تک نور کے منتقل ہونے کی خاموش حکایت۔

یہ منظر کچھ یوں تھا کہ صدیوں کے فاصلے پر ایک ایسی نسبت رقم ہو رہی تھی جسے وقت مٹا نہیں سکتا تھا۔ یہ الفاظ نہیں تھے، ایک امانت تھی، ایک ایسا مسلسل راز جو اہلِ دل کے سپرد کیا جا رہا تھا۔ یہ بشارت دراصل آنے والے عہد کی پیشانی پر لکھی ہوئی وہ روشنی تھی جس کی جھلک پہلے ایک مردِ حق کی بصیرت میں نمودار ہوئی، پھر زمانے کے افق پر آفتاب بن کر ابھری۔ گمان ہوتا ہے جیسے ایک آستانے میں روشن کی جانے والی قندیل صدیوں بعد دوسرے آستانے میں شمعِ ہدایت بن کر فروزاں ہو گئی ہو۔ یہ صرف نور کا انتقال نہ تھا، روحانی وراثت کا تسلسل تھا-- ایک دل سے دوسرے دل، ایک سجدہ گاہ سے دوسری سجدہ گاہ، ایک نسبت سے دوسری نسبت تک روحانی امانت کے سفر کی کہانی۔ اس میں محبت بھی تھی، ولایت بھی اور تجدید کے آنے والے نقوش بھی۔

یہ منظر یوں ابھرتا ہے کہ تقدیر نے پہلے ہی اعلان کر دیا ہو کہ جب فتنوں کی تاریکی گہری ہوگی تو اسی نور سے ایک صبح طلوع ہوگی۔

اس خموش حکایت میں عجیب رمز پوشیدہ ہے-- چراغ اپنی روشنی کم نہیں کرتا جب دوسرا چراغ جلاتا ہے بلکہ نور بڑھتا ہے۔ اولیاء کی نسبتیں بھی اسی طرح منتقل ہوتی ہیں، ان میں فاصلہ حائل نہیں ہوتا، زمانہ رکاوٹ نہیں بنتا۔ ایک بزرگ کی دعا کبھی دوسرے مجدد کی صورت میں جواب بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ یوں یہ پیش گوئی دراصل ایک روحانی سلسلۂ نور کا اعلان تھی، جہاں بشارت مجددیت سے ملتی ہے اور نسبت تاریخ سے بلند ہو کر تقدیر کی تفسیر بن جاتی ہے۔

یہ منظر کچھ یوں ہے جیسے یہ ایک واقعہ نہیں بلکہ صدیوں کے درمیان جاری ایک خاموش مکالمہ تھا-- جس میں ایک بزرگ نے آنے والی روشنی دیکھ کر خبر دی اور آنے والی روشنی نے ظہور پا کر اس خبر کی تصدیق کر دی اور یہی وہ لمحہ ہے جہاں تاریخ عقیدت میں ڈھل جاتی ہے اور عقیدت نورانی روایت بن کر کہتی ہے: بعض چراغ بجھتے نہیں، وہ صرف آگے منتقل ہوتے ہیں۔

روایت ہے کہ ہجری 1102 میں، 4 ربیع النور کے بابرکت دن، کلاریا شریف کی علمی فضا میں جب شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دارالعلوم قادریہ شیرازیہ میں درس دے رہے تھے کہ اچانک ایک روحانی کیفیت نے احاطہ کر لیا۔ درس کی روانی ٹھہر گئی، حضرت خاموش ہو گئے۔ تین مرتبہ گہری سانس لی، دونوں ہاتھ بغل میں ڈال کر سکوت اختیار فرما لیا۔ فضا پر ایک غیر معمولی جلال و جمال کی فضا چھا گئی، جیسے عالمِ غیب سے کوئی پیغام نازل ہو رہا ہو اور سکوت کی تہوں میں کوئی نادیدہ صدا جنبش کر رہی ہو۔ لمحہ یوں ٹھہر سا گیا تھا جیسے وقت نے اپنی رفتار سمیٹ لی ہو اور فضا پر اسرارِ ربانی کی نرم بارش ہو رہی ہو۔ لمحہ یوں ٹھہر گیا تھا جیسے وقت نے اپنی رفتار روک کر کسی غیر معمولی اعلان کے استقبال میں ادب سے سر جھکا لیا ہو۔

ایسا معلوم ہوتا تھا گویا خموشی بول رہی ہو اور سکوت کے باطن میں معانی کے چراغ روشن ہو رہے ہوں۔ یہ عام توقف نہ تھا، کشف و وجدان کی وہ ساعت تھی جہاں لفظ پیچھے رہ جاتے ہیں اور حقائق اشاروں میں جلوہ گر ہونے لگتے ہیں۔ یہ کیفیت تھی کہ پردۂ غیب کے اُس پار سے کوئی نورانی بشارت دل پر اتر رہی ہو اور زبانِ حق شناس اس کے استقبال میں خموش ہو گئی ہو۔

وہ کیفیت اس درجہ پُر ہیبت اور پُر نور تھی کہ گویا ملأ اعلیٰ کی کوئی سرگوشی زمین کے گوشۂ درس تک پہنچ رہی ہو۔

فضا پر ایسی ہیبت طاری تھی کہ فرشتوں کے پر بھی ٹھہرے ہوئے محسوس ہوتے تھے...... اور تقدیر اپنے کسی پوشیدہ باب کا ورق الٹنے والی ہو۔ یہ سکوت دراصل خموشی نہیں تھا، ایک مکاشفہ تھا ایک ایسا روحانی ارتکاز جس میں آنے والی صدیوں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ جیسے مستقبل کے نقوش لوحِ دل پر ابھر رہے ہوں اور ایک مردِ کامل کی نگاہ ان انوار کا مشاہدہ کر رہی ہو جن تک عام بصارت کی رسائی نہیں ہوتی۔

یہ خموش لمحہ محض ایک پیغام کا حامل نہ تھا بلکہ ایک عہد کی بنیاد رکھ رہا تھا...... ایک عہد جنم لے رہا تھا، ایک بشارت اپنے ظہور کے لیے الفاظ تلاش کر رہی تھی۔ اور جب یہ سکوت ٹوٹا تو محض گفتگو شروع نہیں ہوئی، درحقیقت تقدیر نے اپنی ایک پوشیدہ تفسیر زبانِ ولی پر جاری کر دی۔

پھر یکا یک زبانِ مبارک سے ''سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر'' کے کلمات جاری ہوئے۔ یہ معمول کی خاموشی نہ تھی، یہ مکاشفۂ وقت کا سکوت تھا ایسا سکوت جس کے باطن میں آنے والی صدیوں کی تاریخ پوشیدہ تھی۔

پھر آپ نے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''سنو! اس وقت مجھے ایک ایسے مجدد کے بارے میں بتایا گیا ہے، جس کا ایک نمونہ بیان کرتا ہوں۔ چودہویں صدی ہجری میں ایک ایسا فتنہ اٹھے گا کہ رسالت ونبوت کا انکار کیا جائے گا اور وہ فتنہ پھیلانے والا چاروں طرف اندھیرا پھیلا دیے گا، ماحول خراب کرے گا اور لوگوں کو گمراہی کی طرف مائل کرے گا۔ اس وقت احمد نام کا ایک شخص اس کا مقابلہ کرے گا۔ وہ اس فتنے کو سختی سے دبائے گا اور زبردست قلمی جہاد کرے گا اور اس کی فتح ہوگی۔ اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے بہت مدد ملے گی۔''

یہ الفاظ گویا کسی آنے والی صبح کی پہلی کرن تھے۔ ابھی صدیوں کی شب باقی تھی مگر ایک مردِ مجدد کے ظہور کا چراغ روشن کر دیا گیا تھا۔ افق ابھی تاریکی کے حصار میں تھا مگر دور کہیں نور کی ایک لکیر نمودار ہو چکی تھی، کیفیت یہ تھی کہ رات کے دامن میں صبح کا راز رکھ دیا گیا ہو۔

یہ محض خبر نہ تھی، ایک طلوعِ صبحِ نو کی بشارت تھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آنے والے زمانوں کی پیشانی پر ایک اجالا لکھ دیا گیا ہو۔ ابھی فتنوں کی گرد اٹھنی تھی، آزمائشوں کے موسم آنے تھے، مگر ان سب سے پہلے حق کے ایک محافظ کا نام لوحِ تقدیر پر ثبت کر دیا گیا۔ یہ الفاظ در حقیقت شبِ تاریخ میں رکھے گئے وہ چراغ تھے جس کی روشنی کو قرنوں بعد ایک پورے عہد کی تابنا کی کا استعارہ بننا تھا۔ کسی درویش کے یہ سادہ الفاظ نہ تھے بلکہ مستقبل کے میناروں پر جلتے ہوئے چراغ ہوں، جو آنے والوں کو راستہ دکھانے کے لیے پہلے ہی روشن کر دیے گئے ہوں۔ اس بشارت میں ایک عجیب سکون بھی تھا اور جلال بھی، یوں معلوم ہوتا تھا تاریکی کو پہلے ہی بتا دیا گیا ہو کہ تیرا دوام نہیں، روشنی اپنا سفیر بھیج چکی ہے۔ فتنوں کے ہجوم سے پہلے ایک مجدد کی آمد کا اعلان دراصل یہ پیغام تھا کہ حق کبھی محافظ سے محروم نہیں رہتا۔ جب اندھیرے گہرے ہوتے ہیں تو نور اپنی کسی نئی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ چراغ ہی نہیں جلا بلکہ احیاءِ دین، عشقِ رسول ﷺ اور حق کی پاسبانی کا پورا کارواں اپنی پہلی روشنی پا گیا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ یہ الفاظ آج بھی محض پڑھے نہیں جاتے، دل میں طلوع ہوتے ہیں-- کیونکہ ان میں ایک صبح کی پہلی کرن ہی نہیں، ایک مکمل سورج کی بشارت پوشیدہ ہے۔

پھر فرمایا: ''وہ شخص مذہبِ اسلام کے لیے اخلاص کے ساتھ کام کرے گا، اہلِ بیت کرام کی بہت عزت کرے گا، بے خوف ہوگا، محافظ شریعت ہوگا اور اپنی آخری سانس تک اسلام کی خدمت کرے گا۔ وہ ولایت اور تجدید کے بلند مقام پر فائز ہوگا۔''

یہ صرف اوصاف کا بیان نہیں تھا، ایک روحانی مرقع تھا، جس میں آنے والے مجدد کی مکمل شخصیت پہلے ہی نقش کر دی گئی تھی۔ یہ الفاظ صفات کا تذکرہ کم اور ایک نورانی پیکر کی پیشگی تصویر زیادہ معلوم ہوتے تھے، جیسے تقدیر نے اپنے نہاں خانوں میں محفوظ ایک عظیم کردار کی جھلک پہلے ہی دکھا دی ہو۔ یہ محض اوصاف بیان نہیں ہو رہے تھے، ایک شخصیت تعمیر ہو رہی تھی اخلاص، شجاعت، عشقِ رسول ﷺ، تعظیم اہلِ بیت، فقاہت اور تجدید-- سب مل کر ایک ایسے مردِ حق کا نقش بنا رہے تھے جسے وقت بعد میں پہچانے گا مگر اہلِ بصیرت پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ کسی مجدد کا یہ تعارف نہیں، اس کے باطنی جوہر کا کشف تھا۔ یہ کیفیت تھی کہ ایک ولی کی نگاہ نے آنے والے آفتاب کو طلوع سے پہلے دیکھ لیا ہو اور اس کی شعاعوں کے اوصاف زبان پر آ گئے ہوں۔ ان الفاظ میں محض خبر نہیں، شناخت تھی، فقط پیش گوئی نہیں، عرفان کا منشور تھا۔ اس روحانی مرقع میں عجیب جامعیت تھی۔ علم بھی تھا، عمل بھی، جلال بھی تھا، جمال بھی، شریعت کی پاسبانی بھی تھی اور ولایت کی لطافت بھی۔ ایک ایسی شخصیت کا خاکہ کھینچا جا رہا تھا جو صرف اپنے عہد کا عالم نہ ہوگا بلکہ ایک دبستان، ایک تحریک، ایک روحانی استعارہ بن کر ابھرے گا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ اوصاف آنے والے مجدد کے گرد نور کا ایک ہالہ کھینچ رہے ہوں اور ہر وصف اس کے مقام کی ایک نئی جہت

روشن کر رہا ہو۔ ایک وصف اس کے قلم کی قوت بتاتا ہے، دوسرا اس کے عشق کی گہرائی، تیسرا اس کے مجددانہ جلال کو اور چوتھا اس کے ولایتی وقار کو۔ گویا ایک ایک لفظ آئندہ صدیوں کے امام کا تعارف نامہ بن رہا ہو اور حیرت یہ ہے کہ جب تاریخ نے اعلیٰ حضرت مجدد دین وملت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ظہور دیکھا تو محسوس ہوا کہ وہ مرقع جو کلاریا شریف کی سرزمین پہ وصیت نامے میں الفاظ کے رنگ سے بنایا گیا تھا، بریلی شریف میں مجسم حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ بشارت شخصیت بن گئی، اشارہ تفسیر بن گیا اور وصف ذات میں ڈھل گیا۔

یہی تو اولیاء کی بصیرت کا اعجاز ہے کہ وہ بعض اوقات شخصیات کو جنم لینے سے پہلے پہچان لیتے ہیں۔ اور تب اوصاف محض اوصاف نہیں رہتے، آنے والی عظمت کے نقوش بن جاتے ہیں۔

شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے صرف بشارت پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنی اولاد، مریدین اور وابستگان کے لیے وصیت کا درجہ رکھنے والی ہدایت بھی عطا فرمائی: ''لہٰذا میری اولاد، میرے مرید اور میرے ماننے والے اس بات پر سختی سے عمل کریں، اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں، اسے عقیدت سے مانیں اور اس کا دکھایا ہوا راستہ صحیح ہوگا۔ وہ جو راستہ بتائے گا وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا راستہ ہوگا، صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین، اولیاء اور مجددین کا راستہ ہوگا۔ مزید یہ کہ وہ حضور پاک ﷺ اور اہلِ بیت کا بہت پابندی سے احترام کرنے والا ہوگا، اسی وجہ سے اللہ پاک اسے بہت عزت عطا فرمائے گا۔''

یہاں بشارت وصیت میں ڈھل گئی اور پیش گوئی نسبت میں تبدیل ہو گئی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک شیخ اپنی روحانی امانت عہد ہائے دراز کے فاصلے پر ایک آنے والے مجدد کے سپرد کر رہا ہے۔ یہ صرف خبر دینے کا مقام نہ تھا، امانت منتقل کرنے کی ساعت تھی، جہاں الفاظ ہدایت بن گئے اور ہدایت ایک روحانی عہد میں ڈھل گئی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک بزرگ اپنی نگاہِ ولایت سے آنے والے زمانے کے امام کو دیکھ کر اپنی محبت، اپنی نسبت اور اپنی دعاؤں کا سرمایہ اس کے حوالے کر رہے ہوں۔ یہ زمانوں کے درمیان خموش دست بستہ مصافحہ تھا اور ایک عہد سے دوسرے عہد کے درمیان سپردگی کا نورانی لمحہ۔ یہاں پیش گوئی محض اطلاع نہ رہی، روحانی وابستگی کا منشور بن گئی۔ بشارت نے وصیت کا لباس پہن لیا اور وصیت نے نسبت کا وقار۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک سلسلہ اپنے بعد آنے والے روشن مینار کی طرف اشارہ کر رہا ہو کہ یہی وہ راستہ ہے جہاں ہماری امانت محفوظ رہے گی۔

اس میں ایک عجیب رمز پوشیدہ ہے: شیخ نے صرف ایک مجدد کے ظہور کی خبر نہیں دی، اپنی اولاد، مریدین اور وابستگان کو اس نورانی نسبت سے وابستہ بھی کر دیا۔ یہ تاثر ابھرتا ہے کہ وہ فرما رہے ہوں کہ یہ آنے والی شخصیت محض ایک فرد نہیں، ہمارے روحانی سلسلے کی توسیع ہے ہماری دعا کا ثمر، ہماری نسبت کا تسلسل اور ہمارے مشرب کا روشن امتداد۔

یہ منظر کچھ یوں ہے کہ ایک آستانہ اپنی روحانی شمع دوسرے آستانے کے چراغ میں منتقل کر رہا ہو۔ صدیوں کا فاصلہ یہاں سمٹ جاتا ہے اور وقت اپنی دیواریں کھو دیتا ہے۔ ایک شیخ کی وصیت، ایک مجدد کی آمد اور ایک امت کی رہنمائی -- یہ سب ایک ہی نورانی تسلسل میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ الفاظ اپنے اندر ایک روحانی وراثت کا شعور رکھتے ہیں۔ یہ کیفیت ہے کہ ولایت اپنے ہاتھوں سے تجدید کے سر پر دستار رکھ رہی ہو اور کہہ رہی ہو: یہ مسلک وہی ہے جو انبیاء، صحابہ، اولیاء اور مجددین کا مسلک ہے۔ یوں پیش گوئی ایک زندہ نسبت بن گئی اور نسبت ایک ایسا عہد کہ جو نسلوں کے لیے رہنمائی کا سرمایہ بن گیا اور حقیقتاً یہی مقام اس واقعے کو محض کرامت کے دائرے سے بلند کر کے روحانی تاریخ کا باب بنا دیتا ہے -- جہاں ایک شیخ صرف خبر نہیں دیتا بلکہ قرنوں کی مسافت کے بعد آنے والے مجدد کو اپنی روحانی امانت کا نگہبان قرار دیتا ہے۔ یہی چراغ سے چراغ تک نور کے سفر کی اصل معنویت ہے۔ اور پھر وہ جلال انگیز تنبیہ:

''اگر میری اولاد اور میرے مریدوں نے اس بات پر توجہ نہ دی تو قیامت کے دن میں ان کا دامن پکڑوں گا۔''

یہ الفاظ محض تاکید نہیں، روحانی ذمہ داری کا اعلان ہیں۔ اس

میں محبت بھی ہے، ولایت کا جلال بھی اور حق کی پاسبانی کا وقار بھی۔ یہ نصیحت نہیں، ایک امانت کا تحفظ ہے، ایک ایسا عہد جو محبت کے نرم لہجے میں بھی جلالِ حق کی ہیبت اپنے اندر رکھتا ہے۔

یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ یہاں ایک شیخ صرف اپنے مریدوں کو ہدایت نہیں دے رہا ہے بلکہ اپنی روحانی نسبت کی حرمت ان کے سپرد کر رہا ہے۔ یہ الفاظ شفقت سے بھی لبریز ہیں اور احتساب کی سنجیدگی سے بھی۔ درحقیقت محبت نے تنبیہ کا پیرایہ اختیار کر لیا ہے اور ولایت نے غیرتِ حق کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ اس اعلان میں ایک مرشد کا درد بھی بولتا ہے اور ایک ولی کی بصیرت بھی۔ محبت چاہتی ہے کہ وابستگان جادۂ حق سے نہ ہٹیں اور ولایت کا جلال یہ گوارا نہیں کرتا کہ نسبت کی امانت ضائع ہو۔ اس لیے ان الفاظ میں نرمی بھی ہے اور ایسی قوت بھی جو دلوں پر نقش ہو جائے۔ یہ صرف ہدایت نہیں، روحانی ذمہ داری کا میثاق ہے۔ جیسے ایک صاحب دل اپنے سلسلے کے ماننے والوں کو یاد دلا رہا ہو کہ نسبتیں صرف عقیدت سے نہیں نبھتیں، وفا اور اتباع بھی مانگتی ہیں۔ اور یہی اتباع حق کی پاسبانی کی اصل صورت ہے۔

ان الفاظ میں ایک عجیب شان ہے، محبت انہیں دعا بناتی ہے، جلال انہیں عہد بناتا ہے اور وقار انہیں حجت بالغہ کا درجہ دیتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک مرشد اپنے مریدوں کے دلوں میں صرف نصیحت نہیں اتار رہا بلکہ حق کے چراغ کی حفاظت کا احساس بیدار کر رہا ہو اور ''اگر میری اولاد اور میرے مریدوں نے اس بات پر توجہ نہ دی تو قیامت کے دن میں ان کا دامن پکڑوں گا''۔۔ یہ جملہ محض وعید نہیں، نسبت کی غیرت کا اظہار ہے۔ اس میں وہ جلال ہے جو محبت کے باطن سے پیدا ہوتا ہے۔ جیسے مرشد اپنی وابستگی کو دنیا تک محدود نہیں رکھتا بلکہ آخرت تک اس کی جواب دہی محسوس کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں الفاظ حکم سے بلند ہو کر روحانی عہد نامہ بن جاتے ہیں۔ یہاں محبت محافظ بن جاتی ہے، ولایت نگہبان بن جاتی ہے اور حق کی پاسبانی ایک مقدس ذمہ داری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

اور شاید اسی لیے یہ کلمات پڑھے نہیں جاتے، دل پر اترتے ہیں۔۔ کیونکہ ان میں ایک مرشد کی شفقت، ایک ولی کی ہیبت اور ایک مجددانہ راستے کی حفاظت کا پورا وقار جمع ہو گیا ہے۔

یہ کرامت حضرت کے بڑے صاحبزادے حضرت سید محمد قاسم کا موشاہ قادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے "سیرتِ شیرازی" صفحہ 35 پر نقل فرمائی ہے جو گجراتی زبان میں طبع شدہ ہے۔

(حضرت سید شاہ محمد صالح شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مذکورہ وصیت نامہ فارسی زبان میں ہے جس کی اصل کاپی حضرت کے آستانۂ قدسیہ کے صاحب سجادہ نے حضور سید نظمی میاں مارہروی قدس سرہٗ العزیز کی بارگاہ میں پیش فرمایا جس کا ذکر و تذکرہ خود حضور نظمی میاں مارہروی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صدیقی مدیر اعلیٰ مجلہ پیغام رضا ممبئی سے فرمایا)

یہ پیش گوئی 1102ھ میں اعلیٰ حضرت کی ولادت سے تقریباً 170 برس پہلے فرمائی گئی۔ ابھی بریلی شریف کی فضاؤں میں وہ خورشیدِ علم وفکر طلوع بھی نہ ہوا تھا مگر کالاریا شریف کی درسگاہ میں اس کی روشنی محسوس کر لی گئی تھی۔ گویا آفتاب ابھی افق پر نمودار نہ ہوا تھا مگر اس کی کرنوں کی بشارت پہلے ہی اہلِ بصیرت کے دلوں پر اتر چکی تھی۔

یہ محض پیش بینی نہ تھی، نور کے آنے کی پیش از وقت شناخت تھی۔ جیسے صبح نے طلوع سے پہلے اپنی خوش خبری شب کے سینے میں رکھ دی ہو۔ ابھی زمانہ اس مجدد کے نام سے بھی آشنا نہ تھا، مگر ایک مردِ کامل کی نگاہ اس آنے والی روشنی کو دیکھ چکی تھی۔

بریلی شریف میں جو چراغ صدیوں بعد روشن ہونے والا تھا، اس کی لو کالاریا شریف کے سکوت میں پہلے ہی لرز رہی تھی۔ ابھی آفتاب پردۂ غیب میں تھا مگر اس کا اجالا اہلِ کشف کے افق پر پھیل چکا تھا۔ یہ وہ بصیرت ہے جو ظہور سے پہلے ظہور کے آثار دیکھ لیتی ہے۔ کیا عجب منظر ہے کہ ایک درسگاہ میں بیٹھا ہوا شیخ، آنے والی صدیوں کے ایک مجدد کو دیکھ رہا ہے، گویا وقت کی دیواریں گر گئی ہوں اور مستقبل حال کے دامن میں سمٹ آیا ہو۔ یہاں تاریخ کی رفتار رکتی محسوس ہوتی ہے اور روحانی مکاشفہ زمانے سے آگے چلنے لگتا ہے۔

یہ بشارت دراصل اس حقیقت کی دلیل تھی کہ بعض ہستیاں صرف پیدا نہیں ہوتیں، ان کے ظہور کی تمہید صدیوں پہلے لکھی جاتی ہے۔ ان

کے لیے دعائیں پہلے مانگی جاتی ہیں، نسبتیں پہلے قائم ہوتی ہیں اور آستانے پہلے ان کے استقبال میں روشن ہوجاتے ہیں۔

کلاریا شریف میں اس روز صرف ایک پیش گوئی نہ ہوئی، ایک آفتاب کے طلوع کی تمہید پڑھی گئی۔ ایک مردِ حق نے آنے والے مجدد کی روشنی محسوس کر کے گویا زمانے سے کہا: جب فتنوں کی رات گہری ہوگی، یہ خورشید طلوع ہوگا اور حقیقتاً یہی ہوا۔ وہ خورشید علم و دانش طلوع ہوا، ایسا طلوع کہ اس کی شعاعیں فقہ، عشق، تجدید، تحقیق اور دفاعِ رسالت کے آفاق پر پھیل گئیں۔ تب محسوس ہوا کہ جو روشنی کلاریا شریف کی درسگاہ میں ایک سو ستر برس قبل محسوس کی گئی تھی، وہ محض وجدان نہ تھا-- ایک زندہ حقیقت کی پیشگی شہادت تھی۔ یہی تو اولیاء کی نگاہ کا اعجاز ہے وہ سورج نکلنے کے بعد نہیں پہچانتے، طلوع سے پہلے اس کی روشنی محسوس کر لیتے ہیں۔ اور یہی اس بشارت کی روح ہے کہ چراغ پہلے دلوں میں جلتے ہیں، پھر زمانے کو روشن کرتے ہیں۔ اولیاء کی بصیرت کا یہی انداز ہے کہ وہ گردشِ ایام سے آگے بھی انوار کے نقوش دیکھ لیتے ہیں۔ پھر وقت نے دیکھا کہ چودھویں صدی میں وہ فتنہ اٹھا جس کی آہٹ صدیوں پہلے اہلِ بصیرت نے سن لی تھی۔ ختمِ نبوت کے منکرین نے آشوب برپا کیا، اسلام مخالف طاقتوں نے شکوک کے بادل پھیلائے اور نام نہاد کلمہ گو مولویوں نے عظمت و توقیرِ رسالت ﷺ کے حصار پر حملے کیے۔ عقیدے کی فضاؤں میں اضطراب تھا، فکر کے افق پر غبار تھا اور یہ کیفیت تھی جیسے فتنوں کی سیاہ رات اپنی تاریکی کو دوام دینا چاہتی ہو۔

باطل نے کبھی کھلے انکار کی صورت میں، کبھی تاویل کے فریب میں اور کبھی مذہبی لبادوں کے اندر چھپ کر حق کی قندیلیں بجھانے کی کوششیں کیں۔ زبانیں مسموم ہوئیں، قلم فتنہ گر ہوئے اور ایسے ایسے نعرے بلند ہوئے جن میں حق کی صدا کم اور گمرہی کی گرد زیادہ تھی۔ رسالت مآب ﷺ کے منصب اقدس پہ جسارتیں ہوئیں، ختمِ نبوت کے قلعے کو متزلزل کرنے کی تدبیریں کی گئیں اور بعض ایسے چہرے بھی سامنے آئے جو ظاہر میں دین کے داعی لیکن باطن میں شکوک کے سوداگر تھے۔

یہ وہ وقت تھا جب صرف ایک فتنہ نہیں اٹھا تھا، فتنوں کا ایک عہد بیدار ہو رہا تھا۔ عقائد آزمائے جا رہے تھے، محبتِ رسول ﷺ کو منطق کی سرد مہری سے تولنے کی کوشش ہو رہی تھی اور امت کے قلب پر ایک فکری یلغار کی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ دراصل تاریخ نے پھر وہی منظر دیکھا جب تاریکی نے روشنی کو گھیرنے کا ارادہ کیا۔ مگر یہی وہ مقام تھا جہاں صدیوں پہلے دی گئی بشارت اپنے پورے جلال کے ساتھ یاد آتی ہے۔ کیونکہ اندھیروں کے بڑھنے کے ساتھ ہی نور کے سفیر بھی ابھرتے ہیں۔ جب فتنوں نے سر اٹھایا تو تقدیر نے اپنا یہ وعدہ بھی پورا کیا کہ "احمد" نام کا ایک مردِ حق آگاہ اس یلغار کے مقابل کھڑا ہوگا۔ پھر وقت نے دیکھا کہ بظاہر ایک تنہا مگر فولادی عزم رکھنے والا مجدد اٹھا، جس نے قلم کو شمشیر، علم کو حصار اور عشقِ رسول ﷺ کو اپنی قوتِ دفاع بنایا۔ اس نے محض رد نہیں کیا، فتنوں کے تار و پود بکھیر دیے، محض جواب نہیں دیے، حق کا ایسا استدلال قائم کیا کہ باطل کے قلعے لرز اٹھے۔ یہ حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آئی کہ کلاریا شریف میں صدیوں پہلے روشن کیا گیا چراغ، بریلی شریف میں آ کر شعلۂ فروزاں بن گیا-- اور اس نے فتنوں کی تاریکیاں چیر کر نورِ حق کا راستہ روشن کر دیا۔ وہ پیش گوئی محض الفاظ نہ تھی، حق کی فتح کا پیشگی اعلان تھی اور اب وہ اعلان تاریخ میں حقیقت بن کر چل رہا تھا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ علیہ نے صرف فتنوں کا رد نہیں کیا بلکہ عظمت رسالت ﷺ کے گرد ایسا حصار قائم فرمایا جس میں عشق بھی تھا، علم بھی، فقہ بھی اور مجددانہ جلال بھی۔ ان کا قلم جب چلتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے غیرتِ ایمانی صفحوں پر اتر رہی ہو، جیسے سطور نہیں، تجدید کی ساعتیں رقم ہو رہی ہوں۔ جیسے ہر لفظ کے پیچھے ایک عہد کی پاسبانی کھڑی ہو۔ جیسے قلم نہیں، عشقِ مصطفیٰ ﷺ کا علم لہرا رہا ہو۔ جیسے عبارتوں میں ایک مجدد کا باطن تکلم کر رہا ہو اور حروف روشن سپاہیوں کی صورت صف بستہ ہوں اور ہر سطر ناموسِ رسالت ﷺ کی پاسبانی کے لیے سینہ سپر کھڑی ہو۔ یہ محض تحریر نہ تھی، عقیدے کی بیدار نگہبانی تھی، قلم نہیں، غیرت کا لہکتا ہوا پرچم تھا۔

ان کے الفاظ میں صرف استدلال کی قوت نہ تھی، عشق کی

حرارت بھی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ روشنائی نہیں بہہ رہی، وفاداریِ مصطفیٰ ﷺ کا خونِ جگر صفحات پر رقم ہو رہا ہے۔ ہر جملہ دلیل بھی تھا اور دفاع بھی، ہر عبارت محبت بھی تھی اور مجاہدانہ للکار بھی۔

جب وہ لکھتے تو گویا علم جلال کے ساتھ ہم آغوش ہو جاتا۔ فقہ کے دقیق مباحث میں بھی عشق کی خوشبو آتی اور ردّ و ابطال کے سخت ترین مقامات میں بھی ادبِ بارگاہِ رسالت ﷺ کی لطافت قائم رہتی۔ یہی ان کے قلم کا اعجاز تھا کہ وہ ایک ہی وقت میں شمشیر بھی تھا اور نعت بھی، وہ ایک ہی وقت میں منبر کی صلابت بھی تھا اور محراب کی گریہ و زاری بھی۔ وہ ایک ہی وقت میں غیرتِ ایمانی بھی تھا اور عشقِ نبوی ﷺ کی تفسیر بھی۔ وہ ایک ہی وقت میں تیغ بھی تھا اور تسبیح بھی۔ وہ ایک ہی وقت میں معرکہ بھی تھا اور درود کی خوشبو بھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے قلم کی نوک پر صرف روشنائی نہ ہو، صدیوں کی امانت رکھی ہو۔ جب وہ فتنوں کے خلاف لکھتے تو الفاظ نہیں، قلعے تعمیر ہوتے، جب وہ لکھتے تو قلم نہیں چلتا، تاریخ اپنا رخ بدلتی محسوس ہوتی، جب وہ پڑھتے تو کتاب نہیں، قرون کی دانش ہم کلام ہو جاتی۔

جب وہ بولتے تو الفاظ نہیں، یقین کے چراغ جلتے۔ جب وہ فتویٰ دیتے تو شریعت کا وقار متکلم ہوتا۔ جب وہ قلم اٹھاتے تو روشنائی نہیں، تاریخ بہنے لگتی۔ جب وہ خموش ہوتے تو سکوت بھی ایک درس بن جاتا اور جب ناموسِ رسالت ﷺ پر گفتگو کرتے تو جملے نہیں، نورانی حصار قائم ہوتے۔ ان کی تحریریں پڑھی نہیں جاتیں، دلوں میں حمیتِ ایمانی جگاتی تھیں۔ بعض قلم علم لکھتے ہیں، بعض تاریخ رقم کرتے ہیں مگر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی کا یہ وہ قلم تھا جو عقیدے کی سرحدوں کی حفاظت کرتا تھا، ناموس رسالت علیہ التحیۃ والثناء کی پاسبانی کرتا تھا۔ اس کی جنبش میں ایک مجدد کا جلال تھا، ایک دل جلے عاشق مصطفیٰ کا درد تھا اور ایک امینِ شریعت کی ذمہ داری کا وقار تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ان کی ہر سطر اعلان کرتی تھی کہ عشق جب علم سے ملتا ہے تو تجدید جنم لیتی ہے۔ اور جب ان کے فتاوے، رسائل اور مناظرانہ مباحث سامنے آتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف ردّ نہیں، ایمان کی فصیلیں ہیں۔ ہر صفحہ گویا حق کے قلعے کی ایک مضبوط اینٹ ہے، ہر دلیل ایک مینار، ہر عبارت ایک چراغ۔

سچ تو یہ ہے کہ ان کا قلم چلتا نہیں تھا، بیدار ہوتا تھا اور جب بیدار ہوتا تھا تو فتنوں کی تاریکیاں سمٹنے لگتی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے غیرتِ ایمانی صفحوں پر اتر ہی نہیں رہی، تاریخ کا رخ بھی بدل رہی ہے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب معلوم ہوا کہ اولیاء کی بشارتیں محض کرامات نہیں ہوتیں، تاریخ کے لیے الٰہی اشارات ہوتی ہیں۔ وہ صرف حیرت انگیز واقعات نہیں، مشیت کے وہ خموش اعلانات ہوتے ہیں جن میں آنے والے زمانوں کے نقوش پہلے ہی ودیعت کر دیے جاتے ہیں۔ ان میں خبر کم، ہدایت زیادہ ہوتی ہے، واقعہ کم، بصیرت زیادہ۔

یہ بشارتیں گویا تقدیر کے بند صحیفوں پر کھلنے والی وہ روشن سطریں ہیں جنہیں اہلِ دل پڑھتے ہیں اور زمانہ بعد میں ان کی تصدیق کرتا ہے۔ وہ مستقبل کے بارے میں محض اطلاع نہیں دیتیں بلکہ حق کے تسلسل، نور کے سفر اور ربانی منصوبے کے ظہور کی نشان دہی کرتی ہیں۔ یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ اولیاء کی زبان پر جب بشارت اترتی ہے تو دراصل تاریخ کے افق پر کوئی نئی صبح لکھی جا رہی ہوتی ہے۔ ان کے الفاظ میں پیش گوئی سے بڑھ کر ایک روحانی شہادت ہوتی ہے، جیسے غیب کے پردوں سے کوئی اشارہ وقت کے صحرا میں مینار بن کر کھڑا کر دیا گیا ہو۔ یہ کرامت اپنی اصل میں خرقِ عادت سے زیادہ کشفِ حقیقت ہے۔ اس میں تعجب سے زیادہ معرفت بولتی ہے۔ اولیاء آنے والے واقعات صرف دیکھتے نہیں، ان کے باطن میں کارفرما حکمت کے نقوش بھی پہچان لیتے ہیں۔ اسی لیے ان کی بشارتیں واقعات کے بیان سے بلند ہو کر حکمت الٰہی کی تفسیر محسوس ہوتی ہیں۔ بعض اوقات تاریخ جو صدیوں بعد سمجھتی ہے، ولی کی نگاہ اسے پہلے ہی دیکھ لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پیش گوئیاں صرف زمانے کے حوادث نہیں بتاتیں بلکہ یہ بھی بتاتی ہیں کہ تاریکی کے مقابل روشنی کہاں سے طلوع ہوگی، فتنوں کے مقابل حق کا پرچم کس کے ہاتھ میں ہوگا اور امت کی کشتی بھنور سے نکالنے والا ناخدا کون ہوگا۔ یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ اولیاء کی بشارتیں وقت کی پیشانی پر رکھے گئے وہ چراغ ہیں جو آنے والے مسافروں کو راستہ دکھانے کے لیے پہلے ہی روشن کر دیے جاتے

ہیں۔ان میں غیب کی خوشبو ہوتی ہے، نسبت کی حرارت ہوتی ہے اور یقین کا ایسا اجالا کہ صدیوں بعد بھی مدھم نہیں پڑتا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بشارتیں محض فرد کی عظمت کا اعلان نہیں کرتیں، ربانی سنّت کے استمرار کا پتا دیتی ہیں-- کہ جب کبھی فتنہ اٹھے گا، ہدایت کا چراغ بھی روشن ہوگا، جب تاریکی بڑھے گی، نور کا سفیر بھی آئے گا۔

اسی لیے اولیاء کی بشارتوں کو صرف کرامت کہنا ان کے معنیٰ کو محدود کرنا ہے، وہ دراصل تاریخ کے لیے الٰہی اشارات، امت کے لیے نوید اور تقدیر کے پردوں سے جھانکتی ہوئی ربانی حکمت کی جھلک ہوتی ہیں۔وہ پڑھی نہیں جاتیں، سمجھی جاتی ہیں اور فقط سمجھی نہیں جاتیں، دل پر اترتی ہیں۔فتنہ اٹھا، جیسا بتایا گیا تھا ''احمد'' اٹھا، جیسا بتایا گیا تھا اور حق غالب آیا، جیسا وعدہ کیا گیا تھا۔یوں آشکار ہوا کہ فتنوں کی سیاہ رات جتنی گہری ہوئی، صبحِ تجدید اتنی ہی روشن طلوع ہوئی۔تب دنیا نے دیکھا کہ ایک مجدد کبھی صرف اپنے عہد کا جواب نہیں ہوتا، وہ صدیوں پہلے کی بشارت کا زندہ ظہور بھی ہوتا ہے۔وہ محض اپنے زمانے کے فتنوں کا رد نہیں کرتا بلکہ تاریخ کے گہرے تسلسل میں چھپی ہوئی ایک ربانی تمہید کی تکمیل بن کر ابھرتا ہے۔درحقیقت اس کا ظہور کسی ایک دور کی ضرورت نہیں، صدیوں سے جاری ایک الٰہی منصوبے کا ظہور ہوتا ہے۔مجدد صرف بحرانوں کا معالج نہیں ہوتا، وہ عہدوں کے درمیان ایک روحانی پل بھی ہوتا ہے، ماضی کی دعاؤں، حال کی ضرورتوں اور مستقبل کی امیدوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے والا۔اس کی ذات میں بشارت تاریخ بن جاتی ہے اور تاریخ نورانی حقیقت۔یہ امر واضح ہوتا ہے کہ مجدد پیدا نہیں ہوتا، ظہور کرتا ہے جیسے مدتوں سے منتظر ایک صبح اچانک افق پر پھیل جائے۔اس کی آمد میں صرف اصلاح نہیں، تجدید کی ایک نئی روح ہوتی ہے۔وہ اپنے دور کے سوالات کا جواب ضرور دیتا ہے مگر ساتھ ہی صدیوں پہلے بولے گئے الفاظ کی تفسیر بھی بن جاتا ہے۔دراصل وہ ایک ایسی زندہ دلیل ہوتا ہے جس میں پیش گوئی مجسم ہو جاتی ہے۔اولیاء کے وجدان، اہلِ حق کی دعائیں، اور امت کی امیدیں اس کی ذات میں آ کر معنیٰ پاتی ہیں۔تب معلوم ہوتا ہے کہ بشارت صرف خبر نہ تھی، ایک حقیقت اپنے وقت پر ظہور پذیر ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔

مجدد کا مقام یہی ہے کہ وہ محض ردِّ باطل نہیں کرتا، حق کا چراغ از سرِ نو فروزاں کرتا ہے۔وہ صرف اپنے عہد کی اصلاح نہیں کرتا، دین کی روح کو تازگی بخشتا ہے۔اسی لیے اس کی شخصیت میں ایک دور نہیں بولتا، کئی زمانوں کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔یہ کیفیت ہے جیسے صدیوں پہلے روشن کیا گیا چراغ، اس کے وجود میں شعلہ بن کر اٹھا ہو۔ایک بزرگ کی بشارت، ایک امت کی آرزو اور ایک مجدد کا ظہور-- یہ سب ایک ہی نورانی سلسلے کے مختلف مظاہر معلوم ہوتے ہیں اور تب دنیا دیکھتی ہے کہ مجدد کسی حادثۂ وقت کا نتیجہ نہیں ہوتا، وہ تقدیر کے گہرے سکوت میں پہلے سے لکھی ہوئی ایک سطر کا ظہور ہوتا ہے۔اس کی آمد صرف جواب نہیں، وعدے کی تکمیل ہوتی ہے، صرف شخصیت نہیں، بشارت کا مجسم نور ہوتی ہے۔اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ ایک مجدد اپنے عہد سے بڑا ہوتا ہے--وہ اپنے زمانے کی ضرورت بھی ہوتا ہے اور صدیوں پہلے کی بشارت کی ایک زندہ کرامت بھی۔وہ آتا نہیں، تاریخ کے افق پر طلوع ہوتا ہے۔

چودہویں صدی میں فتنہ اٹھا، ختمِ نبوت کے منکرین نے آشوب برپا کیا، گستاخان رسول نے توقیر و احترام رسالت کے باب میں ناپاک جسارتیں کیں اور بعینہٖ وہی ''احمد'' جلوہ گر ہوا جس کی خبر دی گئی تھی۔اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے قلم کو شمشیر بنایا، علم کو حصار اور عشقِ رسول ﷺ کو مرکز بنایا اور ایسے معرکے سر کیے کہ مذہبِ اہلِ سنّت و جماعت کا ڈنکا بج اٹھا۔ان کا قلم صرف لکھتا نہ تھا، حق کی سرحدوں کی پاسبانی کرتا تھا، ان کا علم محض درس و تدریس نہ تھا، عقیدے کے گرد ایک مستحکم فصیل تھا اور ان کا عشقِ رسول ﷺ صرف جذبہ نہ تھا، مجددانہ جدوجہد کی مکمل روح تھا۔

جب فتنوں نے یلغار کی تو انہوں نے دلیل کو سپر بنایا، فقہ کو قوت بنایا اور عشق کو وہ حرارت بخشی کہ باطل کے دبیز پردے چاک ہوتے گئے۔یوں نظر آتا تھا کہ ایک مردِ مجدد تنہا نہیں لکھ رہا ہے بلکہ صدیوں کی امانت اس کے قلم کے ساتھ حرکت کر رہی ہے۔

انہوں نے اپنے قلم کو شمشیر بنایا-- مگر یہ شمشیر خون نہیں بہاتی تھی، شبہات کے سر قلم کرتی تھی۔ انہوں نے علم کو حصار بنایا-- مگر یہ حصار پتھروں کا نہ تھا، دلائل، براہین اور معارف کا ایسا قلعہ تھا جس پر فتنوں کی یلغار بے اثر ہو جاتی تھی۔ انہوں نے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مرکز بنایا-- اور یہی مرکز ان کی تمام علمی و روحانی کاوشوں کی جان بن گیا۔ ان کے معرکے صرف مناظرے نہ تھے، حق و باطل کے امتیاز کی روشن سرحدیں تھیں۔ ان کے رسائل، فتاوے اور تحقیقات صرف کتابی سرمایہ نہیں، عقائد و نظریات کے دفاع کے باب میں زندہ مینار تھے۔ ہر تصنیف ایک محاذ، ہر دلیل ایک ضرب، ہر فتویٰ ایک حصار اور ہر تحریر ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کا روشن پرچم محسوس ہوتی تھی۔

یہ کیفیت تھی جیسے ان کے قلم کی جنبش سے صفحات پر صرف نقوش نہیں ابھر رہے ہیں، باطل کے اندھیرے سمٹ رہے ہیں۔ جب وہ لکھتے تو غیرتِ ایمانی عبارت بن جاتی اور جب بولتے تو علم جلال کے ساتھ جلوہ گر ہوتا۔ ان کی تحریروں میں فقہ کی گہرائی بھی تھی، محدثانہ وقار بھی، عاشقانہ سوز بھی اور مجددانہ ہیبت بھی۔ انہوں نے ایسا فکری جہاد برپا کیا کہ اہلِ سنّت و جماعت کا دبستان صرف محفوظ نہ رہا، از سرِ نو تابناک ہو اٹھا۔ ان کے ذریعے مسلک نے صرف اپنا دفاع نہیں کیا، وقار پایا، صرف بقا نہیں پائی، غلبے کا شعور بھی حاصل کیا۔ گویا ایک مجدد نے اپنے قلم سے ایک پورے عہد کی فکری سمت درست کر دیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے معرکے محض علمی مناقشے نہ تھے، وہ ایمان کے قلعوں کی حفاظت کے معرکے تھے۔ اس لیے جب کہا جاتا ہے کہ مذہبِ اہلِ سنّت و جماعت کا ڈنکا بج اٹھا، تو یہ صرف ایک تعبیر نہیں، ایک عہد کی گواہی ہے-- کہ ایک مردِ حق اٹھا اور اس نے عشق و علم کے زور پر فتنوں کے مقابل حق کا علَم اس شان سے بلند کیا کہ اس کی صدا آج تک تک سنائی دے رہی ہے۔ درحقیقت انہوں نے صرف معرکے سر نہیں کیے، ایک چراغ سے اٹھنے والی لو کو آفتاب بنا دیا۔

کلاریا شریف میں روشن کیا گیا چراغ بریلی شریف میں آ کر شعلۂ جوّالہ بن گیا۔ ایک نسبت تھی جو صدیوں پار منتقل ہوئی، ایک نور تھا جو ایک آستانے سے دوسرے آستانے تک پہنچا۔

یہ واقعہ محض ایک کرامت کا بیان نہیں، یہ روحانی تاریخ کا وہ باب ہے جس میں مجددیت، ولایت اور نسبتِ اولیاء ایک ہی روش میں بہتی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں حضرت سید محمد صالح شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی بصیرت بھی جلوہ گر ہے اور اعلیٰ حضرت کی تجدیدی عظمت بھی اور حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کو اپنی مشیت کے کچھ اسرار عطا فرماتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ کبھی کبھی آنے والے زمانوں کے وہ نقوش بھی دیکھ لیتے ہیں جو عام نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ ان کی پیش گوئیاں محض ظن نہیں ہوتیں، عطائے ربانی کے پرتو ہوتی ہیں۔

اعلیٰ حضرت کی ولادت سے ایک سو ستر برس پہلے دی گئی یہ بشارت اسی عطا کی روشن دلیل ہے۔ یہ ایک مجدد کی آمد کی خبر ہی نہیں بلکہ اس حقیقت کی شہادت ہے کہ حق کے چراغ کبھی بجھتے نہیں، ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا رہتا ہے۔ پورا بیانیہ ایک ایسی ربانی سنّت کی گواہی ہے جس میں بشارت کبھی بے مصرف نہیں جاتی اور نور کبھی اپنے امینوں سے خالی نہیں رہتا۔ اور شاید اسی کا نام ہے-- چراغ سے چراغ تک۔

□□□□

رسائل پڑھیں، عقائد و نظریات کی حفاظت کریں، کہ زندہ قومیں اپنے قلم اور اپنی فکری میراث کو زندہ رکھتی ہیں۔

محمد ملک الظفر سہسرامی

مجددیت: بشارت سے تعبیر تک

ادارتی نوٹ:

''مجددیت: بشارت سے تعبیر تک'' زیرِ نظر مضمون اپنی نوعیت کے اعتبار سے محض ایک ادبی یا سوانحی کاوش نہیں بلکہ ایک سنجیدہ فکری مقدمہ ہے، جس میں مجددیت کے تصور کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے سمجھنے کی بامعنیٰ کوشش کی گئی ہے۔ یہاں تاریخ کو واقعات کے جامد سلسلے کے طور پہ نہیں بلکہ مشیت الٰہی کے اشاراتی نظام کی ایک مربوط زبان کے طور پر پڑھنے کی دعوت دی گئی ہے اور اسی تناظر میں ''بشارت'' کو مجددیت کے فہم میں ایک اصولی حیثیت عطا کی گئی ہے۔

یہ زاویہ بلاشبہ دلکش بھی ہے اور فکر انگیز بھی ---- کہ مجددیت کو صرف بعد از ظہور خدمات کے آئینے میں نہ دیکھا جائے بلکہ اسے قبل از ظہور ربانی نوید، روحانی پیش آگاہی اور تقدیری اشارات کے تناظر میں بھی سمجھا جائے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو اس مضمون کو محض ایک بیانیہ نہیں رہنے دیتا بلکہ اسے ایک ممکنہ علمی دبستان کی بنیاد کے طور پر سامنے لاتا ہے، جہاں مجددیت ایک تاریخی منصب سے بلند ہو کر روحانی تسلسل، ربانی انتخاب اور ایک مقدر شدہ ظہور کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۰۰ھ/ ۱۱۸۰ھ) سے منسوب وصیت نامے کو بنیاد بنا کر مضمون نگار نے نہایت لطیف انداز میں یہ واضح کیا ہے کہ اولیائے کرام کی بصیرت زمانے کے ظاہری پردوں تک محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ مستقبل کے وہ نقوش بھی دیکھ لیتی ہے جو ابھی تاریخ کے افق پر ظاہر نہیں ہوئے ہوتے۔ اسی زاویے سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۷۲ھ-۱۸۵۶ء/ ۱۳۴۰ھ-۱۹۲۱ء) کی مجددیت کو ایک ایسی بشارت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس کی بازگشت صدیوں پہلے اہلِ دل کی نگاہوں میں سنائی دیتی رہی --- یوں بشارت اور تعبیر ایک ہی نور کے دو مرحلے بن کر سامنے آتے ہیں۔ تاہم ادارہ اس امر کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہے کہ اس نوع کے موضوعات اپنی نزاکت اور اہمیت کے پیش نظر محض تأثراتی یا ذوقی سطح پر نہیں بلکہ باقاعدہ منہجِ تحقیق کے ساتھ آگے بڑھائے جانے کے متقاضی ہیں۔ بالخصوص وصیت نامے کی سند، متن اور تاریخی حیثیت پر جامع و تنقیدی تحقیق، متعلقہ روایتوں اور مآخذ کا تقابلی و تحقیقی مطالعہ، علم کلام اور اصول حدیث کی روشنی میں ''کشف'' اور ''بشارت'' جیسے مفاہیم کی متوازن تعبیر۔

اگر یہ اصولی جہات پیش نظر رکھتے ہوئے اس فکر کو آگے بڑھایا جائے تو بعید نہیں کہ ''مجددیت بطورِ بشارت'' یا ''بشاراتِ رضویہ'' کے عنوان سے ایک منضبط علمی باب وجود میں آئے --- ایسا باب جو روایت، تحقیق اور روحانی شعور کے مابین ایک گہرا اور بامعنیٰ ربط قائم کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون محض ایک روایت کی شرح نہیں بلکہ ایک نئے علمی و فکری امکان کا اعلان بھی ہے۔ یہ ایک ایسا فکری اشارہ ہے جو تحقیق کے نئے دریچے وا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اہلِ علم کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس بیانیے کو محض ایک خوبصورت تصور تک محدود نہ رکھیں بلکہ اسے علمی استحکام، تحقیقی گہرائی اور فکری توازن کے ساتھ ایک زندہ روایت میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔

ہمیں امید ہے کہ یہ کاوش اہلِ نظر کو نہ صرف ایک نئے زاویۂ مطالعہ سے آشنا کرے گی بلکہ تحقیق، تدبر اور فکری مکالمے کا ایسا راستہ بھی ہموار کرے گی جہاں سوالات جنم لیتے ہیں، زاویے بدلتے ہیں اور فکر کو نئی جہت عطا ہوتی ہے --- اور یہی کسی زندہ علمی کاوش کی اصل کامیابی ہے۔ (ادارہ)

شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۱۰۰۰ھ ۱۱۷۰ھ) کے وصیت نامے اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۱۲۷۲ھ-۱۳۴۰/ 1856ء-1921ء) کی مجددیت کے تناظر میں تاریخ کے بعض اوراق محض واقعات کے امین نہیں ہوتے، وہ زمانے کے باطن میں اترنے والے ان اشارات کے حامل ہوتے ہیں جنہیں اہلِ بصیرت ''بشارت'' کہتے ہیں۔ وہ اوراق دراصل تقدیر کے دبیز پردوں پر ابھرتے ہوئے وہ نقوش ہوتے ہیں جن میں آنے والے زمانوں کی روشنی جھلملاتی محسوس ہوتی ہے۔ بعض لمحے بظاہر ایک واقعہ ہوتے ہیں مگر اپنے اندر صدیوں کی معنویت سموئے ہوتے ہیں، جیسے وقت اپنی خموش زبان میں مستقبل کے کسی عظیم ظہور کی خبر دے رہا ہو۔ ان میں بعض اشارے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ابتدا میں محض سرگوشی معلوم ہوتے ہیں مگر گردشِ ایام کے ساتھ وہی سرگوشیاں تاریخ کی گونج بن جاتی ہیں۔

دل گواہی دیتا ہے کہ بعض واقعات رونما نہیں ہوتے بلکہ مشیت کے ہاتھوں بتدریج منکشف ہوتے ہیں اور ان کے پس منظر میں ایک ایسا روحانی تسلسل کارفرما ہوتا ہے جو اہلِ نظر کے لیے محض داستان نہیں، ایک زندہ بشارت بن جاتی ہے اور جب مشیت کے یہ تدریجی انکشافات تاریخی شعور میں اترتے ہیں تو واقعات محض واقعات نہیں رہتے، وہ اشاروں کی زبان میں ایک بڑے معنوی نظام کی ترجمانی کرنے لگتے ہیں۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں تاریخ خبر سے بلند ہو کر اشارہ بن جاتی ہے اور واقعہ، تقدیر کے پوشیدہ نظام کی ایک جھلک محسوس ہونے لگتا ہے۔ بعض تحریریں دستاویز نہیں ہوتیں، زمانوں کے بیچ رکھا ہوا ایک روحانی پل ہوتی ہیں، جو ماضی کو مستقبل سے اور بصیرت کو تعبیر سے مربوط کر دیتی ہیں۔

شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منسوب وہ تاریخی وصیت نامہ، جس میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ولادت سے تقریباً ایک سو ستر برس قبل ان کے ظہور، تجدیدی کردار اور آئندہ زمانوں میں ان کے علمی و روحانی فیضان کے آثار کا ذکر ملتا ہے، اسی نوع کے نادر اور حیرت انگیز روحانی اشارات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

یہ محض ایک پیش گوئی نہیں بلکہ اہلِ ولایت کی بصیرت میں جھلکتی ہوئی ایک مجددانہ بشارت ہے۔ ایسی بشارت جس میں مستقبل کوئی غیر مرئی دھندلا امکان نہیں بلکہ ایک روشن حقیقت کی طرح جلوہ گر دکھائی دیتا ہے۔

اولیائے کرام کے ہاں پیش گوئی محض وقوع پذیر ہونے والے حالات کی خبر نہیں ہوتی بلکہ وہ دراصل بصیرت کی وہ آنکھ ہوتی ہے جو زمانے کے ظاہری پردوں کے پیچھے تقدیر کے نقوش دیکھتی ہے۔

یہ آنے والے زمانوں کا بیان نہیں بلکہ مشیت کے سربستہ رازوں کی ایک جھلک ہوتی ہے جو اہلِ دل پر منکشف ہوتی ہے۔ ان کے ہاں بشارت، خبر سے زیادہ نظر ہوتی ہے، ایسی نظر جو حوادث کے غبار میں بھی مستقبل کے روشن مینار دیکھ لیتی ہے۔ وہ زمانے کی سطح پر نہیں، اس کے باطن میں اتر کر ان حقائق کو محسوس کرتے ہیں جہاں تقدیر خموشی سے اپنے فیصلے رقم کر رہی ہوتی ہے۔ اسی لیے اولیاء کی پیش گوئیاں صرف الفاظ نہیں ہوتیں، روحانی ادراک کے وہ چراغ ہوتی ہیں جو آنے والے ادوار کی سمت متعین کرتے ہیں۔ بسا اوقات ایک جملہ، ایک اشارہ یا ایک دعا صدیوں بعد ایک عہد ساز حقیقت بن کر جلوہ گر ہوتی ہے اور تب محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض پیش گوئی نہ تھی بلکہ نورِ فراست سے دیکھی گئی ایک زندہ بشارت تھی، جس میں مستقبل اپنی پوری معنویت کے ساتھ پہلے ہی بول اٹھا تھا۔

اسی لیے ان کے اشارے محض الفاظ نہیں ہوتے، معانی کے چراغ ہوتے ہیں۔ جو صدیوں کے دھندلکوں میں بھی رہنمائی کی لو دیتے رہتے ہیں۔ ان کے کلمات صرف بیان نہیں، بصیرت کے ایسے نقوش ہوتے ہیں جن میں آنے والے زمانوں کے امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ بسا اوقات ایک مختصر اشارہ اپنے اندر ایک پورے عہد کی تعبیر سموئے ہوتا ہے اور ایک جملہ تاریخ کے کئی ابواب پر محیط حقیقت کا پیش لفظ بن جاتا ہے۔ ان کی گفتگو میں رمز بھی ہوتا ہے، روشنی بھی، بشارت بھی ہوتی ہے، بصارت بھی۔ وہ الفاظ کے پیرہن میں حقائق

کے ایسے موتی پرو دیتے ہیں جو وقت گذرنے کے ساتھ اور زیادہ تابناک ہوجاتے ہیں۔ ان کے اشارات محض سنے نہیں جاتے، زمانہ انہیں بتدریج پڑھتا ہے اور پھر ایک دن وہی اشارے تاریخ کے افق پر ایک روشن حقیقت بن کر طلوع ہوتے ہیں۔ شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصیت نامے کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

اس وصیت نامے کی اہمیت صرف اس لیے نہیں کہ اس میں ایک مجدد کے ظہور کی خبر دی گئی بلکہ اصل اہمیت اس معنوی ربط کی ہے جو گیارہویں صدی ہجری کے ایک صاحبِ کشف بزرگ کو چودہویں صدی کے ایک مجدد سے جوڑتا ہے۔ یہ ربط محض زمانی فاصلے کو سمیٹنے کا نام نہیں بلکہ روحانی تسلسل کی اس زنجیر کا اظہار ہے جس میں صدیوں کے فاصلے قربت میں ڈھل جاتے ہیں۔ گویا ایک عہد کی دعا دوسرے عہد کی تعبیر بن کر جلوہ گر ہوتی ہے اور ایک بزرگ کی بصیرت آنے والے زمانے کے مجدد میں اپنی تکمیل پاتی ہے۔

یہ نسبت اس حقیقت کو آشکار کرتی ہے کہ اہلِ حق کے درمیان تعلق صرف ہم عصری کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ نورانی مشن اور فکری وراثت کا ایک ایسا رشتہ بھی ہوتا ہے جو زمان و مکان کی قیود سے ماورا ہوتا ہے۔ یہاں ایک صاحبِ کشف کی بشارت اور ایک مجدد کا ظہور، دو الگ الگ واقعات نہیں بلکہ ایک ہی روحانی حکایت کے دو باب محسوس ہوتے ہیں۔

غور کیا جائے تو یہ حقیقت ابھرتی ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں بکھرے ہوئے یہ نقوش دراصل ایک ہی مشیت کے مربوط اشارات ہیں، جن کے درمیان ایک خموش مگر گہرا ربط جاری ہے۔

یہی معنوی پیوستگی اس واقعے کو محض ایک پیش گوئی سے بلند کر کے روحانی تواتر کی دلیل بنا دیتی ہے، جہاں صدیوں کے فاصلے سمٹ کر اس حقیقت کا اعلان کرتے ہیں کہ چراغوں کی روشنی نسلوں کے فاصلے سے مدھم نہیں ہوتی بلکہ ایک چراغ سے دوسرے چراغ تک منتقل ہوکر اور زیادہ فروزاں ہوجاتی ہے۔

یہ روحانی تواتر صرف نسبتوں کی روشنی محفوظ نہیں رکھتا بلکہ یہ حقیقت بھی منکشف کرتا ہے کہ تاریخ میں ظہورِ مجددیت اتفاق نہیں، مشیتِ الٰہی کے مسلسل نظم کا ایک مظہر ہے۔

صدیوں کے فاصلے کے باوجود یہ ربط اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ تجدید محض تاریخی ضرورت نہیں، ربانی منصوبۂ ہدایت کا تسلسل بھی ہے۔

غور کیا جائے تو واضح ہوتا کہ یہ وصیت نامہ تاریخ کے بکھرے ہوئے اشاروں کو ایک وحدت عطا کرتا ہے اور مجددیت کو صرف ایک علمی عنوان نہیں بلکہ ایک روحانی استمرار کے طور پر سامنے لاتا ہے۔ یہ محض ایک تحریری وصیت نہیں بلکہ صدیوں پر محیط ایک نورانی نسبت کا مکتوب ہے، جس میں ماضی کی بشارتیں اور مستقبل کی تعبیرات ایک نقطۂ وصل پر جمع ہوجاتی ہیں۔ اس کی سطور میں صرف الفاظ نہیں، ایک ایسا فکری و روحانی تسلسل موجزن ہے جو مجددیت کو محض علمی تجدید کے دائرے سے نکال کر ربانی انتخاب اور تاریخی مشن کی صورت میں آشکار کرتا ہے۔

گویا منظر یہ ہے کہ یہ وصیت نامہ منتشر اشارات کو معنیٰ کی ایک مرکزی لڑی میں پرو دیتا ہے اور تاریخ کے مختلف ادوار کو ایک ہی روحانی بیانیے کا تسلسل بنا دیتا ہے۔ یہاں مجددیت محض کسی فرد کا منصب نہیں رہتی بلکہ امت کے باطن میں جاری اس تجدیدی روح کی مظہر بن جاتی ہے جو ہر دور میں نئی شان سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو یہ وصیت نامہ ایک خبر نہیں، ایک تعبیر ہے، ایک بیان نہیں، ایک اشارت ہے، جو بتاتی ہے کہ تجدید کا عمل زمانوں کے بدلنے سے منقطع نہیں ہوتا بلکہ روحانی امانت کی صورت نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔

یوں باور ہوتا ہے جیسے اس وصیت نامے کے پس منظر میں تاریخ محض واقعات کا سلسلہ نہیں رہتی بلکہ ایک زندہ مکالمہ بن جاتی ہے، جہاں ماضی حال سے ہم کلام ہے اور حال مستقبل کے لیے روشنی ترتیب دے رہا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مجددیت ایک علمی عنوان سے بڑھ کر روحانی استمرار، نورانی توارث اور مشیت کے مسلسل ظہور کا استعارہ بن کر سامنے آتی ہے۔

مجددیت: محض علمی منصب نہیں، ایک ربانی بشارت:

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ علیہ کی مجددیت عموماً ان کے علمی کارناموں، فقہی بصیرت، عشقِ رسول ﷺ اور دفاعِ اہلِ سنّت کی خدمات کے حوالے سے بیان کی جاتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی مجددانہ عظمت صرف علمی تصنیفات یا مناظرانہ فتوحات تک محدود نہیں بلکہ وہ ایک ہمہ گیر روحانی و فکری انقلاب کا عنوان ہے۔ ان کی ذات میں تجدید محض مسائل کے حل یا عقائد کے تحفظ کا نام نہیں بلکہ ایمان کی حرارت تازہ کرنے، محبتِ مصطفیٰ ﷺ کو شعورِ امت کا مرکز بنانے اور شریعت و طریقت کے بکھرے رشتوں کو ایک وحدت میں پرو دینے کا نام ہے۔

انہوں نے اپنے قلم سے صرف شبہات کا ازالہ نہیں فرمایا بلکہ ایک عہد کے فکری انتشار کو سمیٹ کر حق کی ایک روشن شاہراہ متعین کی۔ ان کی مجددیت میں فقہ کی گہرائی بھی ہے، عرفان کی لطافت بھی، عشق کی سوزناکی بھی اور ملت کی پاسبانی کا وقار بھی۔ حقیقت یہی ہے کہ ان کا ظہور ایک ایسے وقت میں ہوا جب امت کو محض ایک عالم نہیں، ایک مجدد، ایک نگہبان اور ایک روحانی چراغ درکار تھا۔ اگر ان کی علمی خدمات مجددیت کا ظاہر ہیں تو ان کی روحانی بصیرت اس کا باطن ہے، اگر ان کے فتاوے اس عہد کے فکری معرکوں کا جواب ہیں تو ان کا عشقِ رسول ﷺ اس تجدیدی مشن کی اصل روح ہے۔ اسی لیے ان کی مجددیت کو صرف ایک علمی عنوان کے طور پر نہیں بلکہ ایک ایسا نورانی تسلسل سمجھنا چاہیے جس میں صدیوں کی بشارتیں، اولیاء کی دعائیں اور تاریخ کی معنوی جہتیں ایک نقطے پر آکر مجتمع ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔

یوں اعلیٰ حضرت کی مجددیت محض ایک شخصیت کا وصف نہیں رہتی بلکہ وہ دین کے ابدی تحفظ، عشق کے احیا اور سنت کے دوام کی ایک زندہ تعبیر بن کر سامنے آتی ہے اور جب مجددیت کو اس ہمہ گیر معنوی تناظر میں دیکھا جائے تو اس کا ایک اور لطیف لیکن نہایت عمیق پہلو منکشف ہوتا ہے، جو اسے محض ظہورِ کردار نہیں بلکہ ظہورِ بشارت کے عنوان سے بھی سامنے لاتا ہے۔ مگر اس وصیت نامے کی روشنی میں اس مجددیت کا ایک اور زاویہ سامنے آتا ہے---اور وہ ہے مجددیت بطورِ بشارت۔ یہاں مجددیت محض بعد کے علمی کارناموں سے ثابت ہونے والا منصب نہیں رہتی بلکہ پہلے سے ودیعت ایک ایسی نوید بن کر ابھرتی ہے جسے اہلِ بصیرت نے وقت کے پردوں کے پار دیکھا تھا۔ گویا یہ صرف تاریخ کا فیصلہ نہیں، تقدیر کا اشارہ بھی ہے۔

اس زاویے سے دیکھا جائے تو اعلیٰ حضرت کی ذات صرف ایک عظیم مجدد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک موعود تجدیدی ظہور کے طور پر سامنے آتی ہے ایسا ظہور جس کی دھیمی بازگشت صدیوں پہلے اہلِ دل کے مکاشفات، دعاؤں اور وصیتوں میں سنائی دے رہی تھی۔ یوں ان کی مجددیت صرف کارناموں کی بنیاد پہ قائم حقیقت نہیں بلکہ ایک ایسی بشارت بھی ہے جو وقت آنے پر اپنے پورے جلال کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی۔ یہاں تاریخ اور روحانیت ایک دوسرے سے ہم آغوش دکھائی دیتے ہیں واقعات، بشارتوں کی تفسیر بن جاتے ہیں اور بشارتیں واقعات کا پیش خیمہ محسوس ہوتی ہیں۔ گویا مجددیت کا یہ تصور ہمیں بتاتا ہے کہ بعض عظیم شخصیات صرف اپنے عہد کا جواب نہیں ہوتیں بلکہ ازل سے مشیتِ الٰہی کے ایک منصوبے کا حصہ ہوتی ہیں۔ قرائن اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ یہ وصیت نامہ مجددیت کو محض علمی و اصلاحی منصب سے اٹھا کر ایک روحانی استمرار، ایک غیبی نوید اور ایک تاریخی بشارت کے قالب میں ڈھال دیتا ہے---جہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ذات ایک مجدد ہی نہیں بلکہ بشارت کے چراغ سے نمودار ہونے والی وہ روشنی بن جاتی ہے جس نے اپنے عہد کو منور کر دیا اور جب اس نورانی ظہور کو بشارت کے پس منظر میں دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ صرف عہد کی ضرورت کا جواب نہیں، ایک قدیم نوید کی تکمیل بھی ہے۔

یہاں مجدد محض اپنے عہد کا جواب نہیں، صدیوں پہلے دی گئی ایک خبر کی تعبیر بھی ہے۔ یہ نکتہ رضویات کے مطالعے میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اس سے مجددیت صرف ایک تاریخی یا فکری منصب نہیں رہتی بلکہ ولایت اور تجدید کے باہمی ربط کی ایک دل آویز صورت بن جاتی ہے۔ یہاں علم، کشف سے ملتا ہے، فقہ، بشارت سے

ہم آغوش ہوتا ہے اور تاریخ، روحانیت کے نور میں اپنے باطنی معانی آشکار کرتی ہے۔

اس زاویۂ نظر سے اعلیٰ حضرت کی مجددیت محض علمی عبقریت یا فقہی امتیاز کی تعبیر نہیں رہتی بلکہ وہ ایک ایسے روحانی تسلسل کا مظہر بن جاتی ہے جس میں اولیاء کی بصیرت، اہلِ حق کی بشارتیں اور امت کی فکری ضرورتیں ایک ہی نقطۂ نور پر جمع دکھائی دیتی ہیں۔ گویا یہاں تجدید صرف ردِّ باطل کا عمل نہیں بلکہ ولایت کے باطن سے پھوٹنے والی وہ شعاع ہے جو علم کو تاثیر، فکر کو سمت اور امت کو نئی حیات عطا کرتی ہے۔ اس تناظر میں یہ وصیت نامہ محض ایک تاریخی دستاویز نہیں رہتا بلکہ ایک رمز بن جاتا ہے---ایسا رمز جس میں مجددیت، ولایت کی توثیق کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہاں کشف مستقبل کے دریچے کھولتا ہے، علم ان اشاروں کی تعبیر بنتا ہے اور تاریخ ان دونوں کے درمیان ایک زندہ پل کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ رضویات کا یہ باب ہمیں مجددیت کی ایک نہایت لطیف اور بلند تر تفہیم عطا کرتا ہے، جہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات صرف ایک مجدد کے طور پر نہیں بلکہ روحانی بشارتوں کے امین، ولایت کے ترجمان اور تجدید کے مقدر آشنا استعارے کے طور پر ابھرتی ہے۔ یہاں علم محراب بنتا ہے، عشق چراغ بنتا ہے اور بشارت اس چراغ کی وہ لو جس کی روشنی صدیوں کے فاصلے طے کر کے ایک عہد کو منور کر دیتی ہے اور شاید اسی مقام پہ مجددیت اپنے کامل مفہوم میں آشکار ہوتی ہے---جب وہ محض فکری قیادت نہیں رہتی بلکہ روح کی رہنمائی بن جاتی ہے، جب وہ صرف امت کی اصلاح کا عنوان نہیں رہتی بلکہ مشیت الٰہی کے ایک خموش مگر درخشاں اشارے کی تفسیر بن جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تاریخ، تقدیر کے لہجے میں بولتی محسوس ہوتی ہے۔

شیراز سے بریلی تک-ایک نورانی تسلسل:

اس وصیت نامے کا سب سے دل آویز پہلو شاید یہی ہے کہ یہ شیراز اور بریلی کے درمیان ایک ایسی معنوی نسبت قائم کرتا ہے جو محض جغرافیہ نہیں، فیضان کا رشتہ محسوس ہوتی ہے۔

ایک طرف شیراز---علم، حکمت اور عرفان کا قدیم مرکز۔ دوسری طرف بریلی---تجدید، عشق اور فقہ کا روشن مینار۔ اور ان دونوں کے درمیان ایک بشارت کا پل۔ نگاہِ تصور میں یوں ابھرتا ہے کہ ایک چراغ شیراز میں روشن ہوا اور اس کی روشنی صدیوں بعد بریلی میں ایک آفتاب بن کر نمودار ہوئی۔ یہ محض حسنِ تعبیر نہیں، ایک روحانی منظر نامہ ہے۔

وصیت نامہ-رضویات کا ایک نظر انداز باب:

حقیقت یہ ہے کہ اس وصیت نامے پر ابھی وہ علمی توجہ نہیں دی گئی جس کا یہ مستحق ہے۔ اگر اس کے فارسی اصل نسخے، روایتوں، حوالوں اور متون پر منہجِ تحقیق کے مطابق سنجیدہ کام ہو، اس کا تقابلی و تنقیدی مطالعہ کیا جائے اور اسے اعلیٰ حضرت کی مجددیت کے تناظر میں مرتب کیا جائے تو یہ رضویات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہی نہیں بلکہ ایک نئی جہت کا آغاز بھی ہو سکتا ہے۔

کیونکہ یہ ایک روایت کی بازیافت نہیں ہوگی بلکہ ایک ایسے فکری وروحانی سرمائے کی دریافت ہوگی جو اب تک پوری طرح سامنے نہیں آ سکا۔ فارسی اصل متن کی تدوین، مخطوطات کی تحقیق، اسناد و مآخذ کی جانچ اور مختلف روایتوں کے تقابل سے نہ صرف اس وصیت نامے کی تاریخی حیثیت زیادہ واضح ہوگی بلکہ مجددیت کے اس بشارتی تصور کو بھی ایک مضبوط علمی بنیاد میسر آئے گی۔ اس نوع کے تحقیقی کام سے رضویات میں محض اضافہ نہیں ہوگا بلکہ اس کے بعض مسلمہ مباحث ایک نئے تناظر میں از سرِ نو مرتب ہو سکیں گے۔

خاص طور پر اگر اس وصیت نامے کو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی علمی خدمات، ان کے عہد کے دینی تقاضوں اور تجدید و ولایت کے باہمی ربط کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ مطالعہ صرف سوانحی یا عقیدت کے دائرے میں محدود نہیں رہے گا بلکہ ایک مستقل علمی discourse کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اس سے مجددیت کے باب میں ''بشارت''، ''روحانی پیش آگاہی'' اور

"تاریخی ظہور" جیسے مباحث بھی باقاعدہ علمی گفتگو کا حصہ بن سکتے ہیں۔ رضویات کے موجودہ مطالعات میں علمی وفکری جہات پر خاصا کام ہوا ہے مگر اس بشارتی و وصیتی زاویے پر منظم تحقیقی توجہ واقعی ایک نئے باب کی بنیاد رکھ سکتی ہے۔

بشارت کا یہ باب ابھی اپنی تمام معنوی پرتوں کے ساتھ منکشف نہیں ہوا بلکہ مزید تدبر کا طالب ہے۔قرائن سے یہ حقیقت جھلکتی ہے کہ یہ وصیت نامہ ابھی اپنے کامل انکشاف کا منتظر ہے، جیسے ایک مخفی دریچہ جو کھلتے ہی رضویات کا منظر نامہ مزید وسیع کر دے۔ اگر اس پہ تحقیقی ادارے، جامعات اور رضوی محققین مشترکہ توجہ دیں تو بعید نہیں کہ یہی موضوع مستقبل میں "مجددیت بطورِ بشارت" کے عنوان سے ایک مستقل باب، بلکہ ایک نئے علمی دبستان کی صورت اختیار کر لے۔

اور شاید تب یہ بات زیادہ وضاحت سے سامنے آئے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مجددیت صرف ایک واقعۂ تاریخ نہیں بلکہ ایک پیش نوشتہ معنویت بھی تھی جسے اولیاء نے اشاروں میں دیکھا، تاریخ نے واقعات میں ثبت کیا اور تحقیق اسے دلیل وشعور کے ساتھ امت کے سامنے لاسکتی ہے۔ یہی وہ مقام ہوگا جہاں روایت، تحقیق سے ملے گی، عقیدت، استدلال سے اور رضویات اپنے ایک نئے افق سے آشنا ہوگی۔ اور شاید یہی نیا افق آگے چل کر ایک مستقل دبستانِ فکر کی بنیاد بن جائے۔

بلکہ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ یہ باب ''بشاراتِ رضویہ'' کے عنوان سے ایک مستقل علمی میدان بن سکتا ہے، کیونکہ یہاں صرف ایک دستاویز نہیں، ایک فکری امکان پوشیدہ ہے، ایسا امکان جو مجددیت کو محض بعد از ظہور شناخت کرنے کی بجائے قبل از ظہور بشارت کے تناظر میں دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ زاویۂ نظر رضویات کے مطالعے کو محض سوانحی یا تجدیدی مباحث تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے روحانی پیش آگاہی، تاریخی اشارات اور ولائی بصیرت کے ایک نئے افق سے ہم کنار کرتا ہے۔

یہاں مجددیت صرف وقوع پذیر ہونے کے بعد پہچانی جانے والی حقیقت نہیں رہتی بلکہ ایک ایسی نوید بن کر سامنے آتی ہے جس کے آثار پہلے سے زمانے کے باطن میں رقم ہوتے چلے آرہے تھے۔ گویا بشاراتِ رضویہ کا تصور ہمیں یہ بتاتا ہے کہ بعض شخصیات صرف اپنے کارناموں سے عظیم نہیں ہوتیں، ان کا ظہور خود بھی ایک معنوی واقعہ ہوتا ہے--- ایک ایسا واقعہ جس کی بازگشت پہلے اہلِ کشف کے اشارات میں، پھر تاریخ کے تسلسل میں اور آخر کار امت کے شعور میں سنائی دیتی ہے۔

اسی لیے یہ باب محض کرامات وبشارات کے تذکرے تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایک منضبط علمی میدان کی صورت اختیار کرسکتا ہے، جہاں بشارت، تجدید، ولایت، تاریخ اور فکری ظہور کے باہمی تعلقات پر باقاعدہ تحقیق ہو۔ اس عنوان کے تحت وصیت ناموں، پیش گوئیوں، مکاشفات، ملفوظات اور ان کے تاریخی ومتنی شواہد یکجا کر کے ایک ایسا علمی ذخیرہ مرتب ہوسکتا ہے جو رضویات کو ایک بالکل نئی معنوی گہرائی عطا کرے۔

حقیقت یہی ہے کہ "بشاراتِ رضویہ" محض ایک عنوان نہیں، ایک مکمل زاویۂ مطالعہ ہے--- ایسا زاویہ جس میں مجددیت اپنی روایتی تعبیر سے بلند ہو کر تقدیر کے اشارات، ولایت کی شہادت اور تاریخ کے روحانی باطن سے جڑ جاتی ہے۔ یہاں علم صرف واقعات کی ترتیب نہیں کرتا بلکہ اشاروں کے معانی بھی دریافت کرتا ہے، یہاں تحقیق صرف متن نہیں پڑھتی، پس منظر کی نورانیت بھی محسوس کرتی ہے۔ اور شاید یہی وہ مقام ہے جہاں یہ فکری امکان ایک باقاعدہ دبستان کی صورت اختیار کرتا ہے--- جہاں مجدد کو صرف مصلحِ وقت نہیں بلکہ مبشَّرِ وقت کے طور پر بھی سمجھا جاتا ہے، جہاں ظہور، بشارت کی تکمیل بنتا ہے اور تاریخ، پیش نوشتہ حقیقت کی شرح۔ اس تناظر میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مجددیت ایک نئے جلال کے ساتھ سامنے آتی ہے: صرف ایک علمی انقلاب نہیں بلکہ ایک ایسی بشارت کا ظہور جسے صدیوں پہلے روحانی آفاق پر دیکھا گیا تھا۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ باب اگر پوری طرح مرتب ہو تو رضویات میں وہی مقام حاصل کرسکتا ہے جو سیرت میں شمائل کو، یا

تصوف میں مکتوبات کو حاصل ہے---ایک ایسا باب جہاں فکر بھی ہے، کشف بھی، استدلال بھی ہے، استبصار بھی اور جہاں تاریخ اپنی ظاہری سطور سے بلند ہوکر معنویت کی روشن تحریر بن جاتی ہے۔

اہلِ ولایت کی نگاہ اور زمانے کا باطن

یہ وصیت نامہ ایک بڑے اصول کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے کہ اولیاء کی نگاہیں واقعات کی سطح پر نہیں ٹھہرتیں، وہ زمانے کے باطن میں دیکھتی ہیں۔ بعض ہستیاں آنے سے پہلے پہچانی جاتی ہیں۔ بعض افراد چراغ روشن ہونے سے پہلے دیکھ لیے جاتے ہیں۔ بعض مجدد وقت کی ضرورت بننے سے پہلے اہلِ کشف کی بصیرت میں جلوہ گر ہو جاتے ہیں اور یہی اس وصیت نامے کا اصل روحانی مفہوم ہے۔ یہ کسی شخصیت کے فضائل میں اضافہ نہیں کرتا بلکہ ان فضائل کی ربانی جہت منکشف کرتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس وصیت نامے کی اصل فارسی صورت عام اہلِ علم کی دسترس میں نہیں آسکی، ورنہ ممکن تھا کہ رضویات کا ایک منفرد باب اب تک سامنے آچکا ہوتا۔ لیکن شاید بعض امانتیں اپنے ظہور کے لیے ایک خاص ساعت کی منتظر ہوتی ہیں۔ شاید یہ وصیت نامہ بھی انہی خموش امانتوں میں سے ایک ہے جو وقت آنے پر نئے معنیٰ کے ساتھ آشکار ہوگی۔

بشارت سے تعبیر تک

شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے اس وصیت نامے کو اگر محض ایک کرامتی روایت کے طور پر نہ دیکھا جائے بلکہ تجدیدی فکر، روحانی بصیرت اور تاریخی شعور کے تناظر میں پڑھا جائے تو یہ ایک نئی دنیا ہی نہیں، ایک نیا زاویۂ ادراک روشن کرتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ وصیت نامہ صرف ایک پیش گوئی نہیں بلکہ زمانوں کے باطن میں کارفرما ربانی حکمت کا ایک اشارہ ہے، جہاں تاریخ، ولایت اور تجدید ایک ہی نقطۂ نور پر آکر مجتمع ہوجاتے ہیں۔

یہ متن اپنے باطن میں اس حقیقت کی شہادت رکھتا ہے کہ مجددیت محض کسی عہد کے فکری بحران کا ردِّ عمل نہیں بلکہ کبھی کبھی اس کے آثار عرصہ دراز پہلے روحانی بصیرت کے افق پر نمایاں کر دیے جاتے ہیں۔ گویا یہاں ایک مردِ حق آگاہ کی نگاہ آنے والے دور کے فتنوں، تقاضوں اور ان کے لیے مقدر ایک مجدد کی آمد پہلے ہی محسوس کر رہی ہے۔ یہ محض خبر نہیں، ایک معنوی تیاری کا اعلان ہے۔

یوں یہ وصیت نامہ تاریخ کے خموش اوراق میں ثبت ایک ایسا زندہ استعارہ بن جاتا ہے جہاں بشارت، بصیرت اور تجدید باہم ہم کلام نظر آتے ہیں۔ اس کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ مجددین صرف اپنے عہد میں نہیں ابھرتے، بلکہ ان کے ظہور کی تمہید کبھی اولیائے ربانیین کی زبان سے پہلے ہی لکھ دی جاتی ہے۔ یہی پہلو اسے محض روایت سے بلند کر کے ”بشاراتِ تجدید“ کے ایک مستقل علمی باب میں داخل کرتا ہے۔

بلکہ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ یہ وصیت نامہ ہمیں مجددیت کو صرف بعد از ظہور شناخت کرنے کی بجائے قبل از ظہور بشارت کے آئینے میں دیکھنے کی دعوت دیتا ہے اور یہی دعوت اس روایت کو تاریخ کے ایک واقعے سے بڑھا کر روحانی استمرار، فکری تواتر اور تقدیرِ امت کے ایک لطیف راز میں بدل دیتی ہے۔ یہاں ایک ایسی دنیا منکشف ہوتی ہے جہاں وقت صرف گذرتا نہیں بلکہ کبھی کبھی اپنے آنے والے چراغوں کی خبر بھی پہلے دے جاتا ہے۔

اور جب تاریخ کے یہ اشارے بشارت کی روشنی میں پڑھے جائیں تو ان کا معنیٰ خبر سے بڑھ کر ایک باطنی شہادت بن جاتا ہے۔

تب محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف ایک پیش گوئی نہیں، تاریخ کے باطن میں رکھا ہوا ایک چراغ ہے، ایک ایسا چراغ جس کی لو فقط ایک عہد کو منور نہیں کرتی بلکہ صدیوں کے فاصلے طے کر کے روحانی و فکری تسلسل کے راستوں کو روشن کرتی چلی جاتی ہے۔ ایک چراغ، جس کی روشنی میں شیراز کی خانقاہ، بریلی کی تجدید اور اہلِ سنّت کا فکری تسلسل ایک نقطۂ نور پر مجتمع دکھائی دیتا ہے، جہاں ابتدا اور انتہا کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں رہتا، صرف نسبتوں کا ایک روشن سلسلہ باقی رہ جاتا ہے۔ اور شاید یہی اس وصیت نامے کا سب سے بڑا پیغام ہے:

کہ تجدید صرف علمی معرکوں کا نام نہیں، وہ پہلے روحوں میں اترتی ہے، پھر تاریخ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ مجدد پہلے تقدیر کے اوراق میں

لکھا جاتا ہے، پھر زمانے کے افق پر ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے یہ وصیت نامہ ہمیں یہ سمجھاتا ہے کہ حق کی بڑی تحریکیں محض حالات کی کوکھ سے نہیں جنم لیتیں، ان کے لیے آسمانوں میں پہلے سے ایک حکمت مقدر ہوتی ہے۔

یہ بھی گویا اسی پیغام کا حصہ ہے کہ اولیاء کی بصیرت صرف حال کی نگہبان نہیں ہوتی، وہ مستقبل کے نقوش بھی پڑھ لیتی ہے۔ چنانچہ یہاں ایک شیرازی درویش کی آواز، آنے والی صدیوں میں ایک عظیم مجدد کے ظہور سے ہم آہنگ سنائی دیتی ہے اور یہ ہم آہنگی محض اتفاق نہیں، روحانی تاریخ کا ایک لطیف تسلسل معلوم ہوتی ہے۔

دل کی تختی پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ یہ وصیت نامہ اعلان کر رہا ہو کہ چراغ سے چراغ جلنے کا عمل کبھی منقطع نہیں ہوتا، ایک نور دوسرے نور کے سپرد ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ ملت کی فکری تقدیر بن جاتا ہے۔ اور شاید یہی وہ مقام ہے جہاں یہ روایت ایک تاریخی دستاویز سے بلند ہو کر "روحانی وراثت" کی علامت بن جاتی ہے--- ایک ایسی وراثت، جس میں بشارت بھی ہے، رہنمائی بھی اور آنے والے زمانوں کے لیے یقین واستقامت کا پیغام بھی۔

اور شاید اسی مقام پر یہ راز کھلتا ہے کہ بشارت اور تجدید دراصل ایک ہی نور کے دو مرحلے ہیں۔ تجدید کبھی اچانک ظہور نہیں کرتی، وہ پہلے بشارت بن کر آتی ہے، پھر تعبیر بن کر جلوہ گر ہوتی ہے اور اس معنیٰ میں شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ وصیت نامہ واقعۃً روحانی پیش گوئی بھی ہے اور مجددانہ بشارت بھی۔

بلکہ یوں کہنا زیادہ حقیقت سے قریب ہوگا کہ یہ وصیت نامہ تجدید کے اس لطیف فلسفے کی ترجمانی کرتا ہے جس میں مجدد کا ظہور محض ایک تاریخی ضرورت نہیں بلکہ ایک مقدر شدہ ربانی انتظام محسوس ہوتا ہے۔ یہاں بشارت صرف اطلاع نہیں دیتی، وہ آنے والی تجدید کی معنوی تمہید بھی مرتب کرتی ہے گویا پہلے نور کی خبر دی جاتی ہے، پھر وہ نور تاریخ کے افق پر طلوع ہوتا ہے۔

اسی لیے اس وصیت نامے کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ہم کسی ایک بزرگ کے کشف یا کرامت کے سامنے نہیں بلکہ تجدید کے ایک گہرے روحانی شعور کے روبرو ہیں۔ ایسا شعور جو بتاتا ہے کہ امت کی فکری وایمانی حفاظت کے لیے قدرت اپنی حکمت پہلے سے رقم کر دیتی ہے اور مجددین اسی ربانی سلسلۂ حفاظت کی روشن کڑیاں ہوتے ہیں۔

یہ وصیت نامہ گویا اس حقیقت پر بھی مہر ثبت کرتا ہے کہ مجددیت صرف بعد کے مورخین کی عطا کردہ تعبیر نہیں، کبھی وہ قبل از ظہور اولیائے حق کی زبان سے بشارت بن کر بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہی پہلو اسے ایک روایت سے بڑھا کر "بشاراتِ رضویہ" کے ایک مستقل علمی و روحانی باب میں داخل کر دیتا ہے۔

قرائن سے یہ نقش ابھرتا ہے کہ یہاں پیش گوئی، تاریخ سے ملتی ہے، بشارت، تعبیر سے ہم آغوش ہوتی ہے اور روحانی بصیرت، تجدیدی ظہور میں اپنی تکمیل پاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں یہ وصیت نامہ صرف ایک خبر نہیں رہتا بلکہ ایک اعلان بن جاتا ہے--- کہ تجدید کا چراغ جب روشن ہوتا ہے تو اس کی لو صدیوں پہلے اہلِ بصیرت کے دلوں میں جھلملانے لگتی ہے۔

اور شاید اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ وصیت نامہ صرف ایک مجدد کی آمد کی خبر نہیں بلکہ اس حقیقت کی شہادت ہے کہ تجدید پہلے غیب کی بشارت بنتی ہے، پھر تاریخ کی حقیقت۔ پہلے نوید، پھر نمود، پہلے اشارہ، پھر ظہور۔ اور یہی اس روایت کا سب سے لطیف اور پُرمعنیٰ راز ہے۔

□□□□

پڑھیں! کہ علم امانت ہے۔
لکھیں! کہ امانت پہنچانا عبادت ہے۔

مولانا محمد رحمت اللہ صدیقی

نسبتوں کے چراغ: ایک سفرنامۂ عقیدت

تاریخ کے بعض صفحات واقعات کی خشک روداد نہیں ہوتے، وہ روحانی الہام کی صورت دل پر وارد ہوتے ہیں اور چشمِ فکر کے سامنے اسرارِ زمانہ وا کرتے ہیں۔

ان میں لمحے صرف گذرتے نہیں، بولتے ہیں، صدیاں صرف بیتتی نہیں، اپنے اسرار آشکار کرتی ہیں۔ بعض واقعات بظاہر تاریخ کے صفحات پر رقم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ تقدیر کے گہرے اشارے اور مشیت کے پوشیدہ پیغام بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان کے پس منظر میں محض حادثات کی ترتیب نہیں ہوتی، بلکہ ایک روحانی نظم اور ربانی حکمت کارفرما محسوس ہوتی ہے۔

ایسے اوراق میں کردار صرف افراد نہیں رہتے، عہد کے استعارے بن جاتے ہیں ان کے اقوال میں محض الفاظ نہیں، بصیرت کی روشنی جھلملاتی ہے اور ان کے اعمال میں صرف حرکت نہیں، ایک خموش پیغامِ دوام موجزن ہوتا ہے۔ یہی وہ صفحات ہیں جہاں تاریخ روایت سے بلند ہوکر مکاشفۂ معانی بن جاتی ہے، جہاں ماضی اپنی خموشی میں مستقبل کی آہٹیں سناتا ہے اور جہاں واقعات کی سطح کے نیچے روحانی حقائق کی ایک پوری کائنات سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔

یوں لگتا ہے کہ ان اوراق کا مطالعہ محض مشاہدۂ تاریخ نہیں، ایک باطنی سفر ہے، ایسا سفر جس میں قاری صرف معلومات حاصل نہیں کرتا بلکہ ایک نورانی تسلسل کا مشاہدہ کرتا ہے، جہاں حقائق اپنے ظاہری خدوخال سے آگے بڑھ کر معرفت کے دریچے کھولتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تاریخ، تذکرہ نہیں رہتی، الہامِ زمانہ بن جاتی ہے۔

اس قسم کے اسفار صرف منزلوں تک پہنچنے کے لیے نہیں ہوتے بلکہ وہ نسبتوں کی بازیافت، یادوں کی تجدید اور روح کے باطن میں اترنے کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ ایسے سفر میں راستے صرف سڑکوں پر نہیں کھلتے، دل کے اندر بھی کئی دریچے روشن ہوتے ہیں اور انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک مقام کی طرف نہیں بلکہ ایک کیفیت کی طرف بڑھ رہا ہے۔

یہ سفرنامہ بھی اسی نوعیت کا ایک روحانی تجربہ ہے، بظاہر ممبئی سے

فٹ نوٹ: حضرت سیّد محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ گیارہویں صدی ہجری کے اُن جلیل القدر اولیائے کاملین میں شمار ہوتے ہیں جن کی ذات محض ایک تاریخی وجود نہیں بلکہ ایک زندہ روحانی تسلسل کی علامت ہے۔ شیراز کی علمی و عرفانی سرزمین پہ نشوونما پانے والی یہ بابرکت ہستی ابتدا ہی سے غیر معمولی فیوض و اشارات کی حامل رہی، چنانچہ روایتوں میں مذکور ہے کہ بارگاہِ رسالت مآب ﷺ سے انہیں ہند کی سرزمین میں دینِ حق کی اشاعت کے لیے منتخب کیے جانے کی بشارت عطا ہوئی اور اسی طرح بارگاہِ غوث الاعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی ان کی اس روحانی خدمت کی توثیق کے آثار ملتے ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی خود ایک کرامت کا عنوان ہے، پانچ برس کی عمر میں حفظِ قرآن مجید کی سعادت اور بارہ برس کی عمر میں علومِ دینیہ کی تکمیل، اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ وجود محض کسبی نہیں بلکہ وہبی فیضان کا مظہر تھا۔ یہ عظیم ہستی اپنے ساتھ وہ کشف و بصیرت لے کر آئی جس نے زمانے کے پردوں میں چھپے اشاروں کو قبل از وقت محسوس کرلیا۔ طویل عمر، مجاہداتِ نفس، علومِ باطن کی گہرائی اور کرامات کے روشن نقوش، یہ سب ان کے ظاہری تعارف کے اجزاء ہیں مگر ان کی اصل پہچان وہ روحانی نگاہ ہے جو حال کے آئینے میں مستقبل کی جھلک دیکھ لیتی ہے۔ ان سے منسوب وہ تاریخی وصیت نامہ، جس میں آنے والے عہد کے ایک عظیم مجدد کی پیش خبری ثبت ہے، محض ایک دستاویز نہیں بلکہ روحانی بصیرت کی ایک درخشاں مثال ہے، جس نے صدیوں کے فاصلوں کو ایک معنوی ربط میں پرو دیا۔ ان کی خانقاہی زندگی سادگی، استغناء اور توکل کا ایسا پیکر تھی جہاں فقر، سلطنتِ باطن کا عنوان بن جاتا ہے اور خموشی، ذکرِ دوام کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ یوں حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ذات ایک فرد نہیں بلکہ ایک عہدِ نور کا استعارہ ہے، ایسا عہد جس میں بشارت بھی ہے، قیادت بھی اور ایک ایسا روحانی فیضان بھی جو آج تک اہلِ دل کو اپنی طرف متوجہ کیے ہوئے ہے۔ ان کا تذکرہ محض عقیدت نہیں جگاتا بلکہ دل میں ایک ایسی بے قراری پیدا کرتا ہے جو قاری کو اس نورانی آستانے، ان کے آثار اور ان کے فیضان کی تلاش میں بے اختیار کھینچ لے جاتی ہے......اور یہی بے چینی اس سفرنامے کی اصل دعوت ہے۔

رتن پور اور رتن پور سے کلاریا شریف تک کی مسافت مگر حقیقت میں یہ گیارہویں صدی ہجری کی ایک روحانی روایت، ایک صاحبِ کشف بزرگ کی یاد، ایک مجددانہ بشارت اور عصرِ حاضر میں ان فیوض کے امین نفوس کی معیت میں طے ہونے والا وجدانی سفر ہے۔

شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ذات عرصۂ دراز سے میرے قلب ونظر کے افق پر ایک روحانی کشش کی صورت جلوہ گر رہی تھی۔

ان کا تذکرہ محض ایک ہستی کی یاد نہیں بلکہ میرے باطن میں اترتی ہوئی ایک خموش روشنی کا احساس تھا، جو کبھی عقیدت کی لطافت بن کر ابھرتا، کبھی جستجو کی صورت دل کو اپنی طرف متوجہ کرتا۔ ان کی شخصیت میرے لیے صرف تاریخ کے اوراق میں محفوظ ایک نام نہ تھی بلکہ ایک ایسا روحانی حوالہ تھی جس کے گرد احترام، محبت اور استعجاب کی کئی جہتیں منعکس ہوتی تھیں۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی ذات سے وابستہ حکایات اور اشارات میں محض ماضی کی داستان نہیں بلکہ ایک زندہ روحانی تسلسل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ ان کے ذکر سے دل کے افق پر ایک ایسی نورانی فضا قائم ہو جاتی جس میں تصوف کی لطافت، ولایت کی شان اور معرفت کی خموش گہرائیاں ایک ساتھ جلوہ گر محسوس ہوتیں۔ گویا ان کا تصور ایک ایسی معنوی کشش رکھتا تھا جو محض ذہنی التفات نہیں بلکہ قلبی انجذاب کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

وقت کے ساتھ یہ تعلق عقیدت سے آگے بڑھ کر ایک باطنی رفاقت کا رنگ اختیار کرتا گیا، جیسے کسی دور افتادہ مینار سے آتی روشنی مسلسل رہنمائی کر رہی ہو۔ ان کی ذات میرے لیے ایک ایسی روحانی علامت بن گئی تھی جس کے گرد تاریخ، کرامت، بصیرت اور تجدید کے کئی روشن دائرے سمٹ آتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کے ذکر کے ساتھ صرف ایک شخصیت نہیں ابھرتی بلکہ ایک پورا روحانی منظر نامہ دل ونگاہ پر منکشف ہونے لگتا ہے۔

اور ان سے منسوب وہ تاریخی وصیت نامہ، جس میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی مجددیت کی پیش خبری ثبت ہے، مدتوں سے طبیعت میں اشتیاق واضطراب کا سبب تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس آستانے پر حاضری صرف ایک زیارت نہیں، بلکہ ایک دیرینہ پکار کا جواب ہے۔ گویا روح کے کسی نہاں خانے میں مدتوں سے جو صدا موجزن تھی، اس کی بازگشت مجھے اسی در کی سمت کھینچ لائی ہو۔ یہ حاضری صرف قدموں کا سفر نہ تھی، دل کی ایک طویل مسافت کا حاصل تھی ایسی مسافت جس میں اشتیاق نے رہنمائی کی، عقیدت نے زادِ راہ فراہم کیا اور محبت نے منزل کا تعین کیا۔

یوں لگتا تھا جیسے اس بارگاہ تک پہنچنا ایک اتفاق نہیں، نوشتۂ تقدیر کی ایک تکمیل ہے جیسے برسوں کی خموش تمنائیں اس آستانے کی فضاؤں میں تعبیر پانے کے لیے منتظر رہی ہوں۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوتا تھا کہ یہ محض ایک بزرگ کے آستانے کی زیارت نہیں، ایک روحانی نسبت کی تجدید ہے ایک ایسا لمحۂ وصال جس میں ماضی کی صدائیں، حال کی کیفیات سے ہم آغوش ہو جاتی ہیں۔

اس آستانے کی حاضری میں عجیب کیفیت تھی کہ زائر خود کو محض حاضر نہیں پاتا، بلکہ محسوس کرتا ہے کہ اسے بلایا گیا ہے۔ گویا یہ آمد ارادۂ سفر سے زیادہ ایک دعوتِ باطن کا ثمر ہے۔ فضا کی خموشی میں بھی ایک خطاب سنائی دیتا تھا، درودیوار سے بھی مانوسیت کی خوشبو آتی تھی اور دل گواہی دیتا تھا کہ یہ مقام محض سنگ وخاک کا مجموعہ نہیں، روحانی فیضان کا ایک زندہ مرکز ہے۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس آستانے پر سر نیاز خم کرنا صرف عقیدت کا اظہار نہیں، اپنی گم گشتہ باطنی نسبتوں کی بازیافت ہے جیسے روح اپنے کسی قدیم عہد سے دوبارہ آشنا ہو رہی ہو اور ایک دیرینہ پکار، آخر کار جواب پا گئی ہو۔

حسنِ اتفاق کہ یہ سعادت رفیقِ گرامی قدر حضرت مولانا مفتی محمد اشرف قادری زید مجدہم واقبالہم بانی وسربراہ جامعہ مدینۃ العلوم رتن پور ضلع کھیڑہ گجرات کی رفاقت میں نصیب ہوئی اور ان کی معیت نے اس سفر کو صرف زیارت نہیں رہنے دیا بلکہ اخلاص، خدمت، سادگی اور روحانی روایت کے ایک زندہ مشاہدے میں بدل دیا۔ پھر کلاریا شریف کی فضا، خانقاہی سادگی، وہاں کے حضور صاحب سجادہ حضرت

سید شاہ عبداللہ قادری شیرازی کی درویشانہ شان اور صدیوں سے جاری روحانی تسلسل ---یہ سب مل کر اس سفر کو ایک معمولی سفر نامہ نہیں بلکہ ایک تاثراتی و روحانی بیانیہ بنا دیتے ہیں۔

زیرِ نظر سطور اسی حاضری کے نقوش ہیں ایک مسافر کے تاثرات، ایک عقیدت مند کی وارفتگی اور ایک طالبِ نسبت کی وہ سرگذشت جس میں سفر، تاریخ اور روحانیت ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہیں۔ یہ سفر نامہ اسی وارداتِ قلب کا بیان ہے، جہاں ممبئی سے کلاریا شریف تک کا راستہ دراصل دل سے آستانے تک کا سفر بن جاتا ہے۔

کلاریا شریف: جہاں صدیوں کا فاصلہ سمٹ آتا ہے

بعض سفر فاصلے طے کرنے کے لیے نہیں ہوتے، زمانوں کو باہم ملانے کے لیے ہوتے ہیں۔ بعض راہیں زمین پر بنتی ہیں مگر ان کی منزلیں روح کے اندر اترتی ہیں۔ کچھ اسفار محض ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچنے کا نام نہیں ہوتے بلکہ وہ تاریخ، روحانیت، عقیدت اور نسبت کے ایسے دریچے کھول دیتے ہیں جہاں مسافت عبادت بن جاتی ہے اور حاضری، ایک داخلی مکاشفہ۔

یہ سفر بھی ایسا ہی تھا--- ممبئی سے رتن پور اور رتن پور سے کلاریا شریف تک--- مگر حقیقت میں یہ سفر جغرافیے سے زیادہ تاریخ کے باطن میں اترنے کا سفر تھا ایک ایسے آستانے کی حاضری کا سفر، جہاں گیارہویں صدی ہجری کی روحانی روشنی آج بھی خموشی سے فروزاں ہے، جہاں ایک صاحبِ کرامت مردِ حق کی سانسوں کی خوشبو اب تک فضا میں محسوس ہوتی ہے اور جہاں عقیدت مند کے قدم نہیں بلکہ ان کا دل حاضر ہوتا ہے۔ وہاں وقت اپنی رفتار بھول جاتا ہے اور صدیوں کا فاصلہ ایک لمحۂ حضوری میں سمٹ آتا ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس در کی فضا میں ماضی صرف یاد نہیں رہتا بلکہ ایک زندہ حقیقت بن کر سانس لیتا ہے جہاں ہر ذرّہ گویا کسی گزرے ہوئے نورانی عہد کی گواہی دیتا ہے اور ہر سکوت کے اندر ایک مسلسل ذکر کی صدا پوشیدہ ہے۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ محض ایک مکانی سفر نہیں بلکہ روح کی اپنی اصل کی طرف مراجعت ہے۔

اس آستانے کی مٹی میں بھی ایک عجیب سی طمانیت رچی بسی محسوس ہوتی ہے، جیسے یہاں ہر آمد پہلے سے لکھی ہوئی ہو اور ہر قدم کسی ازلی اذن کی پیروی کر رہا ہو۔ در و دیوار سے اٹھتی ہوئی خموشی بھی ایک زبان رکھتی ہے، جو دل کے نہاں خانوں میں اتر کر عقیدت کے چراغ روشن کر دیتی ہے۔

یہاں زائر خود کو محض دیکھنے والا نہیں پاتا بلکہ کسی پوشیدہ مکالمے کا حصہ محسوس کرتا ہے ایسا مکالمہ جو الفاظ کا محتاج نہیں، صرف احساس کی لطافتوں میں جاری رہتا ہے۔ یوں یہ حاضری ایک عام زیارت نہیں رہتی بلکہ ایک روحانی بیداری کا استعارہ بن جاتی ہے، جہاں دل اپنی ہی کسی گم گشتہ منزل سے دوبارہ ہم کلام ہو جاتا ہے۔

یہ سعادت مجھے حضرت مولانا مفتی محمد اشرف قادری، بانی و سربراہ جامعہ مدینۃ العلوم، گجرات کی رفاقت میں حاصل ہوئی اور سچ یہ ہے کہ اس سفر کی ایک منزل کلاریا شریف تھی مگر دوسری منزل خود مفتی اشرف قادری زید مجدہم کی رفاقت تھی، جو اپنی ذات میں اخلاص، للّٰہیت اور خدمتِ دین کا ایک روشن باب ہیں۔

ان کی ہم نشینی محض ایک سفر کا ساتھ نہ تھا بلکہ ایک فکری و روحانی استفادے کا ایسا دروازہ تھا جو قدم قدم پہ بصیرت کے نئے دریچے وا کرتا جاتا تھا۔ ان کی صحبت میں وقت کا احساس بھی بدل جاتا تھا اور گفتگو کے ہر لمحے میں دین کی محبت، اخلاص کی حرارت اور مقصدیت کی روشنی محسوس ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کی رفاقت محض اتفاقی نہیں بلکہ کسی تربیتی نظام کا حصہ ہو، جہاں ہر بات میں اصلاحِ نفس کا پہلو اور ہر انداز میں خدمتِ خلق کا پیغام پوشیدہ ہو۔ ان کی خموشی بھی معنیٰ خیز تھی اور ان کا کلام بھی دلوں کو بیدار کر دینے کی تاثیر رکھتا تھا۔

سفر کے اس مرحلے پر یہ احساس اور بھی گہرا ہو جاتا تھا کہ بعض ہستیاں راستے کی ہم سفر نہیں ہوتیں بلکہ خود راستہ دکھانے والی نشانیاں بن جاتی ہیں۔ مفتی صاحب کی ذات بھی اسی نوعیت کی ایک روشن علامت ہے، جن کی معیت میں دین کی سادگی، اخلاص کی گہرائی اور عمل کی پختگی ایک ساتھ جلوہ گر محسوس ہوتی ہے۔

یوں یہ رفاقت محض ایک ہم سفری نہیں رہی بلکہ ایک باطنی تربیت

گاہ بن گئی، جہاں دل خموشی سے سیکھتا رہا اور نگاہ بغیر کسی تکلف کے معنویت کے نئے افق دریافت کرتی رہی۔

کلاریا شریف: خاموشی میں بولتا ہوا ایک روحانی مرکز

گجرات کے نسبتاً گمنام خطے میں واقع کلاریا شریف بظاہر ایک سادہ بستی معلوم ہوتی ہے مگر روحانی تاریخ میں اس کی حیثیت ایک روشن استعارے کی ہے۔ یہ وہ خطہ ہے جہاں خاموش زمین کے سینے میں بھی ذکر کی صدائیں سانس لیتی محسوس ہوتی ہیں اور جہاں سادہ فضا کے پردے میں ایک گہرا روحانی وقار چھپا ہوا ہے۔ یہاں کی سادگی دراصل بے رنگی نہیں بلکہ نور کی وہ لطیف کیفیت ہے جو ظاہری جلووں کے بغیر بھی دلوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اس بستی کی فضاؤں میں ایک ایسی معنوی طمانیت رچی بسی محسوس ہوتی ہے جو آنے والے کو صرف منظر نہیں دکھاتی بلکہ ایک کیفیت عطا کرتی ہے۔

کلاریا شریف کی شناخت محض جغرافیے سے نہیں بلکہ ان نفوسِ قدسیہ سے ہے جن کی نسبت نے اسے زمانوں کی گردش میں بھی زندہ رکھا ہے۔ یہاں کی گلیوں میں گویا تاریخ نہیں چلتی بلکہ عقیدت کے نقوش چلتے ہیں اور یہاں کی خموشی بھی ایک مسلسل ذکر کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ بستی اپنے سکوت میں بھی بولتی ہے اور اپنی سادگی میں بھی ایک پورا روحانی جہان سموئے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلاریا شریف محض ایک مقام نہیں بلکہ روحانی نسبتوں کا ایک ایسا روشن حوالہ بن جاتا ہے جو دل و نگاہ پر دیرپا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے فیوض آج بھی جاری ہیں۔

شیراز، جو علم، عرفان اور تہذیب کا قدیم مرکز رہا--جہاں فکر نے حکمت کا جامہ پہنا، تصوف نے محبت کی زبان پائی اور تہذیب نے اپنے نفیس ترین آداب کی صورت اختیار کی۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں علم صرف درسگاہوں میں نہیں، فضا کی لطافت میں بھی محسوس ہوتا ہے، جہاں عرفان نے خانقاہوں میں آنکھیں کھولیں اور ادب نے دلوں میں چراغ جلائے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں دانش نے وقار پایا، روحانیت نے سکون اور حسنِ تہذیب نے دوام۔ جہاں ہر کوچہ گویا کسی حکیم کی بصیرت، کسی صوفی کی خلوت اور کسی شاعر کے سوز کا امین دکھائی دیتا ہے۔ شیراز، جہاں فکر نے پرواز سیکھی، محبت نے وقار پایا اور روحانی نسبتوں نے تاریخ کے صفحات کو نور بخشا۔ یہ صرف ایک شہر نہیں، تہذیبی شعور، علمی عظمت اور عرفانی روایت کا ایک زندہ استعارہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس سرزمین کی ہوا میں بھی حکمت گھلی ہوئی ہے، اس کے ذروں میں بھی تصوف کی خوشبو بسی ہے اور اس کے افق پر آج بھی علم و محبت کے وہی چراغ فروزاں ہیں جنہوں نے صدیوں کو روشن رکھا۔ اسی سرزمین سے نسبت رکھنے والی یہ عظیم ہستی گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں جلوہ گر ہوئی۔ ایک سو اسی برس کی طویل عمر، علم و معرفت کے بے شمار نقوش، کرامات کے تابندہ آثار اور پھر وہ حیرت انگیز وصیت نامہ، جس میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی مجددیت اور آئندہ زمانوں کے احوال کا ذکر---یہ سب کچھ اس شخصیت کو محض ایک بزرگ نہیں بلکہ ایک روحانی مظہر بنا دیتا ہے۔

ایسی شخصیت جس کے گرد زمانے کی گرد بھی عقیدت کے نور میں بدل جاتی ہے اور جس کے ذکر سے دل کے اندر ایک خموش بیداری سی پیدا ہونے لگتی ہے۔ ان کی نسبت صرف یاد نہیں رہتی بلکہ ایک مسلسل احساس بن کر فکر و نظر کے افق پر چھائی رہتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی ذات میں سادگی اور عظمت، خموشی اور تاثیر اور ظاہری گمنامی و باطنی تابانی ایک ساتھ سمٹ آئی ہو۔ وہ محض تاریخ کے ایک باب نہیں بلکہ تاریخ کے اندر جاری ایک معنوی تسلسل ہیں جو آنے والے دلوں کو بھی اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔

ان کا تذکرہ دل میں ایسی روشنی جگاتا ہے جو نہ صرف ماضی کو روشن کرتا ہے بلکہ حال کو بھی ایک نئی معنویت عطا کرتا ہے۔ یوں یہ احساس مزید گہرا ہو جاتا ہے کہ بعض ہستیاں صرف یاد نہیں کی جاتیں بلکہ محسوس کی جاتی ہیں اور ان کا وجود وقت کے صفحات پر نہیں بلکہ روح کے نہاں خانوں میں ثبت رہتا ہے۔

مدتوں سے دل میں ایک اضطراب تھا کہ کبھی اس آستانے پہ حاضری ہو، اس خاکِ آستاں کو آنکھوں سے لگایا جائے اور اس وصیت

نامے کے ان نقوش کی زیارت ہو جو گویا آنے والے عہد کی پیشانی پر لکھی ہوئی بشارت تھے۔ وہ نقوش محض الفاظ کی ترتیب نہ تھے بلکہ ایک خموش امانت تھی جو نسلوں کے دلوں میں اترنے کے لیے محفوظ کر دی گئی تھی۔ ان میں وصیت نہیں، بصیرت بولتی تھی اور تحریر نہیں، ایک باطنی اشارہ سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے ان سطور کے اندر زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ بھی سمٹ آئے ہوں اور مستقبل کے نقشے بھی اپنے خد و خال کے ساتھ جلوہ گر ہو گئے ہوں۔ ہر جملہ ایک چراغ کی مانند تھا جو صرف پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ راستہ دکھانے کے لیے روشن کیا گیا ہو۔ ان نقوش کی زیارت دراصل ایک عہد سے ملاقات تھی، ایسا عہد جو ماضی کی خموشی میں بھی حال کو مخاطب کرتا ہے اور حال کے سکوت میں بھی مستقبل کی آہٹیں سناتا ہے۔ گویا یہ وصیت نامہ محض ایک دستاویز نہیں، ایک زندہ پیغام تھا جو وقت کے پردے سے گذر کر دلوں کی زمین پر اترنے کے لیے بے قرار تھا۔ رمضان المبارک میں حضرت مولانا مفتی محمد اشرف قادری زید مجدہم کی معیت میں جب یہ حاضری نصیب ہوئی تو یوں لگا جیسے برسوں کی تشنگی کو چشمۂ وصال مل گیا ہو۔ دل کے اندر جو پیاس مدتوں سے کسی نا معلوم طلب کی صورت میں بے قرار تھی، وہ اس لمحۂ حضوری میں ایک عجیب سی طمانیت میں ڈھل گئی۔ فضا میں روزے کی نورانیت، سحر و افطار کی برکتیں اور ذکر و دعا کی لطافتیں گویا ایک ہی لڑی میں پروئی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ حاضری محض ایک سفر نہیں بلکہ ایک روحانی میثاق کی تجدید ہے، جہاں قدموں سے زیادہ دل چل رہا ہو اور نگاہوں سے زیادہ احساسات سفر کر رہے ہوں۔ ہر منظر میں ایک خموش تسبیح کی کیفیت تھی اور ہر لمحہ کسی اندرونی انکشاف کی صورت اختیار کیے ہوئے تھا۔

حضرت مولانا مفتی محمد اشرف قادری صاحب کی معیت یہ کیفیت اور بھی گہری کر رہی تھی، گویا وہ اس روحانی سفر میں صرف ہم سفر نہیں بلکہ رہبرِ احساس بھی ہوں، جن کی خموش موجودگی بھی دل کو سمت عطا کرتی تھی۔ اس مبارک مہینے میں یہ حاضری ایک عام زیارت سے بڑھ کر ایک باطنی بیداری کا ذریعہ بن گئی، جہاں وقت نے بھی اپنی رفتار نرم کر لی تھی اور دل کی بے قراری کو بھی سکون کی صورت حاصل ہو گئی تھی۔

ایک مخلص رفیقِ سفر: مفتی محمد اشرف قادری

اس سفر کا ایک روشن پہلو خود حضرت مولانا مفتی محمد اشرف قادری کی رفاقت تھی۔ بعض اشخاص اپنے منصب سے پہچانے جاتے ہیں اور بعض اپنی سیرت سے۔ مفتی اشرف قادری ان نفوس میں ہیں جن کی شناخت ان کے اخلاص سے بنتی ہے۔

گجرات میں اگر مسلکِ اعلیٰ حضرت کے بے لوث خادموں کا ذکر ہو تو ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے، کہ انہوں نے مسلکی خدمت کو ہمیشہ اخلاص، وقار اور خاموش استقامت کے ساتھ برتا ہے۔ وہ خدمت کو شہرت نہیں بناتے، نسبت کو سرمایہ جانتے ہیں اور عقیدت کو عمل کی صورت دیتے ہیں۔ ان کی زندگی مسلک کی ترجمانی بھی ہے اور اس کی پاسبانی بھی۔ ان کی شخصیت وابستگی کی محض علامت نہیں بلکہ اس نسبت کی زندہ تعبیر محسوس ہوتی ہے۔

وہ اُن اہلِ وفا میں ہیں جنہوں نے مسلکِ اعلیٰ حضرت کی خدمت کو صرف ایک علمی نسبت نہیں رہنے دیا بلکہ اسے محبت، عمل اور وفاداری کے ساتھ نبھایا ہے۔ ان کے ذکر کے ساتھ خلوص، دیانت اور حسنِ عقیدت کی ایک روشن فضا ذہن میں ابھرتی ہے۔ انہوں نے اپنے کردار اور خدمات سے ثابت کیا ہے کہ مسلک کی خدمت صرف تقریر و تحریر سے نہیں، اخلاصِ عمل سے بھی ہوتی ہے۔ ان کی جدو جہد میں خموشی ہے مگر تاثیر ایسی کہ دل احترام سے جھک جاتا ہے۔

وہ اس قافلۂ نسبت کے ان چراغوں میں ہیں جن کی روشنی نمود سے نہیں، خدمت سے پہچانی جاتی ہے اور جن کا وجود اہلِ سنّت کی علمی و روحانی روایت کا معتبر حوالہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ خدمت، عقیدت اور نسبت کے اس چراغ کے امین ہیں جسے اکابر نے روشن کیا تھا، ان کی ذات میں وابستگی بھی ہے، پاسبانی بھی اور مسلک سے وفاداری کی ایک خاموش مگر تابناک شان بھی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے مسلکِ حق کی شمع صرف روشن نہیں رکھی بلکہ اپنی خاموش جدو جہد سے اس کے گرد حفاظت کے حصار بھی قائم کیے ہیں۔

ان کا نام آتا ہے تو خدمت، اخلاص اور استقامت ایک ساتھ ذہن میں ابھرتے ہیں۔ وہ مسلکِ اعلیٰ حضرت کو محض ایک فکری

روایت کے طور پہ نہیں برتتے بلکہ اسے اپنی زندگی میں ایک بیدار اور تازہ دم نسبت کے طور پہ جلوہ گر رکھتے ہیں اور ان کا کردار اسی نسبت کا روشن چراغ بن کر سامنے آتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جن کی خاموش محنت شور نہیں مچاتی مگر اثرات کی صورت دیر پا صدائیں چھوڑ جاتی ہے۔ ان کی خدمات میں اخلاص کا وہ نور ہے جو نام سے زیادہ کام کو روشن کرتا ہے۔

اگر گجرات میں اہلِ عشق و نسبت کے چراغ گنے جائیں تو ان کا چراغ الگ پہچانا جائے گا کہ وہ ایک ہی وقت میں مسلک کے پاسبان بھی ہیں اور عقیدت کے ترجمان بھی۔ وہ دعوت و تبلیغ کو ذریعۂ معاش نہیں، امانت سمجھتے ہیں، دین کی خدمت ان کے نزدیک مشن ہے، مشغلہ نہیں۔ ان کی زندگی کے اوراق میں نمود و نمائش کی بجائے خاموش عمل کی روشنیاں بکھری ہوئی ہیں اور ان کے کردار میں گفتار سے زیادہ تاثیر کی گونج سنائی دیتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی وابستگی کسی وقتی جذبے کا نام نہیں بلکہ ایک گہری فکری و روحانی نسبت کا تسلسل ہے، جو ہر حال میں یکساں استقامت کے ساتھ قائم رہتی ہے۔ وہ اپنے کام میں اس وقار کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں کہ خدمتِ دین خود ان کے وجود سے پہچانی جاتی ہے، اور ان کی موجودگی ہی ایک پیغام بن جاتی ہے۔ ان کی شخصیت وابستگی کی محض علامت نہیں بلکہ اس نسبت کی زندہ تعبیر محسوس ہوتی ہے۔ وہ اُن اہلِ وفا میں ہیں جنھوں نے مسلکِ اعلیٰ حضرت کی خدمت کو صرف ایک علمی نسبت نہیں رہنے دیا بلکہ اسے عمل، محبت اور پاسبانی کی صورت دی۔ ان کے ذکر کے ساتھ خلوص، دیانت اور حسنِ عقیدت کی ایک روشن فضا ذہن میں ابھرتی ہے۔

ان کی شخصیت میں سادگی اور وقار کا ایسا حسین امتزاج پایا جاتا ہے جو دیکھنے والے کو متاثر کرنے سے پہلے سوچنے پہ مجبور کرتا ہے۔ وہ اس راہ کے مسافر ہیں جہاں مقصد محض انجام تک پہنچنا نہیں بلکہ راستے کو بھی عبادت بنا دینا ہے۔ اسی لیے ان کی خدمات کا دائرۂ کار الفاظ سے زیادہ احساسات میں نمایاں ہوتا ہے اور ان کی نسبت وقت کے ساتھ اور بھی معتبر ہوتی چلی جاتی ہے۔ کتنی بار دیکھا کہ کسی پروگرام میں گئے، کسی مدرسے کی ضرورت سامنے آئی، انتہائی خموش انداز میں اپنی جیب خاص سے مدد فرما دی۔ کتنے مستحقین کی پوشیدہ اعانت کرتے ہیں، کتنے چراغ بے آواز جلاتے ہیں--- گویا روشنی کو بھی اخلاص کا سلیقہ سکھا رہے ہوں۔ ان کے اسلوبِ خدمت میں نہ اعلان ہوتا ہے نہ تشہیر، نہ واویلا ہوتا ہے نہ اظہار بس ایک خموش مسکراتا ہوا عمل ہوتا ہے جو اپنے اندر پوری ایک دنیا اخلاص سموئے ہوتا ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی عطا بھی ان کے مزاج کی طرح ساکت ہے، جو شور کے بغیر اثر کرتی ہے اور نظر آئے بغیر دلوں میں اتر جاتی ہے۔ وہ مدد بھی عبادت بنا کر پیش کرتے ہیں اور احسان کو بھی وقار عطا کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ لینے والا بھی ان کے سامنے شرمندگی کی بجائے دعا کی کیفیت میں آ جاتا ہے۔ ان کی اس پوشیدہ سخاوت میں ایک عجیب سی روحانی لطافت ہے، جیسے وہ نیکی پردے میں رکھ کر اس کی قبولیت کو زیادہ خالص بنا دینا چاہتے ہوں۔ یہ وہ انداز ہے جس میں ہاتھ تو نظر آتا ہے مگر انا نہیں، عمل تو دکھائی دیتا ہے مگر تشہیر نہیں۔

یوں ان کی زندگی کے یہ خموش گوشے بتاتے ہیں کہ اصل عظمت اعلان میں نہیں، اخلاص میں ہے اور اصل روشنی دکھانے میں نہیں، جلانے میں ہے--- وہ بھی اس طرح کہ چراغ بھی جلیں اور ہوا کو خبر بھی نہ ہو جیسے نور اپنی تشہیر نہیں کرتا، صرف پھیلتا ہے۔ یہ ان کے رب اور ان کے دل کے درمیان کا معاملہ ہے۔ ان کے یہاں "نہیں" گویا لغت ہی میں نہیں۔ رمضان المبارک کے ایام میں بھی دن بھر پروگرام، درس، اصلاح، ملاقاتیں--- اور اس کے باوجود ہر ملنے والے کے لیے کشادہ پیشانی۔ یہ صرف مصروفیات کے درمیان تحمل نہیں بلکہ اخلاص، ظرف اور حسنِ اخلاق کی وہ روشن مثال ہے جہاں خدمت عبادت بن جاتی ہے اور ملاقات بھی تربیت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

ایسے لوگ روایتوں کو زندہ رکھتے ہیں کہ وہ صرف اقدار کے داعی نہیں ہوتے، خود ان اقدار کی چلتی پھرتی تعبیر ہوتے ہیں۔ ان کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ روایتیں کتابوں سے نہیں، کردار سے باقی رہتی ہیں۔ وہ ان لوگوں میں ہوتے ہیں جو تھکن کو ذمہ داری پر غالب نہیں آنے دیتے اور مشغولیت کو مروّت کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیتے۔ ان کے یہاں مصروفیت کے باوجود کشادگیِ دل، گویا اخلاص کا

ایک خاموش چراغ بن کر جلتی رہتی ہے۔ ایسے لوگ محض افراد نہیں ہوتے، ایک تہذیبی امانت ہوتے ہیں ان کی نشستوں میں تربیت، ان کی گفتگو میں شفقت اور ان کی مسکراہٹ میں دل جوئی کی ایک روایت سانس لیتی ہے۔ ایسے لوگ روایتوں کو زندہ رکھتے ہیں، جیسے شمع روشن ہوتی ہے اور ہوا کو خبر بھی نہیں ہوتی خاموشی سے مگر مسلسل۔ ان کے وجود سے معلوم ہوتا ہے کہ خدمت جب اخلاص سے جڑ جائے تو معمولات بھی عبادت بن جاتے ہیں۔

ان ساری خوبیوں اور کمالات کے باوجود ان کا نام بعض افراد کے نزدیک وفاداروں کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔ وہ انھیں مسلک اعلیٰ حضرت کی ڈگر سے بھٹکا ہوا ایک راہی سمجھتے ہیں۔ جبکہ ان کے پاس اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل نہیں ہے، حالات دن بدن عجیب سے عجیب تر بنتے جا رہے ہیں۔ بریلی شریف کی لاٹھی سے اس کے وفاداروں کو خوف زدہ کرنا بعض لوگوں نے اپنی عادت بنالی ہے۔ وہ مسرور ہیں کہ اب ہمارے حضور ہر بلند گردن کو خم ہونا پڑے گا۔ وہ اپنا زمینی دائرہ بڑھانے کے لیے بریلی شریف کی زمینوں پہ نقب زنی کر رہے ہیں۔ ان کا یہ عمل انتہائی تشویشناک ہے۔ اگر اس ذہنیت کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکا نہ گیا تو حالات دن بدن بد سے بدتر ہوتے جائیں گے۔ بریلی شریف ہمیشہ سے خودمختار رہا ہے۔ اسے کسی بیساکھی کی کبھی ضرورت نہیں پڑی اور ان شاء اللہ آئندہ بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سب ان سے جلنے والوں کے گل ہو گئے چراغ۔ یہ مبنی برصداقت نعرہ ہمیشہ فضاؤں میں شور مچاتا رہے گا۔ یہ نعرہ جب فضاؤں میں گونجتا ہے تو اہلِ عقیدت کی دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں اور معاندین کی بزم میں مردنی چھا جاتی ہے۔ حاشیہ حالات کو خوفناک بنا رہا ہے۔ اس پہلو پہ بھی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

آستانۂ شیرازی: جہاں سادگی عبادت بن گئی

کلاریا شریف پہنچ کر جو پہلی چیز دل میں اتری، وہ حیرت تھی۔

ایک ایسے عظیم صاحبِ کرامت بزرگ کا آستانہ۔۔ مگر دنیاوی جاہ و حشم سے بے نیاز۔ وہی دری، وہی چٹائی، وہی خانقاہی سادگی۔ نہ تزئین و آرائش کا تکلف، نہ ظاہری شان و شوکت کا ہجوم مگر اس سادگی کے پردے میں ایک ایسی روحانی ہیبت اور باطنی وقار چھپا ہوا ہے جو بڑے بڑے ایوانوں پر بھی بھاری محسوس ہوتا ہے۔

یوں لگتا ہے کہ یہاں ظاہری بے سروسامانی دراصل باطنی استغناء کی علامت ہے اور یہ فقر اپنی حقیقت میں درویشی نہیں بلکہ سلطانی کی ایک اور صورت ہے۔ اس آستانے کی خموش فضا میں ایک ایسی کشش ہے جو دل کو بلا تکلف اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، جیسے ہر آنے والا پہلے سے اسی نسبت کا متلاشی ہو۔ یہاں نہ تکلف کی گونج ہے نہ رسم و رواج کا ہجوم مگر ذکر کی لطافت، دعا کی تاثیر اور سکوت کی معنویت ہر گوشے میں محسوس ہوتی ہے۔ اس سادہ سی فضا میں وقت بھی جیسے اپنی رفتار بھول جاتا ہے اور دل اپنی دنیا سے نکل کر کسی اور ہی جہان کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سادگی، عظمت میں ڈھل جاتی ہے اور بے نیازی، روحانیت کا سب سے روشن عنوان بن جاتی ہے۔ وہاں کے موجودہ صاحب سجادہ کی زیارت ہوئی تو ایسا محسوس ہوا کہ وقت نے یہاں صدیوں کو محفوظ رکھا ہوا ہے۔ جیسے روایت نے اپنی تمام تازگی کے ساتھ ایک زندہ صورت اختیار کر لی ہو اور ماضی کسی یاد کے طور پر نہیں بلکہ ایک متحرک حقیقت کے طور پر سامنے کھڑا ہو۔ یوں لگا جیسے اس آستانے کی قدیم روحانیت آج بھی انہی آنکھوں کی روشنی، انہی لہجوں کی نرمی اور انہی آداب کی متانت میں سانس لے رہی ہو۔ ان کی زیارت میں محض ایک شخصیت سے ملاقات نہ تھی، ایک تسلسل سے روبرو ئی تھی۔

ایسا محسوس ہوا جیسے سجادہ نشینی یہاں منصب نہیں، امانت ہے اور یہ امانت نسلوں سے نور کی طرح منتقل ہو رہی ہے۔ ان کے وقار میں روایت کا جلال تھا اور ان کی شفقت میں خانقاہی اخلاق کی دیرینہ خوشبو۔ زمینی مزاج نے دل کو ان کے قدموں میں بچھنے پر مجبور کر دیا، ان کے سر پہ نسبت کی دستار چمک رہی تھی اور اس سے جو کرن پھوٹ رہی تھی اس سے ہمارے دل کے آفاق روشن ہو رہے تھے۔ نام نہاد خانقاہوں نے عموماً جو اپنا ہالہ بنا رکھا ہے یہاں آ کر وہ ہالے مشکوک نظر آنے لگے، یہاں سانسوں سے ایک عجیب و غریب خوشبو پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئی، ایک ایسی خوشبو جس سے ماضی کی لطافتوں کا شعور جھلکتا تھا۔

وہ منظر یوں تھا گویا وقت نے اپنے منتشر اوراق سمیٹ کر اس در پر محفوظ کر دیے ہوں جہاں صدیوں کا فاصلہ سمٹ جاتا ہے اور ماضی حال کے ساتھ ہم کلام دکھائی دیتا ہے۔

ایسا محسوس ہوا جیسے یہاں نسبتیں صرف محفوظ نہیں رہیں، زندہ بھی ہیں جیسے اکابر کی سانسوں کی خوشبو اب تک فضا میں باقی ہو اور ہر نظر میں ایک خموش دعا، ہر نشست میں ایک روحانی تسلسل جھلکتا ہو۔

آج کے مادی دور کی چکا چوند سے بے تعلق، مزاج میں وہی دنیا بیزاری، وہی تواضع، وہی انکسار جو کبھی ہمارے اسلاف کی شناخت ہوا کرتی تھی۔ ان کے چہرے کی سادگی اور گفتگو کی نرمی میں ایک ایسی روحانی تہذیب جھلکتی تھی جو دل کو بے اختیار قدیم ادوار کی طرف لے جاتی ہے، جیسے زمانہ اپنی رفتار بدل کر کسی اور ہی آہنگ میں سانس لینے لگا ہو۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ صرف ایک فرد کی زیارت نہیں بلکہ ایک مکمل تاریخی تسلسل کی ملاقات ہے وہ تسلسل جو نسل در نسل منتقل ہوتا ہوا آج بھی اپنی اصل شان اور پہچان کے ساتھ قائم ہے۔ ان کے انداز میں نہ تکلف تھا نہ بناوٹ مگر ہر لفظ میں ایک وزن اور ہر خموشی میں ایک پیغام پوشیدہ تھا۔

اس ملاقات میں یہ احساس اور بھی گہرا ہو گیا کہ بعض شخصیات اپنے زمانے کی پیداوار نہیں ہوتیں بلکہ زمانے کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں۔ وہ حال میں رہتے ہوئے بھی ماضی کی امانت معلوم ہوتے ہیں اور ان کی موجودگی خود ایک دلیل بن جاتی ہے کہ روحانی وراثت ابھی مکمل طور پر منقطع نہیں ہوئی۔

یوں یہ زیارت محض ایک رسمی ملاقات نہ رہی بلکہ ایک فکری و روحانی تجربہ بن گئی، جہاں دل نے سادگی میں عظمت کا تعارف حاصل کیا اور نگاہ نے انکسار میں وقار دیکھا۔

حتیٰ کہ مسجدوں میں بھی وہ ظاہری تزئین و آرائش نہیں جو آج کی شناخت بن چکی ہے، بلکہ ایک خموش وقار، ایک فقیرانہ جلال۔ وہاں دیواریں رنگ و روغن سے نہیں، ذکر و سجود کی تکرار سے منور محسوس ہوتی ہیں اور فضا کسی ظاہری نقش و نگار کے بغیر بھی ایک داخلی نور سے معمور دکھائی دیتی ہے۔

یوں لگتا ہے جیسے ان مساجد کی اصل زیب و زینت محراب و منبر نہیں بلکہ سجدہ ریز پیشانیاں ہیں اور ان کی اصل آرائش قالین و چراغاں نہیں بلکہ آنسوؤں کی وہ لڑیاں ہیں جو خموشی سے زمین پر گرتی اور دلوں میں اثر چھوڑ جاتی ہیں۔

اس سادگی کے اندر ایک عجیب سا جلال چھپا ہوا ہے، جو شور و شکوہ سے نہیں بلکہ سکوت و وقار سے جنم لیتا ہے۔ وہاں داخل ہونے والا شخص خود کو کسی عمارت میں نہیں بلکہ عبادت کے ایک زندہ تصور میں داخل محسوس کرتا ہے، جہاں ہر گوشہ گویا ایک مسلسل دعا کی کیفیت میں سانس لے رہا ہو۔

یہی وہ فضا ہے جو بتاتی ہے کہ اصل عظمت ظاہری نقش و نگار میں نہیں بلکہ اس روحانی کیفیت میں ہے جو دلوں کو جھکا دے اور نگاہوں کو ادب سے بھر دے۔ خانقاہ کی زیارت کے بعد یوں لگا جیسے خانقاہ صرف عمارت نہیں، ایک طرزِ حیات ہے۔ ایسی طرزِ حیات جس میں سادگی، استغناء اور توکل کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہو اور جہاں زندگی کے معنیٰ ظاہری اسباب سے نہیں بلکہ باطنی نسبت سے متعین ہوتے ہوں۔ وہاں ہر گوشہ گویا ایک درس گاہ تھا اور ہر سکوت اپنے اندر ایک حکمت سموئے ہوئے تھا۔

یوں محسوس ہوا کہ خانقاہ دراصل دلوں کی تعمیر کا نام ہے، جہاں پتھر اور اینٹوں سے زیادہ انسان کا باطن سنوارا جاتا ہے۔ یہاں وقت بھی ایک مختلف انداز میں رواں تھا نہ عجلت کی بے قراری، نہ دنیا کی دوڑ بلکہ ایک ٹھہرا ہوا سا سکون جو انسان کو اپنے اندر جھانکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس ماحول میں یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ خانقاہیں صرف عبادت کی جگہیں نہیں ہوتیں بلکہ کردار سازی کے وہ مراکز ہوتی ہیں جہاں انسان اپنی انا چھوڑ کر عبدیت کی طرف لوٹتا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جو اس زیارت کے بعد دل میں باقی رہ جاتی ہے کہ خانقاہ دراصل پتھروں کی نہیں، حال اور مزاج کی تعمیر کا نام ہے۔

وہ وصیت نامہ: ایک روحانی پیش گوئی

شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

سے میرا شغف محض ان کی کرامات کے باعث نہ تھا بلکہ خاص طور پر اس وصیت نامے کے سبب تھا جس میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی ولادت سے تقریباً ایک سوستر برس پہلے ان کے ظہور اور مجددانہ کردار کا ذکر موجود ہے۔ یہی وہ نکتہ تھا جس نے میری عقیدت کو جستجو میں اور جستجو کو ایک گہری فکری وابستگی میں بدل دیا۔

یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ وصیت نامہ کسی ایک دور کی بات نہیں بلکہ تاریخ کے پردے میں چھپی ہوئی ایک طویل بشارت ہے، جو وقت کے مختلف مرحلوں سے گذرتی ہوئی اپنی تعبیر کی طرف بڑھ رہی ہو۔ اس میں صرف پیش گوئی نہیں، ایک روحانی تسلسل کا اشارہ تھا، جس نے ماضی کو مستقبل سے جوڑ کر ایک حیرت انگیز فکری وحدت قائم کر دی تھی۔ اس نسبت نے میرے مطالعے اور احساسات دونوں کو ایک نئی جہت عطا کی، جہاں شخصیت محض کرامت کے دائرے میں محدود نہیں رہتی بلکہ ایک فکری علامت بن جاتی ہے۔ یوں یہ وصیت نامہ میرے لیے صرف ایک تاریخی حوالہ نہ رہا بلکہ ایک ایسے روحانی افق کا روشن دان بن گیا جس سے جھانک کر زمانے کی تہوں میں پوشیدہ معنویت محسوس کی جاسکتی ہے۔ یہ صرف پیش گوئی نہیں، تاریخ کے پردے میں ایک روحانی اشارہ ہے۔

ایسا اشارہ جو واقعات کے ظاہری تسلسل سے بلند ہو کر زمانے کے اندرون میں اترتا ہے اور صدیوں کا فاصلہ ایک باطنی ربط میں سمیٹ دیتا ہے۔ اس میں محض الفاظ کی ترتیب نہیں بلکہ تقدیر کی وہ خموش جنبش محسوس ہوتی ہے جو وقت کے تسلسل کو ایک خاص سمت عطا کرتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ اشارہ ماضی کی گہرائیوں سے ابھرا ہو اور مستقبل کی وسعتوں میں اپنی معنویت بکھیر رہا ہو۔ اس کے اندر ایک ایسی معنوی لطافت پوشیدہ ہے جو قاری کو محض دیکھنے پر نہیں بلکہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ گویا تاریخ خود اپنے اندر چھپے ہوئے راز آہستہ آہستہ ظاہر کر رہی ہو اور ہر پردہ ایک نئے انکشاف کی تمہید بن رہا ہو۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پیش گوئی روایت نہیں رہتی بلکہ بصیرت بن جاتی ہے اور اشارہ محض خبر نہیں رہتا بلکہ ایک فکری و روحانی رہنمائی کا عنوان اختیار کر لیتا ہے۔

گجراتی زبان میں اس کی پی ڈی ایف حاصل ہوئی، مواد ملا، مگر فارسی اصل کی جستجو باقی رہی۔ حضور صاحب سجادہ کی فراہم کردہ معلومات سے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اس وصیت نامے کی اصل کاپی، حضرت سید شاہ آل رسول حسنین میاں نظمی مارہروی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی فرمائش پر، ان کے ایک نمائندے کے ذریعے ان کی خدمتِ عالیہ میں روانہ کی گئی تھی اور باحسن تمام اُن تک پہنچ بھی گئی تھی۔

یہ خبر خود اپنے اندر ایک خاموش رمز رکھتی ہے، گویا اس نادر دستاویز نے ایک اور نسبت کا در وا کیا ہو۔ یہ معلوم نہیں حضور والا نے اسے کس عظیم مقصد کے تحت طلب فرمایا تھا مگر ایک صاحب علم و نظر کی اس التفات میں یقیناً کوئی معمولی داعیہ کارفرما نہ تھا۔ گمان غالب یہی ہے کہ ان کے پیش نظر کوئی بڑا علمی، فکری یا تجدیدی منصوبہ رہا ہوگا، جس کے لیے یہ تاریخی وصیت نامہ حاصل فرمایا گیا۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ محض ایک دستاویز کی طلب نہ تھی بلکہ تاریخ کے ایک خموش چراغ کو پھر سے فروزاں کرنے کی تمہید تھی۔ ایک ایسی امانت، جس کے پسِ منظر میں صدیوں کی بشارتیں، روحانی نسبتیں اور علمی اشارات پوشیدہ تھے۔

مگر شاید گردشِ ایام نے انہیں مہلت نہ دی، یا وقت نے اس خواب کی تکمیل کا موقع فراہم نہ کیا چنانچہ وہ اصل وصیت نامہ، جس میں رضویات کے ایک نئے باب کے امکانات مضمر تھے، اہلِ نظر اور قدردانوں کے سامنے اس طرح جلوہ گر نہ ہو سکا جس کا وہ مستحق تھا۔

یوں لگتا ہے جیسے ایک عظیم علمی امکان وقت کے پردوں میں کہیں ٹھہر گیا اور ایک ایسا چراغ، جو رضویات کے افق پر نئی روشنی بکھیر سکتا تھا، پوری طرح جلوہ گر ہونے سے پہلے ہی خموش رہ گیا۔

مگر شاید بعض امانتیں اپنے ظہور کے لیے ایک خاص ساعت کی منتظر ہوتی ہیں اور بعض دستاویزات وقت کے صندوق میں اسی لیے محفوظ رکھی جاتی ہیں کہ جب وہ سامنے آئیں تو تاریخ کا کوئی نیا دریچہ وا کریں۔ شاید یہ وصیت نامہ بھی انہی امانتوں میں سے ایک تھا۔

اس ضمن میں حضرت سید شاہ آل رسول حسنین میاں نظمی برکاتی مارہروی رحمۃ اللہ سے ملاقاتوں میں جو گفتگو ہوئی، وہ آج بھی مجھے یاد

ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ اصل فارسی نسخہ ان کے پاس محفوظ ہے۔

افسوس، بارہا ملاقاتوں کے باوجود اس کی زیارت نہ ہو سکی۔ کبھی کبھی تاریخ اپنے کچھ راز اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس وصیت نامے نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی مجددیت کو ایک اور زاویے سے سمجھنے کا باب کھولا ہے۔ ایسا زاویہ جو محض تاریخی مطالعے تک محدود نہیں رہتا بلکہ فکر و بصیرت کے نئے دریچے وا کرتا ہے، جہاں شخصیت کے ظاہری کارناموں کے ساتھ ساتھ اس کے روحانی تسلسل کی پرتیں بھی سامنے آنے لگتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس وصیت نامے نے وقت کے بکھرے ہوئے اشاروں کو ایک مربوط معنویت میں سمیٹ دیا ہو اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی علمی و روحانی عظمت کو ایک وسیع تر تناظر میں دیکھنے کی دعوت دی ہو۔ اس سے مجددیت کا تصور محض ایک عنوان نہیں رہتا بلکہ ایک مسلسل فیضان کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو مختلف ادوار میں اپنے اثرات ظاہر کرتا رہتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں تاریخی فہم و فراست بھی گہری ہو جاتی ہے اور شخصیت کا ادراک بھی وسیع تر ہو جاتا ہے اور قاری اس احساس سے گزرتا ہے کہ بعض حقیقتیں صرف بیان نہیں ہوتیں بلکہ نئے فکری آفاق کو جنم دیتی ہیں۔

اعلیٰ حضرت اور شیرازی نسبت

یہ محض اتفاق نہیں لگتا کہ شیراز کے ایک صاحبِ کشف بزرگ کے قلم سے آنے والے زمانے کے اس مجدد کا ذکر ہو، جو بعد میں برصغیر میں علم و عرفان، فقہ و تجدید اور عشقِ رسالت کا مرکز بنے۔

یہ واقعہ بظاہر تاریخ کے چند بکھرے ہوئے اشارے معلوم ہوتے ہیں مگر غور سے دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وقت کے پس پردہ ایک باقاعدہ روحانی منصوبہ کارفرما تھا، جو مختلف صدیوں کو ایک ہی تسلسل میں پرو رہا تھا۔

یوں لگتا ہے جیسے اہلِ بصیرت کے قلم محض تحریر رقم نہیں کرتے بلکہ آنے والے زمانوں کی سمت بھی متعین کر دیتے ہیں اور ان کے اشارے تاریخ کے صفحات پر نہیں بلکہ تقدیر کے افق پر ثبت ہوتے ہیں۔ اس نسبت میں ایک ایسی معنوی ہم آہنگی محسوس ہوتی ہے جو محض عقیدت کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک گہری روحانی قرابت کا اظہار ہے۔

یہ منظرنامہ دیکھ کر یہ احساس اور بھی پختہ ہو جاتا ہے کہ بعض شخصیات اور بعض اشارے وقت کی قید میں نہیں ہوتے بلکہ وقت خود ان کے گرد طواف کرتا ہے۔ یوں یہ ذکر محض ایک تاریخی حوالہ نہیں رہتا بلکہ ایک ایسے روحانی ربط کی نشاندہی بن جاتا ہے جو صدیوں کے فاصلے کو ایک وحدت میں سمیٹ دیتا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات محض ایک فقیہ یا محدث کی نہیں، ایک تہذیبی مظہر کی ہے۔ ایسی تہذیب جس میں علم و عمل، عشق و عرفان اور فقہ و ذوقِ جمال سب ایک ہی مرکز پر مجتمع ہو جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت محض کتابی حوالوں میں محدود نہیں رہتی بلکہ ایک پورے فکری و روحانی مزاج کی تشکیل کرتی ہے، جو اپنے زمانے سے آگے بڑھ کر آنے والے ادوار تک اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا وجود صرف علمی خدمات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل فکری روایت ہے، جو دین کی تعبیر کو محبت، ادب اور احتیاط کے ساتھ ایک نئی وسعت عطا کرتی ہے۔ ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ محض استدلال نہیں بلکہ ایک باطنی یقین کی گواہی دیتا ہے اور ان کی ہر بحث میں علم کے ساتھ ساتھ خشیت کی جھلک بھی نمایاں رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذات کو دیکھ کر یہ احساس پختہ ہو جاتا ہے کہ بعض ہستیاں صرف اپنے عہد کی نمائندہ نہیں ہوتیں بلکہ ایک پوری تہذیبی فضا کو جنم دیتی ہیں، جو صدیوں تک اپنے اثرات قائم رکھتی ہے اور جب شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی جیسے صاحب کشف و کرامات بزرگ کی بصیرت میں اس نور کے آثار قبل از وقت جلوہ گر نظر آئیں، تو محسوس ہوتا ہے کہ اولیاء کی نگاہیں زمانے کی سطح پر نہیں، تقدیر کے باطن میں دیکھتی ہیں۔

سفر یا زیارت؟

واپسی کے وقت بار بار یہ احساس ہوتا رہا کہ ہم ایک مقام سے واپس نہیں لوٹ رہے، ایک کیفیت سے نکل رہے ہیں۔ ممبئی سے رتن پور، رتن پور سے کلاریا شریف، یہ راستہ اب محض سڑکوں کا نقشہ نہیں رہا،

یہ دل کے اندر ایک روحانی گذرگاہ بن چکا تھا۔ اس سفر نے یہ بھی بتایا کہ خانقاہیں صرف ماضی کی یادگاریں نہیں، زندہ روایتیں ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد اشرف قادری جیسے رجال، صاحبِ سجادہ جیسے درویش اور سید محمد صالح شاہ شیرازی جیسے اولیاء، یہ سب مل کر اس روحانی تسلسل کو قائم رکھتے ہیں جس سے ملت کی باطنی زندگی وابستہ ہے۔ بعض آستانے صرف زیارت گاہ نہیں ہوتے، وہ سوالوں کے جواب ہوتے ہیں۔

کلاریا شریف میرے لیے ایسا ہی مقام ثابت ہوا۔

وہاں جا کر محسوس ہوا کہ تاریخ کبھی مرتی نہیں، وہ خموش خانقاہوں میں سانس لیتی رہتی ہے، کہ اولیا کرام کے نقوش وقت کی گرد سے مٹتے نہیں کہ سادگی کبھی کبھی عظمت کا سب سے بڑا لباس ہوتی ہے اور یہ بھی کہ بعض سفر واپس نہیں آتے، انسان ان سے بدل کر لوٹتا ہے۔

یہ سفر دراصل ممبئی سے کلاریا شریف تک نہیں تھا-- یہ دل سے نسبت تک، جستجو سے حضور تک اور تاریخ سے روحانیت تک کا سفر تھا۔

یوں یہ سفر اپنے ظاہری اختتام کو پہنچا مگر باطن میں ایک نئی ابتدا رقم کر گیا۔ بعض حاضریاں واپس نہیں ہوتیں، وہ انسان کے اندر مستقل قیام اختیار کر لیتی ہیں۔ کلاریا شریف سے واپسی پر یہی محسوس ہوا کہ ہم ایک آستانے سے لوٹے نہیں بلکہ اپنے ساتھ ایک روحانی امانت لے کر پلٹے ہیں ایسی امانت جس میں تاریخ کی خوشبو بھی ہے، نسبت کی حرارت بھی اور عقیدت کی نمی بھی۔

شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مزار پہ حاضری نے یہ احساس اور گہرا کیا کہ اولیاء اللہ کی خانقاہیں صرف ماضی کی یادگار نہیں، زندہ فیضان کے مراکز ہیں۔ وہاں صدیوں پہلے لکھی گئی ایک وصیت، آج بھی دلوں میں یقین جگاتی ہے وہاں سادگی کا ایک منظر، دنیا کی تمام ظاہری چمک دمک پر سوالیہ نشان بن کر ابھرتا ہے اور وہاں خموشی بھی گویا ذکر میں مشغول محسوس ہوتی ہے۔

اس سفر نے حضرت مولانا مفتی محمد اشرف قادری کی رفاقت کے توسط سے یہ بھی باور کرایا کہ اخلاص جب عمل کے ساتھ جمع ہو جائے تو وہ خود ایک چلتی پھرتی خانقاہ بن جاتا ہے۔ کچھ لوگ راستے دکھاتے ہیں اور کچھ خود راستہ بن جاتے ہیں ایسے نفوس کی معیت بھی ایک نعمت ہے اور ان کی رفاقت بھی ایک روحانی تربیت۔

کلاریا شریف کی اس حاضری نے یوں محسوس کرایا جیسے شیراز کی علمی روشنی، بریلی کی مجددانہ تجدید اور گجرات کی موجودہ روحانی روایت، تینوں ایک نقطۂ نور پر مجتمع ہو گئی ہوں۔ ایک طرف حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کشف وبصیرت، دوسری طرف اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ کی مجددانہ عظمت اور تیسری طرف اس فیضان کے امین موجودہ اہلِ خانقاہ-- یہ سب مل کر ایک ایسا روحانی تسلسل بناتے ہیں جو زمانوں کو آپس میں مربوط کر دیتا ہے۔ اب جب اس خوبصورت سفر کے یادگاری لمحات دل ودماغ میں بسیرا کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے یہ ایک سفرنامہ نہیں، نسبتوں کی بازیافت ہے ایک حاضری نہیں، ایک مکاشفہ ہے۔

بعض سفر ختم نہیں ہوتے، دل میں قیام کرتے ہیں۔ اور بعض آستانے چھوڑے نہیں جاتے، انسان کے اندر آباد ہو جاتے ہیں۔ کلاریا شریف میرے لیے اب ایک مقام نہیں، ایک کیفیت ہے۔ ایسی کیفیت جو وقت کے ساتھ کم نہیں ہوتی بلکہ اور گہری ہو کر احساس کی تہوں میں اترتی چلی جاتی ہے، جیسے کوئی خموش نور اندر ہی اندر پھیلتا جائے اور پورے وجود کو اپنے حصار میں لے لے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہاں کی فضا اب بھی میرے ساتھ چلتی ہے، وہاں کی خموشیاں اب بھی میرے اندر بولتی ہیں اور وہاں کی روحانی نسبتیں اب بھی میرے احساسات کی سمت متعین کرتی ہیں۔ یہ محض یاد نہیں رہی بلکہ ایک زندہ تجربہ بن گئی ہے، جو ہر نئی کیفیت میں اپنا رنگ بدل کر مگر اپنی اصل روح کے ساتھ باقی رہتا ہے۔

کلاریا شریف اب میرے لیے کسی جغرافیے کا نام نہیں بلکہ ایک باطنی منظرنامہ ہے، جہاں سادگی بھی معنویت رکھتی ہے اور خموشی بھی گفتگو بن جاتی ہے۔ یوں یہ مقام میرے باہر نہیں رہا، میرے اندر ایک مسلسل موجودگی اختیار کر چکا ہے، جو نہ وقت کی گرفت میں آتا ہے نہ فاصلے کی حدوں میں سمٹتا ہے۔

□□□□

مفتی محمد اشرف قادری
بانی وسربراہ جامعہ مدینۃ الاسلام، رتن پور، کھیڑا، گجرات

ضوئیات

چراغوں کے درمیان ایک روشنی اور بھی

گیارہویں صدی ہجری (۱۰۰۰ھ تا ۱۰۹۹ھ/ تقریباً ۱۵۹۱ء تا ۱۶۸۸ء) تاریخِ عالم میں ایک ایسے عہد کی نمائندگی کرتی ہے جہاں گذشتہ صدی کے قائم کردہ سیاسی وفکری سانچے مزید پختہ ہوئے مگر ساتھ ہی اندرونی کمزوریاں بھی نمایاں ہونے لگیں۔ یہ زمانہ ایک طرف مذہبی تجدید، تصوف کی تطہیر اور فکری استحکام کا آئینہ دار ہے، تو دوسری جانب عالمی سیاست میں طاقت کے توازن کی تبدیلی اور یورپی اثرات کے بڑھتے ہوئے دائرے کا بھی شاہد ہے۔

اس صدی کی سب سے نمایاں خصوصیت تجدیدِ دین اور اصلاحِ باطن کی تحریکات ہیں، جنھوں نے اسلامی افکار ونظریات کو ایک نئے اعتدال اور توازن کی طرف مائل کیا۔

گیارہویں صدی ہجری کے ابتدائی ایام میں برصغیر کا مذہبی و فکری منظرنامہ ایک غیر معمولی اضطراب سے گذر رہا تھا۔ بظاہر سلطنتِ مغلیہ اپنی شان وشوکت کے عروج پر تھی مگر باطن میں مسلم معاشرہ ایک ایسی فکری کشمکش کا شکار تھا جس میں عقیدے کی سرحدیں دھندلانے لگی تھیں۔ دربارِ اکبری میں "صلحِ کل" کے نام پر ایک ایسا ماحول پروان چڑھ رہا تھا جہاں دین کی قطعی قدریں تدریجاً نسبی تعبیرات میں بدلتی جا رہی تھیں۔ مختلف مذاہب کے افکار اس انداز میں خلط ملط کیے جا رہے تھے کہ حق وباطل کے درمیان امتیاز کمزور پڑنے لگا۔

دینِ الٰہی محض ایک سیاسی تجربہ نہ تھا بلکہ اس کے پس منظر میں وہ ذہن کارفرما تھا جو وحی کی حاکمیت کو انسانی عقل کے تابع دیکھنا چاہتا تھا۔ سجدۂ تعظیمی، شعائرِ اسلام سے سرد مہری، اسلامی شناخت کی تدریجی تحلیل، علما کی تحقیر اور شریعت کے مقابل "رواداری" کے ایک مبہم تصور کی ترویج نے مسلم معاشرے کے روحانی اعتماد کو متزلزل کرنا شروع کر دیا تھا۔ خانقاہوں میں بھی بعض مقامات پر تصوف اپنی اصل روح کھو کر محض وجدانی کیفیتوں اور غیر محتاط تعبیرات کا شکار ہونے لگا تھا۔ وحدت الوجود کے بعض سطحی فہم نے عوام کے اذہان میں شریعت اور طریقت کے تعلق کو دھندلا دیا تھا۔

ایسے نازک دور میں برصغیر میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (1563ء/ 1624ء) ایک ایسے مردِ مومن کی حیثیت سے ابھرے جنھوں نے زوال کی دھند میں حقائقِ دین کی شمع دوبارہ روشن کی۔ ان کی تجدید محض فقہی مباحث کی اصلاح نہ تھی بلکہ امت کے فکری، روحانی اور تہذیبی وجود کی ازسرِ نو حفاظت کا ایک ہمہ گیر عمل تھا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اگر اس وقت اسلامی عقیدے اور تشخص کی حفاظت نہ کی گئی تو مسلم معاشرہ رفتہ رفتہ ایک ایسی فکری بے سمتی کا شکار ہو جائے گا جہاں اسلام اپنی امتیازی روح کھو بیٹھے گا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے تصوف کو دوبارہ شریعت کے تابع کر کے پیش کیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ کشف وحال، وجد وذوق اور روحانی واردات اس وقت تک معتبر نہیں ہوتے جب تک وہ سنّتِ مصطفی ﷺ کی میزان پر پورے نہ اتریں۔ انہوں نے طریقت اور شریعت کے درمیان پیدا ہونے والی مصنوعی دوری ختم کی اور یہ حقیقت آشکار کی کہ اسلام میں باطن کی تمام ترفعتیں ظاہرِ شریعت کی اطاعت ہی سے جنم لیتی ہیں۔

انہوں نے وحدت الوجود کی ان تعبیرات پر علمی گرفت کی جن سے خالق ومخلوق کے امتیاز میں ابہام پیدا ہوتا تھا۔ اس کے مقابل انہوں نے ''وحدت الشہود'' کی تعبیر نمایاں کی تاکہ توحید اپنی خالص اسلامی معنویت کے ساتھ محفوظ رہے۔ ان کی یہ اصلاح محض فلسفیانہ اختلاف نہ تھی بلکہ عقیدۂ توحید کو عوامی سطح پر فکری انتشار سے بچانے کی ایک عظیم کوشش تھی۔

ان کے مکتوبات اسلامی فکر کی تاریخ میں محض خطوط نہیں بلکہ ایک فکری وروحانی انقلاب کی دستاویز ہیں۔ ان تحریروں میں علم کی گہرائی بھی ہے، روحانیت کی حرارت بھی، شریعت کی پاسبانی بھی اور امت کے زوال پر ایک دردمند دل کی تڑپ بھی۔ انہوں نے امرا، علما، صوفیا اور اہلِ اقتدار سب کو مخاطب کر کے یہ احساس دلایا کہ اسلام کسی درباری مصلحت کا نام نہیں بلکہ ایک زندہ اور غالب حقیقت ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ایک بہت اہم خصوصیت ان کا غیر معمولی توازن تھا۔ وہ نہ ظاہر بینی کے قائل تھے نہ بے لگام باطنیت کے۔ ان کے یہاں عشق بھی تھا مگر ادب کے حصار میں، معرفت بھی تھی مگر شریعت کی روشنی میں، تصوف بھی تھا مگر صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے مزاج سے ہم آہنگ۔ انہوں نے روحانیت کو شریعت سے جدا کوئی مستقل راستہ نہیں بننے دیا بلکہ اسے اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشبو سے معطر رکھا۔

انہوں نے اکبری فتنوں کے مقابل محض ردّ وانکار کی زبان اختیار نہیں کی بلکہ ایک متبادل فکری وروحانی نظام پیش کیا۔ ان کی خانقاہ محض ذکر وشغل کی جگہ نہ تھی بلکہ اصلاحِ امت کا مرکز تھی۔ وہاں سے ایسے رجالِ کار تیار ہوئے جنہوں نے پورے برصغیر میں اسلامی فکر وروحانیت کی تجدید کی۔ ان کے اثرات صرف ہندستان تک محدود نہ رہے بلکہ ماوراء النہر، افغانستان، حجاز اور عالمِ اسلام کے دوسرے علاقوں تک پھیل گئے۔

اگر اس عہد میں اکبری فکر مذہب کو محض ایک ''اخلاقی نظام'' بنا دینا چاہتی تھی تو مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسلام کو اس کی کامل روح کے ساتھ دوبارہ پیش کیا-- ایک ایسا دین جو عقیدہ بھی ہے، تہذیب بھی، شریعت بھی، روحانیت بھی اور نسبتِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روشن ایک مکمل طرزِ حیات بھی۔

انہوں نے امت کو یہ احساس دلایا کہ مسلمان کی اصل قوت اس کی سیاسی طاقت نہیں بلکہ اس کا روحانی واعتقادی استحکام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریک محض ایک وقتی اصلاحی کوشش نہ رہی بلکہ بعد کی صدیوں میں آنے والی دینی وروحانی تحریکات کے لیے بنیاد بن گئی۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب اکبری دور کی فضا میں دین کی آواز دبتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایمان کی اس خموش ہوتی شمع کو پھر سے فروزاں کر دیا۔ انہوں نے امت کو یاد دلایا کہ اسلام کی بقا صرف شمشیر سے نہیں بلکہ عقیدے کی پاکیزگی، سنّت کی وفاداری اور نسبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرارت سے ہوتی ہے۔ ان کی ذات اس عہدِ پرآشوب میں محض ایک عالم یا صوفی کی نہیں بلکہ ایک ایسے مجدد کی تھی جس نے وقت کے منتشر اندھیروں میں امت کے لیے اعتدال، محبت اور حق کا راستہ دوبارہ روشن کر دیا۔

یہ عہد اپنی باطنی ساخت میں نہایت پیچیدہ تھا۔ ایک طرف اصلاح وتجدید کی وہ متوازن آوازیں تھیں جو امت کے روحانی وفکری وجود کو اعتدال بخش رہی تھیں اور دوسری طرف ایسے رجحانات بھی سر اٹھا رہے تھے جو دین کی تعبیر کو سختی، انکار اور تنگ نظری کی سمت لے جانے والے تھے۔

لیکن ہر تجدید اپنے ساتھ توازن نہیں لاتی۔ بعض اوقات اصلاح کے نام پر ایسی شدتیں بھی جنم لیتی ہیں جو امت کے روحانی اور تہذیبی سرمائے ہی کو مشتبہ بنا دیتی ہیں۔

چنانچہ انہی چراغوں کے درمیان ایک ایسی آگ بھی سلگ رہی تھی جس نے بعد کے زمانوں میں عالمِ اسلام کے روحانی وتہذیبی توازن کو شدید متاثر کیا۔ یہ وہ دور تھا جب نجد کے خشک ریگزاروں سے ایک ایسی تحریک ابھرنے لگی جو بظاہر توحید کے احیا کا دعویٰ کرتی تھی مگر اپنے مزاج، تعبیر اور طرزِ عمل میں امت کے صدیوں کے علمی وروحانی تسلسل سے بغاوت کا رنگ رکھتی تھی۔

محمد بن عبد الوہاب نجدی کی تحریک نے دین کے اُس جمالیاتی،

روحانی اور عشقیہ پہلو کو نشانہ بنایا جس نے صدیوں تک مسلمانوں کے دلوں میں محبتِ رسول ﷺ، تعظیمِ اولیا اور احترامِ آثارِ مقدسہ کی شمع روشن رکھی تھی۔ توحید کے نام پر ایسے سخت گیر تصورات کو فروغ دیا گیا جن میں اعتدال کی جگہ شدت، ادب کی جگہ تحقیر اور روحانیت کی جگہ ظاہریت نے لے لی۔ یہ محض ایک فقہی مناقشہ نہ تھا بلکہ اسلامی تہذیب کے اس پورے ذوق پر حملہ تھا جس میں خانقاہیں صرف عبادت گاہیں نہیں بلکہ تربیتِ باطن کے مراکز تھیں، مزارات صرف قبریں نہیں بلکہ تاریخِ ایمان کے روشن مینار تھے اور اہل اللہ سے محبت صرف عقیدت نہیں بلکہ نسبتِ رسول ﷺ کا ایک لطیف اظہار تھی۔

رفتہ رفتہ یہ تحریک اپنے اندر ایسی شدت اختیار کرتی گئی کہ اختلافِ رائے تکفیر میں بدلنے لگا۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد، جو صدیوں سے اولیا و صالحین کے آثار سے وابستگی رکھتی تھی، شرک و بدعت کے فتووں کی زد میں آنے لگی۔ قبورِ مقدسہ اور تاریخی آثار کی بے حرمتی کو "تطہیرِ عقیدہ" کا نام دیا گیا۔ آثارِ اسلام کو مٹانے کی ایک ایسی لہر اٹھی جس نے تاریخ کے ان نقوش تک کو نہ بخشا جو امت کے اجتماعی حافظے کا حصہ تھے۔

حجاز کی سرزمین، جہاں ہر ذرّہ عہدِ رسالت ﷺ کی یادوں سے معطر تھا، وہاں بھی اس فکر کی تند آندھی چلی۔ تقریباً تمام مزارات و آثار منہدم کیے گئے، قدیم کتب خانے اجاڑے گئے، علمی ذخیرے ضائع ہوئے اور وہ تہذیبی ربط مجروح ہوا جو مسلمانوں کو اپنے ماضی سے جوڑے ہوئے تھا۔ یہ محض پتھروں کی شکست و ریخت نہ تھی بلکہ حافظۂ امت پر ضرب تھی۔

اس تحریک کے سیاسی اتحاد نے جب عسکری طاقت حاصل کی تو صورتِ حال مزید سنگین ہوگئی۔ بہت سے علاقوں میں مسلمانوں ہی کو مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانی پڑی۔ شہروں پر حملے ہوئے، خونریزی ہوئی، اہلِ علم و تصوف کو نشانہ بنایا گیا اور اختلاف برداشت کرنے کی بجائے بزورِ شمشیر ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ یوں "اصلاح" کا دعویٰ رفتہ رفتہ ایک ایسی سخت گیر فکر میں ڈھلتا گیا جس میں امت کی صدیوں پر محیط علمی روایت، فقہی تنوع اور روحانی ورثہ سب مشکوک قرار پانے لگے۔ سب سے المناک پہلو یہ تھا کہ توحید کے نام پر عشقِ رسول ﷺ کے اُن لطیف مظاہر کو بھی نشانہ بنایا گیا جو اہلِ سنّت کے نزدیک ایمان کی حرارت اور ادبِ نبوی ﷺ کی علامت تھے۔ تعظیم کو شرک، توسل کو گمرہی اور محبت کے اظہار کو بدعت کہنے کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے امت کا روحانی ذوق شدید مجروح کیا۔ گویا مسئلہ صرف عقائد کی تعبیر کا نہ رہا بلکہ نسبتِ مصطفی ﷺ کے اُس تہذیبی اور قلبی نظام کا ہو گیا جس پر مسلم معاشروں کی روحانی عمارت قائم تھی۔ اسی فکری و روحانی کشمکش کے ماحول میں عالمِ اسلام کے مختلف گوشوں سے ایسی شخصیات ابھریں جنھوں نے اعتدال، محبت، روحانیت اور علمی توازن کے چراغ روشن رکھے۔ انہوں نے نہ صرف دین کے ظاہر کی حفاظت کی بلکہ اُس باطن کی بھی پاسبانی کی جس کے بغیر مذہب محض خشک استدلال بن کر رہ جاتا ہے۔ شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی انہی نفوسِ قدسیہ میں سے تھے، جن کی شخصیت میں علم کی سنجیدگی، روحانیت کی لطافت اور نسبتِ رسول ﷺ کی حرارت ایک ساتھ جلوہ گر تھی۔

شیعہ و سنی تعلقات میں کشیدگی بدستور قائم رہی، خصوصاً سلطنت صفویہ کے زیرِ اثر ایران میں، جہاں مذہب اور سیاست ایک دوسرے میں گہرے طور پر پیوست ہو چکے تھے۔

یہ صدی تین بڑی اسلامی سلطنتوں کے استحکام اور تدریجی زوال کے ابتدائی آثار کی صدی ہے۔

سلطنت عثمانیہ اس صدی کے آغاز میں اب بھی ایک عظیم قوت تھی، مگر اندرونی بدعنوانی، انتظامی کمزوریاں یورپ کے ساتھ مسلسل جنگوں نے اس کی طاقت آہستہ آہستہ متاثر کرنا شروع کیا۔ محاصرۂ ویانا (1683) کی ناکامی اس زوال کی ایک علامتی جھلک بن کر سامنے آئی۔ سلطنت صفویہ اس دور میں اپنی شان و شوکت برقرار رکھے ہوئے تھی، خصوصاً شاہ عباس اول کے زمانے میں ایران سیاسی طور پر مستحکم ہوا، فنون و ثقافت کو فروغ ملا لیکن صدی کے آخر تک اس کے اندر بھی کمزوریوں کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

سلطنت مغلیہ اس صدی میں اپنے عروج پر پہنچی، خصوصاً شاہ جہاں کے دور میں تعمیرات و تہذیب کی بلندی، حضرت اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے زمانے میں سلطنت کی وسعت اور شریعت کے نفاذ کی کوشش تاہم حضرت اورنگزیب عالمگیر کے آخری دور میں، طویل جنگیں، علاقائی بغاوتیں، مستقبل کے زوال کی بنیاد بننے لگیں۔ یہ صدی دراصل عالمی طاقت کے مرکز کی تدریجی منتقلی کی صدی ہے: یورپ میں سائنسی انقلاب (Scientific Revolution) اپنے عروج پر تھا، جس میں آئزک نیوٹن جیسے مفکرین نے کائنات کے فہم کو بدل دیا۔ سمندری طاقتوں (پرتگال، ہالینڈ، برطانیہ) نے ایشیا و افریقہ میں اپنے تجارتی مراکز قائم کر لیے تھے۔

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اور ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی جیسی تجارتی قوتیں مستقبل کی نوآبادیاتی سلطنتوں کی بنیاد رکھ رہی تھیں۔ عیسائی دنیا میں اصلاحِ مذہب پروٹسٹنٹ کے اثرات ابھی تک جاری تھے، جس کے نتیجے میں یورپ مذہبی جنگوں اور فکری تقسیم سے گذر رہا تھا۔

گیارہویں صدی ہجری کو اگر ایک جملے میں سمیٹا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی سطح پہ یہ صدی مذہبی فتنوں کے رونما ہونے کی صدی ہے۔ سیاسی سطح پہ عظیم اسلامی سلطنتیں اپنے عروج کے ساتھ ساتھ زوال کے ابتدائی مراحل میں داخل ہو رہی تھیں۔ عالمی سطح پہ یورپ آہستہ آہستہ علمی، سائنسی اور تجارتی میدان میں برتری حاصل کر رہا تھا، جو آنے والی صدیوں میں مکمل غلبے میں تبدیل ہونے والا تھا۔

یہ صدی دراصل ایک خاموش تبدیلی کا دور ہے--ظاہر میں استحکام مگر باطن میں تغیر--جس نے آنے والے زمانوں کی سمت متعین کر دی۔ گیارہویں صدی ہجری کے اوائل میں اگر بغداد بالخصوص شیراز کے منظر نامے پہ نظر ڈالی جائے تو یہ محض دو شہروں کے احوال نہیں بلکہ ایک پورے تہذیبی، علمی اور روحانی افق کا مشاہدہ ہے، جہاں قرونِ وسطیٰ کی روایات ابھی زندہ تھیں اور ایک نئے زمانے کی آہٹیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔

بغداد اگرچہ عباسی خلافت کے سیاسی جاہ و جلال سے محروم ہو چکا تھا مگر اس کی علمی و روحانی مرکزیت باقی تھی۔ یہ شہر اب براہِ راست سلطنت عثمانیہ کے زیر اثر تھا اور عثمانی وصفوی کشمکش کے باعث بارہا سیاسی اضطراب کا شکار رہا۔

بغداد اب بھی مدارس، خانقاہوں اور کتب خانوں کا شہر تھا۔ فقہ، حدیث اور تصوف کی روایتیں جاری تھیں، مدرسہ نظامیہ بغداد کی تاریخی بازگشت اہلِ علم کے حافظے میں زندہ تھی، روضۂ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی روحانی مرکز کے طور پر اہلِ دل کو کھینچتا تھا، بغداد کی فضا میں ایک طرف ماضی کی عظمت کی دھیمی روشنی تھی، دوسری طرف سیاسی بے یقینی کا غبار لیکن اس غبار کے درمیان علم کی شمعیں بجھی نہ تھیں، جیسے وقت کی آندھیوں میں بھی کچھ چراغ اپنے وقار کے ساتھ روشن رہتے ہیں۔ گلیوں میں تاریخ کی چاپ سنائی دیتی تھی، محرابوں میں صدیوں کی مناجات گونجتی تھی اور دجلہ کے کنارے تہذیب کی کوئی خموش روایت اب بھی سانس لیتی محسوس ہوتی تھی۔ یہ وہ شہر تھا جہاں شکست کی دھول بھی یادِ عروج کو مٹا نہ سکی تھی۔

بغداد کی فضا میں ایک عجب امتزاج تھا---زوال کی کسک بھی، بقا کی رمق بھی۔ خانقاہوں میں ذکر کی لے، مدارس میں درس کی صدا اور کتب خانوں میں علم کی روشنی گویا اس حقیقت کی گواہی دیتی تھی کہ تہذیبیں صرف سلطنتوں سے نہیں، روایتوں سے زندہ رہتی ہیں۔ یہاں ماضی محض یاد نہیں تھا، ایک زندہ حوالہ تھا اور روحانیت صرف مزاروں تک محدود نہ تھی بلکہ شہر کے مزاج میں رچی ہوئی ایک کیفیت تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بغداد اپنی شکست کے ملبوں پر بھی وقار کے ساتھ کھڑا ہے ایک ایسا شہر جس کے زخم بھی تاریخ بولتے ہیں اور جس کی خاموشی بھی معرفت کا استعارہ بن جاتی ہے۔ یہاں وقت صرف گذرا نہیں تھا، تہذیب بن کر ٹھہرا ہوا تھا۔ عثمانی صفوی کشمکش نے بغداد کو سرحدی تنازع کا مرکز بنا دیا تھا۔ کبھی عثمانی اقتدار مضبوط، کبھی صفوی اثرات غالب--اس کشمکش نے علمی زندگی کو بھی متاثر کیا۔ اگر بغداد علم کی یادگار تھا تو شیراز حسن، حکمت، تصوف اور تہذیب کا زندہ استعارہ تھا۔ وہ صرف ایک شہر نہیں، ذوق و دانش کی ایک دل آویز تعبیر تھا، جہاں فضائیں شعر کی نرمی، فکر کی گہرائی اور روحانیت کی لطافت سے معطر محسوس ہوتی تھیں۔ باغات کی سرسبز و شادابی، گلستانوں کی عطر

بیزیاں اور اہلِ دل کی محفلیں گویا شہر کے مزاج میں شامل تھیں۔

یہاں حکمت صرف درس گاہوں میں نہیں، زندگی کے قرینے میں بولتی تھی تصوف فقط خانقاہوں تک محدود نہ تھا بلکہ زندگی کی رفتار میں جھلکتا تھا۔شیراز کی گلیوں میں تہذیب چلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور اس کی فضا میں جمال اور جلال کا ایک نازک توازن قائم تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے شہر کا ہر گوشہ کسی خاموش معرفت کا امین ہو۔

یہ وہ سرزمین تھی جہاں علم، عشق اور ادب نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے۔فکر یہاں خشک استدلال نہیں بنتی تھی بلکہ ذوق کی روشنی سے منور ہو کر حکمت کا پیکر بن جاتی تھی۔ یہاں کی مجلسوں میں گفتگو صرف الفاظ کا تبادلہ نہ تھی، روح اور شعور کا ایک زندہ مکالمہ تھی۔

شیراز اپنی تہذیبی روح میں گویا ایک متحرک و بیدار دیوان تھا کہیں حضرت شیخ سعدی کی دانائی کی بازگشت، کہیں حضرت حافظ کے رمز آشنا لہجے کی لطافت، کہیں اہلِ تصوف کی خموش ریاضتوں کی خوشبو۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ شہر اینٹ اور پتھر سے نہیں، معانی، محبت اور جمال سے تعمیر ہوا ہو۔

اگر بغداد تاریخ کے حافظے میں علم کا چراغ تھا تو شیراز دل کی دنیا میں حسن و معرفت کا وہ چراغ تھا، جس کی روشنی صرف آنکھوں سے نہیں، باطن سے دیکھی جاتی ہے۔ یہاں تہذیب ماضی کی یاد نہیں، ایک زندہ کیفیت تھی اور شہر خود ایک ایسا استعارہ، جس میں روحانیت نے جمال کا پیرہن پہن رکھا ہو۔

سلطنت صفویہ کے زیرِ سایہ شیراز ایک اہم علمی و تمدنی مرکز تھا۔ یہ شہر علماء، صوفیا اور حکماء کی بستی شعر و ادب کا گہوارہ فلسفہ و عرفان کا مرکز اور باغات و معماری کا شہر تھا۔صدرالدین شیرازی جیسے عظیم فلسفی کی موجودگی نے شیراز اور اس کے فکری ماحول کو ایک خاص امتیاز دیا۔ حکمتِ متعالیہ کے مباحث اسی فضا میں نمو پا رہے تھے۔

مزار حضرت حافظ شیرازی اور مزار حضرت شیخ سعدی محض مزارات نہیں، تہذیبی شعور کے استعارے تھے۔

شیراز کی فضا میں تصوف تھا، فلسفہ تھا، شعریت تھی اور ایک لطیف تہذیبی نزاکت تھی۔ گویا شہر سانس نہیں لیتا تھا، شعر کہتا تھا۔

صفوی دور کے باعث اثنا عشری تشیع کو ریاستی سرپرستی حاصل تھی مگر شیراز کے مزاج میں محض فقہی سختی نہیں بلکہ عرفانی رنگ بھی غالب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں مذہب صرف قانون نہیں، ذوق بھی تھا۔

اگر اس عہد کے بغداد اور شیراز کو ایک ساتھ دیکھا جائے تو ایک معنیٰ خیز تضاد سامنے آتا ہے:

بغداد: ماضی کی علمی بازگشت ۔شیراز: تہذیبی وفکری تازگی
بغداد: سیاسی اضطراب۔شیراز: نسبتاً ثقافتی استحکام
بغداد: روحانی مرکزیت ۔شیراز: عرفانی وادبی مرکزیت
بغداد: سرحدی کشمکش کا شہر۔شیراز: جمال وحکمت کا شہر
بغداد میں تاریخ بولتی تھی۔اور شیراز میں تہذیب گنگناتی تھی۔

انہی متغیر فضاؤں، انہی علمی چراغوں اور انہی روحانی کشمکشوں کے درمیان کچھ ایسی شخصیات بھی ابھر رہی تھیں جو آنے والے زمانوں کی فکری سمت متعین کرنے والی تھیں۔ ان میں بعض نے علم کو نئی تعبیر دی، بعض نے روحانیت کو نئی حرارت بخشی اور بعض نے زوال پذیر عہد میں امید کے چراغ روشن رکھے۔

شیراز سے ہند تک: ایک بشارت، ایک امانت، ایک روحانی سفر

تاریخ کے بعض اوراق محض واقعات نہیں ہوتے، مکاشفۂ زمانہ ہوتے ہیں۔ ان میں کردار چلتے پھرتے انسان کم اور تقدیر کے لکھے ہوئے استعارے زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔

کبھی ان کے نقوش مٹی پر نہیں، زمانے کے شعور پر ثبت ہوتے ہیں، کبھی ان کی حیات ایک فرد کی سرگذشت نہیں بلکہ ایک عہد کی باطنی تعبیر بن جاتی ہے۔ ایسے لوگ تاریخ کے دھارے میں شامل نہیں ہوتے، بعض اوقات خود تاریخی تسلسل کا رخ موڑ دیتے ہیں۔

کبھی ایک خواب صدیوں کے مستقبل پر محیط حقیقت بن جاتا ہے، کبھی ایک بشارت نسلوں کے مقدر میں روشنی بن کر اترتی ہے۔ بعض زندگیاں حالات کے جبر سے نہیں بنتیں، غیبی اشارات کے سائے میں نمو پاتی ہیں، ان کے سفر میں حادثات کم اور حکمت کے نقوش زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔

ایسے ہی رجالِ حق کی داستانوں میں وقت محض گذرتا نہیں، معنیٰ اختیار کرتا ہے۔ ان کے بچپن میں بھی اشارے ہوتے ہیں، جوانی میں بھی اسرار اور بڑھاپے میں بھی چراغِ رہنمائی۔ ان کی خموشی کبھی خطاب بن جاتی ہے اور ان کا ایک جملہ آئندہ صدیوں کے لیے منشور۔

بسا اوقات تاریخ کے انہی روشن گوشوں میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ولایت صرف کرامت کا نام نہیں، ایک ذمہ داری ہے اور بعض ہستیاں زمین پر چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں مگر ان کے قدموں کی سمت آسمان طے کرتا ہے۔

یہ وہ شخصیات ہوتی ہیں جن کی ولادت محض ایک گھر میں نہیں ہوتی، ایک عہد کے افق پر ہوتی ہے جن کے تذکرے واقعات کے طور پہ نہیں، امانتوں کے طور پہ منتقل ہوتے ہیں اور جن کی حیات کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ہم کسی انسان کی زندگی نہیں، تقدیر کے لکھے ہوئے ایک زندہ صحیفے کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ کبھی ایک خواب آنے والی صدیوں کے رخ بدل دیتا ہے، کبھی ایک ماں کے بطن میں پلنے والا بچہ محض فرزند نہیں رہتا، عہد کا چراغ بن جاتا ہے۔

وہ تقدیر کے خموش اوراق پر لکھی ہوئی ایسی بشارت ہوتا ہے جو وقت کے دامن میں پروان چڑھ کر تاریخ کی پیشانی کا نور بن جاتا ہے۔ اس کی ولادت ایک فرد کا ظہور نہیں، ایک عہد کے معنوی بیداری کا اعلان ہوتا ہے۔ ایسے وجود اپنے ساتھ صرف سانسیں نہیں لاتے، وہ پیغام لاتے ہیں، صرف خاندانوں کی نسبت نہیں بڑھاتے، زمانوں کی سمت بدل دیتے ہیں۔ ان کی ہستی میں مستقبل کے امکانات ایک روشن امانت کی صورت ودیعت ہوتے ہیں اور یوں ایک گہوارہ کبھی کبھی پوری تہذیب کی تقدیر کا نقطۂ آغاز بن جاتا ہے۔

گیارہویں صدی ہجری کے طلوع سے ذرا پہلے بغداد کے مشہور شہر شیراز کی پاکیزہ فضا میں ایک سادات گھرانہ آباد تھا علم جس کا ورثہ تھا، ولایت جس کی میراث تھی۔

اس کی شخصیت میں دانش کی سنجیدگی اور روحانیت کی لطافت ایک دوسرے میں یوں پیوست تھیں جیسے نور میں حرارت اور خوشبو میں تاثیر۔ اس کے وجود میں درسگاہوں کی بصیرت بھی تھی اور خانقاہوں کی وارفتگی بھی، قلم کی وقار آمیز روشنی بھی تھی اور دل کی منور آگہی بھی۔ وہ صرف علوم کا حامل نہ تھا، معانی کا امین بھی تھا، صرف سلسلۂ نسب کا وارث نہ تھا، سلسلۂ روحانیت کا زندہ تسلسل بھی تھا۔ اس کی ذات میں روایت محض محفوظ نہیں تھی، متحرک تھی اور میراث محض منتقل نہیں ہوئی تھی، ایک نئے جمال کے ساتھ جلوہ گر ہوئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے علم نے اس کے اندر حکمت کا لباس پہن لیا ہو اور ولایت نے کردار کی صورت اختیار کر لی ہو۔

اسی خانوادۂ طیبہ میں سید محمد علی اور حضرت سیدنا آمنہ بی بی کی زندگی ایک خموش نور میں ڈھلی ہوئی تھی۔ مگر تقدیر اس سکوت کے پس منظر میں ایک بڑی داستان لکھ رہی تھی۔

بظاہر یہ ایک سادہ اور پُرسکون زندگی کا منظر تھا لیکن باطن میں زمانہ ایک ایسے باب کی ترتیب و تدوین کی تیاری کر رہا تھا جس کی بازگشت صدیوں تک سنائی دینی تھی۔ ان کے وجود کے گرد خموشی تھی مگر وہ خموشی معنیٰ سے لبریز تھی، کسی گہری ربانی حکمت کی مانند، جو خاموش رہ کر بھی اپنے آثار چھوڑتی چلی جاتی ہے۔

جیسے کسی طلوعِ عظیم سے پہلے افق پر ٹھہری ہوئی روشنی۔

گھر کی فضا میں سکون تھا مگر اس سکون کے اندر ایک انجانی سی بیداری دھڑک رہی تھی، گویا وقت اپنی سانس روکے کسی لمحۂ ظہور کا منتظر ہو۔ جیسے خموش فضا میں کسی آنے والے نور کی آہٹ دھیرے دھیرے گونج رہی ہو، جیسے وقت کے پردوں میں کوئی رازِ مقدر چپکے چپکے شکل اختیار کر رہا ہو، جیسے سکوت کی تہوں میں ایک عظیم بشارت اپنے لمحاتِ ظہور کا انتظار کر رہی ہو۔

فضا کی خموشی میں ایک عجب وقار تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ قدرت نے اس گھر کے گرد اپنی رحمت کا حصار کھینچ دیا ہو اور زمانہ مودب ہو کر کسی فیصلۂ الٰہی کے نزول کا انتظار کر رہا ہو۔

جیسے صبح کے آنے سے پہلے اجالے کی نرم جنبش افق پر محسوس ہونے لگے، جیسے کائنات کسی غیر معمولی ظہور کے استقبال میں دم بخود کھڑی ہو، جیسے تقدیر اپنی روشن تحریر ابھی پردۂ غیب میں رقم کر رہی ہو۔

ان لمحوں میں سکوت بھی گویا ایک زبان رکھتا تھا۔ دیواریں خموش

تھیں مگر ماحول کے اندر ایک غیر مرئی بشارت کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی، جیسے آنے والے وقت کی چاپ ابھی سے سنائی دینے لگی ہو۔

جیسے ایک خموش دعا زمانے کے لبوں پر قبولیت بن کر ٹھہر گئی ہو، جیسے نور ابھی گہوارۂ امکان میں ہو مگر اس کی کرنیں دور افق کو منور کرنے لگی ہوں، جیسے آنے والے عہد کی روشنی سکوت کے دامن میں پرورش پا رہی ہو۔ان کی حیات کا سکون دراصل ایک گہری ربانی تدبیر کا پردہ تھا، جس کے عقب میں مستقبل کے نقوش خموشی سے ابھر رہے تھے۔ وقت بظاہر ٹھہرا ہوا دکھائی دیتا تھا مگر حقیقت میں تقدیر اپنے سب سے روشن اوراق مرتب کر رہی تھی۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ خموشی محض خموشی نہ تھی، ایک امانت کی پاسبانی تھی، ایک ایسی بشارت کا تحفظ، جو وقت آنے پر عہد کی تقدیر بدلنے والی تھی۔

یہ خموشی دراصل اسرارِ تقدیر کی وہ دبیز چادر تھی جس میں مستقبل کی ایک عظیم روشنی محفوظ کی جا رہی تھی۔ بظاہر سکون تھا مگر اس سکون کے باطن میں زمانہ ایک نئے باب کی تمہید لکھ رہا تھا۔ یہ ٹھہراؤ جمود نہ تھا، ایک معنوی ارتکاز تھا، جیسے قدرت کسی بڑے ظہور سے پہلے کائنات کو خموش احترام میں تھام لیتی ہو۔

یوں لگتا ہے کہ اس سکوت کے دامن میں صرف ایک فرد کی ولادت نہیں، ایک عہد کی تشکیل پرورش پا رہی تھی۔ ایک ایسی صبح کا امکان سانس لے رہا تھا جو نمودار ہو کر فکر کے رجحانات بدل دے گی، روحانیت کے افق روشن کر دے گی اور تاریخ کے اوراق پر ایک نئے عنوان کا اضافہ کرے گی۔ یہ مژدہ گویا وقت کے سینے میں ودیعت وہ راز تھا جب وہ آشکار ہوتا تو محض ایک زندگی نہیں، پورے دور کی سمت متعین کر دیتا۔اس خاموش پاسبانی میں ماں کی گود بھی امانت تھی، تقدیر کا صحیفہ بھی اور آنے والے زمانوں کی روشنی بھی۔

ایک ماں کے وجود میں کبھی کبھی تاریخ اپنی سمت محفوظ کرتی ہے اور ایک گود میں کبھی پورے دور کی معنوی صبح پرورش پاتی ہے۔ سیدتنا آمنہ بی بی کی زندگی بھی اسی راز آشنا خموشی کا استعارہ تھی، جہاں نور ابھی پردۂ سکوت میں تھا مگر اس کی کرنیں زمانے کے افق پر پھیلنے کے لیے آمادہ ہو چکی تھیں۔

سیدتنا آمنہ بی بی حالتِ حمل سے تھیں کہ ایک شب عالمِ خواب میں ایک بشارت اترتی ہے۔خواب کیا تھا گویا غیب کا کوئی روزن کھل گیا ہو۔ گویا پردۂ محسوس کے اُس پار سے حقیقت کی ایک کرن قلب و نظر پر اتر آئی تھی۔ یہ محض خواب کا ایک منظر نہ تھا، تقدیر کے سربستہ راز کا ایک لمحۂ انکشاف تھا، جہاں سکوتِ شب میں آسمانی پیغام کی سرگوشی سنائی دیتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے نیند کی وادی میں شعور کسی اور جہت سے ہم کلام ہو گیا ہو اور زمانہ اپنے مخفی اشاروں میں ایک بڑے ظہور کی خبر دے رہا ہو۔

وہ خواب ایک تاثر نہیں، ایک بشارت کا نزول تھا جیسے عالمِ غیب نے لمحے بھر کو اپنے دریچے وا کر دیے ہوں اور مستقبل کی روشنی ایک رمز بن کر دل میں اتر گئی ہو۔ اس میں فقط منظر نہ تھا، معانی تھے، فقط اشارات نہ تھے، تقدیر کے نقوش تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شب کی خموشی میں نور نے کلام کیا ہو اور آنے والے عہد کی ساعتوں نے اپنی آہٹ سنا دی ہو۔

کبھی خواب محض خواب نہیں ہوتے، وہ وحشتِ شب میں امید کے چراغ بھی ہوتے ہیں اور تاریخ کے افق پر ابھرنے والی حقیقتوں کی تمہید بھی۔ یہ بھی ایسا ہی خواب تھا--- جیسے غیب نے اپنے اسرار کا ایک ورق الٹ دیا ہو، جیسے آنے والی صبح نے رات کی آغوش میں اپنی پہلی کرن رکھ دی ہو اور جیسے تقدیر نے خموشی سے اعلان کیا ہو کہ ایک نئی داستانِ نور رقم ہونے والی ہے۔

سید محمد علی رحمۃ اللہ علیہ دیکھتے ہیں کہ ایک نورانی آواز کہہ رہی ہے: تمہارے گھر ایک فرزند پیدا ہوگا۔اس کا نام محمد صالح رکھنا۔وہ پیدائشی صاحبِ ولایت ہوگا، اپنے زمانے کا قطب ہوگا۔اس کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کرنا، اور بغداد میں اس کے لیے مخصوص انتظام کرنا۔

یہ محض خواب نہ تھا، گویا آنے والے وقت کا منشور تھا۔ایک ایسا منشور جس میں مستقبل کے نقوش اشاروں میں ثبت تھے اور تقدیر اپنی روشن تحریر خموشی سے پیش کر رہی تھی۔ یہ خواب ایک منظر سے بڑھ کر ایک اشارۂ ربانی تھا، جس میں آنے والے عہد کی سمتیں پوشیدہ تھیں۔ یوں

محسوس ہوتا ہے جیسے زمانہ اپنے پردۂ غیب سے ایک لمحے کے لیے جھانک اٹھا ہو اور مستقبل نے حال کے گوشِ دل میں اپنا راز رکھ دیا ہو۔

یہ خواب گویا صبحِ فردا کی پیشانی پہ لکھی ہوئی بشارت تھیں، ایک ایسی بشارت جس میں صرف خبر نہ تھی بلکہ ایک دور کے ظہور کی تمہید بھی تھی۔ اس میں مستقبل بولتا تھا، تقدیر اشارے کرتی تھی اور وقت اپنے امکانات کے دریچے وا کرتا تھا۔ جیسے کسی آنے والے انقلابِ نور کی پہلی سرگوشی شب کے سکوت میں سنائی دے گئی ہو۔

یوں لگتا ہے کہ یہ خواب نہیں، تاریخ کے اوراق پر ثبت ہونے والے ایک باب کا ابتدائی عنوان تھا ایک خموش اعلان کہ کوئی عظیم حقیقت عالمِ امکان سے عالمِ ظہور کی طرف بڑھ رہی ہے۔ گویا غیب نے ایک لمحے کے لیے اپنا پردہ اٹھایا اور آنے والے وقت کا منشور دل کے صحیفے پر ثبت کر دیا۔

نیند سے بیدار ہوئے، آنکھیں کھلیں اور پھر صبح کے وقت یہ بشارت اپنے والدِ بزرگوار کو سنائی گئی تو خوشی کی وہ کیفیت تھی جیسے کسی نے گھر میں سورج اترنے کی خبر دی ہو۔

دل کے آنگن میں بشارت کا نور بکھر کر کچھ اس انداز میں پھیل گیا جیسے مدتوں کے انتظار کے بعد افق پر صبحِ موعود نمودار ہوئی ہو۔ یہ صرف ایک خواب کی تعبیر سننے کی خوشی نہ تھی بلکہ ایک ایسی بشارت کے لمس سے دل کا منور ہو جانا تھا جس میں آنے والے وقت کی عظمت کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔

یوں لگتا تھا جیسے گھر کی فضاؤں میں نور کی ایک نرم لہر دوڑ گئی ہو، جیسے دیواریں بھی خموش مسرت سے جگمگا اٹھی ہوں۔ اس خبر نے محض ایک فرد کو شاداں نہ کیا، گویا پورے ماحول پر ایک روحانی سرور طاری ہو گیا۔ جیسے کسی نے درِ امید پر دستک دی ہو اور تقدیر نے مسکرا کر آنے والی سعادت کی نوید سنائی ہو۔

وہ خوشی محض باپ کے قلب کی طمانیت نہ تھی، ایک امانت کی آمد کا شعور بھی تھا جیسے کسی نے بتایا ہو کہ ایک چراغ آنے والا ہے جو صرف ایک گھر نہیں، زمانے کے دریچوں کو روشن کرے گا۔ گویا اس بشارت کے ساتھ ایک نئی صبح نے آنگن میں قدم رکھے تھے اور گھر کے سکوت میں آنے والے نور کی آہٹ سنائی دینے لگی تھی۔

اور پھر وہ ساعت آئی۔ تین محرم 1000 ہجری۔

صبحِ صادق کا وقت۔ چار بج کر تیس منٹ پر شیراز کی فضا میں ایک نور نے آنکھیں کھولیں۔ حضرت سید محمد صالح شاہ تشریف لائے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے صدی کا آغاز ایک بچے کی ولادت کے ساتھ نہیں، ایک روحانی عہد کے آغاز کے ساتھ ہوا۔ بچپن ہی سے آثار نمایاں تھے۔ پانچ برس کی عمر میں اپنے والد کے سامنے مکمل قرآن مجید حفظ کر لیا۔ لفظ ابھی زبان پر تھے اور معانی دل میں اترتے جا رہے تھے۔ پھر علم کی تکمیل کے لیے بغداد شریف بھیجے گئے۔

بغداد---جہاں تاریخ سانس لیتی تھی، جہاں مدرسوں کے صحنوں میں فقہ بولتا تھا، خانقاہوں میں ذکر گونجتا تھا اور اولیاء کی قبروں سے نور پھوٹتا تھا۔ جہاں علم محض کتابوں میں نہیں، فضاؤں میں جاری تھا جہاں حکمت گلیوں سے گذرتی، معرفت کوچوں میں بسیرا کرتی اور روحانیت میناروں سے اذان کی طرح بلند ہوتی تھی۔ یہ وہ شہر تھا جہاں قلم کو وقار ملا، فکر کو پرواز ملی اور دلوں کو حضوری کی دولت نصیب ہوئی۔

یہاں ہر کوچہ گویا روایت کا امین تھا، ہر دروازہ کسی علم وعرفان کے باب کی مانند کھلتا تھا۔ مدرسوں کی محرابوں میں مناظرے کی سنجیدگی تھی، خانقاہوں کے آستانوں پر محبت وسلوک کی گرمی اور اہلِ دل کی مجلسوں میں وہ نورانی سکوت جو دلوں کو بیدار کر دے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بغداد کی مٹی میں بھی دعا کی تاثیر رچی ہوئی ہو اور اس کی فضا میں صدیوں کی عبادت کی خوشبو بسی ہو۔

یہ صرف ایک شہر نہ تھا، تہذیب کا دھڑکتا ہوا قلب تھا جیسے تاریخ یہاں واقعات نہیں، زندہ تجربات کی صورت چلتی پھرتی ہو۔ دجلہ کے کناروں پر گویا علم کے چراغ جھلملاتے تھے اور وقت کے اوراق یہاں آ کر روشنی میں بدل جاتے تھے۔ بغداد وہ آستانہ تھا جہاں عقل کو عرفان سے نسبت ملتی تھی اور روح کو اپنی گم گشتہ منزل کا سراغ۔

جیسے یہ شہر اینٹ پتھر سے نہیں، دعاؤں، درسوں اور ذکر وفکر کی صداؤں سے تعمیر ہوا ہو جیسے ہر گنبد ایک حکایت سناتا ہو، ہر مزار ایک روحانی نسبت کا چراغ ہو اور ہر صبح اس اعلان کے ساتھ طلوع ہوتی ہو

کہ یہاں نور ابھی زندہ ہے اور علم ابھی سانس لے رہا ہے۔

بارہ برس کی عمر میں کامل عالم۔ بیس برس میں علوم پر مہارتِ تامہ۔ گویا علم ان کے سامنے دروازے نہیں کھول رہا تھا، خود استقبال کو کھڑا تھا۔ دانش اپنے خزینے سمیٹے ان کے قدموں پر گویا خود فرشِ راہ ہو رہی تھی اور حکمت اپنے سربستہ راز ان کے شعور کے حوالے کرنے کو آمادہ تھی۔ یہ تحصیلِ علم نہ تھی، جیسے علم خود طالب بن کر ان کی طرف کھنچا چلا آتا ہو اور معرفت اپنی گرہیں خود وا کرتی جاتی ہو۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کتابیں صرف پڑھی نہیں جا رہیں، اپنے باطن کے معانی خود منکشف کر رہی ہوں جیسے اساتذہ محض درس نہیں دے رہے، ایک روایت اپنے اسرار منتقل کر رہی ہو۔ گویا علم نے ان کے لیے راستے نہیں بنائے، اپنی آغوش وا کر دی تھی اور فضل نے انہیں تلاش نہیں کیا خود ان کے در پر حاضر ہو گیا تھا۔

یہ منظر ایسا تھا جیسے حکمت کے دریچے خود بخود کھلتے جاتے ہوں، جیسے معانی کے قفل ان کی نگاہ سے ٹوٹتے ہوں اور جیسے فکر کے افق ان کے لیے نئے نئے آسمان روشن کر رہے ہوں۔ علم یہاں محنت کا صرف حاصل نہ تھا، ایک عطیہ بھی تھا، ایک ایسی ربانی توفیق، جس میں تحصیل اور قبول، دونوں ایک نور میں ڈھل گئے ہوں۔

گویا علم ان کے سامنے دروازے نہیں کھول رہا تھا بلکہ خود ادب سے کہہ رہا تھا آؤ، میرے پوشیدہ جہان تمہارے منتظر ہیں، آؤ، ان اسرار کو چھو لو جو صدیوں سے اہلِ دل کے سپرد امانت ہیں۔ جیسے دانش نے ان کی آمد کو پہچان لیا ہو اور حکمت نے پہلے ہی سے ان کے لیے اپنی محرابیں منور کر رکھی ہوں۔

پھر ایک شب آئی، رمضان المبارک کی ستائیسویں شب۔ عبادت کی رات، انوار کی رات، دعا، ذکر، تلاوت، سحری کے بعد مختصر آرام۔ اور اسی عالم میں ایک حکم۔ حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی جانب سے روحانی اشارہ: ''عید کے بعد بغداد آؤ، اپنے مرشد سے بیعت کر لو۔'' یہ دعوت نہ تھی، بلاوا تھا۔

عید کے بعد قافلہ روانہ ہوا۔ بغداد پہنچے۔ گیارہ شوال، نمازِ ظہر کا وقت۔ اور پھر ملاقات ہوئی حضرت سید شاہ جمال الدین قادری سے۔

وہ ساعت بیعت کی تھی مگر درحقیقت امانت کی منتقلی کی ساعت تھی۔ بظاہر ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ میں دیا جا رہا تھا لیکن باطن میں صدیوں کی روحانی روایت ایک دل سے دوسرے دل میں منتقل ہو رہی تھی۔ یہ محض ارادت کا اعلان نہ تھا، نسبت کے ایک ایسے باب کا افتتاح تھا جس میں تربیت، سلوک اور فیض کے چراغ روشن ہونے والے تھے۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس لمحے صرف عہد و وفا نہیں بندھ رہا ہے بلکہ ایک خموش امانت اپنے اہل تک پہنچ رہی ہو، جیسے پیر کی نگاہ میں صدیوں کا اعتماد سمٹ آیا ہو اور مرید کے دل میں قبولیت کا نور اتر رہا ہو۔ وہ بیعت محض دست بوسی کا منظر نہ تھی، ایک روحانی میثاق تھا، ایک ایسا معاہدۂ نور جس میں سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والے اسرار نئی منزل پا رہے تھے۔ یہ ساعت گویا تسلسلِ ولایت کے ایک نئے حلقے کے قیام کی ساعت تھی جیسے ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہوا ہو اور روشنی نے اپنے سفر کا ایک نیا پڑاؤ اختیار کیا ہو۔ اس لمحے میں ہاتھوں کا اتصال کم، روحوں کی نسبت زیادہ بول رہی تھی خموشی میں وہ کچھ منتقل ہو رہا تھا جسے لفظوں میں نہیں، صرف دلوں میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ ساعت بیعت کی تھی مگر حقیقت میں یہ امانت کی منتقلی، فیض کی توثیق اور تقدیر کے ایک نئے باب کے آغاز کی ساعت تھی جیسے مرشد نے محض مرید کو قبول نہ کیا ہو، بلکہ آنے والے زمانوں کے لیے ایک نورانی سلسلہ آگے بڑھا دیا ہو۔ ہاتھ میں ہاتھ دیا گیا، دل سے دل ملا اور پھر اسی لمحے سلسلۂ قادریہ کی خلافت بھی عطا ہوئی۔ عمامہ شریف۔ خرقہ (جبہ) اور ایک تسبیح۔ مگر یہ کوئی معمولی تسبیح نہ تھی، یہ وہ امانت تھی جس کی نسبت حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے جا ملتی تھی، نسل در نسل چلتی ہوئی، اہلِ امانت سے اہلِ امانت تک۔

اور اب یہ حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی کے ہاتھ میں تھی۔ گویا وقت نے اپنا راز ان کے سپرد کر دیا۔ مگر داستان ابھی یہاں کہاں مکمل تھی۔

ایک دن خواب میں سرکارِ دو عالم محمد عربی ﷺ جلوہ گر ہوئے۔ فضا نور سے معمور تھی جیسے روشنی نے اپنے نرم پر پھیلا کر ہر سمت کو اپنی آغوش میں لے لیا ہو۔ سکوت بھی منور تھا، ہوا بھی معطر اور لمحہ لمحہ

کسی غیر مرئی تجلی کے لمس سے لرزاں محسوس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے زمان و مکان پر ایک نورانی طمانیت اتر آئی ہو اور کائنات خموش ادب میں کسی عظیم ظہور کے استقبال میں ٹھہر گئی ہو۔

فضا نور سے معمور تھی جیسے ہر ذرہ اپنی خموش زبان میں تسبیح پڑھ رہا ہو، جیسے افق پر انوار کی لہریں پھیل رہی ہوں اور جیسے سکوت کے باطن میں کوئی مقدس سرگوشی گونج رہی ہو۔ یہ صرف روشنی نہ تھی، ایک حضوری کا احساس تھا، ایک ایسی کیفیت جس میں دل پر اترنے والے معانی الفاظ کے دائرے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نور صرف ماحول میں نہیں، دلوں کے اندر بھی اتر آیا ہو جیسے ہر سمت ایک غیبی بشارت کے پرتو میں نہا گئی ہو۔ فضا کا یہ نور گویا کسی بڑے راز کی تمہید تھا، کسی آنے والی تجلی کا پیش خیمہ، جیسے کائنات نے اپنی سانسیں روک کر ایک لمحۂ قدسی کے ظہور کو تھام لیا ہو۔ فضا نور سے معمور تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے زمین پر آسمان اتر آیا ہو، جیسے روشنی نے سکوت کو بھی معنیٰ عطا کر دیے ہوں اور جیسے اس لمحے کائنات کا ہر ذرہ اعلان کر رہا ہو کہ یہاں محض روشنی نہیں، نور کی حضوری ہے۔

ارشاد ہوا: ''پہلے مدینہ آؤ، پھر ہندستان جاؤ۔ وہاں دین کی خدمت تمہارے انتظار میں ہے۔''

عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میں نے ہند نہ دیکھا نہ سنا۔

ارشاد ہوا: ''جہاں جاؤ گے راستے خود بنتے چلے جائیں گے وہاں منزلیں تمہیں خود اپنا پتا دیں گی۔'' یہ حکم تھا یا تقدیر کا دروازہ۔

جو ایک لمحے میں کھل گیا اور آنے والے زمانوں کی سمتیں روشن کر گیا۔ یہ محض ارشاد نہ تھا، گویا مشیتِ الٰہی نے اپنے راز کا ایک ورق الٹ دیا ہو۔ اس میں حکم کی ہیبت بھی تھی اور بشارت کی لطافت بھی جیسے ایک لفظ بولا گیا ہو مگر اس کے پس منظر میں پورا عہد حرکت میں آ گیا ہو۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ صرف ایک فرمان نہیں، قسمت کے نہاں دریچوں کے وا ہونے کا لمحہ تھا جیسے تقدیر خموشی سے اپنی راہیں بدل رہی ہو اور مستقبل اپنی نئی تعبیر پا رہا ہو۔ یہ حکم نہیں، گویا وقت کی پیشانی پر لکھا ہوا وہ فیصلہ تھا جو صدیوں کے سفر کو نئی جہت دینے والا تھا۔

جیسے ایک صدا اٹھی اور اس کے ساتھ امکانات کے بند دروازے کھلتے چلے گئے جیسے غیب نے ایک اشارہ کیا اور تاریخ نے اپنا رخ موڑ لیا۔ وہ حکم گویا محض سنا نہیں گیا، زمانے کی روح میں اتر گیا اور ایک لمحہ معمول کا نہ رہ کر ابدی معنویت کا استعارہ بن گیا۔

یہ حکم تھا یا تقدیر کا دروازہ -- جیسے نور نے خود راستہ دکھایا ہو، جیسے مشیت نے اپنی مہر ثبت کر دی ہو اور جیسے ایک جملے میں پورے مستقبل کا صحیفہ سمیٹ دیا گیا ہو۔ صبح والدہ ماجدہ کو خواب سنایا، وہ خوش ہوئیں۔ کہا: ''بیٹا! اب یہاں ٹھہرنا نہیں چاہیے۔''

پھر ایک قافلہ شیراز سے اٹھا۔ اہلِ خانہ، مریدین، متعلقین، اور منزل مدینہ منورہ۔ وہاں پہنچ کر جب روضۂ اقدس پہ حاضر ہوئے تو محبت نے ادب کا جامہ پہن لیا عقیدت نے خموشی اختیار کر لی اور دل نے دھڑکنوں کی بجائے درود پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ حاضری محض قدموں کا ایک سفر نہ تھی، روح کی واپسی تھی جیسے دل اپنی اصل نسبت کے آستانے پر پہنچ گیا ہو۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہاں پہنچ کر الفاظ اپنی بساط کھو بیٹھتے ہیں اور جذبات سرِ نیاز جھکا دیتے ہیں۔ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں مگر باطن منور، لب خموش تھے مگر دل ہمہ وقت مناجات میں مشغول۔ عشق وہاں جذبہ نہیں رہتا، بندگی بن جاتا ہے اور ادب رسم نہیں رہتا، حضوری کا شعور بن جاتا ہے۔ روضۂ اقدس کے سامنے گویا وقت تھم گیا تھا، سانسیں بھی احترام سے آہستہ آہستہ چلنے لگی تھیں۔ جیسے ہر ذرہ کہہ رہا ہو کہ یہاں حضورِ نور ہے، یہاں عشق کو وقار کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے۔ وہ کیفیت ایسی تھی جیسے محبت نے اپنے شوق کو ضبط میں ڈھال لیا ہو اور اشکوں نے دعا کا پیرہن پہن لیا ہو۔ جب روضۂ اقدس پہ حاضر ہوئے تو عشق نے شائستگی کی صورت اختیار کر لی، جیسے دل نے اپنی تمام وارفتگی سمیٹ کر سرِ تسلیم خم کر دیا ہو، جیسے روح نے اپنی منزل پالی ہو اور جیسے عقیدت نے خموشی میں وہ کچھ کہہ دیا ہو جو لفظ کبھی ادا نہیں کر سکتے۔

نہایت باادب انداز میں سر جھکائے ہوئے وہ عرض گذار ہوتے ہیں۔ ''السلام علیکم یا جدی۔'' اور جواب آیا: ''وعلیکم السلام یا ولدی۔''

یہ جواب صرف سماعت نے نہ سنا ہوگا، روح نے بھی سنا ہوگا۔ یہ الفاظ محض کانوں سے ٹکرانے والی صدا نہ تھے، دل کے نہاں خانوں میں اترنے والی ایک نورانی بازگشت تھے۔ گویا جواب نہیں، ایک ایسی تجلی تھی جو سنائی بھی دیتی تھی اور محسوس بھی ہوتی تھی جیسے کلام نے صوت سے آگے بڑھ کر وجدان کی صورت اختیار کر لی ہو۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسے صرف سماعت نے نہیں، باطن نے

قبول کیا ہوگا صرف کانوں نے نہیں، دل نے اپنے سکوت میں اس کی گونج محفوظ کر لی ہوگی۔ وہ جواب جیسے لفظوں میں ادا ہوا مگر اثر اپنی معنویت میں روح پر نقش ہوتا چلا گیا۔ جیسے کسی نے سنا یا کم ہو اور جگا یا زیادہ ہو۔ یہ جواب گویا ایسی صدا تھی جسے وجود کے ہر ریشے نے سنا ہوگا جیسے روح نے اس میں اپنی قدیم نسبت کی پہچان پالی ہو اور دل نے اس میں ایک ایسی بشارت محسوس کی ہو جو عمر بھر روشنی دیتی رہے۔ یہ محض خطاب نہ تھا، حضوری کا ایک لمس تھا، ایک ایسا جواب جو سماعت سے گذر کر سرشت میں اتر جائے۔

یہ جواب صرف کانوں نے نہ سنا ہوگا، روح نے بھی سنا ہوگا، جیسے نور نے کلام کی صورت اختیار کر لی ہو، جیسے محبت نے جواب بن کر خود کو ظاہر کیا ہو اور جیسے ایک لمحے میں ظاہر و باطن دونوں ایک ہی ندا کے سامنے ساکت ہو گئے ہوں۔

پھر دستِ مبارک ظاہر ہوا۔ بوسہ دیا گیا۔

عرض کی: یارسول اللہ! پچیس بار حاضری کی سعادت چاہتا ہوں۔ پھر دعا کی: ایک سوستر برس عمر...... دوبارہ ایک سو اسی برس عمر کی درخواست...... ارشاد ہوا: ایک سو اسی کیا، ایک لاکھ اسی ہزار دعائیں بھی قبول ہیں۔ پھر فرمایا: بغداد جا کر اپنی امانت لے لو اور ہندستان جاؤ، دینِ محمدی کی تبلیغ کرو۔

یہاں سے یہ داستان شخصی نہیں رہتی، رسالتی مشن بن جاتی ہے۔

شیراز کا ایک خواب، بغداد کی ایک امانت، مدینہ منورہ کا ایک حکم اور ہند کی ایک تقدیر---سب ایک لڑی میں پروئے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ولادت سے قبل سنائی گئی بشارت دراصل اسی سفر کا مقدمہ تھی۔ وہ بچہ جو پیدائشی صاحبِ ولایت کہا گیا، اب وقت کے صحیفے پر اپنے منصب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شیراز نے انہیں جنم دیا، بغداد نے سنوارا، مدینہ منورہ نے مامور کیا اور ہندستان کی مٹی ان کی منتظر ہوئی۔ یہ کسی فرد کی سوانح نہیں، ولایت کے سفرنامے کا پہلا باب ہے اور شاید اسی لیے ان کی زندگی کا ہر مرحلہ واقعہ نہیں لگتا، اشارہ لگتا ہے...... ایک خواب کا اشارہ۔ ایک تسبیح کی امانت۔ ایک دستِ نبوی کا لمس اور ایک ہجرت، جو دراصل تبلیغِ محمدی کی طرف سفر تھی۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں تاریخ افسانہ نہیں بنتی، افسانہ حقیقت بن جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ کی روحانی حاضری نے اس سفر کے باطن کو بیدار کیا اور بغداد نے اس بیداری کو سمت عطا کی۔ چنانچہ یہ سفر اب ایک عام درویش کی سیاحت نہ رہا بلکہ مشیتِ الٰہی کے تحت ترتیب پانے والا وہ روحانی سلسلہ بن گیا جس کے ہر موڑ پر غیب کی کوئی خموش رہنمائی کارفرما دکھائی دیتی ہے۔ اسی روحانی تسلسل میں جب آستانۂ غوثِ اعظم پر حاضری نصیب ہوئی تو گویا تقدیر نے اس داستان کے اگلے باب پر اپنی مہر ثبت کر دی۔

تاریخ کے بعض سفر محض ایک مقام سے دوسرے مقام تک رسائی کا نام نہیں ہوتے، وہ تقدیر کے لکھے ہوئے ایسے ابواب ہوتے ہیں جن میں قدم مسافر کے ہوتے ہیں مگر رہنمائی غیب کرتا ہے۔ بعض قافلے راستوں سے نہیں گذرتے، راستے ان کے لیے بچھائے جاتے ہیں، بعض مسافر منزلیں تلاش نہیں کرتے، منزلیں انہیں خود پکارتی ہیں۔ حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا سفر بھی اسی نوع کا ایک روحانی سفرنامہ ہے، جس میں ہجرت بھی ہے، بشارت بھی، امانت بھی اور مشیتِ ایزدی کا وہ خموش تصرف بھی، جو اولیاء کی زندگیوں کو تاریخ سے بلند کر کے حکایتِ نور بنا دیتا ہے۔

شیراز کی علمی و روحانی فضا سے اٹھنے والا یہ مسافر جب مدینہ منورہ کی حاضری سے فیضیاب ہوا تو گویا سفر کو روح مل گئی۔ وہاں سے بغداد کا قصد محض جغرافیے کی تبدیلی نہ تھی، ایک روحانی دربار کی طرف بلاوا تھا۔ بغداد--- جہاں تاریخ سانس لیتی تھی، جہاں مدرسوں کے صحنوں میں فقہ بولتا تھا، خانقاہوں میں ذکر گونجتا تھا اور اولیاء کی قبروں سے نور پھوٹتا تھا--- اسی بغداد میں جب آستانۂ حضور غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پر حاضری نصیب ہوئی، تو یہ حاضری بھی ایک نئے باب کے آغاز میں بدل گئی۔

یوں لگا جیسے بغداد کی اس مقدس حاضری نے صرف دل کو منور نہیں کیا بلکہ آنے والے زمانوں کی ایک خاموش ذمہ داری بھی ان کے سپرد کر دی۔ آستانۂ غوثیت کی فضا میں ٹھہری ہوئی وہ روحانی ساعت اب ایک ایسے لمحۂ تقدیر میں ڈھلنے والی تھی جہاں دعا امانت بن جاتی ہے اور امانت، مشنِ حیات۔

روضۂ مبارک کے سامنے ادب سرنگوں تھا، محبت خاموش، اور روح کسی انجانی بشارت کی منتظر۔ یکا یک وہ ندا ابھری جو محض سماعت سے نہیں، روح سے سنی جاتی ہے: ''اے میرے بیٹے! یہ تمہاری امانت ہے، اسے لے جاؤ۔''

یہ حکم تھا یا تقدیر کا دروازہ-- ایک لمحے میں دونوں ایک ہو گئے۔ کچھ دیر بعد چار افراد ایک صندوق اٹھائے حاضر ہوئے اور خموشی سے سامنے رکھ دیا۔ صندوق کیا تھا، گویا اسرارِ ولایت کی ایک مہر بند امانت تھی۔ پھر روضۂ اقدس سے وہ دوسری صدا ابھری جس نے پورے سفر کی سمت متعین کر دی: ''اے میرے بیٹے محمد صالح! یہ صندوق لے کر ہندستان جاؤ، تمہیں اپنا مقام تلاش کرنے میں دشواری نہیں ہوگی۔''

یہ الفاظ محض حکم نہ تھے، آنے والے زمانے کا منشور تھے۔ گویا غیب نے منزل کا پتا دے دیا تھا، اگرچہ راہ ابھی پردۂ امکان میں تھی۔ اس ساعت بیعت کی نہیں، امانت کی منتقلی کی کیفیت تھی، ایک صندوق ہاتھ میں آیا مگر حقیقت میں ایک مشن قلب میں اتر آیا۔

بغداد شریف میں گیارہ دن کا قیام محض اقامت نہ تھا، جیسے کسی باطنی تیاری کا زمانہ ہو۔ پھر حکمِ غوثی کے تحت قافلہ روانہ ہوا--- سندھ کی طرف۔ یہ سفر زمین پر تھا مگر اس کی رہنمائی آسمان سے تھی۔ راستے بدلتے رہے مگر سمت نہ بدلی۔ کبھی سندھ کے میدان، کبھی کاٹھیاواڑ کے گوشے، کبھی ٹھٹھہ کی سرزمین، جہاں آپ کے اسلاف--- حضرت سید عقیق شیرازی، حضرت سید ہاشم شیرازی، حضرت سید علی شیرازی رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین--- کے مزارات گویا نسب کی یاد نہیں، نسبت کی تجدید تھے۔

وہاں کچھ روز قیام فرمایا۔ بزرگوں کے مزارات پر حاضری گویا سفر کی تھکن نہیں اتارتی تھی، روح کو تازگی عطا کرتی تھی۔ پھر قافلہ آگے بڑھا مگر یہ پیش قدمی محض نقلِ مکانی نہ تھی، جہاں دعوت کی ضرورت محسوس ہوتی، وہیں پڑاؤ ڈال دیتے۔ کبھی ایک گاؤں مرکزِ اصلاح بن جاتا، کبھی کوئی بستی ذکر کی انجمن۔ راستے ان کے لیے تبلیغ کے منبر بن گئے۔

مانڈوی کے قریب تھن نامی گاؤں میں کچھ عرصہ قیام فرمایا۔ وہیں اپنے ایک صاحبزادے کو دین کی اشاعت کے لیے چھوڑا، جیسے چراغ سے چراغ روشن ہوا ہو۔ آج بھی اس نسل کے آثار وہاں موجود ہیں، گویا وقت نے یہ نسبت محفوظ رکھی۔

مگر اصل منزل ابھی پردۂ راز میں تھی۔ مسافر چلتا رہا مگر منزل اپنا نام ظاہر نہ کرتی تھی۔ شاید بعض منزلیں نقشوں میں نہیں ملتیں، اشاروں میں ملتی ہیں۔ سفر کرتے کرتے وہ مقام آیا جہاں آج کلاریا شریف آباد ہے۔ خاموش زمین، سادہ فضا، بظاہر ایک عام مقام--- مگر تقدیر نے اسی مٹی کے سینے میں ایک راز چھپا رکھا تھا۔

حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بغداد سے عطا کردہ وہ صندوق زمین پر رکھا۔ اور پھر جو ہوا، وہ تاریخ سے زیادہ کرامت کا باب ہے---صندوق زمین سے چمٹ گیا۔

یہ محض ایک صندوق کا ٹھہر جانا نہ تھا، منزل کا اعلان تھا۔ گویا زمین نے خود کہہ دیا ہو: "یہی وہ مقام ہے۔" جیسے مٹی نے امانت کو پہچان لیا ہو اور سرزمین نے اپنے مقدر کا چراغ تھام لیا ہو۔

اس لمحے شاید سارے راز منکشف ہو گئے۔ وہی مقام جس کے لیے سرورِ کائنات ﷺ کی بارگاہ سے اشارہ ملا، وہی مقام جس کے لیے غوثِ اعظم نے حکم صادر فرمایا--- اب سامنے تھا۔ مسافر نے منزل نہیں پائی، منزل نے مسافر کو قبول کر لیا۔

یہاں قیام فرمایا اور یہیں وہ آستانہ آباد ہوا جو بعد میں کلاریا شریف کے نام سے نور کی ایک مستقل علامت بن گیا۔ گویا بغداد کی امانت ہندستان کی مٹی میں دفن نہیں ہوئی، شجر بن کر اگ آئی۔ ایک صندوق آیا تھا، مگر اس سے ایک روحانی سلسلہ برآمد ہوا، ایک حکم ملا تھا مگر اس سے ایک خطۂ ہدایت روشن ہو گیا۔

یوں حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہ سفر ہجرت سے بڑھ کر ہدایت کی ایک داستان بن گیا۔ شیراز سے مدینہ، مدینہ سے بغداد، بغداد سے سندھ اور سندھ سے کلاریا--- یہ جغرافیہ نہیں، نور کے سفر کے پڑاؤ تھے۔ ہر مقام ایک باب، ہر توقف ایک اشارہ، ہر قدم ایک تقدیری تحریر۔

اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ صندوق آج بھی صرف ایک صندوق نہیں، ایک رمز ہے--- اس امانت کا رمز جو اولیاء کو سپرد ہوتی ہے، اس

مشن کا استعارہ جو غیب سے ملتا ہے اور اس حقیقت کی شہادت کہ بعض مسافر اپنے قدموں سے نہیں چلتے......انہیں مشیت چلاتی ہے۔

شاید یہی وہ لمحہ تھا جب امانتِ غوثیت نے سفر کی صورت بدل دی۔ اب یہ ہجرت کسی ایک درویش کی ذاتی منزل کی تلاش نہ رہی بلکہ ایک ایسی سرزمین کی طرف پیش قدمی بن گئی جو مدتوں سے کسی مردِ حق کی منتظر تھی۔ چنانچہ جب قدم کلاریا شریف کی خاک تک پہنچے تو یوں محسوس ہوا جیسے تقدیر اپنے لکھے ہوئے باب کو حقیقت کے قالب میں ڈھالنے جا رہی ہو۔ گویا سفر اپنی ظاہری منزل تک پہنچ چکا تھا مگر اصل مرحلہ اب شروع ہونے والا تھا۔ کیونکہ بعض ہجرتیں آرام کے لیے نہیں ہوتیں، وہ زمانوں کے باطل سے ٹکرانے کے لیے مقدر کی جاتی ہیں۔

بعض سرزمینیں فتح سے پہلے تطہیر مانگتی ہیں اور بعض معرکے تلواروں سے پہلے ارادوں میں جیتے جاتے ہیں۔ کلاریا شریف کی سرزمین پر حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی آمد بھی محض ایک قیام نہ تھا، گویا حق اور باطل کے ایک ایسے معرکے کی تمہید تھی جسے تقدیر صدیوں سے لکھ رہی تھی۔ جس مقام پر صندوق زمین سے چمٹ گیا تھا، وہ کوئی خموش بیابان نہ تھا، وہ شرک کے غرور کا گڑھ تھا، بت پرستی کا مرکز، جادو اور جبر کا آستانہ، جہاں ایک وسیع و عریض مندر کے صحن میں باطل اپنی قوت پر نازاں کھڑا تھا۔

کہا جاتا ہے وہاں روزانہ ایک مسلمان ذبح کرکے چڑھایا جاتا، گویا ظلم نے مذہب کا لبادہ پہن رکھا تھا۔ مگر تاریخ نے کئی بار دیکھا ہے کہ جب باطل اپنے عروج پر پہنچتا ہے تو حق کے قدم بھی نزدیک آ جاتے ہیں۔

جب آپ کے رفقا نے عرض کیا: ''یہ سراسر کفار کا علاقہ ہے، یہاں ایک بھی مسلمان نہیں''، تو حضرت نے سکون بھرے لہجے میں فرمایا: ''ہمیں تو رسول اللہ ﷺ کے حکم سے یہاں آنا ہوا ہے، غوثِ پاک نے امانت عطا فرمائی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوگی وہی ہوگا۔ ہم یہاں آرام کے لیے نہیں، اسلام پھیلانے کے لیے آئے ہیں۔''

یہ جواب نہیں تھا، گویا توکل نے کلام کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ساتھ پیر و مرشد حضرت سید شاہ جمال الدین محمد قادری بھی تھے--- جن کا مزار آج بھی کلاریا شریف میں نور بکھیرتا ہے--- اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہی قافلے میں ارادت بھی ہے، قیادت بھی، نسبت بھی ہے اور نصرت بھی۔

صبح ہوئی تو ایک عجیب منظر تھا۔ تلوار نہیں اٹھی، پہلے قلم اٹھا۔ حضرت نے سنسکرت زبان میں خط تحریر فرمایا۔ یہ بھی کیسا رمز ہے کہ دعوت کا آغاز ان ہی کی زبان میں ہوا، جنہیں چیلنج دیا جا رہا تھا۔ خط پجاری کے ہاتھ جاگبائی تک پہنچا۔ مضمون مختصر مگر برق آسا تھا:

''یہ سب بند کرو۔ مسلمانوں کی قربانی چھوڑ دو، ورنہ انجام اچھا نہ ہوگا۔'' جاگبائی نے پڑھا تو غضب سے دہک اٹھی: ''یہ فقیر اپنی موت کھینچ کر یہاں آیا ہے!''

مگر اولیاء کے یہاں جواب کبھی جلدی نہیں آتا، اثر آتا ہے۔

حضرت مسکرائے اور فرمایا: ''میں خود اس کا بندوبست کرلوں گا۔''

پھر وہ واقعہ پیش آیا جو افسانہ نہیں، کرامت کی زبان ہے۔ آپ نے اپنی چکھڑی (کھڑاون) سے فرمایا: ''جا، سب کی خبر لے آ!''

اور اسے فضا میں اچھال دیا۔ یہ کھڑاون نہ تھی، گویا امر کا ایک پرتو تھا۔ وہ سیدھی جاگبائی کے سر پر پہنچی، کئی ضربیں لگائیں، پھر گرداب کی طرح گھومتی ہوئی سب کے سروں پر برسی، حتیٰ کہ پجاری بھی نہ بچا۔ ہر ضرب گویا غرور کے ماتھے پر پڑ رہی تھی۔ پھر وہ پلٹ کر قدموں میں آگری۔ حضرت نے پوچھا: ''کیا سب کا حساب ہوگیا؟''

اور جب ایک شخص باقی نکلا تو دوبارہ اڑی، اس کے سر پر بھی ضرب لگائی، پھر واپس آگئی۔ یہ منظر دیکھ کر جاگبائی پر ہیبت طاری ہوئی: ''جب ان کی چکھڑی میں اتنا اثر ہے، تو خود ان میں کتنا اثر ہوگا!'' یہ اقرار شکست کی پہلی آہٹ تھی مگر غرور ابھی باقی تھا۔

حضرت نے صلح کی پیشکش کی۔ شرط ایک ہی تھی--- اسلام قبول کرلو۔ مگر باطل نے ہمیشہ پہلے انکار کیا ہے۔ جنگ کا اعلان ہوا۔ ایک طرف ہزاروں کا ہجوم، دوسری طرف کل تریسٹھ نفوس ان میں عورتیں بھی اور لڑنے کے قابل صرف سینتیس۔ مگر تعداد کبھی نصرت کا پیمانہ نہیں رہی۔ بدر کی زمین بھی یہی کہتی ہے۔

دوسرا خط بھیجا گیا۔ جواب آیا: ''اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو یہاں

سے چلے جاؤ ورنہ موت کے لیے تیار رہو!''

حضرت خود گئے، دعوت دی، سمجھایا مگر گستاخی بڑھی۔ خلیفۂ باصفا حضرت یعقوب سومرا نے عرض کیا: ''اجازت دیں تو اسے قتل کر دوں۔'' فرمایا: ''نہیں، ابھی اسے سمجھانا ہے۔''

یہ اولیاء کا اسلوب ہے تلوار سے پہلے ہدایت۔ اسی اثنا میں پجاری نے تیر چلایا۔ مگر نگاہِ ولی اٹھی اور تیر پلٹ کر اسی کے پاؤں میں جا لگا۔ گویا ظلم اپنے ہتھیار سے خود زخمی ہو گیا۔ وہ لرز اٹھا۔ مگر تقدیر نے فیصلہ جنگ میں لکھا تھا۔ اگلی صبح معرکہ برپا ہوا۔ وسائل؟ کچھ نہ تھے۔ مگر جہاں اسباب ختم ہوتے ہیں، وہاں توکل بولتا ہے۔ بانس چیر کر تلوار بنائی گئی۔ دعا سے زرہ بکتر میسر آئی۔ گویا فقر نے خود سپہ گری کا جامہ پہن لیا۔ دشمن نے جادو کے حربے آزمائے۔ منتر، عملیات، سحر کے طلسم۔ مگر نور پر ظلمت کا جادو کب چلتا ہے؟ حضرت نے سب باطل کر دیا۔ جیسے ایک نگاہ نے سحر کی تمام گرہیں کھول دیں۔

پھر جنگ چھڑی---اور ایسی چھڑی کہ تین دن تک گردِ معرکہ آسمان سے باتیں کرتی رہی۔ تلواریں بولتی رہیں، تکبیریں گونجتی رہیں اور باطل کے ایوان لرزتے رہے۔ یہ صرف جنگ نہ تھی، عقیدے کا امتحان تھا۔ سینتیس نفوس ہزاروں پر بھاری پڑے۔ ایک رفیق شہید ہوا---مگر شہادت شکست نہیں، فتح کی مہر ہوتی ہے۔ آخر مندر فتح ہوا، بت پرستی کا مرکز سرنگوں ہوا اور وہ آستانہ جس پر روز ظلم کی قربانی ہوتی تھی، اسلام کی روشنی سے منور ہو گیا۔ پجاری کا نام ونشان مٹ گیا۔ جا گبائی کا غرور خاک ہوا۔ اور وہ مقام جہاں کبھی بتوں کے سامنے سجدے تھے، وہاں توحید کا پرچم لہرانے لگا۔ یوں محسوس ہوتا ہے یہ مندر پر قبضہ نہ تھا، ایک سرزمین کا غسلِ تطہیر تھا۔ گویا صندوق جو بغداد سے آیا تھا، اسی دن کھلا۔ اس میں لکڑی یا دھات نہیں، نصرت کی امانت تھی۔ اور کلاریا شریف کی مٹی نے دیکھا کہ ایک فقیر، ترسیٹھ ساتھیوں کے ساتھ، ہزاروں پر غالب آ گیا---کیونکہ وہ تنہا نہ تھا۔ اس کے ساتھ حکمِ رسول ﷺ تھا، غوثِ پاک کی دعا تھی، اور ربِّ ذوالجلال کی نصرت تھی۔ اور جب غبارِ معرکہ بیٹھا تو یہ واضح ہو چکا تھا کہ کلاریا شریف میں صرف ایک گروہ کی شکست یا فتح کا واقعہ پیش نہیں آیا، بلکہ تاریخ نے ایک بار پھر یہ منظر دیکھا کہ جب ولایت میدان میں اترتی ہے تو تعداد نہیں، تعلقِ الٰہی فیصلہ کرتا ہے۔ اسی لیے اس فتح کی بازگشت محض ایک جنگ کی یاد نہیں بنی بلکہ یقین، نصرت اور غلبۂ حق کی دائمی علامت بن گئی۔

تاریخ کے اوراق پر بعض فتوحات سلطنتیں لکھتی ہیں، بعض فتوحات ولایت لکھتی ہے۔ یہ دوسری قسم کی فتح تھی---جہاں تلوار سے زیادہ یقین نے کام کیا اور معرکہ زمین پر نہیں، پہلے دلوں میں جیتا گیا۔ آج بھی کلاریا شریف کی ہوا میں شاید وہ صدا گونجتی ہے کہ باطل جتنا بھی مستحکم ہو، جب حق قدم رکھتا ہے، مندر بھی محراب بن جاتے۔

کلاریا شریف کی بنیاد--ایک بستی نہیں، ایک دعا کا ظہور

جب معرکۂ حق اپنے انجام کو پہنچا، بتوں کے سائے مٹ گئے اور باطل کے ایوان سرنگوں ہوئے، تو یوں محسوس ہوا جیسے اس سرزمین نے ایک طویل خواب سے آنکھ کھولی ہو۔ جس مٹی پر کبھی ظلم کے قدم پڑتے تھے، وہی اب نور کی امانت سنبھالنے کو آمادہ تھی۔ حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس مقام کو محض فتح نہیں کیا، اسے تطہیر بخشی اور پھر اسی تطہیر کے بطن سے ایک بستی نے جنم لیا-- کلاریا شریف۔

یہ بستی اینٹ اور مٹی سے کم، دعا اور ارادے سے زیادہ آباد ہوئی۔ جہاں بغداد شریف سے عطا کردہ صندوق زمین سے چمٹ گیا تھا، وہ مقام ایک راز کی مانند محفوظ کر لیا گیا۔ حضرت نے فرمایا تھا: منزل خود بتائے گی کہاں ٹھہرنا ہے---اور اب زمین خود گواہ بن چکی تھی کہ یہی مقام مراد ہے۔

وہ صندوق جسے غوثِ پاک کے دربار سے امانت کے طور پر پایا گیا تھا، اس پر ایک عمارت تعمیر کی گئی۔ گویا امانت پر عمارت نہیں، نسبت پر بنیاد رکھی گئی۔ اس کے سامنے مدرسہ قائم ہوا اور پھر مسجد کی بنیاد پڑی، یوں ایک صندوق سے بستی نکلی، بستی سے ادارہ، ادارے سے روایت، اور روایت سے ایک روشن سلسلہ۔ جہاں صندوق زمین سے چمٹا تھا، وہ مقام آج بھی بڑے پیر کی ڈیلی" کہلاتا ہے۔ اس نام میں فقط ایک نشان دہی نہیں، ایک روحانی تاریخ محفوظ ہے۔

حضرت نے وصیت فرمائی: ''اس مقام کو پاک و صاف رکھنا، میرے بعد یہاں قبر نہ بنانا، نہ اسے مزار کی صورت دینا۔''

یہ کیسا عرفان تھا کہ جہاں لوگ اپنے آثار باقی رکھتے ہیں، وہاں انہوں نے اپنی نفی کی وصیت فرمائی۔ گویا تعلیم دی کہ اصل نسبت مقام سے نہیں، پیغام سے ہے۔ اور ان کی اولاد نے آج تک یہ وصیت اسی وفا سے قائم رکھی، جیسے امانت سینے سے لگائے ہوئے ہو۔

دار العلوم قادریہ شیرازیہ۔۔ جہاں علم سانس لیتا تھا

پھر اس بستی میں صرف آبادی نہ بڑھی، ایک تہذیب پروان چڑھی۔ حضرت نے یہاں ایک عظیم دینی ادارہ قائم فرمایا۔۔ دار العلوم قادریہ شیرازیہ۔ یہ محض مدرسہ نہ تھا، گویا علم اور سلوک کا ایسا گلشن تھا جہاں فقہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی اور دل بھی سنوارے جاتے تھے۔

حضرت خود درس دیتے۔ ان کے فرزندِ اکبر، حضرت محمد قاسم (کاموشاہ) قادری ولی کامل اور چار خلفا تدریس کے چراغ روشن رکھتے۔ مدرسے کے صحن میں صرف سبق نہ ہوتا، بصیرت اترتی تھی۔ فقہ کے مباحث، حدیث کے انوار، تفسیر کے نکات۔۔ سب گویا ایک زندہ روایت کے تسلسل تھے۔

اور یہ کیسی جامع تربیت تھی کہ یہاں قلم کے ساتھ شمشیر بھی تھی۔ تیر اندازی سکھائی جاتی، گھڑسواری سکھائی جاتی، جسمانی تربیت دی جاتی۔ گویا یہ ادارہ صرف عالم نہیں بناتا تھا، مجاہدِ نفس بھی بناتا تھا۔ علم کو عمل سے اور روحانیت کو قوت سے جوڑ دینا۔۔ یہی اس مدرسے کی امتیازی شان تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں محراب اور میدان، دونوں ایک ہی تربیت کے دو رخ ہیں۔ مگر حضرت کی سب سے بڑی تعلیم شاید کتابوں میں نہیں، ان کے اخلاق میں تھی۔ آپ نہایت خموش مزاج، نرم خو، منکسر المزاج تھے۔ ان کے پاس آنے والا خالی واپس نہ جاتا۔۔ کوئی عزت پا کر جاتا، کوئی دعا لے کر، کوئی سکون لے کر۔

کہتے ہیں جو بھی آتا، آپ خود اسے پانی پیش کرتے۔ مہمان کے لیے کھانا میسر ہو جاتا اور وہ اس محبت سے ملتا جیسے برسوں سے شناسا ہو۔ گفتگو میں سکون، لہجے میں شفقت اور نگاہ میں وہ وقار جس میں محبت بھی ہو اور تربیت بھی۔

آپ نے کبھی غصے سے جواب نہ دیا۔ ہمیشہ فرماتے: ''اللہ تعالیٰ کو نرمی پسند ہے، لہٰذا نرمی اختیار کرو۔'' یہ جملہ محض نصیحت نہ تھا، ان کی پوری زندگی کا خلاصہ تھا۔

شریعت کا کامل التزام

آپ کی شخصیت میں سلوک تھا مگر شریعت سے جدا نہیں بلکہ شریعت ہی ان کی روحانی عظمت کی بنیاد تھی۔ کھانے میں، پینے میں، سونے میں، جاگنے میں، اٹھنے بیٹھنے میں، گفتگو میں۔۔ ہر پہلو میں سنّت کی پابندی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آپ کا ہر عمل خاموش درود ہو۔ آپ کے یہاں ولایت شریعت سے نکلتی تھی، شریعت پر غالب نہیں آتی تھی۔ اور شاید یہی اولیاء کی اصل پہچان ہے۔

ذاتی اوصاف۔۔۔ پیدائشی ولی کی خاموش شان

کہتے ہیں بعض نفوس بچپن ہی سے الگ دکھائی دیتے ہیں۔ حضرت بھی انہی میں سے تھے۔ کھیل کود سے دل نہ لگا، ابتدا ہی سے عبادت میں انہماک رہا۔ گویا بچپن ہی میں روح نے اپنی سمت پہچان لی تھی۔ آپ پیدائشی ولی تھے۔ اور پچیس حج! یہ تعداد فقط سفر کی نہیں، شوق کی شہادت ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے حرم بار بار انہیں بلاتا رہا اور وہ لبیک کہتے رہے۔ خوش شکل، متناسب جسم، دبلا مگر وجیہہ سراپا وجیہہ، چہرے پر نور، رفتار میں وقار، اور خموشی میں کشش۔ آپ کا لباس بھی شخصیت کی طرح متوازن تھا۔ سادہ کرتا۔ گھٹنوں تک شیروانی۔ کبھی لمبا جبہ۔ عمامۂ شیرازی۔ سیاہی مائل چاکلیٹی رنگ، جیسے مشرقی وقار کا نشان۔ سفید سبز جوتے۔ ایرانی موزے۔۔ موجڑی کی سی نفاست۔ اور تلوار۔۔ جیسے زہد کے ساتھ عزیمت بھی ہمراہ ہو۔

یہ لباس نمود کا نہ تھا، نسبت کا تھا۔ اس میں فقر بھی تھا، شان بھی۔ زندگی نہایت سادہ بسر فرماتے۔ کھانے پینے میں سخت احتیاط۔ کم خوراک، پاکیزہ مزاج اور قناعت گویا طبیعت میں گھلی ہوئی۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا ان کے ہاتھ میں تھی، دل میں نہیں۔ اور پھر وقت گذرتا گیا مگر کلاریا فقط ایک بستی نہ رہی، ایک روایت بن گئی۔ ایک صندوق سے شروع ہونے والی داستان مدرسے، مسجد، تربیت، اخلاق اور

روحانی مرکز کی صورت اختیار کر گئی۔

آج بھی اگر اس سرزمین کی مٹی کو کان لگا کر سنا جائے تو شاید وہ کہتی ہو- یہاں ایک فقیر آیا تھا، جو جنگ بھی جیتا، دل بھی جیتا، جس نے مندر کو مسجد بنایا اور مٹی کو مدرسہ۔ یہاں ایک ولی نے بستی نہیں بسائی---ایک دعا آباد کی تھی۔صدیوں پہلے اتری ہوئی بشارت جب کلاریا میں مستقبل نے آواز دی ۔تاریخ کے بعض صفحات صرف حادثات کی روداد نہیں ہوتے، وہ وقت کی پیشانی پر ابھرنے والے ایسے الہامی اشارے ہوتے ہیں جن میں آنے والے زمانوں کی دھندلی صدائیں بھی سنائی دیتی ہیں-ان میں بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں جہاں وقت اپنی رفتار روک دیتا ہے، حال کے دریچے سے مستقبل جھانکتا ہے اور اولیاء کی زبان پر وہ کلمات آتے ہیں جو بعد میں تاریخ کی تعبیر بن جاتے ہیں۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں پیش گوئی خبر نہیں رہتی، کرامت بن جاتی ہے اور کرامت محض خرقِ عادت نہیں، مشیتِ الٰہی کے کسی سربستہ راز کا انکشاف بن جاتی ہے۔

کلاریا شریف کی درسگاہ میں بھی ایک ایسا ہی لمحہ اترا تھا--ایک ایسا لمحہ جس میں ایک صدی نہیں، ڈیڑھ صدی سے زیادہ کا فاصلہ سمٹ آیا تھا اور ایک آنے والے مجدد کی بشارت زمانے کے پردوں سے جھانکنے لگی تھی۔

ایک دن جب درس مکاشفہ بن گیا۔حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ طلبہ کو درس دے رہے تھے۔ ماحول علم کی سنجیدگی سے معمور تھا۔ الفاظ رواں تھے، معانی منکشف ہو رہے تھے اور دارالعلوم قادریہ شیرازیہ کے صحن میں علم گویا سانس لے رہا تھا۔

اچانک......حضرت خاموش ہو گئے۔

یہ خموشی معمول کی خموشی نہ تھی۔جیسے کسی باطنی استغراق نے ظاہری گفتگو کو تھام لیا ہو۔آپ بیٹھ گئے۔تین مرتبہ زور سے سانس لی۔فضا پر سکوت چھا گیا۔طلبہ دم بخود۔ پھر آپ نے دونوں ہاتھ بغل میں ڈال لیے--گویا کسی غیبی واردات کا بوجھ سینے میں سمٹ آیا ہو۔

کچھ دیر بعد لب متحرک ہوئے--''سبحان اللہ......الحمدللہ...... اللہ اکبر......''

یہ تسبیح نہ تھی، گویا مکاشفے کے در وا ہو رہے تھے۔ پھر آپ نے طلبہ کو مخاطب فرمایا: ''سنو!'' یہ ایک لفظ نہ تھا، جیسے وقت نے خود کان لگا دیے ہوں۔ جب مستقبل کا پردہ اٹھا

فرمایا: ''اس وقت مجھے ایک ایسے مجدد کے بارے میں بتایا گیا ہے، جس کا ایک نمونہ بیان کرتا ہوں......''

یہاں سے کلام خبر نہ رہا، بشارت بن گیا۔ ''چودہویں صدی ہجری میں ایک ایسا فتنہ اٹھے گا کہ رسالت و نبوت کا انکار کیا جائے گا......ایک ایسا فتنہ جو اندھیرا پھیلائے گا، ماحول کو آلودہ کرے گا، دلوں کو گمراہی کی طرف مائل کرے گا......''

یوں لگتا تھا جیسے حضرت صرف بیان نہیں فرما رہے، صدیوں بعد پیش آنے والا منظر دیکھ رہے ہوں۔

پھر فرمایا: ''اس وقت احمد نام کا ایک شخص اس کا مقابلہ کرے گا......'' احمد! یہ ایک نام تھا مگر گویا آنے والے مجدد کا پرچم۔ ''وہ اس فتنے کو سختی سے دبائے گا......زبردست قلمی جہاد کرے گا......اور فتح اسی کی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اسے بڑی مدد ملے گی۔'' یہ الفاظ نہیں، آنے والی صدائے حق کی تمہیدی کلمات تھے۔قلم کا مجاہد......عشق کا امام حضرت نے اس مجدد کی صفات بیان فرمائیں: ''وہ مذہب اسلام کے لیے اخلاص سے کام کرے گا...... اہلِ بیت کی بے حد تعظیم کرے گا...... بے خوف ہوگا...... صاحبِ شریعت ہوگا...... آخری سانس تک اسلام کی خدمت کرے گا...... ولایت اور تجدید کے بلند مقام پر فائز ہوگا۔''

گویا ایک شخصیت نہیں، ایک پورا مرقع کھینچا جا رہا تھا۔

پھر فرمایا: ''میری اولاد، میرے مرید، میرے ماننے والے-- اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا، اسے عقیدت سے ماننا، کیونکہ وہ جو راستہ دکھائے گا، وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا راستہ ہوگا......صحابہ، تابعین، تبع تابعین، اولیاء اور مجددین کا راستہ ہوگا۔''

یہ فقط وصیت نہ تھی--سلسلے کے لیے آئندہ کی ہدایت کی ایک مربوط دستاویز تھی۔ اور پھر وہ جملہ......جس میں شفقت بھی تھی، جلال بھی: ''اگر میری اولاد اور میرے مریدوں نے اس بات پر توجہ نہ دی،

تو قیامت کے دن میں ان کا دامن پکڑوں گا۔‘‘

یہ اعلان نہیں، روحانی ذمہ داری کی مہر تھی۔ یہ پیش گوئی تھی یا آنے والے مجدد کا تعارف؟ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ولادت سے تقریباً 170 سال پہلے یہ بشارت دی گئی۔ صدیوں پہلے...... نام بھی بتایا گیا: احمد مقام بھی بتایا گیا: مجدد کام بھی بتایا گیا: فتنہ شکنی، قلمی جہاد۔ منہج بھی بتایا گیا: مذہب اہل سنّت۔ یہ محض پیش گوئی نہیں لگتی ۔۔ جیسے مستقبل کی دستاویز ہو۔

حضرت کے فرزندِ اکبر حضرت سید محمد قاسم کا موشاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے سیرتِ شیرازی کے صفحہ 35 پر محفوظ کیا۔ گویا بشارت صرف زبانی نہ رہی، تاریخ کے سپرد کر دی گئی۔ اور پھر صدیوں بعد بشارت جلوہ گر ہوئی پھر وقت نے گردش کی۔ اور چودھویں صدی ہجری میں واقعی ایک فتنہ اٹھا۔ اور پھر...... بریلی سے ایک آفتاب طلوع ہوا۔

احمد رضا۔ جس کے قلم نے واقعی فتنوں کے قلعے ہلا دیے۔ جس نے عشقِ رسول ﷺ کو عقیدہ بنایا اور عقیدے کو استدلال۔ جس نے قلم کو تلوار اور تلوار کو دلیل بنا دیا۔ یوں لگا جیسے کلاریا کی وہ بشارت بریلی میں مجسم ہو گئی ہو۔ حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی کی صدیوں پرانی صدا، امام احمد رضا کی شخصیت میں تعبیر بن کر ابھری۔ گویا پیش گوئی نے خود اپنا مصداق پا لیا۔

کلاریا سے بریلی تک ۔۔ نور کا تسلسل

کیا عجب منظر ہے! ایک طرف کلاریا کی درسگاہ...... دوسری طرف بریلی کا فکری افق...... ایک طرف پیش گوئی...... دوسری طرف اس کی تعبیر...... ایک طرف بشارت...... دوسری طرف مجدد۔ یہ دو الگ واقعات نہیں، ایک ہی نور کے دو مظاہر محسوس ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے غوثی نسبت کے ایک چراغ نے صدیوں پہلے دوسرے چراغ کی آمد پر روشنی ڈال دی ہو۔

اولیاء اور علمِ غیب کی عطا

یہاں سوال پیدا نہیں ہوتا، ایمان بیدار ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ والے خود سے نہیں کہتے ۔۔ انہیں بتایا جاتا ہے۔ انہیں غیب ذاتی نہیں، عطائی طور پر معلوم ہوتا ہے اور یہی وہ عطا ہے جس کی جھلک ایسی پیش گوئیوں میں نظر آتی ہے۔ یہ کرامت اس حقیقت کی روشن مثال ہے کہ اولیاء صرف حال کے نگہبان نہیں ہوتے، کبھی کبھی مستقبل کے امین بھی ہوتے ہیں۔

یہ صرف پیش گوئی نہ تھی...... ایک امانت تھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ 4 ربیع الاول شریف کا وہ درس، درس نہ تھا، ایک روحانی منشور تھا۔

حضرت کا وہ سکوت، سکوت نہ تھا، مکاشفے کی ایک نورانی دہلیز تھی۔ وہ تین سانسیں، شاید زمانے کے پردے ہٹنے کی آہٹ تھیں۔ اور ’’سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر‘‘ شاید اس نورانی انکشاف پر شکر کے کلمات۔ پھر احمد نام کے مجدد کی خبر...... کیا یہ محض پیش گوئی تھی؟ یا آنے والے عہد کے لیے ایک روشن امانت؟ شاید دونوں۔ اور اسی لیے آج بھی جب یہ روایت پڑھی جاتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کلاریا کی درسگاہ سے وہ صدا اب بھی آ رہی ہو۔

ایک احمد آئے گا...... فتنوں کو دبائے گا...... قلم سے جہاد کرے گا...... اور حق کا پرچم بلند کرے گا...... اور تاریخ گواہ ہے...... وہ احمد آیا...... اس نے فتنے دبایا...... اور اہل سنّت کا ڈنکا بجا دیا...... یہی بشارت تھی...... یہی کرامت تھی...... یہی مجدد کی آمد کا صدیوں پہلے لکھا ہوا مقدمہ تھا۔ جب جادو سجدہ ریز ہوا...... کرامت، دعوت اور ولایت کی ایک روشن حکایت۔ اولیاء کی زندگی میں بعض واقعات محض حکایت نہیں ہوتے، معرفت کے دروازے ہوتے ہیں۔ ان میں کرامت صرف حیرت پیدا کرنے کے لیے نہیں ہوتی، ہدایت کا راستہ کھولنے کے لیے ہوتی ہے۔ جہاں بعض لوگ کرامت کو محض خرقِ عادت سمجھ کر ٹھہر جاتے ہیں، اہلِ نظر جانتے ہیں کہ کرامت کا اصل جوہر کسی غیر معمولی تصرف میں نہیں، بندے کو خدا کی طرف موڑ دینے میں ہے۔ اگر ایک کرامت کسی دل کو بدل دے تو وہ ہزار ظاہری عجائبات سے بڑھ کر ہے۔ حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی زندگی میں ایسے واقعات اسی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔

وہ محض ایک رسمی ملاقات، جب ایک جادوگر تقدیر سے ٹکرا گیا

تبلیغِ دین کے سلسلے میں ایک سفر تھا۔ راستے خموش، فضا پرسکوت اور قافلۂ حق اپنی سمت رواں۔ اسی دوران ایک جادوگر سے ملاقات ہوئی۔ مگر یہ کوئی معمولی ملاقات نہ تھی، جیسے دو انسان نہیں، دو جہان آمنے سامنے آگئے ہوں، ایک طرف سحر کا غرور، دوسری طرف ولایت کا نور۔ حضرت کا چہرۂ مبارک جلال لیے ہوئے تھا۔ ایسا جلال جس میں ہیبت بھی تھی اور کشش بھی۔ دیکھنے والا مرعوب ہو جاتا۔ جادوگر نے اپنے فن کے ذریعے بھانپ لیا کہ یہ کوئی عام مسافر نہیں، مسلمانوں کی کوئی بلند مرتبہ ہستی ہے۔

وہ ادب سے قریب آیا۔ قدم بوسی کی۔ عرض کیا: ''اے مسلمانوں کے مذہبی پیشوا! کیا آپ یہاں اسلام کی تبلیغ کے لیے آئے ہیں؟'' فرمایا: ''ہاں۔'' اس نے کہا: ''آپ مسلمانوں کے بڑے پیشوا معلوم ہوتے ہیں۔'' حضرت نے نہایت انکسار سے فرمایا: ''مسلمان مجھے اسی طرح سمجھتے ہیں۔''

یہ جواب بھی کیسا تھا۔۔۔۔۔۔عظمت کے ساتھ انکسار، جلال کے ساتھ تواضع۔ پھر گفتگو شروع ہوئی......اور یہی گفتگو کرامت بن گئی۔ وہ کرامت جو گفتگو کے دوران رونما ہوئی۔ ابھی چند لمحے گذرے تھے کہ جادوگر کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اس کا باطن لرز گیا۔ اس نے حیرت سے کہا: ''اے مسلمانوں کے پیشوا! آپ نے میرے ساتھ کیا کیا؟'' فرمایا: ''کیا ہوا؟'' وہ بولا: ''آپ سے بات کرتے کرتے میرا سارا جادو ختم ہو گیا!'' یہاں نہ کوئی ہاتھ اٹھا، نہ کوئی ظاہری کرامت کا اظہار ہوا، نہ کوئی زوردار تصرف ہوا۔۔۔۔۔صرف صحبت ہوئی اور سحر باطل ہو گیا۔

یہی تو ولایت ہے۔ نور آیا، ظلمت ہٹ گئی۔ حضرت نے فرمایا: ''اے جادوگر! ایسا علم کس کام کا جو ایک فقیر سے بات کرنے پر ہی ختم ہو جائے؟ ایسا علم حاصل کرو جو قیامت تک تمہارے اور تمہاری اولاد کے کام آئے بلکہ مرنے کے بعد بھی نفع دے۔''

یہ نصیحت نہیں، روح کے دروازے پر دستک تھی۔ یہاں کرامت نے دعوت کا ہاتھ تھام لیا۔ جادوگر بولا: ''آپ نے میرا ذریعۂ معاش ختم کر دیا۔ میں نے یہ جادو اسی لیے سیکھا تھا کہ اپنی اور اپنی اولاد کی روزی چلا سکوں۔ اب کیا ہوگا؟''

حضرت نے فرمایا: ''کیا تمہیں خدا کی قدرت پر بھروسا نہیں؟ وہی زندہ رکھتا ہے، وہی موت دیتا ہے، وہی رزق دیتا ہے۔''

یہاں کرامت ختم نہیں ہوئی، اصل کرامت تو اب شروع ہوئی۔۔دل کا بدل جانا۔

پھر حضرت نے اسلام کے بارے میں ایسی حکیمانہ تعلیم دی کہ جو شخص پہلے اسلام سے نفرت رکھتا تھا، وہی اس کی طرف مائل ہونے لگا۔ نفرت قربت میں بدلی، قربت محبت میں اور محبت ایمان میں۔

بالآخر وہ مسلمان ہو گیا۔ حضرت کے دستِ اقدس پر اسلام قبول کیا۔ جیوا......عبدالخالق بن گیا۔ اور اس کی بیوی...... فاطمہ بائی۔ نام بدلا، تقدیر بدل گئی۔ مگر قصہ یہاں ختم نہیں ہوتا۔ حضرت نے اس پر خاص توجہ فرمائی، تربیت دی، صحبت دی۔ اور وہی شخص، جو کبھی سحر کا اسیر تھا، ولایت کے مقام تک پہنچ گیا۔ یہ ہے اولیاء کی اصل کرامت۔ مردوں کو زندہ کرنا نہیں......مردہ دلوں کو زندہ کرنا۔ باطل کو مٹانا نہیں......حق سے بدل دینا۔ یہ ایک جادوگر کا مسلمان ہونا نہ تھا، ایک روح کا دوبارہ پیدا ہونا تھا۔ اللہ والوں کی شان۔ واقعی......اللہ والوں کی شان کتنی نرالی ہوتی ہے۔ جہاں کرامت کے اظہار کی ضرورت ہو، وہاں تصرف فرماتے ہیں۔

جہاں نصیحت مطلوب ہو، وہاں حکمت سے دل بدل دیتے ہیں۔ کبھی کھڑاون سے غرور توڑتے ہیں، کبھی ایک گفتگو سے جادو باطل کر دیتے ہیں، کبھی جنگ کرتے ہیں، کبھی دل فتح کرتے ہیں اور اکثر......دل کی فتح کو ترجیح دیتے ہیں۔

بڑے بڑے جادوگر ان کے ہاتھ پر تائب ہوئے، کیونکہ نور کے سامنے سحر کب ٹھہرتا ہے؟

کرامت کیا ہے؟۔۔۔ایک علمی توضیح

یہاں ایک اہم علمی نکتہ سمجھنا ضروری ہے۔
بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ کرامت ہی ولایت کی پہچان ہے۔

یہ گمان فاسد ہے۔ ولایت کی اصل پہچان کرامت نہیں ۔۔استقامت علی الشریعت ہے۔

مشہور قول ہے:"الاستقامة فوق الكرامة"

استقامت، کرامت سے بلند ہے۔کوئی شخص ہوا میں اڑے، پانی پر چلے یا عجیب تصرفات دکھائے ۔۔اس سے ولایت ثابت نہیں ہوتی۔ولی وہ ہے جو شریعت پر قائم ہو......اتباعِ سنّت میں کامل ہو......اخلاق میں نبی کریم ﷺ کے نقشِ قدم پر ہو......کرامت اس کی دلیل نہیں، کبھی عطیہ ہے......اصل معیار تقویٰ ہے۔

معجزہ، کرامت اور استدراج میں فرق ہے۔

معجزہ: انبیاء سے ظاہر ہوتا ہے۔دعویِ نبوت کی تصدیق کے لیے۔جیسے عصائے موسیٰ، شق القمر۔یہ تحدّی کے ساتھ ہوتا ہے۔

کرامت: اولیاء سے ظاہر ہوتی ہے۔دعوے کے لیے نہیں، عطیات کے طور پر۔ولی خود اسے اپنی عظمت نہیں سمجھتا۔بلکہ اکثر چھپاتا ہے۔

استدراج: یہ بہت نازک باب ہے۔کسی فاسق یا گمراہ کے ہاتھ پر بھی خارقِ عادت چیزیں ظاہر ہو سکتی ہیں۔مگر وہ کرامت نہیں، استدراج ہوتی ہیں۔یعنی ڈھیل......آزمائش......دھوکا۔

قرآن کا مفہوم ہے:''ہم انہیں ڈھیل دیتے ہیں، جہاں سے انہیں گمان بھی نہیں۔''یہ فرق نہ سمجھایا جائے تو لوگ ہر عجیب چیز کو ولایت سمجھ بیٹھتے ہیں۔

حالانکہ معیار یہ ہے: شریعت کے موافق ہو؟ تقویٰ ہو؟ اتباعِ سنّت ہو؟ تو کرامت معتبر۔ورنہ دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔اور دراصل ہر کرامت بھی اللہ کی قدرت ہی کا مظہر ہے۔ولی کچھ نہیں کرتا۔اللہ کرتا ہے۔ولی فقط مظہر بنتا ہے۔کرامت ولی کی نہیں۔قدرتِ الٰہی کی جلوہ گری ہے۔اسی لیے اولیاء کرامت کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتے۔وہ کہتے ہیں:''یہ سب اس کا فضل ہے۔''

حضرت شیرازی کی کرامتوں کا راز۔حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کرامتوں میں یہی رنگ نمایاں ہے۔

جہاں ضرورت ہو اظہار۔جہاں مصلحت ہو اخفا۔جہاں جلال چاہیے وہاں جلال۔جہاں جمال چاہیے وہاں جمال۔اور سب سے بڑی کرامت؟ دل بدل دینا۔جیوا کو عبد الخالق بنا دینا۔یہی اصل ولایت ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے اس واقعے میں ایک جادوگر کا قصہ نہیں، تصوف کی پوری روایت ہم کلام ہو رہی ہے۔سحر آیا......نور کے سامنے پگھل گیا۔غرور آیا......نصیحت میں جھک گیا اور ایک گمراہ......ولی بن گیا۔کبھی کبھی اولیاء کی سب سے بڑی کرامت یہ نہیں ہوتی کہ وہ قوانینِ عادت بدل دیں......بلکہ یہ کہ وہ انسان بدل دیں۔اور یہی حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کرامتوں کا جوہر ہے۔انہوں نے جادو نہیں توڑا......دل کا طلسم توڑا۔اور یہی سب سے بڑی کرامت ہے۔

سبز جھنڈے کا مسافر۔جب ایک فقیر بت خانوں میں اذان لے کر اترا

بعض ہستیاں صرف تبلیغ نہیں کرتیں، ان کی آمد خود دعوت بن جاتی ہے۔وہ جہاں قدم رکھتی ہیں، وہاں راستے بدلتے ہیں، فضائیں بدلتی ہیں اور کبھی کبھی دلوں کے موسم بھی بدل جاتے ہیں۔حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ انہی نفوسِ قدسیہ میں سے تھے، جن کے لیے تبلیغ محض فریضہ نہ تھی، ایک الٰہی امانت تھی۔مدینہ منورہ سے حکم ملا تھا کہ وہاں ضرورت ہے۔۔اور جنہیں بارگاہِ نبوی ﷺ سے اشارہ مل جائے، ان کے قدم پھر توقف نہیں جانتے۔

آپ بت خانوں میں بھی گئے۔۔مگر مناظرے کے شور کے ساتھ نہیں، نورِ یقین کے ساتھ۔وہ جگہیں جہاں بتوں کے سائے تھے، آپ وہاں سبز جھنڈا لے کر داخل ہوتے۔کیا منظر ہوگا! ایک طرف شرک کے معبد، دوسری طرف سبز پرچمِ توحید۔گویا خموش پتھروں کے درمیان کلمے کی صدا اتر رہی ہو اور جب واپس لوٹتے تو اسلام کی سربلندی کا اعلان ساتھ لاتے۔یوں محسوس ہوتا جیسے ہر سفر محض آمد و رفت نہ ہو، ایک فتحِ معنوی ہو۔

گجرات و کاٹھیاواڑ: جہاں تبلیغ نے بستیوں کا مقدر بدلا

خصوصاً گجرات اور کاٹھیاواڑ میں آپ کی دعوت نے عجیب

تاثیر دکھائی۔ بعض مبلغ الفاظ بولتے ہیں، بعض اپنی ذات سے دین دکھاتے ہیں۔ حضرت دوسری قسم کے تھے۔

اوپلیٹا (اپلیٹا) کے کتنے ہی گھرانے آپ کے دستِ حق پرست پر اسلام لائے۔ نسلیں بدل گئیں، نام بدل گئے مگر نسبت باقی رہی۔ آج بھی ان گھروں کے لوگ حضرت کی درگاہ پر حاضر ہو کر فیض لیتے ہیں۔۔۔ گویا ایمان کی وہ پہلی روشنی نسلوں کے چراغوں میں اب بھی جل رہی ہے۔

یہ صرف مذہبی تبدیلی نہ تھی، مقدر کا بدلاؤ تھا۔ یوں لگتا ہے حضرت جہاں جاتے، صرف لوگ مسلمان نہیں ہوتے تھے، زمین بھی مسلمان ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ احمد آباد تشریف لے گئے۔ جامع مسجد میں قیام تھا۔ علماء حاضر ہوئے۔ مگر یہ حاضری بھی محض علمی مجلس نہ تھی، ایک نورانی مکالمہ تھا۔ حضرت نے علماء کی ایسی عزت و تکریم فرمائی کہ گویا علم خود علم کے سامنے مؤدب ہو۔ وہ دراصل حضرت کے شاگرد تھے۔ ایک فقہی اشکال لے کر آئے تھے، مدتوں سے الجھا ہوا مسئلہ۔

حضرت نے مسئلہ دیکھا، نگاہ ڈالی، اور فرمایا: ''یہ مسئلہ ابھی نامکمل ہے، اس میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

یہ جملہ ایسا تھا جیسے گرہ پر ہاتھ پڑ گیا۔ پھر مفصل جواب عطا فرمایا۔ استدلال، بصیرت، فقاہت۔۔ گویا علم اپنے دروازے کھولتا چلا گیا۔ علماء خوشی سے جھوم اٹھے۔

عرض کیا: ''حضرت! ہم مدت سے اس مسئلے میں الجھے ہوئے تھے، آپ کی تشریف آوری سے حل ہو گیا۔''

حضرت نے فرمایا: ''جسے بھی کسی مسئلے میں اشکال ہو، ہمارے پاس آئے، ہم حتی المقدور رہنمائی کریں گے۔''

یہاں بھی دیکھیے: ''میں نے حل کیا'' نہیں فرمایا۔

فرمایا: ''رہنمائی کریں گے۔'' یہی اولیاء کی زبان ہے۔

ان کی گفتگو میں ''میں'' نہیں ہوتا ''ہم'' بھی خدمت کے معنیٰ میں ہوتا ہے۔ تبلیغ صرف زبان سے نہیں، مزاج سے بھی ہوتی ہے۔

حضرت کی دعوت کی تاثیر شاید اسی لیے تھی کہ وہ محض وعظ نہیں کہتے تھے، دین جیتے تھے۔ بت خانوں میں جاتے مگر لہجہ تلوار کا نہیں، حکمت کا ہوتا۔ جادوگر آتے، ولی بن کر جاتے۔ منکر آتے، مرید بن کر جاتے۔ علما آتے، مطمئن ہو کر لوٹتے۔ اور عوام؟ وہ محبت لے کر لوٹتے۔ یہی تبلیغ کی اعلیٰ صورت ہے۔

اگرچہ آپ نرم خو اور منکسر المزاج تھے، مگر نماز کے باب میں گویا ایک اور رنگ جلوہ گر ہو جاتا تھا۔

یہاں محبت میں جلال شامل ہو جاتا۔

فرماتے: ''بے نمازی سے دوستی نہ رکھو۔'' اور یہ محض تنبیہ نہ تھی، ایمان کی غیرت تھی۔ ''حتی المقدور نماز قضا نہ ہونے دو۔''

آپ کے یہاں نماز محض رکن نہ تھی، روح تھی۔ کہتے ہیں اگر کسی آنے والے کی فجر قضا ہو جاتی، حضرت پورا دن اس سے گفتگو نہ فرماتے، مجلس میں بیٹھنے نہ دیتے۔ یہ ناراضی شخص سے نہ تھی...... غفلت سے تھی۔ فرماتے: ''جس کی فجر قضا ہوئی، اس کا پورا دن خراب اور جس کی عشاء قضا ہوئی، اس کی رات خراب۔''

کیا گہرا جملہ ہے...... فقہ بھی، تربیت بھی، روحانیت بھی۔ اور ''بے نمازی کے لیے اللہ تعالیٰ نے سخت عذاب رکھا ہے۔''

یہ وعید نہیں، بیداری ہے۔ یہ بھی کیسی تربیت تھی...... کوئی تعویذ لینے آتا تو فوراً تعویذ نہ دیتے...... پہلے وضو، پھر دو رکعت نفل، پھر تعویذ...... گویا سکھاتے تھے: اصل علاج کاغذ نہیں...... سجدہ ہے۔

یہی اولیاء کا مزاج ہے، وہ سب سے پہلے مسبب کی طرف لے جاتے ہیں۔

شریعت پہلے، کرامت بعد میں...... یہاں ایک نازک نکتہ بھی روشن ہوتا ہے۔ لوگ کرامتوں پر حیران ہوتے ہیں...... مگر اولیاء کی اصل کرامت شریعت پر سخت التزام ہے۔ حضرت نے بت خانے فتح کیے...... مگر فجر کی قضا برداشت نہ کی۔ جادو باطل کیا...... مگر نماز میں رو رعایت نہ کی۔ فقہی اشکال حل کیے...... مگر سجدے کو مرکز رکھا۔ یہی بتاتا ہے کہ ولایت کی بنیاد کشف نہیں، شریعت ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے حضرت کا وہ سبز جھنڈا محض کپڑا نہ تھا...... ایک استعارہ تھا، جہاں لے جاتے، امید لے جاتے، دعوت لے جاتے، رحمت لے جاتے اور

واپسی پر اسلام کی سربلندی کی خبر لاتے۔ گویا ہر سفر سے پہلے جھنڈا اٹھتا تھا اور ہر واپسی پر ایک نیا دل مسلمان ہو چکا ہوتا تھا۔

حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حیات کا یہ باب پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے ایک فقیر نہیں، ایک قافلۂ نور چل رہا ہو...... ہاتھ میں سبز جھنڈا، لبوں پر دعوت، دل میں مدینے کا حکم، قدموں میں غوثی امانت اور نگاہ میں امت کی فکر۔ وہ بت خانوں میں گئے......اور وہاں اذان کی بازگشت چھوڑ آئے۔ وہ جامع مسجد میں بیٹھے......اور فقہ کے دریچے کھول گئے۔ وہ نماز پر بولے......تو جیسے شریعت نے خود زبان پالی۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے صرف لوگوں کو اسلام کی طرف نہیں بلایا---اسلام کو لوگوں کے دلوں میں اتار دیا۔

سادھو سے شاہ دلہ---ایک نظر نے تقدیر بدل دی

بعض واقعات تاریخ میں نہیں، دلوں میں لکھے جاتے ہیں۔ وہ محض حکایات نہیں ہوتے، صحبتِ اولیاء کے اثرات کا زندہ ثبوت ہوتے ہیں۔ ان میں نہ صرف کرامت جھلکتی ہے بلکہ یہ راز بھی منکشف ہوتا ہے کہ اللہ والوں کی نگاہ صرف دیکھتی نہیں، بدل دیتی ہے، صرف اثر نہیں ڈالتی، تقدیر روشن کر دیتی ہے۔

حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حیاتِ طیبہ میں ایسے بے شمار واقعات ہیں مگر سادھو سے شاہ دلہ کی حکایت ان میں ایک عجیب نورانی رنگ رکھتی ہے...... جہاں ایک آغوری جوگی، ایک لمحۂ وجد میں، ایک نظر کے تصرف سے، ولایت کی دہلیز تک پہنچ جاتا ہے۔ حضرت کا حال یہ تھا کہ جب بھی حضور اقدس ﷺ کا اسمِ مبارک لیا جاتا، آپ پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ یہ عشق لفظوں میں نہ تھا، حال میں تھا۔ نامِ محمد ﷺ آتا اور دل گویا اپنے مرکز کی طرف لپک اٹھتا۔

یوں لگتا تھا جیسے مدینے کا ذکر ان کے لیے خبر نہ ہو، حضوری ہو۔

ایک روز کلاریا کے قریب سوڈودر سے آگے روغیل نامی گاؤں کے پاس ایک آغوری سادھو کی جھونپڑی پر قیام ہوا۔ وہ جوگی اپنی دنیا میں مست تھا مگر تقدیر نے اس دن اس کے لیے کچھ اور لکھ رکھا تھا۔

حضرت نے فرمایا: ''میرے لیے پانی لے آؤ۔''

وہ پانی لینے گیا۔ اور اسی دوران کسی نے مدینہ منورہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ بس پھر کیا تھا......حضرت پر فوراً وجد طاری ہو گیا۔ فضا بدل گئی، سکوت نور میں ڈھل گیا اور عاشق اپنے حال میں ڈوب گئے۔ وہ لمحہ جب ایک فقیر کی زبان سے تقدیر بولی۔ سادھو پانی لے کر لوٹا۔

حضرت کو اس حال میں دیکھا، حیران رہ گیا، آواز دی--کوئی جواب نہ آیا۔ کیونکہ اس وقت حضرت زمین پر نہ تھے، عشق کے ایک اور عالم میں تھے۔ اور اسی حالِ وجد میں آپ کی زبان سے الفاظ نکلے:

''میں بھی شاہ، تو بھی شاہ......جا، تو شاہ دلہ شاہ ہے!''

یہ جملہ تھا...... یا تقدیر کا فرمان؟ یہ صدا تھی...... یا روحانی تاج پوشی؟

کلمات نکلے اور ایک سادھو بدل گیا۔ ایک جوگی......شاہ دلہ شاہ بن گیا۔ اہلِ ایمان کی نگاہ تقدیر بدل دیتی ہے۔ یہاں کرامت صرف یہ نہ تھی کہ کلمات نکلے۔ اصل کرامت یہ تھی کہ ایک نظر نے باطن بدل دیا۔ حضرت نے اسے سینے سے لگایا۔ گویا نور کا دریا سینے میں اتر گیا۔ کہتے ہیں اس کا سینہ انوار سے بھر گیا۔ اور اس نے فوراً کلمہ پڑھ لیا۔ اسلام قبول کر لیا۔ یہ تبدیلی بحث سے نہ آئی---صحبت سے آئی۔ یہی تو اہل اللہ کا تصرف ہے۔ جہاں وعظ کام نہ کرے، وہاں نظر کام کرتی ہے۔ باطن بدلا، ظاہر بھی بدل گیا۔ اس کی جٹائیں بہت لمبی تھیں حضرت نے سر پر ہاتھ پھیرا...... بال جھڑ گئے۔ نئے حال کی علامت گویا ظاہر پر بھی ثبت ہو گئی۔ ناخن بڑھے ہوئے تھے حضرت نے ان پر لعاب دہن لگایا---وہ گر گئے۔ صاف نئے ناخن نکل آئے۔ کیا یہ محض ظاہری تبدیلی تھی؟ نہیں--باطن کے انقلاب کا ظاہری استعارہ تھی۔ گویا پرانی زندگی اتر گئی۔ نئی زندگی پہن لی گئی۔ اور نام رکھا گیا---شاہ دلہ۔ اسلام قبول کیا......اور خلافت بھی پائی۔ یہاں قصہ صرف اسلام لانے پر ختم نہیں ہوا۔ حضرت کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور اسی وقت قادریہ شیرازیہ سلسلے کی خلافت عطا ہوئی۔ یہ کیسا مقام! جوگی سے خلیفہ۔ سادھو سے صاحبِ نسبت۔ گمراہی سے ولایت۔ یہی صحبت

کی تاثیر ہے۔ اور پھر شاہ دلہ حضرت کے ساتھ دین کی تبلیغ میں لگ گئے۔ گویا جو کل تک راہ سے باہر تھا، آج دوسروں کو راہ دکھانے والوں میں شامل ہو گیا۔ صحبت نے غلامِ مصطفیٰ ﷺ بنا دیا۔ اسلام کے بعد ان کی زندگی سراسر بدل گئی۔ نماز کے ایسے پابند ہوئے کہ عبادت ان کی پہچان بن گئی۔ حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں ایسے لگے جیسے غلامی کو عزت سمجھ لیا ہو۔ پانچ حج حضرت کے ساتھ ادا کیے۔ پانچ حج! یہ کوئی معمولی نسبت نہیں۔ یہ صحبت کا کمال ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی پوری زندگی آقائے کونین محمد عربی ﷺ کے غلام کی حیثیت سے گذاری۔

یہ جملہ پڑھتے ہوئے دل ٹھہر جاتا ہے۔ کیونکہ یہی تو تصوف کی معراج ہے......غلامی۔ تیس برس کی خدمت...... اور روغیل میں وصال، تیس برس تک اسلام کی خدمت کی، دعوت دی، لوگوں کو جوڑا۔

فیض پھیلایا۔ پھر 14 ربیع الآخر 1104 ہجری کو روغیل میں وصال فرمایا۔ اور آج بھی لوگ انہیں ۔شاہ دلہ شاہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ نام محض لقب نہیں......ایک نظر کی یادگار ہے۔ صحبتِ اولیاء کا اثر۔ یہ سب کیا تھا؟ یہ صحبت کا اثر تھا۔ ایک لمحۂ قربت......اور پوری تقدیر بدل گئی۔ اسی لیے کہا گیا: ''صحبتِ صالح ترا صالح کند۔''

اولیاء کی مجلسیں مدرسے نہیں ہوتیں--کارخانے ہوتے ہیں جہاں دل ڈھلتے ہیں، جہاں انسان بدلتے ہیں، جہاں سادھو شاہ بن جاتے ہیں۔

کرامت کا جوہر کیا ہے؟ بعض لوگ کرامت کو صرف خارقِ عادت واقعات میں دیکھتے ہیں۔ حالانکہ اصل کرامت یہ ہے کہ ایک گمراہ ولی بن جائے۔ یہ واقعہ اسی کی مثال ہے۔ بال جھڑنا کرامت نہیں۔دل بدلنا کرامت ہے۔ ناخن گرنا کرامت نہیں---باطن سنورنا کرامت ہے۔ جوگی کا شاہ دلہ بن جانا--یہ کرامت ہے۔ اولیاء مر کر مٹی میں مل جاتے ہیں؟ بعض کہتے ہیں: اللہ والے مر کر مٹی ہو جاتے ہیں۔ یہ گمان نہیں، محرومی ہے۔ اولیاء مرتے نہیں......ظاہری پردہ فرماتے ہیں۔ روحانی فیض باقی رہتا ہے۔ آج بھی لوگ مزارات پر جاتے ہیں۔ فیض لیتے ہیں، دل بدلتے ہیں، دعائیں قبول ہوتی ہیں اور نسبتیں زندہ رہتی ہیں۔ اگر صحبت حیات میں بدلتی ہے تو وفات کے بعد فیض کیوں منقطع ہو؟

اولیاء کا تعلق جسم سے کم، روح سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور روحانی فیض ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت تک جاری رہتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے یہ سادھو کی حکایت نہیں، ایک نظر کی داستان ہے۔ ایک عاشقِ رسول ﷺ پر وجد طاری ہوا...... ایک سادھو آیا...... ایک جملہ نکلا...... ''میں بھی شاہ، تو بھی شاہ......'' اور تاریخ بدل گئی۔ جوگی......شاہ دلہ بن گیا۔ اور یہ واقعہ آج بھی اعلان کرتا ہے......اللہ والوں کی نگاہ صرف انسان نہیں دیکھتی، انسان کے مقدر بھی پڑھتی ہے اور کبھی کبھی......لکھ بھی دیتی ہے۔

ایک نظرِ جلال، ایک تعویذ دعا، ایک بشارتِ رحمت

صحبت اولیاء کے تین روشن باب

اولیاء کی زندگی میں بعض واقعات الگ الگ حکایات نہیں ہوتے، ایک ہی نور کے مختلف مظاہر ہوتے ہیں۔ کہیں ایک نظر انسان کو علم و ولایت تک پہنچا دیتی ہے، کہیں ایک تعویذ تقدیر کے بند دروازے کھول دیتا ہے اور کہیں ایک دعا بانجھ آنگن میں بچوں کی ہنسی بسا دیتی ہے۔ یہی اللہ والوں کی شان ہے......وہ اسباب کے محتاج نہیں ہوتے، اسباب ان کے در پر آ کر ادب سیکھتے ہیں۔

حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حیاتِ طیبہ میں ایسے بے شمار مناظر بکھرے ہوئے ہیں، مگر سید محمد عثمان بخاری، تعویذِ شفا، اور اولاد کی بشارت--یہ تینوں واقعات صحبت، کرامت اور دعا کی ایک عجیب مثلث بناتے ہیں۔

سادہ دل طالب علم......اور ایک نظرِ جلال

کلاریا کے دارالعلوم میں ایک سید زادہ داخل ہوا...... سید محمد عثمان بخاری۔ کنٹول گاؤں کے سید، سادہ طبیعت، بے تکلف مزاج۔

علم کی فضیلت سنی تو دل میں شوق جاگا اور دارالعلوم قادریہ شیرازیہ کی دہلیز پر آ پہنچے۔

مگر سادگی کبھی کبھی امتحان بھی بن جاتی ہے۔
حضرت کی غیر موجودگی میں چند طلبہ نے مذاق میں کہا:
''اگر علم حاصل کرنا ہے تو فجر کے بعد سات مرتبہ کپڑوں سمیت غسل کرو، پھر کپڑے اتار کر مدرسے آؤ!''
وہ سادہ دل سید...... اسے مذاق نہ سمجھ سکے۔ پر، سچ جانا۔ اور روز یہی عمل کرنے لگے۔ فجر کے بعد کنویں پر جاتے...... بار بار پانی ڈالتے......خاموشی سے یہ عمل دہراتے۔ انہیں کیا خبر......ان کی سادگی آسمان پر لکھی جا رہی ہے۔ وہ صبح جب تقدیر بدل گئی۔ حضرت واپس تشریف لائے۔ فجر کے بعد دیکھا...... وہ کنویں پر بار بار پانی ڈال رہے ہیں۔ فرمایا: ''یہ کیا کر رہے ہو؟''
انہوں نے معصومانہ انداز میں جواب دیتے ہوئے عرض کیا:
''طلبہ نے بتایا علم کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔''
بس یہ سننا تھا...... حضرت پر جلال طاری ہو گیا۔ مگر یہ جلال غضب نہ تھا...... فیضان کا جلال تھا۔ فرمایا: ''جاؤ! آج سے تم میری جگہ بیٹھو اور جنہیں میں پڑھاتا تھا، تم پڑھاؤ!''
یہ الفاظ تھے...... یا روحانی اجازت؟ یہ حکم تھا...... یا علم کا دروازہ؟ جیسے ہی یہ الفاظ نکلے......سید عثمان بخاری فوراً علمِ شریعت اور ولایت کے مقام پر فائز ہو گئے۔ اگلے ہی دن وہ مدرسے میں درس دے رہے تھے۔ کل جن پر ہنسی اڑائی گئی تھی، آج وہ استاد تھے۔
یہیں سے حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی روحانی عظمت کا ایک اور باب کھلتا ہے، کیونکہ اولیائے کاملین کی نگاہ صرف انسان کو علم نہیں دیتی بلکہ اس کی تقدیر بھی بدل دیتی ہے۔ جس دربار میں ایک لمحے کی التفات کسی عام شخص کو صاحبِ علم و ولایت بنا دے، وہاں سے صادر ہونے والی تاثیر پھر صرف ایک فرد تک محدود نہیں رہتی بلکہ زمانوں کے مزاج بدل دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت کی حیاتِ مبارکہ کا ہر واقعہ محض ایک کرامت نہیں بلکہ ہدایت، تربیت اور روحانی انقلاب کی ایک زندہ تفسیر محسوس ہوتا ہے۔
تاریخِ ولایت کے بعض ابواب ایسے ہوتے ہیں جہاں عقل خموش ہو جاتی ہے اور دل بولنے لگتا ہے۔ وہاں واقعات محض بیانیے نہیں رہتے بلکہ روحانی حقائق کی روشن علامت بن جاتے ہیں۔
حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حیاتِ مبارکہ بھی انہی اسرار و انوار سے عبارت تھی۔ آپ جہاں تشریف لے جاتے، وہاں صرف قدموں کی چاپ نہیں پہنچتی تھی بلکہ ہدایت کی ایک خموش روشنی بھی اترتی تھی۔ کبھی ایک آتش کدہ توحید کے چراغ سے منور ہو جاتا، کبھی ایک بے اولاد آنگن دعائے ولی سے گلزار بن جاتا، کبھی سیکڑوں میل دور بیٹھا مرید خواب میں دستِ شفقت پا کر شفایاب ہو جاتا اور کبھی ایک سادھو کی تمام عمر کی ریاضت فقیر کی ایک مسکراہٹ کے سامنے ہیچ ثابت ہو جاتی۔
ایک مرتبہ حضرت ایک پارسی کے آتش کدہ، یعنی اگیاڑی میں تشریف لے گئے۔ فضا میں دھوئیں کی مخصوص بو پھیلی ہوئی تھی، آگ کے شعلے ایک عجیب تقدس کے ساتھ بلند ہو رہے تھے اور دو پارسی بھائی نہایت انہماک سے اس آگ کی پرستش میں مصروف تھے۔ حضرت خموشی سے ایک طرف کھڑے رہے۔ جب وہ دونوں اپنی عبادت سے فارغ ہوئے تو آپ نے نہایت شفقت آمیز لہجے میں فرمایا:
"اے آتش پرستو! تم نے عمر بھر اس آگ کے سامنے سر جھکایا، اس کی عبادت کی، اس کے گرد عقیدت کے پھیرے لگائے......کیا اس آگ نے کبھی تمہارا کچھ لحاظ بھی کیا؟"
یہ سوال ان کے دل کے اندر کہیں اتر گیا۔ دونوں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے، پھر دھیرے سے بولے: ''یہ تو آگ ہے، اس کا کسی سے کیا تعلق؟''
حضرت نے فرمایا: ''جب یہ تمہارا ذرا سا بھی لحاظ نہیں رکھتی تو پھر ایسی عبادت کس کام کی جو اپنے پرستار کو ہی نہ پہچانے؟''
فضا پر خاموشی چھا گئی۔ آگ کے شعلے بدستور بھڑک رہے تھے مگر اب ان دونوں کے دلوں میں ایک نئی آگ روشن ہو چکی تھی۔ پھر حضرت نے فرمایا: ''آؤ، ہم تینوں اپنے ہاتھ اس آگ میں ڈال دیتے ہیں۔ جس کا ہاتھ نہ جلے، ہم اسی کے دین کو سچا مان لیں گے۔''
یہ ایک غیر معمولی دعوت تھی۔ دونوں بھائی حیرت میں پڑ گئے مگر نہ جانے حضرت کے لہجے میں کیسی صداقت آفرینی تھی کہ آخر کار انہوں

نے یہ شرط قبول کر لی۔

سب سے پہلے حضرت نے ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' پڑھ کر اپنا مبارک ہاتھ آگ میں ڈال دیا۔ شعلے لپکتے رہے، آگ دہکتی رہی مگر دستِ ولی پر ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے آگ خود ادب سے جھک گئی ہو۔ حاضرین دم بخود رہ گئے۔

اب دونوں پارسی بھائیوں کی باری تھی۔ ایک نے ہمت کر کے اپنا ہاتھ آگ کی طرف بڑھایا۔ جونہی اس کی انگلیاں شعلوں کے قریب پہنچیں، حرارت کی شدت سے اس کا جسم کانپ اٹھا۔ دوسرے بھائی نے بھی کوشش کی مگر آگ کی تپش برداشت نہ کر سکا۔ آخرکار دونوں نے اپنے ہاتھ آگ میں ڈال دیے، مگر چیخ اٹھے اور فوراً ہاتھ باہر کھینچ لیے۔ ان کی ہتھیلیاں جھلس چکی تھیں اور چہروں پر خوف و حیرت کے آثار نمایاں تھے۔

اسی لمحے ان کے دلوں پر حقیقت کا دروازہ کھل گیا۔ انہیں محسوس ہوا کہ یہ آگ، جسے وہ عمر بھر معبود سمجھتے رہے، اپنے پجاریوں اور عقیدت کیشوں کو خود اپنے شعلوں سے نہ بچا سکی، جبکہ ایک مردِ خدا کے سامنے اسی آگ کی تاثیر ماند پڑ گئی۔

دونوں بے اختیار حضرت کے قدموں میں گر پڑے۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگے:

''بے شک سچا دین وہی ہے جس کی طرف آپ بلا رہے ہیں۔ ہمیں اسلام قبول ہے۔''

پھر انہوں نے کلمۂ طیبہ پڑھا اور نورِ ایمان سے ان کے دل جگمگا اٹھے۔ وہ آتش کدہ، جو مدتوں سے شعلوں کی پرستش کا مرکز تھا، اس دن توحید کے نور سے روشن ہو گیا۔ آگ کے شعلے تو پہلے بھی وہاں تھے، مگر اس دن پہلی مرتبہ دلوں میں ایمان کا چراغ روشن ہوا تھا۔

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت مالیا میانا تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کے مرید میانا برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ گل محمد نامی ایک مرید کے گھر قیام فرماتے تھے۔ اس کی بیوی برسوں سے بے اولاد تھی۔ محلے کی عورتوں کے طعنے اس کے دل میں زخم بن چکے تھے۔ وہ خموشی سے سب سہتی رہی مگر ایک دن غم کا بوجھ ضبط سے باہر ہو گیا۔

حضرت پردے کا بے حد لحاظ فرماتے تھے مگر اس روز وہ عورت روتی ہوئی حضرت کے سرہانے آ کھڑی ہوئی۔ حضرت نے اس کی کیفیت محسوس کر لی۔ نگاہِ شفقت اٹھائی اور فرمایا:

بیٹی! جا، ان شاء اللہ تجھے تین بیٹے اور دو بیٹیاں عطا ہوں گی۔

یہ الفاظ اس عورت کے لیے جیسے خشک زمین پر بارانِ رحمت تھے۔ وہ بے اختیار رو پڑی اور عرض کیا: ''آج سے میں آپ کی بیٹی ہوں، لہٰذا مجھ سے پردہ نہ کیا جائے۔''

حضرت نے مسکرا کر فرمایا: ''آج سے تم میری بیٹی ہو۔''

وقت گذرا اور وہی ہوا جو ایک ولی کی زبان سے نکلا تھا۔ اس عورت کے ہاں تین بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں، حالانکہ اس وقت اس کی عمر چھیالیس برس اور اس کے شوہر کی عمر باون برس تھی۔ لوگ حیران تھے مگر اہلِ دل جانتے تھے کہ اللہ جب اپنے مقرب بندوں کو دعا کی تاثیر عطا کرتا ہے تو ناممکن کے دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔

حضرت کے ساتھ چار خاص خلفاء اور سمرہ حضرات بھی تھے، جو آپ کے سچے مرید، خلیفہ اور صاحبِ ولایت بزرگ تھے۔ کلاریہ شریف آج بھی ان کے مزارات کے نور سے آباد ہے۔ دو بھائیوں کے مزارات "ڈھولیاوارا" کے نام سے مشہور ہیں، جبکہ باقی دو کے مزارات سادگی کے ساتھ خموش کھڑے ہیں مگر سب پر یکساں فیضان برستا ہے۔ لوگ خالی ہاتھ آتے ہیں اور جھولیاں بھر کر لوٹتے ہیں۔

حضرت ان چاروں کو باری باری تبلیغِ دین کے لیے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ انہی چاروں کے ساتھ حج کے سفر پر روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک قافلہ ملا۔ انہوں نے عرض کیا:

حضرت! ہم آپ کے پاس اسلام قبول کرنے آئے ہیں لیکن آپ تو حج کے لیے جا رہے ہیں۔

حضرت نے یعقوب سمرہ کی طرف نگاہ فرمائی۔ یعقوب سمرہ نے کہا: ''تم لوگ کلاریہ پہنچ جاؤ، ہم تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔''

وہ قافلہ کلاریہ شریف پہنچا تو حیرت سے دیکھا کہ حضرت کے چاروں خلفاء پہلے ہی وہاں موجود ہیں اور کہہ رہے ہیں:

حضرت تمہارا انتظار فرما رہے ہیں۔

پھر وہ لوگ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے، اسلام قبول کیا اور حضرت نے فرمایا:

اب اپنے وطن واپس لوٹ جاؤ۔

ادھر وہ تمام لوگ جو حضرت کے ساتھ حج کے سفر میں تھے، قسم کھا کر کہتے تھے کہ:

جس دن سے حضرت کلاریہ سے روانہ ہوئے، ایک لمحے کے لیے بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوئے۔

اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جس دن قافلہ کلاریہ میں مسلمان ہوا، وہ یومِ عرفہ تھا، اور اسی دن حضرت میدانِ عرفات میں بھی موجود تھے۔

یہ سن کر لوگوں پر ایک عجیب سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ پھر سب یہی کہتے: ''اللہ کے مقرب بندوں کی شان ہی نرالی ہوتی ہے۔ وہ جہاں چاہے، اپنے فضل سے انہیں حاضر فرما دیتا ہے۔''

ایران میں بھی حضرت کے بے شمار مرید تھے۔ انہی میں ایک مخلص ایرانی شخص تھا جس کے گلے میں ایک نہایت خطرناک پھوڑا نکل آیا تھا۔ مرض اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ حکیم اور معالج سب مایوس ہو چکے تھے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا:

"اب ہمارے پاس کوئی علاج نہیں۔ اپنی آخری تیاری کرلو۔"

یہ سن کر اس شخص کے دل پر مایوسی چھا گئی۔ رات کے سناٹے میں اسے اپنے پیر و مرشد یاد آئے۔ وہ پوری بے بسی کے ساتھ پکارتا رہا: ''یا پیر! مدد فرمائیے!''

اسی کیفیت میں اسے نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھا کہ حضرت محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تشریف لائے ہیں۔ آپ نے شفقت سے فرمایا: ''بیٹا! جب سے تم اس مصیبت میں مبتلا ہوئے ہو، مجھے اس کی خبر ہے۔ کل صبح نیم کی مسواک کرنا، پھر ظہر کے بعد آرام کرنا اور عصر کے بعد غوثِ پاک کا نام لے کر اٹھنا اور دوبارہ نیم کی مسواک کرنا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ شفا ہو جائے گی۔''

صبح اس نے بعینہٖ ایسا ہی کیا۔ عصر کے بعد وہ پھوڑا پھٹ گیا اور اسے آرام مل گیا۔ دورِ مسافت مٹ گئی، خواب حقیقت بن گیا اور ایک مرید پر مرشد کی نگاہِ کرم سایہ فگن ہو گئی۔ ایک اور واقعہ نہایت معنی خیز ہے۔

ایک دن ایک سادھو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک شیشی تھی۔ بڑے فخر سے کہنے لگا: ''یہ سونا بنانے کا کیمیا ہے۔ پوری زندگی اس کے حصول میں صرف کر دی ہے۔''

حضرت نے فرمایا: ''ہو سکتا ہے، مگر فقیروں کا سونے سے کیا تعلق؟'' مگر سادھو اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس نے غرور سے کہا: ''آج کے زمانے میں کوئی اسے نہیں بنا سکتا۔'' حضرت خموشی سے مسکرائے، شیشی ہاتھ میں لی اور دور پھینک دی۔

سادھو تلملا اٹھا: ''حضرت! یہ آپ نے کیا کر دیا؟ یہ تو میری ساری عمر کی کمائی تھی!''

حضرت نے سکون سے فرمایا: ''پریشان کیوں ہوتے ہو؟ جا کر دیکھو، شاید وہیں پڑی ہو۔''

وہ دوڑا ہوا گیا۔ ایک گندگی کے ڈھیر پر شیشی کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے اور وہ کیمیا اسی کوڑے میں لتھڑا ہوا تھا۔ واپس آ کر اس نے حیرت سے سارا حال بیان کیا۔

حضرت نے فرمایا: ''تم نے ساری زندگی اسی گندگی کو جمع کرنے میں گذار دی۔''

پھر فرمایا: ''اگر اصل پارس دیکھنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ چلو۔''

سادھو خاموشی سے پیچھے چل پڑا۔ حضرت دریا کے کنارے پہنچے، وضو فرمایا، کلی کا پانی ریت پر ڈالا اور فرمایا: ''اگر یہی سونا، یہی ہیرے، یہی پارس مطلوب ہیں تو دیکھ لو!''

سادھو نے دیکھا کہ ریت جگمگا اٹھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ مگر اس لمحے اس کے اندر کی دنیا بدل چکی تھی۔ وہ بے اختیار حضرت کے قدموں میں گر پڑا اور پکار اٹھا:

''مجھے نہ سونا چاہیے، نہ پارس، نہ ہیرے-- مجھے وہ رب چاہیے جس نے آپ کو یہ مقام عطا کیا ہے!''

یوں ایک بت پرست، خدا پرست بن گیا اور حضرت نے وہ تمام دنیاوی اشیاء لوگوں میں خیرات کر دیں، جیسے ایک فقیر دنیا کی ہر چمک سے بے نیاز ہوتا ہے۔ یہی اولیائے کرام کی شان ہے۔ وہ صرف

کرامات نہیں دکھاتے بلکہ دلوں کی دنیا بدل دیتے ہیں۔ ان کی نگاہ جب کسی پر پڑتی ہے تو تقدیریں بدل جاتی ہیں اور جب ان کی زبان سے دعا نکلتی ہے تو بنجر زمینوں میں بھی بہار اتر آتی ہے۔

حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پوری زندگی درود پاک کی خوشبو سے معطر تھی۔ آپ کی مجلسوں میں ذکرِ مصطفیٰ ﷺ ایسا جاری رہتا جیسے کسی بہتے ہوئے چشمے سے مسلسل آبِ حیات رواں ہو۔ آپ فرماتے تھے:

"مجھے جو مرتبہ حاصل ہوا، وہ میری والدہ کی دعا اور درود شریف کی برکت سے ملا ہے۔ میری والدہ کثرت سے درود شریف پڑھتی تھیں۔ جب میں ان کے بطن میں تھا تو انہوں نے ایک کروڑ سے زائد درود پاک حضورِ اقدس ﷺ کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت کے طور پر پیش کیا تھا۔ یہی درودِ شریف کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ مقام عطا فرمایا۔"

یہ الفاظ محض ایک واقعہ نہیں بلکہ اس راز کی طرف اشارہ کہ اولیائے کاملین کی روحانی رفعتوں کے پیچھے عشقِ رسول ﷺ کی وہ خموش عبادت کارفرما ہوتی ہے جسے دنیا کی آنکھیں نہیں دیکھ پاتیں۔

حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کو پانچ ہزار سے زائد درود شریف ازبر تھے۔ پیر کے دن اور جمعہ کی رات آپ کی خانقاہ نورانی آوازوں سے گونج اٹھتی۔ سوالاکھ "درودِ تاج" باجماعت پڑھا جاتا۔ درود و سلام کی وہ محفلیں ایسی معلوم ہوتیں جیسے زمین پر فرشتوں کا نزول ہو رہا ہو۔ جب ذکر کی کیفیت اپنے عروج کو پہنچتی تو بارگاہِ رسالت ﷺ میں سلام پیش کیا جاتا، پھر حضرت کی طرف سے نیاز تقسیم ہوتی۔ عقیدت مند جھولیاں بھر بھر کر لے جاتے مگر اصل دولت وہ سکینت تھی جو دلوں میں اترتی تھی۔

گیارہویں شریف کے موقع پر سترہ دن تک میلادِ پاک کی محفلیں سجتیں۔ ہر روز غوثِ پاک حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی نیاز پیش کی جاتی۔ بارہویں شریف کے ایام میں ہر رات اور نمازِ فجر کے بعد میلاد شریف کی محفل منعقد ہوتی۔ درود و سلام کی صدائیں فضا میں بکھرتیں، نیاز تقسیم ہوتی اور عاشقانِ رسول ﷺ کی آنکھیں نم رہتیں۔ بارہویں تاریخ کی رات تو گویا نور کا دریا بہنے لگتا۔ پوری رات درود شریف کا ورد جاری رہتا اور حضورِ اقدس ﷺ کے موئے مبارک کی زیارت کرائی جاتی۔ عقیدت مندوں کے دل دھڑکتے، آنکھیں جھک جاتیں اور زبانیں بے اختیار درود پڑھنے لگتیں۔

محرم شریف کے دنوں میں بھی آپ کی خانقاہ عقیدت و محبت کا سنگم بنی رہتی۔ دس دن تک ہر رات شربت اور ملیدہ تقسیم کیا جاتا، قرآن خوانی ہوتی، درود پاک کی محفلیں منعقد ہوتیں اور یہ تمام انتظامات حضرت اپنی ذاتی رقم سے فرماتے۔ آپ کا دسترخوان صرف مریدوں کے لیے نہ تھا بلکہ ہر آنے والے کے لیے کھلا رہتا۔ سخاوت آپ کے مزاج کا حصہ تھی۔

حضرت صرف صاحبِ کرامت بزرگ نہ تھے بلکہ عمل اور محنت کی روشن مثال بھی تھے۔ آپ کھیتی باڑی کرتے، عطر کی تجارت فرماتے اور غلے کا کاروبار بھی چلاتے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے زمین کاشت کرتے، مدارس چلاتے، اسلام کی تبلیغ کرتے اور ان سب کے باوجود روزانہ ایک ہزار نوافل ادا فرماتے۔ گویا دن مخلوقِ خدا کی خدمت میں گذرتا اور رات خالقِ کائنات کی عبادت میں۔

آپ ہمیشہ فرماتے:

"حلال روزی تلاش کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ جو شخص حلال کھاتا ہے، اس کی اولاد نیک اور صالح پیدا ہوتی ہے اور وہ کبھی محتاج نہیں رہتا۔"

یہی وجہ تھی کہ آپ کی خانقاہ میں روحانیت کے ساتھ محنت، عبادت کے ساتھ کسبِ حلال اور ذکر کے ساتھ خدمتِ خلق کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب اس آفتابِ ولایت کے غروب کا لمحہ قریب آ پہنچا۔ حضرت نے اپنی آخری گھڑی کی خبر پہلے ہی دے دی تھی۔ محرم شریف میں فرمایا: ''اس مدرسے کا خاص خیال رکھنا جو ہم نے قائم کیا ہے۔ یہ چار پشتوں تک قائم رہے گا، پھر بند ہو جائے گا۔''

وقت نے ثابت کیا کہ ولی کی زبان سے نکلی ہوئی بات تقدیر کا عنوان بن جاتی ہے۔ چنانچہ آپ کے پوتے حضرت محمد لالا میاں باپو کے زمانے میں وہ مدرسہ بند ہو گیا بالکل ویسے ہی جیسے حضرت نے فرمایا

تھا۔ وصال کے دن فضا میں ایک عجیب سکوت تھا۔ حضرت نے تہجد کی نماز ادا فرمائی، پھر غسل کیا اور عبادت میں مشغول ہو گئے۔ مکمل "دلائل الخیرات" پڑھی، پھر "دعائے حزب البحر" کا ورد کیا اور "یٰسین قادریہ شیرازیہ" کی تلاوت فرمائی۔ فجر کا وقت ہوا تو خود اذان پکاری اور نماز پڑھائی۔

سب جانتے تھے کہ آج جدائی کا دن ہے، کیونکہ حضرت پہلے ہی خبر دے چکے تھے۔ اہلِ خانہ، مریدین، معتقدین اور اولاد سب حاضر تھے۔ فجر کے بعد حضرت قبرستان تشریف لے گئے۔ سب سے پہلے اپنی والدہ ماجدہ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ مزار کو بوسہ دیا، قدم بوسی کی اور فاتحہ پڑھی۔ پھر اپنے چاروں خلفاء کے مزارات پر گئے، اس کے بعد اپنے فرزند کامو شاہ شیرازی کے مزار پر فاتحہ خوانی فرمائی۔ پھر حضرت زور آور شاہ پیر کی درگاہ پر حاضر ہوئے۔

اس کے بعد اس مقام پر تشریف لائے جہاں آج آپ کا مزارِ اقدس ہے۔ وہاں قبر تیار ہو چکی تھی۔ حضرت نے دو رکعت نماز ادا کی۔ منظر ایسا تھا جیسے ایک مسافر اپنی ابدی منزل آخری بار دیکھ رہا ہو۔

پھر آپ اپنے پیرو مرشد حضرت سید شاہ جمال الدین محمد قادری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہوئے، جو غوثِ پاک رحمۃ اللہ علیہ کی سترہویں پشت میں تھے۔ وہاں فاتحہ خوانی کی، قدم بوسی کی اور پھر اپنی قیام گاہ میں کچھ دیر مراقبہ فرمایا۔

اس کے بعد آپ خانقاہ میں تشریف لائے اور اپنے پوتے میر شاہ میاں باپو کو بلا کر فرمایا:

"بیٹا! صبر کا دامن کبھی نہ چھوڑنا۔ ایمان پر ثابت قدم رہنا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت دل میں مضبوط رکھنا۔ اہلِ بیت کی تعظیم کرنا اور سادات کا دل کبھی نہ دکھانا۔"

پھر اپنی اولاد کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "اگر تم میرے راستے پر چلو گے تو خوش حال رہو گے اور اگر اسے چھوڑ دو گے تو مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔"

پھر ارشاد فرمایا: "درود شریف کثرت سے پڑھتے رہنا۔ کوئی انسان ہمارے گھر آئے تو اسے بھوکا واپس نہ جانے دینا۔ اگر ممکن ہو تو اس کا دل خوش کر دینا۔"

یہ گویا پوری خانقاہی زندگی کا خلاصہ تھا: محبت، سخاوت، درود اور خدمتِ خلق۔

آپ نے مزید فرمایا: "نماز کی پابندی کرنا، اپنی اولاد کو علمِ دین سکھانا، کیونکہ علمِ دین حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔"

پھر نہایت سکون سے فرمایا: "میرے بعد رونا دھونا نہ کرنا، بلکہ کلمہ، درود شریف اور استغفار پڑھتے رہنا۔"

پھر مریدین کی طرف دیکھا اور فرمایا: "جو نصیحت میں نے اپنی اولاد کو کی ہے، وہی تم سب کے لیے بھی ہے۔"

ظہر کے وقت آپ بیدار ہوئے، اذان پکاری، سنتیں ادا کیں اور فرض نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد فرمایا: "یہ میری آخری نماز ہے۔"

یہ سنتے ہی فضا اشک بار ہو گئی۔ ہر آنکھ نم تھی مگر حضرت کے چہرے پر عجب سکون تھا۔

پھر آپ نے کبیر سمرہ کو بلا کر فرمایا:

"اپنے والد کی طرح اہلِ بیت سے محبت رکھنا۔"

جب انہوں نے اپنی قوم کے لیے دعا کی درخواست کی تو حضرت نے فرمایا: "سمرہ قوم زندہ دل رہے گی، مردانگی اور حوصلے کے ساتھ زندگی بسر کرے گی اور گمراہ نہ ہوگی۔۔۔ان شاء اللہ۔"

پھر آپ نے میر شاہ میاں باپو کو اپنی جانشینی عطا فرمائی اور فرمایا:

"یہ خلافت اسلام کی خدمت کے لیے ہے، اس میں کبھی کوتاہی نہ کرنا۔"

اس کے بعد حضرت خموش ہو گئے۔ پھر درودِ ابراہیمی کا ورد شروع فرمایا۔ بارگاہِ رسالت ﷺ میں سلام پیش کیا، کلمۂ طیبہ پڑھا اور پانچوں کلمے گیارہ مرتبہ پڑھے۔ حاضرین دم بخود بیٹھے تھے۔ ہر طرف درود و استغفار کی مدھم صدائیں گونج رہی تھیں۔

پھر آہستہ آہستہ آپ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ یوں ایک سو ستر برس کا وہ روشن چراغ، جس نے ہزاروں دلوں کو نور دیا تھا، غروب ہو گیا۔۔۔مگر اس کی روشنی آج بھی کلاریہ شریف کی فضاؤں میں محسوس ہوتی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

سترہ ربیع الاول شریف، پیر کا دن، دو پہر کے بعد کا وقت تھا۔ عصر کے بعد آپ کا جنازہ اٹھا۔ فضا درود و سلام سے گونج رہی تھی۔ لوگ اشک بار تھے مگر حضرت کی وصیت کے مطابق صبر اور ذکر میں مشغول تھے۔ کلاریہ شریف کے قبرستان میں آپ کو سپردِ خاک کیا گیا۔

ایران کی تاریخ ساز سرزمین شیراز سے اٹھنے والا یہ نور آخرکار کلاریہ شریف کی مٹی میں آسودہ ہوا مگر اس کی خوشبو آج بھی اہلِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

یوں حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حیاتِ مبارکہ کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ہم فقط کسی ایک انسان کی سوانح نہیں پڑھ رہے بلکہ روحانیت، محبت، خدمت، درود و ذکر اور تبلیغِ حق کے ایک ایسے روشن عہد سے گذر رہے ہیں جس کے ہر ورق سے نور پھوٹتا ہے۔

کہیں ایک آتش کدہ توحید کے چراغ سے روشن ہو رہا ہے، کہیں ایک بے اولاد عورت دعا کے سائے میں ماں بن رہی ہے، کہیں ایک بیمار مرید ہزاروں میل دور خواب میں مرشد کی شفقت پا کر شفا یاب ہو رہا ہے اور کہیں ایک سادھو دنیا کا مادی سونا چھوڑ کر ایمان کی دولت اختیار کر رہا ہے۔ یہ سب محض کرامات کے بیانات نہیں بلکہ اس حقیقت کے مظاہر ہیں کہ جب بندہ اپنے رب سے اخلاص کے زیر سایہ سچا تعلق قائم کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دلوں کی دنیا بدل دینے والی تاثیر عطا فرما دیتا ہے۔

اسی حقیقت کو ان کلمات کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے یہ جملے مختصر ضرور ہیں مگر معنیٰ خیز ہیں: "مَنْ كَانَ لِلّٰهِ كَانَ اللّٰهُ لَهٗ"

یعنی "جو اللہ کا ہو جاتا ہے، اللہ اُس کا ہو جاتا ہے۔"

پھر قدرت کے بند دروازے اس پر کھلنے لگتے ہیں، ناممکن کے اندھیروں میں امکان کی روشنی اترتی ہے اور ایک بندۂ مومن اپنی ذات سے نہیں بلکہ نسبتِ الٰہی سے پہچانا جانے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولیائے کاملین کی زندگیوں میں ہمیں بار بار یہی منظر دکھائی دیتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں چاہتے مگر اللہ تعالیٰ انہیں اپنے بندوں کے لیے سراپا رحمت بنا دیتا ہے۔ ان کے قدم جہاں پڑتے ہیں وہاں ویرانے آباد ہوتے ہیں، ان کی دعاؤں سے مایوسی امید میں بدل جاتی ہے اور ان کی صحبت میں بیٹھ کر دلوں کو اپنے رب کا راستہ مل جاتا ہے۔

حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پوری حیاتِ مبارکہ بھی اسی راز کی روشن تفسیر تھی۔ انہوں نے دنیا کو اپنی کرامات سے زیادہ اپنے اخلاص، درود پاک کی کثرت، خدمتِ خلق، محبتِ اہلِ بیت اور تعلق باللہ و رسول سے متاثر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ذکر آج بھی صرف ایک روحانی بزرگ کے طور پہ نہیں بلکہ ایک روحانی عہد، ایک زندہ تاثیر اور ایک خموش نور کے طور پر کیا جاتا ہے۔

حضرت کی پوری زندگی عشقِ رسول ﷺ کی خوشبو سے معطر تھی۔ ان کی زبان پر درود، ان کی مجلس میں ذکر، ان کے ہاتھ میں سخاوت، ان کی نگاہ میں شفقت اور ان کے کردار میں خدمتِ خلق کا درد تھا۔ وہ صرف ایک خانقاہ کے سجادہ نشین نہ تھے بلکہ کھیت میں محنت کرنے والے مزدور بھی تھے، مدرسہ چلانے والے معلم بھی، بھوکوں کو کھلانے والے کریم النفس بھی اور راتوں کے خموش لمحات کو نوافل میں گذارنے والے عابد شب زندہ دار بھی۔ ان کی ذات میں شریعت کی پابندی، طریقت کی لطافت، معرفت کی گہرائی اور انسانیت کی محبت ایک ساتھ جمع ہو گئی تھی۔

آج بھی کلاریہ شریف کی فضاؤں میں درود پاک کی وہ مدھم صدائیں گویا سنائی دیتی ہیں، جن کے درمیان ایک مردِ خدا نے اپنی پوری زندگی انسانوں کے دلوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب رسول ﷺ کی محبت سے جوڑنے میں گذار دی۔ ان کا مزار صرف اینٹوں اور پتھروں کا ایک گنبد نہیں بلکہ ایک روحانی تاریخ کی خموش دستاویز ہے، جہاں حاضری دینے والا ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ کچھ ہستیاں وقت کے گذر جانے کے باوجود فنا نہیں ہوتیں بلکہ اپنے اخلاص، محبت اور خدمت کے باعث صدیوں تک زندہ رہتی ہیں۔

اولیائے کاملین کی اصل کرامت بھی یہی ہے کہ وہ اپنے وصال کے بعد بھی دلوں میں ایمان کی شمع روشن رکھتے ہیں۔ ان کے مزارات پر جلنے والے چراغ دراصل اسی ابدی روشنی کی علامت ہوتے ہیں جو کبھی بجھتے نہیں۔

□□□□

سید صبیح رحمانی
مدیر اعلیٰ ''نعت رنگ''، کراچی، پاکستان

کلامِ رضا کا ابلاغ اور ہماری ذمہ داریاں

اردو نعت آج ایک منفرد صنفِ سخن کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہے۔ نعت کی صنفی شناخت کا یہ دائرہ نہ تو صرف مسلمان حلقوں تک محدود رہے اور نہ ہی اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے والوں تک۔ نعت کی تخلیقی اور تفہیمی دنیا ایسی تمام سرحدوں سے ماورا اور کہیں زیادہ وسیع تر ہے۔ بلاشبہ نعت کے بیانیہ کی ساخت اور اُس کے متن کے اظہاری سانچوں کی تشکیل اور ان کی معنویت کا عمل براہِ راست اسلامی عقائد سے مشتق ہوتا ہے۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ غیر مسلم شعرا کی نعت نگاری آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبوبیت کا وہ اعتراف ہے جو بجائے خود معجزے ہی کا درجہ رکھتا ہے۔ انسانی تاریخ کے ہزاروں برسوں میں ایسی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ عقل و دل دونوں ہی اس امر کی گواہی دیتے ہیں اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآنِ کریم نے اس معجزے کی گواہی میں حق تعالیٰ شانہٗ کے یہ الفاظ پیش کیے ہیں: ''اور ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کیا۔''

یہ ذکر اور اِس کی بلندی کی سطحوں کا فروغ نعت کا شیوہ ہے اور یہی نعت نگاروں کی آرزو۔

اُردو نعت کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے۔ اس صنفِ سخن کی آبیاری میں متعدد شعرا نے اپنا خونِ جگر صرف کر کے عقیدت نگاری کے باب میں اپنے خلوص، وارفتگی اور فنی مہارت کے جاوداں نقوش ثبت کیے اور نسبت کے اعزاز کے ذریعے اپنے نام ہی کو نہیں، کام کو بھی دست بردِ زمانہ سے بچالیا۔ اردو کے تناظر میں دیکھا جائے تو نعتیہ شاعری کا ذکر آتے ہی ہمارے ذہنوں میں جو پہلا نام روشن ہوتا ہے، وہ مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ کا ہے۔ کہتے ہیں قدرت بڑے کاموں کے لیے بڑے لوگ پیدا کرتی ہے اور انھی بڑے لوگوں کے عظیم کارناموں سے کسی قوم کی فکری تاریخ اور تہذیب و ادب کے اوراق روشن ہوتے ہیں۔ مولانا احمد رضا خاںؒ بھی اپنی مجموعی صفات کے تناظر میں ایک ایسی ہی بڑی شخصیت ہیں جنھوں نے علمی، فکری، نظریاتی اور فقہی موضوعات پر وہ قابلِ قدر قلمی اثاثہ چھوڑا ہے جس سے آنے والا زمانہ تادیر روشنی حاصل کرتا رہے گا۔

مولانا کو شعر و ادب سے بھی خصوصی لگاؤ تھا۔ بے شمار علمی مشاغل کے باوجود ان کی شاعرانہ تخلیقات میں زبان و بیاں کی قوت، تخیل کی بلند پروازی، جذبات و واقعات نگاری اور وارداتِ قلبی کی پیکر تراشی جیسے فکری اور فنی محاسن دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوتی ہے کہ مولانا نے کل وقتی شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی اُردو زبان و ادب اور نعت گوئی کے فن کو کتنا پُر ثروت کیا ہے۔ ۱۴۴۰ ہجری میں مولانا کو دنیا سے رُخصت ہوئے ۱۰۰ سال ہو جائیں گے، مگر مولانا کے عشقِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حرارت اور ان کے افکار، نظریات اور تعلیمات و کلام کی روشنی ہر آنے والے لمحے میں اپنا دائرہ وسیع کر رہی ہے۔ ہر گزرتا دور ''حدائقِ بخشش'' کی تخلیقی عظمت ، ادبی سرفرازی، شعری بلندی اور عشق و عقیدت کے نو بہ نو پہلو سامنے لا رہا ہے۔ مولانا نے اپنی نعت گوئی کے توسط سے بحیثیت عالمِ دین بارگاہِ رسالت مآب اور آدابِ نعت گوئی کے جن زاویوں اور پہلوؤں کو متعارف کروایا اور انھیں اپنے افکار و خیالات کے شعری سانچے میں جس طرح ڈھال کر دکھایا، اس کی کوئی دوسری مثال اُردو نعت کی شعری روایت میں باید و شاید نظر آئے۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ نعتیہ ادب پر اب تک تنقید و تحقیق کے جتنے بھی

اظہاری زاویے سامنے آرہے ہیں، ان میں کہیں نہ کہیں مولانا کے اسلوب و آہنگ کو چراغِ راہ بنا کر چلنے کا رویہ نمایاں نظر آتا ہے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ، لیکن اس امر کی نفی نہیں کی جاسکتی کہ اب تک مولانا کو بحیثیت شاعر اُردو زبان وادب کی تاریخ میں وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کی متعدد وجوہات ہوسکتی ہیں اور یقیناً ہیں، مگر ۲۰۰۵ء میں ''نعت رنگ'' کا مولانا احمد رضا خاں نمبر مرتب کرتے ہوئے، میں نے جن چند معروضات کا اظہار کیا تھا وہ آج بھی سوالیہ نشان کی صورت ہمارے سامنے ہیں۔ میں پوری ذمے داری کے ساتھ اس احساس کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا کی تمام تر مقبولیت کے باوجود تاریخِ ادب کا اُن کی طرف عدم التفات اور کلامِ رضا کے اہم فکری، فنی اور لسانی حوالوں کا عصری ادبی مباحث اور تجزیاتی مطالعات میں نظر انداز کیا جانا ہماری تنقید کے آگے ایک بڑا سوالیہ نشان اور ہماری ادبی روایت کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

''نعت رنگ'' کے مذکورہ خصوصی شمارے کی ترتیب و تہذیب کے دوران مجھے کلام رضا کی تفہیم و تشریح پر مبنی ایسے بیشتر لوازمے کو توجہ سے دیکھنے کا موقع ملا جو اس وقت تک شائع ہو چکا تھا اور اس کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مولانا کی نعتیہ شاعری پر اب تک اُردو کے بہت سے نعت گو شعرا کے مقابلے میں دیکھا جائے تو کہیں زیادہ لکھا گیا ہے، مگر اس کا بیشتر حصہ تحسینی ہے کیوں کہ وہ صرف جذباتی عقیدت پر مشتمل ہے۔ ادب میں صرف عقیدت کے اظہار سے کام نہیں چلتا، یہاں تو تحلیل، تبصرہ، تجزیہ کرتے ہوئے نتائجِ فکر پیش کرنے کا تقاضا ہوتا ہے، جس کی کمی اس باب میں صاف صاف محسوس ہوتی ہے۔ نقد و نظر کا ماحول ایک کھلی فضا کا تقاضا کرتا ہے، جب کہ ہم نے مولانا کے گرد ایک ایسا تقدیسی ہالا قائم کر رکھا ہے جو شعری تخلیقات کو معروضی انداز اور ادبی معیارات کی روشنی میں پرکھنے والے سنجیدہ اہلِ قلم کو اس طرف آنے سے روکنے کا سبب بن رہا ہے۔ یہ طبقہ اگر کہیں اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتا دکھائی بھی دیتا ہے تو سرسری انداز اور محتاط رویوں سے اس بات کی نشاندہی فوری طور پر ہو جاتی ہے کہ وہ صرف رسمی توصیف اور عمومی دلجوئی سے کام لے رہا ہے۔ اس مجموعی فضا کے حوالے سے میں نے اپنے احساسات ''نعت رنگ'' کے مولانا احمد رضا خاں نمبر کے ادارتی نوٹ میں کچھ اس طرح پیش کیے تھے:

حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں اُردو کے وہ خوش نصیب اور مقبولِ خاص و عام نعت گو ہیں جن پر بہت لکھا گیا ہے۔ اُردو کے کسی اور نعت گو پر اتنا نہیں لکھا گیا جتنا مطبوعہ مواد مولانا پر موجود ہے، لیکن مقالات و مضامین کی یہ کثرت ہمارے لیے خوشی کا باعث تو ہوسکتی ہے، اطمینان کا نہیں۔ خوشی اس بات کی کہ کسی نہ کسی بہانے ایک عظیم نعت گو کی یاد اور اس کے کام کی خوش بو پھیل رہی ہے اور عدم اطمینان اس بات پر کہ اس مطبوعہ سرمائے کی ایک بڑی تعداد سنجیدہ قارئین کو متاثر کرنے کے بجائے یکسانیت اور اُکتاہٹ کا احساس پیدا کر رہی ہے۔

ایسا صرف اس لیے ہے کہ یہ ساری تحریریں ایک دوسرے کی تفصیل و تلخیص معلوم ہوتی ہیں۔ اس ایوان میں فکرِ تازہ کے دریچے کم ہی کھلے ہیں۔ وہی چند موضوعات اور وہی چند حوالے جن کی بنیاد پر لاتعداد مضامین کا ایک ڈھیر لگا دیا گیا ہے۔ پھر ان مضامین کے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد مولانا احمد رضا خاںؒ کے ایسے حلقۂ ارادت منداں سے تعلق رکھتی ہے جو مولانا کی نعت گوئی پر صرف اور صرف مولانا سے عقیدت اور محبت کے اظہار کی خاطر کچھ لکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ادب اور زبان سے جڑے مسائل ان کا مسئلہ اور موضوع نہیں۔

نتیجتاً ایسی تحریروں کی تعداد زیادہ ہے جو اعلیٰ حضرت کی نعتیہ شاعری کی تحسین کے نام پر جمع کر دی گئی ہیں۔ اس انبار میں مولانا کی نعتیہ شاعری پر لکھے گئے ایسے سنجیدہ، علمی اور تنقیدی مقالے بھی ہیں جو عصری ادبی میلانات کی روشنی میں لکھے گئے تھے اور جنھیں نمایاں کرنا ضروری تھا، مگر وہ کہیں دب کر رہ گئے۔ ان کی وہ توقیر نہیں ہوسکی جس کے وہ مستحق تھے۔

یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ ہم نے مولانا کی نعتیہ شاعری کو ادبی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور بحیثیت شاعر ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو پرکھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ خود کی، نہ دوسروں کو اس کی اجازت دی۔ مولانا کی نعتیہ شاعری اور ان کا شعری عمل خالص ادبی نقطۂ نظر سے ہونے

والی گفتگو کا وسیع، خیال افزا اور خیال افروز ماحول چاہتے ہیں۔ مگر ہم مولانا کی نعتیہ شاعری کو ان کے دیگر اہم اور وقیع کاموں کے ساتھ ملا کر دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں جس کے نتیجے میں وہ بحیثیت شاعر محدود تر حوالے سے موضوعِ گفتگو بنتے ہیں اور ایک معروف عالمِ دین اور مذہبی و مسلکی رہنما کی حیثیت سے زیادہ توجہ حاصل کرتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں ادب کے نقاد اور قاری دونوں ہی ان کے کلام پر آزادانہ اور ناقدانہ رائے دینے میں محتاط رویوں کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

مولانا پر پر لکھے گئے بیش تر اہلِ علم کے مضامین پر ایک نظر ڈالیے، آپ کو مولانا کی مذہبی خدمات، علمی حیثیت اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرے تو خوب ملیں گے مگر شعری محاسن پر چند جملوں اور چند سطروں سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔ ایسا صرف اور صرف اس لیے ہے کہ ہم اب تک مولانا کو خود بحیثیت شاعر موضوعِ گفتگو نہیں بننے دے رہے کہ کوئی لسانی یا ادبی اختلاف سامنے نہ آجائے اور اگر کہیں ایسا ہوا بھی ہے تو ہم نے اسے مولانا کی شخصیت یا علمی مرتبے پر حملہ تصور کرتے ہوئے اپنی برہمی کا اظہار کیا ہے۔ ہمارا یہی رویہ مولانا کی شعری عظمت کے وسیع تر اعتراف میں حائل رہا ہے، مولانا کی زندگی میں بھی اور آج بھی۔ ردِعمل کے اس رویے کا نقصان یہ ہوا کہ ایک عظیم نعت گو شاعر ہماری سنجیدہ اور مرکزی ادبی تاریخ کا حصہ نہ بن سکا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم ان کا یوں تذکرہ ہی نہیں چاہتے؟ اس طرح تو ہم خود اُردو کے نعتیہ اور اسلامی ادب میں مولانا کے مقام اور کام کا شمار نہ ہونے کے ذمہ دار ٹھہریں گے۔ کیا سعدیؒ، رومیؒ اور جامیؒ کی منظومات پر کسی ادبی و لسانی تنقید نے ان کی شخصی عظمت اور علمی مرتبت کی ضیا کم کی ہے؟ ہمیں اپنے رویے پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی، اس فضا کو بدلنا ہوگا۔ ہماری یہ جذباتیت کلام رضا کی تفہیم کے راستے بند کر رہی ہے۔

عربی، فارسی اور اُردو کے حوالے سے تمام بڑے اور محترم نام جو علم و فضل میں درجۂ استناد رکھتے ہیں اور شاعر بھی ہوئے، ان پر ہونے والے کاموں پر ایک نظر ڈالیے، کیا ان پر لکھنے والوں کو اظہارِ رائے کی آزادی نہیں دی گئی اور کیا اس کے نتیجے میں ان پر ہونے والے کاموں کی رفتار اور اس کی قبولیت و پذیرائی کے آثار نمایاں نہیں ہیں۔

اگر ہم اپنی سوچ کو کشادہ کر کے اس فضا کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ہم نے اہلِ علم کو سنجیدگی سے کلامِ رضا پر لکھنے کا موقع فراہم کیا تو مجھے یقین ہے کہ کلامِ رضا کی تابندگی اور اس کی عظمت سے نہ صرف ہماری ادبی تاریخ منور ہوگی، بلکہ ہمارا وہ قاری جو اس موضوع پر موجود مواد کی یکسانیت کی وجہ سے اُکتاہٹ کا اظہار کر رہا ہے، وہ بھی پوری دلچسپی سے اس طرف متوجہ ہوگا۔ ان شاء اللہ!

(نعت رنگ، شمارہ ۱۸، مطبوعہ ۲۰۰۵ء)

اس ساری تفصیل کو ایک بار پھر آپ کے سامنے پیش کرنے کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ ہمیں اب مولانا کے کلام پر ازسرِ نو ادبی زاویوں سے گفتگو کا ماحول سازگار بنانا چاہیے اور اس سلسلے میں ادب کے معتبر اور ثقہ نقادوں، ادیبوں اور شاعروں کو آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ مولانا کی شعری تخلیقات پر نقد و نظر کے دَر وا کریں۔ اس کتاب میں شامل مضامین کو اسی خیال سے یک جا پیش کیا جا رہا ہے کہ اس کام کی راہ کو ہموار کیا جائے اور اس رویے کو فروغ دیا جائے۔

ادب کے کسی بھی سنجیدہ قاری کے لیے عام ادبی ذوق اور پسندیدگی کے بدلتے ہوئے معیار اور ایک شاعر کی قدر و قیمت میں عہد بہ عہد اُتار چڑھاؤ کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا۔ ان تبدیلیوں کی اہمیت کو سمجھنے اور ایک ادبی شاہکار کو مختلف زمانوں کے زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرنا نہ صرف ادبی ذوق کی تربیت کرنے اور ادبی روایت کا شعور حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے، بلکہ یہ اپنے عصر کے لیے ایک صحت مند اور پہلودار روایتی پس منظر کی تعمیر اور ہم عصر لکھنے والوں کی تخلیقات کے لیے متوازن فکر و نظر کا معیار قائم کرنے کے سلسلے میں بھی ایک اہم اور سنجیدہ کوشش کا درجہ رکھتا ہے۔

ادب و فن کے اصولوں کے تحت دیکھا جائے تو کسی بھی شاعر کا فنی مطالعہ کرنے کے دو خاص زاویے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ شاعر کو اُس کے عہد کے تقاضوں، ماحول اور تناظر میں رکھ کر اس کے کلام کو ان اقدار کی روشنی میں پرکھا جائے جو اس عہد میں رواج پا چکی تھیں اور پسندیدہ سمجھی جاتی تھیں۔ دوسرا زاویہ یہ ہو سکتا ہے کہ دورِ حاضر کے ادبی

ذوق و معیار کو بنیاد بنا کر شاعر کو جدید آگہی کے مطابق از سرنو دریافت کیا جائے۔ میرے خیال میں کلامِ رضا پر اوّل الذکر زاویے سے برابر اور بہت کچھ لکھا گیا ہے اور حالیہ دور تک لکھا جا رہا ہے۔ تاہم اب ضرورت اس امر کی ہے کہ جدید عصری ادبی تناظر میں کلامِ رضا کے مطالعے کا رُجحان پیدا کیا جائے۔ اسی صورت میں یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کلام کے وہ کون سے فکری اور ادبی میلانات ہے جو اس عہد کے شعری اسالیب اور تخلیقی معیارات کے حامل ہیں اور مولانا احمد رضا خاں کے اس دور کے شعری تناظر میں زندہ رہنے اور پڑھے جانے کا جواز فراہم کرتے ہیں۔

ہر کلام کو عہد بہ عہد قرأت کی تبدیلیوں کے ساتھ معانی کے آفاق کے پھیلتے ہوئے منظرنامے میں پڑھنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ادوار میں بعض اساتذہ کے کلام کی نئی نئی شرحیں سامنے آتی رہی ہیں۔ اس ضمن میں غالب اور اقبال مثال کے درجے میں آتے ہیں۔ ان کی شرح و تعبیر کا جو کام ہوا، وہ نہ صرف دوسروں سے بہت زیادہ ہے، بلکہ اس حوالے سے بھی غور طلب ہے کہ مختلف ادوار میں مختلف نظریات اور ذہن کے حامل لوگوں نے الگ الگ نظریاتی اور فکری اندازِ نظر سے یہ کام کیا ہے۔ اس نوع کے کام کی اصل اہمیت بھی یہی ہے کہ ہر نئے عہد کے لوگ ایک نئی نگاہ اور ایک نئے زاویے سے اسے سرانجام دیں۔ غالب اور اقبال کے سلسلے میں تو تشریح و تعبیر کا یہ کام اپنا ایک جواز عام قاری کے لیے رکھتا ہی ہے، لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ میر تقی میر جو اپنے لہجے کے دھیمے پن اور زبان کی سادگی کے باعث ایک آسان شاعر سمجھا گیا تھا، اس کی شرح بھی جدید منظرنامے میں کی گئی تو ''شعرِ شور انگیز'' جیسا معرکہ آرا کام سامنے آیا جس میں تنقید کے پانچ پہلوؤں یعنی تشریح، تقابل، تجزیہ، تعیینِ قدر اور امتیاز کا خاص خیال رکھتے ہوئے میر کے کلام کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی شاعر کے جہانِ معنی کی تفہیم کا جواز محض اس کی زبان یا اس کے لسانی پیکروں کی عقدہ کشائی سے موسوم نہیں، بلکہ اس کے ادبی، جمالیاتی، تلازماتی، حسیاتی اور فکری پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے عہد سے اسے ہم آہنگ کرنا بھی اس کی تشریح و تعبیر کا ایک رخ سامنے لاتا ہے۔ دراصل اسی رُخ کی بنیاد پر کسی بھی شاعر کی نئے زمانے سے ہم آہنگی کے پہلو سامنے آتے ہیں۔ یہی پہلو اُسے نئے زمانے میں قابلِ فہم بناتے اور زندہ رکھتے ہیں۔

میرے نزدیک نعتیہ ادب میں مولانا احمد رضا خاںؒ کی شاعری کا وہ مقام و مرتبہ ہے کہ ان کے کلام کا بھی ایسے ہی زاویوں سے مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ اسی خواہش کے تحت میں نے اس کتاب میں جو مضامین جمع کیے ہیں، ان میں سے چند ایک جدید ادب کے تناظر میں بھی لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب کی تدوین میں، جیسا کہ عرض کیا، یہ حقیقت ایک ادبی ضرورت اور فکری تقاضے کے طور پر مسلسل میرے پیشِ نظر رہی ہے کہ مولانا کی ادبی حیثیت کا تعین پوری معروضیت کے ساتھ اس وقت تک نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اُن کے تخلیقی اور شعری اظہار کو ان کی مذہبی حیثیت سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاتا۔ ایسا اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک ان کے ادبی کام کا جائزہ ادب کے اپنے معیارات کے تحت نہیں لیا جاتا۔ صنائع بدائع، محاکات، مدرکات، لسانیات اور جمالیات ایسے مستند مشرقی پیمانوں کے ساتھ ساتھ اب اُن کے کام کو جدید تاریخی، فکری، لسانی اور نظریاتی اصولوں کے تحت بھی دیکھا اور پرکھا جانا چاہیے تاکہ ان کی حقیقی ادبی عظمت نعتیہ ادب میں بالخصوص اور ادبی تناظر میں بالعموم متعین اور محکم ہوسکے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک وسیع اور وقیع نوعیت کا کام ہے، اس کے لیے مسلسل مساعی کی ضرورت ہے اور اس کی تکمیل میں وقت بھی صرف ہوگا۔

مولانا کی شاعری کے بارے میں ادب کے ایک ادنیٰ طالبِ علم اور نعت کے مستقل قاری کی حیثیت سے، میں جب بھی غور کرتا ہوں تو دو باتیں بالخصوص غور طلب محسوس ہوتی ہیں۔ پہلی جذبے کا وفور اور دوسری اظہار کا قرینہ۔ اپنے اوّلین تجزیے میں شاعری سب سے پہلے جذبے کے ابلاغ کی سطح پر ہی پرکھی جاتی ہے۔ شاعر کی کامیابی کے باقی سارے معیارات اس کے بعد ہی غور طلب ٹھہرتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مولانا کی شاعری میں جذبے کی فراوانی اور گہرائی ہر دو صورتوں میں مولانا کا کلام توجہ طلب نظر آتا ہے۔......

(باقی صفحہ 348 پر ملاحظہ فرمائیں۔۔۔)

مولانا عبدالمتین ضیائی
ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی

تلمیحات کے استعمال میں امام احمد رضا کا تفرد

ادب کی تاریخ میں بعض فنون ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی ظاہری ساخت نہایت مختصر ہوتی ہے، مگر ان کے باطن میں معنیٰ کا ایک وسیع جہان آباد ہوتا ہے۔ تلمیح انہی فنون میں سے ایک ہے۔ ایک لفظ، ایک ترکیب یا ایک مختصر اشارہ اور اس کے ساتھ تاریخ کا ایک باب، قرآن کی ایک آیت، حدیث کا ایک واقعہ، سیرتِ نبوی کا ایک روشن منظر یا تہذیب وثقافت کا پورا پس منظر قاری کے ذہن میں زندہ ہو جاتا ہے۔ یہی تلمیح کا حسن ہے کہ وہ الفاظ میں اختصار اور معانی میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ اردو شاعری میں تلمیح کا استعمال ابتدا ہی سے ملتا ہے لیکن نعتیہ شاعری میں اس کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے، کیونکہ نعت کا موضوع وہ ذاتِ اقدس ہے جن کی حیاتِ طیبہ قرآن کریم، احادیثِ نبویہ، سیرت، تاریخِ اسلام اور معجزات کے ایک لامحدود علمی و روحانی ذخیرے سے وابستہ ہے۔ اس لیے ایک کامیاب نعت گو صرف شاعر نہیں ہوتا بلکہ قرآن، حدیث، سیرت، تاریخ، علمِ کلام اور اسلامی روایت کا شناسا بھی ہوتا ہے۔ جتنا وسیع اس کا علمی سرمایہ ہوگا، اتنی ہی بامعنیٰ اور مؤثر اس کی تلمیحات ہوں گی۔

جب اردو نعتیہ شاعری کے افق پہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے تلمیح کو محض ایک ادبی صنعت کے طور پہ استعمال نہیں کیا بلکہ اسے اپنے فکری، اعتقادی اور جمالیاتی اظہار کا بنیادی وسیلہ بنا دیا۔ ان کے ہاں تلمیح صرف شعر کا حسن نہیں بڑھاتی بلکہ عقیدے کی وضاحت کرتی ہے، قرآنی مفاہیم اجاگر کرتی ہے، حدیث کے اشارات زندہ کرتی ہے، سیرت کے واقعات کو معنیٰ کی نئی وسعت عطا کرتی ہے اور بسا اوقات ایک پورے علمی مناظرے کو دو مصرعوں میں سمو دیتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے معاصر اور متقدم نعت گو شعرا سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کے اشعار میں قرآنی تلمیحات بھی ہیں، حدیثی تلمیحات بھی، سیرتی اشارات بھی، معجزاتِ نبوی کی جھلک بھی، انبیائے سابقین کے واقعات بھی، صحابۂ کرام رضوان اللہ عنہم کے تذکرے بھی اور اسلامی تاریخ کے وہ نقوش بھی جو شعر کو محض جذباتی اظہار سے بلند کر کے ایک علمی متن میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

زیرِ نظر مضمون کا مقصد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نعتیہ شاعری کی روایتی شرح پیش کرنا نہیں بلکہ اردو نعتیہ شاعری میں تلمیح کے فن کا تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے یہ واضح کرنا ہے کہ امام احمد رضا نے اس صنعت کو کن نئی جہتوں سے آشنا کیا، ان کے یہاں تلمیح کے مصادر کیا ہیں، اس کی فنی ساخت کیا ہے، اس کی اعتقادی بنیادیں کیا ہیں اور اردو نعتیہ ادب میں ان کا تفرد کن بنیادوں پہ قائم ہے۔

اس میں ہر تلمیح کو اس کے اصل ماخذ ---قرآنِ کریم، حدیثِ نبوی، سیرتِ طیبہ، تاریخِ اسلام یا دیگر اسلامی مصادر--- کی روشنی میں دیکھا جائے گا۔ اس کے بعد اردو نعتیہ شاعری کی روایت میں اس کے استعمال کا جائزہ لیا جائے گا، پھر امام احمد رضا کے اشعار کا تجزیہ کیا جائے گا اور جہاں ضرورت ہوگی وہاں ان کی نثری تصانیف سے اصل اقتباسات کی مدد سے یہ واضح کیا جائے گا کہ ان کی نظم اور نثر ایک ہی فکری سرچشمے سے فیض یاب ہیں۔

اس طرح یہ مضمون صرف اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری

برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اشعار کی شرح نہیں بلکہ اردو نعتیہ شاعری میں تلمیح کے فن اور امام احمد رضا کے اسلوبیاتی، فکری اور اعتقادی تفرد کا ایک تحقیقی مطالعہ ہوگا، جس سے امید ہے کہ اس موضوع پہ آئندہ تحقیق کے لیے بھی نئی راہیں ہموار ہوں گی۔

تلمیح: لغوی، اصطلاحی اور ادبی مطالعہ

ادب کی مختلف اصناف میں بعض ایسی صنعتیں پائی جاتی ہیں جو الفاظ کی کثرت سے نہیں بلکہ اشاروں کی قوت سے اپنا اثر پیدا کرتی ہیں۔ ان میں تلمیح کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ یہ محض ایک ادبی صنعت نہیں بلکہ علم، حافظے، تہذیب اور فکری روایت کے باہمی امتزاج کا نام ہے۔ ایک کامیاب تلمیح اپنے اندر صدیوں کی تاریخ، مذہبی روایت، تہذیبی شعور اور ادبی ذوق کو اس انداز سے سمو لیتی ہے کہ چند الفاظ پورے ایک عہد کی نمائندگی کرنے لگتے ہیں۔

لفظ ''تلمیح'' عربی مادہ (ل۔م۔ح) سے مشتق ہے، جس کے بنیادی معنیٰ ہیں: تیزی سے دیکھنا، اشارہ کرنا، کسی چیز کو سرسری طور پہ نمایاں کر دینا یا بغیر صراحت کسی حقیقت کی طرف متوجہ کرنا۔ اسی مناسبت سے علمِ بلاغت میں تلمیح اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں شاعر یا ادیب کسی معروف واقعے، شخصیت، قرآنی آیت، حدیث، تاریخی واقعہ، ضرب المثل یا ادبی روایت کی طرف براہِ راست بیان کی بجائے محض ایک لطیف اشارے سے ذہن منتقل کر دے۔

یہی وجہ ہے کہ تلمیح کی کامیابی صرف شاعر کے کمال پہ منحصر نہیں ہوتی بلکہ قاری کے علمی پس منظر سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے۔ جتنا وسیع قاری کا مطالعہ ہوگا، اتنا ہی وہ تلمیح کے پوشیدہ معانی سے لطف اندوز ہوگا۔ گویا تلمیح شاعر اور قاری کے درمیان ایک خموش علمی مکالمہ ہے، جس میں الفاظ کم اور معانی زیادہ ہوتے ہیں۔ علم بلاغت کی متعدد صنعتیں بظاہر تلمیح سے مشابہ دکھائی دیتی ہیں لیکن ان کے دائرۂ کار اور مقاصد مختلف ہیں۔ اشارہ صرف کسی حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے، کنایہ کسی مفہوم کو غیر مستقیم انداز میں بیان کرتا ہے، استعارہ ایک چیز کو دوسری چیز کے قالب میں پیش کرتا ہے، جبکہ تلمیح ان سب سے مختلف اس اعتبار سے ہے کہ اس کا انحصار ایک ایسے معروف علمی یا تاریخی پس منظر پہ ہوتا ہے جسے شاعر بیان نہیں کرتا بلکہ قاری کے حافظے پہ چھوڑ دیتا ہے۔ اسی لیے تلمیح محض زبان کا حسن نہیں بلکہ تہذیبی حافظے کا اظہار بھی ہے۔ اگر کسی قوم کی تاریخی، دینی یا ادبی یادداشت کمزور ہو جائے تو اس کی تلمیحات بھی بے معنیٰ ہو جاتی ہیں۔

اسلامی ادب میں تلمیح کی اہمیت اس لیے غیر معمولی ہے کہ اس کی بنیاد صرف اساطیر یا قومی داستانوں پہ نہیں بلکہ وحی، نبوت اور تاریخ اسلام پہ قائم ہے۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پہ گذشتہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ السلام، اقوامِ سابقہ، معرکۂ بدر، ہجرت، اصحابِ کہف، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت ابراہیم علی نبینا علیہم الصلوٰۃ والسلام اور دیگر بے شمار واقعات کو بار بار یاد دلایا ہے۔ یہ تمام واقعات بعد کے اسلامی ادب میں تلمیح کے بنیادی مآخذ بن گئے۔

اسی طرح احادیثِ نبویہ، سیرتِ طیبہ اور آثارِ صحابہ نے بھی اسلامی شاعری کو ایسے اشارے عطا کیے جو صدیوں سے شعر و ادب کی زینت بنتے آ رہے ہیں۔ اس اعتبار سے اسلامی تلمیح محض ادبی صنعت نہیں بلکہ دینی شعور کی ترجمان بھی ہے۔

اردو نعتیہ شاعری اور تلمیح

اردو نعتیہ شاعری کا تعلق براہِ راست سیرتِ رسول اللہ ﷺ سے ہے، اس لیے اس میں تلمیح کا دائرہ دوسرے شعری موضوعات کی نسبت کہیں زیادہ وسیع ہے۔ یہاں شاعر کے سامنے قرآنِ کریم کی آیات، احادیثِ مبارکہ، معجزاتِ نبوی، غزوات، ہجرت، معراج، صحابۂ کرام، اہلِ بیتِ اطہار اور اسلامی تاریخ کا ایک لامحدود سرمایہ موجود ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر نعت گو شاعر اس ذخیرے سے یکساں استفادہ نہیں کر سکا۔ بعض شعرا نے معروف تلمیحات تک خود کو محدود رکھا، بعض نے حسنِ بیان پیدا کیا مگر بہت کم شعرا ایسے ہوئے جنہوں نے تلمیح کو ایک فکری، اعتقادی اور استدلالی نظام میں تبدیل کیا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا نام پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ان کے یہاں تلمیح محض صنعت نہیں، علم ہے، محض آرائش نہیں،

استدلال ہے، محض روایت نہیں، تحقیق ہے اور محض شعری حسن نہیں، بلکہ عقیدۂ اہلِ سنت کی بلیغ اور مؤثر ترجمانی ہے۔

چنانچہ آئندہ سطور میں ہم یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اردو نعتیہ شاعری میں تلمیح کے فن کو کس طرح نئی وسعت، نئی گہرائی اور نئے فکری آفاق عطا کیے اور کن بنیادوں پہ ان کا اسلوب اپنے پیش رووں اور معاصروں سے ممتاز قرار پاتا ہے۔

عربی، فارسی اور اردو نعتیہ شاعری میں تلمیح کی ارتقائی روایت

ہر ادبی صنعت کی طرح تلمیح بھی اچانک وجود میں نہیں آئی بلکہ اس نے ایک طویل فکری، تہذیبی اور ادبی سفر طے کیا ہے۔ اسلامی ادب کی تاریخ پہ نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تلمیح کی بنیادیں خود قرآنِ کریم میں موجود ہیں۔ قرآنِ حکیم نے گذشتہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ و السلام، سابقہ امتوں، تاریخی واقعات، اخلاقی مثالوں اور کائناتی نشانیوں کو بار بار ایسے اسلوب میں بیان کیا ہے کہ ایک واقعہ دوسرے واقعے کی طرف، ایک آیت دوسری حقیقت کی طرف اور ایک لفظ پورے ایک تاریخی پس منظر کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یہی اسلوب بعد میں اسلامی ادب کا مستقل مزاج بن گیا۔

چنانچہ جب نعتیہ شاعری نے ارتقائی سفر شروع کیا تو اس کے شعرا نے بھی قرآن، حدیث اور سیرتِ نبوی سے اخذ کردہ ان اشارات کو اپنے اشعار کا جزو بنایا۔ البتہ ہر دور اور ہر زبان میں تلمیح کا انداز یکساں نہیں رہا بلکہ اس کے اسالیب، مقاصد اور فنی جہات وقت کے ساتھ وسعت اختیار کرتی گئیں۔

نعتیہ شاعری کا پہلا اور سب سے مستند سرمایہ عربی زبان میں محفوظ ہے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اور ان کے بعد آنے والے شعرا نے جب رسول اللہ ﷺ کی مدح میں اشعار کہے تو ان کے سامنے قرآنِ کریم، آپ کی حیاتِ مبارکہ اور ابتدائی اسلامی معاشرہ براہِ راست موجود تھا۔ اس لیے عربی نعت میں تلمیح مصنوعی صنعت کے طور پہ نہیں بلکہ فطری اسلوب کے طور پہ جلوہ گر ہوئی۔

عربی نعت کے شعرا نے معراج، ہجرت، بدر، اُحد، فتحِ مکہ، شقُّ القمر، غارِ ثور، غارِ حرا، سدرۃ المنتہیٰ، لواء الحمد، حوضِ کوثر اور دیگر قرآنی و حدیثی واقعات کو نہایت سلیقے سے اپنے اشعار میں سمویا۔ ان کے ہاں تلمیح کا مقصد صرف حسنِ بیان پیدا کرنا نہیں بلکہ سیرتِ نبوی کے روشن ابواب کو محبت، عقیدت اور ایمان کے ساتھ زندہ رکھنا تھا۔

اسلامی تہذیب کے فروغ کے ساتھ جب فارسی زبان علمی و ادبی اظہار کا ایک بڑا وسیلہ بنی تو نعتیہ شاعری نے بھی ایک نئی جمالیاتی جہت اختیار کی۔ فارسی شعرا نے عربی روایت سے استفادہ کرتے ہوئے تلمیح کو زیادہ لطیف، رمز آمیز اور جمالیاتی رنگ عطا کیا۔ ان کے یہاں قرآنی اور حدیثی اشارات کے ساتھ ساتھ عرفانی تعبیرات، صوفیانہ استعارات اور اخلاقی اشارے بھی نمایاں ہونے لگے۔

اس دور میں تلمیح محض تاریخی یاد دہانی نہ رہی بلکہ روحانی تجربے اور باطنی کیفیات کے اظہار کا بھی مؤثر وسیلہ بن گئی۔ یہی وہ مرحلہ تھا جس نے بعد کی اردو نعتیہ شاعری کے لیے ایک مضبوط ادبی بنیاد فراہم کی۔ اردو نعتیہ شاعری نے عربی سے عقیدہ، فارسی سے جمالیات اور برصغیر کی علمی روایت سے وسعتِ اظہار حاصل کی۔ ابتدائی نعت گو شعرا نے عربی و فارسی روایات کی پیروی کرتے ہوئے قرآنی اور حدیثی تلمیحات کو اپنے اشعار میں جگہ دی لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ان کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اردو نعت میں معراج، شقُّ القمر، غارِ ثور، بدر، حنین، ہجرت، حوضِ کوثر، لوائے حمد، مقامِ محمود، قابَ قوسین، سدرۃ المنتہیٰ، ختمِ نبوت، رحمۃ للعالمین اور دیگر بے شمار قرآنی و سیرتی تلمیحات نہایت تواتر کے ساتھ استعمال ہوئیں۔ تاہم اکثر شعرا کے یہاں یہ تلمیحات جذبۂ عقیدت کی ترجمان رہیں، جب کہ ان کے فکری اور استدلالی پہلو نسبتاً کم نمایاں ہوئے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی: روایت سے تفرد تک

اردو نعتیہ شاعری کا مطالعہ یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تلمیح کو صرف روایتی صنعت کے طور پہ استعمال نہیں کیا بلکہ اسے ایک فکری، اعتقادی اور علمی اسلوب میں ڈھال دیا۔ ان کے اشعار میں تلمیح بیک وقت

قرآن کی تفسیر، حدیث کی ترجمانی، عقیدۂ اہلِ سنّت کی توضیح اور ادبی حسن کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔

ان کے ہاں تلمیح کا استعمال محض روایت کی تقلید نہیں بلکہ روایت کی تخلیقی توسیع ہے۔ وہ ایک ہی شعر میں متعدد تلمیحات کو اس مہارت سے جمع کرتے ہیں کہ ہر تلمیح دوسری کی توضیح بن جاتی ہے اور شعر ایک ایسا فکری نظام تشکیل دیتا ہے جس میں بلاغت، استدلال، عقیدہ اور جمالیات ایک دوسرے سے جدا نہیں رہتے۔ یہی وہ امتیاز ہے جس نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اردو نعتیہ شاعری میں تلمیح کے فن کا ایک منفرد معمار بنا دیا۔ چنانچہ آئندہ سطور میں ہماری کوشش ہوگی کہ ان کی نعتیہ شاعری میں وارد ہونے والی تلمیحات کا صرف تعارف نہ کرایا جائے بلکہ ان کے مصادر، فنی ساخت، ادبی قدر، اعتقادی جہات اور اسلوبیاتی تفرد کا بھی تحقیقی جائزہ لیا جائے، تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اردو نعتیہ شاعری میں تلمیح کے فن کو کس قدر وسعت، گہرائی اور معنوی ثروت عطا کی۔

اصلِ ہر بود و بہبود تخمِ وجود
قاسمِ کنزِ نعمت پہ لاکھوں سلام

اردو نعتیہ شاعری میں حضور اکرم ﷺ کو مرکزِ کائنات، سرچشمۂ ہدایت اور مظہرِ رحمت کے طور پہ بیان کرنے والے اشعار کی کمی نہیں لیکن امام احمد رضا کے اس شعر کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے یہ تمام مضامین نہایت مختصر، جامع اور تہہ دار اسلوب میں سمو دیے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ شاعر نے "اصلِ ہر بود و بہبود" اور "تخمِ وجود" جیسی فلسفیانہ تعبیرات کیوں اختیار کیں؟ پھر دوسرے مصرع میں" قاسمِ کنزِ نعمت" کہہ کر کون سی قرآنی اور حدیثی تلمیح کو شعری قالب عطا کیا ہے؟ کیا یہ محض مبالغۂ مدح ہے یا اس کے پس منظر میں ایک منظم اعتقادی اور فکری نظام موجود ہے؟

یہی سوال اس شعر کی تفہیم کا نقطۂ آغاز ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کا یہ شعر پڑھتے ہی سب سے پہلے جو چیز قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، وہ اس کی غیر معمولی لفظیات ہیں۔ اردو نعت کے عمومی سرمائے میں ''نور''، ''رحمت''، ''شفاعت''، ''کرم'' اور ''احسان'' جیسے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں، لیکن ''بود''، ''بہبود''، ''تخمِ وجود'' اور ''کنزِ نعمت'' جیسی تراکیب ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو فلسفہ، تصوف، علمِ کلام اور قرآنی تعبیرات کے وسیع پس منظر سے آتے ہیں۔

یہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ صرف جذبۂ عقیدت کے شاعر نہیں رہ جاتے بلکہ ایک ایسے مفکر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جس کے سامنے اسلامی علوم کا پورا ذخیرہ موجود ہے اور جو جانتا ہے کہ کون سا لفظ اپنے اندر کتنی تہیں رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شعر میں ایک بھی لفظ ایسا نہیں جسے مترادف لفظ سے بدل دیا جائے اور مفہوم یا حسن متاثر نہ ہو۔ ہر لفظ اپنی جگہ دلیل ہے، ہر ترکیب اپنے اندر ایک مستقل علمی جہان رکھتی ہے۔

اس شعر میں ''بود'' اور ''بہبود'' ایک تہذیبی و فکری اشارہ ہے۔ فارسی میں ''بود'' کے معنیٰ ہیں ''ہونا''، ''وجود'' یا ''ہستی''، جبکہ ''بہبود'' سے مراد ہے ''بھلائی''، ''کمال''، ''اصلاح'' اور ''فلاح''۔ امام احمد رضا نے ان دونوں الفاظ کو ایک دوسرے کے مقابل لاکر ایک نہایت گہرا مفہوم پیدا کیا ہے۔

یہاں ''بود'' صرف کائنات کے وجود کی طرف اشارہ نہیں بلکہ ہر اس حقیقت کی علامت ہے جو عالمِ امکان میں ظہور پذیر ہوئی، اور ''بہبود'' اس وجود کے مقصد، اس کی تکمیل اور اس کے حسنِ انجام کی نمائندہ ہے۔ گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس ہستی کے سبب وجود کو معنیٰ ملا، اسی کے ذریعے وجود نے اپنی تکمیل بھی پائی۔ اگر وجود صرف پیدا ہو جائے مگر اپنے مقصد سے محروم رہے تو وہ ''بود'' تو ہے مگر ''بہبود'' نہیں۔ حضور اکرم ﷺ کی بعثت نے انسان کو صرف زندگی نہیں دی بلکہ زندگی کا مقصد بھی عطا کیا۔

یہی وہ نکتہ ہے جہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا شعر محض مدح سے بلند ہو کر ایک تہذیبی اور فکری اعلان بن جاتا ہے۔ وہ یہ باور کراتے ہیں کہ رسالتِ محمدیہ علیہ التحیۃ والثنا صرف ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ انسانی وجود کی معنویت کا سرچشمہ ہے۔ انسان کو وجود بھی اسی نور کی برکت سے ملا اور اس وجود کی

فلاح بھی اسی تعلیم کے ذریعے ممکن ہوئی۔

یہ تعبیر اپنے اندر ایک لطیف تلمیح بھی رکھتی ہے۔ قرآنِ کریم نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رحمت للعالمین قرار دیا ہے۔ "عالمین" میں صرف انسان نہیں بلکہ تمام جہان شامل ہیں۔ اس لیے "اصلِ ہر بود و بہبود" کی تعبیر قرآنی تصورِ رحمت کی ایک شعری تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ امام احمد رضا نے آیتِ قرآنی نقل نہیں کی بلکہ اس کے مفہوم کو نئے ادبی قالب میں ڈھال دیا ہے۔ یہی ان کی تلمیح نگاری کا وہ اسلوب ہے جس میں قرآن شعر کے اندر جذب ہو جاتا ہے لیکن شعر اقتباس کا بوجھ محسوس نہیں کرتا۔ یہی اس شعر کا پہلا علمی راز ہے کہ یہاں شاعر نے الفاظ کا انتخاب معنیٰ کے لیے نہیں بلکہ معنیٰ کی تہذیب کے لیے کیا ہے۔ ''بود'' اور ''بہبود'' دو الفاظ نہیں بلکہ پوری اسلامی فکر کا ایک نچوڑ اور خلاصہ ہیں اور یہی امام احمد رضا کی شعری عظمت کا پہلا مظہر ہے۔

زیرِ بحث شعر کا سب سے زیادہ دقیق، بلیغ اور فکری اعتبار سے گراں قدر لفظ ''تخمِ وجود'' ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی علمی وسعت، فلسفیانہ شعور اور شعری قوت ایک دوسرے سے ہم آغوش نظر آتی ہے۔ بظاہر یہ صرف دو لفظوں کی ترکیب ہے لیکن حقیقت میں اس کے پس منظر میں اسلامی عقائد، قرآنی اشارات، حدیثی مضامین اور صوفیانہ تعبیرات کا ایک وسیع عالم آباد ہے۔

عام شاعر اگر یہی مفہوم ادا کرنا چاہتا تو شاید "سببِ وجود"، سرچشمۂ ہستی" یا "باعثِ تخلیق" جیسی مانوس تعبیرات اختیار کرتا لیکن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے "تخمِ وجود" کہا۔ یہی ان کے شعری وجدان کا امتیاز ہے۔

تخم اپنی حقیقت میں درخت نہیں ہوتا مگر پورا درخت اپنی تمام شاخوں، پتوں، پھولوں اور پھلوں سمیت اسی میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ بظاہر وہ ایک مختصر سا دانہ ہے لیکن حقیقت میں ایک مکمل حیات اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسی فطری حقیقت کو شعری استعارے میں ڈھالتے ہوئے رسالتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت سے "تخمِ وجود" کی تعبیر اختیار کی۔

یہاں شاعر کا مقصود ہرگز یہ نہیں کہ نعوذ باللہ ذاتِ اقدسِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خالقِ کائنات ہیں، کیونکہ خالق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور تخلیق اسی کی صفت ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پوری علمی و فکری زندگی اسی عقیدۂ توحید کے دفاع سے عبارت ہے۔ ان کی نثری تصانیف اس بات پہ شاہد ہیں کہ وہ خالق اور مخلوق کے امتیاز کو عقیدۂ اسلام کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا اس شعر کا مفہوم اسی اعتقادی اصول کی روشنی میں سمجھا جائے گا۔

پس "تخمِ وجود" سے مراد علتِ فاعلی (Efficient Cause) نہیں بلکہ وہ سببی و تشریفی نسبت ہے جسے اسلامی روایت میں مختلف تعبیرات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ شاعر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کائنات کے ظہور، اس کی ہدایت اور اس کی تکمیل کے نظام میں ایک مرکزی مقام عطا فرمایا۔ تخم درخت کو پیدا نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نظام کے تحت اس کے ظہور کا ذریعہ بنتا ہے۔ اسی لطیف مناسبت کو امام احمد رضا نے نہایت احتیاط کے ساتھ شعر میں سمو دیا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں امام احمد رضا کا شعری اسلوب ان کے اعتقادی شعور سے ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے ایسا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا جس سے استقلالِ ذاتی کا وہم پیدا ہو بلکہ ایسا استعارہ منتخب کیا جو ایک طرف عظمتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پوری شان سے ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف عقیدۂ توحید کی سرحدوں کو بھی محفوظ رکھتا ہے۔ یہی ان کی نعتیہ شاعری کا اعتدال اور ان کی فکری پختگی ہے۔

اگر اس ترکیب کو اردو نعتیہ شاعری کے وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر شعرا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "باعثِ تخلیق"، جانِ جہاں" یا "روحِ کائنات" جیسے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، لیکن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے "تخمِ وجود" کہہ کر اس روایت میں ایک نیا اضافہ کیا۔ اس ترکیب میں حرکت بھی ہے، نمو بھی، بقا بھی اور تسلسل بھی۔ گویا وجود ایک جامد حقیقت نہیں بلکہ ایک مسلسل ظہور ہے اور اس پورے نظام کی معنوی نسبت حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قائم ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نثری تصانیف کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ وہ حضور اکرم ﷺ کے مقام و مرتبے کو ہمیشہ عطائے الٰہی کے دائرے میں بیان کرتے ہیں۔ جہاں بھی وہ حضور کے فضائل، اختیارات یا کمالات کا ذکر کرتے ہیں، وہاں بنیادی اصول یہی رہتا ہے کہ ہر کمال اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، ذاتی اور مستقل نہیں۔ یہی اصول اس شعر کی روح بھی ہے۔

لہٰذا "تخمِ وجود" کو بھی اسی فکری تناظر میں سمجھنا چاہیے۔ یہ شاعر کی وجدانی تعبیر ہے، کوئی فلسفیانہ دعویٰ نہیں، یہ محبت کا استعارہ ہے، کوئی مستقل عقیدہ وضع کرنا مقصود نہیں۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نثر اس شعر کی بہترین مفسر ہے، کیونکہ وہ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی ہر فضیلت کو عطا، اذن اور مشیتِ الٰہی کے تحت سمجھا جائے۔

یہی وہ نکتہ ہے جو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نعتیہ شاعری کو افراط و تفریط سے محفوظ رکھتا ہے۔ ان کے یہاں عشق، عقیدے کی حدود میں رہ کر اظہار پاتا ہے اور عقیدہ، عشق کی حرارت سے بے نیاز اور خشک نہیں ہونے پاتا۔ یہی توازن ان کے کلام کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔

اس شعر کا دوسرا مصرع اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نعتیہ فکر کے ان بلند ترین مقامات میں سے ہے جہاں حدیث، عقیدہ، بلاغت اور شعریت ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی حدِ فاصل باقی نہیں رہتی۔ وہ فرماتے ہیں:

قاسمِ کنزِ نعمت پہ لاکھوں سلام

بظاہر یہ ایک مختصر سا مصرع ہے، لیکن اس کے اندر معانی کی جو وسعت پوشیدہ ہے، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب اس کے الفاظ کو الگ الگ نہیں بلکہ ایک مربوط فکری نظام کے طور پہ پڑھا جائے۔

اس مصرع کا مرکزی لفظ "قاسم" ہے۔ عربی زبان میں "قاسم" کے معنیٰ ہیں: تقسیم کرنے والا، بانٹنے والا، عطا کو مستحقین تک پہنچانے والا۔ لیکن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک یہ لفظ محض لغوی مفہوم کا حامل نہیں بلکہ ایک نہایت واضح حدیثِ نبوی کی طرف اشارہ ہے۔

رسول ﷺ کا ارشاد ہے: ''إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِي''
یعنی: ''میں تو تقسیم کرنے والا ہوں اور عطا فرمانے والا اللہ تعالیٰ ہے۔''

یہ حدیث اس باب کی اصل بنیاد ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسی حدیث کو اپنے شعری وجدان میں جذب کیا اور صرف ایک لفظ "قاسم" کے ذریعے پورا حدیثی منظر شعر میں سمو دیا۔ یہی ان کی تلمیح نگاری کا اعجاز ہے۔ وہ حدیث نقل نہیں کرتے بلکہ حدیث کو شعر کی روح بنا دیتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ شاعر نے صرف "قاسم" نہیں کہا بلکہ "قاسمِ کنزِ نعمت" فرمایا۔ یہ اضافہ محض شعری حسن کے لیے نہیں بلکہ ایک گہرا اعتقادی اشارہ ہے۔

کنز عربی میں خزانے کو کہتے ہیں، لیکن ہر خزانہ "کنزِ نعمت" نہیں ہوتا۔ "نعمت" کا اضافہ یہ بتا رہا ہے کہ یہاں گفتگو دنیاوی مال و متاع کی نہیں بلکہ ان تمام ربانی نعمتوں کی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول ﷺ کے وسیلے سے انسانیت کو عطا فرمائیں۔ ایمان، قرآن، سنّت، ہدایت، معرفت، شفاعت، رحمت، مغفرت اور قربِ الٰہی ---یہ سب اسی "کنزِ نعمت" کی مختلف جلوے ہیں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے نہایت لطافت کے ساتھ حدیثِ مبارک کا مفہوم بھی برقرار رکھا اور قرآنِ کریم کا یہ ابدی اصول بھی پیشِ نظر رکھا کہ ہر نعمت، ہر قدرت اور ہر تصرف کا حقیقی سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اسی لیے انہوں نے "قاسم" کہا "تقسیم کرنے والا" کہا، "پیدا کرنے والا" نہیں۔ اس ایک لفظ کے انتخاب میں ان کی علمی بصیرت، فقہی احتیاط اور اعتقادی پختگی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

یہی وہ نکتہ ہے جو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نعتیہ شاعری کو اعتقادی توازن عطا کرتا ہے۔ ان کے یہاں مدح کا ہر لفظ توحید کے آئینے میں چمکتا ہے۔ وہ رسول اللہ

ﷺ کے مقام کو انتہائی رفعت کے ساتھ بیان کرتے ہیں مگر اس رفعت کی بنیاد ہمیشہ عطائے الٰہی، اذنِ ربانی اور مشیتِ خداوندی پہ قائم رکھتے ہیں۔ یہی اہلِ سنّت و جماعت کا وہ معتدل اور متوارث منہج ہے جو نہ مقامِ رسالت میں کسی نوع کی تنقیص گوارا کرتا ہے اور نہ الوہیت کی حدود واختیارات کو کسی غیر کے لیے ثابت کرتا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک توحید اور رسالت دو متقابل حقیقتیں نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے دو بنیادی عقائد ہیں۔ توحید یہ اعلان کرتی ہے کہ خالق، مالکِ حقیقی، مختارِ کل اور بالذات مؤثر صرف اللہ تعالیٰ ہے، جبکہ رسالت یہ تعلیم دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول ﷺ کو اپنی بے شمار نعمتوں، کمالات، اختیارات اور معجزات کا مظہر بنایا ہے۔ لہٰذا جو کچھ رسول اللہ ﷺ کے لیے ثابت ہے، وہ ذاتی (بالاستقلال) نہیں بلکہ عطائی (باذنِ الٰہی) ہے اور یہی نسبت عقیدۂ اہلِ سنّت کی روح ہے۔

اسی لیے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نعتیہ شاعری میں جہاں معجزات کا ذکر آتا ہے، وہاں اسلوبِ بیان پوری شان کے ساتھ عشق وتعظیم کا مظہر ہوتا ہے مگر اس کے باطن میں توحید کا چراغ مسلسل روشن رہتا ہے۔ ان کے اشعار میں مقامِ مصطفیٰ ﷺ کی بلندی اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ایک دوسرے کے مدمقابل نہیں آتیں، بلکہ ایک دوسرے کی دلیل اور تائید بن کر سامنے آتی ہیں۔ گویا ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی ہر عظمت، اللہ تعالیٰ کی عطا کی عظمت کا مظہر ہے اور محبوبِ خدا کی ہر شان، ربِّ کائنات کی ربوبیت اور قدرت ہی کا پرتو ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نعتیہ شاعری کا مطالعہ یہ حقیقت آشکار کرتا ہے کہ انہوں نے عشق کو عقیدے سے، عقیدے کو علم سے اور علم کو قرآن وسنّت سے اس طرح وابستہ کر دیا ہے کہ ان کی مدح سرائی نہ غلو کا شکار ہوتی ہے اور نہ تنقیص کا۔ وہ افراط وتفریط، دونوں انتہاؤں سے محفوظ رہتے ہوئے اہلِ سنّت کے اس اعتدال کی ترجمانی کرتے ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ کی بے مثال عظمت کا کامل اعتراف بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت والوہیت کا غیر متزلزل اقرار بھی۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نثری تصانیف کا مطالعہ بار بار یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی تمام شانیں، تمام کمالات اور تمام تصرفات اللہ تعالیٰ کی عطا، اذن اور مشیت کے تابع ہیں۔ وہ جہاں بھی حضور اکرم ﷺ کے علوم، اختیارات، شفاعت یا فضائل پہ گفتگو کرتے ہیں، وہاں بنیادی اصول یہی رہتا ہے کہ حقیقی معطی اللہ تعالیٰ ہے اور رسول اللہ ﷺ اس کے عطا کردہ فیض کے مظہر اور تقسیم فرمانے والے ہیں۔

یہی اصول اس شعر میں نہایت حسین پیرائے میں جلوہ گر ہوا ہے۔ اگر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ یہی حدیث نثر میں بیان کرتے تو وہ اس کی شرح دلائل سے کرتے لیکن شعر میں انہوں نے صرف "قاسمِ کنزِ نعمت" کہہ کر پوری حدیث، پورا اعتقادی نظام اور پوری روحانی نسبت ایک ہی ترکیب میں سمو دی۔

یہی ان کے شعری کمال کی معراج ہے۔

اردو نعتیہ شاعری میں حدیثی تلمیحات کا استعمال بہت سے شعرا نے کیا ہے مگر اکثر جگہ حدیث محض ایک استشہاد بن کر رہ جاتی ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہاں معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ حدیث کو شعر میں اس طرح جذب کرتے ہیں کہ اگر قاری حدیث سے واقف ہو تو شعر کے نئے جہان اس پہ منکشف ہوتے ہیں اور اگر واقف نہ بھی ہو تو شعر اپنی جمالیاتی تاثیر برقرار رکھتا ہے۔

یہی کامیاب تلمیح کی پہچان ہے کہ وہ شعر پر بوجھ نہ بنے بلکہ شعر کے حسن میں اضافہ کرے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ان کے یہاں تلمیح، شعر کی زینت نہیں بلکہ اس کی روح ہے۔

اسی لیے "قاسمِ کنزِ نعمت" کو صرف ایک مدحیہ ترکیب سمجھ لینا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔ یہ دراصل حدیثِ نبوی کی شعری تفسیر، اہلِ سنّت کے

اعتقادی اصول کی ادبی تعبیر اور نبوی فیضان کی ایک نہایت بلیغ تصویر ہے۔ یہی اس مصرعے کی فنی عظمت اور اس کی دائمی تازگی کا راز ہے۔

وہ دہن جس کی ہر بات وحیِ خدا
چشمۂ علم و حکمت پہ لاکھوں سلام

اردو نعتیہ شاعری میں رسولِ اکرم ﷺ کی زبانِ اقدس، لبِ مبارک اور کلامِ نبوی کی مدح میں بے شمار اشعار ملتے ہیں لیکن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہ شعر اپنے اندر ایک غیر معمولی علمی اور اعتقادی گہرائی رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ شاعر نے "زباں" کی بجائے "دہن" کیوں کہا؟ پھر "ہر بات وحیِ خدا" سے ان کی مراد کیا ہے؟ کیا یہ ایک عام مدحیہ اسلوب ہے یا اس کے پس منظر میں قرآنِ کریم، علمِ اصولِ حدیث اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اعتقادی فکر پوری قوت کے ساتھ جلوہ گر ہے؟

یہی سوال اس شعر کے فہم کی بنیاد ہے۔ ''دہن'' کا انتخاب: لفظ نہیں، ادب کا عنوان ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ الفاظ کا انتخاب محض شعری ضرورت کے تحت نہیں کرتے، بلکہ ہر لفظ اپنے ساتھ ایک تہذیبی اور ادبی شعور لے کر آتا ہے۔ یہاں اگر وہ "زباں" کہتے تو مفہوم ادا ہو جاتا لیکن "دہن" کہہ کر انہوں نے شعر میں ادب، جمال اور تعظیم کی ایک نئی فضا قائم کر دی۔

فارسی اور اردو کی کلاسیکی نعتیہ روایت میں "دہن" صرف جسمانی عضو کا نام نہیں بلکہ اس مبارک سرچشمے کی علامت ہے جہاں سے قرآن کی تلاوت سنائی دی، جہاں سے حکمت کے چشمے پھوٹے، جہاں سے ایمان کو جلا ملی اور جہاں سے انسانیت نے زندگی کا دستور پایا۔ اس طرح "دہن" کا لفظ اپنی ظاہری دلالت سے بلند ہو کر ایک روحانی علامت بن جاتا ہے۔ یہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اسلوب کا خاص وصف ہے کہ وہ جسمانی اوصاف کو بھی روحانی معنویت عطا کر دیتے ہیں۔ ان کے یہاں دہن، لب، جبیں، قدم، زلف اور نگاہ-----سب اپنی مادی حیثیت سے بلند ہو کر نبوت کے مختلف مظاہر کی علامت بن جاتے ہیں۔

ہر بات وحیِ خدا" تلمیح کا مرکز۔ اس شعر کا سب سے اہم حصہ یہ ہے: ''جس کی ہر بات وحیِ خدا''

یہ مصرع براہِ راست قرآنِ کریم کی سورۂ نجم کی ان آیات کی طرف رہنمائی کرتا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى ○ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان آیات کا لفظی ترجمہ نہیں کیا، نہ ہی انہیں شعر میں بعینہٖ نقل کیا، بلکہ ان کے مفہوم کو ایک نئی شعری ساخت عطا کی۔ یہی ان کی تلمیح نگاری کا کمال ہے۔ وہ قرآنی الفاظ دہراتے نہیں بلکہ قرآنی فکر کو شعر کی روح بنا دیتے ہیں۔ تاہم یہاں ایک نہایت اہم علمی نکتہ پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ شاعر کا مقصود یہ نہیں کہ حضور اکرم ﷺ کا ہر کلام بذاتِ خود وحیِ متلو ہے۔ قرآنِ مجید کی وحی اور اس کے احکام اپنی مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ اس شعر میں "ہر بات" سے مراد وہ ارشادات، تعلیمات اور دینی رہنمائی ہے جو منصبِ رسالت کے تحت امت کو عطا ہوئی اور جسے قرآنِ کریم نے وحیِ الٰہی کی تائید سے معتبر قرار دیا۔ یہی اعتدال ملحوظ رکھے بغیر اس شعر کی صحیح تفہیم ممکن نہیں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نثری فکر کی روشنی میں اس شعر کی تفہیم کی کوشش نتیجہ خیز ہوگی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نظم اور نثر ایک دوسرے کی تفسیر بن جاتی ہیں۔ ان کی نثری تصانیف میں سنّتِ رسول اللہ ﷺ کی حجیت، حدیث کی شرعی حیثیت اور اطاعتِ رسول کی فرضیت پہ نہایت مضبوط استدلال ملتا ہے۔ ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ اللّٰہ کا دینی ارشاد محض ایک عالم یا مصلح کا بیان نہیں بلکہ منصبِ نبوت سے صادر ہونے والی وہ ہدایت ہے جس کی بنیاد وحیِ الٰہی ہے۔ اسی لیے وہ بار بار یہ قرآنی اصول نمایاں کرتے ہیں کہ اطاعتِ رسول اللہ ﷺ دراصل اطاعتِ خدا ہے اور رسولِ اکرم ﷺ کی تشریعی رہنمائی امت کے لیے واجب الاتباع ہے۔

یہی علمی فکر اس شعر میں جمالیاتی قالب اختیار کر لیتی ہے۔ نثر

میں جو حقیقت دلائل، آیات اور احادیث سے ثابت ہوتی ہے، شعر میں وہی حقیقت دو مصرعوں کی لطافت میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ شعر صرف نعت نہیں بلکہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیہ کے اصولِ حدیث اور اصولِ شریعت کا شعری خلاصہ ہے۔

''چشمۂ علم وحکمت'' --ایک جامع استعارہ ہے۔ پہلے مصرع میں وحی کا ذکر آیا اور دوسرے میں "چشمۂ علم وحکمت" کی تعبیر۔ یہ ترتیب خود اس بات کی دلیل ہے کہ وحی کا پہلا ثمر علم ہے اور علم کی تکمیل حکمت سے ہوتی ہے۔ چشمہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ وہ ایک مرتبہ پانی دے کر خشک نہیں ہو جاتا بلکہ مسلسل فیض پہنچاتا ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیہ نے حضور اکرم ﷺ کو "سمندرِ علم" یا "خزانۂ حکمت" کہنے کی بجائے "چشمہ" کہا۔ اس میں ایک نہایت لطیف اشارہ ہے کہ نبوی تعلیمات کا فیض قیامت تک جاری رہنے والا ہے۔ چودہ صدیاں گذر جانے کے باوجود قرآن کی تفسیر، حدیث کی شرح، فقہ کی تدوین، اخلاق کی تعمیر اور روحانیت کی تربیت اسی چشمۂ نبوت سے سیراب ہو رہی ہے۔

یہ استعارہ ایک زندہ اور متحرک فیضان کی تصویر پیش کرتا ہے۔ گویا علم جامد سرمایہ نہیں بلکہ مسلسل بہنے والی نعمت ہے اور اس کا سرچشمہ رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔

تنقیدی جائزہ

اس شعر کا سب سے بڑا فنی کمال یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیہ نے دو قرآنی تصورات ---وحی اور حکمت-- کو ایک مربوط شعری نظام میں جمع کر دیا۔ نہ انہوں نے آیات نقل کیں، نہ ان کی تشریح نظم میں کی بلکہ ان دونوں مفاہیم کو ایسے شعری پیکر میں ڈھالا کہ شعر اپنی ادبی لطافت بھی برقرار رکھتا ہے اور اپنی اعتقادی گہرائی بھی۔

یہی وہ مقام ہے جہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیہ اردو نعتیہ شاعری کے عام اسلوب سے بلند نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں شعر جذبات کا بہاؤ نہیں بلکہ علم کی تہذیب، عقیدے کی ترجمانی اور قرآن وسنّت کے معانی کی ادبی تشکیل ہے۔ اسی لیے ان کی نعتیہ شاعری کو محض ذوقِ محبت سے نہیں بلکہ علمی بصیرت کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ ہر شعر کے پس منظر میں ایک منظم فکری نظام پوری قوت کے ساتھ موجود ہے۔

صاحبِ رجعتِ شمس و شقُّ القمر
نائبِ دستِ قدرت پہ لاکھوں سلام

تلمیحِ معجزات اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیہ کا فنی شعور

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیہ کی نعتیہ شاعری کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ معجزاتِ نبوی کو محض واقعاتی انداز میں بیان نہیں کرتے بلکہ ان کے پس منظر میں کارفرما اعتقادی حقیقت کو بھی شعر کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک معجزہ تاریخ کا ایک واقعہ نہیں بلکہ نبوت کی صداقت، قدرتِ الٰہی کی تجلی اور مقامِ مصطفیٰ ﷺ کی ایک روشن دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ معجزات کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی نظر صرف واقعے پہ نہیں بلکہ اس واقعے کی روح پہ ہوتی ہے۔ زیرِ نظر شعر اسی حقیقت کا ایک نہایت بلیغ نمونہ ہے:

صاحبِ رجعتِ شمس و شقُّ القمر
نائبِ دستِ قدرت پہ لاکھوں سلام

پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے حضور اکرم ﷺ کے دو معجزات کا ذکر کر دیا ہے لیکن ناقدانہ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ شعر دو معجزات کا بیان نہیں بلکہ نبوی تصرفات کی وسعت کا ایک علامتی اظہار ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیہ نے یہ دونوں معجزات الگ الگ بیان نہیں کیے بلکہ ایک ہی مصرع میں جمع کر دیا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں؟

اگر مقصد صرف فضائل کا بیان ہوتا تو ہر معجزہ ایک مستقل شعر کا متقاضی تھا لیکن شاعر نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ واقعات

کی تفصیل بیان نہیں کر رہے بلکہ حضور اکرم ﷺ کے منصبِ معجزات کا ایک جامع تصور پیش کر رہے ہیں۔

مزید غور کیجیے! رجعتِ شمس کا تعلق سورج سے ہے، جو دن، وقت اور نظامِ ارضی کی علامت ہے۔ شق القمر کا تعلق چاند سے ہے، جو آسمانی نظامِ فلکی ترتیب اور شب کی علامت ہے۔ گویا ایک معجزہ دن کے نظام سے متعلق ہے اور دوسرا رات کے نظام سے۔ ایک سورج سے متعلق ہے اور دوسرا چاند سے۔ ایک وقت کے تسلسل میں تصرف کا مظہر ہے اور دوسرا اجرامِ فلکی کے نظام میں قدرتِ الٰہی کی تجلی۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے صرف دو واقعات جمع نہیں کیے بلکہ پورے نظامِ کائنات کو ایک مصرع میں سمیٹ دیا۔ گویا وہ یہ باور کرا رہے ہیں کہ جس نبی کے اشارے پہ سورج اپنا سفر بدل دے اور چاند اپنی ہیئت بدل لے، اس کی نبوت کسی ایک خطے یا ایک زمانے تک محدود نہیں بلکہ پوری کائنات اس کی صداقت کی گواہ ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تلمیح نگاری اپنے عروج پہ پہنچ جاتی ہے۔ وہ تاریخ نہیں لکھتے، تاریخ کے اندر چھپی ہوئی معنویت کو شعر بنا دیتے ہیں۔

اردو نعتیہ شاعری میں معجزات کا ذکر بہت ہوا ہے مگر اکثر شعرا واقعے کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اسلوب اس سے مختلف ہے۔ وہ صرف دو الفاظ کہتے ہیں: ''رجعتِ شمس'' اور پورا واقعہ قاری کے ذہن میں زندہ ہو جاتا ہے۔ پھر صرف دو الفاظ کہتے ہیں: ''شق القمر'' اور قرآنِ کریم کی پوری سورت، اس کا تاریخی پس منظر اور نبوت کی دلیل ذہن میں ابھر آتی ہے۔ یہی حقیقی تلمیح ہے۔

تلمیح کی کامیابی اسی میں ہے کہ شاعر کم سے کم الفاظ استعمال کرے اور زیادہ سے زیادہ معنیٰ پیدا کرے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس معیار پہ پوری شان کے ساتھ پورے اترتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نثری فکر کی روشنی میں جب ہم اس شعر پہ غور و فکر کی شمع روشن کرتے ہیں تو بھی اسی کے جلوے مختلف اسالیب میں نمایاں طور پر بنظر آتے ہیں۔

ان کی نثری تصانیف کا مطالعہ یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ وہ معجزات کو ہمیشہ قدرتِ الٰہی کی تجلی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک نبی کریم ﷺ کے دستِ اقدس پہ ظاہر ہونے والا ہر معجزہ اللہ تعالیٰ کی عطا، اس کے اذن اور اس کی قدرت کا مظہر ہے۔ نبی معجزے کے خالق نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول ہیں، جنہیں ربِ کریم نے اپنی قدرت کی نشانیاں ظاہر کرنے کا شرف عطا فرمایا۔

اسی اعتقادی اصول کی شعری تعبیر دوسرے مصرع میں سامنے آتی ہے: ''نائبِ دستِ قدرت پہ لاکھوں سلام''

یہاں شاعر نے "صاحبِ قدرت" نہیں فرمایا، نہ "مالکِ قدرت" کہا، بلکہ "نائبِ دستِ قدرت" فرمایا۔

یہ دو الفاظ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پورے اعتقادی نظام کا خلاصہ ہیں۔ وہ عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچاتے ہیں لیکن توحید کی سرحد سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتے۔ ان کے نزدیک اصل قدرت اللہ تعالیٰ کی ہے اور رسولِ اکرم ﷺ اسی قدرت کے مظہر، امین اور نائب ہیں۔ یہی اہلِ سنّت کا وہ معتدل اور محققانہ منہج ہے جو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ہر نعت میں مکمل آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔

تلمیح ''رجعتِ شمس''، حدیث، تاریخ اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا شعری شعور

زیرِ بحث شعر کی پہلی تلمیح "رجعتِ شمس" ہے اور یہی اس شعر کے علمی و فنی حسن کا پہلا دروازہ ہے۔ عام قاری اس ترکیب کو محض ایک معجزے کی طرف اشارہ سمجھ کر گزر جاتا ہے لیکن جب اس پہ تحقیقی نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے صرف ایک واقعے کا ذکر نہیں کیا بلکہ حدیث، تاریخ، علمِ کلام اور فنِ بلاغت کا ایک وسیع باب دو الفاظ میں سمو دیا ہے۔

رجعتِ شمس" سے مراد وہ معروف واقعہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا اور آپ کے معجزے سے سورج کو دوبارہ پلٹایا، تاکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عصر کی نماز ادا کر سکیں۔ اس واقعے کے بارے میں محدثین کے درمیان اسناد اور طرق کے اعتبار سے تفصیلی بحث موجود ہے اور اہلِ سنّت کے متعدد ائمہ نے اس کے مختلف پہلوؤں پہ نہایت عالمانہ و فاضلانہ گفتگو کی ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ان مباحث سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ صرف شاعر نہیں تھے بلکہ علمِ حدیث کے دقیق مسائل سے گہری واقفیت رکھنے والے محقق بھی تھے۔ اس لیے ان کے یہاں "رجعتِ شمس" کا ذکر کسی عوامی روایت کی بنیاد پہ نہیں بلکہ ایک شعوری اور علمی انتخاب کے طور پہ سامنے آتا ہے۔

یہاں ایک نہایت لطیف فنی نکتہ قابلِ غور ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ نہیں فرمایا کہ:

جس نے سورج پلٹایا۔۔۔۔ یا۔۔۔جس کے حکم سے سورج لوٹ آیا بلکہ صرف فرمایا: ''صاحبِ رجعتِ شمس''، یہی وہ مقام ہے جہاں ان کی بلاغت اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

صاحب" عربی و اردو روایت میں صرف مالک کے معنیٰ میں نہیں آتا بلکہ کسی خاص وصف، شرف یا امتیاز کے حامل شخص کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں بھی متعدد مقامات پر" صاحب" اسی معنیٰ میں آیا ہے۔ لہٰذا ''صاحب رجعتِ شمس'' کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہستی جس کے ساتھ سورج کے پلٹنے کا یہ عظیم معجزہ وابستہ ہے، اور جس کی نسبت سے یہ واقعہ تاریخِ نبوت کا حصہ بن گیا۔

یہاں بھی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا اعتقادی اعتدال پوری شان سے نمایاں ہے۔ انہوں نے معجزے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے منسوب ضرور کیا لیکن اس انداز میں کہ اصل مؤثرِ حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔ یہی اسلوب ان کی پوری نعتیہ شاعری میں جاری و ساری ہے۔

ان کی نثری تصانیف کا مطالعہ ہمیں یہ اصول دیتا ہے کہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معجزات کو ہمیشہ قدرتِ الٰہی کے تحت سمجھا جائے۔ وہ بارہا واضح کرتے ہیں کہ معجزہ نبی کا ذاتی کمال نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور اس کی قدرت کا ظہور ہے۔ نبی معجزے کے مظہر ہیں، خالقِ معجزہ نہیں۔

یہی اصول اس شعر میں پوری وضاحت کے ساتھ کارفرما ہے۔ صاحبِ رجعتِ شمس" کہہ کر شاعر نے عظمتِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیان کی مگر دوسرے مصرع میں" نائبِ دستِ قدرت" کہہ کر اس عظمت کو اس کے صحیح اعتقادی دائرے میں بھی قائم رکھا۔ گویا شعر کا پہلا مصرع معجزے کا بیان ہے اور دوسرا مصرع اس معجزے کی اعتقادی تفسیر۔

تنقیدی مطالعہ

اردو نعتیہ شاعری میں معجزات کا ذکر اکثر مقامات پہ صرف مدحیہ جذبے کے اظہار کے لیے کیا گیا ہے، لیکن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہاں معجزہ ایک علمی استدلال کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ وہ معجزے کو محض حیرت انگیز واقعہ بنا کر پیش نہیں کرتے بلکہ نبوت کی صداقت، اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مقامِ رسالت کی رفعت کی دلیل بنا دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ" رجعتِ شمس" ان کے یہاں صرف ایک تاریخی واقعہ نہیں رہتی بلکہ نبوی عظمت کی ایک دائمی علامت بن جاتی ہے۔ دو الفاظ کی یہ ترکیب اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہاں تلمیح حافظے کی آرائش نہیں بلکہ معنیٰ کی تخلیق ہے۔ ان کا ہر اشارہ اپنے اندر ایک مکمل علمی دنیا سموئے ہوئے ہے، اور یہی ان کی نعتیہ شاعری کو اردو ادب میں ایک منفرد اور بلند مقام عطا کرتا ہے۔

شش جہت سمت مقابل شب و روز ایک ہی حال
دُھوم وَالنَّجم میں ہے آپ کی بینائی کی

قرآنی تلمیح، کائناتی علامت اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا شعری اعجاز۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نعتیہ شاعری کا

مطالعہ اس حقیقت کو روزِ روشن کی طرح واضح کر دیتا ہے کہ وہ محض الفاظ کے شاعر نہیں بلکہ معانی کے معمار ہیں۔ ان کے یہاں ایک ایک لفظ اپنے پیچھے علم کی ایک دنیا، عقیدے کا ایک باب اور بلاغت کا ایک نیا افق لیے ہوئے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض اشعار کی تفہیم صرف لغت یا عروض کے ذریعے ممکن نہیں بلکہ ان کے لیے قرآن، حدیث، تفسیر، علمِ کلام اور کلاسیکی شعری روایت سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

زیرِ نظر شعر انہی نادر اشعار میں سے ہے جن میں شاعر نے صرف دو مصرعوں میں قرآنی تلمیح، کائناتی نظام اور مقامِ نبوت کا ایک نہایت دقیق پہلو نہایت بلیغ اسلوب میں بیان کیا ہے۔

» شش جہت سمت مقابل شب و روز ایک ہی حال
دُھوم وَالنّجم میں ہے آپ کی بینائی کی «

پہلی نظر میں یہ شعر مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن جوں جوں اس کے الفاظ کے پردے اٹھتے ہیں، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے شعری شعور کی نئی نئی جہتیں سامنے آتی جاتی ہیں۔

شش جہت" ---صرف ایک لفظ نہیں، ایک علمی اصطلاح ہے۔ شعر کا آغاز "شش جہت" سے ہوتا ہے۔ عام شاعر اگر تمام جہات کا ذکر کرنا چاہتا تو" چاروں طرف"، "ہر سو" یا" جہان بھر" جیسے مانوس الفاظ استعمال کرتا لیکن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے علمِ کلام اور فلسفے کی معروف اصطلاح "شش جہت" اختیار کی۔

اسلامی فلسفے اور علمِ کلام میں "شش جہت" سے مراد وجود کی چھ سمتیں ہیں: اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے۔ یہ تعبیر صرف جغرافیائی سمتوں کی نشاندہی ہی نہیں کرتی بلکہ کائناتی احاطے (Cosmic Totality) کی علامت ہے۔ گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کائنات کی کوئی سمت ایسی نہیں جو نگاہِ مصطفیٰ ﷺ کے فیضان سے خارج ہو۔

یہاں بھی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مبالغہ آرائی کا راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ ایک علمی اصطلاح کو شعری علامت بنا دیا۔ یہی ان کا امتیاز ہے کہ وہ فلسفے کو شاعری میں اس طرح جذب کرتے ہیں کہ نہ فلسفہ خشک محسوس ہوتا ہے اور نہ شاعری بوجھل۔

شب و روز ایک ہی حال" -----زمان و مکان کی وحدت

پھر وہ فرماتے ہیں: ''شب و روز ایک ہی حال''

یہ محض دن اور رات کا ذکر نہیں۔ ''شب و روز'' عربی و فارسی ادب میں زمانے کے تسلسل کی علامت ہیں۔ گویا مکان کے بعد زمان کو بھی شعر میں شامل کر لیا گیا۔ پہلے "شش جہت" کے ذریعے پوری فضا محیط کی اور پھر" شب و روز" کے ذریعے پورے زمانے کو۔

یہ اسلوب اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی غیر معمولی فنی مہارت کی دلیل ہے۔ صرف چند الفاظ میں انہوں نے مکان اور زمان دونوں کو جمع کر دیا، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ حضور اکرم ﷺ کی عطا کردہ بصیرت اور نورانیت کسی خاص سمت، کسی خاص مقام یا کسی خاص وقت تک محدود نہیں۔

یہاں" ایک ہی حال" کی تعبیر بھی نہایت معنیٰ خیز ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کی نورانی بینائی کے سامنے تاریکی اور روشنی، قرب اور بُعد، دن اور رات---یہ سب رکاوٹیں نہیں بنتیں، کیونکہ یہ بصیرت عام انسانی بصارت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نبوی بصیرت ہے۔

یہاں تک شعر کا پہلا مصرع ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مکان اور زمان دونوں کو ایک شعری پیکر میں سمو کر حضور اکرم ﷺ کی عطائی بصیرت کا بیان کیا ہے۔ لیکن شعر کا اصل معجزہ ابھی باقی ہے، کیونکہ دوسرے مصرع میں آنے والی" وَالنّجم" کی تلمیح اس پورے شعر کو قرآنی فضا سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ یہی اس شعر کا مرکزی محور ہے اور اسی سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تلمیح نگاری کی اصل عظمت سامنے آئے گی۔

دُھوم وَالنّجم میں ہے آپ کی بینائی کی" سورۂ النجم کی تلمیح اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قرآنی شعور

اس شعر کا دوسرا مصرع اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تلمیح نگاری کے ان نادر نمونوں میں سے ہے جنہیں سمجھے بغیر

ان کی نعتیہ شاعری کی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

»دُھوم وَالنَّجم میں ہے آپ کی بینائی کی«

عام قاری اس مصرع کو صرف سورۂ النجم کی طرف ایک اشارہ سمجھتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہاں صرف ایک سورت کا نام استعمال نہیں کیا بلکہ اس پوری سورت کا مرکزی مضمون شعر میں جذب کر دیا ہے۔ یہی ان کے فنی کمال کا راز ہے۔

اردو نعتیہ شاعری میں قرآنی الفاظ کا استعمال بکثرت ہوا ہے مگر اکثر مقامات پہ شاعر کسی ایک آیت یا ایک لفظ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا انداز اس سے مختلف ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''وَالنَّجْمِ''

یہ صرف سورۂ النجم کے ابتدائی لفظ کی طرف اشارہ نہیں بلکہ پوری سورت کی طرف دعوتِ فکر ہے۔

سورۂ النجم کا بنیادی موضوع کیا ہے؟ یہی کہ رسول اکرم ﷺ جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں وہ خواہشِ نفس پہ مبنی نہیں، وحیِ الٰہی پہ مبنی ہے۔ پھر اسی سورت میں معراجِ مصطفیٰ ﷺ، حضرت جبریل علیہ السلام سے ملاقات اور وہ عظیم منظر بیان کیا گیا ہے جسے قرآن نے ان الفاظ میں محفوظ کیا: ''مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی''

یعنی نگاہ نہ بہکی، نہ حد سے بڑھی۔

یہ وہ مقام ہے جہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا شعری شعور اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ انہوں نے "بینائی" کا ذکر کیا اور ساتھ ہی "وَالنَّجم" کی تلمیح لے آئے۔ گویا وہ صرف آنکھ کی تعریف نہیں کر رہے بلکہ اس بصارت کی مدح کر رہے ہیں جس کی صداقت پہ خود قرآنِ کریم نے مہرِ تصدیق ثبت کی۔

''بینائی'' سے مراد کیا ہے؟ یہاں ایک اہم تنقیدی سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا شاعر کی مراد صرف ظاہری آنکھ ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو شعر کی معنوی وسعت ختم ہو جاتی۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہاں "بینائی" صرف بصارت نہیں بلکہ بصیرت بھی ہے۔ یہ وہ نگاہ ہے جس نے عالمِ شہادت بھی دیکھا اور عالمِ ملکوت بھی۔ یہ وہ نظر ہے جس نے جبریلِ امین علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دیکھا۔

یہ وہ نگاہ ہے جس نے سدرۃ المنتہیٰ کے اسرار کا مشاہدہ کیا۔ اور یہی وہ نظر ہے جس کے متعلق قرآن نے فرمایا: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی" گویا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے صرف ایک لفظ ''بینائی'' میں پورے واقعۂ معراج کی روح سمو دی۔ یہاں بھی ان کا اسلوب وہی ہے جو ہم گذشتہ اشعار میں دیکھ چکے ہیں۔ وہ تفصیل بیان نہیں کرتے۔ وہ ایک علامت دیتے ہیں۔ اور وہ علامت پورا منظر قاری کے ذہن میں زندہ کر دیتی ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نثری فکر کی روشنی میں جب اس شعر کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو مفہوم اور زیادہ واضح طور پہ سامنے آ جاتا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نثری تصانیف میں معراجِ نبوی، رؤیت، خصائصِ مصطفیٰ ﷺ اور قرآنی آیاتِ معراج پہ نہایت دقیق علمی مباحث ملتے ہیں۔ ان کی تحقیق کا بنیادی اصول یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جو واقعۂ معراج بیان کیا ہے، اسے ظاہری اور حقیقی معنیٰ میں تسلیم کیا جائے، اور آیاتِ قرآنی کی روشنی میں رسولِ اکرم ﷺ کے مقامِ قرب کو سمجھا جائے۔

اسی منہج کا شعری اظہار اس مصرع میں سامنے آتا ہے۔ یہاں شاعر اپنی طرف سے کوئی نیا دعویٰ نہیں کر رہا بلکہ قرآن کے بیان کو حسنِ بیان کے ساتھ پیش کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نعتیہ شاعری میں جہاں جذبۂ عشق موجزن ہے، وہیں علمی احتیاط بھی ہر قدم پر موجود ہے۔

تنقیدی جائزہ

یہ مصرع اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تلمیح نگاری کا ایک منفرد نمونہ ہے۔ عام شاعر اگر معراج کا ذکر کرتا تو سدرۃ المنتہیٰ، رفرف، براق یا عرش کا تذکرہ کرتا، لیکن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے پورے واقعۂ معراج

کی وسعت پہ نظر ڈالی جائے تو اس میں بے شمار قرآنی اشارات، سیرتی مناظر اور روحانی حقائق جلوہ گر نظر آتے ہیں لیکن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی غیر معمولی شعری بصیرت کے ساتھ ان تمام جزئیات میں سے صرف ایک قرآنی تلمیح اور ایک ایسا قرآنی وصف منتخب کیا جو واقعۂ معراج کی روح اور اس کے باطنی حسن کا جامع عنوان بن جاتا ہے۔ ان کے نزدیک مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ※ محض ایک قرآنی جملہ نہیں بلکہ معراجِ مصطفیٰ ﷺ کا سب سے بلند جمالیاتی، روحانی اور اعتقادی مظہر ہے۔ یہ انتخاب اس بات کی دلیل ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مقصود صرف معراج کے عجائبات بیان کرنا نہیں بلکہ اس مقامِ قرب کو نمایاں کرنا ہے جہاں محبوبِ خدا ﷺ کی نگاہِ اقدس نہ حسنِ مشاہدہ میں لغزش کی شکار ہوئی، نہ جلالِ الٰہی کے سامنے حدودِ عبدیت سے متجاوز ہوئی۔ گویا معراج کا سب سے عظیم معجزہ صرف آسمانوں کی سیر نہیں بلکہ اس سفر میں بھی کمالِ ادب، کمالِ ضبط اور کمالِ عبودیت کا برقرار رہنا ہے۔

اسی لیے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس قرآنی وصف کو اپنے شعر کا محور بنایا۔ ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی عظمت کا اعلیٰ ترین مظہر یہ نہیں کہ آپ نے کون کون سے مشاہدات فرمائے بلکہ یہ ہے کہ ان بے مثال مشاہدات کے باوجود آپ کی نگاہِ اقدس "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی" کی ربانی شہادت کی آئینہ دار رہی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نبوت کا جلال، عبدیت کا جمال اور قربِ الٰہی کی انتہا ایک ہی قرآنی تعبیر میں سمٹ آتی ہے۔

یہی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا شعری تفرد بھی ہے۔ وہ واقعۂ معراج کے ظاہری مظاہر سے زیادہ اس کے باطنی اسرار پہ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں معراج صرف ایک معجزہ نہیں بلکہ آدابِ قرب، کمالِ عبودیت اور حسنِ مصطفوی کی سب سے بلند تفسیر ہے۔ اس لیے انہوں نے پورے واقعۂ معراج میں سے اسی قرآنی وصف کو منتخب کیا جو رسول اللہ ﷺ کی شخصیتِ اقدس کا یہ پہلو نمایاں کرتا ہے، جسے خود ربِّ کریم نے اپنی کتاب میں ہمیشہ کے لیے محفوظ فرما دیا۔

یہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شاعری کا ایک اور امتیاز بھی سامنے آتا ہے کہ وہ قرآنی تلمیح کو محض زینتِ کلام نہیں بناتے بلکہ اس کے اندر پوشیدہ اعتقادی، روحانی اور جمالیاتی معانی کو شعر کی روح میں اس طرح جذب کر دیتے ہیں کہ ایک مختصر مصرع پورے واقعۂ معراج کی فکری اور عرفانی تفسیر بن جاتا ہے۔ یہی ان کے اسلوب کا وہ تفرد ہے جو ان کی نعتیہ شاعری کو محض جذبۂ محبت کا اظہار نہیں رہنے دیتا بلکہ اسے قرآن فہمی، بلاغت اور عشقِ رسول اللہ ﷺ کا ایک حسین امتزاج بنا دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے "وَالنَّجْم" اور "بینائی" کو ایک ساتھ لا کر قرآن کی تفسیر بھی کر دی، معراج کا تذکرہ بھی کر دیا اور حضور اکرم ﷺ کے کمالِ بصارت و بصیرت کو بھی نہایت بلیغ انداز میں خراجِ عقیدت پیش کر دیا۔ یہی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا فنی امتیاز ہے کہ ان کے یہاں تلمیح صرف حافظے کی آزمائش نہیں بلکہ معنیٰ کی تخلیق، قرآن سے ربط اور فکر کی تعمیر کا ایک زندہ وسیلہ ہے۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی "اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شعری تعبیر

جب تلمیح، تفسیر بن جائے

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے اس شعر کی اصل روح سورۂ النجم کی اس عظیم آیت میں پوشیدہ ہے:

﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ و اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مَا طَغٰی﴾

اگر یہ آیت پیشِ نظر نہ رکھی جائے تو شعر کا جمال تو محسوس ہوگا مگر اس کی فکری اور اعتقادی گہرائی پوری طرح منکشف نہیں ہو سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے "وَالنَّجْم" کا ذکر کرتے ہی قاری کو از خود سورۂ نجم کے اس مقام تک پہنچا دیا جہاں قرآن خود رسولِ اکرم ﷺ کی بینائی کی عظمت کی شہادت دے رہا ہے۔

یہاں ایک نہایت لطیف ادبی نکتہ قابلِ توجہ ہے۔ قرآن نے یہ

نہیں فرمایا کہ آپ کی نگاہ بہت تیز تھی، یا بہت وسیع تھی، یا بہت بلند تھی، بلکہ فرمایا: ''نگاہ نہ بہکی اور نہ حد سے بڑھی۔'' یہ دو مختصر جملے دراصل نبوی بصارت کے کمال کا سب سے جامع بیان ہیں۔ ''مازاغ'' کا مطلب یہ ہے کہ نگاہ اپنے مقصود سے ایک لمحہ کے لیے بھی منحرف نہیں ہوئی۔ اور ''ما طغیٰ'' کا مفہوم یہ ہے کہ نگاہ نے ادبِ بندگی کی حدود سے تجاوز بھی نہیں کیا۔ گویا کمال صرف دیکھ لینے کا نہیں بلکہ صحیح دیکھنے کا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا شعری شعور اپنی پوری عظمت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ انہوں نے "بینائی" کا لفظ استعمال کیا مگر اس کے ذریعے اس قرآنی بینائی کی طرف اشارہ کیا جسے خود ربِ کائنات نے سندِ کمال عطا فرمائی۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر نے "علم"، "معراج" یا دیدار" کی بجائے "بینائی" ہی کو کیوں منتخب کیا؟

یہی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی انفرادی دریافت ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ معراج کا سب سے بڑا معجزہ صرف بلند مقام تک پہنچنا نہیں بلکہ وہاں بھی نگاہ کا ادب، سکون، اعتدال اور کمال برقرار رہنا ہے۔ انسان جب کوئی غیر معمولی منظر دیکھتا ہے تو حیرت، خوف یا اضطراب اس کی نگاہ کو متزلزل کر دیتا ہے، لیکن معراج کی شب رسول اللہ ﷺ کی بصارت ایسی کامل تھی کہ قرآن نے اس کی گواہی دیتے ہوئے فرمایا:

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی"

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسی قرآنی شہادت کو اپنے شعر میں نہایت لطیف انداز سے جذب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے "بینائی" کو صرف جسمانی قوت کے معنیٰ میں استعمال نہیں کیا بلکہ اسے کمالِ نبوت، کمالِ شعور اور کمالِ ادب کی علامت بنا دیا۔

نظم اور نثر کا باہمی ربط

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نثری تصانیف کا مطالعہ یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ وہ قرآنی آیات کو ہمیشہ ان کے ظاہر اور ان کے شایانِ شان معانی کے ساتھ سمجھتے ہیں۔ معراج کے مباحث میں بھی وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام مشاہدات حقیقی تھے اور آپ کی تمام قوتیں اللہ تعالیٰ کی عطا سے کامل ترین درجے پر تھیں۔

یہی علمی منہج اس شعر میں شعری پیکر اختیار کر لیتا ہے۔ نثر میں وہ اس حقیقت کو دلائل سے ثابت کرتے ہیں اور نظم میں صرف "بینائی" اور "والنجم" کہہ کر پوری بحث کو دو الفاظ میں سمو دیتے ہیں۔

یہ اختصار دراصل اختصار نہیں بلکہ علمی ایجاز ہے اور یہی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔

تنقیدی نتیجہ

اردو نعتیہ شاعری میں معراج کا ذکر کرنے والے شعرا کی کمی نہیں لیکن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا امتیاز یہ ہے کہ وہ معراج کے خارجی مناظر سے زیادہ اس کے قرآنی اسرار کو شعر کا حصہ بناتے ہیں۔ ان کے یہاں تلمیح محض واقعے کی یاد دہانی نہیں بلکہ قرآن کے ایک دقیق نکتے کی علمی و ادبی تعبیر ہے۔

اسی لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس شعر میں "والنجم" صرف ایک تلمیح نہیں بلکہ پوری سورۂ نجم کا فکری نچوڑ ہے اور "بینائی" صرف ایک وصف نہیں بلکہ آیتِ ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی﴾ کی شعری تفسیر ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک نعت گو شاعر سے آگے بڑھ کر مفسرِ قرآن کا ذوق رکھنے والے شاعر کے طور پہ سامنے آتے ہیں اور یہی ان کی نعتیہ شاعری کی سب سے بڑی انفرادیت ہے۔

سورج الٹے پاؤں پلٹے، چاند اشارے سے ہو چاک
اندھے نجدی دیکھ لے قدرتِ رسول اللہ کی

تلمیحِ معجزات اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا استدلالی اسلوب

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نعتیہ شاعری کا

ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ صرف جذبۂ محبت کے ترجمان نہیں بلکہ عقیدۂ اہلِ سنّت کی علمی و استدلالی وکالت بھی کرتی ہے۔ ان کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو محض مدح نہیں بلکہ ایک فکری مکالمہ، ایک اعتقادی استدلال اور بسا اوقات باطل افکار و نظریات کے لیے ایک خموش مگر مضبوط جواب بن جاتے ہیں۔ زیرِ نظر شعر اسی اسلوب کا بہترین نمونہ ہے۔

سورج الٹے پاؤں پلٹے، چاند اشارے سے ہو چاک
اندھے نجدی دیکھ لے قدرتِ رسول اللہ کی

اس شعر کے پہلے مصرع میں دو عظیم نبوی معجزات کو اس مہارت سے جمع کیا گیا ہے کہ ہر تلمیح اپنے پورے تاریخی اور حدیثی پس منظر کے ساتھ قاری کے ذہن میں روشن ہو جاتی ہے۔ "سورج الٹے پاؤں پلٹے" سے رجعتِ شمس کی طرف اشارہ ہے، جبکہ "چاند اشارے سے ہو چاک"، معجزۂ شقُّ القمر کی قرآنی تلمیح ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے دونوں واقعات کی تفصیل بیان نہیں کی بلکہ دو مختصر تصویر کے ذریعے پوری تاریخِ نبوت کو سامنے لا کھڑی کی ہے۔ یہی کامیاب تلمیح کی اعلیٰ ترین صورت ہے کہ چند الفاظ پورے واقعے کا قائم مقام بن جائیں۔

لیکن اس شعر کی اصل عظمت صرف یہ نہیں کہ اس میں دو معجزات جمع ہو گئے ہیں بلکہ یہ ہے کہ شاعر نے ان دونوں معجزات کو دلیل کے طور پہ پیش کیا ہے۔ وہ صرف یہ نہیں کہتے کہ یہ معجزات رونما ہوئے، بلکہ ان کے ذریعے ایک مخصوص فکری انکار کو مخاطب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرا مصرع پہلے مصرع کی منطقی تکمیل ہے۔

اندھے نجدی دیکھ لے قدرتِ رسول اللہ کی

یہاں "اندھا" جسمانی نابینائی کا استعارہ نہیں بلکہ فکری نابینائی کی علامت ہے۔ شاعر کی مخاطبت اس شخص سے ہے جو دلائل کی موجودگی کے باوجود مقامِ مصطفےٰ ﷺ کا اعتراف نہیں کرتا۔ اس لیے "دیکھ لے" کا حکم بھی ظاہری آنکھ سے زیادہ بصیرت سے متعلق ہے۔ گویا شاعر کہتا ہے کہ اگر تعصب کی پٹی ہٹا دی جائے تو سورج اور چاند کے یہ معجزات خود گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول ﷺ کو غیر معمولی معجزات سے سرفراز فرمایا۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہاں "قدرتِ رسول" کی تعبیر اختیار کی ہے، مگر اہلِ سنّت کے معروف اصول کے مطابق اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی عطا سے حاصل شدہ قدرت ہے، نہ کہ ذاتی و مستقل قدرت۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پوری نثری زندگی اس عقیدے کی وضاحت سے عبارت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ہر کمال، ہر اختیار اور ہر معجزہ اللہ تعالیٰ کے اذن، مشیت اور عطا کے تابع ہے۔ اسی لیے اس شعر کو ان کی نثری تصانیف کی روشنی میں پڑھنا ضروری ہے، تاکہ "قدرت" کا مفہوم اپنے صحیح اعتقادی دائرے میں سمجھا جا سکے۔ ادبی اعتبار سے بھی یہ شعر غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ "سورج الٹے پاؤں پلٹے" میں تشخیص (Personification) کا حسین انداز ہے، گویا سورج ایک فرماں بردار وجود ہے جو حکم ملتے ہی پلٹ کھڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح "چاند اشارے سے ہو چاک" میں فعل کی سرعت اور اختصار، دونوں مل کر معجزے کی ہیبت بڑھا دیتے ہیں۔ اس طرح دونوں مصرعے مل کر یہ تصور قائم کرتے ہیں کہ اجرامِ فلکی بھی مشیتِ الٰہی کے تحت رسولِ اکرم ﷺ کے معجزات کے مظہر بن جاتے ہیں۔ تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ شعر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے استدلالی اسلوب کا بہترین نمونہ ہے۔ انہوں نے مخالف مکتبِ فکر سے طویل مناظرہ نہیں کیا، نہ فلسفیانہ استدلال اختیار کیا بلکہ تاریخِ نبوت کے دو ایسے روشن معجزات پیش کر دیے جنہیں قرآن، حدیث اور اسلامی روایت نے محفوظ رکھا ہے۔ یہی ان کے شعری منہج کا امتیاز ہے کہ وہ جذبات کو دلائل سے اور عشق کو علم سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔

''اندھے نجدی''---ایک تاریخی اور فکری تلمیح

زیرِ نظر شعر کا دوسرا مصرع:

اندھے نجدی دیکھ لے قدرتِ رسول اللہ کی

محض ایک خطابی جملہ نہیں بلکہ برصغیر کی مذہبی و فکری تاریخ کے ایک اہم مناظرانہ پس منظر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں "نجدی" سے مراد کوئی جغرافیائی نسبت نہیں، بلکہ ایک مخصوص فکری مکتب ہے جس

کی بنیاد اٹھارہویں صدی میں محمد بن عبد الوہاب نجدی کے افکار پہ استوار ہوئی۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی متعدد نثری تصانیف میں اس مکتبِ فکر کے ان نظریات پہ تفصیلی نقد کیا ہے جنہیں وہ مقامِ رسالت، تعظیمِ نبوی اور اختیاراتِ مصطفےٰ ﷺ کے بارے میں اہلِ سنّت کے متوارث عقائد سے متصادم سمجھتے تھے۔

اسی فکری پس منظر میں ''اندھے نجدی'' کی تعبیر کو سمجھنا چاہیے۔ یہاں ''اندھا'' جسمانی نابینائی کا استعارہ نہیں بلکہ فکری محرومی اور بصیرت سے محرومی کی علامت ہے۔ شاعر کے نزدیک اصل اندھا وہ نہیں جس کی آنکھیں دیکھنے سے محروم ہوں، بلکہ وہ ہے جو قرآنِ کریم میں مذکور نبوی معجزات اور احادیثِ صحیحہ میں ثابت فضائل کے باوجود رسول اللہ ﷺ کے عطائی کمالات کا انکار کرے۔

شعر کے پہلے مصرع میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے دو ایسے معجزات کا ذکر کیا ہے جنہیں اہلِ سنّت کی علمی روایت میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے: رجعتِ شمس اور شقُّ القمر۔ پھر دوسرے مصرع میں انہی معجزات کو بطورِ دلیل پیش کرتے ہوئے مخاطب سے گویا یہ کہا کہ اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو یہ روشن نشانیاں خود مقامِ رسالت پہ گواہ ہیں۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے "قدرتِ رسول اللہ" کی تعبیر استعمال کی ہے، لیکن ان کی پوری نثری زندگی اس حقیقت کی شاہد ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے تمام کمالات کو عطائے الٰہی کے تحت سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کی قدرت، تصرف اور معجزات، سب اللہ تعالیٰ کی مشیت، اذن اور عطا کے مظاہر ہیں، نہ کہ ذاتی اور مستقل اختیارات۔ اس لیے یہ شعر بھی اسی اعتقادی اصول کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ یہ شعر محض ایک مناظرانہ رد نہیں بلکہ اہلِ سنّت کے تصورِ مقامِ رسالت کا ایک بلیغ شعری اعلان بھی ہے، جس میں دلیل بھی ہے، تلمیح بھی، بلاغت بھی اور اعتقادی توازن بھی۔

□□□□

(صفحہ 331 کا باقی حصہ ملاحظہ فرمائیں۔۔۔)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی عقیدت ہی کو مولانا نے شعر و سخن میں بیان نہیں کیا ہے، بلکہ شرفِ انسانیت کے معیارات کا تعین آپ کی ذاتِ گرامی کے شخصی اور انفرادی اوصاف کو اس انداز سے بنایا ہے کہ اس سے ہر زمانے اور ہر تہذیب کے لیے اخذ و استفادہ کی صورت واضح ہوگئی ہے۔ چناں چہ یہ اظہار مولانا کے ذاتی عقیدے تک محدود نہیں رہتا، بلکہ موجود و آئندہ زمانوں کے تہذیبی و ادبی اظہار کا جاوداں حوالہ بن جاتا ہے۔

اب جہاں تک معاملہ ہے اظہار کے قرینے کا تو مولانا کی نعت میں آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت بہ یک وقت محبوب اور ہادیِ برحق کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ چناں چہ اس نعت کی تفہیم و تعبیر کے ضمن میں عوام و خواص دونوں اپنی اپنی ذہنی و فکری سطح کے مطابق تسکین کا سامان پاتے ہیں۔ عامۃ الناس کے لیے محبوب کی جہت اور اہلِ فکر و دانش کے رُشد و ہدایت کی جہت ہے۔ اس کے ساتھ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا کے ہاں سخن کا لطف اور شعر کا حسن ایسا ہے کہ اس رُخ پر دل فدا ہوتا ہے تو اُس رُخ پر جاں نذر ہوتی ہے۔ چناں چہ اُن کے ہاں کلام کی تاثیر یہ کہ روح کیف و سرور سے، ہی نہیں عقل و شعور سے بھی ہم کنار ہو۔ مولانا کے کلام کی یہ دو جہتیں ہی معاصر ادبی و تنقیدی ذہن کے لیے مطالعے کا تقاضا نہیں رکھتیں، بلکہ ایسے ہی کئی لطیف نکات ہیں جو پڑھنے اور سوچنے والے ذہنوں کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب کی بابت مجھے نہ تو کوئی دعویٰ کرنا ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں وضاحتیں پیش کرنی ہیں۔ میں نے اس کام کی ضرورت مولانا کے ایک نیاز مند اور ادب کے قاری کی حیثیت سے پوری سچائی اور اخلاص کے ساتھ محسوس کی۔ اللہ رب العزت کا فضل و کرم ہے کہ مجھے روایتی اور جدید تنقیدی منظر نامے سے وہ لوازمہ بہر حال فراہم ہوگیا کہ میں اسے ایک امید اور اطمینان کے ساتھ مولانا کے نئے قارئین اور ناقدین کی نذر کر سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ انھی نئے لوگوں میں سے کچھ اور نام، کچھ اور ذہن آگے چل کر مولانا کے ادب و شعر کی تشریح، تعبیر اور تفہیم کا وہ کام کریں گے جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں اور جو ہمارے ادب و نقد پر اُن کا قرض بھی ہے۔

□□□□

مولانا مفتی راحت خاں قادری
بانی وسربراہ دارُالعلوم فیضان تاج الشریعہ، بریلی شریف

اَلْقَوْلُ الْجَلِیْ فِیْ نِسْبَةِ الْبَرَیْلَوِیْ

’’بریلوی‘‘ سوادِ اعظم کی پہچان ہے

(ادارتی نوٹ)

لفظ کی نہیں، علمی روایت کی بحث: تاریخ میں بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو لغت کے صفحات سے نکل کر تہذیب کی علامت، فکر کی شناخت اور ایک پوری علمی روایت کے امین بن جاتے ہیں۔ ایسے الفاظ کو محض لغوی معنیٰ کی روشنی میں نہیں بلکہ ان کے تاریخی پس منظر، علمی ارتقا اور عملی اثرات کے تناظر میں سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ ’’بریلوی‘‘ بھی برصغیر کی دینی تاریخ کا ایسا ہی ایک عنوان ہے، جس پر گذشتہ تین دہائیوں سے مسلسل بحث ہوتی رہی ہے---کبھی اسے اعتراض کا نشانہ بنایا گیا، کبھی اسے فرقہ سازی سے تعبیر کیا گیا اور کبھی اس کی اصل تاریخی حقیقت نظرانداز کرنے کی کوشش کی گئی۔

زیرِ نظر فتویٰ اسی قدیم مگر مسلسل زندہ رہنے والے سوال کا جواب ہے۔ خوش آئند امر یہ ہے کہ اس کا جواب محض جذبات یا خطیبانہ اسلوب میں نہیں بلکہ دلائل، تاریخی شواہد، اکابرِ اہلِ سنّت کے تعامل اور فقہی اصولوں کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ تحریر ایک وقتی جواب سے بڑھ کر ایک علمی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس استفتاء کے جواب نگار حضرت علامہ مفتی محمد راحت خان قادری برصغیر کے ممتاز اربابِ افتاء میں شمار ہوتے ہیں۔ فقہ، فتویٰ، عقائد اور مسلکی مباحث میں ان کی علمی بصیرت، اعتدالِ فکر اور تحقیقی اسلوب اہلِ علم کے نزدیک مسلم ہے۔ انہوں نے ہمیشہ حساس دینی مسائل میں جذبات کی بجائے اصول، تحقیق اور اکابر کے منہج کو ترجیح دی ہے۔ زیرِ نظر فتویٰ بھی اسی علمی روایت کا آئینہ دار ہے، جس میں نہ غیر ضروری تشدد ہے، نہ مداہنت بلکہ دلیل، دیانت اور اعتدال کے ساتھ مسئلے کی تہہ تک پہنچنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی فکری دبستان نے اپنا امتیاز محفوظ رکھنے کی ضرورت محسوس کی تو نسبتیں وجود میں آئیں۔ ان نسبتوں کا مقصد کوئی نیا مذہب یا نئی جماعت قائم کرنا نہیں تھا بلکہ قدیم اصولوں، مسلمہ عقائد اور علمی روایت کی شناخت کو محفوظ رکھنا تھا۔ اسی تناظر میں برصغیر میں بریلوی" نسبت کو بھی سمجھنا چاہیے کہ یہ کسی نئے مذہبی تصور کی علامت نہیں بلکہ اہلِ سنّت کی اسی قدیم علمی و اعتقادی روایت کی ایک تاریخی شناخت ہے۔

اس جواب کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ محض ’’بریلوی‘‘ لفظ کے جواز یا عدمِ جواز پہ گفتگو نہیں کرتا بلکہ اس نسبت کے تاریخی پس منظر، اس کے وجود میں آنے کے اسباب، اکابرِ اہلِ سنّت کے تعامل اور اس کے شرعی اصولوں کو بھی واضح کرتا ہے۔ یوں قاری یہ محسوس کرتا ہے: اصل بحث کسی نام کی نہیں بلکہ اس علمی و اعتقادی روایت کی ہے جس کی حفاظت کے لیے یہ نسبت برصغیر کی تاریخ میں معروف ہوئی۔

’’الکوثر‘‘ کا یہ امتیاز رہا ہے کہ وہ اختلافی مسائل کو اشتعال انگیزی کی جگہ علمی وقار کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اسی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے یہ فتویٰ شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے، تاکہ قارئین اس موضوع پہ کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے مستند دلائل، تاریخی شواہد اور اکابرِ اہلِ سنّت کی تحقیقات کا براہِ راست مطالعہ کر کے اپنی رائے قائم کر سکیں۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ فتویٰ صرف ایک اعتراض کا جواب نہیں، بلکہ ایک تاریخی مغالطے کی اصلاح، ایک علمی روایت کی وضاحت اور اہلِ سنّت کی فکری شناخت کو صحیح تناظر میں سمجھنے کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوگا۔ ایسے دور میں جب علمی مسائل کو بھی سوشل میڈیا کے نعروں اور جذباتی مباحث کے حوالے کر دیا گیا ہے، یہ تحریر ہمیں یاد دلاتی ہے کہ اختلاف اگر علم کے دائرے میں رہے تو حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بنتا ہے اور اگر جذبات کے سپرد ہو جائے تو حقیقت پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ علم کی دنیا میں فیصلے آواز کی بلندی سے نہیں، دلیل کی قوت سے ہوتے ہیں۔ (ادارہ)

مسئولہ (مولانا) محمد توصیف رضا، محمدی ضلع لکھیم پور کھیری

(۱) کیا فرماتے ہیں علمائے کرام مسئلہ ذیل میں، کہ ہم اہل سنت و جماعت اپنے آپ کو ”بریلوی“ کہہ سکتے ہیں، اس میں کوئی شرعی خرابی تو نہیں ہے، جو لوگ ”بریلوی“ کہنے سے منع کرتے ہیں ان کے بارے میں کیا حکم شرعی ہے؟

(۲) زید کا یہ کہنا کہ حضور تاج الشریعہ علیہ رحمہ کو جب سعودی میں گرفتار کیا گیا تھا، اس وقت تاج الشریعہ نے اپنے آپ کو ”بریلوی“ کہلوانے سے انکار کر دیا تھا اور حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ نے زبانی اور تحریری دونوں طریقے سے ”بریلوی“ کہنے سے منع فرمایا ہے زبانی طور پر منع کے ثبوت میں حضرت کی تقریر سوشل میڈیا پر عام ہے اور تحریری طور پر حضرت ہی نے اپنی کتابوں مثلاً ”حقيقة البريلوية“ اور ”الحق المبين“ وغیرہ میں لکھا ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟

(۳) زید کا یہ بھی کہنا ہے کہ ”بریلوی“ نہیں کہنا چاہیے بلکہ اگر کوئی تمہیں بریلوی کہے تو شدت سے انکار کرنا چاہیے، اس کے متعلق حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کا فتوی ہے زید اس کے ثبوت میں عرفان مذہب و مسلک کی یہ عبارت پیش کرتا ہے:

”چنانچہ حضور مفتی اعظم ہند، مولانا الشاہ مصطفیٰ رضا نوری بریلوی (وصال محرم الحرام ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۱ء) ۱۹۶۰ء کی دہائی کے آغاز میں اپنے ایک فتوی میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

ہم وہی قدیم چودہ سو سالہ اہلِ سنت و جماعت ہیں اور وہابیہ دیابنہ ملاعنہ، اہلِ سنت کو بریلوی کہتے ہیں۔ اگر کوئی تم کو بریلوی کہے تو شدت سے انکار کرو“۔

لہٰذا زید کے اس قول کا کیا جواب ہے؟

(۴) زید کا کہنا ہے کہ خود کو سنی کہنا ہی کافی ہے اپنے آپ کو ”بریلوی“ نہیں کہنا چاہیے کوئی دوسرا اگر ہم کو بریلوی کہے تو سختی سے انکار کرنا چاہیے کیوں کہ ”بریلوی“ غیروں کا دیا ہوا نام ہے، زید دلیل میں مندرجہ ذیل عبارتوں کو پیش کرتا ہے:

اہلسنت و جماعت کو بریلوی کہنا ہندوستانی دیوبندیوں کا طریقہ ہے۔ (الحق المبین عربی صفحہ نمبر 3 از تاج الشریعہ حضرت علامہ محمد اختر رضا خان صاحب)

حضرت علامہ مولانا مفتی اختر رضا خاں الازہری مدظلہ عالیہ نے ایک انٹرویو میں فرمایا: ’’ہم اپنے آپ کو بریلوی نہیں کہتے، ہمارے مخالف ہمیں بریلوی کہتے ہیں۔‘‘

(ماہنامہ ضیائے حرم، لاہور، فروری 1988، ص 14)

سعودی عرب میں گرفتاری کے بعد سی آئی ڈی سے گفتگو کے دوران تاج الشریعہ اختر رضا خان الازہری حفظہ اللہ نے فرمایا: ہم پر کچھ لوگ یہ تہمت لگاتے ہیں کہ ہم اور قادیانی ایک ہیں۔ یہ غلط ہے۔ اور وہی لوگ ہمیں بریلوی بھی کہتے ہیں، جس سے وہم ہوتا ہے کہ ’’بریلوی‘‘ کسی نئے مذہب کا نام ہے، ایسا نہیں ہے بلکہ ہم اہلسنت و جماعت ہیں۔ (حیات تاج الشریعہ صفحہ 42 بحوالہ عرفان مسلک و مذہب صفحہ 45)

اسی کتاب حیات تاج الشریعہ میں یہ بھی درج ہے اقرار نامہ میں تاج الشریعہ نے ان الفاظ کا اضافہ کروایا: ’’بریلویت کوئی نیا مذہب نہیں ہے، ہم لوگ اپنے آپ کو اہلسنت و جماعت کہلوانا ہی پسند کرتے ہیں‘‘۔

ماہر رضویات پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد رحمۃ اللہ علیہ اس بارے میں فرماتے ہیں کہ: ’’اصل میں امام احمد رضا اور اس مسلکِ قدیم کے مخالفین نے اس کے بریلویت کے نام سے یاد کیا ہے اور بقول ابو یحییٰ امام خان نوشروی "یہ نام علما دیوبند کا دیا ہوا ہے"۔ ڈاکٹر جمال الدین (جامعہ حنفیہ، دہلی) نے بھی اپنے ایک تحقیقی مقالے میں یہی تحریر فرمایا ہے کہ یہ نام مخالفین کا دیا ہوا ہے۔‘‘ (آئینہ رضویات، ص 300)

فتاوی شارح بخاری میں مفتی شریف الحق امجدی فرماتے ہیں: دیوبندیوں نے عناد و دشمنی کی وجہ سے اہلِ سنت و جماعت کو بریلوی کہنا شروع کر دیا ہے، تاکہ ناواقف لوگ یہ نہ جائیں کہ یہ نیا فرقہ ہے اور اس سے بیزار ہوں۔ چوں کہ اس صدی میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے مذہب اہلِ سنت و جماعت کی حمایت و نصرت کی ہے، تو بدمذہبوں نے سنیوں کو بریلوی کہنا شروع کر دیا ہے۔ (فتاوی شارح بخاری جلد سوم ص 153)

(۵) زید یہ بھی کہتا ہے کہ ہماری نسبت اعلی حضرت رحمۃ اللہ

تعالیٰ علیہ سے ہے، شہرِ بریلی سے نہیں۔ ہم بریلی کو بھی اسی نسبت کی وجہ سے جانتے ہیں، ورنہ نہ ہم وہاں پیدا ہوئے، نہ وہاں رہائش رکھتے ہیں۔ جب نہ ہماری پیدائش بریلی میں ہے، نہ قیام، تو محض شہر کی بنیاد پر ہمیں ''بریلوی'' کہنا کیسے درست ہوسکتا ہے؟

اصل حقیقت یہ ہے کہ کسی عظیم شخصیت سے نسبت ایک فکری، روحانی اور علمی وابستگی کا اظہار ہوتی ہے، جبکہ شہر سے نسبت صرف جغرافیائی پہچان ہوتی ہے۔ اسی لئے ہم خود کو ''رضوی'' کہتے ہیں، کیونکہ یہ نسبت براہِ راست اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے جڑتی ہے، نہ کہ کسی شہر سے۔ جس طرح حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی نسبت سے قادری ہیں بغدادی نہیں، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی نسبت سے چشتی ہیں اجمیری نہیں، حضرت نظام الدین اولیا کی نسبت سے نظامی ہیں دہلوی نہیں، حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کی نسبت سے اشرفی ہیں کچھوچھوی نہیں، اسی طرح حضور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان کی نسبت سے رضوی ہیں بریلوی نہیں۔

(۶) بریلوی نہیں کہنا چاہیے کیوں کہ بہت سے مقامات پر بریلوی کو ایک نیے فرقے کے طور پر جانا جاتا ہے۔

(۷) صرف اعلیٰ حضرت کی طرف ہی مسلک کی نسبت کیوں کی جائے؟

(۸) ہمارے معتبر اکابر علمائے اہل سنت بھی ''بریلوی'' کے بجائے سنی اور امتیاز کے لیے ''مسلک اعلیٰ حضرت'' کو پسند فرماتے تھے۔

ان تمام سوالات کے جوابات حقائق و واقعات اور بزرگوں کے اقوال کی روشنی میں تفصیلی دلائل کے ساتھ عطا فرمائیں اور عند اللہ ماجور ہوں۔

بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الجواب بعون الملک الوھاب:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي جَعَلَنَا مِنْ سَالِكِي سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ، وَهَدَانَا لِاتِّبَاعِ سُنَّةِ سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ، وَأَمَرَنَا بِالتَّمَسُّكِ بِمَا كَانَ عَلَيْهِ السَّلَفُ الصَّالِحُونَ، حَيْثُ قَالَ نَبِيُّنَا الْأَمِينُ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي''۔ وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، الَّذِي أَمَرَنَا بِلُزُومِ الْجَمَاعَةِ وَالِاعْتِصَامِ بِحَبْلِهِ الْمَتِينِ، وَبَشَّرَنَا بِقَوْلِ نَبِيِّهِ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ''۔ وَأَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، الَّذِي حَذَّرَ مِنَ الِافْتِرَاقِ وَالِانْشِقَاقِ، فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''مَنْ شَذَّ شَذَّ فِي النَّارِ''، وَأَمَرَنَا بِلُزُومِ السَّوَادِ الْأَعْظَمِ، فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''عَلَيْكُمْ بِالسَّوَادِ الْأَعْظَمِ''۔ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ الطَّاهِرِينَ، وَسَلَّمَ تَسْلِيمًا كَثِيرًا إِلٰى يَوْمِ الدِّينِ. أَمَّا بَعْدُ:

(۱) جواب: ''بریلوی'' عرف عام میں اہل سنت وجماعت کو کہا جاتا ہے، جو سنی صحیح العقیدہ مسلمان خود کو ''بریلوی'' کہتے ہیں ان کا مطلب ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ دیوبندی، وہابی، رافضی، قادیانی وغیرہ فرقہائے باطلہ سے نہیں ہیں بلکہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ کے جو عقائد ونظریات ہیں وہ بھی انہیں پر قائم ہیں اور انہیں کو ماننے والے ہیں، لہٰذا وہ خود کو اسی وجہ سے ''بریلوی'' کہتے ہیں اگرچہ بریلی شریف میں رہنے والے علما و مشائخ سے ان کا تلمذ وسلسلۂ طریقت کا تعلق ہو یا نہ ہو۔

دیوبندیوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جس کو بھی معمولات اہل سنت وجماعت اور سلف صالحین کے طریقے پر قائم، اولیائے کرام سے محبت کرنے والا، وسیلہ، شفاعت، اختیارات مصطفی، علم غیب مصطفی، میلاد و قیام، عرس و فاتحہ وغیرہ کا قائل اور مسلک تصوف سے منسلک دیکھتے ہیں اس کو ''بریلوی'' ہی کہتے ہیں اگرچہ بریلی شریف میں رہنے والے علما و مشائخ سے اس کا تلمذ وسلسلۂ طریقت کا تعلق ہو یا نہ ہو۔

''بریلوی'' کہنے اور کہلانے سے روکنا غلط اور غیر شرعی عمل ہے۔ جو لوگ اہل سنت وجماعت کو ''بریلوی'' کہتے ہیں وہ بھی اسی وجہ سے ہی کہتے ہیں کہ یہ لوگ عقائد ونظریات اور معمولات میں اعلیٰ حضرت امام اہل سنت شاہ امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ کے طریقے پر قائم ہیں اور اعلیٰ حضرت قدس سرہ عامۃ المسلمین کے طریقے پر ہیں جس کی اصل حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضور صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم کے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اس مبارک اصل کی فرع ہیں، خلافت راشدہ کے دور سے لے کر آج تک مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت اسی کی متبع و پیروکار اور امت کے اجماعی عقائد و نظریات کی علم بردار رہی ہے، اسی جماعت کو اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدس کلام میں "سبیل المؤمنین" کا امتیازی لقب عطا فرمایا ہے، حدیث شریف میں اسی مبارک جماعت کو "سواد أعظم"، "الجماعة" اور "ما أنا علیه و أصحابی" کے بابرکت ناموں سے ذکر کیا گیا ہے، اسی جماعت سے جدا ہونے والوں کو "من شذ شذ فی النار" کی وعید سنائی گئی ہے۔ لہٰذا "بریلوی" کہنے اور کہلانے سے روکنا اس بات کا مظہر ہے کہ روکنے والا یہ نہیں چاہتا کہ دوسروں پر صاف ظاہر ہو کہ ہم اعلیٰ حضرت امام اہل سنت شاہ امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ کے طریقے پر ہیں، جو اس بات کو مستلزم ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہ کے افکار و نظریات میں معاذ اللہ کوئی خامی ہے اور ان پر بہتان تراشی کرنے والوں کی باتوں میں کچھ سچائی ہے، حالاں کہ اعلیٰ حضرت کے عقائد و نظریات وہی ہیں جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے صحابہ کرام، تابعین عظام اور دیگر سلف صالحین کے واسطے ہم تک پہنچے۔ لہٰذا "بریلوی" کہنے سے روکنا در پردہ سواد اعظم سے روکنا ہے جو شرعاً درست نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص "بریلوی" کہنے اور کہلانے سے اس وجہ سے روکتا ہے کہ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت شاہ امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ کے عقائد و نظریات جو ان کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں معاذ اللہ! وہ غلط ہیں ان کو نا ماننا جائے تو روکنے والے پر حکم کفر ہوگا۔ بدر العلما حضرت علامہ مفتی بدر الدین احمد صدیقی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سوال کیا گیا:

"ہم لوگ سنی عقیدہ رکھتے ہیں اور بریلی کے اعلی حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کہنے پر چلتے ہیں لیکن ایک مولوی نے تقریر میں اعلان کیا کہ نہ تم لوگ بریلوی بنو نہ دیوبندی اور نہ چودھویں صدی کے ملوں کا کہنا مانو صرف محمدی بنو تو ہم لوگ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بریلوی بننے سے بھی روکا جاتا ہے اور چودہ صدی کے ملوں کا کہنا ماننے سے بھی روکا جاتا تو اب ہم لوگ کیا بنیں اور کس کا کہنا مانیں اور بریلوی محمدی میں کیا فرق ہے؟"

آپ اس سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"بریلی شریف کے فاضل افضل حضور اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دین و مذہب جو ان کی کتابوں سے ظاہر ہے، وہ وہی ہے جو خالص دین محمدی ہے، جو "بریلوی" بننے سے روکتا ہے وہ محمدی بننے سے روکتا ہے، وہ بھی بحکم شریعت مطہرہ عند الفقہا کافر ہے"۔ (فتاوی بدر العلما، کتاب العقائد، ص: ۱۱۲، ۱۱۳، رضا اکیڈمی، ممبئی، ۱۴۳۷ھ/ ۲۰۱۵ء)

جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے سابق صدر شعبۂ افتا، شارح بخاری علامہ مفتی شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ایسے شخص کا حکم دریافت کیا گیا جو کہتا ہے کہ "حنفیت، بریلویت، دیوبندیت، وہابیت ایسے عنوانات سے اسے وحشت ہونے لگتی ہے" تو آپ نے اس کے جواب میں یوں تحریر فرمایا:

"چونکہ یہ شخص صلح کلی ہے اس لیے اس کے اس قول میں وحشت سے مراد یہی ہے کہ وہ حنفیت، سنیت، بریلویت سے بھی بیزار ہے اور یہ اس کی وہ گمراہی ہے جو کفر تک پہنچی ہوئی ہے"۔ (فتاوی شارح بخاری، کتاب العقائد، ج: ۲، ص: ۵۱۲، دائرۃ البرکات گھوسی)

عرف عام میں "بریلوی" ہونا سنی صحیح العقیدہ مسلمانوں کی علامت و پہچان ہے، زید کا "بریلوی" کہنے سے روکنا غلط ہے جب کہ زید "سنی بریلوی" عقائد و نظریات کے خلاف نہ ہو اور اگر "بریلوی" کہنے سے بریلویوں کے عقائد و نظریات کی وجہ سے روکتا ہے تو یہ کفر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۲) جواب: زید کا کہنا کہ "سعودیہ میں حضور تاج الشریعہ نے خود کو "بریلوی" کہلانے سے انکار کر دیا تھا"۔ یہ بات سراسر غلط، بے بنیاد اور حقیقت کے برعکس ہے۔ زید یا تو مخالفین کی اڑائی ہوئی افواہوں کا شکار ہے، یا پھر زید از خود افترا پردازی اور بہتان تراشی کی نحوست میں گرفتار ہو کر حقائق کو مسخ کر کے حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ پر افترا کر رہا ہے۔

شیخ الاسلام حضور تاج الشریعہ علامہ شاہ مفتی محمد اختر رضا خاں

قادری علیہ الرحمہ نے مکہ مکرمہ میں سی-آئی-ڈی کے سوالات کے جوابات میں فرمایا کہ ”بریلوی“ کوئی نیا مذہب نہیں ہے، اگر کوئی نیا مذہب ”بریلوی“ نام سے ہے تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور آپ سے دستخط کروانے کے لیے سعودی حکام کی طرف سے جس اقرار نامہ پر آپ سے دستخط کروائے گیے اس اقرار نامہ کے آخر میں آپ نے پرزور مطالبہ کر کے یہ اضافہ کروایا کہ ”بریلویت“ کوئی نیا مذہب نہیں ہے۔ جواب اگرچہ طویل ہوجائے گا لیکن حقیقت حال کو واضح کرنے کے لیے حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ کے ۱۹۸۶ء کے سفرحج کے موقع پر سعودیہ میں پیش آنے والے واقعہ کی یہاں پر وہ تفصیل نقل کی جاتی ہے جو حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ نے خود بیان فرمائی اور تحریری طور پر ”ماہنامہ سنی دنیا“ بریلی شریف ۱۹۸۶ء کے اکتوبر و نومبر کے شمارے میں شائع ہوئی اور اس کو مولانا شہاب الدین رضوی بہرائچی نے اب کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا ہے اس میں یوں لکھا ہے:

” مجھے سی۔ آئی۔ ڈی آفس لائے، اور یکے بعد دیگرے میرے رفقا محبوب اور یعقوب کو بھی اٹھا لائے۔ مجھ سے رات میں رسمی گفتگو کے بعد پہلا سوال یہ کیا کہ آپ نے جمعہ کہاں پڑھا؟ میں نے کہا کہ میں مسافر ہوں، میرے اوپر جمعہ فرض نہیں، لہذا میں نے اپنے گھر میں ظہر پڑھی، مجھ سے پوچھا کہ تم حرم میں نماز نہیں پڑھتے ہو؟ میں نے کہا کہ میں حرم سے دور رہتا ہوں، حرم طواف کے لئے جاتا ہوں، اس لئے میں حرم میں نماز نہیں پڑھ سکتا۔ مجھ سے کہا کہ آپ کیوں اپنے محلے کی مسجد میں نماز نہیں پڑھتے؟ میں نے کہا کہ بہت سے لوگ ہیں جنہیں میں دیکھتا ہوں کہ وہ محلے کی مسجد میں نماز نہیں پڑھتے، اور بہت سے لوگوں کے متعلق مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ سرے سے نماز ہی نہیں پڑھتے تو مجھی سے کیوں باز پرس کرتے ہیں۔ مجھ سے پھر بھی اصرار کیا گیا تو میں نے کہا کہ میرے مذہب میں، اور آپ لوگوں کے مذہب میں اختلاف ہے، آپ حنبلی کہلاتے ہیں، اور میں حنفی ہوں، اور حنفی مقتدی کی رعایت غیر حنفی امام اگر نہ کرے تو حنفی کی نماز صحیح نہ ہوگی، اس وجہ سے میں نماز علاحدہ پڑھتا ہوں۔

دس بجے پھر سی آئی ڈی سے گفتگو ہوئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ ہندوستان میں کتنے فرقے ہیں، میں نے شیعہ، قادیانی وغیرہ چند فرقے گنائے، اور میں نے واضح کیا کہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب فاضل بریلوی نے قادیانیوں کا رد کیا ہے، اور اس کے رد میں چھ رسالے ”جزاء اللہ عدوہ“ اور ”قهر الديان“، ”السوء والعقاب“ وغیرہ لکھے ہیں۔ ہم پر کچھ لوگ یہ تہمت لگاتے ہیں اور آپ کو یہ بتایا ہے کہ ہم اور قادیانی ایک ہیں۔ یہ غلط ہے، اور وہی لوگ ہمیں ”بریلوی“ کہتے ہیں، جس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ ”بریلوی“ کسی نئے مذہب کا نام ہے ایسا نہیں ہے، بلکہ ہم اہل سنت و جماعت ہیں۔

سی آئی ڈی کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ امام احمد رضا خاں بریلوی نے کسی نئے مذہب کی بنیاد نہیں ڈالی، بلکہ ان کا مذہب وہی تھا جو سرکار محمد مصطفے صلی اللہ تعالی علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین، اور ہر زمانے کے صالحین کا مذہب ہے، اور یہ کہ ہم اپنے آپ کو اہل سنت و جماعت کہلوانا ہی پسند کرتے ہیں، اور ہمیں اس مقصد سے بریلوی کہنا کہ ہم کسی نئے مذہب کے پیرو ہیں ہم پر بہتان ہے۔ سی آئی۔ ڈی کے پوچھنے پر میں نے وہابی اور سنی کا فرق مختصر طور پر واضح کیا، میں نے کہا کہ وہابی حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے علم غیب، اور ان کی شفاعت، اور ان سے توسل، اور استمداد اور انہیں پکارنے کے منکر ہیں، اور ان امور کو وہ شرک بتاتے ہیں۔ جب کہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ حضور سے توسل جائز ہے، اور انہیں پکارنا بھی، اور یہ کہ وہ سنتے بھی ہیں، اور اللہ کے بتائے سے غیب جانتے ہیں، اور اللہ نے ان کو شفاعت کا منصب عطا فرمایا ہے۔ اور علم غیب پر سی آئی۔ ڈی کے پوچھنے پر آیات قرآن سے میں نے دلیلیں قائم کیں، اور یہ ثابت کیا کہ نبوت اطلاع علی الغیب ہی کا نام ہے۔ اور نبی وہی ہے جو اللہ کے بتانے سے غیب کی خبر دے، اور یہ کہ نبی کے واسطے سے ہر مومن غیب جانتا ہے، جیسا کہ قرآن میں منصوص ہے۔ سی آئی ڈی کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بعد وصال بھی غیب کی خبر ہے، اس لیے کہ سرکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نبوت باقی ہے، اور نبوت غیب جاننے ہی کو کہتے ہیں، پھر یہ کہ آیتوں میں ایسی قید نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ بعد وصال سرکار غیب نہیں جانتے۔

ایک اور نشست میں سی آئی۔ڈی کے مطالبے پر میں نے توسل کی دلیل میں آیت:﴿ وَابۡتَغُوا اِلَيۡهِ الۡوَسِيۡلَةَ ﴾ پڑھی، اور یہ بتایا کہ سرکار صلی اللہ تعالی علیہ وسلم سے توسل منجملہ اعمال صالحہ ہے، اور یہ کہ کسی عمل کا صالح ہونا، اور وسیلہ ہونا، اس شرط پر موقوف ہے کہ وہ مقبول ہو، اور سرکار رسالت صلی اللہ تعالی علیہ وسلم بلا شبہ مقبول بارگاہ الوہیت ہیں، بلکہ سید المقبولین ہیں، تو ان سے توسل بدرجہ اولی جائز ہے، اور توسل شرک نہیں۔

سی۔آئی۔ڈی کے کہنے پر میں نے مزید کہا کہ کسی سے اس طور پر مدد مانگنا کہ اللہ کے سوا اس کو مستقل اور فاعل حقیقی سمجھے شرک ہے، اور ہم اس طور کسی سے مدد مانگنے کے قائل نہیں ہیں۔ ہاں اللہ کی مدد کا وسیلہ جان کر کسی مقبول بارگاہ سے مدد مانگنا، یہ ہرگز شرک نہیں ہے۔

سی آئی ڈی نے مجھ سے محمد بن عبد الوہاب کے متعلق پوچھا۔ میں نے اس کا جواب تفصیلا نہ دے کر یہ کہا کہ ہم میں اور وہابیوں میں فرق یہ ہے کہ وہ ہمیں توسل وغیرہ امور کی بنا پر کافر ومشرک کہتے ہیں لیکن ہم ان کو محض اس بنا پر کافر ومشرک نہیں کہتے یعنی اس کے وجوہات اور بھی ہیں۔ دوسرے دن میرے ان بیانات کی روشنی میں سی آئی ڈی نے میرے لئے ایک اقرار نامہ خود لکھ کر مجھے سنایا، جو یوں تھا میں فلاں بن فلاں ''بریلوی مذہب'' کا متبع ہوں۔ میں نے اعتراض کیا کہ میں بار بار یہ کہہ چکا ہوں کہ ''بریلوی'' کوئی مذہب نہیں ہے، اور اگر کوئی نیا مذہب بنام بریلوی ہے تو میں اس سے بری ہوں۔ آگے اقرار نامہ میں اس نے یوں لکھا کہ میں امام احمد رضا کا پیرو ہوں اور بریلویوں میں سے ایک ہوں، اور ہمارا عقیدہ ہے کہ سرکار سے توسل اور استغاثہ اور ان کو پکارنا جائز ہے، اور سرکار غیب جانتے ہیں، اور وہابی ان امور کو شرک بتاتے ہیں، اور یہ کہ میں ان کے پیچھے اس وجہ سے نماز نہیں پڑھتا ہوں، وہ ہم سنیوں کو مشرک بتاتے ہیں اقرار نامہ کے آخر میں میرے مطالبہ پر اس نے یہ اضافہ کیا کہ بریلویت کوئی نیا مذہب نہیں ہے، اور ہم لوگ اپنے آپ کو اہل سنت و جماعت ہی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ پھر مختلف نشستوں میں بار بار وہی سوالات دہرائے۔(ملخصا، سعودی حکومت کے ظلم کی کہانی تاج الشریعہ کی زبانی، ص: ۵۱ تا ص: ۵۴، اسلامک ریسرچ سینٹر، بریلی)

مذکورہ تفصیلات میں کہیں بھی یہ نہیں ہے کہ حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ نے ''بریلوی'' کہلوانے سے منع کیا ہو بلکہ اس میں تو اس بات کا انکار ہے کہ ''بریلوی'' کوئی نیا مذہب نہیں ہے۔

''حقیقة البريلوية'' اور ''الحق المبين'' کی عبارت معمولی لفظی اختلاف کے ساتھ ایک ہی ہیں فقیر قادری نے ''الحق المبین'' کا اردو ترجمہ کر کے شائع کر دیا ہے اس کے مقدمہ میں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی کر دیا گیا ہے لہٰذا اسی کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''ماضی قریب میں کچھ لوگوں نے یہ نا کام کوشش کی کہ اہل سنت و جماعت کو ''بریلوی'' کہنا درست نہیں ہے۔ وہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے درج ذیل عبارت سے استدلال کرتے ہوئے حضور تاج الشریعہ (دامت برکاتہم العالیہ) کا بھی یہی موقف ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مقام پر اس عبارت کا خلاصہ اور ان کے شبہات کا ازالہ ضروری ہے۔ ''اَلۡحَقُّ الۡمُبِين'' کی عبارت یوں ہے:

''**زعم قائل هذه الكلمة ما نصه: ظهرت في البلاد بدعة جديدة من بدع الطوائف الخارجة عن الإسلام والمسلمين وهي البريلوية۔**

ورداً عليه نقول: نسبتنا أهل السنة والجماعة إلى ''البريلوية'' ديدن الديوبندية من أهل الهند، والذي اتهمونا من الخروج عن الإسلام والمسلمين هم أحق به وأجدر، وهذه التهمة بهم ألصق، ونحن بحمد الله عن هذه التهمة براء، ولا ندين ''البريلوية'' ولا ملة جديدة غيرها، إنما ندين الملة السمحاء البيضاء التي ليلها كنهارها، ولم نزل من أهل السنة، وفي أهل السنة، ومع أهل السنة عن بكرة أبينا، والله على مانقول وكيل۔''

ترجمہ: مقالہ نگار نے لکھا ہے: ملک میں بریلویت نامی ایک نیا فرقہ نمودار رہا ہے، جس کا تعلق اسلام اور مسلمانوں سے خارج بدعتی فرقوں سے ہے۔

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں: ہم اہل سنت و جماعت کو

بریلویت کی جانب منسوب کرنا دیوبندیوں کا کام ہے، اسلام اور مسلمانوں سے خارج ہونے کی جوتہمت انہوں (دیوبندی وغیرہ) نے ہم (اہل سنت و جماعت) پر لگائی ہے اس (اسلام اور مسلمانوں سے خارج ہونے) کے اصل مستحق وہ (دیوبندی) خود ہیں، نیز یہ (اسلام اور مسلمانوں سے خارج ہونے) کی تہمت انھیں (دیوبندیوں) پر خوب چسپاں ہے۔ ہم بحمداللہ! اس (اسلام اور مسلمانوں سے خارج ہونے) کی تہمت سے بری ہیں، نہ ہمارا دین (اس قسم کی اسلام اور مسلمانوں سے خارج ہونے والی) بریلویت ہے اور نہ کوئی دوسری نئی ملت، ہمارا دین وہ آسان روشن ملت ہے جس کی شب (روشنی میں) دن کی طرح، ہم اپنے آباواجداد سے اہل سنت و جماعت سے وابستہ ہیں، اہل سنت میں ہیں اور اہل سنت کے ساتھ ہیں اور ہماری اس بات پر اللہ تعالیٰ کا ذمہ ہے۔

(۱) پہلے اقتباس کا تجزیہ

جولوگ ''بریلوی'' کہنے کو منع کرتے ہیں، وہ دلیل کے طور پر اس عبارت کو پیش کرتے ہیں:

''ظهرت في البلاد بدعة جديدة من بدع الطوائف الخارجة عن الاسلام والمسلمين وهي البريلوية''۔

ترجمہ: ملک میں بریلویت نامی ایک نیا فرقہ نمودار ہوا ہے، جس کا تعلق اسلام اور مسلمانوں سے خارج بدعتی فرقوں سے ہے۔

مذکورہ عبارت کو حضور تاج الشریعہ کی طرف منسوب کرنا تقیہ، دھوکہ اور الزامات کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ عبارت دیوبندیوں کی ہے جسے حضور تاج الشریعہ نے ''الہدیٰ'' میگزین سے رد کرنے کے لیے نقل کیا ہے۔ اس کا تفصیلی رد بھی اسی اقتباس کے بعد یوں بیان کیا گیا ہے:

''ورداً عليه نقول: نسبتنا أهل السنة والجماعة إلى ''البريلوية'' ديدن الديوبندية من أهل الهند، والذي اتهمونا من الخروج عن الإسلام والمسلمين هم أحق به وأجدر، وهذه التهمة بهم ألصق، ونحن بحمد الله عن هذه التهمة براء، ولا ندين ''البريلوية''۔

ترجمہ: اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں: ہم اہل سنت و جماعت کو بریلویت کی جانب منسوب کرنا دیوبندیوں کا کام ہے، اسلام اور مسلمانوں سے خارج ہونے کی جوتہمت انہوں (دیوبندی وغیرہ) نے ہم (اہل سنت و جماعت) پر لگائی ہے اس (اسلام اور مسلمانوں سے خارج ہونے) کے اصل مستحق وہ (دیوبندی) خود ہیں، نیز یہ (اسلام اور مسلمانوں سے خارج ہونے) کی تہمت انھیں (دیوبندیوں) پر خوب چسپاں ہے۔ ہم بحمداللہ! اس (اسلام اور مسلمانوں سے خارج ہونے) کی تہمت سے بری ہیں، نہ ہمارا دین (اس قسم کی اسلام اور مسلمانوں سے خارج ہونے والی) بریلویت ہے۔

لہٰذا اس اقتباس سے بریلوی نہ کہنے پر استدلال کرنا، اس کو حضور تاج الشریعہ کی جانب منسوب کرنا سفاہت و بے وقوفی اور جہالت و نادانی ہے۔

(۲) دوسرے اقتباس کا تجزیہ

مخالفین دلیل کے طور پر یہ عبارت بھی پیش کرتے ہیں:

''نسبتنا أهل السنة والجماعة إلى ''البريلوية'' ديدن الديوبندية من أهل الهند۔''

ترجمہ: ہم اہل سنت و جماعت کو بریلویت کی جانب منسوب کرنا دیوبندیوں کا کام ہے۔

اس عبارت سے یہ تو مفہوم ہوتا ہے کہ اہل سنت و جماعت کو ''بریلوی'' کہنا دیوبندیوں کا طریقۂ کار ہے۔ لیکن ہندوستانی سنیوں نے اپنی اس نسبت کو امام عشق ومحبت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کے شہر کی جانب کبھی بھی معیوب یا ناپسندیدہ نہیں سمجھا، بلکہ اس پر خوشی اور فخر محسوس کیا ہے۔ انہوں نے دیوبندیوں کے مقابلے میں خود کو ''بریلوی'' کہنا اور کہلوانا محبوب رکھا۔ یہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ اگر عوام وخواص میں کوئی سنی اور غیر سنی کے درمیان امتیاز کرنا چاہتا ہے تو وہ پوچھتا ہے کہ ''بریلوی ہو یا نہیں؟'' جب کوئی خود کو صرف سنی کہتا ہے تو ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ دیوبندی بھی تو خود کو سنی کہتے ہیں۔ اس لیے مجبوراً یہ سوال کرنا پڑتا ہے کہ ''دیوبندی ہو یا بریلوی؟'' جب وہ

"بریلوی" کہتا ہے تو دل مطمئن ہو جاتا ہے کہ یہ معمولاتِ اہل سنت کو ماننے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صلوٰۃ وسلام، قیام اور فاتحہ کرتے ہوئے دیکھا تو غیروں نے کہا "یہ بریلوی ہے"۔ اسی طرح اختیارِ مصطفیٰ، علمِ غیبِ مصطفیٰ، اور نورانیتِ مصطفیٰ کے قائل مسلمان کو دیکھ کر غیروں نے کہا "یہ بریلوی ہے"۔ گویا کہ لفظ "بریلوی" اہل سنت و جماعت کے لیے ایک پہچان اور علم بن گیا، جسے حضور تاج الشریعہ نے یوں بیان کیا ہے:

"فصار البريلوية علماً و لقباً علىٰ اهل السنة والجماعة"۔

ترجمہ: یہاں تک کہ لفظ ''بریلوی'' اہلسنت و جماعت کے لئے ایک پہچان اور لقب بن گیا۔

لہٰذا اس اقتباس سے بھی مخالفین کا استدلال درست نہیں ہے۔

(۳) تیسرے اقتباس کا تجزیہ

بعض لوگ "ولا ندين البريلوية''سے"بریلوی" نہ کہنے پر استدلال کرتے ہیں۔

" والذى اتهمونا من الخروج عن الاسلام والمسلمين هم أحق به وأجدر، وهٰذه التهمة بهم ألصق، ونحن بحمدالله عن هٰذه التهمة براء، ولا ندين "البريلوية"۔

ترجمہ: اور اسلام اور مسلمانوں سے خارج ہونے کی جو تہمت انہوں (دیوبندی وغیرہ) نے ہم (اہل سنت و جماعت) پر لگائی ہے اس (اسلام اور مسلمانوں سے خارج ہونے) کے اصل مستحق وہ (دیوبندی) خود ہیں، نیز یہ (اسلام اور مسلمانوں سے خارج ہونے) کی تہمت انھیں (دیوبندیوں) پر خوب چسپاں ہے۔ ہم بحمد اللہ! اس (اسلام اور مسلمانوں سے خارج ہونے) کی تہمت سے بری ہیں، نہ ہمارا دین (اس قسم کی اسلام اور مسلمانوں سے خارج ہونے والی) بریلویت ہے۔

حالانکہ حضور تاج الشریعہ نے یہاں اس قسم کی "بریلویت" کا انکار کیا ہے جس کی صورت وہابیوں نے بگاڑ کر پیش کی اور اس بگاڑی ہوئی صورت کو "بریلوی" کا نام دیا۔ تو آپ نے اسی کے رد میں فرمایا کہ اگر تم اس مسخ شدہ صورت کو "بریلویت" کا نام دیتے ہو تو ہمارا دین ایسی "بریلویت" نہیں ہے جو اسلام اور جماعت مسلمین سے خارج ہو۔ لہٰذا اس اقتباس سے بھی استدلال کرنا درست نہیں ہے"۔ (الحق المبین، مترجم، از ص: ۱۵/ تا ص: ۲۰، المکتب النور، بریلی، ۱۴۴۷ھ/ ۲۰۲۶ء)

زید کا یہ کہنا کہ زبانی طور پر منع کرنے کے ثبوت میں حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ کی تقریر سوشل میڈیا پر عام ہے، تو زید کو چاہیے تھا کہ وہ اس تقریر کے الفاظ کو نقل کرتا کیوں کہ حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ کی کثیر کلپس سوشل میڈیا پر عام ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ "بریلوی" یا "بریلویت" اہل سنت و جماعت کی پہچان ہے، اس زمانے میں مسلک اہل سنت کو مسلک اعلیٰ حضرت اور عوام کی زبان میں "بریلوی" کہا جاتا ہے، عرف میں بریلوی اہل سنت و جماعت کو کہا جاتا ہے، یہی حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ کے فتاوی مسطور ومصرح ہے چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

"بریلوی" عرفِ عام میں اہلِ سنت و جماعت کو کہا جاتا ہے۔ خصوصاً جب کہ دیوبندی کے بالمقابل "بریلوی" بولا جاتا ہے تو سنی ہی مراد ہوتے ہیں"۔ (فتاوی تاج الشریعہ، ج:۱، ص:۴۷۵، مرکز الدراسات الاسلامیہ، بریلی)

اسی میں ہے:

"حاجی مذکور کا یہ کہنا کہ ہم بریلی والوں کو نہیں مانتے، بے وجہ علما سے بیر کی کھلی دلیل ہے۔ ان تمام باتوں سے وہ شخص توبہ شرعیہ کرے۔ ورنہ ہر مسلمان واقفِ حال اسے چھوڑ دے"۔ (فتاوی تاج الشریعہ، ج:۱، ص:۵۱۵، مرکز الدراسات الاسلامیہ، بریلی)

اسی میں ہے:

"زید بے قید غلط کہتا ہے اور اس کا یہ کہنا کہ ''بریلوی" شرک کا کام کرتے ہیں''، محض بہتان وافترا ہے"۔ (فتاوی تاج الشریعہ، ج:۲، ص:۵۴۶، مرکز الدراسات الاسلامیہ، بریلی)

صورت مسئولہ میں زید نے جو دعوی کیا ہے وہ جھوٹ اور

بہتان پر مبنی ہے زید کو چاہیے کہ اپنے دعوی کے ثبوت میں کوئی دلیل پیش کرے ﴿هَاتُوا بُرْهٰنَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ یہ جھوٹا اور مکر و فریب پر مشتمل دعوی کہ "حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ نے "بریلوی" کہنے سے منع فرمایا ہے" زید دلیل سے کبھی بھی ثابت نہیں کر سکتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۳) جواب: **اولاً**: پیش کردہ عبارت کئی وجوہات کی بنا پر شرعی دلیل بننے کے قابل ہی نہیں ہے اور اس کی صحت درج ذیل وجوہات کے سبب سخت مشکوک ہے:

(۱) اس میں حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کی طرف فتوی کو منسوب کیا گیا ہے یہ مجہول ہے کہ وہ فتوی کہاں ہے؟ لہٰذا اس سے یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ نے بریلوی کہنے سے منع فرمایا ہے۔

(۲) مذکورہ کتاب (جو کچھ سال پہلے شائع ہوئی جس کا علمائے کرام نے شدومد سے رد فرمایا) کی عبارت یوں ہے:

"۱۹۶۰ء کی دہائی کے آغاز میں اپنے ایک فتوی میں تحریر فرماتے ہیں"۔

اس عبارت کو غور سے دیکھیے کہ اس میں حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کی طرف یہ منسوب کیا گیا ہے کہ آپ "۱۹۶۰ء کی دہائی کے آغاز میں اپنے ایک فتوی میں تحریر فرماتے ہیں"۔ حالاں کہ حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کے فتاوی میں چاند کی ہی تاریخ کا التزام ملتا ہے اگر ان کے حقیقی فتوی سے حصول فیضان و عرفان ہوا ہوتا تو اسی سے ماخوذ یہاں بھی چاند ہی کی تاریخ یعنی سن ہجری کا تذکرہ ہوتا سن ہجری کو عیسوی میں تبدیل کرنے کی بلا وجہ کی مشقت نہیں اٹھانی پڑتی۔

(۳) حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کے کثیر رسائل اور ۷ جلدوں پر مشتمل فتاوی کا مجموعہ بنام "فتاوی مفتی اعظم" مطبوع ہیں ان میں کہیں بھی ایسا فتوی نہیں ملا کہ جس میں آپ نے اتنی شدومد تو درکنار محض منع ہی فرمایا ہو۔ لہٰذا کسی کے بلا دلیل حضرت کی طرف منسوب کر دینے سے اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) بلا دلیل کسی ایک شخص کے ایسا منسوب کر دینے سے مذکورہ بات ثبوت شرعی نہیں ہے کہ حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ نے ایسا کسی فتوی میں تحریر فرمایا ہے خاص کر تب کہ جب علمائے اہل سنت کی اتنی بڑی اکثریت اس طرح کے کسی حکم سے بالکل بے خبر ہے۔

(۵) یہ بات عقل سے بالکل بعید ہے کہ حضور مفتیِ اعظم ہند علیہ الرحمہ کسی بات سے منع فرمائیں اور دنیا بھر کے علمائے اہل سنت ان کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مسلسل خود کو "بریلوی" لکھتے اور کہتے رہیں۔ آپ کی بے پناہ مقبولیت کے سبب آپ کے حکم کو عالم میں عام ہونے سے ایسی کون چیز مانع تھی جو صاحب عرفان مذہب و مسلکی روایت کے بغیر کسی دوسرے تک نہیں پہنچ سکا۔

ثانیا: اگر یہ حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ سے ثابت بھی ہو جائے تو اس پورے معاملے کو درست طور پر سمجھنے کے لیے اس کے سیاق و سباق پر غور کرنا ضروری ہے کیوں کہ اس عبارت میں لفظ "بریلوی" کے استعمال پر جو بحث کی گئی ہے، اس کے دو واضح پہلو ہیں۔ پہلا پہلو یہ ہے کہ جب مخالفین ہمیں "بریلوی" کہتے ہیں تو ان کا مقصد ہمیں اہل سنت سے الگ کر کے یہ تاثر دینا ہوتا ہے کہ معاذ اللہ یہ کوئی نیا دین یا جدید فرقہ ہے۔ جب وہ ہمیں اہل سنت و جماعت سے علاحدہ ثابت کرنے کے لیے یہ لفظ بولیں تو اس وقت اس نام کی شدت سے نفی کرنا اور انکار کرنا لازم ہو جاتا ہے تاکہ ان کے باطل پروپیگنڈے کا جواب دیا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قول میں یہ واضح عبارت موجود ہے کہ ہم وہی چودہ سو سالہ قدیم اہل سنت و جماعت ہیں، جو دراصل ایک چھپے ہوئے اعتراض کا جواب ہے کہ "بریلوی" کوئی نیا گروہ یا نیا مذہب نہیں ہے بلکہ یہ اہل سنت و جماعت کے مترادف تعبیر ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس وضاحت سے سرکار مفتیِ اعظم ہند علیہ الرحمہ کے اس موقف پر کوئی زد نہیں پڑتی کہ لفظ "بریلوی" کو امتیازی پہچان کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حاصلِ بحث یہ ہے کہ یہاں "بریلوی" کہلانے سے مطلقاً منع نہیں کیا گیا، بلکہ منع صرف اس صورت میں ہے جب بدمذہب ہمیں اہل سنت سے کاٹ کر ایک نیا فرقہ ظاہر کرنے کے لیے یہ لفظ استعمال کریں، جب کہ گمراہوں اور بے دینوں کے مقابلے میں اپنی سچی سنی پہچان کو واضح کرنے اور

امتیاز قائم کرنے کے لیے اسے بطورِ علامت استعمال کرنا اپنی جگہ بالکل جائز اور برقرار رہتا ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں جس عبارت کو پیش کیا گیا ہے اس کی صحت مذکورہ وجوہ سے نہایت مشکوک اور برتقدیر تسلیم بھی اس عبارت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ سنیوں کو گمراہ و بدمذہب فرقوں سے امتیاز کے لیے بھی ''بریلوی'' کہنا منع ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۴) جواب: زید کا یہ کہنا بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ ''بریلوی'' غیروں کا دیا ہوا نام ہے اسی لیے ''بریلوی'' نہیں کہنا چاہیے۔ حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ کی عبارات کے متعلق قدرے تفصیل کے ساتھ سوال نمبر دو (۲) کے جواب میں کلام گزر چکا ہے۔

''بریلوی'' نہیں کہنا چاہیے اس بات کو ثابت کرنے کے لیے زید نے کتر و بیونت اور مکر و فریب کی راہ کو اختیار کیا ہے۔ ماہرِ رضویات پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب نے تو لکھا ہے: **''بریلوی'' کوئی فرقہ نہیں بلکہ سواد اعظم اہل سنت کے مسلک قدیم کو عرف عام میں ''بریلویت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔''**

معترض زید نے صرف اپنے مطلب کی عبارت کی کاٹ چھانٹ کر کے وہ مفہوم نکالا جو ماہر رضویات کی اس مراد کے خلاف ہے جو ان کی عبارت سے ظاہر ہے لہٰذا ''آئینہ رضویات'' کی مکمل عبارت ملاحظہ ہو:

''البریلویہ میں امام احمد رضا پر جو فرد جرم عائد کی گئی ہے وہ بہت طویل ہے، جس کا محققانہ اور تسلی بخش جواب اس کتاب میں موجود ہے۔ یہاں چار پانچ الزامات کا مختصراً ذکر کروں گا، جو سفید جھوٹ کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ''البریلویہ'' کے مصنف نے کس دیدہ دلیری سے جھوٹ بولا ہے ع

چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد!

ا۔ امام احمد رضا پر ایک الزام یہ ہے کہ وہ ''بریلوی'' فرقے کے بانی ہیں اگر تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ **''بریلوی'' کوئی فرقہ نہیں بلکہ سواد اعظم اہل سنت کے مسلک قدیم کو عرف عام میں ''بریلویت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے** اور یہ عرف بھی پاک و ہند میں محدود ہے۔ اصل میں امام احمد رضا اور اس مسلک قدیم کے مخالفین نے اس کو ''بریلویت'' کے نام سے یاد کیا ہے اور بقول ابویحییٰ امام خاں نوشہروی، یہ نام اہل حدیث کا دیا ہوا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر جمال الدین (جامعہ ملیہ، دہلی) نے بھی اپنے ایک تحقیقی مقالے میں یہی تحریر فرمایا ہے کہ یہ نام مخالفین کا دیا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام احمد رضا خاں بریلوی نے پوری قوت کے ساتھ سواد اعظم اہل سنت کے اس عالمی مسلک کی حفاظت اور مدافعت فرمائی اور اس کو دشمنوں کے ہاتھوں برباد نہیں ہونے دیا''۔ (آئینہ رضویات، حصہ:۲، ص:۳۰۰، ادارہ تحقیقات امام احمد رضا انٹرنیشنل، کراچی، ۱۴۲۵ھ/ ۲۰۰۴ء)

مذکورہ عبارت کو زید غیر جانب دار ہو کر مکمل پڑھے اور پھر بتائے کہ ماہر رضویات ''بریلوی'' کہنے اور کہلوانے سے منع کر رہے ہیں یا عرف عام میں ''بریلویت'' کو سواد اعظم اہل سنت کے مسلک قدیم کی تعبیر قرار دے رہے ہیں؟ اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر آپ یوں رقم طراز ہیں:

''میں اہل سنت و جماعت (مسلک بریلوی) سے عرض کروں گا کہ افہام و تفہیم کے دو طریقے ہیں: عارفانہ، جارحانہ''۔ (آئینہ رضویات، حصہ:۱، ص:۱۳۳، ادارہ تحقیقات امام احمد رضا انٹرنیشنل، کراچی، ۱۴۲۵ھ/ ۲۰۰۴ء)

اس اقتباس میں جو ''مسلک بریلوی'' بریکٹ میں لکھا ہوا ہے وہ راقم کا اضافہ نہیں ہے بلکہ اصل کتاب کی عبارت ہے۔

اسی طرح زید نے شارح بخاری مفتی شریف الحق امجدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی جو عبارت پیش کی ہے اس سے قبل ہی یہ لکھا ہوا ہے کہ **''بریلوی کوئی نیا فرقہ نہیں، یہ وہی قدیم فرقہ ہے جس کو اہلِ سنت و جماعت کہتے ہیں۔ جو صحابہ کرام و تابعین عظام کے مبارک عہد سے چلا آرہا ہے''**۔ لہٰذا فتاویٰ شارح بخاری کی بھی مکمل عبارت ملاحظہ فرمائیں:

''**بریلوی کوئی نیا فرقہ نہیں، یہ وہی قدیم فرقہ ہے جس کو اہلِ سنت و جماعت کہتے ہیں۔ جو صحابہ کرام و تابعین عظام کے مبارک عہد سے چلا آرہا ہے**۔ دیوبندیوں نے عناد و دشمنی کی وجہ سے اہلِ سنت و

جماعت کو بریلوی کہنا شروع کر دیا ہے، تاکہ ناواقف لوگ یہ نہ جانیں کہ یہ نیا فرقہ ہے اور اس سے بیزار ہوں۔ چوں کہ اس صدی میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے مذہب اہلِ سنت و جماعت کی حمایت ونصرت کی ہے، تو بد مذہبوں نے سنیوں کو"بریلوی" کہنا شروع کر دیا ہے۔ دیوبندی البتہ نیا فرقہ ہے جو تیرہویں صدی سے شروع ہوا اور اب ابھرا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ دیوبندیوں کے جو عقائد ہیں وہ اسلاف میں سے کسی کے نہیں تھے۔ (فتاوی شارح بخاری، کتاب العقائد، ج:۳،ص: ۱۵۳، دائرۃ البرکات گھوسی)

اس عبارت سے بھی یہی واضح ہے کہ دیوبندیوں نے عناد و دشمنی کے سبب ہم سنیوں کو"بریلوی" کہنا شروع کیا اس عبارت سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خود کو غیروں سے امتیاز کے لیے"بریلوی" نہیں کہنا چاہیے بلکہ مذکورہ عبارت کی ابتدا میں جو یہ لکھا ہے کہ **"بریلوی کوئی نیا فرقہ نہیں، یہ وہی قدیم فرقہ ہے جس کو اہلِ سنت و جماعت کہتے ہیں۔ جو صحابہ کرام وتابعین عظام کے مبارک عہد سے چلا آرہا ہے"**۔ اسی سے یہ ثابت ہے کہ بدمذہبوں سے امتیاز کے لیے ہی ہم سنی خود کو"بریلوی" کہتے ہیں۔ اسی مفہوم کو مزید سمجھنے کے لیے شارح بخاری علیہ الرحمہ کی دوسری عبارت ملاحظہ ہو:

"اس کے کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ بریلوی یعنی سنی بواسطہ خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں اور دیوبندی بلاواسطہ، ڈائرکٹ"۔ (فتاوی شارح بخاری، کتاب العقائد، ج:۲،ص:۴۲۱، دائرۃ البرکات گھوسی)

کیا واقعی لفظ بریلوی غیروں کا دیا ہوا نعرہ ہے اور اس کی حمایت غیروں کی معاونت ہے۔ اس تعلق سے حضرت مولانا مفتی سید محمد حسینی اشرفی مصباحی سجادہ نشین آستانہ عالیہ شمسیہ رائچور کرناٹک چیف ایڈیٹر ماہنامہ سنی آواز ناگپور لکھتے ہیں:

"ایک صدی سے زائد عرصہ سے مسلک اہلسنت کی شناخت صرف"مسلک اعلیٰ حضرت"یا"مسلک بریلوی" کے نام سے معروف ہے۔ اس لیے کہ حنفیت اور سنیت کے نام پر ہی وہابی، دیوبندی بھی جانے جاتے ہیں۔ بلکہ قادیانی بھی اپنے آپ کو حنفی ہی کہتا ہے۔ ایسی صورت میں مسلک اہلسنت، صراط مستقیم سواد اعظم کی شناخت کے لیے کسی ایسے خصوصی لفظ کی ضرورت تھی جس کے ذکر ہوتے ہی تمام گمراہ و باطل پرست و بدمذہب فرقے جدا ہو جائیں۔ اگر کوئی اپنے آپ کو صرف حنفی و سنی کہتا ہے تو اس میں کوئی خصوصیت باقی نہیں رہتی کہ آیا یہ دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہے یا مسلک اہلسنت سے۔ اگر کسی نے اپنے آپ کو حامل مسلک اعلیٰ حضرت کہا یا"بریلوی" کہا اس سے تمام گمراہ و بدمذہب و باطل پرست چھٹ جائیں گے۔ اب کسی کو شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہ اہلسنت و جماعت سے نہیں ہے۔ غرضیکہ جس سلسلہ سے بھی وابستہ ہو چاہے وہ قادری ہو، یا چشتی، سہروردی ہو یا نقشبندی، حنفی ہو یا شافعی، مالکی ہو یا حنبلی اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو اہلسنت میں ہونے کا مدعی ہے۔ تو وہ پہلے"مسلک اعلیٰ حضرت" کے حامل ہونے کا اقرار کرے اور"بریلوی" ہونے پر یقین رکھے۔" (بدلتے زاویئے،ص: ۳، ۴، مکتبہ سنی آواز دارالعلوم امجدیہ ناگپور بحوالہ امتیازِ اہل سنت ۲۰۱۲ء، ص: ۱۴۷، ۱۴۸، رضا دارالمطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار)

حضرت سید محمد حسینی اشرفی دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"آج کا وہ زمانہ جو بکثرت پرانے اور نئے نئے گمراہ، بددین، مرتد فرقوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور ہر فرقہ اپنے کھرے مسلمان ہونے کا دعوی کرتا ہے۔ مسلمانوں کے نزدیک اسلام اور اسلامیات وہی ہیں جن کی تصریحات اعلیٰ حضرت امام بریلوی قدس سرہ نے دلائل قاہرہ سے فرمادی ہے۔ جس کو اہلسنت،"بریلوی مسلک" اور"مسلک اعلیٰ حضرت" سے جانتے ہیں پہچانتے ہیں اور اہلسنت کے علاوہ دوسرے فرقے والے بھی اسی نام کے مسلک کو سبب امتیاز مانتے ہیں اور ہم سنی اشرفی سادات یا ہمارے دوسرے غیر سادات برادران اہلسنت خواہ وہ کچھوچھہ شریف میں رہتے ہوں یا کسی دوسرے مقام پر وہ پچھلی صدی کے ہوں یا نئی صدی کے سب اسی فرق و امتیاز کے ساتھ"مسلک اعلیٰ حضرت" یا"بریلوی" مسلک پر قائم ہیں"۔

(گل افشانیاں، ص:۲۹، ۳۰، ۱۹۹۴ء، مکتبہ ماہنامہ سنی آواز، دار العلوم امجدیہ ناگپور بحوالہ امتیازِ اہل سنت ۲۰۱۲ء، ص: ۱۴۸، ۱۴۹، رضا دارالمطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار)

اہل سنت و جماعت خود کو" بریلوی" بد مذہبوں سے امتیاز کے لیے کہتے ہیں جولوگ یہ کہتے ہیں کہ" بریلوی" غیروں کا دیا ہوا نام ہے ان کا جواب دیتے ہوئے شہزادۂ بحر العلوم مولانا شکیب ارسلان مصباحی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"لہذا اعلیٰ حضرت یا ان کے خلفا و تلامذہ نے جب نہ منع کیا۔ اور نہ اجازت دی۔ تو اجازت ہی رہے گی اور اپنے طور پر اہلسنت کو بریلوی لکھنا صحیح ہوگا۔ کیا یہ طریقۂ استدلال، اور طرز سوال وہی نہیں ہے جسے بار بار وہابی، اور دیو بندی اہلسنت سے کرتے ہیں۔ کہ میلا د و قیام اور سوم و فاتحہ کا ثبوت حدیث سے دیں۔

اہلسنت کو بریلوی سے متعارف حافظ ملت کے طریقہ کار اور ان کے تلامذہ کی تحریروں میں جا بجا موجود ہے۔ مثلاً جامعہ اشرفیہ کے دستور میں لکھا ہے۔ ابتدا ہی سے جامعہ کا کوئی دستور مرتب نہیں تھا۔ ۱۹۷۱ء میں الجامعۃ الاشرفیہ کی بنیاد پڑی۔ اس وقت حضرت علامہ حافظ عبد الرؤف صاحب اور بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب علیہما الرحمہ اور ان کے رفقائے کار نے دستور مرتب فرمایا۔ اس کو گورنمنٹ سے رجسٹرڈ کرایا۔ وہ دستور چھپ کر آ بھی گیا جن کی چند دفعات درج ذیل ہیں۔

(۱) ادارہ کا مسلک: اس کے بانیوں (شیخ المشائخ ابو احمد محمد علی حسین صاحب اشرفی جیلانی، اور صدر الشریعہ حضرت مولانا امجد علی صاحب مصنف بہار شریعت کے موافق سنی حنفی، بریلوی ہوگا۔ سنی واہلسنت و جماعت ہر وہ صحیح العقیدہ مسلمان ہے جو تمام اعمال و عقائد میں سلف صالحین کا متبع ہو۔ موجودہ زمانہ میں جس کی واضح نشانی یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں صاحب بریلوی علیہ الرحمہ سے اعمال و عقائد میں بالکلیہ متفق ہو۔ اور تمام فرق باطلہ مثلاً وہابی دیو بندی، رافضی غیر مقلد وغیرہ سے دور و نفور ہو۔ اور کتاب مستطاب حسام الحرمین مصنفہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کو حرف بحرف مانتا ہو۔ (بریلوی ہی اہل سنت ہیں، ص: ۴، ۵، بحر العلوم عرس کمیٹی، مبارک پور، ۱۴۲۹ھ/ ۲۰۱۷ء)

اسی میں ہے:

دستور کی ترتیب اکابرین اہل سنت کے ذمہ دار علما کی مرہون منت ہے حافظ ملت علیہ الرحمہ نے" سنی، حنفی، کے ساتھ" بریلوی" کے اضافے کو ناگزیر سمجھا اور اسے باقی رکھا۔ اب اگر تسلیم کیا جائے کہ اہل سنت کو بد مذہبوں نے ہی" بریلوی" سے موسوم کیا تو معاذ اللہ دستور کے مرتبین اور حافظ ملت علیہ الرحمہ کو بد مذہب مانا جائے یا کم از کم بد مذہبوں کے اشتہاری پروپیگنڈہ کا مجرم گردانا جائے یا ان کا شریک سمجھا جائے یہ بڑا سنگین الزام ہوگا"۔ (مرجع سابق، ص: ۵، ۶)

لہذا جب بد مذہب ہمیں نئے فرقے کے طور پر" بریلوی" کہیں تو ایسا" بریلوی" ہونے سے انکار کیا جائے یعنی یہ بتایا جائے کہ "بریلوی" کوئی نیا مذہب یا نیا فرقہ نہیں ہے اگر کوئی" بریلوی" نام سے نیا مذہب یا نیا فرقہ ہو تو ہم اس سے بیزار ہیں۔ بد مذہبوں سے امتیاز کے لیے خود کو" بریلوی" کہنا یہ بزرگوں سے ثابت ہے۔ واللہ تعالیٰ علم

(۵) جواب: اہل سنت و جماعت اپنے آپ کو" اشعری" اور" ماتریدی" کہلاتے ہیں جیسا کہ شیخ محقق علی الاطلاق حضرت شاہ عبد الحق محدث دہلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تحریر فرماتے ہیں:

"وشیخ ابو الحسن اشعری در فقه بر مذهب شافعی بود، ودیگر از مؤیدان مذهب اهل سنت وجماعت شیخ ابو منصور ماتریدی بود و مناقب و مفاخر وی بیرون از حد حصر و احصا است و وے حنفی المذهب ست از بیجاست که جانب شافعیه را اشاعره خوانند و حنفیه را ماتریدیه هر دو متفق اند در عقائد، و اهل سنت وجماعت که گویند تابعان ایشان اند"۔ (شرح سفر السعادت، ص: ۵۰۹، مکتبہ نوریہ رضویہ، سکھر پاکستان، ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء)

ترجمہ: اور شیخ ابو الحسن اشعری فقہ میں شافعی مذہب پر تھے، اور اہل سنت و جماعت کے دوسرے تائید کرنے والوں میں سے شیخ ابو منصور ماتریدی تھے۔ ان کے فضائل اور کارنامے گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں۔ وہ حنفی المذہب تھے، اسی وجہ سے شافعیوں کو" اشاعرہ" اور حنفیوں کو" ماتریدیہ" کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں گروہ عقائد میں متفق ہیں، جنہیں اہل سنت و جماعت کہا جاتا ہے، وہ انہی دونوں کے متبعین

ہیں۔

فخر المتکلمین علامہ محمد عبد العزیز پرہاروی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"هو الإمام محمد بن محمد بن محمود سمرقندي منسوب إلى ما تريد إسم قرية من سمرقند، ويلقب بعلم الهدى وهو رئيس علماء أهل السنة والجماعة بما وراء النهر وكان حنفي المذهب تلمذ على أبي نصر عياض تلميذ أبي بكر الجوز جاني تلميذ الامام محمد رحمه الله صاحب أبي حنيفة رحمه الله و تسمى اتباعه بالما تريدى"۔(النبراس شرح شرح العقائد النسفية، الكلام فى صفة الكلام، ص:۳۱۰، مكتب ياسين، تركيا، ۱۴۳۳ھ/ ۲۰۱۲ء)

ترجمہ: وہ امام محمد بن محمد بن محمود سمرقندی ہیں، جن کی نسبت "ماترید" کی طرف ہے جو کہ سمرقند کا ایک گاؤں ہے۔ آپ علم الہدیٰ کے لقب سے ملقب ہیں اور آپ ماوراء النہر میں علمائے اہل سنت و جماعت کے سربراہ تھے۔ آپ مذہب کے اعتبار سے حنفی تھے، آپ نے ابو نصر عیاض سے تعلیم حاصل کی جو کہ ابو بکر الجوز جانی کے شاگرد تھے، اور وہ حضرت امام محمد بن حسن شیبانی رحمہ اللہ کے شاگرد تھے جو کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔ اور آپ کے متبعین کو "ماتریدی" کہا جاتا ہے۔

زید کا یہ کہنا کہ "کسی عظیم شخصیت سے نسبت ایک فکری، روحانی اور علمی وابستگی کا اظہار ہوتی ہے"، "شہر سے نسبت صرف جغرافیائی پہچان ہوتی ہے" درست نہیں ہے کیوں کہ اگر ہم زید کی مذکورہ منطق کو تسلیم کر لیں تو احناف کو "ماتریدی" یا "ماتریدیہ" کی نسبت لگانا بھی غلط ہو جائے گا کیوں کہ "ماتریدی" کسی شخصیت کا نام نہیں، بلکہ سمرقند (ازبکستان) کے ایک محلے یا علاقے کا نام "ماترید" ہے جو امامِ اہلِ سنت، امام الہدیٰ، حضرت سیدنا امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مولد و مسکن ہے اسی کی طرف نسبت کر کے "ماتریدی" کہا جاتا ہے۔ علامہ خیر الدین دمشقی زرکلی تحریر فرماتے ہیں:

"محمد بن محمد بن محمود، أبو منصور الماتريدى: من أئمة علماء الكلام، نسبته إلى "ماتريد" (محلة بسمرقند)"۔(الأعلام للزركلی، ج:۷، ص:۱۹، دار العلم للملايين، بيروت)

ترجمہ: محمد بن محمد بن محمود، ابو منصور ماتریدی: علمِ کلام کے اماموں اور علما میں سے ہیں، ان کی نسبت "ماترید" کی طرف ہے جو سمرقند کا ایک محلہ ہے۔

ابو الحسن نور الدین علی بن سلطان ملا علی قاری ہروی علیہ الرحمہ [م ۱۰۱۴ھ] ایک حدیث کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں:

"وقيل: المراد به أبو منصور الماتريدي، وهو إمام جليل مشهور، وعليه مدار أصول الحنفية في العقائد الحنيفية"۔(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، كتاب الفتن، باب اشراط الساعة، ج:۱۰، ص:۹۸، دار الكتب العلمية، بيرتوت)

ترجمہ: اور ایک قول یہ بھی ہے کہ: اس سے مراد ابو منصور ماتریدی ہیں، جو کہ ایک عظیم اور مشہور امام ہیں، اور عقائدِ حنفیہ میں احناف کے اصولوں کا دارومدار انہیں کی ذات پر ہے۔

طریقت کے جو چار مشہور سلاسل ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) سلسلۂ عالیہ قادریہ: اس سلسلہ سے منسلک افراد "قادری" کہلاتے ہیں۔ (۲) سلسلۂ نقشبندیہ: اس سلسلہ سے منسلک افراد نقش بندی کہلاتے ہیں۔ (۳) سلسلۂ چشتیہ: اس سلسلہ سے منسلک افراد کو چشتی کہا جاتا ہے۔ (۴) سلسلۂ سہروردیہ: اس سلسلہ سے منسلک افراد کو سہروردی کہا جاتا ہے۔

اگر زید کی اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ شہر یا قصبے کی نسبت عیب ہے، تو برصغیر کے مقبول ترین روحانی سلسلے سے منسلک افراد کو "چشتی" نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ یہ چشت کی طرف منسوب ہے اور "چشت" خراسان میں کا ایک گاؤں ہے۔

برکات الصوفیہ" میں ہے:

""الجشتية" منسوبة إلى "جشت"، وهي قرية بقرب "هرات" في خراسان، تبدأ هذه الطريقة من الشيخ

الخواجة أبي إسحاق الشامي (ت: ۳۲۹ھ)"۔(برکات الصوفية فی شبه القارة الهندية، ص:۶۴، دار اشرف البرکات، حیدرآباد)

ترجمہ:"چشتیہ" یہ "چشت" کی طرف منسوب ہے، جو خراسان میں "ہرات" کے قریب ایک گاؤں ہے۔اس سلسلے کی ابتدا شیخ خواجہ ابو اسحاق شامی (م۳۲۹ھ) سے ہوتی ہے۔

"چشت دو ہیں ایک شہر ہے جو ملک خراسان میں ہرات کے نواحی میں واقع ہے۔دوسرا قصبہ ہے ہندوستان میں جو ملتان اور اوچ کے درمیان ہے ہمارے خواجگان خراسان والے چشت سے تعلق رکھتے ہیں"۔(مرأۃ الاسرار مترجم،ص:۲۷، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور)

"چشت (فارسی) ایک گاؤں کا نام جہاں سے سلسلۂ چشتیہ کی ابتدا ہوئی"۔ (وثائق بخشش شرح حدائق بخشش، ج:۱،ص:۲۷، جمعیت اشاعت اہلسنت، کراچی

اگر بزرگانِ دین کی جائے پیدائش کی طرف نسبت اصولاً غلط ہے، تو سلسلۂ سہروردیہ سے منسلک افراد کو "سہروردی" نہیں کہنا چاہیے، کیوں کہ "سہروردی" منسوب ہے "سہرور" کی طرف جو کہ ایران کا ایک شہر ہے۔معجم البلدان میں ہے:

"بلدة قريبة من زنجان بالجبال خرج منها جماعة من الصالحين والعلماء"۔(معجم البلدان، ج:۳، ص: ۲۸۹، دار صادر، بیروت)

ترجمہ: یہ علاقہ پہاڑی سلسلے میں زنجان کے قریب ایک بستی ہے، جہاں سے صالحین اور علما کی ایک جماعت وابستہ رہی ہے۔

مذکورہ اصول جغرافیائی پہچان فکری نسبت کے منافی ہے، کو تسلیم کرنے کی صورت میں تو مغرب اسلامی کے مشہور زمانہ سلسلے کو شاذلیہ سے منسلک افراد کو "شاذلی" کہنا اور کہلوانا بھی غلط ہو جائے گا کیوں کہ یہ "شاذلہ" کی طرف منسوب ہے اور "شاذلہ" شمالی افریقہ کے ملک "تونس" کا ایک قصبہ ہے جیسا کہ حضرت امام عبد الوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"ومنهم الشيخ أبو الحسن الشاذلي رضي الله عنه، هو علي بن عبد الله بن عبد الجبار الشاذلي، بالشين والذال المعجمتين، وشاذلة قرية من إفريقية-الضرير، الزاهد، نزيل إسكندرية، وشيخ الطائفة الشاذلية، وكان كبير المقدار، عالي المنار، له عبارات فيها رموز"۔(الطبقات الکبری للشعرانی، ج:۱، ص:۴، مکتبة محمد المليجی الکتبی وأخيه، مصر)

ترجمہ: اور انہیں میں سے ایک شیخ ابوالحسن الشاذلی رضی اللہ عنہ ہیں، جو کہ علی بن عبداللہ بن عبدالجبار الشاذلی ہیں۔شاذلی کا تلفظ شین اور ذال معجمہ یعنی نقطوں والے حروف کے ساتھ ہے، اور "شاذلہ" افریقہ کا ایک گاؤں ہے۔ظاہری آنکھوں سے معذور اور زاہد تھے، اسکندریہ میں سکونت پذیر رہے اور "سلسلۂ شاذلیہ" کے شیخ تھے۔وہ بلند مرتبت اور عظیم الشان شخصیت کے مالک تھے، ان کے کلام میں روحانی رموز و اشارات پائے جاتے ہیں۔

آج حق و باطل کے امتیاز کے لیے "مسلک اعلیٰ حضرت" اور "بریلوی" کا استعمال ہوتا ہے اس سے پہلے اہلِ باطل کے مقابلہ میں اہل حق کو "بدایونی" اور "خیر آبادی" بھی کہا جاتا تھا جیسا کہ مولانا محمود احمد قادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"یہ حقیقت ہے کہ حضرت سیف اللہ المسلول (حضرت علامہ فضل رسول بدایونی) صف اول کے ان ممتاز علما و مشائخ میں تھے جنھوں نے فتنۂ وہابیت کے سد باب کے لئے کوشش بلیغ فرمائی۔آپ کی اور علامہ فضل حق خیر آبادی کی ذات قدسی صفات کی وجہ سے اہل باطل کے مقابلہ میں اہل حق، دور اول میں "بدایونی" اور "خیر آبادی" کے لقب سے پکارے جاتے تھے"۔(تذکرہ علمائے اہل سنت، ص:۲۱۰، سنی دار الاشاعت علویہ رضویہ، فیصل آباد، ۱۹۹۲ء)

اگر شہر سے نسبت صرف جغرافیائی پہچان کے لیے ہوتی حق و باطل کے امتیاز کے لیے شہر کی طرف نسبت کرنا درست نہیں ہوتا تو باطل کے مقابلہ میں اہل حق "بدایونی" اور "خیر آبادی" نہیں کہے جاتے، مذکورہ تفصیلات سے معلوم ہوا کہ انتسابات میں اعتبار عرف کا ہے عرف

میں جو حق و باطل کا معیار ہو وہ اہل حق کی علامت ہے چاہے وہ پیروں میں پہنے جانے والا موزہ ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ ایک زمانے میں "خفین پر مسح کرنا" اہل حق کی علامت و نشانی رہا ہے۔ حضرت مفتی محمد امان الرب رضوی علیہ الرحمہ اپنے ایک مضمون کے اخیر میں تحریر فرماتے ہیں:

"مسلک اعلی حضرت اور بریلوی کہنے کا یہی مطلب ہے کہ ہم اہلسنت و جماعت دلائل میں اعلی حضرت کے نقش قدم پر چلتے ہیں جس طرح "ماترید" جگہ کا نام ہے اور تمام (حنفی) اہلسنت "ماتریدی" کہتے ہیں چاہے وہ کہیں کہ ہوں جب اس پر اعتراض نہیں تو "بریلوی" کہنے پر بھی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ یہ نسبت جو ہے اعلی حضرت بریلوی کی اقتدا اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی بنیاد پر ہے۔ لہذا دور حاضر میں مسلک اعلی حضرت اور بریلوی دونوں کا استعمال لازم وضروری ہے، جیسا کہ ماتریدی اور اشعری کا استعمال ماضی میں لازم وضروری تھا۔ جو لوگ مسلک اعلی حضرت اور لفظ بریلوی کہنے پر مشتبہ ہیں اور ان کے استعمال پر مناظرانہ ومجادلانہ انداز فکر اپنائے ہوئے ہیں ان کے لئے یہ تحریر پیغام عمل بھی ہے اور راہ عمل بھی"۔ (پیغام رضا، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰ء، ص: ۲۴، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار)۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۶) جواب: برصغیر کے وہ سنی مسلمان جو عقائد و معمولات اہل سنت پر قائم ہیں اور غیروں سے امتیاز کے لیے عام طور پر خود کو "مسلک اعلیٰ حضرت" کا ماننے والا اور "بریلوی" کہتے ہیں "دیوبندی"، "وہابی"، "نجدی" اور قادیانی وغیرہ کے عقائد ونظریات ان سنیوں کے خلاف ہیں تو یہ "دیوبندی"، "وہابی"، "نجدی" اور قادیانی وغیرہ اپنی زبان سے یہ تو نہیں کہتے پھریں گے کہ برصغیر کے "سنی بریلوی" حق پر ہیں اور وہ اہل باطل ہیں بلکہ اہل باطل کا ہر زمانے میں یہ دستور رہا ہے کہ وہ کذب وغدر اور الزام وبہتان کے سہارے خود کو حق اور حق کو باطل ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے ہیں اور نجدیوں، وہابیوں کا یہ طریقہ ان کے جد اعلیٰ ابن عبد الوہاب نجدی سے ہی چلا آرہا ہے کہ وہ اپنے علاوہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو مشرک کہتا تھا۔

سرزمین حجاز مقدس پر ایک عرصہ سے نجدیوں، وہابیوں کا تسلط ہے، اس مذہب کے بانی ومبانی ابن عبد الوہاب نجدی علیہ ما علیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اس کے اور اس کے متبعین کے علاوہ پوری دنیا کے مسلمان کافر ومشرک ہیں، شیخ الاسلام علامہ سید احمد زینی دحلان مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نجدیوں، وہابیوں کے عقائد فاسدہ وباطلہ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"وكان أتباع محمد بن عبد الوهاب إذا أراد أحداً أن يتبعهم على دينهم طوعاً أو كرهاً كانوا يأمرونه بالإتيان بالشهادتين أولاً يقولون له اشهد على نفسك إنك كنت كافراً واشهد على والديك أنهما ماتا كافرين، واشهد على فلان وفلان أنه كان كافراً ويسمون له جماعة من أكابر العلماء الماضين فإن شهدوا بذلك قبلوهم وإلا أمروا بقتلهم"۔ (الدر السنية فى الرد على الوهابية، ص: ۱۱۸، مكتبة الأحباب، دمشق، ۱۴۲۴ھ/ ۲۰۰۳ء)

ترجمہ: محمد بن عبد الوہاب کے پیروکار جب کسی کو خوشی سے یا زبردستی اپنے عقیدے پر لانا چاہتے، تو وہ اسے سب سے پہلے کلمہ شہادت پڑھنے کا حکم دیتے۔ وہ اس سے کہتے: اپنے متعلق گواہی دو کہ تم کافر تھے، اپنے والدین کے متعلق گواہی دو کہ وہ کفر کی حالت میں مرے، اور فلاں فلاں شخص کے بارے میں گواہی دو کہ وہ کافر تھا۔ اور وہ اس کے سامنے ماضی کے جید علمائے کرام کی ایک جماعت کا نام لیتے، پس اگر وہ اس بات کی گواہی دے دیتے تو وہ انہیں قبول کر لیتے، ورنہ وہ ان کے قتل کا حکم دے دیتے۔

"وكانوا يصرحون بتكفير الأمة منذ ستمائة سنة۔ وأول من صرح بذلك محمد بن عبد الوهاب فتبعوه على ذلك، وإذا دخل إنسان في دينهم وكان قد حج حجة الإسلام قبل ذلك يقولون له حج ثانياً فإن حجتك الأولى فعلتها وأنت مشرك فلا تسقط عنك الحج، ويسمون من اتبعهم من الخارج المهاجرين، ومن من أهل بلدتهم يسمونهم

الأنصار"۔ (المرجع السابق، ص: ۱۹)

ترجمہ: اور وہابیہ کھلم کھلا یہ کہتے تھے کہ گزشتہ چھ سو سال سے پوری امت کافر چلی آ رہی ہے۔ اور سب سے پہلے جس نے اس کا واضح اعلان کیا وہ محمد بن عبد الوہاب تھا، پھر انھوں (وہابیوں، نجدیوں) نے اس معاملے میں ان کی پیروی کی اور جب کوئی شخص ان کے دین میں داخل ہوتا اور وہ اس سے پہلے فرض حج کر چکا ہوتا، تو وہ اس سے کہتے: دوبارہ حج کرو، کیوں کہ تمہارا پہلا حج اس وقت ہوا تھا جب تم مشرک تھے، اس لیے وہ تمہارا فرض ساقط نہیں کرتا، اور جو باہر سے ان کے ساتھ شامل ہوتا، وہ اسے "مہاجرین" کا نام دیتے، اور جو ان کے اپنے علاقے کے لوگ ہوتے، انہیں وہ "انصار" کہتے تھے۔

وقال له أخـــوه سليمان يوماً: كم أركان الإسلام يا محمد بن عبد الوهاب؟ فقال خمسة، فقال أنت جعلتها ستة، السادس: من لم يتبعك فليس بمسلم هذا عندك ركن سادس للإسلام"۔ (المرجع السابق، ص: ۱۰۴)

ترجمہ: ایک دن اس کے بھائی سلیمان نے اس سے پوچھا: اے محمد بن عبد الوہاب! اسلام کے ارکان کتنے ہیں؟" اس نے جواب دیا: پانچ۔ تو سلیمان نے کہا: تم نے انہیں چھ بنا دیا ہے؛ چھٹا رکن یہ ہے کہ: جو تمہاری پیروی نہ کرے وہ مسلمان نہیں، یہ تمہارے نزدیک اسلام کا چھٹا رکن ہے۔

اعلیٰ حضرت امام اہل سنت شاہ امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

"یہ ناپاک ترکہ اسی بے باک اخبث امام اول دین مستحدث یعنی ابن عبد الوہاب نجدی علیہ ما علیہ کا ہے، کہ اپنے موافقان ناخردمند نفرے چند بے قید و بند آزادی پسند کے سوا تمام عالم کے مسلمانوں کو کافر و مشرک کہتا، اور خود اپنے باپ، دادا، اساتذہ مشائخ کو بھی صراحۃً کافر کہہ کر پوری سعادت مندی ظاہر کرتا۔

اور نہ صرف انہیں پر قانع ہوتا بلکہ آج سے آٹھ سو برس تک کے تمام علما و اولیا سائر امت مرحومہ کو (خاک بدہان ناپاک) صاف صاف کافر بتاتا اور جو شخص اس کے جال میں پھنس کر اس کے دست شیطان پرست پر بیعت کرتا اس سے آج تک اس کے اور اس کے ماں باپ اور اکابر علمائے سلف نام بنام سب کے کفر پر اقرار لیتا۔

اور اگرچہ بظاہر ادعائے حنبلیت رکھتا مگر مذاہب ائمہ کو مطلقاً باطل جانتا اور سب پر طعن کرتا اور اپنے اتباع ہر کندہ ناتراشیدہ کو مجتہد بننے کا حکم دیتا۔ یہ دو چار حرف اردو کے پڑھ کر استر بے لگام واشتر بے مہار ہو جانا بھی اسی خرناشخص کی تعلیم ہے۔" (حجاز مقدس پر نجدی تسلط اسباب و نتائج، ص: ۳۰، رضا اکیڈمی، ممبئی، ۱۴۴۰ھ/۲۰۱۸ء، بحوالہ ماہنامہ تحفہ حنفیہ پٹنہ، ربیع الآخر و جمادی الاولی، ۱۳۱۹ھ، ص: ۴، ۵)

نجدیوں، وہابیوں کا پوری دنیا کے اہل سنت و جماعت کو کافر و مشرک اور دین سے خارج کہنا کس سبب سے تھا؟ ملاحظہ فرمائیں اس کے متعلق بھی شیخ الاسلام علامہ سید احمد زینی دحلان مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"كان محمد بن عبد الوهاب الذي ابتدع هذه البدعة يخطب للجمعة في مسجد الدرعية ويقول في كل خطبة: ومن توسل بالنبي فقد كفر، وكان أخوه سليمان بن عبد الوهاب من أهل العلم، فكان ينكر عليه إنكاراً شديداً في كل ما يفعله أو يأمر به ولم يتبعه في شيء مما ابتدعه"۔ (الدر السنية فى الرد على الوهابية، ص: ۱۰۴، مكتبة الأحباب، دمشق، ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳ء)

ترجمہ: محمد بن عبد الوہاب ہی نے اس بدعت کو بھی ایجاد کیا تھا کہ وہ مسجدِ درعیہ میں جمعہ کا خطبہ دیتا اور اپنے ہر خطبے میں کہتا: جس نے نبی کا توسل اختیار کیا، وہ کافر ہو گیا۔ اس کے بھائی سلیمان بن عبد الوہاب اہلِ علم میں سے تھے، وہ اس کی مخالفت فرماتے تھے ہر اس چیز میں جس کا وہ حکم دیتا یا جس کو وہ کرتا، اور انھوں نے اس کی ایجاد کردہ کسی بھی بدعت میں اس کی پیروی نہیں کی۔

"ومن مقابحه أنه لما منع الناس من زيارة النبي صلى الله عليه وآله وسلم خرج ناس من الأحساء وزاروا النبي صلى الله عليه وآله وسلم وبلغه خبرهم، فلما رجعوا مروا عليه بالدرعية، فأمر بحلق لحائهم ثم أركبهم مقلوبين من الدرعية

إلى الأحساء"۔(المرجع السابق، ص:۱۰۸)

ترجمہ: اور ان کی برائیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب انہوں نے لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری سے روکا، تو احساء کے کچھ لوگ نکلے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری دی، اور اس (ابن عبدالوہاب) تک ان کی یہ خبر پہنچ گئی۔ پس جب وہ لوگ واپس لوٹے اور راستے میں درعیہ سے اس کے پاس سے گزرے، تو اس نے ان لوگوں کی داڑھیاں منڈوانے کا حکم دیا، پھر انہیں درعیہ سے احساء تک سواریوں پر الٹا بٹھا کر بھیجا۔

"وكان ينهي عن الصلاة على النبي صلى الله عليه وآله وسلم ويتأذى من سماعهم وينهى عن الإتيان بها يوم الجمعة وعن الجهر بها على المنابر، ويؤذي من يفعل ذلك ويعاقبه أشد العقاب، حتى أنه قتل رجل أعمى كان مؤذناً صالحاً ذا صوت حسن نهاه عن الصلاة على النبي صلى الله عليه وآله وسلم في المنارة بعد الأذان فلم ينته وأتى بالصلاة على النبي صلى الله عليه وآله وسلم فأمر بقتله فقتل، ثم قال: إن الربابة في بيت الخاطئة: يعني أن الزانية أقل إثماً ممن ينادي بالصلاة على النبي صلى الله عليه وآله وسلم في المنائر، ويلبس على أصحابه بأن ذلك كله محافظة على التوحيد"۔(المرجع السابق، ص:۱۰۸، ۱۰۹)

ترجمہ: وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود شریف پڑھنے سے روکتا تھا، لوگوں سے درود شریف سن کر اذیت محسوس کرتا تھا۔ وہ جمعہ کے دن درود پڑھنے اور منابر پر بلند آواز سے اسے پڑھنے سے منع کرتا، جو ایسا کرتا اسے تکلیف اور سخت ترین سزا دیتا یہاں تک کہ اس نے ایک نابینا شخص کو قتل کروا دیا جو کہ ایک نیک اور خوش الحان مؤذن تھے۔ اس نے اس مؤذن کو اذان کے بعد مینار پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھنے سے روکا تھا، لیکن وہ باز نہ آئے اور انہوں نے درود شریف پڑھ دیا، تو اس نے ان کے قتل کا حکم دیا اور انہیں قتل کر دیا گیا۔ پھر (ابن عبدالوہاب نے) کہا: بدکار عورت کے گھر میں سارنگی (کا ہونا) اس شخص سے کم گناہ ہے جو میناروں پر بلند آواز سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پکارتا ہے۔ (معاذ اللہ!) اور وہ اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر مغالطے میں ڈالتا تھا کہ یہ سب کچھ توحید کی حفاظت کے لیے ہے۔

"وكان يمنع أتباعه من مطالع كتب الفقه والتفسير والحديث وأحرق كثيراً منها، وأذن لكل من اتبعه أن يفسر القرآن فهمه حتى همج الهمج من أتباعه، فكان كل واحد منهم يفعل ذلك ولو كان لا يحفظ القرآن ولا شيئاً منه، فيقول الذي لا يقرأ منه لآخر يقرأ: اقرأ علي حتى أفسر لك، فإذا قرأ عليه يفسر برأيه، وأمرهم أن يعملوا ويحكموا بما يفهمونه وجعل ذلك مقدماً على كتب العلم ونصوص العلماء"۔(المرجع السابق، ص:۱۰۹)

ترجمہ: وہ اپنے پیروکاروں کو فقہ، تفسیر اور حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے روکتا، اس نے ان میں سے بہت سی کتابیں جلا دیں، اس نے اپنے ہر پیروکار کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ قرآن کی تفسیر اپنی سمجھ کے مطابق کرے، یہاں تک کہ اس کے پیروکاروں میں سے جاہل ترین، گنوار لوگ بھی یہ کرنے لگے۔ پس ان میں سے ہر ایک یہی کام کرتا تھا، خواہ اسے قرآن یا اس کا کوئی حصہ بھی حفظ نہ ہو۔ چنانچہ جو پڑھنا نہیں جانتا تھا وہ دوسرے پڑھنے والے سے کہتا: میرے سامنے پڑھو تاکہ میں تمہارے لیے اس کی تفسیر کروں پھر جب وہ اس کے سامنے پڑھتا، تو یہ اپنی رائے سے اس کی تفسیر کر دیتا۔ اور اس نے اپنے پیروکاروں کو حکم دیا تھا کہ وہ اسی پر عمل کریں اور اسی کے مطابق فیصلہ کریں جو وہ خود سمجھتے ہیں، اور اس نے اس ذاتی فہم کو علمی کتابوں اور علما کی تصریحات پر مقدم قرار دیا۔

"وكان ينتقص النبي صلى الله عليه وآله وسلم كثيراً بعبارات مختلفة ويزعم أن قصده المحافظة على التوحيد؛ فمنها أن يقول إنه طارش، وهو في لغة أهل المشرق بمعنى الشخص المرسل من قوم إلى آخرين، فمراده أنه صلى الله عليه وآله وسلم حامل كتب: أي غاية أمره أنه كالطارش الذي

يرسله الأمير أو غير في أمر لأناس ليبلغهم إياه ثم ينصرف ؛ ومنها أنه كان يقول : نظرت في قصة الحديبية فوجدت بها كذا وكذا ، إلى غير ذلك مما يشبه هذا حتى إن أتباعه كانوا يفعلون مثل ذلك أيضاً ويقولون مثل قوله بل أقبح مما يقول ويخبرونه بذلك فيظهر الرضا وربما أنهم قالوا اذلك بحضرته فيرضى به ، حتى أن بعض أتباعه كان يقول : عصاي هذه خير من محمد لأنها ينتفع بها في قتل الحية ونحوها ومحمد قد مات ولم يبق فيه نفع أصلاً وإنما هو طارش وقد مضى''۔(المرجع السابق، ص:، ۱۱۰، ۱۱۱)

ترجمہ: وہ (ابن عبدالوہاب) مختلف جملوں کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی بہت تنقیص کرتا اور یہ دعویٰ کرتا کہ اس کا مقصد توحید کی حفاظت کرنا ہے۔انھی جملوں میں سے ایک یہ تھا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو''طارش'' کہتا، اہلِ مشرق کی لغت میں اس کا معنی وہ شخص ہوتا ہے جسے ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف پیغام دے کر بھیجا جائے پس اس کی مراد یہ ہوتی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف مکتوب لانے والے ہیں؛ یعنی آپ کے معاملے کی آخری حد بس اتنی ہے جیسے کوئی قاصد ہو جسے کوئی امیر یا کوئی اور شخص لوگوں کی طرف کوئی پیغام پہنچانے کے لیے بھیجے، وہ پیغام پہنچائے اور چلا جائے!اور انھیں باتوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ کہتا: میں نے قصۂ حدیبیہ میں غور کیا تو اس میں مجھے فلاں فلاں کمزوریاں ملیں، اسی طرح کی دیگر باتیں جو اس سے ملتی جلتی تھیں۔ یہاں تک کہ اس کے پیروکار بھی بالکل ایسا ہی کیا کرتے تھے اور اس کے جیسے اقوال، بلکہ ان سے بھی زیادہ قبیح باتیں زبان پر لاتے تھے اور اسے ان باتوں کی خبر دیتے تو وہ اس پر رضامندی کا اظہار کرتا، اور بسا اوقات وہ اس کی مجلس میں یہ باتیں کہتے اور وہ اس پر خوش ہوتا یہاں تک کہ اس کے بعض پیروکار تو یہ تک کہہ دیتے تھے کہ: میری یہ لاٹھی محمد سے بہتر ہے، کیوں کہ اس سے سانپ وغیرہ مارنے کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، جبکہ محمد تو فوت ہو چکے ہیں اور اب ان میں کوئی نفع باقی نہیں رہا، وہ تو بس ایک قاصد تھے جو گزر گئے۔(معاذ اللہ! صد بار معاذ اللہ!)

یہ بعض ہفوات نجدیوں وہابیوں کی ذکر کر دیں مزید تفصیل کا یہ مقام نہیں اجمالا اتنا سمجھ لیجیے کہ یہ نجدی وہابی جن لوگوں کو کافر و مشرک، ملحد و بے دین کہتے ہیں ان کی فہرست یہ ہے:

(۱) یہ ہر اس شخص کو کافر و مشرک کہتے ہیں جو انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیا اللہ کو خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ بنانے کو جائز سمجھتا ہو۔

(۲) جو نبی وغیرہ کو اپنا ولی جانے وہ اور ابو جہل شرک میں برابر ہیں۔

(۳) جس کا یہ عقیدہ ہو کہ وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے استغاثہ کرتا ہے تو انہیں خبر ہو جاتی ہے تو وہ مشرک ہے۔

(۴) انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیا اللہ کی مزاروں کے پاس سیدھے کھڑے ہونے والا مشرک ہے۔

(۵) ان کے مزارت پر حاضری کے ارادہ سے سفر کرنے والا مشرک ہے۔

(۶) مزارات کے لیے مال خرچ کرنے والا مشرک ہے۔

(۷) مزارات کو بوسہ دینے والا مشرک ہے۔

(۸) مزارات سے رخصت ہوتے وقت الٹے پاؤں چلنے والا مشرک ہے۔

(۹) مزارات پر شامیانہ نصب کرنے والا، ان پر پردہ لٹکانے والا، مزارات کو کپڑے سے چھپانے والا مشرک ہے۔

(۱۰) مزارات کا مجاور بننے والا مشرک ہے۔

(۱۱) مزارات پر دعا کرنے والا مشرک ہے۔

(۱۲) مزارات کے اطراف کی تعظیم کرنے والا، غیر اللہ کے ذکر کو قربت و عبادت سمجھنے والا مشرک ہے۔

(۱۳) مصیبت کے وقت غیر اللہ کو یاد کرنے والا مشرک ہے۔

(۱۴) یا محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)، یا عبد القادر، یا حداد، یا سمناں کہہ کر پکارنے والا مشرک ہے۔

(۱۵) غیر اللہ کی قسم کھانے والا مشرک ہے۔

(۱۶) عبد النبی، عبد الرسول نام رکھنے والا مشرک ہے۔

(۱۷) غیر اللہ کی نذر ماننے والا، غیر اللہ کے نام صدقہ کرنے والا مشرک و کافر ہے۔ جس نے یہ کہا کہ یہ نذر اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے یا یہ صدقہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ہے وہ کافر و مشرک ہو گیا۔

(۱۸) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت کو طلب کرنے والا مشرک ہے۔

(۱۹) جس نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو وسیلہ بنایا، یا مدد کے لیے پکارا وہ مشرک ہو گیا۔

(۲۰) (معاذ اللہ) رسول اپنی حیات میں اپنے خاتمے کا حال بھی نہیں جانتے تھے تو بعد وفات ان مشرکین کا حال کیسے جانیں گے۔

(۲۱) جس نے یہ عقیدہ رکھا کہ مخلوق کو عالم میں تصرف حاصل ہے یا اس کو اپنا سفارشی جانے وہ مشرک ہے، اگرچہ اسے اللہ سے کم تر اور اللہ کا مخلوق ہی مانے۔

(۲۲) تعظیم کے لیے کھڑے ہونا، کسی کو پکارنا کسی کے نام کا ورد کرنا شرک ہے۔

(۲۳) حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر، اُن کے غزوات کے مقامات، اُن کے آثار کی مسجدوں اور کسی نبی یا ولی کی قبر اور تمام بتوں کی طرف سفر کرنا، یوں ہی حضرت محمد مصطفی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر کا طواف کرنا، اُس کے حرم کی تعظیم کرنا، وہاں شکار نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا وغیرہ شرک اکبر ہیں۔

مذکورہ تفصیلات سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا کہ نجدیوں، وہابیوں نے "سنیوں بریلویوں" کو الگ فرقہ یا کافر و مشرک اس وجہ سے نہیں کہا کہ یہ اپنے آپ کو "بریلوی" کہتے ہیں یا "بریلویوں" نے دین و مذہب سے الگ کوئی نئی چیز ایجاد کر لی ہے بلکہ وہ ان کو کافر و مشرک اور جدید ملت اس وجہ سے کہتے ہیں کیوں کہ وہ نجدیوں وہابیوں کے عقیدے پر نہیں ہیں اور وہابیوں اور نجدیوں کے عقیدے پر جو نہ ہو وہ ان کے نزدیک کافر و مشرک اور گمراہ و ملحد و بے دین ہے، علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی [م ۷۹۱ھ]، سید السند علامہ میر سید شریف جرجانی [م ۸۱۶ھ]، حضرت سیدی حسین بن منصور حلاج [م ۳۰۹ھ]، صاحب مثنوی مولوی معنوی، مولائے روم مولانا جلال الدین رومی [م ۶۷۲ھ]، حضرت شیخ صدر الدین محمد بن اسحق قونوی [م ۶۷۲ھ]، امام ابو عبد اللہ شریف تلمسانی [م ۷۷۲ھ]، خواجہ بہاء الدین نقشبند بخاری [م ۷۹۱ھ]، نور الدین علامہ عبد الرحمٰن جامی [م ۸۹۸ھ]، ابو المواہب عارف باللہ امام عبد الوہاب الشعرانی [م ۹۷۳ھ]، سیدی عارف باللہ علامہ عبد الغنی نابلسی [م ۱۱۴۳ھ] وغیرہ اولیائے کرام و علمائے عظام رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم کو ان نجدیوں، وہابیوں نے ملحد و زندیق، حلول و اتحاد کا معتقد اور قبر پرستی کا علم بردار صرف اس وجہ سے قرار دیا ہے کیوں ان حضرات کے عقائد و نظریات ان نجدیوں، وہابیوں کے عقائد باطلہ و فاسدہ کے خلاف ہیں۔

علمائے مکہ معظّمہ کے سردار بقیۃ السلف عمدۃ الابرار خاتمۃ المحققین شیخ الاسلام والمسلمین علامہ سید شریف احمد زینی دحلان شافعی مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ [م ۱۳۰۳ھ]، علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ [م ۱۳۵۰ھ] علامہ زاہد الکوثری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ [م ۱۳۷۱ھ] علامہ شیخ سید محمد بن علوی مالکی حسینی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ [م ۱۴۲۵ھ] وغیرہ کو دجال و کذاب، قبر کی پرستش کرنے والے، شیطان، سرکش، ملحد و مفتری اور گمراہ و کافر، مشرک اور بدعتی و بے دین وغیرہ کہہ کر ان کا ردو ابطال کرتے ہیں۔

مذکورہ علمائے کرام نے خود کو کب "بریلوی" کہا لیکن نجدیوں، وہابیوں نے کیا ان کی طرف کفر و شرک اور بے دین ہونے کے وہ تمام الزامات نہیں لگائے جو وہ عموماً "سنی بریلوی" مسلمانوں پر لگاتے ہیں۔ کیا ان کی برائی پر مشتمل کتابیں نہیں لکھی گئیں، کیا ان کو دین و مذہب کے خلاف، اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے آل و اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا دشمن نہیں بتایا گیا؟ ان کو اور ان کے متبعین کو پوری امت سے الگ راہ اختیار کرنے والا نہیں کہا۔

بات وہی ہے کہ سنیوں کو دجال و کذاب، قبر کی پرستش کرنے والا، شیطان، سرکش، ملحد و مفتری اور گمراہ و کافر، مشرک اور بے دین

وغیرہ کہنا صرف اسی وجہ سے ہے کہ اہل سنت و جماعت نجدیوں، وہابیوں کے باطل عقائد ونظریات کے خلاف ہیں، جن علما و مشائخ کرام کے عقائد ونظریات نجدیوں، وہابیوں کے خلاف تھے یا جنھوں نے ان کے عقائد باطلہ و فاسدہ کا ردّ وابطال فرمایا تو ان وہابیوں، نجدیوں نے ان تمام علما واساطین امت کو کذاب، شیطان، سرکش، ملحد ومفتری اور گمراہ وکافر قرار دیا ہے، جس کو تفصیل دیکھنی ہو وہ مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ کرے:

(۱)صيانة الانسان عن وسوسة الشيخ دحلان (۲)كشف غياهب الظلام عن أوهام جلاء الأوهام وبراءة الشيخ محمد بن عبد الوهاب عن مفتريات هذا الملحد الكذاب (۳)تأييد الملك المنان في نقض ضلالات دحلان (۴)كتاب مصباح الظلام في الرد على من كذب الشيخ الإمام ونسبه إلى تكفير أهل الإيمان والإسلام (۵)الآية الكبرى على ضلال النبهاني رائيته الصغرى (۶)غاية الأماني في الرد على النبهاني (۷)بيان تلبيس المفتري محمد زاهد الكوثري (۸)التنكيل بما في تأنيب الكوثري من الأباطيل (۹)براءة أهل السنة من الوقيعة في علماء الأمة (۱۰)جهود علماء الحنفية في إبطال عقائد القبورية

اس سے معلوم ہوا کہ باطل فرقے تو اہل حق کو باطل اور خود کو اہل حق کہہ کر خود کو حق ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہی ہیں لیکن ان کی اس ذلیل حرکت سے گھبرا کر اہل حق اپنا نام اور پہچان نہیں چھپاتے۔ پوری دنیا میں "سلسلۂ عالیہ قادریہ" سے منسلک افراد خود کو "قادری"، "سلسلۂ چشتیہ" سے منسلک افراد "چشتی"، "سہروردیہ" سلسلہ سے منسلک افراد "سہروردی"، "نقشبندیہ" سے منسلک افراد "نقشبندی"، "رفاعیہ" سلسلہ سے منسلک "رفاعی"، "شاذلیہ" فرقے سے منسلک "شاذلی"، "مجددیہ" سے منسلک "مجددی" اور "بدویہ" سلسلہ سے منسلک "بدوی" کہتے ہیں۔ جب کہ نجدیوں، وہابیوں کا کہنا ہے:

"قادریہ، رفاعیہ، شاذلیہ، چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، مجددیہ، بدویہ" یہ قبوری فرقے شرکیہ عقائد رکھتے ہیں یہ غالی قسم کے قبر کی پرستش کرنے والے، حلول واتحاد کے قائل صوفیوں کے سلاسل ہیں"۔

اہل باطل اگر اہل حق کو کافر ومشرک یا بدعتی کہیں تو ان سے مرعوب ہو کر اپنا نام وعلامت اور نسبت وشناخت کو نہیں ختم کر دیا جائے گا اگر ایسا ہو جائے تو اہل حق کو صرف "بریلوی" ہی نہیں بلکہ سنی، حنفی، قادری، چشتی، نقشبندی، سہروردی، مجددی اور شاذلی وغیرہ جتنی بھی نسبتیں ہیں، اہل حق کی علامتیں ان تمام سے سبک دوش ہونا پڑے گا۔

اہل حق کو باطل کے پروپیگنڈہ کو بے نقاب کرنا چاہیے خود چھپنے کی راہ نہیں اختیار کرنا چاہیے، اسی طرح اگر کسی علاقے، ملک یا شہر میں نجدیوں، وہابیوں اور دیوبندیوں نے "سنیوں بریلویوں" کا غلط تعارف کروا کر ان کی جانب جھوٹی باتوں کو منسوب کر کے اہل سنت وجماعت میں ان کی غلط شبیہ بنادی ہو تو حتی المقدور ان کی اس جھوٹی مہم کا پردہ فاش کر کے ان کے عقائد فاسدہ و باطلہ کو ظاہر کر کے اپنی حقانیت ثابت کرنا ضروری ہے یہ تسلیم کر لینا کہ "سنی بریلوی" معاذ اللہ گمراہ بے دین ہیں درست نہیں ہے۔

برصغیر کے علاوہ دیگر ممالک میں جہاں کے بھی سنی مسلمانوں سے "بریلوی" یا "بریلویت" یا "بریلویۃ" کا تعارف کسی نئے دین و مذہب یا نئے فرقہ سے کرایا گیا ہے تو وہاں کیا کرنا چاہیے اس کو سمجھنے کے لیے حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ کے ۲۰۰۹ء کے دورۂ مصر کی اس روداد کے چند اقتباس نقل کیے جاتے ہیں جس روداد کو مولانا امام الدین رضوی ازہری نے تحریر فرمایا ہے۔

دورۂ مصر میں حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ نے کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

" آج ہمارے جد امجد شیخ الاسلام والمسلمین امام الہمام امام احمد رضا خان رضی اللہ عنہ کے بارے میں کچھ مفسد عناصر نے اپنے عقائد فاسدہ پر پردہ ڈالنے کے لئے غلط عقیدوں کو ان کی طرف منسوب کر دیا ہے جس سے ہمارے جد امجد اور ان کی نسلیں بری ہیں اور ہمارے عقائد وہی ہیں جو عہد صحابہ سے لے کر آج تک سینہ بسینہ چلے آرہے ہیں اور ہم مذہباً حنفی، مسلکاً سنی، مشرباً قادری، اور بلداً بریلوی ہیں۔ آج وہابیوں اور دیوبندیوں نے یہ مشہور کر دیا ہے کہ امام

احمد رضا ”فرقہ بریلویہ“ کے بانی ہیں میں کہتا ہوں ”بریلویہ“ کوئی فرقہ نہیں ہے نہ امام احمد رضا اس کے بانی ہیں یہ ایک جھوٹ اور غلط الزام و بہتان ہے جو ہمارے اوپر عائد ہے ہم اس سے کلیتاً بری ہیں۔ **ہاں! جس طرح عرب دنیا میں اہلسنت و جماعت اپنے آپ کو صوفی سے متعارف کراتے ہیں اسی طرح ہندوستان میں اہل سنت و جماعت کو ”بریلوی“ کہا جاتا ہے**۔(پیغام رضا، ممبئی، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰ء، ص:۲۸۶، ۲۸۷، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار)

اسی میں ہے:

”اہل سنت و جماعت کو ہندوستان میں ”بریلویہ“ سے پہچانا جاتا ہے جیسا صوفیہ بلاد عرب میں اہل سنت و جماعت کا دوسرا نام ہے“۔(پیغام رضا، ممبئی، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰ء، ص: ۲۸۷، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار))

اسی میں ہے:

”بریلویہ کا لقب ہمارے اغیار و اعدا نے اس شرط کے ساتھ دیا ہے کہ یہ محب رسول کی جماعت ہے اور جواب اہل سنت و جماعت کی نشانی ہے“۔(پیغام رضا، ممبئی، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰ء، ص: ۲۸۷، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار)

اسی میں ہے:

”اسی شام تاج الشریعہ جبل مقطم پر عاشق امام احمد رضا ڈاکٹر محمد خالد ثابت کے دولت کدہ پہ تشریف لے گئے یہ وہی محترم موصوف ہیں جن کی دعوت پر حضرت کا یہ دورہ ہوا ہے۔ موصوف اپنے یہاں محفل میلاد منعقد کئے تھے یہاں بھی سامعین کی اچھی خاصی تعداد تھی آپ نے حضور ازہری صاحب سے عرض کیا کہ سیدی اپنا کوئی قصیدہ اپنی رس بھری آواز میں سنائیں تو حضرت نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور اپنا عزیز ترین قصیدہ ”اللہ اللہ اللہ مالی رب الا ھو“ کو گنگنایا اور تمام سامعین حضرت کے ساتھ اس قصیدہ کو گنگنا رہے تھے۔ پھر اس کے بعد وہاں پہ ایک بہت بڑے صوفی عالم دین اور فن طب کے ماہر ڈاکٹر یسری صاحب تشریف فرماتھے۔ موصوف آج بھی ازہر شریف کی جامع مسجد میں درس بخاری دیتے ہیں جس میں کئی ممالک کے طلبہ شریک ہوتے ہیں۔ آپ کا نظریہ امام احمد رضا کے متعلق صاف نہیں تھا۔ کیونکہ جب ہمارے احباب نے حضرت علامہ محمد احمد مصباحی صاحب کی کتاب ”حدوث الفتن و جهاد اعیان السنن“ کی طباعت شیخ محمد خالد ثابت کے مکتبہ سے کرائی تو موصوف نے شیخ خالد سے کہا کہ آپ نے اس کتاب کو اپنے مکتبہ سے کیوں شائع کیا ہے اس میں تو امام احمد رضا بریلوی کا تذکرہ ہے جو مسلمانوں کی عام تکفیر کرتے ہیں تو شیخ نے کہا کہ ہماری نگاہ سے تو ایسی عبارت نہیں گذری ہے تب موصوف نے کہا کہ میں نے ایک کتاب بنام البریلویہ تاریخ وعقائد میں پڑھی ہے تو شیخ نے کہا کہ یہ ایک وہابی کی کتاب ہے اور آپ وہابیوں کے دسائس سے بخوبی واقف ہیں کہ انہوں نے شیخ الاسلام علامہ زینی دحلان اور علامہ یوسف نبہانی علیہم الرحمۃ والرضوان کے بارے میں کیا کچھ نہیں لکھا ہے، اس کے بعد موصوف خاموش ہو گئے تب شیخ خالد نے کہا کہ کسی قسم کا اگر کوئی تردد ہو تو آپ بلا جھجک پوچھ سکتے ہیں۔ میں اپنے مطالعہ کی روشنی میں آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔ راقم اپنے دوست کے ساتھ شیخ خالد کی زیارت کے لئے گیا تو انہوں نے یہ ساری باتیں بتلائیں کہ اس طرح کا حادثہ ہوا ہے پھر آپ نے پوری کہانی سنا دی تو ہم نے ان سے عرض کیا کہ آپ ضرور ان سے خاص طور پر ملاقات کر کے ان کے نظریات کو صاف کریں اس کے لئے ہم سے جس طرح کی بھی مدد کی ضرورت ہوگی تو ہمیں حاضر پائیں گے، اسی اثنا میں حضرت کا دورہ بھی ہوا تو ڈاکٹر موصوف کو خاص طور سے کانفرنس میں مدعو کیا گیا تھا لیکن موصوف عدم فرصت کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکے تب میں نے شیخ خالد سے عرض کیا کہ ڈاکٹر یسری صاحب کو اپنے دولت کدہ پر پروگرام میں ضرور مدعو کریں تو انہوں نے لگے ہاتھ فون کر کے موصوف کو دعوت دی اور وہ ان کے دولت کدہ پر حاضر ہو گئے۔ لیکن جب موصوف نے حضرت کے پر رونق جلوۂ زیبا کو دیکھا تو حیران ہو گئے اور کلی طریقے سے مرعوب نظر آنے لگے اور بہت ہی عاجزی کے ساتھ چند سوالات اس شرط کے ساتھ کیے کہ یا سیدی آپ کا مذہب بھی طیب ہے اور مشرب بھی طیب ہے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی جاہل کلمہ کفر کہے تو کیا وہ کافر ہو گا یا نہیں کیونکہ آپ کے جد امجد امام احمد رضا خان اس کی تکفیر کرتے ہیں۔ تب تاج الشریعہ نے کہا کہ نبی پاک

صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت عام ہوگئی ہے اور جہالت کوئی عذر نہیں ہے لہذا اگر کوئی کلمہ کفر بکے اور اس پر مصر رہے تو وہ کافر ہے جیسا کہ فقہائے حنفیہ کا کہنا ہے پھر آپ نے برجستہ در المختار ورد المحتار کی عبارتیں پیش کیں۔

(راقم الحروف نے جب ان عبارتوں کی تحقیق کی تو من وعن پایا جیسا آپ نے بیان کیا تھا۔ یہ حضرت کی اپنی انفرادیت ہے، فقہ حنفی کے مسائل میں) حضرت کی اس حاضر دماغی پر ڈاکٹر موصوف ششدر رہ گئے اور بول پڑے کہ اگر اصرار کرتا ہے تو یقیناً کافر ہے، تب حضرت نے کہا کہ وہابیہ دیابنہ اسی اصرار کی وجہ سے کافر ہیں۔ان ساری گفتگو کے بعد ڈاکٹر موصوف نے عرض کیا کہ آپ ہمیں دلائل الخیرات شریف کی اجازت عنایت فرمائیں تو حضرت نے فرمایا کہ اجازت ہے اس کے بعد عرض کیا کہ داخل سلسلہ فرمالیں تو حضرت نے داخل سلسلہ کیا۔کسی صاحب نے کہا کہ کہئے کہ وہ ٹائی اتار لیں ٹائی ہمارے نزدیک پہننا حرام ہے(یہ جرأت و بے باکی حضرت کا ہی حصہ ہے جو انہوں نے اپنے اسلاف کرام سے پائی ہے) پھر آپ نے داخل سلسلہ فرمایا اور طریقہ قادریہ کی اجازت بھی عطا فرمائی۔اس طرح اختتام محفل پر حضرت نے اپنا عمامہ شریف جو اپنی قیام گاہ ہی سے لے کر آئے تھے اس کو شیخ محمد خالد ثابت کے سر پر سجایا اور دعائیں کیں کہ اللہ عزوجل مزید آپ کو ہمارے جد امجد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا پر کام کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے اور آپ کی عمر دراز فرمائے۔پھر آپ نے شیخ کو بریلی شریف آنے کی دعوت دی''۔(پیغام رضا، ممبئی، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰ء، ص: ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار))

ڈاکٹر عبد القادر رضا ہیڈ ڈپارٹمنٹ آف اردو لینگویج، عین الشمس یونیورسٹی، قاہرہ نے حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ کے ۲۰۰۹ء کے دورۂ مصر کے وقت جامع ازہر مصر کے بڑے ہالوں میں سے ایک ہال'' قاعۃ مرکز صالح کامل'' میں سیکڑوں دکاترہ، علما وطلبہ کے درمیان اعلیٰ حضرت امام اہل سنت شاہ امام احمد رضا خان قادری قدس سرہ اور ان کے نائب و جانشین حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ کا علمی و تصنیفی تعارف کرتے ہوئے حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ کے روبرو یوں کہا:

''لفظ ''بریلوی'' ہندوستان میں اسی مسلک کے معنی میں متعارف ہے جو ہمارے مصر میں ''صوفی'' کے نام سے موسوم ہے اور جس مذہب پر ہم یہاں عمل پیرا ہیں وہ وہی مذہب ہے جو ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں مسلک اعلیٰ حضرت کے نام سے مشہور ہے۔لیکن افسوس کی بات ہے کہ چند متعصب بدعقیدوں نے اس صاف شفاف جماعت کو بدنام کرنے کی پوری کوشش کی۔بعد میں حضور ازہری میاں نے بھی عبد القادر رضا صاحب کی باتوں کی تائید فرمائی''۔(پیغام رضا، ممبئی، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰ء، ص: ۲۹۷، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار)

مذکورہ روداد کو پڑھیے اور سمجھیے کہ یہاں ''بریلوی'' اور ''بریلویت'' کے متعلق حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ جو وضاحت فرمائی یہ اس سے الگ ہے جو آپ نے مکہ معظمہ میں سی آئی ڈی سے جواب میں فرمایا تھا:

ہم پر کچھ لوگ یہ تہمت لگاتے ہیں اور آپ کو یہ بتایا ہے کہ ہم اور قادیانی ایک ہیں۔ یہ غلط ہے، اور وہی لوگ ہمیں ''بریلوی'' کہتے ہیں، جس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ ''بریلوی'' کسی نئے مذہب کا نام ہے ایسا نہیں ہے، بلکہ ہم اہل سنت وجماعت ہیں۔

ہمیں اس مقصد سے بریلوی کہنا کہ ہم کسی نئے مذہب کے پیرو ہیں ہم پر بہتان ہے۔

میں بار بار یہ کہہ چکا ہوں کہ ''بریلوی'' کوئی مذہب نہیں ہے، اور اگر کوئی نیا مذہب بنام بریلوی ہے تو میں اس سے بری ہوں۔

دونوں میں فرق یہی ہے کہ وہاں نجدیوں، وہابیوں کی طرف سے سوال تھا جو بریلویت بلکہ سنیت ہی کو نیا مذہب سمجھتے ہیں تو ان کو یہ جواب دیا گیا:

'' ہم اپنے آپ کو اہل سنت و جماعت کہلوانا ہی پسند کرتے ہیں، اور ہمیں اس مقصد سے بریلوی کہنا کہ ہم کسی نئے مذہب کے پیرو ہیں ہم پر بہتان ہے۔سی آئی۔ڈی کے پوچھنے پر میں نے وہابی اور سنی کا فرق مختصر طور پر واضح کیا، میں نے کہا کہ وہابی حضور علیہ الصلوۃ

والسلام کے علم غیب، اور ان کی شفاعت، اور ان سے توسل، اور استمداد اور انہیں پکارنے کے منکر ہیں، اور ان امور کو وہ شرک بتاتے ہیں۔ جب کہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ حضور سے توسل جائز ہے، اور انہیں پکارنا بھی، اور یہ کہ وہ سنتے بھی ہیں، اور اللہ کے بتائے سے غیب جانتے ہیں، اور اللہ نے ان کو شفاعت کا منصب عطا فرمایا ہے۔ اور علم غیب پرسی آئی۔ ڈی کے پوچھنے پر آیات قرآن سے میں نے دلیلیں قائم کیں، اور یہ ثابت کیا کہ نبوت اطلاع علی الغیب ہی کا نام ہے۔ اور نبی وہی ہے جو اللہ کے بتانے سے غیب کی خبر دے، اور یہ کہ نبی کے واسطے سے ہر مومن غیب جانتا ہے، جیسا کہ قرآن میں منصوص ہے"۔

معلوم ہوا کہ حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ نے اس مقصد سے بریلوی کہنے کو منع فرمایا کہ "بریلوی کسی نئے مذہب کے پیرو ہیں" اور اس کو ثابت فرمایا کہ "بریلوی" برصغیر میں سنی صحیح العقیدہ مسلمانوں کی ایسے ہی پہچان ہے جیسے عالم عرب میں "صوفی" سنی صحیح العقیدہ مسلمانوں کی پہچان ہے۔ نجدیوں وہابیوں کے یہاں صوفی بھی کافر ومشرک ہیں جس طرح عرب میں صوفی ہونا سنیت کی علامت ہے اسی طرح برصغیر میں "بریلوی" سنی صحیح العقیدہ ہونے کی علامت ہے۔ اپنے تو اپنے مخالفین بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جو قدیم بزرگوں کے طریقہ پر ہیں وہ "بریلوی" ہی ہیں ملاحظہ کیجیے غیر مقلد مولوی ثناء اللہ امرت سری نے لکھا:

"امرتسر میں مسلم آبادی غیر مسلم آبادی (ہندو سکھ وغیرہ) کے مساوی ہے، اسی (۸۰) سال پہلے قریبا سب مسلمان اسی خیال کے تھے جن کو آج کل بریلوی حنفی کہتے ہیں"۔ (شمع توحید، ص: ۵۳، مکتبہ عزیزیہ جامع مسجد، لاہور،)

مولوی ثناء اللہ امرت سری کی یہ رائے ۱۹۳۷ء کی ہے اس سے پیچھے تقریبا ۹۰ رسال قبل سنی حنفی بریلوی مسلمانوں کے عقائد و اعمال کا اعتراف "حنفی بریلوی" کے نام سے ایک جماعتی مخالف کر رہا ہے کہ "بریلوی" کسی خود ساختہ فکر وعمل کا نام نہیں ہے بلکہ عہد گذشتہ کے سنی مسلمانوں کی امانت ہے۔

حاصل کلام یہ کہ برصغیر کے اکابر علمائے کرام اس بات پر متفق ہیں کہ "مسلک اعلیٰ حضرت" اور "بریلوی" دیوبندیوں، وہابیوں، نجدیوں اور تمام قسم کے بدعقیدوں کے مقابلہ میں امتیازی شناخت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستانی حکومت نے مدارس و مساجد اور فلاحی اداروں کو شیعہ سنی میں تقسیم کیا اور سنی مساجد و مدارس اور اداروں کو دیوبندی اور بریلوی دو خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔

پڑوسی ملک میں تو تقریبا اسی یا نوے سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے کہ وہاں بریلوی اور دیوبندی لفظ کو قانونی و دستوری حیثیت حاصل ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک میں دیوبندیوں کے مقابل "بریلوی" اہل سنت و جماعت کے لیے شناخت اور علامت کی حیثیت رکھتا ہے مغربی مسلمان کہلانے والے ہی نہیں بلکہ وہاں کے دیگر روشن خیال سمجھے جانے والے لوگ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ "بریلوی" وہ ہیں جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سچی عقیدت رکھتے ہوں، انبیائے کرام علیہم السلام کے معجزات اور اولیائے کرام کی کرامات کے قائل، شفاعت و توسل کے جواز پر ایمان رکھتے ہوں، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری کے مسلک پر ہوں وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ برطانیہ کے مشہور اسکالر اور مذہبی امور کے ماہر کہے جانے والے پروفیسر رون گیوز (Ron Geaves) اور تھیوڈر گیبریل (Theodore Gabriel) دونوں کی مشترکہ لکھی ہوئی کتاب صوفی ازم اِن برٹین (Sufism in Britain) میں ہے:

"The Barelvi stream owes its name to the ulama who follow the school associated with Ahmad Raza Khan Barelvi (1854-1921).Barelvis call themselves ahl-i sunnat wa'l jama`at in South Asia. The Barelvi ulama profess belief in miracles and the intercessionary powers of saints and the dispensing of amulets and charms." (Sufism in Britain, Page No.:217,Bloomsbury, London, England)

بریلوی مکتبِ فکر کا نام ان علما کی نسبت سے مشہور ہوا جو عقائد ونظریات میں امام احمد رضا خان بریلوی (1854ء-1921ء) کے طریقے اور ان کے مسلک پر ہیں۔ برصغیر میں اس مکتب کے علما اپنے آپ کو اہلِ سنت و جماعت کہتے ہیں۔ بریلوی علما انبیائے کرام کے معجزات اور اولیائے کرام کی کرامات کے قائل، ان کی شفاعت وتوسل کے جواز پر ایمان رکھتے ہیں، نیز تعویذات اور وظائف کے استعمال کو بھی جائز سمجھتے ہیں۔

کینتھ ڈبلیو جونز (KENNETH W JONES) کی کتاب دی نیو کیمبرج ہسٹری آف انڈیا (THE NEW CAMBRIDGE HISTORY OF INDIA) کیمبرج یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی اس میں "بریلوی" کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

"The Barelwi Ulama in defence of Islamic orthodoxy.

At a polar opposite to the acculturative movement of Sayyid Ahmad Khan and the transitional movements that advocated degrees of change in Islam stood the Barelwi 'Ulama, who defended contemporary religion from criticism within and beyond the community. This group was led by Ahmad Riza Khan (1856-1921) ,an effective exponent and apologist for Islamic customary practice." (THE NEW CAMBRIDGE HISTORY OF INDIA, III, page no.:70, Cambridge university press)

اسلامی عقائد کے دفاع میں علمائے بریلی

سید احمد خان کی (مغربی تہذیب کو) اپنانے والی تحریک اور ان عبوری تحریکوں کے بالکل برعکس جو اسلام کو کسی نہ کسی حد تک بدلنے کی وکالت کر رہی تھیں، علمائے بریلی کی جماعت ان کے خلاف کھڑی تھی، جس نے مسلم معاشرے کے اندر اور باہر سے ہونے والی تنقید کے مقابلے میں رائج الوقت روایتی دین کا دفاع کیا۔ اس گروہ کی قیادت احمد رضا خان (1856-1921) کر رہے تھے، جو اسلامی رواج ومعمولات کے ایک باا ثر شارح (وضاحت کرنے والے) اور پرجوش وکیل تھے۔

اسی میں ہے:

"Ahmad Riza Khan placed at the centre of his teachings the figure of the Prophet who possessed total knowledge of spiritual truth and for whom Ahmad Riza had the greatest respect. He could brook no criticism of Muhammad, celebrated the Prophet's birthday, and saw him as unique among all men. He also gave his respect and public deference to all sayyids since they were descendants of the Prophet. In his conception of Islam, saints, retained a bodily existence after death. They could thus both hear prayers and grant requests from the grave. This position led him to accept the celebration of'urs, revere saints, tombs, and the rituals associated with these powerful figures. The Prophet, saints, pirs, and shaikhs could all act on behalf of Muslims who sought their assistance. In addition Ahmad Riza accepted as valid, customs and parochial cults as long as they were not in contradiction to established sections of hadith ." (THE NEW CAMBRIDGE HISTORY OF INDIA, III, page no.:71, Cambridge university press)

احمد رضا خان نے اپنی تعلیمات کا محور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو رکھا، جو روحانی حقیقت کا مکمل علم رکھتے تھے

اور جن کے لیے احمد رضا کے دل میں بے پناہ عقیدت و احترام تھا۔ وہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات پر کوئی تنقید برداشت نہیں کر سکتے تھے، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا یومِ ولادت (جشنِ عید میلادالنبی) منایا اور انہیں تمام انسانوں میں یکتا و بے مثال جانا۔ وہ تمام سادات کا بھی احترام کرتے تھے اور عوامی سطح پر ان کی تعظیم کرتے تھے کیوں کہ سادات نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اولاد ہیں۔ اسلام کے بارے میں ان کے تصور کے مطابق، اولیا اللہ وفات کے بعد بھی جسمانی حیات برقرار رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ قبر سے دعائیں سن بھی سکتے ہیں اور التجاؤں کو پورا بھی کر سکتے ہیں۔ اسی موقف کی وجہ سے انہوں نے عرس منانے، اولیا کے مزارات کی تعظیم کرنے اور ان صاحبِ اقتدار و روحانیت ہستیوں سے وابستہ رسومات کو تسلیم کیا۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، اولیا، پیر اور شیوخ، ان تمام مسلمانوں کی طرف سے بارگاہِ الٰہی میں وسیلہ بن سکتے ہیں جو ان سے مدد کے طالب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ، احمد رضا نے مقامی رواجوں اور علاقائی روایتوں کو اس وقت تک درست مانا جب تک کہ وہ احادیث کے مسلمہ حصوں کے متصادم نہ ہوں۔

دی کولمبیا ورلڈ ڈکشنری آف اسلامزم (The Columbia World Dictionary of Islamism) میں ہے:

"The first of these is the Barelvi movement. This has its roots in India, but is today very much linked with Pakistan. Its name derives from that of its founder, Ahmad Riza Khan of Bareilly. Barelvi Islam has directly descended from the original Islam of the Indian subcontinent in the nineteenth century, as distinct from the reformist con-struction of Deoband." (The Columbia World Dictionary of Islamism, Page no. 92, Columbia University Press, New York)

ان میں سے پہلی "بریلوی تحریک" ہے۔ اگرچہ اس کی جڑیں ہندوستان سے جڑی ہیں، لیکن آج کے دور میں اس کا گہرا تعلق پاکستان سے ہے۔ اس کا یہ نام اس کے بانی، بریلی کے مولانا احمد رضا خان کے نام پر رکھا گیا ہے۔ بریلوی اسلام براہِ راست انیسویں صدی کے برِصغیر پاک و ہند کے اصل اور روایتی اسلام کی ہی ایک کڑی ہے، جو دیوبند کی اصلاحی فکر سے بالکل الگ ہے۔

اسی میں ہے:

" Barelvis observe the cult of shrines and venerate saints, whom they believe are able to intercede on their behalf. They keep feast days and use music as part of their religious practice. Barelvis particularly venerate the Prophet Muham-mad as well as Ali, his son-in-law and cousin, though they are in no sense Shi'ites. They are often referred to as Sufi, because of their mystic practices." (The Columbia World Dictionary of Islamism, Page no. 92, Columbia University Press, New York)

"بریلوی مکتبِ فکر" کے لوگ مزارات پر جانے اور بزرگوں (اولیا اللہ) کی تعظیم و توقیر کرنے پر یقین رکھتے ہیں، اور ان کا ماننا ہے کہ یہ بزرگ ان کے حق میں اللہ کے ہاں سفارش (شفاعت) کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ عرس اور تہوار مناتے ہیں اور اپنی مذہبی تقریبات میں مخصوص انداز کی موسیقی (جیسے نعت و قوالی) کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ بریلوی حضرات خاص طور پر نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے داماد و چچا زاد بھائی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شدید محبت و عقیدت رکھتے ہیں، اگرچہ وہ کسی بھی لحاظ سے شیعہ نہیں ہیں۔ صوفیانہ اور روحانی طور طریقوں کی وجہ سے انہیں اکثر "صوفی" بھی کہا جاتا ہے۔

ماہر رضویات پروفیسر مسعود احمد نقشبندی لکھتے ہیں:

"کولمبیا یونیورسٹی، امریکہ کی فاضلہ خاتون ڈاکٹر اوشا سانیال

نے اپنے مقالہ ڈاکٹریٹ میں بھی اس مفروضہ کو غلط قرار دیا ہے کہ ''بریلوی'' کوئی فرقہ نہیں ۔ اُن کا موقف بھی یہی ہے کہ یہ وہی عالمی مسلک ہے جس کو سوادِ اعظم اہل سنت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مطالعہ و تحقیق سے پہلے موصوفہ یہی سمجھتی تھیں کہ بریلوی کوئی فرقہ ہے۔ جب اُن کو بتایا گیا اور انہوں نے خود مطالعہ کیا تو اُن پر حقیقت عیاں ہوگئی''۔ (آئینہ رضویات، حصہ:۲،ص:۳۰۱، ادارہ تحقیقات امام احمد رضا انٹرنیشنل، کراچی، ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء)

عالمی و آفاقی شخصیت حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ جن کی علمی، فقہی اور روحانی عظمت سے عالم عرب متعارف ہے۔آپ جب بھی حج یا عمرہ کے لیے حجازِ مقدس تشریف لے جاتے، تو جدہ، مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ میں عشاقِ مصطفیٰ آپ کی زیارت کے لیے امنڈ پڑتے۔ دیارِ ہند و پاک کی طرح عالمِ عرب میں بھی سچے سنیوں اور نجدیوں کے درمیان امتیاز کے لیے سنیوں کو''صوفی'' کہا جاتا ہے، اور وہاں کے سنیوں کے عقائد عین وہی ہیں جن کی تشریح اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدثِ بریلوی نے فرمائی ہے۔یہی وجہ ہے کہ عالمِ عرب میں مقیم ترکی، یمن، قطر، عراق، کویت، شام اور فلسطین کے باشندے جہاں مختلف صوفی سلاسل مثلاً سلسلہ رفاعیہ، نقشبندیہ، قادریہ شاذلیہ سے وابستہ ہیں، وہیں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، دمام، جدہ، ابہا اور ریاض میں ایک بڑی تعداد حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوکر''سلسلۂ قادریہ رضویہ'' میں شامل ہے۔ یہ حضرات آپ کو ''الشیخ الأزھری الھندی'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔یہ حضرات محفل میلاد شریف منعقد کرتے ہیں، قصیدہ غوثیہ قصیدہ بردہ شریف اور قصیدہ معراجیہ پڑھتے ہیں پاکستانیوں کے ساتھ کعبہ کے بدرالدجیٰ، مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام بھی پڑھتے ہیں۔

حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ کے ''ہندو بیرون ہند میں کروڑوں کی تعداد میں مریدین ومتوسلین، سیکڑوں کی تعداد میں خلفا ہزاروں کی تعداد میں تلامذہ ہیں جو براعظموں کے مختلف ممالک میں مسلک اعلیٰ حضرت کی ترویج و اشاعت میں مصروف عمل ہیں ۔آپ براعظم ایشیا، یورپ، امریکہ، افریقہ، آسٹریلیا، وغیرہا کے متعدد ممالک میں تبلیغی دورے فرماتے ہیں۔''(ماہ نامہ سنی دنیا، بریلی، شمارہ جنوری ۲۰۱۲ء،ص:۲۲)

حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ نے اپنے خلفا و تلامذہ، مریدین و معتقدین میں سے کسی کو بھی''بریلوی'' کہنے سے کبھی بھی اس لیے منع نہیں فرمایا کیوں کہ''بریلوی'' باطل فرقوں سے امتیاز کے لیے ایک واضح نشانی اور خط امتیاز ہے ورنہ حضور تاج الشریعہ علیہ الرحمہ عالمی منظر نامے کو زید سے بہتر سمجھتے تھے اگر''بریلوی'' کہنا مضر ہوتا تو آپ ضرور منع فرماتے۔واللہ تعالیٰ اعلم

(۷)جواب:اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ کے زمانے میں دین و اسلام اور قرآن وسنت کے نام پر شیعہ، وہابی، دیوبندی، نیچری اور قادیانی وغیرہ بہت سے باطل فرقے موجود تھے جو خود کو توحید پرست، قرآن وسنت کے متبع ہونے کو ظاہر کرنے میں لگے ہوئے تھے، اپنے عقائد باطلہ کو قرآن وحدیث سے ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے، معاذ اللہ خدائے تعالیٰ پر کذب کا افترا، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علم، اختیارات اور ان کی عزت وعظمت، شان وشوکت پر اعتراض اور ختم نبوت کے معنی کو بدلنے کی سعی لاحاصل کر رہے تھے۔ان میں بہت سے ایسے تھے جو خود کو حنفی، شافعی، حنبلی، قادری، نقشبندی اور چشتی وسہروردی وغیرہ بھی کہہ رہے تھے ایسے نام نہاد لوگوں کا ردّ وابطال، ان کی سرکوبی، عقائد حقہ کی حفاظت وصیانت، مراسم اہل سنت و جماعت کی تائید وتقویت، سنت کی نشر و اشاعت اور ردّ خرافات و اماتت بدعات میں جوحق گو علمائے کرام اپنا چین وسکون تج کر میدان میں تھے بلاشبہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ کی خدمات ان تمام میں نمایاں تھیں۔آپ نے ضلالت وگمراہی کے ان طوفانوں کی روک تھام کے لیے دلائل و براہین اور تحقیقات وتنقیحات پر مشتمل کتابوں کے ذریعہ سدّ سکندری تعمیر کر دی، اپنے عمل و کردار سے متعدد سنتوں کا احیا فرمایا مثلاً اقامت میں''حی علی الصلاۃ والفلاح'' پر کھڑے ہونا، جمعہ کی اذان ثانی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے طریقے کے مطابق خارج مسجد امام کے سامنے پڑھنا۔آپ کے غیر معمولی

وجود مسعود کی برکتوں سے بہت سے مستحبات کو شعار اہل سنت کا درجہ حاصل ہوا جیسے اذان میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نام پاک پر انگوٹھا چومنا، اذان کے بعد تثویب بصیغہ صلاۃ وسلام پکارنا، میلاد مبارک، فاتحہ وغیرہ۔ کثیر بدعات وممنوعات اور غیر شرعی رسم ورواج کی تردید فرمائی مثلاً محرم اور شادی بیاہ کی غیر شرعی رسومات، عورتوں کی مزارات پر حاضری، مزامیر کے ساتھ قوالی، نعت وتقاریر اور تراویح اور قرآن خوانی وغیرہ کی اجرت وغیرہ۔

جو ایمان وعقیدہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام وتابعین عظام کے توسل سے مسلمانوں کو ملا ان اعتقادی نظریات اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے عملی احکام اور سلف صالحین کی صالح فکر کے اثبات واظہار میں آپ نے تصانیف کی شکل میں امت مسلمہ کو عظیم سرمایہ عطا فرمایا، جس سے عقائد واحکام اور فکرِ صالح میں کتر بیونت، تغیر تبدل کرنے والوں کی ذلت ورسوائی ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ شہزادہ استاذ زمن حضرت علامہ حکیم حسنین رضا خاں قادری رحمہما اللہ تحریر فرماتے ہیں:

''اس وقت ہندوستان میں کوئی باطل فرقہ ایسا نہیں ہے جس کے رد میں ان کی (اعلیٰ حضرت) بکثرت تحریریں موجود نہ ہوں جب دین میں کوئی نیا فتنہ اٹھتا تو سب سے پہلے حضور کے زبان وقلم کو حرکت ہوتی اور کامل استیصال فرما کر چھوڑتے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ہر فتنہ انگیز کو فتنہ پھیلانے سے قبل یہ خیال مدتہا مدت تک باز رکھتا کہ اعلیٰ حضرت کی سیف زباں ونیزہ قلم کا کیا جواب ہوگا''۔ (وصایا شریف، ص:۶، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۴۱۶ھ/ ۱۹۹۶ء)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری قدس سرہ کی ان خدمات جلیلہ کے پیش نظر اس وقت کے جو جید علمائے کرام تھے انہوں نے آپ کو مجدد وقت کا خطاب دیا ان کے طریقے کو اہل سنت کا طریقہ قرار دیا، ان کے مؤید مسائل پر عمل پیرا ہوئے۔ دیوبندیوں، وہابیوں، نجدیوں اور تمام قسم کے باطل وگمراہ فرقوں سے امتیاز کے لیے اہل سنت وجماعت کے عوام وخواص میں ''مسلک اعلیٰ حضرت'' اور ''بریلوی'' رائج ہو گیا جس کو علما وعوام نے پسند بھی کیا، فقیہ ملت مفتی جلال الدین امجدی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

''مذہب حق اہل سنت وجماعت کو ظاہر کرنے کے لئے ایسے لفظ کا ہونا ضروری ہے جو تمام بد مذہبوں سے ممتاز کردے اسی لیے ضرورت کے لحاظ سے ہر زمانہ میں مذہب حق کو امتیاز کے لئے الگ الگ الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ جو اہل علم پر پوشیدہ نہیں مثلاً صحابہ وتابعین کے دور میں جب معتزلہ ظاہر ہوئے تو اس وقت کے تمام صحابہ وتابعین جن میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی وتابعی بھی تھے، سب نے مل کر معتزلہ کے باطل عقائد کا رد کیا، لیکن حضرت ابوالحسن اشعری علیہ الرحمۃ والرضوان اور ان کے اصحاب نے بڑی سختی سے رد کرتے ہوئے ان کے خلاف کتابیں تحریر کیں، جس کی وجہ سے اہل سنت کو معتزلہ سے ممتاز کرنے کے لئے اشعری کہا گیا۔

اسی طرح موجودہ دور میں بھی اولیائے کرام و دیگر علمائے عظام نے بدعقیدہ فرقوں کا رد کیا اور مذہب اہل سنت کی خدمات انجام دی ہیں، لیکن اعلیٰ حضرت مجدد اعظم امام احمد رضا محدث بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان نے بڑی سختی سے ان کا رد کیا اور ان کے باطل عقائد کے خلاف بے شمار کتابیں تصنیف فرما کر اولیائے کرام کے عقائد ونظریات کو عام کیا، اس لئے مذہب حق اہل سنت کو تمام باطل فرقوں، قادیانی، دیوبندی، وہابی اور مودودی وغیرہم سے ممتاز کرنے لئے ''مسلک اعلیٰ حضرت'' خاص وعام میں رائج ہوا، جسے عامۃ المسلمین نے پسند بھی کیا اور حدیث شریف میں ہے:

''ما رآہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن'' یعنی جس کو عامۃ المسلمین اچھا سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی اچھا ہے۔'' (فتاوی فقیہ ملت، ج:۲، ص:۴۲۹، فقیہ ملت اکیڈمی، اوجھا گنج بستی)

حضرت مفتی محمد امان الرب رضوی علیہ الرحمہ اپنے ایک مضمون کے اخیر میں تحریر فرماتے ہیں:

''اہلسنت وجماعت کا تعارف مسلک اعلیٰ حضرت یا بریلوی سے کرنا تقاضائے وقت کے عین مطابق ہے۔ جس طرح معتزلہ،

عناد یہ، لا ادر یہ فرق باطلہ نے اہلسنت و جماعت کے عقائد و افکار، شعار وضروریات میں بیجا حذف و اضافہ، کتر و بیونت اور تلبیس وفساد کا ایسا اودھم مچایا کہ اہلسنت کے اصل عقائد ونظریات بالکل گنجلک ہو گئے۔ گمراہیت و آزاد روی کی عام و باسی پھوٹ پڑی مگر" **ید اللہ علی الجماعۃ**" کا اعزاز اس طرح ظاہر ہوا کہ حضرت ابوالحسن اشعری و امام ابومنصور ماتریدی نے تائید غیبی و نصرت خداوندی سے عقائد اہلسنت کو روشن وواضح فرمایا، پھر جملہ مسلمانان اہلسنت کو اشعری کہتے یا ماتریدی، اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم اشعری یا ماتریدی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ جو اسلام کے عقائد ونظریات کے مددگار و امین ہیں۔ اس دور کے بد مذہب ان دونوں نسبتوں کے طفیل اپنی چالیں فیل ہوتے ہوئے دیکھا تو یہ پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیا کہ دین تو اسلام ہے یہ اشعری کیا ہے اور ماتریدی کیا ہے؟ اس کے جواب اس دور کے اجلۂ علمائے کرام نے وہی دیے ہیں جو آج کے متعصبین کو" مسلک اعلی حضرت" کہنے والے جواب دیتے ہیں"۔ (پیغام رضا، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰ء، ص: ۲۳، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار)

بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان اعظمی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

" پورے ہندوستان کے سنی مراکز نے بھی امام احمد رضا خان صاحب کی اس دینی خدمت کو محسوس کیا اور موجودہ گمراہوں سے اہل سنت و جماعت سے ممتاز کرنے کے لیے امام احمد رضا کی ذات کو سنیت کی علامت قرار دیا اور مسلک اہل سنت و جماعت کو ان سے منسوب کیا چنانچہ دستور اساسی " آل انڈیا سنی تبلیغی جماعت" ص: ۱۲/ پر ہے:

" سنی سے مراد وہ افراد ہیں جو مسلک سیدنا اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب بریلوی سے عقائد و اعمال میں بالکل متفق ہوں اور عملاً اس کی موافقت کرتے ہوں"۔

دستور اساسی دار العلوم اشرفیہ مبارک پور ص: ۵/ پر ہے:

" ادارے کا مسلک موجودہ زمانے میں جس کی واضح نشانی یہ ہے کہ جو اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب بریلوی سے اعمال وعقائد میں بالکل متفق ہوں"۔

ادارہ شرعیہ پٹنہ کے دستور العمل ص: ۸/ پر ہے:

" اس دستور میں جہاں سنی یا اہل سنت کا لفظ آئے اس سے وہ صحیح العقیدہ مسلمان مراد ہے جو باب عقائد میں علمائے بریلی کے مسلک سے متفق ہوں"۔

پورے غیر منقسم ہندوستان کی عظیم ترین "تنظیم آل انڈیا سنی کانفرنس" جس میں پشاور سے بنگلہ دیش تک تمام مراکز اہل سنت کے سارے علما شریک ہوئے اس میں بھی اہل سنت کی پہچان مولانا احمد رضا خان صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مسلک کو قرار دیا گیا ہے"۔ (پیغام رضا، مارچ ۲۰۰۷ء، ص: ۱۴۵، ۱۴۶، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قادری قدس سرہ نے بدمذہبوں کے ردّ وابطال میں امتیازی کوشش فرمائی اسی وجہ سے علمائے کرام نے ان کو مجدد کہا اور اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ حضرت کی طرف منسوب "مسلک اعلیٰ حضرت" اور ان کے شہر کی طرف منسوب "بریلوی" کو اہل حق کا نشان امتیاز بنا دیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۸) جواب: زید کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ہمارے معتبر و اکابر علمائے اہل سنت امتیاز کے لیے "مسلک اعلیٰ حضرت" کو پسند فرماتے تھے لیکن اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ وہ "بریلوی" کہنا یا کہلوانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہمارے علمائے اہل سنت نے تو غیروں سے امتیاز کے لیے "مسلک اعلیٰ حضرت" اور "بریلوی" دونوں کو برقرار رکھا ہے۔ چنانچہ پیچھے عبارت گزر چکی ہے کہ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے "سنی، حنفی، بریلوی" کے لفظ کو ادارے کے مسلک کے طور پر باقی رکھا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ "بریلوی" کہلانے کو ممنوع نہیں سمجھتے تھے بلکہ غیروں سے امتاز کے لیے "بریلوی" کہنے اور کہلوانے کے قائل تھے۔

اب یہاں اکابر علمائے اہل سنت کے موقف کو ترتیب وار نقل کیا جاتا ہے:

● رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے "بریلوی" کہنے اور کہلوانے کے متعلق باضابطہ ایک مقالہ بنام "بریلوی دور حاضر میں اہل سنت کا علامتی نشان" تحریر فرمایا جو رسالہ کی شکل میں طبع ہو کر عام ہو چکا ہے اس رسالہ کے اخیر میں تحریر فرماتے ہیں:

"اس مقالے کی آخری سطریں لکھتے ہوئے اپنے عنوان کے متعلق دو لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ بات اب محتاج بحث نہیں۔ کہ ہند و پاک میں اپنے آپ کو "حنفی" کہنے والے دو بڑے مکاتیب فکر میں منقسم ہو گئے ہیں۔ "بریلوی مکتبہ فکر" اور "دیوبندی مکتبہ فکر" میرا یہ مقالہ دونوں مکتبہ فکر کے تقابلی مطالعہ پر مشتمل ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا آپ ہی کے ذمہ ہے کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے اہل دیوبند کے مقابلے میں جن عقائد واعمال کی حمایت کی ہے اگر وہی اہل سنت کا مذہب ہے تو لازما یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ "بریلوی مکتبہ فکر" ہی مذہب اہل سنت کا صحیح ترجمان ہے"۔ (بریلوی دور حاضر میں اہل سنت کا علامتی نشان، ص:۲۸، جامعہ حبیبیہ، الہ آباد، ۱۴۳۱ھ)

"یہ داستان سننے کے قابل ہے کہ آج دنیا کے کروڑوں سنی مسلمان اعلیٰ حضرت پہ اپنی جان کیوں چھڑکتے ہیں اور مسلک اعلی حضرت کیا چیز ہے، جس کے ساتھ ان کی والہانہ وابستگی ہے؟ اعلیٰ حضرت کے اندر دین وایمان کی وہ کون سی خوبی تھی جس کی وجہ سے بریلوی کا لفظ اب سنی صحیح العقیدہ حق پرست طبقے کا علامتی نشان بن گیا ہے۔ (تجلیات رضا، ص: ۱۷۵، دار الکتاب دہلی، بحوالہ پیغام رضا، اپریل تا جون، ۲۰۰۹ء ص:۳۵۵، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار)

● ماہر ہفت لسان وحید الزمان خلیفہ حضور مجاہد ملت علامہ عاشق الرحمن حبیبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی "بریلوی" کہلانے کے متعلق ایک مقالہ بنام "ہمیں بریلوی کہلانے پر فخر ہے" تحریر فرمایا جو رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے رسالہ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے اس میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت علامہ علوی نے اپنے شیخ علامہ تبانی سے یہ قول سنایا کہ:

"اذا جاء كم احد من الحجاج الهنود فاذكروا لديه الشيخ احمد البريلوى فان سرّ فهو من اهل السنة وان سخط وغضب فهو من اهل البدعة"۔

علامہ تبانی نے علمائے عرب کو خطاب کر کے یہ فرمایا تھا اور سنی کو پہچاننے کے لیے یہ معیار قائم کر دیا تھا کہ جو حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز کا ذکر سن کر خوش ہوتا ہے وہی سنی ہے اس لیے ہمیں ''بریلوی کہلانے پر فخر ہے۔ بریلوی کہنے سے اگر کوئی چڑتا ہے تو ہمیں اس کی پرواہ نہیں ہے"۔ (ہمیں بریلوی کہلانے پر فخر ہے، ص:۴۸، جامعہ حبیبیہ، الہ آباد، ۱۴۳۱ھ)

● تمام فضلائے جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں سب سے پہلے اپنے نام کے ساتھ "مصباحی" لکھنے کا التزام کرنے والے مولانا محمد احمد مصباحی مبارک پوری ابن بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی رحمہا اللہ رئیس القلم علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے تحریر فرمودہ رسالہ مطبوعہ "حق اکیڈمی" کے ابتدائی صفحات میں تحریر فرماتے ہیں:

"امام احمد رضا قادری فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ نے ہی ان کے چہروں کی نقاب کشائی کی اور مردہ سنتوں کو زندہ کر کے احیائے دین وملت کا فریضہ انجام دیا ہے جس کی وجہ سے لوگ صراط مستقیم پر گامزن دکھائی دیتے ہیں۔ اس احسان کا بدلہ معاندین اہل سنت نے بہتان تراشی کر کے دیا۔

زیر نظر کتاب "بریلوی" میں مولانا ارشد القادری صاحب نے انتہائی سنجیدہ ومتین لب ولہجہ میں حقائق بیانی کا فریضہ انجام دیا ہے اور اس کو واضح کیا ہے کہ "بریلوی" ہونا کوئی معیوب بات نہیں بلکہ موجود زمانہ میں اب "بریلوی" اہل سنت وجماعت اور حنفیوں کا علامتی نشان بن گیا ہے"۔ (پیغام رضا، مارچ ۲۰۰۷ء، ص:۲۹۸، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار)

● مولانا ضیا جالوی مدیر اعزازی ماہ نامہ پاسبان الہ آباد

خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی علیہ الرحمہ کے متعلق یوں تحریر فرماتے ہیں:

''لیکن اسلام ان کے نزدیک وہی معتبر ہے جو بریلوی نقطۂ نگاہ رکھتا ہو اور جو صرف بریلوی مکتبۂ فکر کی آغوش میں پلتا ہے۔ چنانچہ افعال واعمال کے لیے بھی وہی پیمانے ان کے نزدیک معتبر ہیں جن پر بریلویت کی چھاپ ہو، فکر ونگاہ کے لیے وہی زاویئے قابل وثوق ہیں جن پر بریلی عینک چڑھی ہو۔ غرض ان کے نزدیک وہی سکہ رائج الوقت ہے جو بریلی اور صرف بریلی کی ٹکسال میں ڈھلتا ہے۔'' (قہر آسمانی بر فتنۂ حقانی، ص:۲۸، مکتبہ پاسبان، الہ آباد)

● خود پاسبان ملت علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

''اب تو اس ملک کا مزاج یہ ہو گیا کہ ہم جیسے لوگ ملک کے کسی صوبے یا کسی گوشے میں چلے جائیں تو ہمارا تعارف الہ آبادی سے نہیں ہوتا بلکہ بریلوی سے ہوتا ہے گویا ذہنوں میں یہ بات رچ بس گئی ہے کہ یہ آنے والا اپنا وطن لے کر نہیں آیا بلکہ امام احمد رضا کا مسلک اور عقیدہ لے کر آیا ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم ملک کے کسی گوشے میں ہوں لیکن مرکز سے ہماری وابستگی میں کوئی فرق نہ آئے اس تحریر کا پس منظر یہ نہیں ہے کہ ہم پوری سنی برادری پر بریلی کے ڈکٹیٹر اور اس کی آمریت کو اس طرح مسلط کر دینا چاہتے ہیں۔ جس میں اصلاح ومشورہ کی کوئی گنجائش ہی نہ ہو۔ ایسا نہیں ہے جہاں ہم چھوٹوں کی اپنی کچھ ذمہ داریاں ہیں وہاں مرکز کی اپنی پاسداری بھی ضروری ہے''۔ (پیغام رضا، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء، ص:۶۱، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار)

آپ ۱۹۸۷ء میں اپنے ایک خط میں یوں رقم طراز ہیں:

''انحطاط اور تنزل کے اس ہوش ربا دور میں مسلک اعلیٰ حضرت کے استقلال واستحکام کے لیے جدوجہد کرنا وقت کا عظیم جہاد ہے۔ آپ اس کام میں لگے رہئے، تنہائی محسوس نہ کیجئے، ابھی مسلک رضویت کے جانثاروں کی کمی نہیں ہوگئی ہے۔ وقت کا سب سے اہم کام یہ ہے کہ بریلویت کے نام پر جہاں بھی زبان وقلم کی آزادی ہو بلا لومۃ لائم ایسے لوگوں سے بہت سختی سے محاسبہ کیا جائے۔ مسلک ہی تو ہمارا سرمایہ ہے، خدانہ خواستہ ہم اس کو بھی کھو بیٹھے تو پھر ہمارا وجود ہی کہاں رہ جائے گا؟ بریلویت ہمارا تشخص ہے اور اس پر ہمیں فخر ہے۔ ہم اس کو کبھی مٹا نہیں سکتے۔ مسلک کو ہم نے کسی مصلحت کے تحت اختیار نہیں کیا ہے یہ ہمارے ضمیر کی اصل آواز ہے جس کو کوئی دبا نہیں سکتا ہے''۔ (خط بنام الحاج سعید نوری، رضا اکیڈمی ممبئی ۱۱؍ اکتوبر ۱۹۸۷ء، بحوالہ پیغام رضا، اپریل تا جون، ۲۰۰۹ء ص:۳۵۳، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار)

● خلیفۂ حضور حجۃ الاسلام استاذ العلما مفتی محمد فضل کریم رضوی حامدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے فتاوی کا مجموعہ ''فتاویٰ شرعیہ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس میں متعدد سوالات ہیں کہ جن میں وہابی و دیوبندی کے مقابلہ میں امتیاز کے لیے سنیوں کے لیے ''بریلوی'' کا استعمال کیا گیا ہے اس کے چند اقتباسات یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

''اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ نبی کی توہین انسان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر کے حد کفر میں پہنچا دیتی ہے۔ ''بریلوی'' مولویوں نے جو کچھ کہا وہ صحیح و درست ہے۔'' (فتاویٰ شرعیہ، کتاب العقائد، ج:۱، ص:۱۵۰، شبیر برادرز، لاہور، ۱۴۳۴ھ/ ۲۰۱۳ء)

''(۴) بریلوی عالم کی اقتدا میں نماز شرعاً جائز و درست ہے۔ (۵) وہابی عالم کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ بریلوی عالم کا مطلب یہ ہے جو مسلک اہلسنّت و جماعت پر قائم ہو جس کا عقیدہ بزرگان دین وسلف صالحین وعلمائے مجتہدین کے عقائد کے مطابق ہو، جو جان رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعطائے الٰہی مالک ومختار سمجھے اور ساری کائنات و جملہ مخلوقات وموجودات سے بزرگ وافضل جانے اور یہ اعتقاد رکھے کہ ان کا مثل ونظیر نہ ہوا ہے نہ ہوگا اور یہ کہ بغیر ان کی محبت وعظمت کے عبادت وطاعت قابل قبول نہیں جو اپنے اہل وعیال جان ومال سے ان کو زیادہ عزیز رکھے، جو یہ یقین کرے کہ رسول سے محبت خدا سے محبت ان کی دوستی خدا کی دوستی اور ان سے دشمنی خدا سے دشمنی اور جو یہ کہے:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی، تمام بولہبی ست

بریلوی مولوی وہ جو محمد عربی روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

دوستوں کو دوست اور ان کے دشمنوں کو دشمن جانے۔ مختصر طور پر بریلوی کی پہچان کے لئے یہ چند باتیں سپردِ قلم کردی گئی ہیں"۔ (فتاویٰ شرعیہ، ج:۱،ص:۱۵۵،۱۵۶،شبیر برادرز، لاہور، ۱۴۳۴ھ/ ۲۰۱۳ء)

"دیوبندیوں کے عقائد باطلہ و خیالات فاسدہ اظہر من الشمس۔ محبوب رب العالمین کی توہین تنقیص کرنے والوں کا عقیدہ بلاشبہ باطل ومردود ہے۔ بریلوی حضرات کا عقیدہ یقیناً صحیح و درست ہے۔ یہ حضرات "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ" "ہم کو سیدھا راستہ چلا راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا۔" (ترجمہ کنز الایمان) کے مطابق منعم علیہم کے طریقہ ومسلک پر ہیں جس کی تشریح قرآن حکیم میں موجود ہے: فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِم مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا (سورہ نساء:۶۹) ''تو اسے ان کا ساتھ ملے گا جن پر اللہ نے فضل کیا یعنی انبیا اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ اور یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں۔'' (ترجمہ کنز الایمان) بریلی مسلک کے لوگ اسی طریقہ پر عمل کرتے ہیں جو طریقہ اہلسنّت والجماعت کا شروع سے اب تک رہا ہے اور جس راستہ پر سلف سے لیکر خلف تک تمام اکابرین ملت چلتے آئے"۔ (فتاویٰ شرعیہ، ج:۱،ص:۲۴۴، ۲۴۵،شبیر برادرز، لاہور، ۱۴۳۴ھ/ ۲۰۱۳ء)

"سوال کا کیا مطلب ہے سائل نے واضح طور پر نہیں لکھا ہے۔ مگر سوال سے مراد شاید یہ ہے کہ بریلوی اور وہابی کے پیچھے نماز درست ہوگی یا نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ عقائد کے اعتبار سے بریلوی کا عقیدہ ٹھیک و درست ہے اس لئے اس کے پیچھے نماز ہوجائے گی اور وہابی عقیدہ کے اعتبار سے گمراہ اور بدمذہب ہے۔ اس لئے کہ اس نے اپنی کتابوں میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین وتنقیص کی ہے۔ لہٰذا وہابی کے پیچھے نماز نہ ہوگی۔ اگر کوئی پڑھے، گنہگار ہوگا۔ (فتاویٰ شرعیہ، ج:۱، ص:۱۵۴، ۱۵۵، شبیر برادرز، لاہور، ۱۴۳۴ھ/ ۲۰۱۳ء)

ایک سوال کیا گیا:

"اور ایک شخص ہے، وہ کہتا ہے کہ نہ میں دیوبندی ہوں اور نہ میں بریلوی ہوں کیوں کہ یہ شہر کے نام ہیں۔ مجھے کسی شہر یا بستی پر ایمان نہیں ہے۔ میرا ایمان اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے۔ اب مسئلہ اور شریعت کی رو سے ایسے شخص کو کیا مانا جائے؟"

آپ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"مولوی مذکور غلط کہتا ہے۔ بریلوی وہ ہے جو ماجاء بہ النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ''جو کچھ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام لے کر تشریف لائے۔'' پر ایمان رکھتا ہے، مومن کو مومن اور کافر کو کافر جانتا ہے۔ بعض دیوبندی مولویوں نے رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شانِ ارفع واعلیٰ میں شدید ترین گستاخیاں کی ہیں جو انہیں کی کتابوں سے ظاہر ہیں۔ لہٰذا ان پر کفر وارتداد کا فتویٰ ہے۔" (فتاویٰ شرعیہ، ج:۳،ص:۱۵۰، ۱۵۱، ۱۴۳۴ھ/ ۲۰۱۳ء)

● شیخ الاسلام حضور تاج الشریعہ علامہ شاہ مفتی محمد اختر رضا خاں قادری علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

"بریلوی" عرفِ عام میں اہلِ سنت و جماعت کو کہا جاتا ہے۔ خصوصاً جب کہ دیوبندی کے بالمقابل "بریلوی" بولا جاتا ہے تو سنی ہی مراد ہوتے ہیں"۔ (فتاوی تاج الشریعہ، ج:۱، ص:۵۷۴، مرکز الدراسات الاسلامیہ، بریلی)

● محدث اعظم پاکستان کے تربیت یافتہ خلیفۂ خلفائے اعلیٰ حضرت علامہ مفتی محمد حسن علی رضوی بریلوی میلسی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"یہ ایک ناقابل تردید مسلمہ حقیقت ہے کہ گذشتہ چودھویں صدی اور موجودہ صدی کے اکثر و بیشتر مسلمہ ومعتمد علیہ اکابر ومشاہیر، علمائے اہلِ سنت، اعاظم مفتیانِ شریعت، فقہائے امت، امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مجدد دین وملت مولانا الشاہ امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مسلک حق پر ہیں۔ عہد حاضر وعصر رواں کے ۹۹ رفی صد علمائے اہل سنت فقہائے امت مسلک اعلیٰ حضرت سے وابستگی ومیلان طبع کا اظہار کرتے ہیں اور سیدنا اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اپنی روحانی ومسلکی نسبت کے باعث خود کو سنی بریلوی اپنے مدارس وعلمی مراکز کو سرکاری وغیر سرکاری ریکارڈ کا

غذات میں بریلوی ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح سرکاری وصحافتی سطح پر بھی ہم اہل سنت کو امتیاز وعلامت کے طور پر سنی بریلوی کہا اور لکھا جاتا ہے اور حد یہ کہ مخالفین اہل سنت بھی محبوبان خدا حضرات انبیا و اولیا کی خداداد عظمتوں کو ماننے والے ہم اہل سنت کو ’’بریلوی‘‘ کہتے اور لکھتے ہیں۔ اگر چہ بریلوی کوئی نیا دین و مذہب اور نو مولود فرقہ نہیں چونکہ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت مجدد دین وملت فاضل بریلوی رضی اللہ تعالی عنہ نے مذہب حق اہل سنت کے عقائد ومعمولات کو دلائل وشواہد اور تحقیقات علمیہ کے ساتھ نکھار کر پیش کیا ہے اس طرح خالص سنیت کی واضح علامت ’’بریلوی‘‘ بن گیا۔ جیسے نجدی وہابی فرقہ کی علامت نجد اور دیوبندی وہابی فرقہ کی علامت دیوبند بنا۔ اسی طرح عہد حاضر میں محبوبان خدا حضرات انبیا و اولیا (علیهم والصلاۃ والسلام و قدست اسرارهم) سے سچی حقیقی محبت وعقیدت رکھنے والے ہم اہل سنت مسلک اعلیٰ حضرت کے اتباع کے باعث ’’بریلوی‘‘ کہلائے جانے لگے‘‘۔ (پیغام رضا، مارچ ۲۰۰۷ء، ص: ۲۸۳، ۲۸۴، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار)

● مفتی اعظم اڑیسہ حضرت علامہ سید عبد القدوس علیہ الرحمہ اپنے وصیت نامہ جو آپ نے خود اپنے ہاتھ سے ۱۸ر رجب المرجب ۱۴۱۵ھ مطابق ۲۲ر دسمبر ۱۹۹۴ء بروز پنج شبہ کو تحریر فرمایا آپ اس کی ابتدا ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

’’سجادہ نشین سنی صحیح العقیدہ ’’بریلوی‘‘ اور مسلک اعلیٰ حضرت کا سچا ترجمان ہو‘‘۔ (پیغام رضا، مارچ ۲۰۰۷ء، ص: ۲۳۲، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار)

● مفتی اعظم راجستھان حضرت علامہ مفتی اشفاق نعیمی علیہ الرحمہ سے سوال کیا گیا:

’’ہم اپنے لیے سنی حنفی کا لفظ بہت پسند کرتے ہیں لفظ ’’بریلوی‘‘ بعض لوگوں کی طبیعت پہ گراں گزرتا ہے۔ مسلک اعلیٰ حضرت کا نعرہ بے موقع بے محل بھی کبھی کبھی ناگوار لگتا ہے‘‘۔

اس سوال کا جواب میں آپ نے ان الفاظ میں فرمایا:

’’میرے عزیز! ہم تو لفظ بریلوی سن کر بہت خوش ہوتے ہیں، دل خوشیوں سے باغ باغ ہوجاتا ہے، کیف وسرور، فرحت وانبساط کا ماحول پیدا ہوجاتا ہے۔ کیوں کہ بریلی شریف میں مجدد اعظم امام عشق و محبت امام احمد رضا خاں بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آرام فرما ہیں جنہوں نے حق وباطل کے درمیان دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کردیا۔

میرے عزیز! مسلک اعلیٰ حضرت کا وہاں نعرہ لگایا جائے جہاں موقع اور محل ہو، مسلک اعلیٰ حضرت کوئی نیا مسلک اور پانچواں مسلک نہیں، بلکہ اس زمانے میں مسلک اہل سنت کا ایک نام مسلک اعلیٰ حضرت بھی ہے۔ مسلک اعلیٰ حضرت حقیقت میں سوادِ اعظم کے اس اس طریقہ مرضیہ اور متوارثہ کا نام ہے جو عہد رسالت سے لے کر آج تک سواد اعظم کا مسلک ہے، جو ’’**يد الله على الجماعة**‘‘ اور ’’**ما أنا عليه وأصحابي**‘‘ کا مصداق ہے‘‘۔ (ماہنامہ کنز الایمان، مارچ ۲۰۰۷ء ص: ۳۰، ۳۱، بحوالہ: پیغام رضا، مارچ ۲۰۰۷ء، ص: ۲۶۳، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار)

● شہزادۂ بحر العلوم حضرت مولانا شکیب ارسلان مصباحی مبارک پوری لکھتے ہیں:

’’حضرت امام الحکمت (علامہ حافظ عبد الرؤف بلیاوی) ہوں یا حضرت بحر العلوم، حضرت علامہ ارشد القادری ہوں یا حضرت شیخ الاسلام یہ علما اشرفیہ کی ہری ہری ڈالوں اور بھری بھری بالوں کے ہی تو خوشہ چیں ہیں۔ اور یہ انھیں کی جبین قلم کے سجود نیاز اور درنایاب ہیں۔ جنہوں نے سنی حنفی کے ساتھ بریلوی کا اضافہ فرمایا‘‘۔ (بریلوی ہی اہل سنت ہیں، ص: ۷، بحر العلوم عرس کمیٹی، مبارک پور ۱۴۲۹ھ/ ۲۰۱۷ء)

● خانقاہ اشرفیہ کچھوچھہ مقدسہ کی مشہور ومعروف شخصیت شہزادۂ محدث اعظم ہند سید محمد مدنی اشرفی جیلانی فرماتے ہیں:

’’وہ مقدس ہدایت یافتہ ونجات یابندہ جماعت حضور آیۂ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ’’**ما أنا عليه وأصحابي**‘‘ سے جس کی پہچان کرائی اور ’’**يد الله على الجماعة**‘‘ فرما کر جس کا تعارف کرایا اسی جماعت کو ہندو پاک کے ایک بڑے حصے میں ’’بریلوی‘‘ کہا جانا ’’مجدد مائۃ حاضرہ امام احمد رضا قادری رضی اللہ عنہ کی فضیلت وعظمت اور ان

کی رفعت شان کے اس گوشے کو نمایاں کرتا ہے جو مجدد دین سابقین کی صف میں آپ کی ذات کو منفرد و ممتاز کر دیتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ لفظ ''بریلویت'' کو غیر شعوری طور پر سہی سنیت کے ہم معنی ایک وسیع مفہوم میں استعمال کے آغاز کا سہرا خود انہی منکرین عظمت نبوت کے سر ہے جنھوں نے تقدیس رسالت کی نفی ہی کو توحید الٰہی سمجھ رکھا ہے اب کوئی اشاعرہ سے ہو یا ماتریدیہ سے حنفی ہو یا شافعی ہو، مالکی ہو یا حنبلی اگر وہ صحیح طور پر مسلک اہل سنت و جماعت پر ہے تو مذکورۃ الصدر مروجہ اصطلاح کی روشنی میں ''بریلوی'' ہے۔ اب ''بریلوی'' ہونے کے لیے فاضل بریلوی کی ذات گرامی تک کسی کا سلسلہ علمی یا سلسلہ نسبی یا سلسلہ بیعت وارادت کا پہنچنا یا شہر بریلی شریف میں مقیم رہنا ضروری نہیں رہ گیا اس لیے تو ایسوں کو بھی ''بریلوی'' کہا جاتا ہے جس نے عمر بھر بریلی شریف کو خواب میں بھی نہیں دیکھا نیز جس کا علمی یا نسبی یا کسی دوسری طرح کا کوئی سلسلہ فاضل بریلوی تک نہیں پہنچتا بلکہ جہاں فاضل بریلوی کی آواز تک نہیں پہنچی اس اصطلاح نے ''بریلویت'' کو وہاں تک پہنچا دیا۔ اب اس دنیا کا ہر وہ فرد ''بریلوی'' ہے جو مسلک اہلسنت پر واقعی طور پر گامزن ہے۔ غور فرمائیے کہ فاضل بریلوی کسی نئے مذہب کے بانی نہ تھے از اول تا آخر مقلد رہے۔ ان کی ہر تحریر کتاب وسنت اور اجماع وقیاس کی صحیح ترجمان رہی نیز سلف صالحین وائمہ مجتہدین کے ارشادات اور مسلک اسلاف کو واضح طور پر پیش کرتی رہی۔ وہ زندگی کے کسی گوشے میں ایک پل کے لیے بھی سبیل مومنین صالحین سے نہیں ہٹے۔

اب اگر ایسے کے ارشادات حقانیہ اور توضیحات وتشریحات پر اعتماد کرنے والوں، انھیں حق سمجھنے والوں اور دلائل و براہین کی روشنی میں انھیں سلف صالحین کی روش کے مطابق یقین کرنے والوں کو ''بریلوی'' کہہ دیا گیا تو کیا ''بریلویت'' وسنیت کو بالکل مترادف المعنی نہیں قرار دے دیا گیا۔ اور ''بریلویت'' کے وجود کا آغاز فاضل بریلوی کے وجود سے پہلے ہی نہیں تسلیم کر لیا گیا؟

المختصر ہمارے امام احمد رضا قادری بریلوی کی عظمت وشان اور بارگاہ خدا اور رسول میں ان کی مقبولیت کو سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ان کی ذات گرامی تو بڑی چیز ان کے شہر کی طرف نسبت منسوب کر کے اہل ایمان اور اس کے عاشق رسول ہونے کی دلیل بن گئی ہے۔

اب میں الحمد اللہ مسلکاً حنفی نسبتاً جیلانی مشرباً اشرفی اور وطناً کچھوچھوی ہونے کے باوجود اپنے کو ''بریلوی'' کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں''۔ (پیغام رضا، مارچ ۲۰۰۷ء، ص:۲۹۹، ۳۰۰، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار)

● لفظ بریلوی کے حوالے سے حضرت مولانا مصطفی رضا شبنم کمالی علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

''میں مسلک کے اعتبار سے اس دور میں امام اہل سنت مجدد دین وملت امام احمد رضا خاں قادری بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات و ارشادات ہی کو اہل حق اہل سنت و جماعت کا مسلک سمجھتا ہوں اور اسی پر بحمدہ تعالی میرا عمل ہے۔ واضح لفظوں میں یہ زیادہ مناسب ہے کہ میں ''بریلوی'' ہوں کیونکہ اس دور پر فتن میں یہی طرۂ امتیاز اور اہل حق کا علامتی نشان ہے''۔ (امتیاز اہل سنت، ص:۱۴۹، ۱۵۰، رضا دار المطالعہ، پوکھریرا، سیتامڑھی، بہار، ۱۴۳۴ھ/ ۲۰۱۲ء)

● حضرت سید آل رسول حسنین میاں نظمی قادری برکاتی نوری قاسمی مارہروی اپنے والد محترم حضرت سید العلما سید آل مصطفیٰ سید میاں مارہروی علیہ الرحمہ کی شان بیان کرتے ہوئے اپنے قصیدے میں فرماتے ہیں:

''احمد رضا سے الفت سید میاں نے دی ہے
ہاں ہاں ''بریلویت'' سید میاں نے دی ہے''

(بعد از خدا، ص:۳۳۴، بزم برکات آل مصطفی، ممبئی، ۲۰۱۳ء)

''مشتے نمونہ از خروارے'' زید کے دعوی کی تردید کے لیے یہی مذکورہ چند حقائق ہی کافی ووافی ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ الفقیر **محمد راحت رضا خان**

السّنی الحنفی القادری الرضوی عفی عنہ

دار الافتا دار العلوم فیضان تاج الشریعہ، بریلی شریف

۲۹ محرم الحرام ۱۴۴۸ھ

محمد ملک الظفر سہسرامی

مسلکِ اعلیٰ حضرت کا تہذیبی و روحانی مطالعہ

مسلک کسی شخصیت کے نام سے وابستہ محض ایک فکری عنوان نہیں ہوتا؛ وہ دراصل ایک پورے ایمانی شعور، تہذیبی مزاج اور روحانی روایت کا نام ہوتا ہے۔ اس کے اندر عقیدہ بھی ہوتا ہے، عبادت بھی، فکر بھی ہوتی ہے، کردار بھی، محبت بھی ہوتی ہے، ادب بھی اور سب سے بڑھ کر وہ تاریخی شعور بھی ہوتا ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل تک دین کی روح کو منتقل کرتا رہتا ہے۔

اسی لیے مسلکِ اعلیٰ حضرت کو اگر صرف چند فقہی مسائل، بعض مناظرانہ مباحث یا چند اعتقادی اصطلاحات کے مجموعے کے طور پہ دیکھا جائے تو یہ اس عظیم روایت کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔ مسلکِ اعلیٰ حضرت دراصل اس جامع اسلامی مزاج کا نام ہے جس میں عقیدہ، شریعت، طریقت، محبت، ادب اور تہذیب ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ ایک ہی روحانی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ یہ وہ شعور ہے جس میں حضور اکرم ﷺ کی تعظیم ایمان کی روح ہے، اہلِ بیتِ اطہار کی محبت قلب و روح کی زینت ہے، صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی عظمت دین کی بنیاد ہے، اولیائے کرام کا ادب روحانی تسلسل کی علامت ہے اور شریعت کی پابندی نجات کا واحد راستہ۔

یہی وجہ ہے کہ مسلکِ اعلیٰ حضرت کو سمجھنے کے لیے صرف اس کے فقہی یا مناظرانہ پہلوؤں کا مطالعہ کافی نہیں بلکہ اس کے لیے اس پورے تاریخی، روحانی اور تہذیبی پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے جس میں یہ روایت تشکیل پاتی ہے، پروان چڑھتی ہے اور پھر ایک عظیم شخصیت کے ذریعے اپنے جامع ترین اظہار تک پہنچتی ہے۔

برصغیر کی اسلامی تاریخ میں بعض نسبتیں محض نسبتیں نہیں رہتیں بلکہ وقت کے طویل سفر میں ایک پورے فکری و روحانی تسلسل کی علامت بن جاتی ہیں۔ خانقاہوں کی پاکیزہ فضا، اہلِ دل کی دعائیں، علما کی علمی کاوشیں، صوفیا کی روحانی تربیت اور عاشقانِ رسول ﷺ کے بے مثال جذبات --- یہ سب مل کر ایک ایسی تہذیب تشکیل دیتے ہیں جس میں دین صرف کتابوں میں نہیں رہتا بلکہ زندگی کے ہر گوشے میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

اسی تاریخی و روحانی تسلسل کے ایک نہایت اہم مرحلے پہ شہنشاہِ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصیت نامہ سامنے آتا ہے۔ اس وصیت نامے میں لفظ مسلک کا مفہوم نہایت وسیع، عمیق اور روحانی ہے۔ یہاں مسلک صرف چند فقہی جزئیات یا مناظرانہ تعبیرات کا نام نہیں بلکہ ایک ایسے مکمل ایمانی و تہذیبی شعور کی علامت ہے جس میں عشقِ رسول ﷺ، محبتِ اہلِ بیت، عظمتِ صحابہ، ادبِ اولیا اور پابندیِ شریعت ایک ہی نورانی سلسلے کی کڑیاں بن جاتے ہیں۔

اسی جامع تصورِ دین کی سب سے روشن اور کامل تصویر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شخصیت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان کے یہاں فقہ ہے، مگر خشک اور بے روح نہیں، تصوف ہے، مگر شریعت سے بے نیاز نہیں، عشق ہے، مگر حدودِ شریعت سے آزاد نہیں اور مناظرہ ہے، مگر محض غلبۂ بحث کے لیے نہیں، بلکہ عقیدۂ اہلِ سنّت کے تحفظ اور ناموسِ رسالت ﷺ کی پاسبانی کے لیے۔

یہی جامع توازن اعلیٰ حضرت کی شخصیت کو محض ایک فقیہ، مفتی، صوفی، شاعر یا مناظر کی حدود سے بلند کر کے ایک مکمل تہذیبی و روحانی

روایت کا مرکز بنا دیتا ہے۔ ان کے یہاں دین زندگی سے جدا کوئی مجرد تصور نہیں بلکہ عقیدے سے کردار تک، عبادت سے تہذیب تک، علم سے عشق تک اور شریعت سے روحانیت تک ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔

چنانچہ مسلکِ اعلیٰ حضرت کو محض ایک فکری تحریک کہنا بھی اس کی وسعت کو محدود کرنا ہے۔ یہ ایک زندہ روحانی روایت ہے، ایک تہذیبی امانت ہے، ایک تاریخی تسلسل ہے اور ایک ایسے ایمانی مزاج کا نام ہے جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو ان کے عقائد، ان کی روحانی نسبتوں، ان کی تہذیبی شناخت اور ان کے عشقِ رسول ﷺ سے وابستہ رکھا۔

اسی پس منظر میں حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصیت نامہ ایک غیر معمولی معنویت اختیار کر لیتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ وصیت محض کسی بزرگ کی روحانی نصیحت نہیں بلکہ تاریخ کے ایک دور سے دوسرے دور تک پہنچنے والی ایک نورانی صدا ہے، ایک ایسا روحانی اشارہ جس میں آنے والے زمانے کے ایک عظیم مجددانہ ظہور کی بشارت پوشیدہ ہے۔ اور جب تاریخ کے صفحات پلٹتے ہیں تو یہی نورانی تسلسل اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شخصیت میں اپنی کامل تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں مسلکِ اعلیٰ حضرت کا مطالعہ محض چند عقائد یا فقہی مباحث کا مطالعہ نہیں رہتا بلکہ ایک پورے تاریخی و تہذیبی سفر کی بازیافت بن جاتا ہے۔۔۔ ایک ایسے سفر کی، جس میں اہلِ سنّت کے عقائد کی حفاظت، عشقِ رسول ﷺ کی حرارت، شریعت کی پاسداری، تصوف کی پاکیزگی، اولیائے کرام کی نسبت اور اسلامی تہذیب کی بقا ایک ہی روحانی دھارے میں بہتی نظر آتی ہے۔

اسی تاریخی تسلسل، روحانی وراثت اور تہذیبی شعور کی روشنی میں مسلکِ اعلیٰ حضرت کا یہ مطالعہ پیشِ نظر ہے۔

اور اسی جامع تصورِ مسلک کی ایک نہایت بلیغ اور روحانی تعبیر ہمیں شہنشاہِ کاٹھیاوار حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے وصیت نامے میں ملتی ہے، ایک ایسی تعبیر جس میں مسلک محض ایک فکری شناخت نہیں بلکہ ایک مکمل ایمانی، روحانی اور تہذیبی وراثت کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

شہنشاہ کاٹھیاوار حضرت سید شاہ محمد صالح شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے وصیت نامے میں ''مسلک'' کا مفہوم بھی نہایت وسیع اور روحانی ہے۔ یہ صرف چند فقہی جزئیات یا مناظرانہ تعبیرات کا نام نہیں بلکہ ایک پورا تہذیبی و ایمانی شعور ہے۔ ایک ایسا شعور جس میں حضور اکرم ﷺ کی تعظیم ایمان کی روح سمجھی جاتی ہے، اہلِ بیت کی محبت قلب و روح کی زینت ہوتی ہے، صحابۂ کرام کی عظمت دین کی بنیاد مانی جاتی ہے، اولیاء اللہ کے ادب کو روحانی تسلسل کا حصہ سمجھا جاتا ہے اور شریعت کی پابندی کو نجات کا راستہ قرار دیا جاتا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شخصیت اسی جامعیت کی علامت بن کر ابھرتی ہے۔

ان کے یہاں فقہ بھی ہے مگر خشک نہیں، تصوف بھی ہے مگر بے لگام نہیں، عشق بھی ہے مگر شریعت سے جدا نہیں اور مناظرہ بھی ہے مگر محض غلبۂ بحث کے لیے نہیں بلکہ تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ کے لیے۔

اسی جامع توازن نے ان کے مسلک کو محض ایک فکری تحریک نہیں رہنے دیا بلکہ اسے ایک زندہ روحانی روایت کی شکل دے دی۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی یہ وصیت دراصل ایک "سلسلۂ نور" کی طرف اشارہ ہے۔۔۔ ایسا سلسلہ جو عہدِ صحابہ سے چلتا ہوا اولیاء و مجددین کے ذریعے ہر دور میں امت کے ایمان، اس کے ذوقِ محبت اور اس کے اعتقادی تشخص کی حفاظت کرتا رہا ہے۔ اور جب کبھی زمانے کے فتنوں نے یہ چراغ بجھانے کی کوشش کی، اسی سلسلے سے کوئی نہ کوئی مردِ حق اٹھا جس نے اپنی خداداد صلاحیت، روحانیت اور عشقِ رسول ﷺ سے اس نور کو پھر سے روشن کر دیا۔

قابلِ غور امر یہ بھی ہے کہ اس وصیت میں "اہلِ بیت کے احترام" پر خاص زور دیا گیا۔ یہ دراصل اُس اعتدال پسند سنی مزاج کی علامت ہے جس میں محبتِ اہلِ بیت اور تعظیمِ صحابہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

اہلِ سنّت کا یہی امتیاز رہا ہے کہ اس نے محبت کو توازن کے ساتھ جوڑا، عقیدت کو اعتدال کے ساتھ رکھا اور تاریخ کے تمام مقدس

کرداروں کو ایک ہی نورانی سلسلے کی کڑیاں سمجھا۔

یہاں اہلِ بیت کی محبت محض جذباتی وابستگی نہیں بلکہ ایمان کی حرارت ہے۔ وہ محبت جو آقائے دو جہاں ﷺ کے گھرانے سے نسبت کی وجہ سے دلوں میں ادب، آنکھوں میں عقیدت اور زبان پر درود و سلام کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ مگر اس محبت کا حسن یہ ہے کہ وہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی عظمت سے متصادم نہیں ہوتی بلکہ انہی کے دامن میں پروان چڑھتی ہے۔ کیونکہ اہلِ بیت سے محبت کا درس بھی ہمیں صحابۂ کرام ہی نے دیا اور صحابہ کی تعظیم کا سلیقہ بھی ہمیں اہلِ بیت کے پاکیزہ کردار سے ملا۔

اسی لیے اہلِ سنّت کے نزدیک یہ دونوں نسبتیں ایک ہی چراغ کی دو روشن کرنیں ہیں۔

ایک طرف حضرت صدیقِ اکبر، سیّدنا فاروقِ اعظم، حضرت عثمانِ غنی اور مولائے کائنات حضرت علی رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی عظمت ہے، تو دوسری طرف حضرات حسنینِ کریمین، سیدۂ کائنات اور اہلِ بیت اطہار کی محبت۔ یہاں نہ صحابہ کے نام پر اہلِ بیت کی شان گھٹتی ہے اور نہ اہلِ بیت کی محبت میں صحابہ کی عظمت پر حرف آتا ہے۔ یہی وہ معتدل اور جامع مزاج ہے جو صدیوں سے اہلِ سنّت کی روحانی شناخت رہا ہے۔

حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جب آنے والے مجدد کی ایک بڑی علامت "اہلِ بیت کا احترام" بیان کی تو گویا وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ حقیقی مجدد وہی ہوگا جس کے دل میں محبتِ مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ محبتِ اہلِ بیت بھی موجزن ہوگی۔ کیونکہ جس دل میں اہلِ بیت کی محبت نہ ہو، وہاں عشقِ رسول ﷺ بھی ادھورا محسوس ہوتا ہے۔

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی پوری حیات اسی نورانی توازن کی آئینہ دار دکھائی دیتی ہے۔

ان کی نعتوں میں جہاں حضور ﷺ کی بارگاہِ اقدس کا والہانہ ادب ہے، وہیں اہلِ بیت اطہار کی محبت بھی ایک روحانی سرشاری کے ساتھ جھلکتی ہے۔ ان کے قلم میں صحابۂ کرام کی عظمت بھی محفوظ ہے اور اہلِ بیت کی تطہیر و تقدیس بھی۔ گویا ان کے یہاں محبت تقسیم نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی مرکزِ نبوت سے نکل کر تمام مقدس نسبتوں کو اپنے دائرۂ نور میں سمیٹ لیتی ہے۔

یہی دراصل سنّیت کا اصل جمال ہے-----

ایک ایسا جمال جس میں اختلاف کی تلخی نہیں بلکہ محبت کی وسعت ہے، جس میں تقدیس کے چراغ ایک دوسرے سے روشنی لیتے ہیں اور جس میں امت کی ابتدائی نسلوں کے تمام مقدس نقوش ایک ہی آسمان کے ستاروں کی طرح جگمگاتے دکھائی دیتے ہیں۔

یوں اس وصیت میں اہلِ بیت کے احترام پر دیا گیا زور محض ایک جزوی نصیحت نہیں بلکہ اُس پورے روحانی و اعتقادی مزاج کی نمائندگی کرتا ہے جس نے صدیوں تک اہلِ سنّت کو انتہاؤں کے تصادم سے بچا کر محبت، ادب اور اعتدال کی شاہراہ پر قائم رکھا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پوری علمی و نعتیہ روایت اسی توازن کی امین نظر آتی ہے۔ ان کی تحریروں میں جہاں صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے ادب کا کامل اہتمام ہے وہیں اہلِ بیت اطہار سے والہانہ محبت بھی نمایاں ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے قلم کی روشنائی میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ محبتِ صحابہ اور عقیدتِ اہلِ بیت دونوں کی خوشبو شامل ہو۔ ان کی نعتیہ شاعری محض جذبات کی روانی نہیں بلکہ ایک پورا اعتقادی و روحانی شعور ہے۔

جب وہ حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں درود و سلام کے پھول نچھاور کرتے ہیں تو ساتھ ہی اہلِ بیت اطہار کے پاکیزہ ذکر سے اپنی محبت کا چراغ بھی روشن رکھتے ہیں۔ اور جب صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کے اسلوب میں احترام کی ایسی لطافت پیدا ہو جاتی ہے جو اہلِ سنّت کے صدیوں پرانے ذوق کی آئینہ دار محسوس ہوتی ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی فکر میں تقدیس کی تمام روشن نسبتیں ایک دوسرے سے مربوط دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے نزدیک صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی

عظمت، اہلِ بیت اطہار کی محبت، اولیاءِ کاملین کا ادب اور عشقِ رسول ﷺ کی حرارت دراصل ایک ہی سرچشمۂ نور سے پھوٹنے والی مختلف کرنیں ہیں۔

اسی لیے ان کی علمی و روحانی روایت میں کہیں تصادم کی فضا محسوس نہیں ہوتی بلکہ ہر نسبت اپنے پورے احترام اور اعتدال کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

گویا انہوں نے امت کو یہ احساس دلایا کہ دین کا حقیقی حسن اسی جامع توازن میں ہے جہاں عقیدہ سختی میں تبدیل نہیں ہوتا، محبت غلو میں نہیں ڈھلتی اور ادب تعصب کا شکار نہیں ہونے پاتا۔

اسی لیے ان کی فکر میں نہ رافضیت کی افراط ہے، نہ خارجیت کی سختی، نہ خشک عقلیت کی بے ذوقی اور نہ محض رسمی دینداری کی سرد مہری۔ ان کے یہاں ایک ایسا معتدل اور جامع سنی شعور جلوہ گر ہے جس میں صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین آسمانِ ہدایت کے روشن ستارے ہیں اور اہلِ بیت اطہار گلشنِ نبوت کے پاکیزہ پھول۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی علمی و روحانی روایت میں "ادب" کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

وہ جانتے تھے کہ عشق جب ادب سے خالی ہو جائے تو محض نعرہ بن جاتا ہے اور علم جب تقدیس سے جدا ہو جائے تو خشک مناظرہ رہ جاتا ہے۔ اسی لیے ان کے قلم میں استدلال بھی ہے مگر گستاخی نہیں، شدت بھی ہے مگر بے ادبی نہیں اور دفاعِ عقیدہ بھی ہے مگر مقدس ہستیوں کے احترام کے دائرے سے باہر نہیں۔

ان کی شہرۂ آفاق نعت "مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام" دراصل اسی روحانی توازن کی ایک دل نشیں مثال ہے۔ اس میں حضور ﷺ کی بارگاہِ اقدس کے ساتھ اہلِ بیت، صحابۂ کرام، اولیاء اور صالحین سبھی پر محبت و عقیدت کے چراغ روشن دکھائی دیتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک نسبتِ مصطفیٰ ﷺ ایک ایسا سمندر ہے جس میں تمام مقدس رشتے اپنی پاکیزگی کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں۔

اسی اعتدال نے اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو محض ایک مناظر یا فقیہ نہیں رہنے دیا بلکہ انہیں اہلِ سنّت کے اس تہذیبی و روحانی ذوق کا ترجمان بنا دیا جس میں عشق، ادب، علم اور اعتدال ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔

ان کی شخصیت کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہی وہ "مذہبِ اہلِ سنت" ہے جس کی طرف حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وصیت نامے میں اشارہ کیا تھا------ایک ایسا راستہ جس میں محبت بھی محفوظ، عقیدہ بھی محفوظ ہے اور امت کی روحانی وحدت بھی۔

اس وصیت نامے کا آخری حصہ غیر معمولی شدت رکھتا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:

"اگر میری اولاد اور مریدوں نے اس بات پر توجہ نہ دی تو قیامت کے دن میں ان کا دامن پکڑوں گا۔"

یہ الفاظ دراصل ایک روحانی ذمہ داری کا اعلان ہیں۔

کوئی صاحبِ ولایت اس قدر سخت لہجہ اسی وقت اختیار کرتا ہے جب اسے اپنے مشاہدے کی صداقت پر کامل یقین ہو۔ اس میں صرف نصیحت نہیں بلکہ ایک طرح کی روحانی گواہی اور آخرت کی جواب دہی کا احساس پوشیدہ ہے۔

یہ وصیت نامہ اپنے اندر تین بڑے پہلو سموئے ہوئے ہے:

ایک آنے والے فکری فتنے کی پیش خبری دوسرے مجددِ دین کی بشارت تیسرے اپنے متعلقین کے لیے ایک اعتقادی و فکری وصیت۔

اسی لیے یہ محض ایک تاریخی روایت نہیں بلکہ برصغیر کی روحانی و فکری تاریخ کا ایک اہم باب محسوس ہوتی ہے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ وقت کی دھند میں جب فتنوں کے سائے گہرے ہونے والے تھے تو مشیتِ الٰہی نے پہلے ہی کچھ چراغ منتخب کر لیے تھے۔

ایسے چراغ جنہیں صرف اپنے عہد کو روشن نہیں کرنا تھا بلکہ آنے والی نسلوں کے ایمان، محبت اور عقائد و نظریات کی حفاظت بھی کرنی تھی۔ جب تاریخ کے افق پر انتشار کے بادل جمع ہونے لگتے ہیں، جب عقائد کی بنیادیں سوالات کی زد میں آنے لگتی ہیں اور جب محبت و

ادب کے چراغ ہوا کے تیز جھونکوں سے لرزنے لگتے ہیں، تب قدرت اپنے مخصوص بندوں کو آگے بڑھا دیتی ہے۔ یہ اللہ کریم کی سنت رہی ہے کہ امت کو کبھی مکمل تاریکی کے حوالے نہیں کیا گیا۔

ہر دور کے فتنوں کے مقابل کہیں نہ کہیں کوئی مردِ حق کھڑا کیا گیا، کوئی اپنے علم سے، کوئی اپنے اخلاص سے، کوئی اپنے جہاد سے اور کوئی اپنے عشقِ رسول ﷺ کی حرارت سے زمانے کے اندھیروں کو چیرتا رہا۔ یہی وہ نفوسِ قدسیہ ہوتے ہیں جن کے بارے میں بظاہر دنیا خموش رہتی ہے مگر آسمان ان کے انتخاب کا اعلان پہلے ہی کر چکا ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک خانقاہ کے سکوت میں ان کا ذکر ہوتا ہے، کبھی کسی بزرگ کی زبان سے ان کی بشارت نکلتی ہے اور کبھی وقت کے بے نام لمحوں میں ان کے لیے دعاؤں کے چراغ جلائے جاتے ہیں۔ پھر جب وہ ہستیاں دنیا کے منظر نامے پر آتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف ایک فرد کی آمد نہیں بلکہ تقدیرِ امت کا ایک نیا باب کھل رہا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ علیہ بھی انہی منتخب چراغوں میں سے ایک تھے۔

ان کی ولادت سے بہت پہلے ان کا ذکر ہونا، ان کے اوصاف کا بیان کیا جانا، ان کے فکری معرکوں کی خبر دینا---یہ سب اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بعض شخصیات محض حالات کا نتیجہ نہیں ہوتیں بلکہ انہیں زمانے کے زخموں کے لیے مرہم بنا کر بھیجا جاتا ہے۔

یوں لگتا ہے جیسے فتنوں کی رات ابھی پوری طرح اتری بھی نہ تھی کہ رحمتِ الٰہی نے پہلے ہی ایک چراغ محفوظ کر لیا تھا، تاکہ جب تاریکی حد سے بڑھنے لگے تو وہ چراغ عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی روشنی کے ساتھ بلند ہو اور بھٹکتے ہوئے قافلوں کو دوبارہ شاہراہِ اہلِ سنّت کی طرف لوٹا دے۔ حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی زبان سے ادا ہونے والی یہ بشارت دراصل اسی چراغ کی پہلی جھلک تھی، یہ وہ چراغ جو بعد میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی صورت میں جلوہ گر ہوا اور جس نے عشقِ رسول ﷺ، تعظیمِ اہلِ بیت، ناموسِ رسالت اور عقائدِ اہلِ سنّت کے دفاع کو ایک نئے وقار کے ساتھ زندہ کر دیا۔

وہ صرف ایک فرد نہ تھے بلکہ ایک پورے روحانی و فکری عہد کی تجدید کا استعارہ تھے۔

ان کی ذات میں ایک ایسے زمانے کی دھڑکن سنائی دیتی ہے جو اپنے عقیدے، اپنے روحانی ذوق اور اپنے تہذیبی تشخص کو بچانے کے لیے ایک مضبوط سہارے کا منتظر تھا۔

وہ محض ایک مدرس، مفتی یا مصنف نہیں تھے بلکہ ایک ایسے قافلے کے سالار بن کر ابھرے جس کے ہاتھوں میں علم کا چراغ بھی تھا اور دلوں میں عشقِ رسول ﷺ کی حرارت بھی۔

ان کے ظہور نے یہ احساس تازہ کر دیا کہ امت کی اصل قوت صرف ظاہری غلبہ نہیں بلکہ اس کے عقیدے کی سلامتی، اس کے ادب کی حفاظت اور اس کے روحانی رشتوں کی بقا میں پوشیدہ ہے۔

اسی لیے انہوں نے محض فروعی مباحث پر زور نہیں دیا بلکہ ایمان کی اُس باطنی کیفیت کو زندہ کرنے کی کوشش کی جس میں حضور اکرم ﷺ کی محبت زندگی کا مرکز بن جاتی ہے۔

وہ ایک ایسے دور میں اٹھے جب مذہب یا تو خشک مناظروں میں محدود ہو رہا تھا یا محض عقلی تعبیرات کا اسیر بنتا جا رہا تھا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں انتہاؤں کے درمیان کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ دین صرف عقل کا مسئلہ نہیں، دل کا نور بھی ہے، صرف قانون نہیں، محبت بھی ہے، صرف استدلال نہیں، ادب بھی ہے۔ گویا انہوں نے امت کو یاد دلایا کہ اگر علم کے چراغ سے عشق کی حرارت چھن جائے تو وہ روشنی بھی سرد پڑ جاتی ہے۔ ان کی تجدید صرف کتابوں تک محدود نہ تھی بلکہ ایک پورے تہذیبی شعور کی تجدید تھی۔

انہوں نے مسجد کے تقدس مآب منبر سے لے کر خانقاہ کی پاکیزہ فضاؤں تک، درسگاہ کے حلقوں سے لے کر نعتیہ ادب کے آہنگ تک، ہر جگہ اہلِ سنّت کے اس روحانی مزاج کو دوبارہ زندہ کیا جس میں محبت اور شریعت ایک دوسرے سے ہم آغوش دکھائی دیتے ہیں۔

اسی لیے ان کے بعد ''بریلویت'' محض ایک نسبت یا جغرافیائی شناخت نہیں رہی بلکہ عشقِ رسول ﷺ، تعظیمِ اہلِ بیت، ادبِ صحابہ،

وابستگیِ اولیاء اور تحفظِ عقیدہ کے ایک مکمل روحانی وفکری دبستان کی علامت بن گئی۔

ان کے اثرات صرف علمی حلقوں تک محدود نہ رہے بلکہ عوام کے اذواق، میلاد کی محفلوں، نعتیہ روایتوں، خانقاہی ماحول اور دینی شعور کے اندر تک اتر گئے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک "روحانی بیداری" کی ایک مضبوط تحریک کی صورت میں آئے تھے۔

ایک ایسی بیداری جس نے امت کو یہ یاد دلایا کہ فتنوں کے شور میں بھی عشقِ مصطفیٰ ﷺ کا چراغ بجھنے نہیں دینا چاہیے، کیونکہ یہی چراغ ایمان کی اصل روشنی ہے، یہی ادب روحانیت کی اصل خوشبو ہے اور یہی وابستگی امت کے اعتقادی وجود کی سب سے مضبوط بنیاد ہے۔

ان کے ظہور سے ایسا محسوس ہوا جیسے برصغیر کی فضا میں بکھرتی ہوئی عقیدت کو پھر سے ایک مرکز مل گیا ہو اور محبتِ مصطفیٰ ﷺ کے چراغوں کو ایک نئی آب وتاب عطا ہوگئی ہو۔

انہوں نے اپنے قلم سے صرف فتاوے نہیں لکھے بلکہ ایک زخمی عہد کے دل پر روحانی مرہم رکھا۔

جب عقائد پر شبہات کے بادل منڈلا رہے تھے، جب عظمتِ رسالت ﷺ کے باب میں بے احتیاطیاں بڑھ رہی تھیں، جب عشق کو بدعت اور ادب کو غلو کہہ کر کمزور کرنے کی کوشش کی جارہی تھی، تب اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے علم اور عشق دونوں کو ساتھ لے کر ایسا مضبوط حصار قائم کیا جس نے اہلِ سنّت کے اعتقادی تشخص کو نئی استقامت عطا کی۔

ان کی آواز میں مناظراتی لہجہ ضرور تھا مگر اس سے زیادہ محبت کی حرارت تھی۔ ان کے استدلال میں سختی ضرور تھی مگر اس کے پس منظر میں ایک عاشقِ رسول ﷺ کا تڑپتا ہوا دل موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں محض علمی مباحث محسوس نہیں ہوتیں بلکہ ان میں ایک روحانی غیرت اور ایمانی سوز بھی جھلکتا ہے۔

پھر ان کی نعتیہ شاعری نے عشقِ رسول ﷺ کو جس وقار، ادب اور روحانی لطافت کے ساتھ پیش کیا وہ اردو نعت کی تاریخ میں ایک مستقل دبستان بن گئی۔

ان کے اشعار میں عقیدہ بھی ہے، فنا فی الرسول ﷺ کی کیفیت بھی، محبت کی عاجزی بھی اور ادب کی انتہا بھی۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک فقیہ جب عشق کی زبان بولنے لگے تو الفاظ درود بن جاتے ہیں اور شاعری عبادت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے صرف فکری محاذ پر کارہائے نمایاں انجام نہیں دیے بلکہ اہلِ سنّت کے روحانی مزاج کو بھی محفوظ کیا۔ انہوں نے یہ باور کرایا کہ شریعت اور محبت ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو حسین پہلو ہیں۔ اگر شریعت جسم ہے تو عشق اس کی روح ہے اور اگر علم روشنی ہے تو ادب اس روشنی کی خوشبو۔ اسی لیے ان کی شخصیت میں ہمیں ایک عجیب جامعیت دکھائی دیتی ہے......وہ فقیہ بھی ہیں اور عاشق بھی، محدث بھی ہیں اور نعت گو بھی، مناظر بھی ہیں اور صاحب حال درویش بھی۔ شاید یہی جامعیت انہیں اپنے عہد کے دیگر علماء سے ممتاز کرتی ہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی بشارت محض ایک آنے والی شخصیت کا تعارف نہ تھی بلکہ ایک ایسے "چراغِ ہدایت" کی خبر تھی جسے اللہ تعالیٰ نے فتنوں کی تاریکی میں امت کے ایمان کی حفاظت کے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔

اور جب وہ چراغ روشن ہوا تو اس کی لو میں عقیدہ بھی جگمگایا، محبت بھی مشکبار ہوئی، ادب بھی زندہ ہوا اور اہلِ سنّت کا روحانی تشخص بھی ایک نئے جلال اور جمال کے ساتھ نمایاں ہوگیا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہ وصیت نامہ محض چند جملوں پر مشتمل ایک تاریخی تحریر نہیں بلکہ صدیوں کے فاصلے سے آنے والی ایک روحانی صدا ہے......ایک ایسی صدا جس میں امت کے مستقبل کی دھندلی راہوں کا شعور بھی ہے، فتنوں کے اندھیروں کی خبر بھی اور ان اندھیروں میں روشن ہونے والے چراغِ حق کی بشارت بھی۔

یہ وصیت نامہ اپنے اندر تاریخ کی سنجیدگی، روحانیت کی لطافت، بصیرتِ ایمانی کی گہرائی اور عشقِ رسول ﷺ کی حرارت کو اس طرح

سموئے ہوئے ہے کہ قاری محض ایک واقعہ نہیں پڑھتا بلکہ ایک پورے روحانی وفکری عہد کی دھڑکن محسوس کرنے لگتا ہے۔

یوں لگتا ہے جیسے ایک صاحب دل ہستی صدیوں پہلے ہی وقت کے پردوں کے اُس پار کھڑی ہوئی ایک عظیم شخصیت کو دیکھ رہی ہو......ایک ایسا مردِ حق جو فتنوں کے ہجوم میں علم، عشق، ادب اور استقامت کا چراغ بلند کرے گا۔

تاریخ نے جب اپنے اوراق کھولے تو واقعی امامِ اہلِ سنّت، اعلیٰ حضرت، امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ذات اس بشارت کی ایک زندہ تفسیر بن کر سامنے آئی۔

ان کی پوری زندگی اس حقیقت کی شاہد دکھائی دیتی ہے کہ جب امت فکری انتشار، روحانی کمزوری اور اعتقادی اضطراب کا شکار ہونے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کے ذریعے پھر حق کی روشنی کو تازہ فرما دیتا ہے۔

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے قلم سے صرف فتاوے نہیں لکھے بلکہ ایک بکھرتے ہوئے روحانی شعور کو پھر سے مرکزِ مصطفیٰ ﷺ کے گرد جمع کیا۔

انہوں نے عشقِ رسول ﷺ کو امت کے ایمان کی روح قرار دیا، محبتِ اہلِ بیت رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو دلوں کی زینت بنایا، صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی عظمت کو عقیدے کی بنیاد کے طور پر محفوظ رکھا اور شریعت وطریقت کے اس حسین امتزاج کو زندہ کیا جو اہلِ سنّت کی اصل پہچان رہا ہے۔

ان کی تجدید صرف علمی نہ تھی بلکہ تہذیبی بھی تھی، روحانی بھی، اعتقادی بھی اور قلبی بھی۔ انہوں نے امت کو یہ احساس دلایا کہ دین محض ظاہری مباحث یا عقلی مناقشات کا نام نہیں بلکہ ادب، محبت، وابستگی اور روحانی وفاداری کی ایک زندہ کیفیت بھی ہے۔ اگر علم میں عشق کی حرارت نہ رہے تو وہ سرد منطق بن جاتا ہے اور اگر عشق شریعت کے دائرے سے جدا ہو جائے تو وہ محض جذباتی ہیجان رہ جاتا ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے انہی دونوں کے درمیان وہ حسین توازن قائم کیا جو صدیوں سے اہلِ سنّت کا امتیاز رہا ہے۔ اسی لیے آج ایک صدی گذر جانے کے باوجود ان کا نام محض تاریخ کا حصہ نہیں بنا بلکہ ایک زندہ روحانی وفکری تاثیر کی صورت میں دلوں میں دھڑکتا محسوس ہوتا ہے۔

ان کی نعتوں میں آج بھی عشق کی خوشبو محسوس ہوتی ہے، ان کے فتاوے میں آج بھی ایمان کی حرارت باقی ہے اور ان کی فکر میں آج بھی اہلِ سنّت کے تہذیبی و روحانی تشخص کی حفاظت کا وہی جذبہ موجزن دکھائی دیتا ہے۔ حضرت سید محمد صالح شاہ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی یہ پیش گوئی اسی لیے محض ایک حیرت انگیز تاریخی روایت نہیں بلکہ اہلِ دل کے نزدیک ایک روحانی شہادت کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اس حقیقت کا اعلان محسوس ہوتی ہے کہ حق کا چراغ کبھی بجھایا نہیں جا سکتا۔ فتنوں کی تاریکیاں خواہ کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو جائیں، اللہ تعالیٰ اپنے دین، اپنے محبوب ﷺ کے ادب اور امت کے ایمان کی حفاظت کے لیے ہر دور میں کچھ چراغ محفوظ رکھتا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ جب اندھیرا بڑھتا ہے تو انہی چراغوں کی روشنی سب سے زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔

□□□□

تہذیب زندگی کا تقاضا ہے کہ اختلاف کو دشمنی نہ بننے دیا جائے، گفتگو کو بدزبانی سے محفوظ رکھا جائے اور آزادیِ اظہار کو دوسروں کی عزتِ نفس کی پامالی کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ انسان کی اصل شرافت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اسے اختلاف کا حق بھی حاصل ہو اور احترام کا سلیقہ بھی۔

محمد ملک الظفر سہسرامی

محدثِ اعظمِ ہندامام احمد رضا کی بارگاہ میں

یہ اُس دور کی بات ہے جب روحانیت پر مادیت کا غلبہ ابھی نہیں ہوا تھا، جب دلوں میں عشقِ رسول ﷺ کی حرارت تیز، ایمان کی کیفیت تازہ اور نسبتوں کی پاس داری زندگی کا سرمایہ ہوا کرتی تھی۔ اُس زمانے میں دنیا آج کی طرح ایک مٹھی میں سمٹی ہوئی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ نہ گلوبلائزیشن کا یہ برق رفتار دور تھا، نہ ذرائعِ ابلاغ نے فاصلے مٹا دیے تھے، نہ سفر چند ساعتوں کا کھیل تھا۔ شہر، بستیاں اور ملک ایک دوسرے سے بہت دور تھے اور ان دوریوں کو طے کرنا محض راستوں کا سفر نہیں بلکہ صبر، مشقت اور عزم کا امتحان ہوا کرتا تھا۔

لوگ دور دراز کا سفر کرتے تو راستے ان کے قدموں سے سوال کرتے، منزلیں ان کے صبر کو آزماتیں اور سفر کی صعوبتیں ان کے ارادوں کو پرکھتیں۔ کہیں ریل کی محدود سہولت، کہیں بیل گاڑیوں کی سست رفتاری، کہیں پیدل راستوں کی گرد، کہیں اجنبی منزلوں کی بے یقینی، مگر علمِ دین کا شوق ایسا تھا کہ یہ تمام دشواریاں راستے کی رکاوٹ نہیں بلکہ طلبِ علم کی قیمت محسوس ہوتی تھیں۔ علم کے متلاشی اپنے گھروں سے نکلتے تو سہولتوں کی تلاش میں نہیں، حقیقت کی جستجو میں نکلتے تھے۔ ان کے لیے سفر کا مقصد منزل سے زیادہ اہم تھا اور منزل کی عظمت اس لیے تھی کہ وہاں کسی صاحبِ علم وفضل، کسی مردِ خدا، کسی وارثِ علومِ نبوّت کا آستانہ موجود تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب علمِ دین محض کتابوں کے اوراق میں محفوظ خزانہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اہلِ علم کی صحبت میں سانس لیتا ہوا ایک زندہ فیض تھا۔ کتابیں پڑھنے کے لیے تھیں مگر علم حاصل کرنے کے لیے اہلِ علم تک پہنچنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ کسی عالمِ ربانی کی ایک نگاہ، کسی بزرگ کی ایک مجلس، کسی فقیہ کے ایک جملے اور کسی محدث کی ایک دعا کو لوگ اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھتے تھے۔ فاصلے جسموں کو جدا کر سکتے تھے، دلوں کو نہیں اور راستے قدموں کو تھکا سکتے تھے، طلب کو نہیں۔

اسی روحانی ماحول میں جب علم وفضل، عشق ومحبت، فقہ وبصیرت اور نسبت وولایت کا ایک آفتاب ہندستان کے افق پہ طلوع ہوا تو دور دور سے پروانے اس کی روشنی کی طرف کھنچے چلے آنے لگے۔ یہ آفتابِ علم تھا، یہ چراغِ عشق تھا، یہ فقہ وفتویٰ کا منبع تھا، یہ عشقِ رسول ﷺ کا ترجمان تھا۔

بریلی شریف کی خاک اُس زمانے میں صرف ایک شہر کی خاک نہ تھی، وہ علم کے پیاسوں کے لیے ایک منزل، عاشقانِ رسول ﷺ کے لیے ایک مرکز اور طالبانِ حق کے لیے ایک ایسی بارگاہ تھی جہاں پہنچنے کے بعد مسافتیں ختم نہیں ہوتیں بلکہ نسبتوں کے نئے سفر شروع ہوتے تھے۔ ہندستان کے دور افتادہ علاقوں سے لوگ اس آستانۂ علم و عشق کی طرف روانہ ہوتے۔ کسی کے پاس سواری کی سہولت نہ تھی، کسی کے پاس وقت کی فراوانی نہ تھی، کسی کے لیے سفر آسان نہ تھا مگر دل میں ایک یقین تھا کہ جس دروازے پر پہنچنے کے لیے قدم اٹھائے ہیں، وہاں پہنچ کر یہ تمام مشقتیں نعمت بن جائیں گی۔

یہ اُس دور کی بات ہے جب ایک عالم کی عظمت کا اندازہ اس کے گرد جمع ہونے والے ہجوم سے نہیں بلکہ اس کے علم کی گہرائی، اس کی نسبت کی پاکیزگی اور اس کے فیض کی وسعت سے کیا جاتا تھا۔ لوگ

اہلِ علم کے پاس محض سوالات لے کر نہیں جاتے تھے، اپنے دل بھی لے کر جاتے تھے۔ انہیں فتویٰ بھی چاہیے ہوتا تھا اور رہنمائی بھی، مسئلہ بھی درکار ہوتا تھا اور نسبت بھی۔ وہ جانتے تھے کہ علم جب عشق سے منور ہو تو محض معلومات نہیں رہتا، بصیرت بن جاتا ہے اور جب بصیرت نسبتِ رسول ﷺ سے ہم رشتہ ہو جائے تو وہ ایک ایسی روشنی بن جاتی ہے جو زمانوں کے اندھیروں کو چیر دیتی ہے۔

چنانچہ اس دور کے اہلِ علم کے لیے لمبے سفر کی صعوبتیں ناقابلِ برداشت نہیں تھیں۔ وہ ان کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے تھے، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ علم کی ایک مجلس تک پہنچنے کے لیے اٹھایا گیا ہر قدم محض زمین پہ نہیں پڑتا، دل کی دنیا میں بھی ایک نئی راہ بناتا ہے۔ وہ اپنے گھروں سے نکلتے تھے تو راستوں کی دشواریوں کو نہیں گنتے تھے، ان کے سامنے وہ شخصیت ہوتی تھی جس کی خدمت میں حاضری خود ایک سعادت تھی، جس کی مجلس علم کا مدرسہ بھی تھی اور روحانیت کا مکتب بھی۔

اور پھر جب یہی سفر کسی ایسے مردِ حق کی بارگاہ تک لے جاتا جس کے سینے میں علومِ قرآن وحدیث کا سمندر موج زن ہو، جس کی زبان پہ عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی خوشبو ہو، جس کے قلم میں شریعت کی قوت اور جس کے دل میں نسبتِ رسول ﷺ کی تڑپ ہو، تو سفر کی تمام صعوبتیں ایک لمحے میں اتر جاتی تھیں۔

ایسے ہی ایک دور میں، ایسے ہی ایک جذبے کے ساتھ، ایک صاحبِ علم ومحبت نے محدثِ اعظم ہند، امامِ عشق ومحبت، مجددِ دین و ملت، امام احمد رضا قادری برکاتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کیا۔ یہ محض ایک سفر نہ تھا یہ علم کی تلاش کا سفر تھا، یہ نسبت کی جستجو کا سفر تھا، یہ اُس چراغ کی طرف سفر تھا جس کی روشنی نے اپنے عہد کے فکری، اعتقادی اور روحانی اندھیروں کو منور کیا اور جس کا فیض آج بھی دلوں کو ایمان، محبت اور وفا کی راہ دکھا رہا ہے۔ یہ سفر دراصل ایک انسان کا ایک عظیم شخصیت تک پہنچنا نہیں تھا، یہ ایک طالبِ حق کا اُس سرچشمۂ علم وعشق تک پہنچنا تھا جہاں کتابیں بولتی تھیں، نسبتیں سانس لیتی تھیں اور عشقِ رسول ﷺ ایک زندہ حقیقت کی صورت میں جلوہ گر تھا۔

دہلی، لکھنؤ، کانپور، بدایوں، اجمیر اور بریلی، یہ وہ شہر تھے جہاں اُس عہد میں علم وفضل کی مسندیں بچھتی تھیں، جہاں علومِ دینیہ کے چراغ روشن تھے، جہاں مدارس کی فضا میں قرآن وحدیث کی صدائیں گونجتی تھیں اور جہاں مقتدر علمائے کرام اپنی اپنی مسندِ تدریس پہ بیٹھ کر نسلوں کی علمی وفکری تربیت فرما رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علم صرف کتابوں میں نہیں، شخصیتوں میں زندہ تھا، جب درس گاہیں محض تعلیم گاہیں نہیں بلکہ تہذیب، نسبت اور روحانی تربیت کے مراکز بھی ہوا کرتی تھیں۔

انہی علمی مراکز میں ایک دن خاتم المحدثین حضرت علامہ مولانا وصی احمد محدث سورتی علیہ الرحمۃ والرضوان کی بزمِ تدریس سجی ہوئی تھی۔ طلبہ زانوئے ادب تہہ کیے بیٹھے تھے۔ فضا میں سکوت تھا مگر یہ ایسا سکوت تھا جس میں علم کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ سامنے استادِ محترم تشریف فرما تھے اور ان کی فیض ترجمان زبان سے احادیثِ نبویہ کا درس جاری تھا۔ عشقِ رسول ﷺ سے تازہ وشاداب زبان جب کلامِ نبوی کے معارف ومعانی کے موتی لٹاتی تو محسوس ہوتا کہ حدیث کی کتاب کھلی نہیں، بلکہ مدینہ منورہ کی ہوائیں اس بزم میں اتر آئی ہیں۔ کبھی کوئی حدیث زیرِ بحث آتی، کبھی اس کے الفاظ کے اسرار کھلتے، کبھی اس کے معانی کے افق وسیع ہوتے اور کبھی محدث سورتی علیہ الرحمۃ کے لہجے میں عشقِ رسول ﷺ کی ایسی حرارت پیدا ہو جاتی کہ درسِ حدیث، درسِ محبت بن جاتا۔

اسی اثنائے گفتگو، کسی مناسبت سے، کسی علمی نکتے کے ضمن میں یا کسی روحانی کیفیت کے زیرِ اثر، اعلیٰ حضرت سیدی امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا تذکرہ آ جاتا۔ یہ تذکرہ رسمی نہ ہوتا، محض نام لینے کی حد تک نہ ہوتا بلکہ ایسا محسوس ہوتا کہ محدث سورتی علیہ الرحمۃ کے دل میں اعلیٰ حضرت کی یاد کسی روشن چراغ کی طرح ہمیشہ فروزاں ہے اور گفتگو کا کوئی نہ کوئی راستہ بالآخر اسی چراغ تک پہنچ جاتا ہے۔

یہ بھی بارہا ہوا کہ درسِ حدیث کے دوران کسی زاویے سے محدث سورتی علامہ وصی احمد علیہ الرحمۃ کی زبان پہ اعلیٰ حضرت کا تذکرۂ جمیل آ گیا۔ کبھی ایک علمی مسئلے کے حوالے سے، کبھی کسی حدیث شریف

کے نکتے کی توضیح میں، کبھی کسی واقعے کی مناسبت سے اور کبھی محض اس لیے کہ دل میں جس شخصیت کی عظمت رچی بسی ہو، زبان کو اس کے تذکرے کے لیے کسی خاص بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

آج بھی امامِ عشق ومحبت، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ذکر آیا تو محدثِ سورتی رطب اللسان ہو گئے۔ ان کی گفتگو میں محبت تھی، لہجے میں عقیدت تھی اور الفاظ میں ایک ایسی کیفیت تھی جسے صرف وہی سمجھ سکتا تھا جس نے کسی عظیم شخصیت کو محض کتابوں میں نہیں، دل کی آنکھوں سے بھی دیکھا ہو۔

لیکن آج اس درس گاہ میں بیٹھا ہوا ایک کم عمر طالب علم اپنے تجسس کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ سوال اس کے ذہن میں کئی دنوں سے کروٹیں لے رہا تھا۔ وہ اپنے محترم استاذ کی زبان سے اعلیٰ حضرت کا بار بار تذکرہ سنتا تھا، ان کی محبت کا والہانہ انداز دیکھتا تھا مگر اس کے ذہن میں ایک سوال مسلسل گردش کر رہا تھا۔

آخر کار اس نے ادب کے تمام تقاضوں کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے عرض کرنے کی اجازت طلب کی۔ شفیق استاذ نے خموش لہجے میں اجازت مرحمت فرمائی۔

شاگردِ رشید نے مؤدبانہ انداز میں عرض کیا: ''حضور گستاخی معاف! مجھے ایک بات آج سمجھ میں نہ آسکی۔ میں نے سنا تھا کہ ''جو جس کا کھاتا ہے اسی کا گاتا ہے''۔ آپ کے تعلق سے مجھے علم ہے کہ آپ کو شرفِ بیعت حاصل ہے حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی سے لیکن آج تک آپ کی زبان سے ان کا تذکرۂ جمیل میرے ان کانوں نے نہیں سنا۔ البتہ امامِ عشق ومحبت اعلیٰ حضرت کا خطبہ آپ خوب والہانہ انداز میں پڑھتے ہیں۔''

یہ سوال بظاہر ایک طالب علم کا سوال تھا مگر اس کے پسِ پشت ایک پورا ذہنی تجسس کارفرما تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر وہ کیا راز ہے جس نے ایک جلیل القدر محدث کے دل کو اعلیٰ حضرت کی محبت سے اس طرح وابستہ کر دیا ہے کہ درسِ حدیث کے دوران بھی ان کا ذکر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے۔

شاگرد کے اس سوال پر محدثِ سورتی علامہ وصی احمد علیہ الرحمۃ نے جو جواب مرحمت فرمایا، وہ اگر اعلیٰ حضرت کے مقامِ علمی وفکری کے تعین میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے تو وہیں اس جواب نے شاگرد کے دل میں لگی ہوئی تجسس کی آگ کو سرد کرنے کی بجائے مزید بھڑکا دیا۔

محدثِ سورتی نے فرمایا: ''جب میں نے پیر ومرشد سے بیعت کی تھی با ایں معنیٰ مسلمان تھا کہ میرا سارا خاندان مسلمان کا خاندان سمجھا جاتا تھا۔ مگر جب اعلیٰ حضرت سے ملنے لگا تو ایمان کی حلاوت مل گئی۔ اب میرا ایمان وہبی نہیں بلکہ بعونہ تعالیٰ حقیقی ہے۔ جس نے حقیقی ایمان بخشا اس کی یاد سے اپنے دل کو تسکین دیتا رہتا ہوں''۔

یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے ایک محدث بول رہا تھا مگر محسوس ہوتا تھا کہ الفاظ کے پیچھے ایک پورا دل بول رہا ہے۔ ایک ایسے دل کی آواز، جس نے علم کے بہت سے آفتاب دیکھے تھے، جس نے حدیث کے بے شمار اسفار طے کیے تھے، جس نے اپنے عہد کے بڑے بڑے اہلِ علم کی صحبتیں پائی تھیں مگر جس کی روحانی زندگی میں اعلیٰ حضرت کی صحبت اور نسبت نے ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی جسے وہ ''ایمان کی حلاوت'' سے تعبیر کر رہا تھا۔ شاگرد اپنے تأثرات کا اظہار کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں: ''حضرت کا اندازِ بیان اور چشمِ پرنم، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ واقعی ''ولی را ولی می شناسد اور عالم را عالم می داند''۔''

مگر یہ جواب بھی اس طالبِ علم کے تجسس کو پوری طرح مطمئن نہ کر سکا۔ ایک سوال کا جواب ملا تھا، مگر اس جواب نے کئی نئے سوالات پیدا کر دیے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر ایک جلیل القدر محدث، علمِ حدیث کے شناور، ایک ایسے عالمِ دین کے بارے میں یہ کیفیت رکھتے ہیں تو پھر علم کے میدان میں اعلیٰ حضرت کا مقام آخر کہاں ہے؟

چنانچہ شاگرد پھر مؤدبانہ انداز میں عرض گذار ہوئے: ''حضور علم الحدیث میں کیا وہ آپ کے برابر ہیں؟''

محدثِ سورتی نے فرمایا: ''ہرگز نہیں۔''

پھر فرمایا: ''شہزادے صاحب! آپ کچھ سمجھے کہ ہرگز نہیں کا کیا مطلب ہے؟ سنیے کہ اعلیٰ حضرت امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔ میں سالہا سال صرف اس فن میں تلمذ کروں تو بھی ان کا پاسنگ نہ ٹھہروں

گا۔“

یہ صرف ایک عالم کا دوسرے عالم کے بارے میں تعریفی جملہ نہیں تھا۔ یہ علمِ حدیث کے ایک عظیم شناسا کی زبان سے علمِ حدیث کے ایک عظیم امام کی علمی عظمت کا اعتراف تھا۔ یہ عقیدت کا ایسا اظہار تھا جس کے پیچھے علم کی گواہی موجود تھی اور یہ گواہی کسی عام شخص کی نہیں، خاتم المحدثین حضرت علامہ وصی احمد محدث سورتی علیہ الرحمۃ والرضوان کی تھی۔ محدثِ سورتی نے اعلیٰ حضرت کو صرف اپنا محبوب نہیں پایا تھا، انہوں نے انہیں علم کا امام بھی پایا تھا۔ انہوں نے صرف ان کی محبت نہیں کی تھی، ان کے علم کے سامنے اپنے علم کی عظمت کو بھی جھکا ہوا پایا تھا۔ اسی لیے ان کے الفاظ میں محبت بھی تھی، عقیدت بھی، معرفت بھی اور علمی اعتراف بھی۔ اور شاید یہی وہ مقام ہے جہاں کسی شخصیت کی عظمت کے بارے میں سب سے بڑی شہادت اس کے مداح نہیں، اس کے اہلِ فن دیتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مقامِ حدیث پہ محدثِ سورتی کا یہ اعتراف اسی نوع کی ایک ایسی شہادت ہے جس میں محبت کی حرارت بھی ہے اور علم کی عدالت بھی۔ ایک طرف ایک کم عمر طالبِ علم کا سوال تھا، دوسری طرف ایک جلیل القدر محدث کا جواب اور ان دونوں کے درمیان جو حقیقت جلوہ گر ہوئی، وہ یہ تھی کہ علم کی دنیا میں بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے مقام کا اندازہ ان کے شاگردوں سے نہیں، ان کے ہم عصر اکابر کے اعترافات سے ہوتا ہے۔

اور جب علمِ حدیث کا ایک امام یہ کہہ دے کہ: ”اعلیٰ حضرت امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔ میں سالہا سال صرف اس فن میں تلمذ کروں تو بھی ان کا پاسنگ نہ ٹھہروں گا۔“

تو پھر یہ جملہ محض ایک قول نہیں رہتا، تاریخِ علم کا ایک روشن باب بن جاتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے علمی مقام و مرتبے کا یہ خطبہ جب آپ نے اپنے استاذِ محترم اور وقت کے عظیم محدث کی زبانِ فیض ترجمان سے اس انداز میں سنا تو دل میں ایک نئی بے قراری پیدا ہوئی۔ اب اعلیٰ حضرت صرف ایک نام نہ رہے تھے، وہ ایک ایسی عظیم علمی و روحانی شخصیت بن چکے تھے جن کی طرف دل خود بخود کھنچنے لگا تھا۔ جس شخصیت کے بارے میں ایک جلیل القدر محدث یہ کہہ رہا ہو کہ وہ ”امیر المومنین فی الحدیث“ ہیں، جس کے سامنے علمِ حدیث کا ایک امام اپنے آپ کو ”پاسنگ“ نہ سمجھتا ہو، اس شخصیت کی زیارت کا شوق آخر کس دل میں پیدا نہ ہوتا؟

محدثِ سورتی حضرت علامہ وصی احمد علیہ الرحمۃ کی بارگاہ میں اپنے تجسس کا اظہار کرنے والے یہ طالبِ علم کوئی اور نہیں، حضرت علامہ سید محمد اشرفی کچھوچھوی، محدثِ اعظمِ ہند علیہ الرحمۃ والرضوان تھے۔

اور اب جب کہ دل میں اعلیٰ حضرت کی زیارت کا شوق بیدار ہو چکا تھا، تو قدموں کو بریلی شریف کی راہ دکھائی دینے لگی۔

اور اب......اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں

اور اب جب کہ دل میں اعلیٰ حضرت کی زیارت کا شوق بیدار ہو چکا تھا، تو قدموں کو بریلی شریف کی راہ دکھائی دینے لگی۔ یہ سفر محض ایک شہر کی طرف سفر نہ تھا؛ یہ اُس سرچشمۂ علم و عشق کی طرف سفر تھا جس کا ذکر ایک جلیل القدر محدث کی زبان سے سن کر دل میں ایمان کی حلاوت کا احساس جاگا تھا۔ جس شخصیت کو ایک امامِ حدیث نے ”امیر المومنین فی الحدیث“ کہا ہو، جس کے سامنے علم کا ایک آفتاب اپنے آپ کو ”پاسنگ“ نہ سمجھتا ہو، اُس کی بارگاہ تک پہنچنے کی آرزو اب ایک آرزو نہ رہی تھی؛ وہ دل کی ضرورت بن چکی تھی۔

حضرت علامہ سید محمد اشرفی کچھوچھوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اُس وقت علم کے شہر لکھنؤ میں آٹھ برس گذار چکے تھے۔ لکھنؤ کی علمی فضا، اس کی تہذیبی نزاکتیں، اس کے بازاروں کی رونقیں اور وہاں کی معاشرتی عادتیں ان کی طبیعت میں کچھ نہ کچھ جگہ بنا چکی تھیں۔ عمر بھی زیادہ نہ تھی، جوانی کی دہلیز ابھی تازہ تھی اور علم و تربیت کے اس نورانی سفر کا آغاز ابھی ہوا ہی تھا۔ مگر بریلی شریف میں داخل ہوتے ہی اُن کے سامنے ایک ایسی شخصیت تھی جس کی تربیت صرف درس گاہ کے اندر نہیں ہوتی تھی؛ جس کی نظر انسان کے ظاہر سے گذر کر اس کے باطن تک پہنچتی تھی۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہاں تربیت محض وعظ و نصیحت کا نام نہ تھی۔ وہ کبھی ایک جملے سے دل کا رخ بدل دیتے، کبھی ایک نظر سے زندگی کی سمت متعین کر دیتے اور کبھی ایسا واقعہ

پیش آتا کہ انسان برسوں بعد بھی سوچتا رہتا کہ اُس وقت جو کچھ ہوا، وہ محض ایک اتفاق تھا یا کسی مردِ خدا کی نگاہِ تربیت کا ایک خموش کرشمہ۔

جمعہ کا دن تھا۔ درس گاہ کے معمولات میں نسبتاً فراغت کا دن۔ حضرت محدثِ اعظم ہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے پہلے ہی ذہن میں ایک منصوبہ بنا رکھا تھا۔ بریلی شریف کا جغرافیہ لوگوں سے دریافت کر لیا تھا۔ بازار دیکھنے تھے، کتب خانوں کی سیر کرنی تھی اور شہر کی کچھ رونقوں سے آشنا ہونا تھا۔ مگر جس شہر میں اعلیٰ حضرت کی بارگاہ موجود ہو، وہاں ایک طالبِ علم کی اپنی منصوبہ بندی کہاں تک چل سکتی تھی؟

نمازِ جمعہ کے لیے انہوں نے مسجد کی پچھلی صف کا انتخاب کیا۔ شاید دل میں یہ خیال تھا کہ خموشی سے نماز ادا ہوگی اور کسی کی نگاہ میں آئے بغیر واپس لوٹ جائیں گے۔ نماز مکمل ہوئی، دعائیں ہوئیں۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے لوگوں سے حضرت محدثِ اعظم ہند کا نام لے کر دریافت فرمایا۔ بریلی میں وہ ابھی نووارد تھے، اس لیے حاضرین میں سے کوئی ان سے واقف نہ تھا۔ لوگ ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔

پھر اچانک اعلیٰ حضرت خود اپنی جگہ سے اٹھے۔ یہ ایک معمولی سا قیام نہ تھا۔ یہ اُس امامِ علم وعشق کا قیام تھا جس کے سامنے بڑے بڑے اہلِ علم ادب سے بیٹھتے تھے۔ آپ مسجد کے دروازے کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں حضرت محدثِ اعظم ہند کو دیکھ لیا۔ پھر مصلے سے اٹھ کر صفِ آخر تک تشریف لائے اور ان سے مصافحہ فرمایا۔

یہ منظر دیکھنے والوں کے لیے شاید حیرت کا منظر تھا، مگر حضرت محدثِ اعظم ہند کے لیے یہ ایک ایسی کیفیت تھی جس نے وجود کو لرزا دیا۔ اعلیٰ حضرت نے مصافحے سے آگے بڑھنے کا ارادہ فرمایا تو وہ فرماتے ہیں: ''میں تھرا کر گر پڑا۔''

یہ صرف جسم کا لرزنا نہ تھا۔ یہ ایک طالبِ علم کا اپنے امام کے سامنے پگھل جانا تھا۔ یہ اُس دل کی کیفیت تھی جس نے ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے اپنے استادِ حدیث کی زبان سے اعلیٰ حضرت کی عظمت کا خطبہ سنا تھا اور آج وہی عظمت مجسم صورت میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اعلیٰ حضرت واپس مصلے پر تشریف لے گئے اور سنن ونوافل ادا فرمانے لگے۔ مسجد میں موجود ہر شخص نے یہ منظر دیکھا۔ لوگ حیران تھے کہ آخر یہ نووارد کون ہے جس کے استقبال کے لیے امامِ وقت خود صفِ آخر تک تشریف لے گئے۔ مگر شاید اس منظر کا اصل راز صرف دو دل جانتے تھے: ایک وہ دل جو اپنے آنے والے فیض کے امین کو پہچان چکا تھا، اور دوسرا وہ دل جو ابھی اپنے مقدر میں لکھی جانے والی نسبت کے سامنے بے خبر کھڑا تھا۔

مگر اعلیٰ حضرت کی تربیت کا یہ پہلا سبق ابھی مکمل نہ ہوا تھا۔

حضرت محدثِ اعظم ہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بازار اور کتب خانے کی سیر کا ارادہ کر رکھا تھا۔ شام ہوئی تو وہ اپنے منصوبے کے مطابق نکلے۔ شہادت گنج کے موڑ پر پہنچے۔ پان کھانے کی خواہش ہوئی۔ ابھی پان والے سے کچھ کہہ بھی نہ پائے تھے کہ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں: ''السلام علیکم! آیئے، آیئے!''

ہر طرف سے سلام، ہر طرف سے مصافحہ، ہر طرف سے محبت۔ حضرت محدثِ اعظم ہند کو ہر سلام کا جواب دینا پڑا۔ پان والے کی دکان کے سامنے کھڑا ہونا بھی دشوار ہو گیا۔ جو شخص خموشی سے بازار کی سیر کے لیے نکلا تھا، وہ چند ہی لمحوں میں لوگوں کے درمیان گھر چکا تھا۔

ایک ایک مصافحہ جیسے ایک ایک پردہ اٹھا رہا تھا۔

ایک ایک سلام جیسے ایک ایک پرانی عادت سے رخصت کرا رہا تھا۔ اور پھر وہ بازار کی سیر، وہ پان کی خواہش، وہ کتب خانے کی طرف جانے کا منصوبہ، سب کچھ وہیں رہ گیا۔

حضرت محدثِ اعظم ہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ:
''سلام ومصافحہ کی برکت نے میرا سارا پروگرام ختم کر دیا۔''

اور پھر وہ تاریخی جملہ فرماتے ہیں: ''وہ دن ہے اور آج کا دن ہے کہ بریلی کا ذکر نہیں، کلکتہ، بمبئی، مدراس میں بھی پا پیادہ نہیں بلکہ موٹر میں بیٹھ کر بھی سیدھے بازار کی طرف نہیں نکلا۔''

یہ تھا اعلیٰ حضرت کا تربیتی انداز۔ نہ کوئی طویل نصیحت، نہ کوئی سخت وعظ، نہ کوئی حکم، نہ کوئی ملامت۔ صرف ایک سلام۔ صرف ایک مصافحہ۔ اور ایک ایسے شہر میں چند قدم کی آمد و رفت، جہاں ہر شخص اس نووارد کو دیکھ کر سلام کرنے کے لیے بے تاب تھا۔

مگر اس سلام کے پیچھے صرف لوگوں کی عقیدت نہ تھی، اس کے پیچھے ایک مردِ حق کی نگاہِ تربیت کارفرما تھی۔ اعلیٰ حضرت نے شاید یہ نہیں کہا کہ بازاروں میں نہ جاؤ، فضول مشاغل سے بچو، اپنی زندگی کو مقصد سے وابستہ کرو۔ انہوں نے اس سے کہیں زیادہ مؤثر کام کیا۔ انہوں نے اپنے محبوب طالبِ علم کو ایک ایسی فضا میں چھوڑ دیا جہاں ہر قدم پر نسبت سامنے آتی تھی، ہر چہرے پر محبت دکھائی دیتی تھی اور ہر سلام اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اب تم اُس شہر میں ہو جہاں علم محض کتابوں میں نہیں، لوگوں کے رویوں میں بھی سانس لیتا ہے۔ لکھنؤ کی خوبو ایک دن میں نہیں گئی تھی مگر بریلی شریف کی ایک سلام و مصافحہ کی برکت نے اُس کی سمت ضرور بدل دی۔

یہ اعلیٰ حضرت کی تربیت تھی۔ وہ تربیت جو لفظوں سے کم اور نسبتوں سے زیادہ ہوتی تھی۔ وہ تربیت جس میں حکم کم اور ماحول زیادہ بولتا تھا۔ وہ تربیت جس میں انسان کو کسی چیز سے زبردستی نہیں روکا جاتا تھا بلکہ اس کے دل میں کسی بلند تر چیز کی محبت پیدا کر دی جاتی تھی۔ اور جب دل کسی بلند نسبت سے آباد ہو جائے تو بہت سی پست رغبتیں خود بخود بے معنی ہو جاتی ہیں۔

حضرت محدثِ اعظم ہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے لیے بریلی شریف کا یہ پہلا سبق یہی تھا کہ اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں آنے والا صرف علم حاصل نہیں کرتا، وہ اپنی زندگی کا مزاج بھی بدلتا ہے۔

وہ صرف کتابیں نہیں پڑھتا، وہ نسبتیں پڑھتا ہے۔ وہ صرف مسائل نہیں سیکھتا، وہ ادب سیکھتا ہے۔ وہ صرف علم کا طالب نہیں رہتا، وہ علم کے آداب کا امین بن جاتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ محدثِ اعظم ہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بعد میں اس واقعے کو محض ایک واقعہ کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ اسے اعلیٰ حضرت کی تربیت کے ایک ایسے ''انوکھے اور پیارے انداز'' کے طور پر یاد کیا جس نے ایک سلام اور ایک مصافحے کے ذریعے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ یہ اعلیٰ حضرت کی بارگاہ تھی۔ یہاں لوگ صرف حاضر نہیں ہوتے تھے بدل کر لوٹتے تھے، یہاں صرف سوالوں کے جواب نہیں ملتے تھے، زندگی کے سوال بدل جاتے تھے اور یہاں کبھی کبھی ایک مصافحہ بھی ایک پوری تربیتی کتاب بن جاتا تھا۔

محدثِ اعظمِ ہند علیہ الرحمہ اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں محض ایک طالبِ علم کی حیثیت سے حاضر نہیں ہوئے تھے۔ ان کا مقصد تربیتِ افتاء تھا۔ وہ اس دروازے پر فقہ و فتویٰ کے اسرار سیکھنے آئے تھے، اس فقیہِ اعظم کے سامنے بیٹھنے آئے تھے جس کے قلم سے شریعت کے مشکل ترین مسائل کے فیصلے صادر ہوتے تھے۔ مگر بعض بارگاہیں ایسی ہوتی ہیں جہاں انسان ایک مقصد لے کر داخل ہوتا ہے اور وہاں سے ایک پوری کائنات لے کر واپس آتا ہے۔

محدثِ اعظمِ ہند علیہ الرحمہ بھی تربیتِ افتاء کے لیے آئے تھے مگر اعلیٰ حضرت کی تعلیم و تربیت نے ان کے وجود پر ایسا رنگ چڑھایا کہ پھر زندگی کے باقی سارے رنگ اس کے سامنے پھیکے پڑتے نظر آئے۔ وہ فتویٰ سیکھنے آئے تھے، مگر علم کی روح پا گئے، وہ فقہ کے مسائل سمجھنے آئے تھے مگر ایمان کی حلاوت سے آشنا ہو گئے، وہ ایک فقیہ کی مجلس میں حاضر ہوئے تھے مگر ایک ایسی شخصیت کے سامنے بیٹھ گئے جہاں علم، ایمان، تزکیہ اور نسبت ایک ہی حقیقت کے مختلف جلوے بن کر سامنے آتے تھے۔ اسی لیے بعد میں محدثِ اعظمِ ہند علیہ الرحمہ نے اپنی اس حاضری کو محض تعلیمی سفر نہیں سمجھا، بلکہ اسے اپنی پوری زندگی کا سرمایہ قرار دیا: ''زندگی کی یہی گھڑیاں میرے لیے سرمایۂ حیات ہوگئیں اور میں محسوس کرنے لگا کہ آج تک جو کچھ پڑھا تھا وہ کچھ نہ تھا اب ایک دریائے علم کے ساحل کو پالیا ہے۔ علم کو راسخ فرمانا اور ایمان رگ وپے میں اتار دینا اور صحیح علم دے کر نفس کا تزکیہ فرما دینا کرامت تھی جو ہر منٹ پر صادر ہوتی رہتی تھی۔''

یہ وہ کیفیت تھی جو صرف کسی مدرسے میں داخل ہونے سے پیدا نہیں ہوتی، یہ کسی ایسے مربی کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے جس کے علم میں رسوخ ہو، جس کے ایمان میں حرارت ہو اور جس کی نگاہ انسان کے ظاہر سے گذر کر اس کے باطن کی اصلاح تک پہنچتی ہو۔ حضرت محدثِ اعظمِ ہند علیہ الرحمہ نے اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں فقہ و افتاء کی تربیت حاصل کی، مگر اس تربیت کا دائرہ صرف مسائل کے جوابات مرتب کرنے تک محدود نہ تھا۔ وہاں فتویٰ لکھنا بھی سکھایا جاتا تھا اور فتویٰ

دینے والے کے اندر وہ تقویٰ پیدا کرنا بھی جس کے بغیر علم کبھی کبھی محض ذہنی مشق بن کر رہ جاتا ہے۔

اعلیٰ حضرت کا معمول تھا کہ عصر و مغرب کے درمیانی مختصر وقفے میں زیرِ تربیت مفتیانِ کرام سے فتوے سماعت فرماتے، مصنفین اپنی تصانیف پیش کرتے، زبانی سوال کرنے والے اپنے سوالات عرض کرتے اور یہ سب کچھ بیک وقت جاری رہتا۔ مختلف آوازیں، مختلف مسائل، مختلف کتابیں، مختلف سوالات، مگر ان سب کے درمیان ایک ہی ذات پوری توجہ کے ساتھ ہر سمت متوجہ ہوتی۔

یہ منظر کسی عام انسانی قوت کا منظر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ایک طرف مفتیانِ کرام اپنے مرتب کردہ فتاویٰ پیش کر رہے ہیں، دوسری طرف مصنفین اپنی تصانیف دکھا رہے ہیں، کہیں کوئی علمی مسئلہ زیرِ بحث ہے، کہیں کوئی شخص زبانی سوال لے کر حاضر ہے اور اس پورے ہجومِ مسائل و اصوات کے درمیان اعلیٰ حضرت کی ذات ہر آواز سن رہی ہے، ہر سوال کا جواب دے رہی ہے، ہر فتویٰ کی تصحیح و تصدیق فرما رہی ہے، ہر کتاب کے علمی مباحث پر گفتگو کر رہی ہے اور ہر غلطی کی اصلاح فرما رہی ہے۔ حضرت محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمہ نے یہ حیرت انگیز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر اسے یوں بیان فرمایا:

''عادت کریمہ تھی کہ استفتاء ایک ایک مفتی کو تقسیم فرماتے اور پھر ہم لوگ دن بھر محنت کر کے جوابات مرتب کرتے پھر عصر و مغرب کی درمیانی مختصر ساعت میں ہر ایک سے استفتاء پھر فتوے سماعت فرماتے اور بیک وقت سب کی سنتے۔ اسی وقت مصنفین اپنی تصانیف دکھاتے، زبانی سوال کرنے والوں کو بھی اجازت تھی کہ جو کہنا ہو کہیں، جو سنانا ہو سنائیں، اتنی آوازیں اور اس قدر جداگانہ باتیں اور صرف ایک ذات کو سب کی طرف توجہ فرمانا جوابات کی تصحیح و تصدیق مصنفین کی تائید و تصحیح واغلاط، زبانی سوالات کا تشفی بخش جواب عطا ہو رہا ہے۔''

یہ منظر دیکھنے کے لیے صرف آنکھیں کافی نہ تھیں، اس کے لیے علم کی آنکھ بھی درکار تھی۔ ایک عام آدمی شاید صرف یہ دیکھتا کہ ایک بزرگ کے گرد بہت سے لوگ جمع ہیں، ہر کوئی اپنی بات کہہ رہا ہے۔ مگر محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمہ نے اس منظر کے اندر علم کا وہ سمندر دیکھا جس میں بیک وقت کئی لہریں اٹھ رہی تھیں اور ایک ہی ذات ہر موج کو اس کے مقام تک پہنچا رہی تھی۔

یہی وہ مقام تھا جہاں محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمہ نے اعلیٰ حضرت کے تبحرِ علمی کو صرف کتابوں میں نہیں پڑھا، اپنی آنکھوں سے دیکھا، ان کی وسعتِ فکری کا صرف تذکرہ نہیں سنا، اس کا عملی مشاہدہ کیا، ان کی خداداد صلاحیت کے صرف قصے نہیں سنے، بلکہ ہر روز اپنی آنکھوں کے سامنے اس کے جلوے دیکھے۔

وہ دیکھتے تھے کہ ایک ہی لمحے میں مختلف علوم کے سوالات سامنے آتے ہیں، مگر اعلیٰ حضرت کی توجہ منتشر نہیں ہوتی۔ ایک طرف فقہی مسئلہ ہے، دوسری طرف حدیث کا نکتہ۔ ایک طرف کسی تصنیف کی علمی اصلاح ہے، دوسری طرف کسی سائل کے سوال کا جواب۔ ایک طرف مفتی کے فتویٰ کی تصحیح ہے، دوسری طرف مصنف کی کتاب پر علمی گفتگو۔ مگر علم کا یہ آفتاب ہر سمت یکساں روشنی دے رہا ہے۔

یہی وہ مشاہدات تھے جنھوں نے محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمہ کو اعلیٰ حضرت کا صرف شاگرد نہیں، گرویدہ بنا دیا۔ وہ پہلے اعلیٰ حضرت کے علم کا ذکر سنتے تھے، پھر ان کی مجلس میں بیٹھ کر اس علم کی وسعت دیکھنے لگے، پہلے ان کی عظمت کا اعتراف سنتے تھے، پھر اپنی آنکھوں سے اس عظمت کے جلوے دیکھنے لگے اور آخر کار وہ مقام آیا جب اعلیٰ حضرت کی ذات ان کے لیے صرف استاد نہ رہی، بلکہ علم، ایمان، محبت اور تربیت کا ایک مکمل عالم بن گئی۔ یہی تو اعلیٰ حضرت کی بارگاہ کا کمال تھا۔ وہاں علم صرف ذہن میں منتقل نہیں ہوتا تھا، دل میں اترتا تھا، وہاں فتویٰ صرف کاغذ پر نہیں لکھا جاتا تھا، کردار میں بھی لکھا جاتا تھا، وہاں مسائل کے جوابات کے ساتھ نفس کے سوالوں کا بھی جواب ملتا تھا۔ اور شاید اسی لیے محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمہ نے اعلیٰ حضرت کی مجلس میں گذارے ہوئے ان ایام کو اپنی زندگی کی سب سے قیمتی گھڑیاں قرار دیا۔ ان کے لیے یہ صرف تعلیم کا زمانہ نہ تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب علم نے ایمان سے ملاقات کی، فقہ نے روحانیت کا دامن تھاما اور ایک طالبِ علم نے اپنے سامنے ایک ایسے دریائے علم کا ساحل پا لیا جس کی وسعت کا اندازہ کرتے کرتے بھی عمر گذر سکتی تھی۔

تربیتِ افتاء کے لیے آنے والا یہ طالبِ علم آخر کار علمِ افتاء کا ماہر ہی نہیں بنا، اعلیٰ حضرت کی نسبت کا ایسا امین بنا کہ اس کی پوری زندگی خود اس تربیت کی ایک روشن شہادت بن گئی۔

فقہی جزئیات کا استحضار کارِ افتاء کی روح ہے۔ مسئلہ کا حکم جان لینا ایک بات ہے، مگر اس حکم کی اصل فقہی کتاب، اس کی عبارت، اس کے سیاق و سباق اور اس کے دقیق مقام تک بلا واسطہ رسائی رکھنا ایک بالکل دوسری بات۔ اہلِ فن جانتے ہیں کہ فتویٰ نویسی میں کبھی ایک لفظ کا فرق، ایک قید کا اضافہ یا ایک جزئیے کا درست محل پورے حکم کی جہت بدل دیتا ہے۔ اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو فقہی جزئیات پر جو عبور حاصل تھا، وہ محض کتبِ فقہ کے وسیع مطالعے کا نتیجہ نہ تھا، یہ ایک ایسا استحضار تھا جس کے سامنے کتابیں گویا کھلی ہوئی تھیں، صفحات اپنی جگہوں سے آشنا تھے اور عبارتیں اپنی سطروں سمیت حافظے میں محفوظ تھیں۔

حضرت محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمہ کی مشاہداتی آنکھ نے اس علمی کمال کے ایسے مناظر دیکھے تھے جنہیں پڑھ کر آج بھی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ کارِ افتاء کے دوران کبھی ایسا ہوتا کہ کسی مسئلے کے جواب کی تکمیل کے لیے فقہی جزئیے کی تلاش میں مفتیانِ کرام کتابوں کے اوراق پلٹتے پلٹتے تھک جاتے۔ کتابیں سامنے ہوتیں، مگر مطلوبہ عبارت کہیں نہ ملتی۔ تلاش جاری رہتی، وقت گذرتا، صفحات بدلتے، مگر جزئیہ ہاتھ نہ آتا۔ ایسے موقع پر اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں عرض کیا جاتا۔ اور پھر وہی ہوتا جسے دیکھ کر اہلِ علم بھی حیرت میں ڈوب جاتے۔

اعلیٰ حضرت فرماتے: ”ردالمحتار کی جلد فلاں کے صفحہ فلاں کی سطر فلاں میں ان لفظوں کے ساتھ جزئیہ موجود ہے۔ درمختار کے فلاں صفحہ کی فلاں سطر میں یہ عبارت ہے۔ عالمگیری میں بقید جلد و صفحہ و سطر یہ الفاظ موجود ہیں۔ ہندیہ میں، خیریہ میں ایک ایک کتاب فقہ کی اصلی عبارت بقید صفحہ و سطر ارشاد فرما دیتے۔“

پھر جب کتابیں کھولی جاتیں، صفحات دیکھے جاتے، سطریں تلاش کی جاتیں تو وہی عبارت اسی مقام پر موجود ہوتی جس کی نشان دہی اعلیٰ حضرت نے فرمائی ہوتی۔

”اب جو کتابوں میں جا کر دیکھتے تو صفحہ و سطر و عبارت وہی پاتے جو اعلیٰ حضرت نے فرمایا تھا۔“

یہ صرف حافظے کی قوت نہ تھی، یہ صرف مطالعے کی وسعت نہ تھی، یہ صرف فقہی کتابوں سے غیر معمولی شغف کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ ایک ایسا علمی استحضار تھا جس میں کتاب کا نام، جلد، صفحہ، سطر، عبارت اور اس کا فقہی محل، سب ایک ہی وقت میں ذہن کے سامنے موجود رہتے تھے۔

ایک مفتی کسی جزئیے کی تلاش میں کتاب کھولتا ہے، اعلیٰ حضرت کے سامنے جزئیہ خود کتاب کے مقام سمیت حاضر ہو جاتا تھا۔

ایک طالبِ علم عبارت تک پہنچنے کے لیے صفحات طے کرتا ہے، اعلیٰ حضرت عبارت کو اس کے صفحے اور سطر سمیت اپنی جگہ سے اٹھا کر سامنے رکھ دیتے تھے۔

یہی وہ منظر تھا جس نے حضرت محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمہ کو اعلیٰ حضرت کے علمی کمال پر غور کرنے کے لیے مجبور کیا۔ انہوں نے اس غیر معمولی استحضار کو محض حیرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا، بلکہ اس کے تقابل کے لیے حافظِ قرآن کی مثال سامنے رکھی۔ اور پھر اعلیٰ حضرت کے اس کمال پر جو تبصرہ فرمایا، وہ خود سیدی اعلیٰ حضرت کے تبحرِ علمی کا ایک ایسا شاندار خطبہ ہے جسے پڑھتے ہوئے علم بھی سر جھکا دیتا ہے اور حیرت بھی خاموش ہو جاتی ہے۔ حضرت محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

”اس کو آپ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت کو چودہ سو برس کی ساری کتابیں حفظ تھیں یہ چیز بھی اپنی جگہ حیرت انگیز ہے مگر میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ حافظ قرآن کریم نے سالہا سال قرآن عظیم کو پڑھ کر حفظ کیا روزانہ دہرایا ایک ایک دن میں بار بار دیکھا حافظ ہوا محراب سنانے کی تیاری میں سارا دن کاٹ دیا اور صرف ایک کتاب سے واسطہ رکھا حفظ کے بعد سالہا سال مشغلہ رہا۔ ہوسکتا ہے کہ کسی حافظ کو تراویح میں لقمے کی حاجت نہ پڑی ہو مگر ایسا دیکھا نہیں گیا اور ہوسکتا ہے کہ حافظ صاحب کسی آیت قرآنیہ کو سن کر اتنا یاد رکھیں کہ ان کے پاس جو قرآن کریم ہے اس میں یہ آیت کریمہ داہنی جانب ہے یا بائیں جانب ہے۔ گو یہ بھی بہت نادر چیز ہے مگر یہ تو عادتاً محال اور بالکل محال ہے کہ آیت قرآنیہ کے صفحہ و سطر کو بتایا جاسکے۔ تو کوئی

بتائے کہ تمام کتب متداولہ وغیر متداولہ کے ہر جملے کو بقید صفحہ وسطر بتانے کے لیے پورے اسلامی کتب خانے کا صرف حافظہ ہی ہے یا وہ اصلی کرامت کا نمونۂ ربانیہ ہے جس کے بلند مقام بیان کرنے کے لیے اب تک ارباب لغت واصطلاح لفظ بنانے سے عاجز رہے ہیں۔"

یہاں حضرت محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمہ نے ایک نہایت دقیق نکتہ بیان فرمایا ہے۔

حافظِ قرآن کریم ایک عظیم کتاب کو یاد کرتا ہے۔ برسوں اس کی تلاوت کرتا ہے، اسے دہراتا ہے، نمازوں میں پڑھتا ہے، تراویح میں سناتا ہے اور مسلسل اس کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔ اس کے باوجود کسی آیت کا قرآنِ کریم کے کس صفحے کی کس سطر میں ہونا، ایک معمول کی بات نہیں۔ تو پھر ایک ایسی شخصیت کا تصور کیجیے جس کے سامنے صرف ایک کتاب نہیں، پورا اسلامی کتب خانہ ہو۔ صرف ایک فن نہیں، علوم و فنون کا ایک وسیع عالم ہو۔ صرف متداول کتابیں نہیں، غیر متداول کتابیں بھی ہوں۔ اور پھر ہر کتاب کی عبارت، ہر جملہ، ہر جزئیہ، اس کے صفحے اور سطر کے ساتھ ذہن میں محفوظ ہو۔ یہاں حافظہ اپنی عام تعریف سے آگے نکل جاتا ہے، یہاں مطالعہ اپنی عام وسعت سے آگے نکل جاتا ہے، یہاں علم اپنے معمول کے پیمانوں سے بلند ہو کر ایک ایسی کیفیت اختیار کر لیتا ہے جس کے لیے خود محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمہ نے اعتراف کیا کہ اربابِ لغت واصطلاح بھی اس کے بلند مقام کو بیان کرنے کے لیے لفظ بنانے سے عاجز ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کے علمی مقام کو صرف کتابوں کی تعداد، تصانیف کی کثرت یا مسائل کے ذخیرے سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان کی عظمت اس بات میں بھی تھی کہ علم ان کے پاس محض محفوظ نہیں تھا، حاضر تھا۔

کتابیں ان کے لیے بند الماریوں میں رکھی ہوئی اشیا نہ تھیں، وہ ان کے حافظے میں زندہ تھیں، جزئیات ان کے لیے تلاش کی جانے والی چیزیں نہ تھیں، وہ ان کے علمی شعور کا حصہ تھیں، فقہی عبارات ان کے لیے محض نقل کرنے کے لیے موجود نہ تھیں، وہ ان کے ذہن میں اپنے اصل مقام، اپنے سیاق اور اپنی پوری علمی نسبت کے ساتھ محفوظ تھیں۔

یہی وہ منظر تھا جسے دیکھ کر محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمہ نے اعلیٰ حضرت کے علمی مقام کو عام پیمانوں سے ناپنے سے انکار کیا۔ اور جب علم کا ایک عظیم شناسا یہ کہہ دے کہ یہ صرف حافظے کا کمال نہیں بلکہ "اصلی کرامت کا نمونۂ ربانیہ" معلوم ہوتا ہے، تو پھر یہ شہادت محض عقیدت کا اظہار نہیں رہتی، یہ ایک اہلِ فن کا مشاہدہ، ایک محدث کا اعتراف اور ایک عظیم علمی شخصیت کے مقام پر تاریخ کا فیصلہ بن جاتی ہے۔ اعلیٰ حضرت کے سامنے فقہی کتابیں صرف کتابیں نہ تھیں، وہ ایک ایسا علمی عالم تھیں جس کے ہر صفحے، ہر سطر اور ہر عبارت سے ان کا حافظہ واقف تھا۔ اور محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمہ اس عظیم منظر کے صرف راوی نہیں تھے، وہ اس کے مشاہد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان سے نکلنے والا ہر اعتراف اعلیٰ حضرت کی عظمت کا ایک ایسا روشن باب بن جاتا ہے جس میں عقیدت کی حرارت بھی ہے، علم کی گواہی بھی اور مشاہدے کی صداقت بھی۔

علمِ الفرائض ان علوم اسلامیہ کا وہ دقیق اور پیچیدہ فن ہے جس میں محض اصولوں کا جاننا کافی نہیں ہوتا، مسائل کی تہہ در تہہ پیچیدگیاں، ورثا کی بدلتی ہوئی صورتیں اور ایک کے بعد دوسرے وارث کے انتقال سے پیدا ہونے والی نئی تقسیمیں حساب اور فقہ دونوں پر غیر معمولی گرفت کا تقاضا کرتی ہیں۔ خصوصاً مناسخہ کا مسئلہ جب کئی بطون تک پھیل جائے تو وہ مفتی کے لیے ایک ایسا علمی معرکہ بن جاتا ہے جس میں معمولی سی لغزش پورے حساب کو بدل سکتی ہے۔ ایک شخص کا انتقال، پھر اس کے وارثوں میں سے کسی کا انتقال، پھر اس کے وارثوں کی نئی تقسیم، یوں وراثت کی ایک زنجیر بنتی چلی جاتی ہے اور ہر نئی کڑی پچھلی تمام کڑیوں کے حساب کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔

حضرت محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمۃ کو چونکہ علمِ حساب کی تعلیم اسکول کے زمانے میں حاصل ہوئی تھی، اس لیے فرائض سے متعلق پیچیدہ سوالات عموماً ان کے سپرد کر دیے جاتے تھے۔ مگر ایک مرتبہ جو استفتا ان کے سامنے آیا، وہ معمولی پیچیدگیوں سے کہیں آگے تھا۔

پندرہ بطون پر مشتمل ایک استفتا۔ ایک ایسا مسئلہ جس میں ایک کے بعد دوسرے وارث کا انتقال ہوتا چلا گیا تھا اور ہر انتقال کے ساتھ وراثت کا حساب ایک نئی صورت اختیار کرتا گیا۔ اس پیچیدہ مسئلے کا

جواب مرتب کرنے کے لیے حضرت محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمۃ نے دو راتیں اور ایک دن مسلسل محنت کی۔ حساب کے مراحل طے کیے، ورثا کے حصے متعین کیے، ہر کڑی کو پچھلی کڑی سے جوڑا اور بالآخر جواب تحریر فرما کر اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ کی بارگاہ میں پیش کیا۔

مگر جو کچھ اس کے بعد ہوا، وہ علمِ فرائض کے ایک پیچیدہ مسئلے سے زیادہ اعلیٰ حضرت کے غیر معمولی علمی استحضار کا ایک ایسا منظر تھا جسے دیکھنے والا زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔

حضرت محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمۃ خود اس واقعے کی تفصیل بیان فرماتے ہیں: ''نماز عصر کے بعد بیٹھا کہ استفتاء سناؤں وہ بہت طویل تھا۔ فلاں مرا اور فلاں فلاں کو وارث چھوڑا پھر فلاں مرا اور اس نے اتنے وارث چھوڑے۔ اس میں صرف ناموں کی تعداد اتنی بڑی تھی کہ فل اسکیپ سائز کے دو صفحے بھرے ہوئے تھے۔ جب یہ استفتاء میں پڑھ رہا تھا تو دیکھا کہ اعلیٰ حضرت کی انگلیاں حرکت میں ہیں۔ ادھر استفتاء ختم ہوا ادھر بلا کسی تاخیر ارشاد فرمایا کہ آپ نے فلاں کو اتنا اور فلاں کو اتنا درجنوں لوگوں کا نام بنام حصہ بتا دیا۔ اب میں حیران وششدر کہ استفتا کو پہلی مرتبہ تو میں نے پڑھا ہر ایک نام کو بار بار پڑھ کر ان کا حصہ قلم بند کیا۔ لیکن مجھ سے جب سب الاحیا کا نام کوئی پوچھے تو بغیر استفتا اور جواب دیکھے نہیں بتا سکتا۔''

یہ منظر اپنے اندر حیرت کی کئی سطحیں رکھتا ہے۔ ایک طرف ایک ایسا استفتا تھا جس کے صرف نام ہی فل اسکیپ سائز کے دو صفحات پر پھیلے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ایک طالبِ علمِ علمِ فرائض تھا جس نے دو راتیں اور ایک دن مسلسل محنت کر کے اس کے ایک ایک وارث کا حصہ متعین کیا تھا۔ ہر نام کو بار بار پڑھا، ہر نسبت کو سمجھا، ہر انتقال کے بعد پیدا ہونے والی نئی صورت کو الگ کیا اور پھر پورے حساب کو قلم بند کیا۔ اور دوسری طرف اعلیٰ حضرت تھے۔

وہی استفتا پہلی مرتبہ ان کے سامنے پڑھا جا رہا تھا۔ وہی نام پہلی مرتبہ ان کے کانوں میں پڑ رہے تھے۔ نہ کوئی کاغذ سامنے، نہ کوئی جدول، نہ کوئی حسابی نقشہ۔ صرف ایک استفتا پڑھا جا رہا تھا۔ اور اسی دوران حضرت محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمۃ نے دیکھا کہ اعلیٰ حضرت کی انگلیاں حرکت کر رہی ہیں۔

شاید یہ انگلیاں صرف حرکت نہیں کر رہی تھیں، علم کے ایک ایسے نظام کو ترتیب دے رہی تھیں جو اعلیٰ حضرت کے ذہن میں لحہ بہ لحہ تشکیل پا رہا تھا۔ نام آ رہے تھے، رشتے سامنے آ رہے تھے، ایک وارث کا انتقال دوسرے وارثوں کی صورت بدل رہا تھا، حصے تبدیل ہو رہے تھے، نسلیں آگے بڑھ رہی تھیں ---- اور ایک ہی ذہن ان تمام پیچیدہ رشتوں اور حسابی نسبتوں کو اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔ پھر استفتا ختم ہوا۔ اور اس کے ختم ہوتے ہی اعلیٰ حضرت نے بلا کسی توقف کے ایک ایک شخص کا نام لے کر اس کا حصہ بتانا شروع کر دیا۔

فلاں کو اتنا۔ فلاں کو اتنا۔ درجنوں افراد کے نام اور ان کے حصے۔ بغیر کسی تاخیر کے۔ بغیر دوبارہ استفتا دیکھے۔ بغیر جواب کے اوراق کی طرف رجوع کیے۔ یہ منظر حضرت محدثِ اعظم ہند علیہ الرحمۃ کے لیے اس لیے بھی حیرت انگیز تھا کہ وہ خود اس استفتا کو حل کرنے کے لیے دو راتیں اور ایک دن مسلسل محنت کر چکے تھے۔ انہوں نے ہر نام کو بار بار پڑھا تھا، ہر حصے کو قلم بند کیا تھا، ہر مرحلہ حساب کے ذریعے طے کیا تھا۔

مگر وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ اگر اسی وقت ان سے کہا جاتا کہ اس استفتا میں موجود تمام زندہ وارثوں کے نام بتائیے تو وہ استفتا اور اپنے جواب کو دیکھے بغیر ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ اور ادھر اعلیٰ حضرت نے ایک مرتبہ سماعت کے بعد نہ صرف نام یاد رکھے، بلکہ ہر نام کے ساتھ اس کا متعین حصہ بھی بتا دیا، یہ محض حافظے کا کمال نہ تھا، یہ محض حسابی ذہانت نہ تھی، یہ فقہ، حساب، حافظہ اور استحضار، چاروں کا ایسا اجتماع تھا جس کی مثال عام انسانی صلاحیتوں کے پیمانے سے ناپنا آسان نہیں۔ ۔۔جاری۔۔(باقی حصہ آئندہ شمارے میں۔۔)

□□□□

پڑھنے والا خود کو سنوارتا ہے۔
لکھنے والا زمانے کو۔

محمد ملک الظفر سہسرامی

الرفاہ ٹور اینڈ ٹراویلس

سفرِ حرمین کا ایک روحانی مشاہدہ

بعض سفر انسان کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچاتے ہیں اور بعض سفر انسان کے اندر ایک نئی دنیا آباد کر دیتے ہیں۔ بعض راستے قدموں کے ساتھ طے ہوتے ہیں اور بعض دل کے ساتھ۔

حرمین شریفین کا سفر بھی ایسا ہی ایک سفر ہے، جس میں مسافر صرف زمین کے فاصلے نہیں طے نہیں کرتا بلکہ اپنی روح کے ان گوشوں تک بھی پہنچتا ہے جہاں مدتوں سے غفلت کی گرد جمی ہوتی ہے۔ ایسے سفر میں سفر کا انتظام بھی محض انتظام نہیں رہتا، بلکہ زائر کے اطمینان، عبادت کی یکسوئی اور روحانی کیفیت کا ایک اہم حصہ بن جاتا ہے۔

راقم الحروف کو اپنے رفقاء اور اہلیہ کے ہمراہ متعدد مرتبہ " الرفاہ ٹور اینڈ ٹراویلس " کے توسط سے حرمین شریفین کی حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ ان اسفار کے دوران جو چیز سب سے زیادہ محسوس ہوئی، وہ یہ تھی کہ الرفاہ کے لیے زائرین محض مسافروں کی ایک فہرست نہیں بلکہ مختلف عمروں، مزاجوں اور ضرورتوں کے حامل وہ مہمان ہیں جن کی راحت اور اطمینان سفر کی بنیادی ذمہ داری ہے۔

حرمین شریفین کا سفر اپنی ذات میں ایک عظیم سعادت ہے لیکن اس سعادت کے ساتھ سفر کی مشقتیں بھی وابستہ ہوتی ہیں۔ کبھی راستے کی تھکن، کبھی موسم کی شدت، کبھی ہجوم کی پریشانی، کبھی قیام و طعام کے مسائل اور کبھی عمر رسیدہ یا کمزور زائرین کی خصوصی ضروریات، یہ سب سفر کا حصہ ہوتے ہیں۔ ایسے مواقع پر کسی ادارے کی اصل شناخت اس کے اشتہارات سے نہیں بلکہ اس کے رویے سے ہوتی ہے۔ الرفاہ کے سفر میں یہی رویہ بارہا دیکھنے کو ملا کہ انتظامی امور کے ساتھ انسانی ضرورتوں کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ گرامی قدر حضرت مولانا رفیق القادری ثقافی زید لطفہ کی شخصیت اس پورے نظام کا ایک نمایاں اور دل آویز پہلو ہے۔ ان کی موجودگی میں سفر کا احساس کچھ مختلف ہو جاتا ہے۔ وہ محض ایک منتظم کی حیثیت سے زائرین کے درمیان نہیں ہوتے بلکہ ایک ایسے رفیقِ سفر کے طور پہ موجود رہتے ہیں جسے ہر مسافر کی راحت، ہر بزرگ کی ضرورت، ہر بچے کا معصومانہ انداز اور ہر پریشاں حال زائر کی تشویش کا احساس رہتا ہے۔

ان کی گفتگو میں تکلف نہیں، اپنائیت ہے، ان کے رویے میں رسمی انداز نہیں، خلوص ہے اور ان کی خدمت میں وہ بے ساختگی ہے جو کسی تربیتی نصاب سے نہیں آتی بلکہ انسان کے باطن سے پھوٹتی ہے۔ بزرگوں کے احترام، بچوں کے ساتھ شفقت، خواتین کی سہولت اور معمر زائرین کی خصوصی رعایت جیسے امور ان کے لیے الگ سے انجام دیے جانے والے کام نہیں بلکہ ان کے مزاجِ خدمت کا فطری حصہ محسوس ہوتے ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ایک ادارہ اپنے اصل معنیٰ میں ادارہ بنتا ہے۔ محض ٹکٹ، ہوٹل، گاڑی اور پروگرام کسی سفر کو یادگار نہیں بناتے، یادگار تو وہ احساس بناتا ہے جو مسافر کو یہ یقین دلائے کہ وہ اس سفر میں تنہا نہیں کوئی ہے جو اس کی تھکن محسوس کرتا ہے، اس کی ضرورتیں سمجھتا ہے اور اس کی پریشانی کو اپنی ذمہ داری جانتا ہے۔ کوئی ہے جو راستے کی دشواری میں سہارا بنے، اجنبی ماحول میں اپنائیت عطا کرے اور ایسے وقت میں اطمینان کا ایک جملہ کہہ دے جب مسافر کو صرف انتظام نہیں، حوصلے کی ضرورت ہو۔ سفر کی اصل خوب صورتی کبھی کبھی کسی بڑے انتظام میں نہیں بلکہ ایک چھوٹی سی توجہ، ایک شفقت بھری نظر اور بروقت تھامنے والے ایک ہاتھ میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہی احساس مسافر کو یہ بھلا دیتا ہے کہ راستہ کتنا طویل تھا، سفر کتنا تھکا دینے والا تھا اور منزل تک پہنچنے میں کتنی دشواریاں پیش آئیں۔ پھر واپسی پر انسان اپنے ساتھ صرف سفر کی یادیں نہیں لاتا بلکہ ان لوگوں کی محبت، خلوص اور خدمت کا ایک ایسا روحانی سرمایہ بھی لے کر لوٹتا ہے جو مدتوں دل میں محفوظ رہتا ہے۔

’’الرفاہ ٹور اینڈ ٹراویلس‘‘ کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے ہاں سفرِ حرمین کو صرف انتظامی مراحل کا مجموعہ نہیں سمجھا جاتا۔ علماء و مشائخ کی رہنمائی، مناسکِ عمرہ کی ادائیگی میں شرعی رہنمائی، دعاؤں اور آداب کی مستند تعلیمات اور حرمین شریفین کی زیارتوں کے روحانی پہلوؤں سے آگاہی۔ یہ تمام امور سفر کو ایک ایسی معنویت عطا کرتے ہیں جس سے زائر کے قدموں کے ساتھ اس کا دل بھی سفر کرتا ہے۔ حرمین شریفین کے مقدس مقامات پہ پہنچ کر ہر شخص اپنی اپنی کیفیت کے ساتھ آتا ہے، کوئی شوق کی شدت لیے، کوئی گناہوں کی ندامت لیے، کوئی دعا کی امید لیے اور کوئی صرف اس آرزو کے ساتھ کہ ایک بار گنبدِ خضریٰ کے حسین سائے میں کھڑا ہو جائے۔ ایسے میں اگر کوئی رہنمائی کرنے والا صرف راستہ نہ بتائے بلکہ عبادات

کے آداب بھی سکھائے، صرف زیارت کا مقام نہ دکھائے بلکہ اس کی نسبت کا احساس بھی دلائے، صرف مناسک کی ادائیگی نہ کرائے بلکہ ان کے پسِ پشت چھپی ہوئی روحانی حکمتوں سے بھی آشنا کرے، صرف دعاؤں کے الفاظ نہ بتائے بلکہ دعا کے لیے دل کی کیفیت بھی پیدا کرے، صرف حرمین شریفین کے مقدس مقامات تک نہ لے جائے بلکہ ان مقامات سے وابستہ تاریخ، نسبت اور روحانی عظمت کو بھی دل میں اتار دے، تو سفر محض سفر نہیں رہتا۔ پھر راستے کی ہر منزل ایک سبق بن جاتی ہے، ہر حاضری ایک یاد بن جاتی ہے، ہر زیارت دل کے اندر ایک نئی روشنی جگاتی ہے اور ہر لمحہ انسان کو اپنی ذات سے بلند ہو کر اس عظیم روحانی روایت سے وابستہ ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ ایسے سفر سے واپسی پہ مسافر صرف یہ نہیں کہتا کہ میں حرمین شریفین کی زیارت کر کے لوٹا ہوں بلکہ اس کے دل میں یہ احساس بھی زندہ رہتا ہے کہ اس مقدس سفر نے مجھے اندر سے کچھ بدل دیا ہے۔

راقم کے مشاہدے میں ''الرفاہ ٹور اینڈ ٹراویلس'' کی سب سے اہم خوبی یہی ہے کہ یہاں انتظام اور نسبت، سہولت اور روحانیت، سفر اور خدمت ------ ان سب کو ایک دوسرے سے جدا نہیں سمجھا جاتا۔ ایک طرف زائرین کے قیام، طعام اور آمد و رفت کا اہتمام ہے، تو دوسری طرف ان کے دلوں کی کیفیت کا بھی خیال ہے۔ ایک طرف سفر کے ظاہری مراحل ہیں، تو دوسری طرف اس سفر کی باطنی منزلوں سے آشنائی بھی ہے۔

اسی لیے "الرفاہ" کا سفر محض ایک سفری پروگرام نہیں رہتا۔ اس میں رفاقت کا لطف، خدمت کا اطمینان اور روحانی نسبت کی ایک ایسی خوشبو شامل ہو جاتی ہے جو واپسی کے بعد بھی دیر تک دل کے اندر باقی رہتی ہے۔ میرا یہ مشاہدہ ہے کہ کسی ادارے کی اصل قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب انسان اس کی خدمات کا خود تجربہ کرے۔ "الرفاہ ٹور اینڈ ٹراویلس" کے ساتھ سفر کرتے ہوئے یہ احساس بار ہا پیدا ہوا کہ اس ادارے کے پیچھے محض کاروباری منصوبہ نہیں بلکہ خدمت کا ایک جذبہ بھی کارفرما ہے۔ یقیناً ہر انسانی انتظام میں بہتری کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے مگر جو ادارہ اعتماد حاصل کر لے، جو زائرین کے دل میں اطمینان پیدا کر دے اور جو اپنے سفر کو خدمت کے رنگ میں رنگ دے، وہ اپنی بنیادی منزل پا لیتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ راقم الحروف ''الرفاہ ٹور اینڈ ٹراویلس'' کے تمام انتظامات کو بے نظیر و بے مثال قرار دینے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ قیام و طعام، آمد و رفت اور دیگر سفری سہولتیں یقیناً اپنی جگہ اہم ہیں اور ان کے معیار و حسنِ انتظام سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن کسی ادارے کی اصل عظمت صرف اس بات سے متعین نہیں ہوتی کہ اس نے اپنے مسافروں کے لیے کتنی سہولتیں فراہم کیں۔ میرے نزدیک ''الرفاہ'' کی سب سے نمایاں خصوصیت اس سے کہیں آگے ہے۔ اصل کمال یہ ہے کہ اس ادارے نے اپنے حسنِ سلوک، خلوصِ خدمت اور انسانی اپنائیت کے ذریعے زائرین کے دلوں میں اپنے لیے ایک جگہ بنائی ہے۔ سہولتیں سفر کو آسان بناتی ہیں، اچھے انتظامات سفر کو خوش گوار بناتے ہیں، لیکن دل جیت لینا، یہ ایک ایسی نعمت ہے جو محض انتظامات سے حاصل نہیں ہوتی۔

''الرفاہ'' کی حقیقی خوبی یہی ہے کہ اس کے ساتھ سفر کرنے والے زائرین اپنے ساتھ صرف ایک مکمل ہونے والے سفر کی یاد نہیں لے کر لوٹتے بلکہ ان کے دل میں اس ادارے اور اس سے وابستہ افراد کے لیے محبت، اعتماد اور اپنائیت کا ایک احساس بھی باقی رہتا ہے۔ اور میرے نزدیک کسی بھی خدمت گار ادارے کے لیے اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے زائرین کو صرف سہولت فراہم نہ کرے بلکہ ان کے دلوں میں بھی جگہ بنا لے۔

انتظامات وقت کے ساتھ بہتر یا مختلف ہو سکتے ہیں، سہولتوں میں اضافہ یا کمی آ سکتی ہے لیکن جو اعتماد خلوص سے پیدا ہو اور جو مقام محبت سے حاصل ہو، وہ دیر پا ہوتا ہے۔ یہی وہ امتیاز ہے جسے میں ''الرفاہ ٹور اینڈ ٹراویلس'' کی سب سے بڑی خصوصیت سمجھتا ہوں۔

حرمین شریفین کے مسافروں کی خدمت بلاشبہ ایک سعادت ہے۔ ہر شخص کو یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ عاشقانِ رسول ﷺ کے سفر کا معاون بنے، ان کی ضروریات کا خیال رکھے اور ان کی حاضری کے سفر میں کسی نہ کسی درجے میں شریک ہو۔ یہ ایک ایسی نسبت ہے جس کی قدر وہی جان سکتا ہے جس کے دل میں حرمین شریفین کی محبت ہو۔

حضرت مولانا رفیق القادری ثقافی نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ جب نیت میں اخلاص، خدمت میں محبت اور مقصد میں رضائے الٰہی شامل ہو تو دنیاوی مشغولیت بھی خیر و برکت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ پھر سفر صرف سفر نہیں رہتا، انتظام صرف انتظام نہیں رہتا اور خدمت صرف خدمت نہیں رہتی، ہر عمل کے پیچھے ایک نسبت، ہر کوشش کے اندر ایک دعا اور ہر قدم کے ساتھ ایک روحانی امید چلتی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت حضرت مولانا رفیق القادری ثقافی زید لطفہ کو صحت و عافیت، عمر میں برکت، عمل میں استقامت اور خدمت میں اخلاص عطا فرمائے۔ "الرفاہ ٹور اینڈ ٹراویلس" کو مزید ترقی، وسعت اور نیک نامی عطا فرمائے اور اسے حرمین شریفین کے زائرین کے لیے اعتماد، سہولت اور روحانی رہنمائی کا ایک معتبر وسیلہ بنائے۔

اللہ تعالیٰ اس ادارے کے ذریعے بے شمار عاشقانِ رسول ﷺ کو حاضریِ حرمین کی سعادت عطا فرمائے اور جو لوگ اس مقدس سفر کے انتظام میں اپنا وقت، اپنی صلاحیت اور اپنی محنت صرف کر رہے ہیں، ان کی ان خدمات کو بارگاہِ الٰہی میں قبول فرمائے۔

آمین بجاہِ سید المرسلین ﷺ۔


AL-REEFAH
HAJJ UMRAH TOURS AND TRAVELS
IATA
15 DAYS
UMRAH
Package
AUGUST TO JANUARY
DELUXE
1,05,000/-
MAKKAH HOTEL
Loloat Al Azhar
500 Meters From Haram
MADINA HOTEL
Arjawan Al Madina Or Similar
250 Meters From Haram
SEMI DELUXE
95,000/-
MAKKAH HOTEL
Manarat Al Misk
700 Meters From Haram
MADINA HOTEL
Burj e Mukhtara
400 Meters From Haram
RAMZAN FULL MONTH
1,75,000/-
Deluxe
Ramzan 35 Days Package
PACKAGE INCLUDES
Accommodation in Mecca & Madinah
Experienced Tour Guide
Airplane Tickets
Visa Documentation
Mecca & Madinah Local Ziyarat
3 Time Indian Buffet Meal
Travel in Luxury Buses
Laundry Service
Travel Bags
CONTACT US +91 9004307866 / 7304748045
Add: Off.No.07, Anjuman Khairul Momineen Masjid, Kurla (W), Mumbai-70
2nd Office No.02, Siddiqui Complex, Near Maaz Hotel, Bypass Kousa Mumbra

Mar. - Aug. 2026

Majalla **Al-Kausar** Sasaram

Contact: 9892471264

Darul Uloom Khairia Nezamia, Barahdari, Sasaram, Bihar-821115 (INDIA)

Contact: 7050055786, E-mail: alkausarsasaram@gmail.com, www.alkausarsasaram.blogspot.com

جب قلم اذان بن جائے اور تحریر قندیل ایمان تب روح کو جگانے اور ایمان تازہ کرنے کے لئے ایک عنوان درج ہوتا ہے

اٹھ مرے دھوم مچانے والے

معروف قلم کار ونثر نگار حضرت مولانا رحمت اللہ صدیقی کی فکر انگیز تصنیف اور ان کا نیا روحانی قلمی شاہکار منظرِ عام پہ پہلی مرتبہ صوبۂ بہار کے تاریخی شہر سہسرام کی پاکیزہ مذہبی تاریخ کا ایسا گوشوارہ پیش کیا جا رہا ہے جو نادیدہ بھی لیکن تحقیق کی روشنی اور ایمان کی خوشبو سے معطر ہے۔ پہلی جلد جو چھ سو صفحات پہ مشتمل ہے اس کا موضوع سہسرام کی پاکیزہ مذہبی تاریخ فکرِ رضا کے تناظر میں۔

صفِ مجددین میں امام احمد رضا کے امتیازات وتفردات جب زمانے کی گرد میں حق کی روشنی دھندلا جائے...... جب گمرہی کی چمک دمک سے دل بہکنے لگیں......

جب علم وعمل کی صفوں میں نفسانیت سر اُٹھانے لگے......تب ضرورت ہوتی ہے ایک اذان کی جو حق وصداقت کی راہ پہ چلنے کی دعوت دے----ایک دھمک کی----ایک روحانی للکار کی---جو صدا دے "اٹھ مرے دھوم مچانے والے" یہ محض ایک عنوان نہیں یہ دعوت فکر ہے- یہ محبت رسول کی ترجمانی ہے--- جو مولانا محمد رحمت اللہ صدیقی کے قلم سے جاری ہوئی ایک مردِ حق آگاہ کا قلم تلوار بن کر اُٹھتا ہے---اور صدا دیتا ہے: اُٹھ مرے دھوم مچانے والے! یہ محض ایک کتاب نہیں---- بلکہ مذہبی تاریخ کا وہ گوشوارہ ہے جس میں مجددین کی قطار میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا درخشاں مقام ان کے تفردات واجتہادی خصوصیات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے--- یہ دعوتِ فکر ہے!--- یہ ندائے رضا ہے!--- یہ محبتِ رسول ﷺ کے مسلک کا روشن مینار ہے! یہ کتاب جدید ذہنوں کو مسلک حق کی جانب متوجہ کرتی ہے سادہ زبان میں گہرے نکات کی وضاحت کرتی ہے اور فکر وروح کو بیدار کرتی ہے۔

کتاب کی خصوصیات: امام احمد رضا کی تجدیدی فکر اور اسلوب کی انفرادیت اور اس کا جامع تجزیہ، سہسرام کی مذہبی تاریخ کا مستند تحقیقی اور خوبصورت بیان، نوجوان نسل کی دینی وفکری رہنمائی، اعلیٰ حضرت کی علمی وروحانی عظمت کا نیا زاویہ، اتحاد واصلاح کی حکیمانہ دعوت، صوفیانہ رنگ میں عقائدِ اہل سنت کی ترجمانی۔ یہ کتاب سلیس وشستہ زبان میں گہرے نکات کے در کھولتی ہے، دل ودماغ کو بہ یک وقت بیدار کرتی ہے، اور مسلکِ حق کا روشن پرچم بلند کرتی ہے۔ تمام بڑے دینی کتاب گھروں اور خانقاہی مراکز پہ دستیاب ہوگی۔

مولانا ملک الظفر سہسرامی: تنقیدی شعور کا روشن ستارہ

(فکر ونظر کے چراغ کی روشنی)

جب علم کے دریچے کھلتے ہیں اور دل کی ویرانیاں نورِ بصیرت سے جگمگاتی ہیں، تو ایسے وقت میں کچھ ہستیاں جلوہ گر ہوتی ہیں جن کی ذات علم وعرفان کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ حضرت مولانا ملک الظفر سہسرامی بھی انہی میں سے ایک ہیں، جن کی زندگی کا ہر لمحہ، ہر تحریر اور ہر احساس دینِ متین کی فکری تجلیات، اور ادبی جمالیات کا حسین امتزاج ہے۔

ان کی نثر میں ایک ایسا لطیف جلال ہے، جو دل کو برانگیختہ کرتا ہے لیکن روح کو سکون بخشتا ہے۔ ان کے قلم کی روشنائی صرف کاغذ پہ نہیں اترتی، بلکہ قلوب واذہان پہ بھی نقش چھوڑ جاتی ہے۔ ان کی تحریریں صرف نگاہوں سے ہم کلام نہیں ہوتیں بلکہ قلب وروح سے رشتے مربوط کرتی ہیں- ان کی تحریریں فقط تنقیدی تجزیے نہیں، بلکہ ایک روحانی ندائے حق بھی ہیں، جو اسلامی تہذیب کے دفاع اور فکری زوال کے سدِّ باب کا سامان رکھتی ہیں۔

ان کی فکر کا افق صرف الفاظ کی وسعت تک محدود نہیں، بلکہ وہ شرعی بصیرت اور ادبی بلاغت کو ایک ہی قرطاس پہ سجا کر پیش کرتے ہیں۔ مولانا کا تنقیدی شعور اس دریا کی مانند ہے جو اپنی روانی میں نہ صرف فکری گرد کو بہا لے جاتا ہے، بلکہ صداقت کے گوہر بھی چن کر سامنے لاتا ہے۔

الحمدللہ! آج وہ لمحہ آیا چاہتا ہے جب مولانا کے قیمتی افکار اور دردمندانہ مشاہدات کو ایک روح پرور مجموعے کی شکل دی جا رہی ہے۔ صحافیٔ عصر، مولانا رحمت اللہ صدیقی (مدیرِ اعلیٰ پیغامِ رضا) کی سعی جمیل سے یہ مجموعہ "فکر ونظر کے چراغ" کے عنوان سے منصۂ شہود پہ آ رہا ہے۔ یہ مجموعہ صرف مقالات کا گلدستہ نہیں، بلکہ ہر تحریر ایک روشن چراغ ہے، جو ذہن کے اندھیروں میں ہدایت کی لو جلاتا ہے۔ ان مضامین میں جہاں اسلامی ادب کی نازک رگوں کو محبت سے چھوا گیا ہے، وہیں عقل وشعور کے چراغ بھی روشن کیے گئے ہیں۔ مولانا کے قلم نے ان موضوعات کا انتخاب کیا جو وقت کی ضرورت ہیں اور انہیں اس انداز سے سنوارا کہ علم، ادب، اور روحانیت تینوں کی پیاس بجھتی نظر آتی ہے۔

"فکر ونظر کے چراغ" ان خوش بختوں کے لیے ہے جو علم سے دل کی دنیا روشن کرنا چاہتے ہیں، جو تنقید کو فقط الفاظ کی قلابازی نہیں بلکہ بصیرت کی جاگتی آنکھ مانتے ہیں، اور جو اسلامی ادب کو صرف روایت نہیں، روح کی تازگی سمجھتے ہیں۔ یہ مجموعہ ان شاء اللہ بہت جلد منظرِ عام پہ آنے والا ہے۔ جو اہلِ دل اس نورانی سرمائے کو اپنی علمی دنیا میں شامل کرنا چاہتے ہیں، وہ ابھی رابطہ کریں۔ یہ چراغ فقط آج کی راتوں کو روشن کرنے نہیں آ رہا ہے بلکہ آنے والی نسلوں کی راہ میں بھی روشنی تقسیم کرے گا- ان شاء اللہ تعالیٰ

رابطہ: قاری رضوان الہدیٰ، دارالعلوم خیریہ نظامیہ، بارہ دری سہسرام ضلع رہتاس 821115، موبائل: 7050055786, alkausarsasaram@gmail.com

Rs. 400/-